قرآنک انسائیکلوپیڈیا

اُردو ترجمہ

جلد ششم

مؤلف
پروفیسر اشفاق احمد خان

(۱) مَا فَرَّطْنَا فِی الْکِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ (سورۃالانعام : ۳۸)

''ہم نے (اپنی اِس) کتاب میں کوئی چیز چھوڑ نہیں رکھی۔'' (۶ : ۳۸)

(۲) وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتَابٍ مُّبِیْنٍ ۝ (سورۃ الانعام : ۵۹)

''اور نہ کوئی تر اور خشک چیز مگر (یہ کہ یہ سب) روشن کتاب میں (موجود) ہیں۔'' (۶ : ۵۹)

(۳) وَنَزَّلْنَا عَلَیْكَ الْکِتٰبَ تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ (سورۃالنحل :۸۹)

(اے محبوبِ مکرّم!) ''ہم نے آپ پر ہر بات کو کھول دینے والی کتاب اتاری ہے۔'' (۱۶:۸۹)

(۴) وَکُلَّ شَیْءٍ اَحْصَیْنٰهُ فِیْٓ اِمَامٍ مُّبِیْنٍ ۝ (سورہ یٰسٓ : ۱۲)

''اور ہر چیز کو ہم نے روشن کتاب میں احاطہ کر رکھا ہے۔'' (۳۶ : ۱۲)

(۵) وَکُلُّ صَغِیْرٍ وَّکَبِیْرٍ مُّسْتَطَرٌ ۝ (سورۃ القمر : ۵۳)

''اور ہر چھوٹی اور بڑی بات (اس میں) لکھی ہوئی ہے۔'' (۵۴ : ۵۳)

قرآنک انسائیکلوپیڈیا (اُردو ترجمہ)

(جلد ششم)

مؤلف : پروفیسر اشفاق احمد خان

سابق صدر شعبہ عربی۔ گورنمنٹ کالج بوسن روڈ ملتان

مترجم : پروفیسر اشفاق احمد خان (مؤلف انسائیکلوپیڈیا ہٰذا)

ثاقب پرنٹرز اینڈ پبلشرز

5۔ شالیمار کالونی' عقب ٹویوٹا شوروم۔ بوسن روڈ ملتان

موبائل : 0308-9217883

0301-7422684

طبع اوّل : مئی 2014ء

ملنے کے پتے :

اندرونِ ملک :

(۱) پروفیسر اشفاق احمد خان ۔۵ شالیمار کالونی، عقب ٹویوٹا شوروم ۔ بوسن روڈ ملتان
موبائل : 0308-9217883
0301-7422684 (محمد جمیل ۔ مارکیٹنگ منیجر)

(۲) ملتان کتاب گھر۔ بالمقابل گورنمنٹ کالج، بوسن روڈ ملتان
فون: 6750226 -061

(۳) مکتبہ قاسمیہ۔ کچہری روڈ، نزد چوک گھنٹہ گھر۔ ملتان
موبائل : 0300-7300097
فون : 061-4542085

بیرونِ ملک : پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمد سلیم
drhafizsaleem@yahoo.com.uk.
Landline Tel: 0044-1628-823632

قیمت : ایک ہزار روپے (Rs. 1000/-)

موبائل : 0308-9217883
0301-7422684

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلٰنا مُحَمَّدٍ عَدَدَ مَا ذَکَرَہُ الذَّاکِرُوْنَ
اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلٰنا مُحَمَّدٍ عَدَدَ مَا غَفَلَ عَنْ ذِکْرِہِ الْغَافِلُوْنَ

نذرانۂ عقیدت

بہ بارگاہِ سلطان الانبیاء، زیبِ مقام **دنیٰ فتدلیٰ** حضرت احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء
والصّلوٰۃ والسلام فی کُلِّ حِینٍ بعددِ معلوماتِ اللہ الاعلیٰ بہ اُمید شفاعتِ روز جزا

جنہیں دربارِ رسالت کے منظورِ نظر شاعر حضرت حسان بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ
نے یوں خراجِ عقیدت پیش کیا:

وَاَحْسَنَ مِنْکَ لَمْ تَرَقَطُّ عَیْنِیْ وَاَجْمَلَ مِنْکَ لَمْ تَلِدِ النِّسَاءُ
خُلِقْتَ مُبَرَّاً مِّنْ کُلِّ عَیْبٍ کَاَنَّکَ قَدْ خُلِقْتَ کَمَا تَشَاءُ

اور عبدالرحمٰن جامیؒ نے عرض کیا:

ہمہ خلق گویدثنائے خدارا	خدا خود بگوید ثنائے محمد ﷺ

شیخ سعدی عرض کرتے ہیں:

عرش است کمیں پایہ زایوان محمد ﷺ	جبریل امین خادم دربار محمد ﷺ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

محتویات (CONTENTS)

(۱۰۷) صحافت (JOURNALISM) اوراسلام --- --- --- --- --- --- ۲۷۶۹

لفظ ''صحافت'' کا ماخذ۔ صحافت کی اقسام۔ صحافت کی اہمیت۔ دورِ جدید میں صحافت کی اہمیت۔ قرآنِ حکیم کے مطابق مقصدِ صحافت۔ صحافت کی تاریخ: قبل از اسلام' دورِ نبوی میں (حضور علیہ السلام کے تبلیغی خطوط اور رسائل' خواتین میں تبلیغ) خلفائے راشدین کے دور میں صحافت۔ دورِ جدید میں صحافت۔ آزادیٔ صحافت کی حدود۔ صحافت کا قرآنی ضابطۂ اخلاق۔ صحافت میں عدل و احسان۔

<u>ہماری ملکی صحافت اور ذرائع ابلاغ کی چند خامیاں</u>: جمعۃ المبارک کے ضمیمے اور ہمارے اخبارات۔ حسن کے مقابلہ جات ننگے پن کے مقابلہ جات ہیں۔ جنسی کشش کے بارے میں چار خطرناک چور گڑھے (Pitfalls) جن میں ہماری صحافت ملوّث ہے۔ ریڈیائی صحافت۔ ٹیلیویژن۔ اشتہاریات اور اُن کا منفی پہلو۔ فلم۔ وی' سی' آر۔ تصویری صحافت۔ کارٹون۔ وقائع نگاری (Reporting) کے آداب۔ معروضی وقائع نگاری۔ اداریہ نگاری کے آداب۔ ہر دور کی صحافت کے لئے احادیثِ نبویہ بطور مشعلِ راہ۔

(۱۰۸) عدلیہ (JUDICIARY) --- --- --- --- --- --- --- ۲۸۲۰

تعریف۔ قضاء (عدل وانصاف) کی شرعی حیثیت۔ عدل وانصاف قانون کی بنیاد ہے۔ عدل و انصاف کا معیار۔ قرآنِ حکیم اور ذاتی تحفظ کا حق۔ عوام کے ذریعے عدل وانصاف کا نفاذ۔ عدل وانصاف کا نفاذ اور ملک کا آئین۔ قاضیوں اور ججوں کی اقسام۔ بے انصاف اور ظالم قاضی کے لئے وعید۔ منصبِ قضا کی خواہش رکھنا۔ قاضی اور رشوت۔ قاضیوں کے ساتھ لوگوں کا رویّہ۔ قاضی کی اہلیت کی شرائط۔ شہادت (گواہی) اور اُس کے چھپانے کی ممانعت۔ ''حدود'' کے جرائم میں شہادت کی حیثیت۔

<u>گواہوں کا نصاب</u>: ایک گواہ کی بنیاد پر فیصلہ۔ ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی کی بنیاد پر فیصلہ۔ دو مَردوں کی گواہی کی بنیاد پر فیصلہ۔ چار گواہوں کی گواہی کی بنیاد پر فیصلہ۔
چار گواہوں کی موجودگی میں نسوانی گواہی کی حیثیت۔ اسلام میں دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر کیوں؟ جھوٹے اور فاسق کی گواہی قابلِ قبول نہیں۔ دشمن کے لئے بھی سچی گواہی۔ کسی بھی فریق کی اَمارت یا غربت گواہی کی صداقت پر اثر انداز نہ ہونے پائے۔ کاتب اور گواہ کو نقصان پہنچانا ناجائز ہے۔ گواہی سے انکار کرنا۔ اعترافِ جرم مجرم کو سزا سے بَری نہیں کرے گا۔ قسم (Oath)۔ قسم کون لوگ اُٹھائیں گے؟ مدّعی جن صورتوں میں قسم اٹھائے گا۔ عدل وانصاف کا آفاقی راہنما اصول۔ وکلاء صاحبان کے لئے لمحۂ فکریہ۔

میں کوئی جواز نہیں۔ اسلام کا جنس کے بارے میں نظریہ۔ انسان کی تخلیق اور نزولِ قرآن۔ مسلمانوں کی نیکیاں اُن کے کم نیک رشتہ داروں کو فائدہ دیں گی۔ یومِ پیدائش خوشی کا نہیں، اظہارِ غم واندوہ کا دن ہے۔ تکبر اور توہینِ رسالت ابلیس کو راندہ درگاہ کر گئے۔ اللہ تعالیٰ تاریخ نگاری اور اپنے ماضی کو یاد رکھنے کو پسند کرتا ہے۔ معاشرے کے استحکام اور فلاح و بہبود کا ایک بنیادی قرآنی نکتہ۔ جادو کا اثر محض حکمِ الٰہی سے ہوتا ہے۔ جادو سے تائب کی توبہ اللہ تعالیٰ کو قبول ہے۔ مساجد کے برباد و آباد کرنے والے کی سزا و جزا۔ تبرّکات کی شرعی حیثیت۔ تمام انبیاء اور رسولوں کے تمام آباء و اَجداد موحّد اور ایک ہی اللہ کے پرستار رہے ہیں۔ معرفتِ الٰہی رسول اللہ ﷺ ہی کے ذریعے سے ممکن ہے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے شمائل و خصائص کا چھپانا یہود کا کام ہے۔ کسی نبی پر الزام لگانا اللہ پر الزام لگانا ہے۔ اللہ کے محبوبین کا ہر عمل اللہ کا عمل ہوا کرتا ہے۔ باہمی مشاورت ایک جمہوری عنصر ہے اور یہ کہ باہمی مشاورت توکل علی اللہ کے خلاف نہیں۔ بیوی کا حق مہر ایک متبرک چیز ہے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا درِ دولت رحمتِ الٰہی کا دَر ہے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام تمام انبیاء علیہم السلام کے خصائل و شیم کا مجموعہ ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کو جھٹلانا غضبِ الٰہی کو للکارنا ہے۔ ہر بچہ اپنے باپ کی طرف منسوب ہوتا ہے نہ کہ ماں کی طرف۔ ہر رونے والی آنکھ کے آنسو حقیقی نہیں ہوتے۔ دورانِ سفر زادِ راہ ساتھ رکھنا توکل علی اللہ کے خلاف نہیں۔ اولیاء کرام کے روضوں کے قریب مساجد کی تعمیر۔ قبور پر عمارات کی تعمیر۔ اللہ تعالیٰ کو جمع کے صیغے سے خطاب کرنا کفّار کا طریقہ ہے۔ صحرائے عرب کو چمنستان میں بدلنے کا مطالبہ کفّار کیوں پورا نہیں کیا گیا؟ اسلام کافروں کی اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ شادی کو تسلیم کرتا ہے۔
تقلیبِ اقدار (Commutation) کے عمومی اصول۔ قانون کی سختی کو نرمی میں بدلنے کے لئے چند قواعد وضوابط۔ قوانین کی مزید توضیح وتشریح۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اختیارِ تشریعی کی حقیقت۔ اثباتِ فقہ۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور اجتہاد۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شانِ قاسمیت۔ توسّل کی ضرورت کیوں؟

''کعبہ'' کا لغوی معنیٰ۔ کعبہ کی وجہ تسمیہ۔ کعبہ اور ہدایت۔ ہدایت کی اقسام۔ اَلشَّھرَ الحرام، ھَدْیَ، قَلَائِد اور اَلنَّاس کی وضاحت۔ کعبہ کے اوّل اور دوئم معمار۔ چاہِ زمزم۔ کعبہ کی حکمت تحویل قبلہ۔ قبلہ سے کعبہ کو تبدیلی لوگوں کی اس لحاظ سے سخت آزمائش ہے کہ کون نبی علیہ الصلوٰۃ و السلام کی بے مثال عظمت وتوقیر کو تسلیم کرتا ہے۔ رُخِ مصطفی ﷺ اور کعبۃ اللہ۔ سارا اسلام، سارا ایمان، مسلمانی کا کمال اور ساری عبادات کی قبولیت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رضا میں مضمر ہے۔ کعبۃ اللہ محبوبِ حقیقی کے حسن و جمال کا مظہر ہے۔ حرمتِ کعبہ کے تقاضے۔ کعبہ معظمہ کا طول وعرض اور ارتفاع وغیرہ۔ کعبہ معظمہ کے مادّی وروحانی فوائد۔
کعبہ کے گرد چند اہم مقامات اور اصطلاحات: باب السلام۔ حجرِ اسود۔ حطیم۔ حرم۔ استلام۔

مطاف ۔ مقامِ ابراہیم ۔ مسجدِ حرام ۔ ملتزم ۔ مسعیٰ ۔ میزابِ رحمت ۔ رکنِ عراقی ۔ رکنِ شامی ۔ رُکنِ یمانی ۔ سعی ۔ شوط ۔ صفا ' مروہ ' تلبیہ ' طواف ' چاہِ زمزم ۔
چند سوالات اور اُن کے جوابات ۔

تعارف و تمہید ۔ عقیدہ کے غلط اور غیر حقیقی پہلو اور اُن کا رَدّ ۔ کرما (تناسخ) اور قرآنِ حکیم ۔ مذہبی تجسس کا حتمی مقصد ۔ کرما اور قرآن کی تعارف کردہ اُخروی زندگی ۔ جن لوگوں کو ڈر ہے کہ موت سے وجود کی فنا ہے تو وہ جہنم میں اپنی بربادی پر واویلا کریں گے ۔ روح غیر فانی ہے ۔ کرما اور قرآنِ حکیم کا اس دنیاوی زندگی کے متعلق نظریہ ۔ کرما کا نظریہ تقدیر بہ مقابلہ قرآنِ حکیم ۔ کرما اور اخلاقی اَقدار / ضابطہِ اخلاق ۔ اللہ تعالیٰ ہی عدل و انصاف کا منبع ہے نہ کہ کرما (تناسخ یا آواگون) ۔ طمانیتِ قلبی اور ذہنی سکون کو کہاں پایا جائے ؟ روح کا بدل بدل کر مختلف جسموں میں آنا (یعنی تناسخ) ناممکن ہے جو کافروں کا عقیدہ ہے ۔

تمہید و تعارف ۔ خضر علیہ السلام کا نسب نامہ ۔ آپ کا زمانہ ۔ موسیٰ علیہ السلام کی جنابِ خضر سے ملاقات ۔ خضر علیہ السلام کا مقام ۔ خضر علیہ السلام کی نبوّت کے حق میں دلائل ۔ موسیٰ اور خضر علیہما السلام کے قصہ میں چند اہم نکات ۔ قصہ مذکورہ میں چند فقہی نکات ۔ خضر علیہ السلام کی درازیِ عمر کی بحث ۔ منکرینِ حیاتِ خضر کے دلائل اور اُن کے جوابات ۔

خلع کا لغوی اور اصطلاحی معنیٰ ۔ خُلع کی حکمت ۔ جوازِ خُلع ۔ خُلع کا طریقہ ۔ بلا سبب عورت کا خُلع طلب کرنا ۔ خُلع بغیر عدالت جائز ہے ۔ اگر شوہر خُلع دینے سے انکار کرے ۔ خلع میں رجوع کا حق ۔ خلع کی عدّت ۔ خلع طلاق ہے یا فسخ ؟ خلع کے اسباب ۔ خلع سے متعلق چند اصول و ضوابط ۔ معاوضہ خُلع کی چند شرائط ۔

تمہید ۔ طفل کشی کی عرب تاریخ ۔ طفل کشی اور قرآنِ حکیم ۔ کیا اسقاطِ حمل بھی طفل کشی ہے ؟ اسقاطِ حمل بہ مقابل مانع حمل ادویات ۔ اسقاطِ حمل کے قانونی جواز پر تحقیق ۔

کچھ مؤلف کے بارے میں

خالقِ کون و مکاں نے اِس رنگ رنگیلی کائنات کے دولھا حضرتِ انسان کو دیگر نعمتوں کے علاوہ سوجھ بوجھ، عقل و فہم، دانش و فراست اور بصیرت بھی عطا کیں اور اِس عطا میں اپنی ایک خاص حکمت کو برقرار رکھا یعنی کسی پر کم اور کسی پر زیادہ فیضانِ نظر ہوا۔ اکثریت ہم جیسے عام لوگوں کی ہے لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کے کچھ نیک بندے ایسے بھی ہیں جن پر اللہ کی عنایتِ خاص کی وجہ سے اُن کی ظاہری آنکھوں کے علاوہ اُن کی قلبی آنکھیں بھی کھلی ہوتی ہیں جن کی بدولت وہ روحانیت کے میدان میں دوسروں سے سبقت لے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہر چھوٹی بڑی بُرائی سے نفرت اور ہر چھوٹی بڑی نیکی سے والہانہ محبت اُن کی نہاد میں رس بس جاتی ہے۔ یہ لوگ اپنی وجدانی سپرٹ (Intuitive Spirit) اور بہترین فراست کی بدولت اپنے اَبنائے جنس کی راہ نمائی کے لئے ہراول دستے کا کام کرتے ہیں۔ عام عقل وفہم رکھنے والے لوگوں کی ہمدردیاں اور دعائیں بھی اِن خداداد صلاحیتوں کے حامل ہستیوں کے شاملِ حال رہتی ہیں۔ میری مراد ''قرآنک انسائیکلوپیڈیا'' کے مؤلف جناب پروفیسر حافظ اشفاق احمد خان (مؤلف انسائیکلوپیڈیا) کی ذات سے ہے۔

گوشۂ خمولت (گم نامی) میں پُرسکون وپُراطمینان، شاداں وفرحاں، سادگی پسند، خوش اَخلاق وخوش طبع، خوش گفتار، خوش شکل وخوش سیرت، متواضع، اعلیٰ خاندانی شرافت ونجابت کے حامل جناب پروفیسر اشفاق احمد خان سے میرے ذاتی مراسم تقریباً 14 سال قبل اُس وقت شروع ہوئے جب میں اُن سے استفادہ کے لئے گاہے گاہے ذکر کی مجلسوں، جمعہ کے خطابات اور نمازِ تراویح کے بعد درسِ قرآن کی رُوح پرور محافل میں حاضر ہوتا اور اپنی جھولی کو ایمان وایقان کی طراوت وتازگی سے بھر کر اُٹھتا۔

پروفیسر موصوف 1939ء کے اوائل میں ملتان (پنجاب) کے ایک معزز ونجیب بلوچ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ خوش بختی یہ کہ ساڑھے آٹھ برس کی عمر میں اُنہوں نے قرآن مجید حفظ کر لیا تھا اور نو برس کی عمر میں اپنے ہونے والے سسر اور ماموں جناب حافظ محمد اسلم خان مرحوم جو ملتان کے جانے پہچانے، چوٹی کے وکلاء میں سے تھے، کی راہ نمائی میں پہلا مصلّی سنایا۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے فضل وکرم سے اُس وقت سے لے کر تا حال (75 سال کی عمر تک) بلاناغہ وہ محض رضائے الٰہی کی خاطر تراویح پڑھاتے چلے آرہے ہیں اور عرصہ بیس سال سے سنائیگئی منزل کا ترجمہ اور تفسیر بھی کرتے چلے آرہے ہیں۔ اِس تمام کارِ خیر میں کوئی مالی طمع یا مادّی منفعت نام کو نہیں ہوتے جو ایک ایسی صفت ہے جو آج کے مادّی دَور میں ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ اُن کے والدِ محترم اور نانا جانِ مکرّم۔۔۔رحمت اللہ خان۔۔۔جو ہم نام تھے، دونوں ملتان کے سربرآوردہ مشیرانِ قانون تھے۔

میٹرک سے لے کر ایم اے تک پروفیسر موصوف کا تعلیمی ریکارڈ قابلِ رشک رہا اور بورڈ ریونیورسٹی کے ہر امتحان میں وہ اعلیٰ فرسٹ ڈویژن نمایاں امتیاز کے ساتھ حاصل کرتے رہے۔ 1962ء میں یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور سے ایم اے عربی نمایاں امتیاز میں پاس کرنے کے بعد اُنہوں نے اڑھائی برس تک ولایت حسین اسلامیہ ڈگری کالج، ملتان میں بطور لیکچرار (عربی وعلوم اسلامیہ) تدریسی خدمات انجام دیں

اور مئی 1966ء میں پبلک سروس کمیشن کی طرف سے سرکاری ملازمت ملنے پر گورنمنٹ ڈگری کالج ڈیرہ اسمٰعیل خان (صوبہ سرحد) میں بطور لیکچرار اِن عربک تعینات ہوئے۔ انہوں نے دوسرا ایم اے علوم اسلامیہ میں پنجاب یونیورسٹی سے پرائیویٹ طور پر 1966ء میں فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ گورنمنٹ کالج علی پور اور گورنمنٹ کالج مظفر گڑھ دونوں کالجوں میں ڈیڑھ ڈیڑھ سال بطور عربی لیکچرار خدمات انجام دیں۔ 1969ء میں اُن کا مظفر گڑھ سے گورنمنٹ ایمرسن کالج ملتان میں تبادلہ ہوا جہاں اُن کا عرصہ قیام ساڑھے ستائیس برس کا ہے۔ اُسی کالج سے اُنہوں نے مئی 1997ء میں بطور ایسوسی ایٹ پروفیسر گریڈ 20 میں ڈیڑھ سال قبل از وقت (Pre-mature) ریٹائرمنٹ لی۔

لسانِ عربی پروفیسر موصوف کا شروع ہی سے انتہائی پسندیدہ اور دلچسپی کا مضمون رہا ہے۔ اپنے طالب علمی کے زمانہ ہی سے اُن کی دلی آرزو تھی کہ اَحْکَمُ الْحَاکِمِین کے آخری نسخہ بے بہا۔ قرآنِ مبین۔ کے نوادرات وعجائبات کو طشت از بام کیا جائے اور بھولی بھٹکی انسانیت کو ایک نئی جہت سے مشعلِ راہ دکھائی جائے۔ ملازمت کے دوران کچھ گھریلو ذمہ داریوں اور دیگر مسائل نے اُن کی اِس آرزو کو شرمندہ تعبیر ہونے کا موقع نہ دیا لیکن بندے میں جذبہ صادق اور پُرخلوص لگن ہو تو دستِ غیب خود مدد فرماتا ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد قدرت نے موقع دیا اور اُس وقت (1997ء) سے لے کر اب تک وہ اسی کام کی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں۔ بحمدہٖ تعالیٰ حصّہ انگریزی کی چھ جلدیں چھپ کر منصہ شہود پر آچکی ہیں۔ موجودہ حصّہ ششم اُردو جو حصّہ انگریزی کا ترجمہ ہے' بھی اُسی کاوش کا ایک حصّہ ہے۔

جناب پروفیسر موصوف کی تحریر وتقریر دونوں میں جو خاص بات راقم الحروف نے معلوم کی' وہ یہ کہ ہر دو میدانوں میں وہ کوئی بات بغیر دلیلِ قطعی (Cogent Argument) کے نہیں کرتے۔ اُنہوں نے قرآن مجید کی حقانیت اور عظمتِ رسول ﷺ کو جس مدلّل انداز میں منوایا ہے' وہ کسی عام آدمی کے بس کی بات نہیں۔ اپنے موقف کے ثبوت میں قرآنِ مبین اور احادیثِ مبارکہ کے حوالہ جات اُنہیں نوکِ زباں اور مستحضر ہوتے ہیں۔ قارئینِ کرام زیرِ نظر انسائیکلوپیڈیا میں بھی اُن کا یہی رنگ ڈھنگ جابجا دیکھیں گے۔

فاضل پروفیسر موصوف کو اپنا مخلصانہ خراجِ تحسین پیش کرنے میں میرا ریشِ قلم کانپتا ہے اور خوشی وشادمانی سے صفحۂ قرطاس جھوم جھوم اٹھتا ہے کیونکہ وہ درویش منش بندہ خدا ''عشقِ رسول'' اور ''عشقِ قرآن'' کی مستی میں سرشار' دنیا کی ہوا وہوس سے کوسوں دُور اور نام ونمود اور شہرت سے نفور و بیزار ہے۔ اپنے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے راقم الحروف پروفیسر موصوف کی صحت' ایمان کی سلامتی' طول العمری' اُن کے خانہ اور اہلِ خانہ کی خیر وبرکت کے لئے دعا گو ہے اور یہ کہ اللہ رب العزت اُن کی اِس کاوش کو اپنی بارگاہِ عالیہ میں شرفِ قبول بخشے اور اِسے اُن کے اور اُن کے والدین کے لئے سرمایہ نجات بنائے!! آمین بہ طفیل سید المرسلین ﷺ۔

۱۹ جمادی الاوّل ۱۴۳۵ھ

21 مارچ 2014ء

Ramzan

محمد رمضان چوہدری (انجینئر)

''قرآنک انسائیکلوپیڈیا'' اور اُس کے مصنّف کے بارے میں

[کراچی سے محترم ڈاکٹر علی اکبر صاحب (چیئر مین سندھ ڈویلپمنٹ فاؤنڈیشن) نے زیرِ نظر انسائیکلوپیڈیا اور اس کے مؤلّف کی بابت اپنے تاثرات بہ زبانِ انگریزی لکھ بھیجے جو ہمیں اُس وقت موصول ہوئے جب اردو ترجمہ کی جِلد پنجم چھپ کر مکمل ہو چکی تھی۔ تاہم اِن تاثرات کا اُردو ترجمہ جلد ششم میں ہدیہ قارئین کیا جا رہا ہے۔]

''دی قرآنک انسائیکلوپیڈیا'' کے مصنّف و مؤلّف پروفیسر اشفاق احمد خان شہرِ ملتان کے بلوچ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جہاں اُن کی پیدائش 1939ء میں ہوئی۔ ملتان ہی میں اُنہوں نے آٹھ سال کی کم عمری میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا اور نو سال کی عمر میں رمضان المبارک میں تراویح کی امامت کی تربیت اپنے ماموں اور ہونے والے سسر حافظ محمد اسلم خان کی رہنمائی میں حاصل کی جو ملتان کے نامور وکلاء میں سے تھے۔ پروفیسر موصوف کے والدِ گرامی رحمت اللہ خان اور اُن کے نانا جان ماہر قانون دان تھے۔ پروفیسر صاحب نے میٹرک سے لے کر ایم اے (عربی وعلومِ اسلامیہ) تک تمام امتحان اعلیٰ فرسٹ ڈویژن میں نمایاں امتیاز کے ساتھ پاس کئے۔ اُنہوں نے اکتوبر 1963 سے مئی 1966 تک ولایت حسین اسلامیہ ڈگری کالج ملتان میں بطور عربی لیکچرار تدریسی خدمات انجام دیں اور مئی 1966 میں سرکاری ملازمت ملنے پر گورنمنٹ کالج ڈیرہ اسماعیل خان (صوبہ سرحد) میں تعینات ہوئے۔ ون یونٹ ٹوٹنے پر اُن کا تبادلہ اکتوبر 1966 میں گورنمنٹ کالج علی پور (ضلع مظفر گڑھ۔ پنجاب) میں ہوا۔ علی پور میں ڈیڑھ سال قیام کے بعد اپریل 1968ء میں وہ وہاں سے گورنمنٹ کالج مظفر گڑھ میں منتقل ہوئے اور اکتوبر 1969ء میں اُن کا تبادلہ گورنمنٹ ایمرسن کالج ملتان میں بہ حیثیت لیکچرار عربی وعلومِ اسلامیہ ہوا جہاں وہ 1997 میں اپنی ریٹائرمنٹ تک بہ حیثیت ایسوسی ایٹ پروفیسر تک رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اُنہوں نے اپنی دیرینہ نیک خواہش کی تکمیل میں زیرِ نظر ''انسائیکلوپیڈیا'' پر کام کا آغاز کیا جس میں اللہ کے آخری کلام -- قرآنِ حکیم -- کے نوادرات و عجائبات کو منصّہ شہود پر لایا گیا ہے۔ اس کی پہلی جِلد بہ زبانِ انگریزی 2008 میں شائع ہوئی اور اَب مارچ 2012ء تک اس کی کل پانچ جلدیں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکی ہیں۔ امید ہے کہ جِلد ششم بھی انشاء اللہ بہت جلد منظرِ عام پر آ جائے گی۔

جب راقم الحروف نے روزنامہ ''ڈان کراچی'' میں انسائیکلوپیڈیا کی پہلی جلد کا اشتہار دیکھا تو اس کے مصنّف سے ٹیلیفون پر رابطہ قائم کیا اور اُن سے اپنے فرزند حاجی ارباب علی کی معرفت جو ملتان میں این ایچ اے کے جنرل منیجر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں' اُس کی پہلی جِلد خریدی۔ اس کے بعد میں نے ارادہ کر لیا کہ ملتان جانے پر اس عالی دماغ اور دل نواز مصنف کی شرفِ ملاقات سے باریاب ہو کر اُن سے تبادلہ خیال کروں گا۔ میں 16 مارچ 2012ء

میں ملتان گیا اور اپنے فرزند سے اس یگانۂ روزگار مصنف سے ملنے کا ارادہ ظاہر کیا جو مجھے اُن سے وقت لینے پر وہاں اُن کی رہائش گاہ کو 19 مارچ 2012ء کو رات کے آٹھ بجے لے گیا جو ملتان شہر کی ایک گنجان آباد شاہراہ پر واقع ہے۔

مسٹر لطیف مہیسر (ڈائریکٹر این ایچ اے)، ریٹائرڈ بریگیڈیئر ڈاکٹر اقبال قریشی، میرا فرزند حاجی ارباب میرے ہمراہ تھے۔ ہم نے پروفیسر اشفاق احمد خان کو بہت ہی صاف دل اور صاف گو شخص پایا جنہیں قرآنِ حکیم اور تعلیماتِ اسلام کا وسیع تجربہ اور علم حاصل ہے۔ انہوں نے ازراہِ کرم بڑے کھلے دل و دماغ سے ہمارے سامنے اپنی محنت سے متعلق تمام معاملات و حقائق سے پردہ اٹھایا اور ہمیں بتایا کہ پانچ ضخیم جلدوں کو اُنہوں نے بہ زبانِ انگریزی پانچ سال کے مختصر عرصہ میں مکمل کیا ہے۔ اِن پانچ جلدوں میں وہ تقریباً 300 عنوانات کو قرآنِ حکیم اور احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں زیرِ بحث لائے ہیں جن کی جلد وار فہرست بہ لحاظ انگریزی حروفِ تہجی حسبِ ذیل ہے:۔

جلد اوّل :

(۱) جمالیات اور قرآنِ حکیم (Aesthetics and the Holy Qur'an)

(۲) علمِ زراعت اور روئیدگی (Agriculture and Vegetation)

(۳) تیز یا ہلکی ہوا (Air and Wind)　(۴) فضائی حملہ (Air Raid)

(۵) علم البشر (Anthropology)　(۶) علمِ آثاریات (Archaeology)

(۷) تیراندازی اور شکاریات (Archery and Hunting)

(۸) فنِ تعمیرات (Architecture)　(۹) انسانی تخلیقی ہنر (Fun)

(۱۰) اللہ تعالیٰ کی کاریگریاں (Artistry of Allah)

(۱۱) علمِ نجوم و جیوتش (Astrology)

(۱۲) علمِ ہیئت ۔۔۔ اجرامِ فلکی کا مطالعہ (Astronomy)

(۱۳) اٹامک انرجی اور قرآنِ حکیم (Atomic Energy and the Holy Qur'an)

(۱۴) محاسبہ و پڑتال اور حساب داری (Audit and Accounts)

(۱۵) ہوابازی (Aviation)　(۱۶) علمِ حیاتیات ۔۔۔ نامی اجسام کا مطالعہ (Biology)

(۱۷) مذہب میں بے حرمتی کی باتیں (Blasphemy)

(۱۸) تجارت اور سوداگری (خرید و فروخت) Business and Commerce

(۱۹) تقویم (Calendaring)　(۲۰) فنِ خطاطی (Calligraphy)

(۲۱) علمِ کیمیا (Chemistry)　(۲۲) علمِ شہریت (Civics)

(۲۳) تہذیب ۔۔۔ سماجی ترقی کی اعلیٰ منزل یا نظام (Civilization)

جلد دوم :

(۵۸) درود و سلام بر محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام (Greetings & Salutations on the Holy Prophet)

(۵۹) حج (Hajj--Pilgrimage)

(۶۰) پردہ (Hijaab)

(۶۱) تاریخ نگاری (Historiography)

(۶۲) گھر ــ جائے قیام (Home)

(۶۳) امورِ خانہ داری (Home Economics)

(۶۴) باغبانی (Horticulture-- Gardening)

(۶۵) مہمان نوازی (Hospitality)

(۶۶) ھود علیہ السلام

(۶۷) انسان دوستی (Humanism)

(۶۸) علم الماء اور آب پاشی (Hydrology & Irrigation)

(۶۹) علمِ حفظانِ صحت (Hygiene)

(۷۰) منافقین (Hypocrites)

(۷۱) عبادت

(۷۲) ابلیس

(۷۳) ابن اُمّ مکتوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ

(۷۴) ابراہیم علیہ السلام

(۷۵) بُت شکنی (Iconoclasm)

(۷۶) عدت

(۷۷) ادریس علیہ السلام

(۷۸) واقعہ افک

(۷۹) اجتہاد

(۸۰) ایلاء

(۸۱) الیاس علیہ السلام

(۸۲) زنا بالمحارم اور دیگر ممنوعہ نکاح (Incest and other Prohibited Marriages)

(۸۳) علم المیراث (Inheritance)

(۸۴) بیمہ (Insurance)

(۸۵) عقیدۂ شفاعت (Intercession)

(۸۶) عقیدۂ توسّل (Intermediation)

(۸۷) بین الاقوامی تعلقات اور خارجہ پالیسی (Internationl Relations & Foreign Policy)

(۸۸) عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کی والدہ مریم سلام اللہ علیہا

(۸۹) اسلام (Islam)

(۹۰) اسلامی کردار

(۹۱) اعتکاف

(۹۲) حسد اور رشک

(۹۳) جبریل علیہ السلام

(۹۴) الجہاد فی الاسلام

(۹۵) صلہ رحمی (Joining of Womb Relations)

(۹۶) صحافت (Journalism)

(۹۷) عدلیہ (Judiciary)

(۹۸) فقہ اسلامی (Jurisprudence)

(۹۹) کعبۃ اللہ

(۱۰۰) کرما (ہندو عقیدہ)

(۱۰۱) خضر علیہ السلام

(۱۰۲) خلع

جلد سوم :

(۱۴۲) اصحاب فہم وذکاء (Men of Understanding and Wisdom)
(۱۴۳) دھات کاری (فلزیات) اور علمِ معدنیات (Metallurgy and Mineralogy)
(۱۴۴) علم مابعد الطبیعیات (Metaphysics)
(۱۴۵) موسمیات (Meteorology)

جلد چہارم:

(۱۴۶) معجزات (Miracles)
(۱۴۷) مباہلہ
(۱۴۸) رہبانیت (Monasticism)
(۱۴۹) مالی معاملات (Monetary Affairs)
(۱۵۰) موسیٰ اور ہارون علیہما السلام
(۱۵۱) حروفِ مقطعات
(۱۵۲) اَخلاقی اقدار
(۱۵۳) مسجد
(۱۵۴) فوت شدگان پر نوحہ
(۱۵۵) متحرک فلمی تصاویر (Movies)
(۱۵۶) محمد ﷺ
(۱۵۷) محکمات، متشابہات
(۱۵۸) موسیقی اور اسلام
(۱۵۹) مسلم اور مؤمن
(۱۶۰) نسخِ قرآن
(۱۶۱) معراجِ مصطفیٰ ﷺ
(۱۶۲) لیلۃ القدر
(۱۶۳) نوح علیہ السلام
(۱۶۴) اعداد اور گنتی (Numbers and Enumeration)
(۱۶۵) علم الاعداد اور قرآنِ حکیم (Numerology in the Qur'an)
(۱۶۶) حلف (قسم) اور دروغ حلفی (Oath and Perjury)
(۱۶۷) علمِ بحریات (Oceanography)
(۱۶۸) شگون (Omen)
(۱۶۹) ظلم وزیادتی اور جبر (Oppression)
(۱۷۰) علم الطیور (Ornithology)
(۱۷۱) یتامیٰ (Orphans)
(۱۷۲) جوڑے اور جوڑے بنانا (Pairs and Pairing)
(۱۷۳) سلسلہ نسب بذریعہ تبنیت (Parentage by Adoption)
(۱۷۴) نبی اکرم ﷺ کے والدین کریمین
(۱۷۵) تضمینِ قرآن (قرآن کی نقالی (Parody of the Qur'an
(۱۷۶) وفورِ جذبات اور کھوکھلی آرزوئیں (Passions and Vain Desires)
(۱۷۷) دیہی زندگی (Pastoral Life)

جلد پنجم:

(۲۰۳) علم نفسیات(Psychology)

(۲۰۴) اسلام میں تعزیرات اور سزائیں(Punishments in Islam)

(۲۰۵) عذابِ قبر(Punishment in the Grave)

(۲۰۶) قبلہ (۲۰۷) قرآنِ حکیم

(۲۰۸) قرآنِ حکیم اور حالاتِ حاضرہ کی للکار(The Quran & the Contemporary Challenges)

(۲۰۹) رَب (Rabb)

(۲۱۰) نسلی امتیاز اور اسلام (Racial Discrimination and Islam)

(۲۱۱) نارِ جہنم کا غیظ وغضب (Rage and Fury of Hell)

(۲۱۲) تفریحی مشغلے اور ورزشی کھیل(Recration, Sports and Games)

(۲۱۳) اسلام میں خوشی منانے کا تصور(Rejoicing in Islam)

(۲۱۴) مذہب(Religion)

(۲۱۵) یادِ الٰہی(Remembrance of Allah)

(۲۱۶) باقیات وآثار(Remnants)

(۲۱۷) معجزہ شق القمر(Renting Asunder of the moon)

(۲۱۸) تحقیق اور قرآنِ حکیم (۲۱۹) وحی(Revelation)

(۲۲۰) قرآنِ حکیم کی فصاحت وبلاغت(Rhetoric of the Holy Quran)

(۲۲۱) نثرِ مسجّع(Rhymed Prose)

(۲۲۲) صالحیت اور راست پسندی(Righteousness)

(۲۲۳) حقوقِ معذوراں : حقوقِ بزرگاں(Rights of Disabled Persons & Senior Citizens)

(۲۲۴) رسوم ورواج اور قرآنِ حکیم(Rituals and the Holy Qur'an)

(۲۲۵) رومانویت(Romanticism)

(۲۲۶) صلوٰۃ الخوف (۲۲۷) صالح علیہ السلام

(۲۲۸) تقدسِ عزت وآبرو، حیاتِ انسانی اور مال وجائداد نیز اقلیتوں کے حقوق

(۲۲۹) طالوت(Saul)

(۲۳۰) سائنس اور قرآن(Science and the Qur'an)

(۲۳۱) موسم(Seasons) (۲۳۲) بحری جنگ وجدل(Sea-Warfare)

(۲۳۳) فرقہ واریت(Sectarianism) (۲۳۴) لادینیت(Secularism)

(۲۳۵) جذباتیت(Sentimentalism)

(۲۳۶) خدمتِ خلق(Service to Humanity)

(۲۳۷) جنسی ضابطےاور قرینے(Sex Hygiene) (۲۳۸) شب برأت

(۲۳۹) پناہ گاہ (Shelter)

(۲۴۰) قرآنِ حکیم میں تشبیہات(Similes in the Holy Qur'an)

(۲۴۱) معصیت(گناہ(Sin (۲۴۲) شعریٰ ستارہ (Sirius)

(۲۴۳)رشتۂ ہمشیر(Sister) (۲۴۴) ذبحِ حیوانات(Slaughtering of Animals)

(۲۴۵)غلامی اور محکومی(Slavery and Serfdom) (۲۴۶) نیند(Sleep)

پروفیسر موصوف کی رہائش گاہ کے خوب آراستہ ہال کمرہ میں نشست کے دوران ''قرآنک انسائیکلو پیڈیا'' پر اُن کے کام سے متعلق اپنی معلومات و تجربات میں مزید اضافہ کے لئے ہم نے اُن سے حسب ذیل چند سوالات کئے:

اپنے پہلے سوال میں میں نے اُن سے کسی ایسے واقعہ کے متعلق پوچھا جو اُنہیں خواب میں نظر آیا ہو تو اُنہوں نے جواب دیا کہ خواب میں نظر آنے والے ایسے متعدد واقعات ہیں ۔اُن میں سے ایک یہ ہے کہ سورۃ الکھف کی آیت ۲۵ کہ ''اصحابِ کہف اپنے غار میں تین سو برس اور نو اوپر رہے'' میں عدد معدود کے اس خلافِ معمول معمّہ کے حل میں خواب میں سفید لباس میں مجھے ملبوس بزرگ نظر آئے جنہوں نے بتایا کہ اپنے کالج کی لائبریری میں اِبسن کے انسائیکلو پیڈیا کی فلاں جلد کے فلاں صفحہ پر اس کا جواب موجود ہے کہ تین سو کو علیحدہ اور نو کے عدد کو علیحدہ اس لئے بیان کیا گیا کہ اصحابِ کہف کا اپنی غار میں قیام کا عرصہ شمسی لحاظ سے تین سو اور قمری لحاظ سے اس سے نو اوپر (تین سو نو سال) بنتا ہے۔

دوسرا سوال میرے فرزند ارباب علی نے اُن سے یہ کیا کہ اپنی ریسرچ اور تحقیق کے دوران اُن کی مصروفیت کی نوعیت کیا رہی ہے تو اُنہوں نے جواب دیا کہ اس کام کے دوران وہ اتنے مگن رہے ہیں کہ وہ اکثر اپنی اہلیہ سے پوچھا کرتے کہ آیا اُنہوں نے کھانا کھایا بھی ہے کہ نہیں؟

میرا تیسرا سوال یہ تھا کہ آیا اُنہوں نے اس انسائیکلو پیڈیا کی تمام جلدوں کے اردو ترجمہ کرنے کا بھی کبھی خیال کیا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ انسائیکلو پیڈیا کے اردو ترجمہ کی پہلی جلد تیار ہو چکی ہے جس کی فوٹوسٹیٹ کاپی انہوں نے ہمیں دکھاتے ہوئے کہا کہ انشاء اللہ باقی جلدوں کا ترجمہ بھی بہت جلد ہو جائے گا۔

میرا اُن سے چوتھا سوال اس تجویز پر تھا کہ اُنہیں تمام قرآن مجید کا ترجمہ بھی شروع کرنا چاہئے کیونکہ اُن کا

انسائیکلو پیڈیا قرآنِ حکیم میں مذکور تمام واقعات وحقائق کی مفصل تفسیر وتوضیح پر مشتمل ہے جس کا جواب انہوں نے مثبت میں دیا۔

میرا اُن سے پانچواں سوال یہ تھا کہ آیا اپنی ریسرچ کے سلسلہ میں وہ کبھی جھنڈیر لائبریری (تحصیل میلسی ضلع وہاڑی) بھی گئے تو اُنہوں نے بتایا کہ وہ اس سلسلہ میں نہ صرف اس عظیم لائبریری میں گئے بلکہ علم کے بے بہا' درخشندہ موتی اکٹھے کرنے کے لئے وہ دیگر متعدد لائبریریوں میں بھی گئے ہیں۔

ہماری گفت وشنید اور تبادلہ خیال کے دوران پروفیسر موصوف نے ہماری آؤ بھگت مٹھائی اور کچھ دیگر پُر لطف و پُر ذائقہ تازگی بخش مفرحات سے کی۔ اُنہوں نے ازراہِ کرم اپنا قیمتی وقت ہمیں عنایت کرتے ہوئے قرآن مجید پر اپنی کی گئی تحقیق کے تمام گوشوں پر بحث کا موقع فراہم کیا جس کے لئے ہم نے اُن کے شکرگزار ہیں ور اللہ تعالیٰ سے اُن کی صحت وعافیت اور طویل العمری کے لئے دعا گو ہیں تاکہ وہ اپنے اَبنائے وطن کی بہتری اور روشن خیالی کے لئے زیادہ سے زیادہ کام کریں۔ مہیسر صاحب نے اُن سے انسائیکلو پیڈیا کی اوّل دو جلدیں خرید کیں۔ اُن کی دعائیں لیتے ہوئے ہم نے اُن سے اجازت چاہی اور انہیں خدا حافظ کہا اور اللہ کی امان میں رہنے کی دعا دی۔ شب تقریباً بارہ بجے ہم اپنے گھر کو پلٹے۔

19-07-2012

Dr. Ali Akbar Dhakan
Chairman,
Sindh Development Foundation
A-106, Shanti Nagar, Dalmia, Karachi-12
Cell # 0300-3664472
Ph: 021-34980110
Dated:19-07-2012

حمد ہے اُس ربّ العالمین کے لئے جو رحمٰن و رحیم ہے
درود ہے رحمت للعالمین کے لئے جو رؤف و رحیم ہے

اللہ جل مجدہ' نے انسانیت کی راہ نمائی اور کامرانی کے لئے قرآنِ کریم نازل فرمایا۔ یہ صحیفہ بہ یک وقت کتابِ فکر و تدبّر بھی ہے اور معرفت و رموز کا خزانہ بھی۔ اس کا پیغام قلب و نگاہ اور روح و جاں کو یکساں طور پر سیراب کرتا ہے۔ اس کی دعوت و تعلیم سے انسان کو خود شناس بھی بنایا اور خدا شناس بھی۔ یہ کتابِ مقدّس ہر لحاظ سے سراپا اعجاز ہے۔ اِس میں ہر چیز کا واضح بیان ہے۔ اِس نے اپنی فطری جاذبیت' محققانہ انداز' دعوتِ فکر' علمی اہمیت و وسعت اور روحانی سکون و طمانیت کی بنا پر اپنے پرائے' ادیب و فلسفی' عربی و عجمی سب کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس کتاب میں اللہ تعالیٰ نے کسی شے کی کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دَور میں محققین نے مختلف انداز سے اس کتابِ مقدّس کے مختلف علمی و عملی' دینی و دنیاوی' ادبی و سائنسی' معاشی و معاشرتی اور ظاہری و باطنی نکتوں پر اپنے فہم و ادراک کے مطابق کافی کام کیا ہے۔ ایسی ہی ایک پُر اثر کاوش میرے فاضل دوست و مہربان و مربّی محترم جناب پروفیسر اشفاق احمد خان صاحب نے کی ہے۔ قرآن پاک کی مختلف سورتوں میں ایک موضوع سے متعلق آیات کو ایک قرینے سے یکجا کیا ہے اور ایک نئے انداز سے قارئین کو دعوتِ فکر و جستجو دی ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس کتابِ مقدّس کو صرف تلاوت کرنے اور ثواب پانے کی حد تک نہ رکھا جائے بلکہ دنیائے عمل میں تسخیر کی طرف بھی توجہ دی جائے۔

میں دعا گو ہوں کہ ربِّ رحیم و کریم جناب محترم پروفیسر صاحب کی اس سعی و تحقیق کو دنیائے اسلام میں خدمتِ دین کے زمرہ میں قبول فرمائے اور علم کے متلاشیوں کے لئے یہ تحقیقی سرمایہ قائم و دائم رہے بجاہ النبی الامین ﷺ۔

چوں زبانِ حق زبانِ اوست بس — بہترین عہد زمان اوست بس

''آپ ﷺ کی زبان اللہ تعالیٰ کی زبان ہے۔ بہترین زمانہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا زمانہ ہے۔''

حضرت خواجہ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''کلامِ پاک صرف کلام اللہ ہی نہیں بلکہ کلامِ رسولِ مقبول بھی ہے۔ آپ ﷺ کی ہر حرکت، قول و فعل میں قرآن کی تفصیل ہے۔ قرآنِ پاک بذاتِ خود یہ چاہتا ہے کہ اِس کی آیات پر خوب غور و فکر کیا جائے۔

دعا گو

مشتاق احمد
(ر) ایسوسی ایٹ پروفیسر۔ شعبہ سیاسیات
گورنمنٹ ایمرسن کالج۔ ملتان

14 دسمبر 2013ء

تعارف (جلد ششم)

(الف) سیّدنا علی کرّم اللہ وجہہ الکریم کا ارشادِ پاک ہے :

جَمِیْعُ الْعِلْمِ فِی الْقُرْآن لٰکِنْ تَقَاصَرَ عَنْہُ أَفْھَامُ الرِّجَالِ

''تمام علوم قرآنِ حکیم میں ہیں لیکن لوگوں کی سمجھ کم ہے ۔''

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے جس کی طرف قرآن مجید راہنمائی نہ کرتا ہو۔ کسی نے پوچھا یہ فرمایئے کہ حاجی کو بحالتِ اِحرام بھڑ مارنا جائز ہے یا نہیں؟ فرمایا: مار سکتے ہو۔ قرآنِ حکیم فرماتا ہے کہ تمہیں جو کچھ رسول ﷺ دے دیں لے لو اور رسول ﷺ فرماتے ہیں کہ تم میری اور میرے خلفائے راشدین کی سنت اختیار کرلو اور سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں : لِلْمُحْرِمِ قَتْلُ الزُّنْبُوْرِ (مُحرم کو بھڑ مار دینا جائز ہے)۔ لہٰذا اس مسئلے کا استنباط بھی قرآنِ پاک سے ہوا (روح المعانی، کبیر)۔

حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین قدس سرّہٗ بفضلہٖ تعالیٰ جامع کمالات تھے۔ علومِ نقلیہ وعقلیہ کے علاوہ خوشنویسی اور علم طب جیسے بہت سے فنون میں اُنہیں پوری مہارت تھی۔ چنانچہ آپ لاٹھی گھمانے اور لاٹھی چلانے کے بھی استاد تھے جسے اہلِ فن ''نبوٹ'' کہتے ہیں۔ ایک بار حضرت کی مجلس میں سورۃ الانعام کی آیتِ کریمہ (۳۸) مَا فَرَّطْنَا فِی الْکِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ (ہم نے اس کتاب میں کوئی چیز نہیں چھوڑی) کی تحقیق ہو رہی تھی۔ کسی نے پوچھا: حضور! کیا قرآنِ پاک میں اِس فن (نبوٹ) کا بھی ذکر ہے۔ فرمایا: اس کا مکمل بیان موجود ہے کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے : فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْھُمْ کُلَّ بَنَانٍ ۝ (الانفال:۱۲) (سو تم کافروں کی گردنوں کے اوپر سے یعنی کھوپڑی پر ضرب لگانا اور اُن کے ایک ایک جوڑ کو توڑ دینا)۔ فرمایا کہ جب دُشمن کو جان سے مارنا ہو تو نبوٹ والا آدمی گردن کے اوپر یعنی کھوپڑی پر مارتا ہے اور اگر کوئی عضو بیکار کرنا ہو تو اُس کے جوڑ پر چوٹ مارتا ہے اور ضربِ حیدری میں ایسی چوٹ ماری جاتی ہے کہ سارے جوڑ بیکار ہو جاتے ہیں۔ اس آیت کریمہ (۳۸) میں اس کا مکمل بیان ہے۔

کسی نے پوچھا: حضرت! قرآن مجید میں کیا علمِ طب بھی ہے؟ فرمایا: علم طب تو بہت سی آیات میں مذکور ہے لیکن ایک آیتِ کریمہ بہت ہی جامع ہے : کُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا (الاعراف:۳۱) (کھاؤ، پیو اور حد سے آگے نہ بڑھو)۔ یعنی کھانے پینے میں زیادتی نہ کرو کہ اَسّی فیصد بیماریاں معدے سے پیدا ہوتی ہیں اور معدہ زیادہ کھانے سے خراب ہوتا ہے۔ کسی نے پوچھا: حضور! قرآن مجید میں قمری مہینوں کا ذکر تو ہے، کہیں شمسی کا بھی ذکر ہے؟ فرمایا: ہاں رب فرماتا ہے : وَلَبِثُوْا فِیْ کَھْفِھِمْ ثَلٰثَ مِائَۃٍ سِنِیْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا (الکھف: ۲۵) (اور اصحابِ کہف اپنی غار میں تین سو برس ٹھہرے رہے اور اُنہوں نے اس پر نو (سال) اور بڑھا دئے)۔ یعنی شمسی حساب سے تین سو سال اور قمری حساب سے تین سو نو سال ہوئے۔ کسی نے پوچھا: حضور! قرآن مجید میں علمِ جغرافیہ بھی ہے؟ فرمایا: ہاں رب تعالیٰ فرماتا ہے : حَتّٰی اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَھَا تَغْرُبُ فِیْ عَیْنٍ حَمِئَۃٍ (الکھف: ۸۶) (ذوالقرنین غروبِ آفتاب (کی سمت آبادی) کے آخری کنارے پر پہنچا تو اُس نے سورج کو دَلدل میں ڈوبتا ہوا پایا)۔ معلوم ہوا کہ سمتِ مغربی میں اتنی بَرف ہے کہ وہاں سمندر برف کا دَلدل بنا ہوا ہے اور سورج اُس میں ڈوبتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

الغرض ایجاز و اعجازِ قرآن کے حوالے سے کائنات کا کوئی علم ایسا نہیں جو قرآن میں موجود نہ ہو۔ کوتاہی ہم میں ہے کہ ہم اس سے ہر شے نکال نہیں سکتے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ نزولِ قرآن کے عہد میں مؤمن و کافر سبھی پر قرآن کا جادو چلا۔ کچھ لوگ قرآنی سحر سے متاثر ہوکر ایمان لے آئے۔ اس کے برعکس کچھ وہ بھی تھے جو قرآن سے مسحور ہوکر اس سے دُور بھاگنے لگے۔ پھر یہ دونوں فریق اپنے اپنے تاثرات بیان کرنے لگے۔ مگر اُن کے تاثرات اُس مسحور اور مخمور آدمی سے زیادہ نہ تھے جنہے یہ معلوم نہ ہو کہ اس عجیب و غریب کلام کی کون سی ادا اُس پر جادو کرگئی اگرچہ وہ بخوبی جانتا ہو کہ اس جادو کی تاثیر اُس کے رگ و پے میں سرایت کرچکی ہے۔ سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ ہی کی مثال لے لیجئے۔ وہ فرماتے ہیں:

''جب میں نے قرآن سنا تو مجھ پر رقت طاری ہوگئی۔ میں رونے لگ گیا اور اسلام قبول کرلیا۔''

ولید بن مغیرہ سلطان الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام اور قرآنِ حکیم دونوں کا منکر تھا اور اس کے ساتھ ساتھ حضور علیہ السلام کا جانی دشمن بھی تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ یہ بات کہنے پر مجبور ہوگیا کہ:

''بخدا قرآن میں شیرینی پائی جاتی ہے۔ یہ تر و تازہ کلام ہے۔ یہ ہر چیز کو مغلوب کرلیتا ہے۔ یہ سب سے ارفع و اعلیٰ ہے اور کوئی بھی چیز اس سے بلند تر نہیں۔''

تلاوتِ قرآن سے اہلِ ایمان اور اہلِ کتاب کے اصحابِ علم جو اثر قبول کرتے ہیں' خود قرآن نے اس کا تذکرہ یوں کیا ہے:

''اس قرآن سے اُن لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ پھر اُن کے اجسام و قلوب اللہ کے ذکر کی طرف مائل ہوجاتے ہیں۔'' (الزُّمَر: ۲۳)

(ب) استغفارِ نبی کے حوالے سے بے ساختہ یہ خیال پریشان کرنے لگتا ہے کہ کیا انبیاء علیہم السلام سے بھی گناہ سرزد ہوتا ہے؟ علامہ قرطبی علیہ الرّحمۃ نے اس مشکل کو حل کیا ہے۔ فرماتے ہیں: اِنَّھُمْ مَعْصُوْمُوْنَ مِنَ الصَّغَائِرِ کُلِّھَا کَعِصْمَتِھِمْ مِنَ الْکَبَائِرِ اَجْمَعِھَا یعنی جمہور فقہاء کا یہ مذہب ہے کہ انبیاء علیہم السلام جس طرح کبیرہ گناہوں سے محفوظ ہوتے ہیں' اُسی طرح صغیرہ گناہوں سے بھی پاک ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں اُن کی مطلق اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ اگر اُن سے گناہ کا ارتکاب ہوسکے تو اُن کے گناہوں کی اطاعت بھی لازم آئے گی جس سے ہدایت کا سارا نظام درہم برہم ہوجائے گا۔ اس پر یہ شبہ وارد ہوتا ہے کہ قرآنِ حکیم میں جابجا انبیاء کی طرف ایسی چیزیں منسوب ہیں جو گناہ ہیں اور پھر ان امور پر انبیاء کی شدید ندامت اور استغفار بھی منقول ہے۔ ایسے میں مطلق عصمت کا قول کیونکر ممکن ہے؟ اس شبہ کے ازالہ کے لئے یہ ہمیشہ ذہن نشین رہے کہ کوئی فعل گناہ اُس وقت ہوتا ہے جب کسی حکم کی نافرمانی کا ارادہ پایا جائے اور اگر ارادہ نہیں ہے بلکہ بلا ارادہ بھول چوک سے کوئی ایسا فعل سرزد ہوجائے جو بظاہر کسی حکم کے خلاف ہو تو اُسے گناہ نہیں کہتے اور ایسے امور کا صدور عصمتِ انبیاء کے منافی نہیں۔ مثلاً آدم علیہ السلام کے لئے قرآن مجید نے زَلَّۃ کا لفظ استعمال کیا ہے جس کا معنیٰ بلا ارادہ پاؤں کا پھسل جانا ہے۔ دوسری جگہ قرآن نے بالکل اس حقیقت کو واضح الفاظ میں بیان فرمادیا: فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَہٗ عَزْمًا یعنی

آدم تو بھول گئے تھے اور اُن کا عزم و ارادہ ہرگز نہ تھا۔ جب عزم و ارادہ مفقود ہو تو اُس فعل کو گناہ نہیں کہا جا سکتا۔

(ج) : موسیٰ علیہ السلام کی ملاقات خضر علیہ السلام سے : سیّدنا موسیٰ علیہ السلام کی نبوّت و رسالت تو قرآنِ حکیم سے بالاتفاق ثابت ہے لیکن خضر علیہ السلام جمہور مفسّرین کے نزدیک نبی ہیں اور کچھ نے کہا کہ وہ ولی ہیں۔ اگر اُن کی ولایت پر اعتماد کیا جائے تو دیکھنا یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کئی علوم اور کئی درجوں میں خضر علیہ السلام سے افضل و اعلیٰ ہیں (تفسیر صاوی، جلد ۳، ص ۱۳)۔ تو ایک اعلیٰ و افضل ہستی کو کم افضل ہستی کی تلاش میں بھیجا جا رہا ہے جس میں نکتہ یہ ہے کہ ولی خواہ کتنے ہی اعلیٰ و ارفع مقام پر کیوں نہ ہو، اُس کا عمل اور فعل شریعت نہیں بنتا بلکہ نبی اور رسول کا فعل سنت بنتا ہے اور جب وہ فعلِ نبی سنت بنتا ہے تو شریعت بنتا ہے جس کا انکار کفر ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے چاہا کہ نبی کی طرف سے ولی کی تلاش سنت بن جائے اور اس واقعہ میں دوسرا سبق یہ ہے کہ اولیاء اللہ کے قرب میں موت زندگی سے بدل جاتی ہے جیسا کہ سورۃ الکہف کی آیت ۶۱ میں بیان ہوا : فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا (وہ تلی ہوئی مچھلی زندہ ہو کر) دریا میں سرنگ کی طرح اپنا راستہ بناتے ہوئے (نکل گئی)۔

اس کی دوسری مثال زکریا علیہ السلام اور مریم سلام اللہ علیہا کی ہے۔ زکریا علیہ السلام نبی ہونے کے حوالے سے اللہ کی ولیّہ مریم علیہا السلام سے بہر حال افضل ہیں۔ اب حجرہ نبی کا ہے جس میں اللہ کی ولیّہ عبادت گزار ہیں۔ یہاں توسّلِ مکانی کا ثبوت ہے کہ ولیّہ کی جگہ پر اللہ کا نبی عمر کے بے موسم وقت میں اولاد کا پھل مانگ رہا ہے۔ تو یہ توسّل بالاولیاء سنتِ انبیاء ہو گئی اور جب قرآن اُسے بیان کر دے تو وہ امرِ الٰہی بن گیا جس کا انکار صریحاً کفر ہے۔

پھر یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں نبی، نبی سے توسّل کر رہا ہے بلکہ توسّل بالآثار کیا جا رہا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے فرمایا : اِذْهَبُوا بِقَمِيصِي هٰذَا فَأَلْقُوهُ عَلٰى وَجْهِ أَبِي يَأْتِ بَصِيرًا (یوسف : ۹۳) (میرا یہ کرتہ لے جاؤ، تو اُسے میرے باواجان کے چہرے پر ڈال دینا، وہ بینا ہو جائیں گے۔) نبی کا مقدس کرتہ نبی یعنی اُن کے والدِ ماجد جناب یعقوب علیہ السلام کے چہرۂ انور پر جب ڈالا گیا تو رب اس سے اگلی آیت ۹۶ میں گواہی دے رہا ہے کہ اُسی وقت یعقوب علیہ السلام کی بینائی لوٹ آئی۔ تو توسّل بالآثار کا ثبوت بھی قرآن سے مل گیا۔

قارئینِ کرام! اِس سراپا تقصیر و پُر خطا بندے نے اپنے انسائیکلوپیڈیا کے انگریزی کے ہر چھ حصص اور اردو ترجمہ میں قرآن مجید کی لازوال اور بے مثال تابندگی اور روشنی کو اور صاحبِ قرآن ﷺ کی عظمت و رفعت کو اجاگر کرنے میں پوری کوشش کی ہے لیکن اس کے باوجود طفلِ مکتب ہونے کے ناطے سے میرا دعویٰ ہرگز یہ نہیں کہ یہ کام حرفِ آخر ہے۔ میری نیت تو اپنی عقبیٰ کو سنوارنے کی خاطر یوسف علیہ السلام کے خریداروں میں اُس بڑھیا کی سی ہے جو سوت کی انٹی لے کر وہاں پہنچی تھی اس امید کے ساتھ کہ بارگاہِ ایزدی میں یہی کام میری بخشش کا سامان ہو جائے۔ اس راہ میں میں ابھی دو گام چلا ہوں جبکہ مسافت اور منزلِ مقصود ابھی بُعد البعید ہے جس پر گامزن ہونے کے لئے اصحابِ علم اور تشنگانِ معرفت راستے کو کھلا پا کر طبع آزمائی کر سکتے ہیں۔

المرقوم : ۵ جمادی الثانی ۱۴۳۵ھ، 6 اپریل 2014ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

(۹۵) اعجازِ قرآن کی مختلف وجوہ

''وہ وجوہات جن کے باعث قرآنِ کریم معجزہ ہے اور اُس نے تمام مخالفین کو اس بات سے عاجز کر دیا ہے کہ وہ اس کے مقابلہ میں زیادہ نہیں تو کم از کم اِس جیسی ایک ہی سورت پیش کریں' اُنہیں مختلف انداز سے چیلنج بار بار دیا گیا لیکن کسی کو لب کشائی کی جرأت نہ ہوئی۔ فصاحت و بلاغت کے بلند بانگ دعوؤں کے باوجود وہ یوں ساکت و صامت ہو گئے جیسے اُنہیں سانپ نے سونگھ لیا ہو۔''

''اُن بے شمار وجوہِ اعجاز میں سے صرف چند وجوہات پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے جن کے مطالعہ سے یہ یقین ہو جاتا ہے کہ قرآنِ کریم واقعی اللہ کا کلام ہے اور کسی اِنسان یا بشر کا نتیجہ فکر نہیں ہے۔''

(1) ایجاز : قرآنِ کریم کے معجزہ ہونے کی ایک وجہ ایجاز ہے اور ایجاز کا مفہوم علمائے معانی نے یہ بیان کیا ہے: اَلْاِیْجَازُ قِلَّۃُ اللَّفْظِ وَ کَثْرَۃُ الْمَعَانِیْ

''الفاظ کی تعداد بہت کم ہو' اس کے باوجود اُس کے دامن میں لطائف و حِکم کے جو سمندر ٹھاٹھیں مار رہے ہوں' وہ بیکراں ہوں۔''

یعنی چند الفاظ میں کثیر التعداد معانی کو سمو دیا گیا ہو۔ مثال کے طور پر یہ آیتِ قرآنی ملاحظہ ہو:

وَلَکُمۡ فِی الۡقِصَاصِ حَیٰوۃٌ'' (البقرۃ: ۱۷۹)

''اور خون کا بدلہ لینے میں تمہاری زندگی ہے۔'' (۲:۱۷۹)

''اس میں صرف تین لفظ ہیں لیکن اس میں جو معانی و معارف بیان کئے گئے ہیں' اُن کی کوئی انتہا نہیں۔ اِن کلمات میں قاتل کی سزا بھی بیان کر دی اور اس میں جو حکمتیں مضمر ہیں' اُن کو بھی واضح انداز سے بیان کر دیا گیا۔''

مفتی احمد یار خان گجراتی لکھتے ہیں کہ یہ آیت انتہائی فصیح و بلیغ ہے کہ قصاص کو جو کہ موت ہے' زندگی کا ظرف بنایا گیا۔ جاہلی عرب اس مضمون کو یوں ادا کرتے تھے کہ اَلۡقَتۡلُ اَنۡفٰی لِلۡقَتۡلِ (قتل قتل کو مٹاتا ہے) اور اس کی فصاحت پر ناز کرتے تھے مگر قرآن کے اِس جملہ نے تمام فصحائے عرب کو حیران کر دیا کہ دیکھو کتنا کامل کلام ہے! یوں کہ (۱) وہ عبارت بڑی تھی جس میں چودہ حروف تھے۔ قرآنی عبارت اُس سے چھوٹی۔ (۲) اُس عبارت میں لفظِ ''قتل'' مکرر تھا جبکہ آیت میں یہ نہیں۔ (۳) اُس کا مضمون بھی غلط جبکہ آیت کا مضمون صحیح ہے کیونکہ ہر قتل قتل کو نہیں مٹاتا بلکہ ظلماً قتل تو اُسے بڑھاتا ہے جبکہ ہر قصاص قتل کو مٹاتا ہے۔ (۴) اُس میں فقط قتل کا ذکر ہے۔ قصاص میں قتل و

زخم وغصب مال سب ہی شامل ہیں۔ (۵) اُس میں یہ بتایا گیا کہ قتل، قتل کو مٹائے۔ یہاں فرمایا گیا کہ قصاص زندگی بخشے یعنی موت اپنی ضد کا سبب ہے۔ (۶) وہ عبارت ہیبت ناک ہے کہ اُس میں موت ہی کا ذکر ہے۔ آیت میں نیک فال ہے کہ اس میں زندگی کا ذکر ہے۔'' (تفسیر نعیمی، جلد۲، صفحات ۱۰۶، ۱۰۷)

''اِس آیتِ کریمہ میں قانونِ قصاص کی علت اور حکمت بیان کی جارہی ہے یعنی اگر بے گناہ شخص کے قتل کرنے والے کو اُس کے جرم کی پوری پوری سزا نہیں دی جائے گی تو اُس کا حوصلہ بڑھے گا اور مجرمانہ ذہنیت کے دوسرے لوگ بھی نڈر ہو کر قتل و غارت کا بازار گرم کر دیں گے۔ لیکن اگر قاتل کو اُس کے جرم کے بدلے میں قتل کر دیا گیا تو دوسرے مجرم بھی اپنا بھیانک انجام دیکھ کر باز آجائیں گے۔ اس طرح ایک قاتل کو قتل کرنے سے بے شمار معصوم جانیں قتل و غارت سے بچ جائیں گی۔''

''آج بعض ملکوں میں قتل کی سزا منسوخ کر دی گئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ سزا ظالمانہ اور بہیمانہ ہے۔ مقتول تو قتل ہو چکا۔ اب اُس کے عوض ایک دوسرے آدمی کو تختۂ دار پر لٹکا دینا بے رحمی نہیں تو کیا ہے؟''

''آپ خوفناک حقائق کو دلکش عبارتوں سے حسین بنا سکتے ہیں لیکن نہ آپ اُن کی حقیقت کو بدل سکتے ہیں اور نہ اُن کے بُرے نتائج کو رُو پذیر ہونے سے روک سکتے ہیں۔ جس ملک کے قانون کی آنکھیں ظالم قاتل کے گلے میں پھانسی کا پھندا دیکھ کر پُرنم ہو جائیں، اُس ملک میں مظلوم و بے کس کا اللہ ہی حافظ ہے۔ وہ معاشرہ اپنی آغوش میں ایسے مجرموں کو ناز و نعم سے پال رہا ہے جو اُس کے چمنستان کے شگفتہ پھولوں کو مسخ کر کے رکھ دیں گے۔ وہ دین جو دینِ فطرت ہے، جو ہر قیمت پر عدل و انصاف کا ترازو برابر رکھنے کا علمبردار ہے، اُس سے ایسی بے جا بلکہ ناز یبا ناز برداری کی توقع عبث ہے۔''

''ادب و لغت کے امام ابوعُبید بیان کرتے ہیں کہ ایک بدو نے ایک شخص کو یہ آیت پڑھتے سنا: فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ (سو آپ اعلان کر دیجئے جس کا آپ کو حکم دیا گیا ہے) [سورۃ الحجر: ۹۴]

''وہ اس کی فصاحت و بلاغت سے اس قدر متاثر ہوا کہ غیر ارادی طور پر سر بہ سجود ہو گیا اور کہا کہ میں نے اس آیت کی فصاحت کے لئے اُس کو سجدہ کیا ہے۔''

''ایک دوسرے اَعرابی نے کسی شخص کو سورہ یوسف کی یہ آیت ۸۰ پڑھتے ہوئے سنا: فَلَمَّا اسْتَيْئَسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا ''پھر جب وہ یعنی برادرانِ یوسف اُن کی طرف سے مایوس ہو گئے تو علیحدہ باہم مشورہ کرنے لگے۔'' تو وہ اَعرابی پکارا اٹھا: اَشْهَدُ اَنَّ مَخْلُوْقًا لَايَقْدِرُ عَلٰى مِثْلِ هٰذَا الْكَلَامِ ''میں گواہی دیتا ہوں کہ کوئی انسان ایسا جملہ زبان پر نہیں لا سکتا۔''

اسی طرح سورۃ القصص کی یہ آیت ملاحظہ ہو:

وَاَوْحَیْنَا اِلٰی اُمِّ مُوْسٰی اَنْ اَرْضِعِیْهِ فَاِذَا خِفْتِ عَلَیْهِ فَاَلْقِیْهِ فِی الْیَمِّ وَلَاتَخَافِیْ وَلَا تَحْزَنِیْ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَیْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ O (القصص : ۷)

''اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی طرف وحی کی کہ بچے کو (بے خوف وخطر) دودھ پلاتی رہو۔ پھر جب اُس کے متعلق تمہیں اندیشہ لاحق ہو تو اُسے دریا میں ڈال دینا اور ہراساں نہ ہونا اور نہ ہی غمگین ہونا۔ یقیناً ہم اُسے تیری طرف لوٹا دیں گے اور ہم اُسے رسولوں میں سے بنانے والے ہیں۔'' (۲۸:۷)

''اس آیت میں مختلف مضامین کو یکجا کر دیا گیا ہے: اس میں دو امر' دو نہی ہیں۔ دو خبریں اور دو بشارتیں ہیں۔ دو امر تو یہ ہیں: اسے دودھ پلاتی رہو' پھر اُسے دریا میں ڈال دو۔ دو نہی یہ ہیں: خوف نہ کرنا، غمگین نہ ہونا۔ دو خبریں یہ ہیں: ہم نے وحی کی۔ جب تمہیں اندیشہ ہو۔ دو بشارتیں یہ ہیں: ہم اُسے تیرے پاس لوٹا دیں گے اور ہم اُن کو رسولوں کے زمرہ میں شامل کر لیں گے۔''

''اِن لطافتوں سے وہی لوگ لطف اندوز ہوتے ہیں جو عربی زبان کے ماہر ہوں۔''

''ایک روز حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ مسجد میں سو رہے تھے۔ اچانک ایک آدمی آپ کے سرہانے کے قریب کھڑا ہو کر کلمہ شہادت پڑھنے لگا۔ اُس کی آواز سے آپ کی آنکھ کھل گئی۔ آپ نے اُس سے پوچھا کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟ اُس نے کہا: میں روم کے پادریوں کا سردار ہوں۔ میں نے ایک روز مسلمان جنگی قیدی کو آپ کی آسمانی کتاب کی یہ آیت پڑھتے سنا:

وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَیَخْشَ اللّٰهَ وَیَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ O (اَلنُّور: ۵۲)

''اور جو شخص اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول مقبول کی اطاعت کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہتا ہے اور (اُس کی نافرمانی سے) بچتا رہتا ہے تو یہی لوگ کامیاب ہیں۔'' (۵۲ : ۲۴)

وہ کہنے لگا: ''میں عربی زبان اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں نے جب یہ آیت سنی اور اس میں غور و فکر کیا تو میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ نے جو کتاب نازل کی' دنیا و آخرت کے بارے میں جو ہدایات اس میں بیان کی گئی ہیں' اُن تمام کا خلاصہ اس آیت میں موجود ہے۔ یہ آیت سن کر اِس کی فصاحت و بلاغت اور جامعیت سے متاثر ہو کر میں حلقہ بگوش اسلام ہو گیا ہوں اور آپ کی زیارت کے لئے حاضر ہوا ہوں۔'' (''السیرۃ النبویۃ'' لزینی دحلان' جلد ۳' صفحہ ۹۹ بحوالہ ''ضیاء النبی'' از کرم شاہ الازہری' جلد ۵' صفحہ ۶۵۵)

''عرب کے بعض فصحاء نے جنہیں اپنی فصاحت و بلاغت پر بڑا ناز تھا' قرآن کریم کے چیلنج کو قبول کرنے

اوراس کے مقابلے میں ایک ہی سورۃ پیش کرنے کی کوششیں بھی کیں لیکن ان سب کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اور وہ ازخود اِس ارادے سے باز آ گئے۔''

''اِن لوگوں کے بارے میں دو تین مثالیں سن لیں تا کہ آپ خود فیصلہ کر سکیں ''چہ نسبت خاک را بہ عالمِ پاک'' کہ خاک کے اِن ذرّوں کو عالمِ بالا کی رفعتوں سے کوئی نسبت نہیں۔''

''اِنہی میں سے ایک مسیلمہ کذّاب ہے جس نے نبوّت کا جھوٹا دعویٰ کیا اور اپنی چرب زبانی اور ملمع سازی سے اپنی قوم کے بے شمار لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ اس نے بھی کوشش کی کہ وہ چند آیات لکھ کر قرآنِ کریم سے اُن کا موازنہ کرے لیکن اس نے بڑی سوچ بچار اور محنت و جانکاہی سے جو فقرے مرتب کئے' اُنہیں لغتِ عرب کا ایک ابتدائی طالب علم بھی سنتا ہے تو اُسے ہنسی آ جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے:

يَا ضِفْدَعُ كَمْ تَنْقَيْنَ اَعْلاَكِ فِي الْمَاءِ وَاَسْفَلُكِ فِي الطِّيْنِ لاَ الْمَاءَ تُكَدِّرِيْنَ وَلاَ الشُّرْبَ تَمْنَعِيْنَ

''اے مینڈک! تو کب تک ٹرّاتا رہے گا؟ تیرا اوپر والا حصہ پانی میں ہے اور تیرا نچلا حصّہ کیچڑ میں ہے۔ نہ تو پانی گدلا کر سکتا ہے اور نہ پانی پینے سے تو منع کر سکتا ہے۔''

''معلوم نہیں اِن بے جوڑ و بے مغز اور مہمل فقرات کو یکجا کرنے کے لئے اُس نے کتنی راتیں جاگ کر گزاری ہوں گی اور نہ جانے اُس نے اپنے کتنے دن ایسے الفاظ کی تلاش میں گزارے ہوں گے جن سے وہ ایسے چند فقرے بنائے اور قرآنِ کریم کا مقابلہ کرنے کا دعویٰ کرے۔ آپ ان الفاظ کو دیکھیں' اُن کے معانی میں غور کریں۔ وہاں انسان کی روحانیت اور کلامِ الٰہی کی افادیت کا نام و نشان تک نہیں تو پھر اُس کی یہ یاوہ گوئیاں قرآنِ کریم کی فصاحت و بلاغت کا کیونکر مقابلہ کر سکتی ہیں بلکہ اِن بے جوڑ جملوں اور لغو الفاظ کو قرآن کریم سے مقابلہ کرنے کے لئے پیش کرنا فصاحت و بلاغت کی توہین ہے۔''

''ایک بار مسیلمہ نے قرآن کریم کی سورۃ النّازعات سنی تو پھر اس کی باسی کڑاہی میں ابال آیا اور اس سورہ پاک کا مقابلہ کرنے کے لئے اُس نے اپنا زورِ قلم آزمانے کی دوبارہ حماقت کی۔ سورۃ النازعات کی پہلی چند آیات اور اُن کا ترجمہ آپ ذہن نشین کر لیں اور پھر مسیلمہ کذّاب کی اس ہرزہ سرائی کا مطالعہ کریں تو آپ کو اُبکائیاں آنے لگیں گی۔ ربّ العرش العظیم کا کلام ملاحظہ ہو۔ فرمایا:

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًاO وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًاO وَالسّٰبِحٰتِ سَبْحًاO فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًاO فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًاO يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُO تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُO قُلُوْبٌ يَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌO اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌO

''قسم ہے فرشتوں کی جو غوطہ لگا کر جان کھینچنے والے ہیں اور بند آسانی سے کھولنے والے ہیں اور تیزی سے تیرنے والے ہیں۔ پھر تعمیلِ ارشاد میں دوڑ کر سبقت لے جانے والے ہیں۔ پھر حسبِ حکم ہر کام کا انتظام

کرنے والے ہیں۔ جس روز تھرتھرانے والی تھرتھرائے گی' اس کے پیچھے ایک اور جھٹکا ہوگا۔ اُس دن کتنے دل خوف سے کانپ رہے ہوں گے اور اُن کی آنکھیں ڈر سے جھکی ہوں گی۔'' (۱۔۹ : ۷۹)

''کلامِ الٰہی کی اِن آیات میں آپ نے آیات کی شانِ اعجاز اور اُن میں جمال وجلالِ خداوندی کی جھلک کا مشاہدہ کیا۔ اب اس کذاب و دجّال مسیلمہ کا کلام سنئے جو اُس نے قرآنِ کریم کی اس سورت کا مقابلہ کرنے کے لئے پیش کیا۔ وہ کہتا ہے:

وَالزَّارِعَاتِ زَرْعًا۔ وَالْحَاصِدَاتِ حَصْدًا۔ وَالذَّارِيَاتِ قَمْحًا۔ وَالطَّاحِنَاتِ طَحْنًا۔ وَالْحَافِرَاتِ حَفْرًا۔ وَالثَّارِدَاتِ ثَرْدًا۔ وَاللَّاقِمَاتِ لَقْمًا۔ لَقَدْ فُضِّلْتُم عَلٰى اَهْلِ الْوَبَرِ وَمَاسَبَقَكُمْ اَهْلُ الْمَدَرِ۔ اِلٰى غَيْرِ ذٰلِكَ مِنَ الْهَذْيَانِ۔

''ازراہِ انصاف خود ہی فیصلہ کیجئے کہ یہاں فصاحت و بلاغت نام کی کوئی چیز ہے؟ اور کیا دیوانے کی اس بڑ کو کلامِ الٰہی کی سراپا دانش وحکمت آیات سے کوئی دُور کی نسبت بھی ہے؟''

''اسی زمرہ کے ایک اور احمق نے سورۃ الفیل کا مقابلہ کرنے کے لئے بڑی مغز ماری کے بعد چند جملے لکھے جن میں معنویت اور بامعنی ہونے کا شائبہ تک نہیں۔ وہ کہتا ہے:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِالْحُبْلٰى۔ خَرَجَ مِنْ بَطْنِهَا نَسَمَةً تَسْعٰى۔ مِنْ بَيْنِ شَرَاسِيْفَ وَاَحْشَاء

''اسی طرح اس کے ایک اور بھائی نے سورۃ الفیل کے مقابلہ کے لئے یہ کلام پیش کیا:

اَلْفِيْلُ مَاالْفِيْلُ۔ وَمَااَدْرٰكَ مَاالْفِيْلُ۔ لَهٗ ذَنَبٌ وَثِيْلٌ۔ وَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ خَلْقِ رَبِّنَا لَقَلِيْلٌ''

(''السيرة النبوية'' لزينى دحلان' ج۳' ص ص ۹۸'۹۹)

''جن لوگوں نے قرآن کریم کا مقابلہ کرنے کا عزم کیا' اُن میں سے ایک اندلس کا ایک مشہور حکیم اور ادیب تھا جس کا نام یحییٰ بن حکیم تھا جو اپنے زمانے میں سارے اندلس میں اپنا کوئی مثل نہیں پاتا تھا۔ ایک سوتیس سال کی عمر میں اُس کی وفات ۲۵۵ھ میں ہوئی۔ اس نے سورۃ الاخلاص جیسی ایک سورت لکھنے کا ارادہ کیا لیکن اس پر کلامِ الٰہی کی ایسی ہیبت اور ایسا رعب طاری ہوا کہ اُس نے اس مقابلہ کے میدان سے ہٹ جانے میں ہی اپنی سلامتی سمجھی۔ آخر کار اُسے یہ اعتراف کرنا پڑا کہ یہ وہ کلام ہے کہ کوئی شخص اس جیسا کلام پیش کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ چنانچہ اپنے اس گناہِ عظیم سے صدقِ دل سے توبہ کی اور ساری عمر قرآن کریم کی رفعتوں اور عظمتوں کے سامنے سرافگندہ رہا۔''

''ابن المقفع نامی ایک شخص جو اپنے زمانے میں عربی زبان کے فصحاء و بلغاء کا سرتاج تصور کیا جاتا تھا' اُس کا زمانہ تابعین کا زمانہ تھا۔ اس نے ارادہ کیا کہ قرآن کریم کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک سورت لکھے گا۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے اُس نے کئی ماہ شبانہ روز محنت کی اور جب اُس نے اپنے خیال کے مطابق ایک سورت کا مسودہ مرتب کرلیا تو

اتفاق سے اُس کا گزر ایک مکتب سے ہوا جہاں بچے قرآن کریم کی تلاوت کر رہے تھے اور تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ جب وہ اُس مکتب کے پاس سے گزرا تو اُس نے ایک معصوم بچے کو اس آیت کی تلاوت کرتے سنا:

وَقِيلَ يَأَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ وَيَسَمَاءُ أَقْلِعِي وَغِيضَ الْمَاءُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ وَقِيلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظَّلِمِينَ O (ھود: ۴۴)

''اور حکم دیا گیا: اے زمین! اپنے پانی کو نگل لے اور اے آسمان! تھم جا اور پانی اتر گیا اور حکمِ الٰہی نافذ ہو گیا اور کشتی جودی پہاڑ پر ٹھہر گئی اور کہا گیا کہ ظالم قوم کے لئے ہلاکت و بربادی ہو۔'' (۱۱ : ۴۴)

''ابن المقفع نے اچانک جب یہ آیت سنی تو دہشت کے باعث اُس پر لرزہ طاری ہو گیا اور کہنے لگا:

أَشْهَدُ أَنَّ هٰذَا مَا هُوَ مِنْ كَلَامِ الْبَشَرِ وَأَنَّ هٰذَا لَا يُعَارَضُ أَبَدًا (''السیرۃ النبویۃ'' لزینی دحلان' ج ۳' ص ۱۰۰)

''میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اس کلام کا مقابلہ کرنا ناممکن ہے۔''

''وہیں سے وہ اپنے گھر لوٹ آیا۔ جو کچھ اُس نے لکھا تھا اُسے مٹا دیا اور جس کاغذ پر لکھا تھا' اُسے ریزہ ریزہ کر دیا۔'' غرضیکہ جامعیت و وسعت' اثر انگیزی اور دلنشینی اور تنوع تمام کی تمام خوبیاں اس آخری صحیفہ مقدسہ میں یکجا کر دی گئی ہیں جس کی دل آویز اور چکا چوند روشنی سے مخالفین کا جذبہ مسابقت جواب دے گیا۔

(2) ''<u>قرآن کریم کے معجز ہونے کی دوسری وجہ</u> : قرآن کریم کی دوسری امتیازی شان جس نے اُسے بے نظیر اور بے مثال بنا دیا ہے اور میدانِ فصاحت کے شہسواروں کو اس کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا ہے' وہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم اگرچہ اُسی عربی زبان میں ہے جس زبان کے یہ لوگ ماہر شمار کیے جاتے تھے لیکن ان کی تمام اصنافِ کلام میں سے کسی کے ساتھ اس کی دُور کی بھی مماثلت نہ تھی۔ اُن کا کلام نثر میں بھی تھا اور نظم میں بھی تھا۔ لیکن قرآن کریم کی سورتوں کو نہ نظم کہا جا سکتا ہے اور نہ نثر۔ انہی چیزوں کو دیکھ کر اہلِ عرب کی عقلیں حیران و ششدر ہو گئی تھیں اور اُن پر قرآنِ کریم کی ایک ہیبت و وحشت طاری ہو گئی تھی۔ اُنہیں یہ ہمت نہ رہی کہ وہ اس کلامِ بلاغت نظام کا مقابلہ کرنے کا خیال تک بھی دل میں لے آئیں۔ سو جن بدنصیبوں نے اس اکھاڑہ میں اترنے کی سعی مذموم کی' اُنہیں قرآن کریم کی فصاحت نے یوں زمین پر پٹخا کہ اُن میں پھر اُٹھنے کی سکت نہ رہی۔''

(3) ''<u>قرآن کریم کے معجز ہونے کی تیسری وجہ۔۔ اُمورِ غیبیہ پر آگاہ کرنا</u>: قرآنِ کریم کے صفحات اُن آیات سے معمور ہیں جن میں آئندہ رُو پذیر ہونے والے واقعات کی اطلاع دے دی گئی ہے اور وہ واقعات بعینہٖ اُسی طرح رُو پذیر ہو رہے ہیں اور قیامت تک رُو پذیر ہوتے رہیں گے جس طرح قرآنِ کریم نے اُن کا ذکر فرمایا ہے۔ ان واقعات کے وقوع پذیر ہونے سے سالہا سال پہلے اپنے محبوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کو آگاہ کر دیا گیا تھا اور یہ امر اِس حقیقت کی ناقابلِ تردید دلیل ہے کہ یہ اُس ذاتِ اقدس کا کلام ہے جو عالم الغیب والشھادۃ ہے۔ اس کی چند مثالیں ذیل میں ہدیہ قارئین کی جاتی ہیں:۔

(۱) لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ آمِنِيْنَ (الفتح : ۲۷)
''تم مسجدِ حرام میں یقیناً امن وسکون کے ساتھ داخل ہو گے' جس وقت اللہ تعالیٰ چاہے گا۔'' (۴۸:۲۷)

''یہ آیت اُس وقت نازل ہوئی جب نبی مکرّم ﷺ اپنے چودہ سو جاں نثار مجاہدین کو اپنے ہمراہ لے کر عمرہ ادا کرنے کے لئے عازم مکہ ہوئے تھے لیکن کفارِ مکہ نے حدیبیہ کے مقام پر مجاہدینِ اسلام کا راستہ روک لیا اور اعلان کر دیا کہ مسلمانوں کو کسی قیمت پر مکہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ مسلمانوں کو اپنے اِحرام کھولنے پڑے' قربانی کے جو جانور وہ ساتھ لے گئے تھے' وہ واپس لانا پڑے اور بیت اللہ شریف کی زیارت کی حسرتیں دلوں میں لئے واپس جانا پڑا۔ لیکن چند سال بعد ساری دنیا نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کا حبیب ﷺ اپنے دس ہزار مجاہدین کے ساتھ مکہ کی طرف بڑھ رہا ہے اور کسی میں لشکرِ اسلام کا راستہ روکنے اور سرورِ عالم ﷺ کو مکہ مکرمہ میں داخل ہونے سے روکنے کی ہمت نہیں۔ آپ ﷺ بڑی شان وشوکت سے مکہ میں داخل ہوئے۔ مسجدِ حرام میں پہنچنے پر بیت اللہ شریف کی زیارت سے اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کیا' طواف کیا' عمرہ کی سعادت حاصل کی' اپنی مرضی سے اِحرام کھولا اور پورے امن وامان سے سارے ارکان ادا کرنے کے بعد بخیریت واپس تشریف لے آئے۔ اپنوں اور بیگانوں سب نے دیکھا اور اس بات کی گواہی دی کہ فرمودۂ الٰہی پورا ہو کر رہا۔''

(۲) وَهُمْ مِّنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ○ (الرُّوم : ۳)
''اور ہار جانے کے بعد وہ یقیناً غالب آئیں گے۔'' (۳ : ۳۰)

''رومیوں اور ایرانیوں کے درمیان بڑی زبردست جنگ ہوئی۔ کفارِ مکہ کی ہمدردیاں ایرانیوں کے ساتھ تھیں کیونکہ دونوں قومیں بُت پرست تھیں اور مسلمانوں کی ہمدردیاں رومیوں کے ساتھ تھیں کیونکہ وہ بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل پر ایمان لاتے تھے۔ اُن کے مابین جنگ ہوئی جس میں ایرانیوں کو فتح ہوئی اور رومیوں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا جس سے مسلمانوں کو بڑی تکلیف ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی افسردگی اور حُزن وملال کو دُور کرنے کے لئے اُنہیں اس خوشخبری سے خورسند کیا وَهُمْ مِّنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ یعنی اے فرزندانِ اسلام! تم رومیوں کی شکست پر رنجیدہ خاطر نہ ہو' عنقریب تم دیکھو گے کہ اُنہیں غلبہ نصیب ہوگا اور ایرانیوں کو شکستِ فاش ہوگی۔''

''جن حالات میں یہ آیت نازل ہوئی' اُن میں یہ ممکن نظر نہیں آتا تھا کہ ایسا ہوگا کیونکہ ایرانیوں نے خسرو کی قیادت میں بیت المقدس پر حملہ کر کے اُس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ اُنہوں نے عیسائیوں کو شکستِ فاش سے دوچار کیا تھا اور اُن کے ہزاروں سپاہیوں کو لقمۂ اجل بنا دیا تھا حتیٰ کہ رومیوں کی مقدس ترین صلیب بھی ایرانی اٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ اِن حالات میں یہ خوش فہمی نہ ہوسکتی تھی کہ اتنی جلدی حالات یوں پلٹا کھائیں گے کہ ایرانیوں کو شکست ہوگی اور رومی فتح یاب ہوں گے لیکن بڑے قلیل عرصہ کے بعد اللہ تعالیٰ کا ارشاد پورا ہو کر رہا اور نبی مکرّم رؤف ورحیم نے اپنے رب کریم کی طرف سے جو مژدہ سنایا تھا' عملی طور پر اُس کی تکمیل ہوگئی۔''

''اِن حالات میں رومیوں کی فتح کی خبر دینا کسی انسان کے بس کی بات نہیں تھی بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس ہی تھی جو حال و مستقبل کو جانتا ہے' جو شکست کو فتح اور فتح کو شکست میں تبدیل کرنے کی قوت رکھتا ہے۔ اس آیت میں جو پیش گوئی کی گئی تھی' اس سے بھی واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام کسی انسان کا نہیں بلکہ اُس خداوندِ قدوس کا ہے جو عالم الغیب والشھادۃ کی شان کا مالک ہے۔''

(۳) هُوَالَّذِیٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَه' بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَه' عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ O (التوبة : ۳۳)

''وہی قادرِ مطلق ہے جس نے اپنے رسول کو (کتاب) ہدایت اور دینِ حق دے کر بھیجا تاکہ اُسے تمام دینوں پر غالب کردے اگرچہ یہ (غلبہ) مشرکوں پر ناگوار گزرے۔'' (۹ : ۳۳)

''اِس آیتِ کریمہ میں بھی دینِ اسلام کے غلبہ اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کی شاندار کامیابی کی خوشخبری دی گئی ہے۔ جو ایسے حالات میں دی گئی جب بظاہر مسلمانوں کی کامیابی کے امکانات صفر کے برابر تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے نہتّے' کمزور اور قلیل التعداد مسلمانوں کو غلبہ عطا فرما کر اپنے قول کی صداقت پر مُہرِ تصدیق ثبت کردی۔''

(۴) سورۃ النّور کی آیت ۵۵ میں اللہ تعالیٰ فرزندانِ اسلام کو خلافتِ راشدہ کے معرضِ وجود میں آنے کی بشارت دے رہا ہے اور فرما رہا ہے:

وَعَدَاللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَیُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَهُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِكُوْنَ بِیْ شَیْئًا (النّور : ۵۵)

''تم میں سے جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں' اُن سے اللہ وعدہ کرتا ہے کہ اُنہیں زمین میں حکومت عطا کرے گا جیسا کہ اُن سے پہلے لوگوں کو حکومت دے چکا ہے اور جس دین کو اُن کے لئے پسند کیا ہے اُسے اُن کے واسطہ سے قوت دے گا اور اُن کے خوف کے بعد اُسے امن میں تبدیل کردے گا (بشرطیکہ) میری عبادت کرتے رہیں اور کسی کو میرا شریک نہ بنائیں۔'' (۲۴ : ۵۵)

''اُس وقت مسلمان مشرکین کے ظلم وستم کی چکی میں پس رہے تھے۔ ہر وقت مسلمانوں کو یہ اندیشہ پریشان کر رہا تھا کہ کسی وقت بھی لات وہُبل کے پجاری اپنے لشکرِ جرار کے ساتھ اُن پر حملہ آور ہو کر اُنہیں نیست و نابود کر کے رکھ دیں گے۔ یہ مژدۂ جانفزا اُن حالات میں سنایا گیا جبکہ اس کے وقوع پذیر ہونے کا بظاہر کوئی امکان نہیں تھا لیکن سارے عالم نے دیکھا کہ محمد عربی ﷺ کے خداوندِ عزّ وجلّ نے جو فرمایا تھا' وہ پورا ہو کر رہا۔ مسلمانوں کی خلافت قائم ہو کر رہی جس کا پرچم تین برِّ اعظموں میں لہرا رہا تھا اور جہاں بھی یہ پرچم لہرایا' وہاں عدل وانصاف کا بول بالا ہوا اور علم ومعرفت کے دریا بہنے لگے۔''

(۵) اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ O وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا O فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَاسْتَغْفِرْہُ اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا O (اَلنَّصر: ۱-۳)

''جب اللہ کی مدد آ پہنچے اور فتح نصیب ہو جائے اور آپ لوگوں کو دیکھیں کہ وہ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہو رہے ہیں' تو اُس وقت اپنے رب کی حمد کرتے ہوئے اُس کی پاکی بیان فرمایئے اور (اپنی امت کیلئے) بخشش طلب کیجئے۔ بے شک وہ بہت توبہ قبول کرنے والا ہے۔'' (۱-۳ : ۱۱۰)

''جس مدد اور فتح کی نوید سنائی گئی' وہ ہجرت کے دس سال بعد وقوع پذیر ہوئی۔ وہ ہادیٔ برحق علیہ الصلوٰۃ والسلام جو چند سال قبل فقط اپنے یارِ غار صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی معیّت میں مکہ سے نکلا تھا' وہ صرف دس سال بعد مجاہدینِ اسلام کا ایک لشکرِ جرار لے کر مکہ کی طرف پیش قدمی کر رہا ہے۔ لشکرِ اسلام کی ہیبت سے زمین کانپ رہی ہے' پہاڑوں پر لرزہ طاری ہے۔ آج کسی کو مزاحمت کی جرأت نہیں۔ مکہ کے سارے باشندے مرد' عورتیں' جوان' بوڑھے' بچے بالے اس نبی برحق کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے سڑکوں پر' گلیوں میں' چھتوں پر' صحنوں میں قطاریں باندھ کر کھڑے تھے اور اس جمالِ جہاں آرا کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے بڑی بے تابی سے چشم براہ تھے۔ وہ لوگ جو اسلام کے مستقبل سے مایوس ہو چکے تھے' وہ اس فتح کے وقوع پذیر ہونے کے بارے میں قطعاً امید نہیں رکھتے تھے۔ آج سب نے دیکھ لیا کہ اللہ کا محبوب ﷺ مکہ میں داخل ہوا اور اسلام کے وہی دشمن جو اَب تک اس شمعِ ہدایت کو بجھانے کے لئے سرگرمِ عمل تھے' وہ آج پروانوں کی طرح اس شمعِ ہدایت پر قربان ہو رہے ہیں۔ جوق در جوق بصد شوق اللہ تعالیٰ کے محبوب کریم کے دستِ ہدایت بخش پر اپنا ہاتھ رکھ کر دولتِ ایمان سے مالا مال ہو رہے ہیں اور اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ کے فلک شگاف نعروں سے مکہ کے در و دیوار گونج رہے ہیں۔''

(۶) اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ O (اَلْحِجر : ۹)

''بے شک ہم ہی نے آپ پر ذکر (قرآن کریم) کو اتارا ہے اور یقیناً ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔''

''چودہ صدیاں بیت گئیں۔ اس عرصہ میں سینکڑوں خونیں انقلابات برپا ہوئے۔ کئی خاندان عزت کے آسمان پر چمکے اور غروب ہو گئے۔ کئی بستیاں آباد ہوئیں اور اجڑ گئیں۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ فرمایا تھا' اُس کے مطابق کتابِ مقدس کی حفاظت فرمائی۔ بڑی بڑی اسلام دشمن طاقتیں برسرِ اقتدار آئیں اور کوشش کے باوجود اس کے ایک نقطہ کو بھی نہ بدل سکیں اور ربِّ ذوالجلال والاکرام کا وعدہ لَایَاْتِیْہِ الْبَاطِلُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْہِ وَلَا مِنْ خَلْفِہٖ (حٰمٓ السجدۃ : ۴۲) یعنی ''اس میں باطل نہ آگے سے آ سکتا ہے اور نہ پیچھے سے'' پورا ہو کر رہا۔ ☆ کیا یہ بات اس دعویٰ کی روشن دلیل نہیں کہ جس نے یہ آیت نازل کی' وہ کوئی انسان نہیں بلکہ ساری کائنات کا خالق و مالک ہے اور اُس نے جو وعدہ فرمایا' دنیا کی کوئی طاغوتی طاقت اُس کے خلاف نہیں کر سکتی۔ جس نے اِس کتاب کو اتارا' وہی اُس کی ہر تحریف اور ہر تغیر و تبدل

☆ بعض علمائے راسخین نے یہیں سے یہ نکتہ بھی نکالا ہے کہ اس طرح قرآن سے تمسک کرنے والے بھی باطل سے محفوظ رہتے ہیں۔ (تفسیر ماجدی اردو' صفحہ ۹۶۱' نوٹ: ۴۱)

سے حفاظت کرنے والا ہے۔ قرآن کریم کے کلامِ الٰہی ہونے کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے!''

(۷) سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَO (القمر: ۴۵)
''یہ جماعت (کفار) عنقریب پسپا ہوگی اور وہ پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے۔'' (۴۵ : ۵۴)

''یہ آیت کریمہ غزوہ بدر سے سات سال پہلے نازل ہوئی جبکہ مسلمانوں کی تعداد بہت قلیل تھی اور مکہ کے رؤساء اُن پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ رہے تھے۔ اس وقت قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب مکرّم ﷺ کو آگاہ فرمایا کہ عنقریب یہ لوگ پسپا ہو جائیں گے اور پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے۔ ان حالات میں کیا کوئی شخص یہ تصوّر کر سکتا تھا کہ قریشِ مکہ جن کی سطوت و شوکت کے سامنے تمام عرب قبائل اپنے سر جھکا دیا کرتے تھے' جن کے نوجوان شجاعت اور جنگی مہارت میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے' جن کے پاس اسلحہ کے انبار تھے اور خورد و نوش کے سامان سے گودام بھرے ہوئے تھے' کیا یہ لوگ بے کس اور نہتے اور معدودے چند مسلمانوں سے عبرتناک شکست کھا کر میدانِ جنگ سے راہِ فرار اختیار کریں گے۔ لیکن قرآن کریم نے جو اطلاع اپنے نبی مکرم ﷺ کو دی تھی اور جو بشارت اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب علیہ السلام کے غلاموں کو ارزانی فرمائی تھی' وہ پوری ہو کر رہی اور سارے جہان نے دیکھا کہ مغرور قریشِ مکہ اپنے ستّر بہادروں کے لاشے میدانِ جنگ میں چھوڑ کر اور ستّر برآوردہ افراد کو اسیرانِ جنگ کی حیثیت سے مسلمانوں کے قبضہ میں چھوڑ کر بھاگے اور ایسے بھاگے کہ پھر کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔''

(۸) قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللهُ بِأَيْدِيكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَO (التوبة: ۱۴)
''ان (کافروں) سے جنگ کرو۔ اُنہیں اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھوں سے عذاب دے گا' اُنہیں رسوا کرے گا اور اُن کے مقابلہ میں تمہاری مدد کرے گا اور اس جماعت کے سینہ کو یوں صحت مند کر دے گا جو اہلِ ایمان ہیں۔'' (۱۴ : ۹)

''اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو جو اَب تک مشرکینِ مکہ کے پنجۂ استبداد میں طرح طرح کی تکلیفیں برداشت کر رہے تھے اور صبر کا دامن تھامے ہوئے تھے' اُن کو کافروں سے جنگ کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی اور اس کے ساتھ ہی یہ خوشخبری بھی سنا دی کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھوں سے اُنہیں عذاب دے گا' ہر محاذ اور ہر میدانِ جنگ میں وہ ذلیل و رسوا ہوں گے اور اُن کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کی مدد تمہارے شاملِ حال ہوگی۔''

''سارے جہان نے یہ منظر دیکھا کہ بدر سے لے کر آخری غزوۂ تبوک تک جب بھی کفار و مشرکین کی قشونِ قاہرہ نے مسلمانوں کے ساتھ قوّت آزمائی کی' اللہ تعالیٰ نے اُنہیں خائب و خاسر کیا اور اپنے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے غلاموں کے سر پر فتح و کامیابی کا تاج سجایا۔''

(۹) لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ O (آلِ عمران: ۱۱۱)

''سوائے زبان سے ستانے کے وہ تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے اور اگر وہ تمہارے ساتھ لڑیں گے تو تمہاری طرف اپنی پیٹھیں پھیر دیں گے (اور بھاگ جائیں گے) پھر اُن کی مدد نہیں کی جائے گی۔''

''یثرب کے یہودی بڑے اثر و نفوذ کے مالک تھے۔ اُن کے پاس نہ دولت کی کمی تھی اور نہ سامانِ جنگ کی۔ اُن میں بڑے بڑے سورما اور بہادر تھے۔ اُنہوں نے یثرب اور اس کے گرد و نواح میں دُور دُور تک قلعے اور گڑھیاں تعمیر کر رکھی تھیں یہاں تک کہ خیبر کی دُور دراز آبادیوں میں اُن کے کئی مستحکم قلعے تھے۔ اُن کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ وہ غریب الوطن' بے سروسامان مٹھی بھر مسلمانوں کو مٹا کر رکھ دیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے محبوبِ مکرّم ﷺ اور اُن کے صحابہ کرام کو واضح طور پر بتا رہا ہے کہ یہودی بایں ہمہ قوت و سطوت کبھی تم پر غالب نہیں آ سکتے۔ زیادہ سے زیادہ وہ زبان درازی' فتنہ طرازی اور بہتان تراشی سے تمہارے دلوں کو دکھ پہنچا سکتے ہیں اور اگر اُنہوں نے جی کڑا کر کے میدانِ جنگ میں آنے کی ہمت کی بھی تو شکست کھا کر پاؤں سر پر رکھ کر بھاگ جائیں گے۔ دنیا نے دیکھا کہ اگرچہ ظاہری حالات مسلمانوں کے ناموافق تھے لیکن قرآن کریم نے جو پیش گوئی کی تھی وہ پوری ہو کر رہی۔''

(۱۰) اِنَّ الَّذِىْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ (القصص: ۸۵)

''جس اللہ نے آپ پر قرآن کو فرض کیا ہے' وہ آپ کو آپ کے وطن میں پہنچا کر رہے گا۔'' (۲۸:۸۵)

''یعنی اُس وقت آپ آزاد' غالب اور صاحبِ حکومت ہوں گے۔ یہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تسلی میں اُس وقت ارشاد ہوا جب ہجرت کے بعد مفارقتِ وطن سے آپ کو طبعی صدمہ ہو رہا تھا۔ کیا ربِّ ذوالجلال والاکرام نے اپنے حبیب علیہ السلام کو مکہ کی شاندار فتح کی صورت میں اُن کے وطنِ مالوف مکہ میں پہنچا کر شاد کام کر کے اپنا وعدہ پورا نہیں کر کے دکھایا؟''

(۱۱) وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (المائدۃ: ۶۷)

''اللہ تعالیٰ تمام لوگوں (کے شر) سے آپ کو محفوظ رکھے گا۔'' (۵ : ۶۷)

''اعلانِ نبوّت سے پہلے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی قوم کی آنکھوں کا تارا تھے۔ اُن کی زبانیں حضور ﷺ کو ''الصادق'' اور ''الامین'' کہنے سے نہیں تھکتی تھیں۔ لیکن جس روز نبی رؤف و رحیم نے دینِ توحید کی تبلیغ کا آغاز کیا تو حالات یکسر بدل گئے۔ جو لوگ آپ ﷺ کے قدموں میں آنکھیں بچھانا اپنی سعادت سمجھتے تھے' وہ اب خون کے پیاسے ہو گئے۔ مکی زندگی میں بھی آپ علیہ السلام ایسے عیار دشمنوں میں گھرے ہوئے تھے جو آپ کے خون کے پیاسے تھے اور ہجرت کے بعد جب آپ ﷺ مدینہ طیبہ تشریف فرما ہوئے تو وہاں بھی دشمنانِ اسلام جن میں منافقین اور یہودی پیش پیش تھے' اُن کی سازشیں اور منصوبہ بندیاں صرف اِس نقطہ پر مرکوز تھیں کہ جس طرح ہو سکے' اِس آواز کو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا جائے جو اُنہیں ہر لحظہ اللہ وحدہٗ لاشریک پر ایمان لانے کی دعوت دیتی رہتی ہے۔''

''جنگوں کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا۔ سرکارِ دوعالم ﷺ جب استراحت فرما ہوتے تو جاں نثار اور وفادار غلاموں کا ایک دستہ رات بھر حضور علیہ السلام کا پہرہ دیا کرتا لیکن جب سورۃ المائدۃ کی آیتِ مذکورہ نازل ہوئی تو اُس دن سے آپ ﷺ نے پہرہ داروں کو اپنے گھر بھیج دیا اور فرمایا کہ اللہ نے میری حفاظت کی ذمہ داری اُٹھالی ہے اور اب مجھے کسی بداندیش سے کوئی خطرہ نہیں رہا۔ چشمِ فلک نے دیکھا کہ آپ کی حیاتِ طیّبہ میں بڑے بڑے خطرناک لمحات بھی آئے لیکن محبوبِ رب العالمین ﷺ نے ذرّہ بھر پروانہ کی۔ اللہ تعالیٰ کی حفاظت پر کامل اعتماد کرتے ہوئے کبھی حفاظتی تدابیر کی طرف توجہ نہ دی۔ اللہ تعالیٰ نے اس وعدہ کو پورا فرمایا اور بعد میں کوئی دشمن محبوبِ رب العالمین کو کوئی گزند نہ پہنچا سکا۔''

(۱۲) وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ O (البقرۃ: ۱۱۱)

''اُنہوں نے کہا جنت میں کوئی بھی ہرگز داخل نہیں ہوگا سوائے یہودی یا عیسائی کے۔ یہ اُن کی من گھڑت باتیں ہیں۔ اُنہیں فرما دیجئے کہ اگر تم سچے ہو تو کوئی دلیل لاؤ۔'' (۲:۱۱۱)

''یہود کو اپنے دین پر بڑا غرور تھا۔ وہ ڈنکے کی چوٹ پر کہتے کہ جنت میں ان یہود و نصاریٰ کے بغیر کوئی داخل نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اُنہیں شرمسار کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ O وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ (البقرۃ: ۹۴، ۹۵)

''(اے حبیبِ مکرّم!) آپ فرما دیجئے اگر دارِ آخرت کی نعمتیں اللہ تعالیٰ کے ہاں تمام لوگوں کو چھوڑ کر تمہارے لئے مخصوص ہیں تو بھلا موت کی آرزو کرو اگر تم سچے ہو۔ اور وہ ہرگز ہرگز کبھی اس کی آرزو نہیں کریں گے بہ سبب اپنے کرتوتوں کے۔'' (۹۴، ۹۵ : ۲)

''وہ بڑی تمکنت اور وثوق کے ساتھ یہ دعویٰ کرتے تھے کہ دارِ آخرت کی ساری راحتیں، آسائشیں اور عزت افزائیاں صرف اُنہی کے لئے مخصوص ہیں۔ اُن کے اس دعویٰ کی لغویت کو ثابت کرنے کے لئے اُنہیں کہا گیا کہ اس آلام و مصائب سے بھری ہوئی دنیا میں رہنے کی بجائے تم کیوں یہ تمنا نہیں کرتے کہ تمہیں موت آئے اور تم جنت کی ابدی بہاروں کے مزے لوٹنے لگو۔ لیکن کیا مجال کہ وہ اس کی تمنا کریں۔ دنیا کے ساتھ اُن کا اتنا قلبی تعلق ہے کہ وہ کسی قیمت پر اس دارالمحن کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں۔ اسی لئے اعلانِ حق تعالیٰ ہوا کہ وہ ہرگز ہرگز کبھی اس کی تمنا نہیں کریں گے۔ اُن کی کارستانیاں ہر وقت اُن کے سامنے تھیں اور اُنہیں معلوم تھا کہ صرف پلکیں بند ہونے کی دیر ہے، وہ ان کارستانیوں کی سزا بھگتنے کے لئے دوزخ میں پھینک دیئے جائیں گے۔ قرآن کریم نے اعلان کر دیا کہ وہ ہرگز ہرگز یہ تمنا نہیں کریں گے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ وہ تمنا کرتے اور مجمع عام میں اپنے مرنے کی دعا مانگتے اور قرآن کریم کی اس پیش گوئی کو باطل ثابت کر کے لوگوں کو دینِ اسلام اور پیغمبرِ اسلام ﷺ سے برگشتہ کرتے جو اُن کی زندگی کی عزیز ترین آرزو تھی لیکن اُنہیں ہمت نہ ہوئی کہ وہ یہ تمنا کریں۔ اب تک وہ ایسا نہیں کر

سکے تو قیامت تک وہ ایسا نہیں کر سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے اس چیلنج کو قبول کرنے کی ہمت نہ آج تک اُنہیں نصیب ہوئی' نہ قیامت تک نصیب ہو گی۔''

''حضور سرکارِ دو عالم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے کہ اگر وہ ضد میں آ کر مرنے کی تمنا کرتے تو جو بھی یہ تمنا کرتا' اُسے فوراً موت کی نیند سلا دیا جاتا اور اُن میں سے کوئی بھی زندہ نہ رہتا۔''

''مندرجہ بالا آیات کے علاوہ قرآن کریم کی بے شمار آیات ہیں جن میں اُن واقعات اور حالات کی نشان دہی کی گئی ہے جو نزولِ قرآن کے صدیوں بعد رُو پذیر ہونے والے تھے۔ اُن میں سے جو واقعات اِن چودہ صدیوں کے دوران وقوع پذیر ہو چکے ہیں وہ بعینہٖ اسی طرح وقوع پذیر ہوئے ہیں جس طرح قرآن کریم نے اُن کے بارے میں اطلاع دی تھی اور جو ابھی وقوع پذیر نہیں ہوئے وہ بھی یقیناً اسی طرح وقوع پذیر ہوں گے جس طرح عالم الغیب والشہادۃ نے اپنی کتابِ مقدّس میں اُن کا ذکر فرمایا ہے۔'' (''ضیاء النبی'' ج ۵' ص ص ۶۵۱۔۶۶۹)

(4) ''قرآن کریم کے معجز ہونے کی چوتھی وجہ: اُس کی ہیبت و جلال ہے جو دنیا کے کسی اور کلام میں نہیں پایا جاتا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ (الزُّمَر: ۲۳)

''وہ لوگ جن کے دلوں میں خوفِ خدا ہے' جب اس کلام مقدس کی آیات کو سنتے ہیں تو اُن پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ پھر اُن کے دل سوز و گداز سے معمور ہو جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ذکر کی طرف بصد شوق مائل ہو جاتے ہیں۔'' (۳۹ : ۲۳)

''یہ ایمان افروز منظر کئی بار دیکھنے میں آیا ہے کہ جب کسی محفل میں قرآن کریم کی تلاوت کی جاتی ہے تو کئی لوگ زار و قطار رونے لگتے ہیں اور بعض پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اس حالت میں وہ اکثر اپنے کپڑے پھاڑ ڈالتے ہیں۔ یہ سب کچھ اس ہیبت و جلال کا اثر ہے جو اس کلامِ مقدس کا خاصہ ہے۔''

جبیر بن مطعم بحالتِ کفر بدر کے اسیرانِ جنگ کے بارے میں گفتگو کرنے کے لئے مدینہ طیبہ حاضر ہوئے۔ مغرب کی نماز کی امامت رحمت ہر عالم ﷺ فرما رہے تھے اور سورۃ الطُّور کی تلاوت فرما رہے تھے۔ جبیر بیان کرتے ہیں کہ جب میں نے یہ آیتیں سنیں :

وَالطُّوْرِ ○ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ○ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ○ (اَلطُّور : ۱-۳)

''قسم ہے طور کی اور کتاب کی جو کھلے ورق پر لکھی گئی ہے۔'' (۵۲ : ۱-۳)

تو مجھ پر حیرت اور دہشت طاری ہو گئی اور جب میں نے سرورِ انبیاء ﷺ کو یہ آیتیں پڑھتے سنا :

اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ○ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ○ (اَلطُّور : ۷' ۸)

''یقیناً آپ کے رب کا عذاب واقع ہو کر رہے گا اور اُسے کوئی ٹالنے والا نہیں۔'' (۷، ۸ : ۵۲)

تو مجھ پر کھڑا رہنے کی تاب نہ رہی۔ میں بیٹھ گیا اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ ابھی عذابِ الٰہی کی بجلی کوندے گی اور مجھے جلا کر خاکستر کر دے گی۔ پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ آیات پڑھیں :

یَوۡمَ تَمُوۡرُ السَّمَآءُ مَوۡرًا ○ وَّتَسِیۡرُ الۡجِبَالُ سَیۡرًا ○ فَوَیۡلٌ یَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُکَذِّبِیۡنَ ○ (اَلطُّور: ۹۔ ۱۱)

''جس دن آسمان بُری طرح تھرتھرا رہا ہو گا اور پہاڑ اپنی جگہ چھوڑ کر تیزی سے چلنے لگیں گے۔ پس اُس دن جھٹلانے والوں کے لئے بربادی ہو گی۔'' (۹ تا ۱۱ : ۵۲)

یہ سن کر مجھ پر شدید خوف و دہشت طاری ہو گئی اور جب حضور علیہ السلام نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

اَمۡ عِنۡدَهُمۡ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمۡ هُمُ الۡمُصَیۡطِرُوۡنَ ○ (اَلطُّور: ۳۷)

''کیا آپ کے رب کے خزانے اُن کے قبضہ میں ہیں یا اُنہوں نے ہر چیز پر تسلط جما لیا ہے!'' (۵۲:۳۷)

''یہ آیات سننے سے مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرا دل میرے سینے کو چیر کر باہر نکلا جاتا ہے۔ چنانچہ جب مرشدِ برحق علیہ السلام نماز سے فارغ ہوئے تو میں نے اُن کے دستِ حق پر اسلام کی بیعت کر لی۔'' (''السیرۃ النبویہ'' لزینی دحلان' جلد ۳' صفحہ ۱۱۱)

(5) قرآنِ کریم کے معجزہ ہونے کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ اس کی جتنی بار تلاوت کی جائے' ایک ایک آیت کو بار بار دُہرایا جائے تو قاری اس سے اکتا نہیں جاتا۔ جتنی بار اس کی تلاوت کی جائے' پڑھنے والے کو نیا سرور اور نیا لطف محسوس ہوتا ہے۔ نہ اُس کا پڑھنے والا اُکتاتا ہے اور نہ اُس کا سننے والا تھکتا ہے۔ وہ لوگ جو فصاحت و بلاغت میں عالمی شہرت کے حامل ہیں' اُن کے کلام کو جب پہلی بار سنا جاتا ہے تو خاص کیف و سرور حاصل ہوتا ہے لیکن جب اسے کثرت سے دُہرایا جاتا ہے تو آہستہ آہستہ اُس کیفیت و سرور میں کمی آنی شروع ہو جاتی ہے اور ایک وقت وہ آتا ہے کہ انسان اُس کے پڑھنے اور سننے سے اُکتا جاتا ہے۔ لیکن اس فرقانِ حمید کی یہ خصوصیت ہے کہ آپ سینکڑوں' ہزاروں بار اس کی آیات کی تلاوت کریں تو ہر بار کیف و نشاط کی ایک نئی کیفیت طاری ہو جائے گی۔ اور ایسا کیوں نہ ہو کہ خود ربِّ ذوالجلال والاکرام کا یہ دعویٰ ہے : وَهُمۡ لَا یَسۡـَٔمُوۡنَ ○ (فُصِّلَتۡ :۳۸) یعنی وہ اُکتاتے نہیں۔

''سرکارِ ہر عالم نے اپنی زبانِ اقدس سے قرآنِ کریم کی نادر خصوصیات سے یوں پردہ اٹھایا ہے' فرمایا:

اَلۡقُرۡاٰنُ لَا یَخۡلَقُ عَلٰی کَثۡرَةِ الرَّدِّ وَلَا تَنۡقَضِیۡ عِبَرُه' وَلَا تَفۡنٰی عَجَآئِبُه' وَهُوَ الۡفَصۡلُ لَیۡسَ بِالۡهَزۡلِ وَلَا یَشۡبَعُ مِنۡهُ الۡعُلَمَآءُ وَلَا تَزِیۡغُ بِهِ الۡاَهۡوَآءُ' وَلَا تَلۡتَبِسُ بِهِ الۡاَلۡسِنَةُ وَهُوَ الَّذِیۡ لَمۡ تَتَنَّهٖ الۡجِنُّ حِیۡنَ سَمِعَتۡهُ اَنۡ قَالُوۡۤا اِنَّا سَمِعۡنَا قُرۡاٰنًا عَجَبًا یَّهۡدِیۡۤ اِلَی الرُّشۡدِ (الشفاء جلد ۱' ص ۳۹۰)

''قرآن کو جتنی بار پڑھا جائے' پرانا نہیں ہوتا۔ اُس کے پند و مواعظ ختم نہیں ہوتے' اُس کے عجائب فنا نہیں ہوتے۔ حق و باطل میں یہ فیصلہ کرنے والی کتاب ہے' یہ مذاق نہیں ہے۔ علماء اس سے سیر نہیں ہوتے اور

اِس کی برکت سے خواہشاتِ نفسانی میں کجی پیدا نہیں ہوتی۔ زبان سے تلفظ کرتے وقت کسی اور کلام کے ساتھ اِلتباس پیدا نہیں ہوتا۔ یہ وہ کتاب ہے کہ جب جنات نے اُسے سنا تو وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ آج ہم نے ایک عجیب و غریب قرآن سنا ہے جو ہدایت کی طرف راہ نمائی کرتا ہے۔''

''ایک دوسرے ارشاد میں سرکارِ ہر عالم ﷺ نے اس کتاب کی فیوض و برکات بیان کرتے ہوئے فرمایا:
مَنْ قَالَ بِهٖ صَدَقَ مَنْ حَكَمَ بِهٖ عَدَلَ مَنْ خَاصَمَ بِهٖ فَلَجَ مَنْ قَسَّمَ بِهٖ اَقْسَطَ مَنْ عَمِلَ بِهٖ اُجِرَ مَنْ تَمَسَّكَ بِهٖ هُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ مَنْ طَلَبَ الْهُدٰی مِنْ غَیْرِهٖ اَضَلَّهُ اللهُ وَمَنْ حَكَمَ بِغَیْرِهٖ قَصَمَهُ اللهُ۔ هُوَ الذِّكْرُ الْحَكِیْمُ وَالنُّوْرُ الْمُبِیْنُ وَالصِّرَاطُ الْمُسْتَقِیْمُ وَحَبْلُ اللهِ الْمَتِیْنُ وَالشِّفَاءُ النَّافِعُ نَجَاةٌ لِّمَنِ اتَّبَعَ لَا یَعْوَجُ فَیُقَوَّمَ وَلَا یَزِیْغُ فَیُسْتَعْتَبَ لَاتَنْقَضِیْ عَجَائِبُهٗ وَلَا یَخْلُقُ عَلٰی كَثْرَةِ الرَّدِّ (الشفاء' جلد ۱' ص ۳۹۲)
''جو اس کے ساتھ گفتگو کرتا ہے وہ سچا ہے' جو اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہے وہ عادل ہے' جو اس کے ساتھ مخاصمت کرتا ہے وہ کامیاب ہے' جو اس کے مطابق تقسیم کرتا ہے وہ انصاف کرتا ہے' جو اس کے مطابق عمل کرتا ہے اُسے اجر دیا جاتا ہے' جو اس کا دامن پکڑ لیتا ہے اُسے صراطِ مستقیم پر چلنے کی ہدایت نصیب ہوتی ہے' جو شخص قرآن کے بغیر کسی اور جگہ سے ہدایت طلب کرتا ہے اللہ تعالیٰ اُسے گمراہ کر دیتا ہے' جو شخص احکامِ قرآن کے بغیر کسی اور حکم کو نافذ کرتا ہے' اللہ تعالیٰ اُس کی گردن توڑ دیتا ہے۔ قرآنِ کریم ہی ذکرِ حکیم ہے' یہی نورِ مبین ہے' یہی راہِ راست ہے اور اللہ تعالیٰ کی مضبوط رسی ہے' نفع دینے والی صحت ہے۔ جو اس کی پیروی کرتا ہے اُسے وہ گناہوں اور غلطیوں سے بچا لیتا ہے۔ اس میں کجی نہیں ہے کہ اسے درست کرنے کی ضرورت ہو۔ وہ حق سے بھٹکتا نہیں کہ اُسے ملامت اور عتاب کیا جائے۔ اس کے معانی کے عجائب و لطائف ختم نہیں ہوتے اور بار بار پڑھنے سے یہ پرانا نہیں ہوتا۔''

''حدیثِ قدسی ملاحظہ فرمایئے۔ اللہ تعالیٰ اپنے حبیبِ مکرم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہیں:
اِنِّیْ مُنَزِّلٌ عَلَیْكَ تَوْرَاةً حَدِیْثَةً تَفْتَحُ بِهَا اَعْیُنًا عُمْیًا وَّاٰذَانًا صُمًّا وَّقُلُوْبًا غُلْفًا فِیْهَا یَنَابِیْعُ الْعِلْمِ وَفَهْمُ الْحِكْمَةِ وَرَبِیْعُ الْقُلُوْبِ (الشفاء' جلد ۱' ص ۳۹۳)
''میں آپ پر ایک جدید تورات نازل کرنے والا ہوں۔ اس کے ذریعہ آپ اندھی آنکھوں کو بینا کر دیں گے اور بہرے کانوں کو شنوا کر دیں گے اور غفلت کے غلافوں میں لپٹے ہوئے دلوں کو بیدار کر دیں گے۔ اس میں علم کے چشمے اُبل رہے ہیں اور یہ حکمت کا مفہوم بتاتی ہے اور اس کی وجہ سے دلوں کی بہار ہے۔''

اللہ تعالیٰ اس صحیفہ مقدسہ کے بارے میں فرماتا ہے:
هٰذَا بَیَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًی وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِیْنَ O (آل عمران : ۱۳۸)
''یہ قرآن ایک بیان ہے لوگوں کے سمجھانے کے لئے اور سراپا ہدایت ہے اور پرہیزگاروں کے واسطے نصیحت ہے۔'' (۳: ۱۳۸)

(6) ''قرآنِ کریم کے وجوہِ اعجاز میں سے ایک امر یہ ہے کہ اِس میں دلیل اور مدلول بہ یک وقت جمع ہوتے ہیں۔اس میں بہ یک وقت امر بھی ہے' نہی بھی۔خبر بھی ہے استخبار بھی۔ وعید (دھمکی) بھی ہے اور وعدہ بھی۔ترغیب بھی ہے اور ترہیب بھی۔اس کی عبارت بڑی دلکش ہے۔اس کے ساتھ اس میں ایجاز اور بلاغت ہے۔توحیدِ خداوندی کو ثابت کرنے کے لئے عقلی اور تکوینی براہین موجود ہیں۔نبوّت کو ثابت کرنے کے لئے دلائل موجود ہیں۔اس کا اندازِ بیان منفرد ہے۔نہ اُسے نثر کہا جا سکتا ہے اور نہ نظم۔''

(7) ''قرآنِ کریم کی وجوہِ اعجاز میں سے ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ اُسے یاد کرنا آسان ہے۔ارشادِ خداوندی ہے:۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ (القمر: ۱۷، ۲۲، ۳۲، ۴۰)

''ہم نے یاد کرنے کے لئے اِس قرآنِ کریم کو آسان بنا دیا ہے۔'' (۱۷، ۲۲، ۳۲، ۴۰: ۵۴)

''دیگر اقوامِ عالم کے پاس اُن کے مذہبی صحائف تورات' انجیل' زبور وغیرہ ہیں۔ان کے بارے میں اُن کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ آسمان سے نازل ہوئے ہیں لیکن آج تک اُن میں ایک آدمی بھی ایسا پیدا نہیں ہوا جس نے اپنے آسمانی صحیفہ کو زبانی یاد کیا ہو جبکہ امتِ مسلمہ میں سینکڑوں نہیں' ہزاروں لاکھوں ایسے خوش نصیب ہیں جن کے سینے اس کتابِ مقدس کے گنجینے ہیں۔آٹھ دس سال کی عمر کا بچہ اس کا حافظ بن جاتا ہے' ساری عمر اس کی تلاوت سے مستفید ہوتا رہتا ہے اور اس کی برکتوں سے مالا مال ہوتا رہتا ہے۔وہ قومیں جو اپنے آپ کو بڑا ترقی یافتہ کہتی ہیں' جہاں شرحِ خواندگی سو فیصد ہے' اُن میں بلا کے ذہین وفطین اور قوی حافظہ والے آدمیوں کی کمی نہیں۔ان تمام امور کے باوجود اُن میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں پایا جاتا جو اپنی آسمانی کتاب کا حافظ ہو۔یہ شرف صرف اس صحیفۂ ربّانی کو حاصل ہے کہ عرب تو رہے عرب' عجمی جن کی مادری زبانیں عربی زبان کے ساتھ دُور کی مناسبت بھی نہیں رکھتیں' اُن میں بھی بکثرت حفاظ پائے جاتے ہیں۔''

(8) ''قرآنِ کریم کی آیاتِ طیّبات میں ایسے ایسے علوم ومعارف جمع کر دئے گئے ہیں کہ قرآن کریم کے نزول سے پہلے کسی عالم یا کسی حکیم' کسی سائنس دان اور کسی فلسفی کو اُن کی خبر تک نہ تھی۔سائنسی تحقیقات' ایجادات اور انکشافات کا کاروان چودہ صدیاں رواں دواں رہنے کے بعد آج بمشکل اِن قرآنی علوم ومعارف کو سمجھنے کے قابل ہوا ہے۔ذیل میں قرآن کریم کی چند ایسی آیات پیش کی جاتی ہیں جن میں سائنسی علوم کو سمو دیا گیا ہے:

(ا) وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيكُمْ مِمَّا فِي بُطُونِهِ مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَدَمٍ لَبَنًا خَالِصًا سَائِغًا لِلشَّارِبِينَ O(اَلنَّحل : ۶۶)

''اور بے شک تمہارے لئے مویشیوں میں بھی بڑا سبق ہے۔اُن کے پیٹ میں جو کچھ گوبر اور خون (کی قسم) سے ہوتا ہے' اُس کے درمیان سے صاف اور پینے والوں کے لئے خوشگوار دودھ ہم تمہیں پینے کو دیتے ہیں۔'' (۶۶ :۱۶)

''دودھ دینے والے مویشی' بھینس' گائیں' بکریاں وغیرہ جو خوراک کھاتی ہیں آخر کار اُنہی سے دودھ بنتا ہے لیکن جب وہ دودھ بنتا ہے تو اس میں نہ اُس خوراک کی رنگت ہوتی ہے' نہ ذائقہ ہوتا ہے اور نہ بو ہوتی ہے۔ یہ عمل کس طرح رُو پذیر ہوتا ہے' قرآن کریم نے اس آیت میں بڑی وضاحت کے ساتھ اُسے بیان کیا ہے اور جس حقیقت سے قرآن کریم نے پردہ اٹھایا ہے' نزولِ قرآن' سے پہلے کوئی عالم' کوئی طبیب' کوئی حکیم اس سے آگاہ نہ تھا۔ ہم آپ کو بتاتے ہیں کہ قرآن کریم نے دودھ کو ان غذاؤں سے کس طرح نکال کر انسان کے لئے ایک لذیذ مشروب بنا دیا ہے۔''

''اِس آیت میں دودھ کو فلٹر کرنے کے سارے مرحلے بیان کیے گئے ہیں۔ ایک مرحلہ اُس وقت شروع ہوتا ہے جب خوراک معدہ میں جاتی ہے۔ اُس کے ہضم ہونے کے بعد اُس کا مائع حصہ جس سے دودھ بنتا ہے' وہ آنتوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ دوسرا مرحلہ: اُن آنتوں میں حکمتِ الٰہی سے چھوٹے چھوٹے بال اُگے ہوئے ہیں۔ وہ اس غذائی مواد کو چوستے ہیں اور چوس کر خون میں ملا دیتے ہیں۔ فضلات کا حصہ آنتوں میں رہ جاتا ہے جسے وہ باہر پھینک دیتی ہیں۔ تیسرا مرحلہ: جو مواد آنتوں نے چوس کر خون میں ملایا تھا' اُس کی صفائی کے لئے غدودِ لبنیہ اپنا کام کرتی ہیں۔ اس میں سے جو خون کے ذرات ہیں' اُنہیں الگ کر دیا جاتا ہے۔ اس میں سے کچھ مواد اُس مویشی کے جسم کا حصہ بن جاتا ہے اور بقیہ مواد کو اِن فلٹروں سے چھانا جاتا ہے۔ اس کے بعد خالص دودھ بن کر اُس مویشی کی کھیری میں چلا جاتا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب اُس فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْض نے انسان کی راہ نمائی کے لئے نازل کی ہے جو اِس کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز کا بنانے والا ہے اور اُس کے تمام اعضاء اور غدودوں کی کارکردگیوں سے آگاہ ہے۔''

(۲) فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَه' يَشْرَحْ صَدْرَه' لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّه' يَجْعَلْ صَدْرَه' ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِى السَّمَآءِ (الانعام : ۱۲۵)

''اور جس (خوش نصیب) کے لئے اللہ ہدایت دینے کا ارادہ فرماتا ہے تو اُس کا سینہ اسلام کے لئے کشادہ کر دیتا ہے اور جس (بدنصیب) کے لئے اُسے گمراہ کرنے کا ارادہ فرماتا ہے تو اُس کے سینہ کو تنگ بنا دیتا ہے ایسے جیسے وہ زبردستی آسمان کی طرف چڑھ رہا ہو۔'' (۱۲۵ : ۶)

''اس آیتِ کریمہ میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ ہر شخص کے لئے ورثہ میں ملے ہوئے مشرکانہ عقائد کو ترک کر کے دینِ حق کی دعوت کو قبول کرنا آسان کام نہیں۔ صرف وہ شخص حق کو بخوشی قبول کرتا ہے جس کے سینہ کو حق تعالیٰ حق قبول کرنے کے لئے منشرح کر دیتا ہے اور جس کے سینے کو اللہ تعالیٰ منشرح نہ کرے' جب اُسے دعوتِ حق دی جاتی ہے تو وہ اپنے دل میں ایسی گھٹن اور انقباض محسوس کرتا ہے جیسے اُسے آسمان کی بلندیوں کی طرف چڑھنے کے لئے مجبور کیا جا رہا ہو۔ اُس کا سانس پھول جاتا ہے اور وہ سانس لینے میں بڑی دقت محسوس کرتا ہے۔ اُس وقت جس گھٹن اور انقباض سے وہ دوچار ہوتا ہے' اُس کی تشریح كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِى السَّمَآءِ کی تمثیل سے کی گئی ہے۔ یہاں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ تمثیل مناسب نہیں۔ جب کوئی شخص آسمان کی بلندیوں کی طرف مصروفِ پرواز ہوتا ہے تو اُسے گھٹن نہیں ہونی

چاہئے کیونکہ وہاں کی فضا تو ایسی ہے کہ وہ ماحولیاتی آلودگیوں اور آسائشوں سے پاک اور منزہ ہوتی ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ اس پاکیزہ فضا میں سانس لینا آسان ہی نہ ہو بلکہ نشاط آور بھی ہو۔''

''قرآن کریم نازل کرنے والا پروردگار قیامت تک آنے والے انکشافات' تحقیقات اور ایجادات کو اچھی طرح جانتا ہے۔ جس حقیقت کو انسانی علم آج سمجھ سکا ہے' اللہ تعالیٰ کو اُس کا پہلے سے علم تھا۔ آج انسانی تحقیقات اس نتیجہ پر پہنچی ہیں کہ اگرچہ سانس ہوا میں لیا جاتا ہے لیکن وہی ہوا سانس لینے کے قابل ہے جس میں ایک مخصوص مقدار تک آکسیجن پائی جاتی ہو اور جس وقت انسان بلندیوں کی طرف پیش قدمی کرتا ہے تو جتنی بلندی زیادہ ہوتی جائے گی' اُتنی ہی آکسیجن کی مقدار ہوا میں کم ہوتی جاتی ہے اور جہاں ہوا میں آکسیجن بالکل ختم ہو جائے وہاں سانس لینا محال ہو جاتا ہے۔''

''جب یہ حقیقتیں منکشف ہو چکی ہیں تو اس وقت اس آیت کو سمجھنا آسان ہو گیا ہے اور اس تمثیل کی موزونیت واضح ہو گئی ہے۔ جو انسان آسمان کی طرف عروج کرے گا' بلندی جتنی بڑھتی جائے گی' ہوا میں آکسیجن کی مقدار کم ہوتی جائے گی اور جس وقت وہ اُس بلندی پر پہنچے گا جہاں ہوا میں آکسیجن برائے نام ہو' اس وقت سانس پھولنے سے جس گھٹن اور انقباض سے وہ دوچار ہو گا' اُس کی شدت کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جو اس مصیبت سے دوچار ہوا ہو۔ کیونکہ ایسے موقع پر انسان کی حالت ناگفتہ بہ ہو جاتی ہے' سانس اکھڑ جاتی ہے' اوسان خطا ہو جاتے ہیں اور اُس پر بے بسی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ بس یہی حال اُس بدنصیب کا ہو گا جسے اللہ تعالیٰ کی عنایات نے نظرانداز کر دیا ہو اور وہ اپنے موروثی عقائد سے چمٹے رہنے پر اُس وقت مصر ہو جبکہ مخالف ہواؤں کے تھپیڑے اُسے اُن سے دستبردار ہونے کے لئے مجبور کر رہے ہوں۔''

''قرآنِ کریم کی جس آیت کو چودہ صدیاں گزرنے پر اب صحیح طور پر سمجھا جا سکا ہے' جس ذاتِ اقدس نے اُسے نازل کیا وہ اس وقت بھی ان حقائق سے پوری طرح باخبر تھی۔ اگر کسی انسان کا یہ بنایا ہوا صحیفہ ہوتا تو وہ بھی اس تمثیل کو ذکر نہ کر سکتا۔ یہ آیت بھی اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ یہ کلام انسانی عقل و خرد کی کاوشوں کا ثمر نہیں بلکہ اُس علیم و خبیر خدا وندِ قدوس کا کلام ہے جس کے سامنے کوئی راز' راز نہیں اور تمام حقیقتیں عیاں اور آشکارا ہیں۔''

(۳) سورۃ الذاریات کی یہ آیت ایک حقیقت کا انکشاف کر رہی ہے جس پر عقلِ انسانی اُس وقت تک آگاہ نہ ہو سکی تھی۔ فرمایا:

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ (اَلذّاریات : ۴۹)

''اور ہر چیز کو ہم نے جوڑا جوڑا پیدا کیا ہے۔'' (۴۹ : ۵۱)

''اس انکشاف کو مزید واضح فرمانے کے لئے سورہ یٰسٓ کی یہ آیت ۳۶ نازل ہوئی:

سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ O

''(ہر عیب سے) پاک ہے وہ ذات جس نے ہر چیز کو جوڑا جوڑا پیدا فرمایا' جنہیں زمین اُگاتی ہے اور اُن کے نفسوں کو بھی اور اُن چیزوں کو بھی جنہیں وہ ابھی تک نہیں جانتے۔'' (۳۶:۳۶)

''اِس آیت میں اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ ہر چیز خواہ اُس کا تعلق عالمِ نباتات سے ہو یا جمادات سے یا کسی دوسری نوع سے ہو' جس کے بارے میں ہماری معلومات ناتمام ہیں' ان مختلف انواعِ تخلیق کے بارے میں فیصلہ کن انداز میں فرمادیا کہ اُنہیں جوڑا جوڑا پیدا کیا گیا۔''

''چنانچہ سائنس دان آج اِس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس کائنات کی ہر چیز خواہ وہ جاندار ہو یا غیر جاندار' جوڑا جوڑا پیدا کی گئی ہے۔ نیز سائنس دان اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس کائنات کا نقطۂ آغاز ذرّہ (Atom) ہے اور یہ ذرّہ برقی لہروں سے عبارت ہے۔ اُن میں سے ایک پازیٹو (مذکر) ہے اور ایک نیگیٹو (مؤنث) ہے اور جب اس کائنات کی پہلی جزو زوجین سے مرکب ہے تو اس کائنات کی باقی اشیاء کا بھی جوڑا جوڑا ہونا آسانی سے سمجھ آسکتا ہے۔ جس کتابِ مقدس نے اس حقیقت کو چودہ سو سال قبل منکشف کیا تھا جبکہ کسی کو اس پر آگاہی نہ تھی' تو کیا یہ اس بات کی روشن دلیل نہیں ہے کہ اس قرآن کو نازل کرنے والی وہی ذات بے ہمتا ہے جو اس سارے عالم کی خالق ہے!''

(۴) یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّ غَیْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَیِّنَ لَكُمْ وَ نُقِرُّ فِی الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا (الحج: ۵)

''اے لوگو! اگر تمہیں روزِ محشر کو جی اُٹھنے میں کوئی شک ہو تو ذرا تم اس امر میں غور و فکر کرو کہ ہم نے ہی تمہیں مٹی سے پیدا کیا' پھر نطفہ سے' پھر خون کے لوتھڑے سے' پھر گوشت کے ٹکڑے سے۔ کچھ کی تخلیق مکمل ہوتی ہے اور کچھ کی تخلیق نامکمل۔۔ تا کہ ہم تمہارے لئے (اپنی قدرت کا کمال) ظاہر فرمائیں اور ہم رحموں میں جسے چاہیں ایک مقررہ میعاد تک قرار بخشتے ہیں۔ پھر ہم تمہیں بچہ بنا کر نکالتے ہیں۔''

سورۂ المُرسلات میں اس مضمون کو یوں بیان کیا گیا ہے:

اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ ۝ فَجَعَلْنٰهُ فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ ۝ اِلٰی قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ۝ فَقَدَرْنَا فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ۝ (المُرسلات: ۲۰-۲۳)

''کیا ہم نے تمہیں حقیر پانی سے پیدا نہیں فرمایا؟ پھر ہم نے اُسے ایک محفوظ جگہ (رحمِ مادر) میں ایک مقررہ مدت تک رکھ دیا۔ پھر ہم نے ایک اندازہ ٹھہرایا' پس ہم کتنے بہتر اندازہ ٹھہرانے والے ہیں!''

''تخلیقِ انسانی کے مختلف مدارج کو سمجھنے کے لئے قرآن کریم کی اس آیتِ طیبہ کا بہ دقتِ نظر مطالعہ فرمایئے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ

عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ O (المؤمنون : ۱۲ـ۱۴)

''بے شک ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا' پھر ہم نے اُسے پانی کی بوند بنا کر ایک محفوظ مقام میں رکھا' پھر ہم نے نطفہ کو خون کا لوتھڑا بنا دیا' پھر ہم نے اُس لوتھڑے کو گوشت کی بوٹی بنا دیا' پھر ہم نے اُس بوٹی سے ہڈیاں بنا دیں' پھر ہم نے ہڈیوں کو گوشت (کا لباس) پہنا دیا' پھر (روح پھونک کر) ہم نے اُسے ایک دوسری مخلوق بنا دیا۔ پس اللہ تعالیٰ بڑا بابرکت ہے جو سب سے بہتر بنانے والا ہے۔'' (۲۳:۱۲ـ۱۴)

''مٹی کے خمیر سے جو جوہر نکلا' اُس سے آدم علیہ السلام کا جسمِ پاک تیار ہوا۔ پھر آپ سے جو انسانی نسل چلی' اُس کے لئے نطفہ اصل قرار پایا' جو اُن غذاؤں سے پیدا ہوتا ہے جو زمین سے اُگتی ہیں۔ اِس لئے جنسِ انسانی کی تخلیق کے متعلق یہ فرمایا کہ اُسے مٹی سے پیدا کیا گیا ہے۔ شکمِ مادر میں جو مختلف تبدیلیاں رُونما ہوتی ہیں' اُن سے کسی حد تک عرب کے بادیہ نشین بھی باخبر تھے لیکن علم وانکشاف کا سلسلہ جوں جوں بڑھ رہا ہے' اِن تصوّرات وتغیرات کے پردوں میں قدرت کے موئے قلم کی اعجاز آفرینیاں اور نقش آرائیاں جو آج تک نگاہوں سے اوجھل تھیں' نمایاں ہو کر اللہ تعالیٰ کے علم اور حکمت کی ناقابلِ تردید گواہی دے رہی ہیں۔ پانی کی وہ بوند رحمِ مادر میں قرار پکڑنے کے بعد مختلف تطوّرات اور تغیّرات کے مرحلوں سے گزرتی ہے جن کا ذکر تفصیل سے ہوا ہے لیکن ابھی تک انسان اور دیگر حیوانات کے جنین یکساں قسم کے تھے۔ جو تبدیلیاں یکے بعد دیگرے انسانی نطفہ میں یہاں وقوع پذیر ہوتی ہیں' بعینہٖ یہی تبدیلیاں دیگر حیوانات کے نطفوں میں بھی ظاہر ہوتی ہیں۔ لیکن ایک منزل پر پہنچ کر یکایک مصوّرِ فطرت نے اپنے موقلم سے کوئی ایسی رنگ آمیزی کر دی کہ اُسے دیگر حیوانی جنینوں سے بالکل ممتاز کر کے رکھ دیا۔ پہلے وہ بے جان تھا' اب اُس میں زندگی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ لیکن انسانی جنین میں روحِ حیوانی کی آفرینش سے حیاتِ انسانی کا آغاز نہیں ہوا بلکہ نفسِ ناطقہ نے اُسے بالکل ایک جدید قسم کی مخلوق کا رُوپ بخش دیا ہے۔ عقل وفہم کی قوّتیں' غور وفکر کی صلاحیتیں' تسخیرِ کائنات کے حوصلے اور حکمرانی کی امنگیں سب کچھ اس عمدگی سے یہاں یکجا کر دیا گیا ہے جسے دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے اور یہ راز سمجھ نہیں سکتا کہ ابتدائی مرحلوں میں بالکل یکساں ہونے کے باوجود کس طرح ایک کا رخ ایک طرف اور دوسرے کا رخ ایک بالکل نئی منزل کی طرف موڑ دیا گیا ہے۔ پھر اس منزل کو پا لینے کے لئے جن قابلیتوں' صلاحیتوں' اعضاء اور وسائل کی ضرورت تھی' وہ سب مہیا کر دئے گئے۔ ان حقائق کو دیکھ کر زبان بے ساختہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتی ہے: فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ O

امام رازی لکھتے ہیں: اَیْ خَلْقًا مُبَایِنًا لِّلْخَلْقِ الْاَوَّلِ مُبَایَنَةً مَا بَعْدَهَا (یہ دوسری تخلیق پہلی تخلیق سے بالکل مختلف اور بہت مختلف ہوتی ہے۔) آگے چل کر امام موصوف لکھتے ہیں:

وَاَوْدَعَ بَاطِنَهٗ وَظَاهِرَهٗ بَلْ كُلُّ عُضْوٍ مِّنْ اَعْضَاءٍ عَجَائِبَ فِطْرَةٍ وَغَرَائِبَ حِكْمَةٍ لَا يُحِيْطُ بِهَا وَصْفُ الْوَاصِفِيْنَ

''پھر انسانی جنین کے باطن اور ظاہر میں بلکہ اس کے اعضاء میں سے تمام اعضاء میں فطرت کے ایسے عجائبات اور حکمت کے ایسے نوادرات رکھ دئے ہیں کہ کوئی وصف کرنے والا اُن کے وصف کا احاطہ نہیں کر سکتا۔''

''اِس آیت کے آخر میں اَحۡسَنُ الۡخَالِقِیۡن کے الفاظ توجہ طلب ہیں۔ ظاہر الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیدا کرنے والے تو بہت سے ہیں البتہ سب سے بہتر پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے حالانکہ صرف وہی خالق ہے اور تخلیقِ کائنات میں کوئی اُس کا حصّہ دار نہیں کیونکہ کسی کو حصّہ دار بنانا توحید کے قطعًا منافی ہے۔''

''علمائے کرام نے اِس شبہ کا ازالہ اس طرح فرمایا کہ خَلۡق کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے: (۱) کسی چیز کو کسی موجود مادّے اور سابقہ نمونے کے بغیر پیدا کرنا۔ مفردات امام راغب میں ہے: اِبۡدَاعُ الشَّیۡءِ مِنۡ غَیۡرِ اَصۡلٍ وَّلَا اِحۡتِذَاءٍ اِس معنی کے لحاظ سے یہ صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے جو کسی اور میں نہیں پائی جاسکتی۔''

''اس کا دوسرا معنی یہ ہے کہ سابقہ مادّے سے کسی چیز کو کسی موجود نمونہ کے مطابق بنالینا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے سوا اوروں میں بھی پایا جاسکتا ہے۔ اس آیت میں یہ لفظ اپنے دوسرے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔'' (''ضیاء القرآن''۔۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری' جلد ۳' ص ص ۲۴۷' ۲۴۸)

''یہاں ہم مصر کے ایک نابغہ روزگار عالم سعید حوی کی تصنیف ''اَلرَّسول'' سے اُن کی تحقیقات ہدیہ ناظرین کرتے ہیں اور اُن کی عبارت کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔ موصوف سورۃ العَلَق کی آیت خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''مرد کے مادۂ تولید میں جو جرثومہ ہے اور عورت کے مادۂ تولید میں جو بویضہ ہے' اُن کا باہم ملاپ اُس نالی میں ہوتا ہے جو رِحم اور مبیض کو آپس میں ملاتی ہے۔ وہاں انسانی حمل کا پہلا خلیہ معرضِ وجود میں آتا ہے۔ یہ خلیہ اگرچہ مقدار میں بہت چھوٹا سا ہوتا ہے لیکن پورا انسان اپنے جملہ عناصر اور خصوصیات کے ساتھ اس ایک خلیہ میں سمویا ہوا ہوتا ہے۔ پھر یہ خلیہ وہاں سے رِحم کی طرف سفر شروع کرتا ہے اور تقریبًا ایک ہفتہ میں وہ اپنی منزل (رِحم) تک پہنچتا ہے۔ اس سفر میں بہت سے خلیات اُس کے ساتھ مل جاتے ہیں اور وہ ایک گچھے کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ یہ گچھا رِحم کی دیوار کے ساتھ چمٹ جاتا ہے اور اُس کو بعض جراثیم کھانا شروع کردیتے ہیں یہاں تک کہ وہ ایک باریک سا نقطہ رہ جاتا ہے۔ ماں کا خون اُسے خوراک پہنچاتا ہے اور قرآنِ کریم نے جنین کی اس حالت کو ''عَـلَـقـہ'' کہا ہے جس کا معنی ہے لٹکا ہوا' آویختہ۔ اور اس سے بہتر اس کی کوئی اور تعبیر نہیں ہوسکتی۔''

''پھر یہ عَلَقہ نمو پذیر ہوتا ہے (بڑھنے لگتا ہے) اور اس کے خلیات مختلف ہوتے ہیں۔ وہ بغیر کسی ترتیب کے گول شکل اختیار کرلیتا ہے۔ وہ چند ہفتے اِسی حالت میں رہتا ہے۔ اُس کے وسط میں ایک چھوٹا سا تالاب نما گڑھا ہوتا ہے اور وہ اس خون سے غذا حاصل کرتا ہے اور وہ گوشت کے ایک چبائے ہوئے ٹکڑے کی شکل اختیار کرلیتا ہے اگرچہ اُس کی لمبائی صرف چند ملی میٹر سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اِس مرحلہ کے بعد اس میں نرم اور شفاف ہڈیاں اُبھرنے لگتی ہیں۔ اس عَلَقہ میں جتنے خلیات ہوتے ہیں' وہ سرگرمِ عمل ہوجاتے ہیں اور ایک ایسا اعصاب کا جال بُننے لگتے ہیں جو ہڈیوں کو ڈھانپ لیتا ہے اور پھر ان ہڈیوں کو گوشت کا لباس پہنا دیا جاتا ہے۔''

''انسان اس انکشاف کو دیکھ کر حیران و مبہوت ہو جاتا ہے کہ اس مُضغہ میں سب سے پہلے ہڈیاں نمودار ہوتی ہیں اور اس کے بعد گوشت کی چادر ظاہر ہوتی ہے جس سے ان ہڈیوں کے ڈھانچے کو لباس پہنایا جاتا ہے۔ یہ حقیقت جس تک آج علمِ انسانی کی رسائی ہوئی ہے' وہ چودہ صدیاں پیشتر اس آیتِ قرآنی نے منکشف کر دی تھی۔ اس حقیقت تک علم تشریح الابدان کے علماء بصد مشکل اب پہنچے ہیں۔''

''اب ہم یہاں آپ کی توجہ ایک خاص بات کی طرف مبذول کرنا چاہتے ہیں جسے قرآنِ کریم نے اس کلماتِ طیبات سے بیان کیا ہے:

ثُمَّ اَنْشَاْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ (یعنی روح پھونک کر ہم نے اُسے دوسری مخلوق بنا دیا ہے۔)

''یہاں تک انسانی اور حیوانی جنین میں بالکل یکسانیت پائی جاتی ہے۔ وہی مادہ منویہ کا اختلاط' وہی اُن کا رحم کی طرف سفر' پھر رحم میں پہنچ کر اُن کا رحم کی دیوار سے چمٹ جانا' پھر اُس خلیہ کے ساتھ بہت سے خلیوں کا جمع ہونا' پھر اُن خلیوں میں ہڈیوں کا نمودار ہونا اور اس ہڈیوں کے ڈھانچے کو گوشت کا لباس پہنانا۔ یہاں تک انسانی اور حیوانی جنین میں بالکل یکسانیت پائی جاتی ہے لیکن اس موقع پر ایک حیران کن تبدیلی رُونما ہوتی ہے۔ جب حمل کا دوسرا مہینہ اختتام پذیر ہونے لگتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا خصوصی لطف و کرم اس جنین پر ہوتا ہے جس نے آگے چل کر انسانیت کی خلعتِ فاخرہ پہننی ہے۔ اس وقت اس انسانی جنین میں بالکل مختلف قسم کی خصوصیات نمودار ہونے لگتی ہیں۔ اس منزل پر یکا یک مصوّرِ فطرت اپنے موقلم سے اس جنین میں ایسی رنگ آمیزی کرتا ہے جو اُسے دیگر حیوانی جنینوں سے بالکل ممتاز کر دیتی ہے۔ پہلے وہ بے جان تھا' اب زندگی کی لہر اُس کے رگ و پے میں دوڑنے لگتی ہے۔ عقل و فہم کی قوتیں' غور و فکر کی صلاحیتیں' تسخیرِ کائنات کے حوصلے اور حکمرانی کی امنگیں سب کچھ اس عمدگی سے یکجا کر دئے جاتے ہیں جسے دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے۔''

''یہ راز سمجھ نہیں آتا کہ ابتدائی مرحلوں میں بالکل یکساں ہونے کے باوجود کس طرح حیوانی جنین کا رخ ایک طرف اور انسانی جنین کا رخ دوسری طرف موڑ دیا جاتا ہے۔ پھر اس منزل کو پالینے کے لئے جن قابلیتوں' صلاحیتوں اور اعضاء و وسائل کی ضرورت ہوتی ہے' وہ سب مہیا کر دئے جاتے ہیں تو زبان بے ساختہ پکارنے لگتی ہے: فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ O

''شکمِ مادر میں وہ تنہا خلیہ جو رحم کی دیوار کے ساتھ چمٹ جاتا ہے' جو حیران کن تغیرات اُس میں رُو پذیر ہوتے ہیں' عام طور پر ہم اُس کی طرف کم توجہ دیتے ہیں لیکن یہ خصوصیتیں آہستہ آہستہ نمو پذیر ہوتی رہتی ہیں یہاں تک کہ وہ اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہیں اور صاف نظر آنے لگتی ہیں۔ پس وہی باریک نقطہ ایک انسانی بچے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور جو خوبیاں اور کمالات اللہ تعالیٰ نے اُس میں ودیعت کئے تھے' آہستہ آہستہ وہ ظہور پذیر ہونے لگتے ہیں۔''

''یہ حیران کن تغیرات بڑے اہم نتائج کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ اس رحم میں وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں

جسے قرآنِ کریم نے فِیْ قَرَارٍ مَّکِیْنٍ کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ یعنی ایک ایسی قرارگاہ جو بڑی پختہ اور مضبوط ہوتی ہے۔ علمِ تشریح الابدان کے ماہر جب رحم کے بارے میں غور کرتے ہیں تو حیران ہو جاتے ہیں کہ کس طرح اُسے پیٹ کے نچلے حصہ میں رکھا گیا ہے اور پھر اُسے مختلف رگ و ریشوں سے شکم کے مختلف حصوں کے ساتھ پیوستہ کر دیا ہے کہ وہ نہ تو الٹ جائے اور نہ کسی ایک طرف جھک جائے۔ جیسے جیسے جنین بڑھتا رہتا ہے' اُسی کے مطابق رحم پھیلتا جاتا ہے اور جب بچہ پیدا ہو جاتا ہے تو پھر وہ پھیلا ہوا رحم سکڑنے لگتا ہے یہاں تک کہ کچھ عرصہ بعد وہ اپنی اصل طبعی حالت پر لوٹ آتا ہے۔''

(۵) اب قرآنِ کریم کی دو ایسی آیات ہدیہ قارئین ہیں جن سے نوعِ انسانی اِن آیات کے نزول سے پہلے بے خبر تھی۔ پہلی سورۃ الحِجر کی آیت ۲۲ ہے جس میں ارشادِ باری تعالیٰ ہوا :

وَاَرْسَلْنَا الرِّیٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْقَیْنٰکُمُوْهُ وَمَآ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِیْنَ O

''اور ہم ہواؤں کو باردار بنا کر بھیجتے ہیں' پھر ہم آسمان سے پانی اتارتے ہیں' پھر ہم تمہیں وہی پانی پلاتے ہیں اور تم اُس کا ذخیرہ کرنے والے نہیں ہو۔'' (۱۵ : ۲۲)

دوسری آیت سورۃ النُّور کی ہے جس میں ارشادِ باری تعالیٰ ہوا:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یُزْجِیْ سَحَابًا ثُمَّ یُؤَلِّفُ بَیْنَهٗ ثُمَّ یَجْعَلُهٗ رُکَامًا فَتَرَی الْوَدْقَ یَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ وَیُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِیْهَا مِنْ بَرَدٍ فَیُصِیْبُ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ وَیَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ یَّشَآءُ یَکَادُ سَنَا بَرْقِهٖ یَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ O (النور : ۴۳)

''کیا تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ آہستہ آہستہ بادل کو لے جاتا ہے' پھر اُس کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑتا ہے' پھر اُسے تہ بہ تہ کر دیتا ہے۔ پھر تو بارش کو دیکھتا ہے کہ وہ اُس کے درمیان سے نکلتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ آسمان سے برف اتارتا ہے جو پہاڑوں کی طرح ہوتی ہے۔ پھر اُس سے جسے چاہتا ہے نقصان پہنچاتا ہے اور جس سے چاہتا ہے اُسے پھیر دیتا ہے۔ قریب ہے کہ اس کی بجلی کی چمک آنکھوں کی بینائی کو لے جائے۔'' (۲۴ : ۴۳)

''اِن دو آیتوں میں دو حقیقتیں بیان ہوئی ہیں: ایک تو یہ کہ جب نباتات' جمادات تمام چیزیں جوڑا جوڑا (نر اور مادہ) ہیں تو عالمِ نباتات میں بھی جب سارے پودے یا نر ہیں یا مادہ' تو اُن میں تلقیح کا عمل کیونکر رُو پذیر ہوتا ہے۔''

''بتا دیا کہ ہم نے عملِ تلقیح کو سرانجام دینے کے لئے ہواؤں کو مقرر کر دیا ہے۔ اگر یہ ذمہ داری حضرتِ انسان کی ہوتی تو دنیا کی ساری مصروفیتوں کو بالائے طاق رکھ کر بھی کسی ایک جنس پر کھیتوں میں عملِ تلقیح کو بروئے کار لانا اُس کے لئے ممکن نہ ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر یہ احسان فرمایا کہ یہ ذمہ داری ہواؤں کو تفویض کر دی اور حضرتِ انسان کو دیگر اہم فرائض کی انجام دہی کے لئے مکلف ٹھہرایا۔''

''سورۃ النُّور کی آیتِ مذکورہ میں یہ بتایا گیا کہ ہواؤں کے ذمہ صرف تلقیح نباتات کا عمل نہیں بلکہ ایک اور اہم

ذمہ داری بھی انہیں تفویض کی گئی ہے کہ وہ بادل کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو بھی ایک جگہ اکٹھا کر دیتی ہیں۔ برقی لہریں جو فضا میں تیر رہی ہیں' اُن کی وجہ سے بادلوں میں کثافت پیدا ہوتی ہے اور بعض بادل ایسے ہیں جن کی برقی لہریں نر ہوتی ہیں اور بعض بادل ایسے ہیں جن کی برقی لہریں مادہ ہوتی ہیں اور ہوائیں جب اِن بکھرے ہوئے بادلوں کو لا کر آپس میں ملاتی ہیں تو مثبت اور منفی برقی لہروں کا باہم امتزاج ہوتا ہے تو اِن بادلوں میں سے بارش کے قطرے ٹپکنے لگتے ہیں۔ یہ بھی ایک قسم کی تلقیح ہے جو ہوائیں مختلف بادلوں کو ملا کر انجام دیتی ہیں۔''

''نباتات کے بارے میں تو انسان کو پہلے بھی کچھ واقفیت تھی کہ پودے' درخت' جڑی بوٹیاں وغیرہ مذکر و مؤنث میں منقسم ہیں اور اُن کی تلقیح کا فریضہ ہوائیں انجام دیتی ہیں لیکن کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ بادل کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو دھکیل کر جب ہوائیں ایک جگہ جمع کر دیتی ہیں تو وہاں بھی عملِ تلقیح انجام پذیر ہوتا ہے جس کی وجہ سے بارش برستی ہے۔ یعنی جب بجلی کی مثبت اور منفی لہریں آپس میں ٹکراتی ہیں تو اس سے بادلوں میں تلقیح کا عمل وقوع پذیر ہوتا ہے جو بخارات کے اس ہیولے کو پانی کے قطروں میں تبدیل کر دیتا ہے۔''

''علمِ انسانی صدہا سال سفر طے کرنے کے بعد جہاں آج پہنچا ہے' قرآنِ کریم نے اس حقیقت سے پہلے ہی پردہ اٹھا دیا تھا' جو اِس بات کی واضح دلیل ہے کہ قرآنِ کریم کسی انسان کا مرتب کردہ نہیں ورنہ اس میں وہ حقائق کمال صحت سے اور بڑی تفصیل سے بیان نہ کئے گئے ہوتے جو انسان کے علم کی رسائی سے ماوراء تھے۔ جب قرآن کریم میں بے شمار ایسے اَسرار بے نقاب کر دیئے گئے ہیں' جو نزولِ قرآن کے وقت انسان کے علم کی رسائی سے ماوراء تھے تو معلوم ہوا کہ یہ اُس فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کا نازل کیا ہوا صحیفۂ ہدایت ہے جو اُن تمام اَسرار کو جانتا ہے جو انسان کی رسائی سے بلند ہیں۔''

(۶) **رتقِ کائنات (Super Black Hole)**: کائنات کے آغاز کے متعلق جدید سائنس کی یہ بھی قابلِ فخر دریافت ہے کہ شروع میں ساری کائنات' ستارے' سیارے ہر چیز ایک جگہ اکٹھی مرکب تھی اور کوئی علیحدہ وجود نہیں تھا۔ توانائی اور مادّہ کے اس مکسچر کا نام (Primordial Matter) رکھا گیا ہے۔ قرآن کریم نے سائنس کی اس عظیم دریافت کو صدیوں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ کبھی زمین و آسمان سب ہی ایک جگہ اکٹھے تھے۔ فرمایا:

اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ اَفَلَا یُؤْمِنُوْنَ O (الانبیاء : ۳۰)

''کیا کافروں نے یہ نہیں جانا کہ آسمان اور زمین بند تھے' پھر ہم نے دونوں کو کھول دیا اور ہم نے ہر زندہ چیز پانی سے پیدا فرمائی' تو کیا وہ اب بھی ایمان نہیں لائیں گے۔'' (۳۰ : ۲۱)

رَتْق سے مراد یہ کہ نہ آسمان سے بارش ہوتی تھی اور نہ زمین سے پیداوار اور سبزہ اُگتا تھا۔ آسمان اور زمین دونوں جامدِ محض تھے۔ چنانچہ بارش سے ہم نے آسمان کو کھول دیا اور زمین کو سبزہ اُگانے کے ذریعے کھول دیا گیا۔ حضرات عطا' عکرمہ' مجاہد اور ضحاک رضی اللہ عنہم سے یہی مروی ہے۔ (تبیان القرآن' ج ۷' ص ۵۴۶)

اَلرَّتقُ : اَلضَّمُّ وَالاِلْتِئَامُ (المفردات) رَتْق کا معنی ہے کسی چیز کا باہم دگر پیوست ہونا اور ایک دوسرے سے ملا ہوا ہونا۔ اَلْفَتْقُ : اَلْفَصْلُ بَیْنَ الْمُتَّصِلَیْن (دو جُڑی ہوئی چیزوں کو الگ الگ کرنا) ارشادِ ربانی ہے کہ زمین و آسمان موجودہ صورت اختیار کرنے سے پہلے ایک دوسرے میں پیوست تھے۔ پھر ہم نے اپنی قدرت سے اُنہیں ایک دوسرے سے الگ کر دیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر علمائے تفسیر سے اس آیت کا یہی مفہوم منقول ہے:

قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ وَضَحَّاك" وَعَطَاء" وَقَتَادَةُ كَانَتَا شَيْئًا وَّاحِدًا مُلْتَزِقَيْنِ فَفَصَّلَ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا بِالْهَوَاءِ (تفسیر قرطبی)

"زمین و آسمان شئے واحد کی طرح تھے۔ اُن کے اجزاء ایک دوسرے سے جُڑے ہوئے تھے۔ پھر ہوا کے ذریعے اُنہیں علیحدہ علیحدہ کر دیا گیا۔"

"آیتِ مبارکہ کے اندازِ خطاب پر بھی غور ہو جائے۔ فرمایا: اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا یعنی کیا قرآن کا انکار کرنے والوں نے یہ نہیں دیکھا۔۔۔۔؟ یوں یہ آیتِ مبارکہ ایک پیشین گوئی بھی تھی۔ یعنی کائنات کے متعلق یہ سائنسی دریافت سب سے پہلے غیر مسلم کریں گے اور دراصل معاملہ ایسا ہی ہوا ہے۔" ("قرآن پاک ایک چیلنج ایک سائنسی معجزہ"۔۔۔ میجر (ر) امیر افضل خان، ص ص ۱۳۴ تا ۱۳۷)

"سینکڑوں صدیوں کی تحقیقات، تجربات اور غور و فکر کے بعد علماء طبعیین جس نتیجہ پر آج پہنچے ہیں، قرآنِ کریم نے پہلے ہی اس حقیقت کو چند الفاظ میں بیان کر دیا تھا۔"

(9) قرآن کریم کے معجز ہونے کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ بعثتِ نبوی سے پہلے آدم علیہ السلام سے عیسیٰ علیہ السلام تک ہزارہا انبیاء و رُسل تشریف لائے۔ اُنہوں نے جن مشکلات میں فریضۂ تبلیغ انجام دیا اور اُن کی قوموں نے اُن کے ساتھ جو غیر انسانی اور بہیمانہ سلوک کیا، قرآنِ کریم نے بڑے مؤثر انداز میں اُن واقعات کا تذکرہ کیا ہے۔ قرآن کریم سے پہلے جو آسمانی کتب نازل ہوئیں، اُن میں بھی یہ واقعات اور یہ حالات تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جب ہم ان واقعات کو قرآن کریم میں پڑھتے ہیں تو ہمارے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت، اپنے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اطاعت کا جذبہ اور جادۂ حیات پر اس کے نقوش کو اپنا خضرِ راہ بنانے کا شوق پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس جب اُن واقعات کو سابقہ کتب میں پڑھا جاتا ہے، تو ان جذبات کا تو وہاں نام و نشان نہیں ملتا، البتہ اُنہیں پڑھنے والا حیرت زدہ ہو کر اپنے آپ سے پوچھنے لگتا ہے کہ کیا یہ وہ لوگ تھے جنہیں نبوّت کے اعلیٰ و ارفع منصب پر فائز کیا گیا۔ اگرچہ ایسے واقعات کی تعداد بہت زیادہ ہے لیکن ہم صرف چند واقعات کے بیان پر اکتفا کریں گے اور ان کے مطالعہ سے قاری پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ قرآن کریم میں انبیائے سابقین اور اُن کی اقوام کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ سابقہ آسمانی کتب سے خوشہ چینی نہیں کی گئی، جیسا کہ مستشرقین کا خیال ہے بلکہ براہِ راست اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اُن حالات و واقعات کو بیان کر کے اپنے محبوب ﷺ کے

قلبِ منیر پر نازل فرمایا ہے۔ اس میں کسی انسان کی کاوش کا سرِ مو دخل نہیں اور یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے گی کہ قرآنِ کریم کسی مؤرخ یا کسی مذہبی فلاسفر کی کاوشوں کا ثمر نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ کلام ہے جو اُس نے اپنے محبوب علیہ السلام پر نازل فرمایا۔ اور اگر یہ واقعات تورات وانجیل سے استفادہ کرتے ہوئے قرآن میں ذکر کئے جاتے تو ان میں بھی وہ عناصر کلیۃً نہیں تو جزوی طور پر پائے جاتے جن کے پیشِ نظر نبوت کا مقامِ رفیع مختلف قسم کی لغزشوں سے داغدار نظر آتا ہے۔''

''پہلے آپ کتابِ پیدائش کے باب ۱۹ کی آیات ۳۰ تا ۳۶ کا مطالعہ کریں جس میں اللہ کے ایک نبی حضرت لوط علیہ السلام کے بارے میں ہرزہ سرائی کی گئی ہے۔ ☆ حضرت لوط علیہ السلام کے بارے میں جس دریدہ دہنی کا مظاہرہ تورات کے بابِ پیدائش کے مرتبین نے کیا ہے، اس کے برعکس اس نبیِ مکرّم ومحترم کے بارے میں قرآنِ حکیم کے ارشادات ملاحظہ ہوں:

وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَالۡيَسَعَ وَيُوۡنُسَ وَلُوۡطًا ‌ؕ وَكُلًّا فَضَّلۡنَا عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ ۝ (الانعام: ۸۶)

''ہدایت دی اسماعیل، یسع، یونس اور لوط کو۔ اِن سب کو ہم نے سارے جہان والوں پر فضیلت دی۔''

اس آیت میں لوط علیہ السلام کا علیحدہ ذکر نہیں کیا گیا بلکہ کئی عظیم القدر انبیاء علیہم السلام کے ناموں کے ساتھ اُن کا ذکر کیا گیا اور پھر فرمایا: وَكُلًّا فَضَّلۡنَا عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ یعنی ان سب کو جن میں جنابِ لوط بھی شامل ہیں، ہم نے تمام جہانوں پر فضیلت دی۔

سورۃ الانبیاء میں پھر اللہ تعالیٰ لوط علیہ السلام کا احترام سے یوں ذکر فرماتا ہے:

وَلُوۡطًا اٰتَيۡنٰهُ حُكۡمًا وَّعِلۡمًا وَّنَجَّيۡنٰهُ مِنَ الۡقَرۡيَةِ الَّتِىۡ كَانَتۡ تَّعۡمَلُ الۡخَبٰٓئِثَ‌ؕ اِنَّهُمۡ كَانُوۡا قَوۡمَ سَوۡءٍ فٰسِقِيۡنَ ۝ وَاَدۡخَلۡنٰهُ فِىۡ رَحۡمَتِنَا‌ؕ اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِيۡنَ ۝ (الانبیاء: ۷۴، ۷۵)

''اور لوط کو ہم نے حکومت اور علم عطا فرمایا اور اُنہیں اُس گاؤں سے نجات دی جس کے باشندے بہت رذیل کام کیا کرتے تھے۔ بے شک وہ لوگ بڑے ناہنجار اور نافرمان تھے۔ اور ہم نے اُسے (لوط کو) اپنے حریمِ رحمت میں داخل کیا، بے شک وہ نیکوکاروں میں سے تھے۔'' (۲۱: ۷۴، ۷۵)

ان دو آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر حضرت لوط علیہ السلام کو جن اعزازات سے نوازا ہے، انہیں سامنے رکھ کر تورات میں اُن کی عصمت پر جو بدبودار داغ لگائے گئے ہیں، اُنہیں دیکھئے تو آپ حقیقت تک پہنچ جائیں گے۔

☆ ایمان اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ اِن قدسی صفات اور اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں کے بارے میں تحریف شدہ آسمانی کتب میں جو گستاخیاں کی گئی ہیں، اُنہیں احاطۂ تحریر میں لایا جائے۔ سچ یہ ہے کہ یہ قرآن اور صاحبِ قرآن ﷺ ہی کا کام تھا کہ انبیائے سابقین کے تقدس اور اُن کی عصمت کو بیان کرے تاکہ اُن کا دامن اُن الزامات سے بالکل صاف اور پاک نظر آئے جو قبیح الزامات اُن کے ماننے والوں نے اُن پر لگا رکھے ہیں۔

سورۃ الصّٰفّٰت کی آیات ۱۳۳ تا ۱۳۵ میں حضرت لوط علیہ السلام کی بابت ارشادِ پاک ہوا:

وَاِنَّ لُوْطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِذْ نَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ۝ اِلَّا عَجُوْزًا فِى الْغٰبِرِيْنَ ۝

''بے شک لوط بھی پیغمبروں میں سے ہیں۔ یاد کرو جب ہم نے انہیں اور اُن کے سارے اہلِ خانہ کو بچالیا سوائے ایک بُوھیا کے جو پیچھے رہنے والوں میں سے تھی۔'' (۱۳۳۔۱۳۵ : ۳۷)

اسی طرح نوح علیہ السلام بھی ان گستاخان کے گھاؤ سے نہیں بچ سکے اور اُن پر ایسے سوقیانہ الزامات کی بوچھاڑ کی گئی ہے جن کے بیان کی مؤلف کی غیرتِ ایمانی اجازت نہیں دیتی۔ جبکہ سورۃ الصّٰفّٰت کی آیات ۷۹ تا ۸۳ میں نوح علیہ السلام کی مدح سرائی یوں کی گئی ہے :

سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِى الْعٰلَمِيْنَ ۝ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ۝ وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ ۝

''جہاں والوں میں نوح پر سلام ہوں۔ بے شک ہم نیکوں کو ایسا ہی صلہ دیتے ہیں' بے شک وہ ہمارے اعلیٰ درجہ کے کامل الایمان بندوں میں سے ہے' پھر ہم نے دوسروں کو ڈبو دیا اور بے شک اُسی کے گروہ سے ابراہیم ہیں۔'' (۷۹۔۸۳ : ۳۷)

''قرآن کریم میں حضرت زکریا علیہ السلام کی نیازمندانہ دعا' اُس کی قبولیت' جنابِ یحییٰ علیہ السلام کی سیرت اور اَخلاق کی جو سورہ مریم کی ابتدائی آیات میں تفصیلات بیان ہوئیں' یہ واقعہ تقریباً انہی تفصیلات کے ساتھ انجیل لوقا باب اوّل آیات ۵ تا ۲۵ میں مذکور ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ انجیل میں نیاز و ادب میں ڈوبی ہوئی التجا مذکور نہیں جو اِس واقعہ کی جان ہے۔ نیز آپ علیہ السلام کے سکوت کو قرآنِ حکیم نے جہاں محض اس خوشخبری کے وقوع پذیر ہونے کی علامت قرار دیا ہے' وہاں انجیل میں لکھا ہے کہ (معاذ اللہ) بطورِ سزا اُس سے قوتِ گویائی سلب کر لی گئی تھی''۔

''تورات کے برعکس قرآنِ کریم میں جن پاکیزہ کلمات سے حضرت یحییٰ علیہ السلام کی شخصیت' اُن کی سیرت و کردار کی تصویر کشی کی گئی ہے' اُسے پڑھ کر آپ علیہ السلام کی عظمت کا پورا احساس دل میں نقش ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں سورہ مریم کی آیات ۱۲ تا ۱۵ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہوا:

يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ وَّاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ۝ وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً وَكَانَ تَقِيًّا ۝ وَّبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ۝ وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ۝

''اے یحییٰ! اِس کتاب کو مضبوطی سے پکڑ لو اور ہم نے انہیں اُن کے بچپنے میں دانائی عطا فرما دی تھی' نیز دل کی نرمی اور نفس کی پاکیزگی اپنی جناب سے عطا فرمائی اور وہ بڑے پرہیزگار تھے۔ اور وہ اپنے والدین کے خدمت گزار تھے اور وہ جابر اور سرکش نہ تھے۔ اور اُن پر سلامتی ہو جس دن وہ پیدا ہوئے' اور جس دن وہ انتقال کر گئے اور جس دن انہیں اٹھایا جائے گا۔'' (۱۲۔۱۵ : ۱۹)

''حضرت ایوب علیہ السلام کے قصہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والوں اور اُس کی رضا کے طلب گاروں

کے لئے بڑی روشن اور واضح نصیحت ہے۔ وہ یاد رکھیں کہ اگر آزمائش کی ایسی وادی میں اُن کا بھی گزر ہو' جہاں قدم قدم پر مصیبتوں کے اژدھا منہ کھولے بیٹھے ہوں' جہاں پر ویرانیوں کے روح فرسا سناٹے ہوں' تو اپنے رب کریم کا شکوہ نہ شروع کر دیں' اُس کی رحمت سے مایوس نہ ہو جائیں بلکہ میرے ایوب کو سامنے رکھیں۔ صبر و استقامت کا دامن تھامے ہوئے قدم آگے بڑھاتے جائیں۔ فَاسْتَجَبْنَا لَہٗ' فَکَشَفْنَا لَہٗ' کی نوید اُنہیں بھی سنائی جائے گی۔''

''اِسی واقعہ کو اگر بائبل میں پڑھیں گے تو ذِکْرٰی لِلْعٰبِدِیْن کی ادنیٰ سی جھلک بھی آپ کو نظر نہیں آئے گی۔ وہاں آپ کو ایوب نامی ایک ایسے آدمی سے واسطہ پڑے گا جو اپنی پیدائش کے دن پر (معاذ اللہ) لعنت بھیج رہا ہے۔''

''آپ خود انصاف فرمایئے کہ کیا ایسا شخص جو سراپا احتجاج ہے' جو اپنے رب پر ظالم ہونے کا الزام لگاتا ہے' جو مصائب سے اُکتا کر اپنی پیدائش پر لعنتوں کی بوچھاڑ کرتا ہے' کیا اُس کی زندگی یا اُس کی سیرت میں کوئی ایسی چیز ہے جو ہمارے لئے ہدایت کا باعث ہو؟''

''اس کے برعکس قرآنِ کریم ایوب علیہ السلام کا ذکر اِن نورانی کلمات سے کرتا ہے:۔

وَاَیُّوْبَ اِذْ نَادٰی رَبَّہٗٓ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ۝ فَاسْتَجَبْنَا لَہٗ فَکَشَفْنَا مَا بِہٖ مِنْ ضُرٍّ وَّاٰتَیْنٰہُ اَھْلَہٗ وَمِثْلَھُمْ مَّعَھُمْ رَحْمَۃً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِکْرٰی لِلْعٰبِدِیْنَ ۝ (الانبیاء: ۸۳'۸۴)

''یاد کیجئے ایوب کو جب اُنہوں نے اپنے رب کو پکارا اور عرض کی کہ مجھے سخت تکلیف پہنچی ہے اور تو اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْن ہے (میرے حالِ زار پر بھی رحم فرما) تو ہم نے اُن کی فریاد قبول فرمائی اور جو تکلیف اُنہیں پہنچ رہی تھی' ہم نے دُور فرما دی' اور ہم نے اُنہیں اُن کے گھر والے نیز اُتنے اور اپنے رحمتِ خاص سے عطا فرما دیئے۔ اور یہ (ذکرِ ایوب) عبادت گزاروں کے لئے نصیحت ہے۔'' (۸۳'۸۴ : ۲۱)

''حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر بائبل میں بھی موجود ہے لیکن قرآنِ حکیم نے اُن کی داستانِ حیات کو جس انداز میں بیان کیا ہے' اُس کی شان ہی نرالی ہے۔ یوں تو قرآنِ حکیم میں سابقہ انبیائے کرام کی پُر نور اور درخشاں زندگیوں کے بیسیوں قصّے مذکور ہیں جن کا ہر پہلو رُشد و ہدایت کے انوار برسا رہا ہے لیکن اَحْسَنَ الْقَصَص کے لقب سے صرف یوسفِ صدّیق علیہ الصلوٰۃ والسلام کی داستانِ حیات کو ہی نوازا گیا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ تکمیلِ انسانیت کی منزلِ رفیع تک جو راستہ جاتا ہے' اُس کے سارے پیچ و خم' نشیب و فراز' پیش آنے والی دشواریاں' منزل سے دل برداشتہ کر دینے والے سنگین مرحلے' منزل سے غافل کر دینے والے حسین و جمیل مناظر اور دل موہ لینے والی دلچسپیوں کو اتنی وضاحت سے بیان کر دیا گیا ہے کہ کسی ابہام و التباس کی گنجائش تک نہیں رہتی۔ پھر اس جانگداز' کٹھن اور طویل راہ کو طے کرنے کے لئے مسافر کو جس صبر' عزم' توکل' تقویٰ' عالی حوصلگی اور سیر چشمی کی ضرورت ہوتی ہے اُس کا ذکر بھی اتنے دلنشین اور مؤثر پیرائے میں کیا گیا ہے کہ اگر انسان کی فطرت سعید قلبِ سلیم کی نعمت سے محروم نہ ہو تو وہ اُس منزل تک رسائی حاصل کرنے کے لئے بے تاب ہو جاتا ہے۔ وہ طوفانوں سے کھیلتا' بپھری ہوئی لہروں

سے آنکھ مچولی کرتا' ہلاکت انگیز گردابوں کا منہ چڑاتا' چٹانوں سے کبھی ٹکراتا' کبھی دامن بچاتا ہوا ساحلِ مراد کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔ آپ خود ہی انصاف فرمایئے کہ جس ذاتِ اقدس واطہر کی داستانِ حیات کا دامن ایسے انمول حقائق سے لبریز ہو' اُسے اگر اَحْسَنُ الْقَصَص نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے اور اگر اُسے قرآن اَحْسَنُ الْقَصَص نہ کہے تو اور کون کہے؟'' (ضیاء القرآن' جلد دوم' صفحہ ۴۰۱)

''سیرتِ یوسفی کا جو خاکہ تورات میں بیان ہوا ہے' اللہ کی پناہ جسے نبوت کے منصب اعلیٰ کے مدِ نظر احاطۂ تحریر میں نہیں لایا جاسکتا۔ اس کا موازنہ قرآن حکیم سے کیجئے۔ اگر آپ انصاف اور حق طلبی کے جذبہ سے یکسر محروم نہیں کردیئے گئے تو مستشرقین کی اس اعتراض کی لغویت اور بیہودگی آپ کے سامنے عیاں ہوجائے گی اور آپ یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوجائیں گے کہ ہادیٔ برحق پیغمبر اسلام علیہ اطیب التحیۃ واذکی السلام نے ان واقعات کو اہلِ کتاب سے سن کر بیان نہیں کی بلکہ براہِ راست اللہ رب العالمین سے سنا اور لوگوں کو سنایا۔'' (ضیاء النبی' جلد ۵' ص ۶۸۶)

''قرآن کریم کے کلام الٰہی ہونے کا ایک اور پہلو

''عاد وثمود : قرآنِ کریم میں نوعِ انسانی کے ماضی' حال اور مستقبل کے بارے میں بہت سے واقعات درج ہیں۔ بہت سی پیش گوئیاں مذکور ہیں لیکن جن چیزوں کو قرآن کریم نے اپنے صفحات میں بیان کیا ہے' اُن کا تعلق ماضی سے ہو یا حال و مستقبل سے' کبھی اُنہیں جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ دشمنانِ اسلام نے چند واقعات کو جن کا تعلق ماضی سے ہے' ان کے بارے میں زبانِ طعن دراز کرنے کی کوشش کی ہے۔''

''مثلاً یورپ کے مستشرقین عاد وثمود جن کا تذکرہ قرآن کریم میں کئی بار تفصیل سے آیا ہے' اُن کے وجود کا ہی انکار کرتے ہیں اور اپنی فرضی تحقیقات پر اعتماد کرتے ہوئے قرآن کریم کے بارے میں زبانِ طعن دراز کرتے ہیں کہ قرآنِ کریم میں عاد وثمود کا کئی بار ذکر آیا ہے لیکن تاریخ میں کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اِس نام کی قومیں کبھی صفحۂ ہستی پر آباد رہی تھیں۔ لیکن اِنہی مستشرقین کی اولاد اور اِنہی ماہرین کے شاگردوں سے ایسے لوگ بھی پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے ان قوموں کے وجود کو تسلیم کیا ہے اور اس کے بارے میں ایسے دلائل پیش کئے ہیں جو ناقابلِ انکار ہیں۔''

''اُن کی اتہام طرازی پر زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ تاریخ بطلیموس کا ایک نسخہ دریافت ہوا جس میں قبیلہ عاد کا ذکر ہے اور اسی کے ساتھ قبیلہ اِرم کا بھی تذکرہ ہے۔ یونان کے مؤرخین نے بھی اپنی کتابوں میں ''ادرامیت'' کا تذکرہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ وہی قبیلہ ہے جس کا ذکر قرآن کریم کی سورۃ الفجر (۸۹) کی آیت ۷ میں عاد اِرَم ذاتِ الْعِمَاد کے الفاظ سے کیا گیا ہے۔ نیز آثارِ قدیمہ کے ماہر ''الموزیل التشیکی'' جس نے حجاز کے شمالی علاقہ کے آثار کے بارے میں مستقل ایک کتاب لکھی ہے جس میں اُس نے تصریح کی ہے کہ مدین کے قریب ایک ہیکل میں ایک سِل ملی ہے جس پر نبطی اور یونانی زبان میں تحریر کندہ ہے اور اس میں قبائلِ ثمود کا تذکرہ ہے۔''

''اِن جدید تحقیقات اور آثارِ قدیمہ کے ماہرین نے قرآن کریم کی تصدیق کرتے ہوئے ایسے دلائل و شواہد پیش کئے ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عاد و ثمود دو قبیلے تھے جو اپنے اپنے علاقوں میں آباد ہوئے اور اپنی بدعملیوں کے باعث عذابِ الٰہی کا نشانہ بنے۔''

''ابرہہ: اِن معترضین کے سرخیلوں نے ابرہہ اور اُس کے لشکر کی تباہی و بربادی کا بھی انکار کیا ہے اور لکھا ہے کہ نہ ابرہہ نے صنعاء میں کوئی کلیسا بنایا اور نہ اُس نے اہلِ عرب کو کعبہ نظرانداز کر کے اس کنیسہ کے طواف پر مجبور کیا۔ اس لئے اُنہوں نے بڑے طمطراق سے یہ کہا کہ اس بارے میں قرآن کریم میں جو لکھا گیا ہے' اُس کا حقیقت سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔''

''لیکن قدرتِ الٰہی کا کرشمہ ملاحظہ ہو کہ سدِّ مارب کے کھنڈرات کی کھدائی کے وقت ایسے نقوش اور تحریریں ملی ہیں جن میں ابرہہ کا نام بھی درج ہے اور یہ بھی تحریر ہے کہ وہ حبشہ کے بادشاہ کا ایک جرنیل تھا اور اُسے حبشہ' سبا' ویدان اور حضرموت کے حبشی بادشاہ نے اس مہم کے لئے روانہ کیا تھا۔ بروس کے ایک سیاح نے جس نے اٹھارویں صدی میں حبشہ کی سیاحت کی اور اپنا سفرنامہ لکھا۔ اپنے سفرنامے میں اُس نے تحریر کیا ہے کہ اہلِ حبشہ اپنی تاریخوں میں ابرہہ کا ذکر کرتے ہیں اور مکہ مکرمہ پر اُس کی چڑھائی کے بارے میں صراحت سے لکھتے ہیں۔ نیز اُس کے لشکر کی بربادی کی عبرتناک داستان قلمبند کرتے ہیں۔ ان تمام دلائل سے زیادہ تاریخ کی یہ سند معتبر ہے کہ سرکارِ دوعالم ﷺ کی ولادتِ باسعادت سے ایک سال قبل اصحابِ فیل کا واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ الغرض قرآن کریم میں ماضی کے بارے میں جو واقعات بیان کئے گئے ہیں اور جن کو دشمنانِ اسلام' اسلام کی صداقت اور حقانیت کو جھٹلانے کے لئے اب تک استعمال کرتے رہے ہیں' پرانی تاریخوں' کھنڈراتِ مآرب' ماہرینِ آثارِ قدیمہ کی تحقیقات اور بعض پتھروں پر کندہ تحریروں نے ان الزامات کی بیخ کنی کر کے رکھ دی ہے اور قرآن کریم میں بیان کردہ حقائق پر مُہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ (حٰمٓ السجدة: ۴۲)

''(یہ وہ کتاب ہے) اس میں کسی بھی جانب سے باطل داخل نہیں ہو سکتا۔'' (۴۲ : ۴۱)

اس کا محافظ رب العالمین ہے اور جو چیز اُس کی حفاظت میں ہو' اس میں کوئی شخص ادنیٰ سا بھی ردّوبدل نہیں کر سکتا۔ جس طرح اہلِ مکہ کو چیلنج دیا گیا تھا کہ اس جیسی کتاب بنا کر لاؤ' ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا تھا کہ ہرگز ایسی کتاب کی ایک سورۃ بھی پیش نہیں کر سکو گے' اسی طرح اس کتابِ مقدس کی حفاظت کے بارے میں فرما دیا کہ یہ میری حفاظت میں ہے۔ کوئی ابلیس' کوئی دشمنِ اسلام اس میں ردّوبدل کرنے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔ آج تک اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان واجب الاذعان سچا ثابت ہوا ہے اور قیامت تک یہ اپنی صداقت کا ڈنکا بجاتا رہے گا۔ یہ آیت بھی قرآن کریم کے کلامِ الٰہی ہونے کی شاہدِ عدل ہے۔'' (''ضیاء النبی'' ۔۔ پیر کرم شاہ الازہری' جلد ۵' صفحات ۷۰۵ تا ۷۰۷)

(۹۶) عدمِ برداشت (Intolerance) اور تعلیماتِ نبوی ﷺ

عدمِ برداشت کا مفہوم : برداشت کا لفظ فارسی سے مشتق ہے جو ''بر'' اور ''داشت'' کا مرکب ہے۔ بر کا معنیٰ بوجھ اور داشت کا مطلب رکھنا ہے۔ برداشت کا لغوی مفہوم کسی بوجھ کو سنبھالنا ہے۔ برداشت کے لفظ کے لئے عربی میں ''تحمل'' اور ''تسامح'' اور انگریزی میں Tolerance کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اصطلاح میں اس سے مراد لوگوں کے آزادیِ عقیدہ کے حق کا عقلی اور عملی اعتراف ہے۔ اس مفہوم کو Encyclopaedia of Britannica میں اس طرح بیان کیا گیا ہے :

"The intellectual & practical acknowledgement of the right of others to live in accordance with religious beliefs that are not accepted as one's own."

یعنی ''لوگوں کے آزادیِ عقیدہ کے حق کے عقلی اور عملی اعتراف کا نام تحمل اور برداشت ہے۔''

''برداشت Tolerance یا ''تسامح'' کے متضاد کے طور پر عدمِ برداشت کا لفظ استعمال ہوتا ہے جس کے لئے انگریزی میں Prejudice کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے جس کا مطلب کسی خاص موقف کا سختی سے ساتھ دینا، اس کے خلاف کسی قسم کی بات سننے سے سخت انکار کرنا اور اس موقف کے نہ ماننے والوں کو غلط سمجھنا ہے۔ عدمِ برداشت کے رُجحان میں ایک انتہا پسندانہ پسند یا ناپسند کا رویّہ ہوتا ہے جس میں پسند کو تمام تر عیوب کے باوجود بہترین قرار دیا جاتا ہے اور ناپسند کو تمام خوبیوں کے باوجود بدترین قرار دیا جاتا ہے۔'' (ماہنامہ ''مؤمن'' لاہور، اپریل ۲۰۰۳ء، صفحہ ۷)

قبل از اسلام عدمِ برداشت کا رُجحان : طلوعِ اسلام سے قبل جنگ و جدل، قتل و غارت اور عدمِ برداشت کی کئی مثالیں ہمیں نظر آتی ہیں۔ بقول زین العابدین میرٹھی ''ایام العرب کا ایک سلسلہ ہے جو خون کی موجوں کی طرح سارے جزیرہ عرب میں پھیلا ہوا تھا۔'' (''پیغمبرِ اسلام کا پیغامِ امن و سلام'' نقوش، جلد سوم، صفحہ ۴۶۰)

ملکِ عرب میں عدمِ برداشت کی یہ حالت تھی کہ معمولی باتوں پر قبائل کے درمیان جھگڑا ہو جاتا۔ قبل از اسلام کی دو خونیں جنگیں ''البسوس'' اور ''داحس والغبراء'' کے نام سے مشہور ہوئیں۔ الدکتور حسن ابراہیم حسن ''تاریخ الاسلام السیاسی والدینی والثقافی والاجتماعی'' جلد اول کے صفحہ ۵۳ پر رقمطراز ہیں کہ ''بسوس کی جنگ چالیس سال تک رہی۔''

تاریخِ عالم عدمِ برداشت کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ بقول اسد سلیم : ''شیخ ذونواس نے یمن میں خندق کھدوائی اور تیس ہزار کے قریب اُن عیسائیوں کو زندہ جلوا دیا جنھوں نے یہودیت اختیار نہ کی۔''
(''رسول اللہ ﷺ کی خارجہ پالیسی'' صفحہ ۲۰۵)

سید ابوالحسن ندوی اپنے مقالہ ''بعثتِ محمدی ﷺ سے پہلے'' میں تحریر کرتے ہیں: ''اگر کوئی شودر کسی برہمن کو ہاتھ لگائے یا گالی دے تو اُس کی زبان تالو سے کھینچ لی جائے۔'' (رسول نمبر' ج ۳' ص ۱۰۹)

''یہ تھا حال ہندو مت میں عدمِ برداشت کا! اسی طرح رومی سلطنت کا تاریخ عدمِ برداشت کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ یہ تاریخ وحشیانہ سزاؤں اور لرزہ خیز مظالم کی داستانوں سے بھری پڑی ہے۔''

''انسائیکلو پیڈیا بریٹینیکا میں درج شدہ مضمون ''سپین'' کے مطابق ۱۴۹۲ء میں سپین میں اسلامی سلطنت کا خاتمہ ہوا۔ ساڑھے تین لاکھ مسلمانوں کو مذہبی عدالت میں پیش کیا گیا۔ اُن میں سے ۲۸٬۵۴۰ کو سزائے موت ملی اور بارہ ہزار کو زندہ جلا دیا گیا۔ بقول رابرٹ ہریفو ''ڈیڑھ لاکھ کے قافلے میں سے ایک لاکھ مسلمانوں کو سپین میں قتل کر دیا گیا۔'' ("The Making of Humanity" page : 253)

''ڈاکٹر غلام جیلانی برق اپنی تصنیف ''یورپ پر اسلام کے احسان'' کے صفحہ ۸۷ پر لکھتے ہیں کہ ۱۶۱۰ء میں تمام مسلمانوں کو سپین چھوڑنے کا حکم دیا گیا۔ ۱۶۳۰ء میں ایک مسلمان بھی سپین میں باقی نہ رہا حالانکہ مسلمانوں نے قریباً پونے آٹھ سو سال حکومت کی۔''

''عدمِ برداشت کی چند اور مثالیں ملاحظہ ہوں جس سے خونِ انسانی کی ارزانی کا اندازہ لگائیں:

۱۔ ۱۰۷ قبل از مسیح (یروشلم) چالیس ہزار اشخاص ذبح ہوئے۔
۲۔ ۱۱۷ قبل از مسیح (یروشلم) ایک لاکھ بیس ہزار اشخاص مارے گئے۔
۳۔ ۹۵۷ قبل از مسیح (یروشلم) ایک لاکھ یہودی مارے گئے۔
۴۔ ۷۰ قبل از مسیح (یروشلم) گیارہ لاکھ یہودی مارے گئے۔
۵۔ ۳۶۔۱۳۵ ق۔م (یروشلم) پانچ لاکھ اَسی ہزار یہودی ذبح ہوئے۔

جنگ عظیم اوّل اور دوم میں عدمِ برداشت کی وجہ سے:
جنگ عظیم اوّل: تہتر لاکھ اڑتیس ہزار افراد مارے گئے۔
جنگِ عظیم دوم: چار کروڑ اشخاص لقمہ اجل ہوئے۔ (نقوش' رسول نمبر' ج ۴' ص ۳۱۳)

''اس کے مقابل رحمۃ للعالمین ﷺ اور پیکرِ رحمت ﷺ کے غزوات میں مسلمان شہداء اور کفار مقتولین کی تعداد سیرت نگاروں کے مطابق دو ہزار سے زیادہ نہیں بنتی۔ یہ ہے برداشت و حلم کی سنہری مثال!''
(ماہنامہ ''منہاج القرآن'' لاہور' مارچ ۲۰۰۸' صفحات ۲۵'۲۶)

حیاۃ الرسول ﷺ میں قبل از بعثت برداشت کا مظاہرہ : رسولِ اکرم ﷺ کی شخصیت میں قبل از بعثت تمام صفات کاملہ بدرجہ اتم موجود ہیں۔ آپ کی شخصیت قیامت تک کے لئے نمونہ ہے۔ اس لئے کہ آپ کے اخلاقِ عالیہ میں سچائی، حلم، صدق و وفا، برداشت، محبت، شجاعت اور تواضع جیسی تمام صفاتِ حسنہ اپنی جامع حالت میں موجود تھیں اور انہی صفات کی وجہ سے تو جبریلِ امین نے کہا تھا:

آفاقہا گردیدہ اَم مہرِ بتاں ورزیدہ اَم بسیارِ خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

''میں زمین میں مشرق سے مغرب تک گھوما ہوں اور خوب سے خوب تر اور ایک سے ایک بڑھ کر لوگ دیکھے ہیں لیکن اے پیارے محبوبِ ربّ العالمین! آپ جیسا میں نے کوئی نہیں دیکھا۔''

رسولِ اکرم ﷺ اِس حالت میں جوان ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو جاہلیت کی بُری عادتوں سے اپنی حفاظت میں رکھا۔ بہت جلد آپ ﷺ اپنی قوم میں اپنے عالی اخلاق، بہترین حسب و نسب، اچھے پڑوسی، سب سے زیادہ برداشت کرنے والے، سب سے زیادہ سچے، سب سے زیادہ امانت والے اور بے حیائی سے سب سے زیادہ دُور رہنے والے کی حیثیت سے مشہور ہو گئے اور آپ ﷺ کو ''الامین'' کے لقب سے نوازا گیا۔ آپ ﷺ کی شخصیت کے یہ عالی اخلاق نبوت سے پہلے ہی ظاہر ہو گئے تھے۔ آپ ﷺ جاہلیت کے برے ماحول کا مقابلہ کرتے رہے۔ آپ اپنی قوم کی برائیوں کو ختم کرنے کے لئے سوچتے تھے اور خون خرابہ ہونے اور لوگوں کو نقصان پہنچنے کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ جب آپ کی عمر ۳۵ سال کی ہوئی تو اہلِ مکہ نے بیت اللہ کی از سرِ نو تعمیر کا فیصلہ کیا۔ تعمیر کے بعد حجرِ اسود کو متعلقہ جگہ پر رکھنے کے معاملے میں عرب قبائل زبردست اختلاف کا شکار ہو گئے۔ قریب تھا کہ تلواریں چل جاتیں لیکن اُن کا اس بات پر اتفاق ہو گیا کہ محمد ابن عبداللہ اس تنازعہ میں ثالث ہوں گے۔ آپ نے حجرِ اسود کو چادر میں رکھا، تمام قبائل کو بلایا اور کہا کہ ہر قبیلہ چادر کے ایک سرے کو پکڑے اور سب مل کر اُسے بلند کریں۔ اُنہوں نے ایسا ہی کیا اور جب یہ پتھر مخصوص جگہ پر پہنچا تو آپ ﷺ نے اُسے اپنے دستِ مبارک سے متعلقہ جگہ پر نصب کر دیا۔ یہ مثال آپ ﷺ کی سیاسی حکمتِ عملی کی اُس عظیم خوبی کو ظاہر کرتی ہے جس میں آپ ﷺ خون خرابے کو پسند نہیں کرتے تھے اور تنازعات کو پُر امن، عالی حوصلگی اور قوتِ برداشت سے حل کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

دعوت الی الاسلام اور برداشت کا مظاہرہ : جب آپ ﷺ کی عمر چالیس سال کی ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوّت کے منصب پر فائز فرمایا۔ آپ ﷺ کمال برداشت اور صبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے تین سال تک خفیہ دعوت دیتے رہے جس کے بعد آپ کو علی الاعلان دعوت دینے کا حکم ملا۔ بنو ہاشم نے اِس دعوتِ حق کو قبول نہیں کیا بلکہ اس کا مذاق اڑایا۔ لیکن آپ ﷺ نے اس مشکل صورتِ حال میں بھی برداشت کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ آپ ﷺ مایوس نہیں ہوئے اور کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر اہلِ مکہ کو بلایا اور فرمایا:

''تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر میں تمہیں یہ خبر دوں کہ صفا کے دامن میں ایک لشکر تم پر حملہ آور ہونے کو ہے تو کیا تم میری بات مان لو گے؟''

اُنہوں نے جواب دیا: ہاں، اس لئے کہ ہم نے آپ کو ہمیشہ سچا پایا ہے۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: تو پھر اُس

ایک اللہ وحدہٗ لاشریک کی وحدت کو مان لو تو عرب و عجم تمہارے زیرِ نگیں ہوں گے۔ ابولہب نے آپ کا مذاق اڑایا اور آپ کے لئے بیہودہ' گستاخانہ الفاظ استعمال کئے لیکن آپ نے کمال برداشت سے کام لیتے ہوئے اُسے کچھ نہ کہا۔

حالات ناگفتہ بہ حد تک انتہائی ناموافق تھے لیکن آپ مایوس نہیں ہوئے اور اپنے مقصد کی خاطر کوششیں جاری رکھیں۔ مخلوقِ خدا کو شب و روز اللہ کی طرف بلایا اور کوئی بھی آپ کو اِس راہ سے ہٹا نہیں سکا۔ آپ ﷺ لوگوں کو اُن کی مجالس میں ملتے' حج کے موسم میں قافلوں سے ملتے اور جو بھی آزاد' غلام' کمزور' امیر یا غریب ملتا' اُسے دینِ حق کی طرف دعوت دیتے۔ دعوت کا کام برداشت' عزم' حوصلے اور قربانی کا کام ہے۔ کامیاب قائد مشکل ترین حالات کا بھی مقابلہ کرتا ہے اور اپنے ہدف پر بھی نظر رکھتا ہے۔ یہ چیز نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیاتِ طیبہ میں بدرجہ اتم نظر آتی ہے کہ آپ ﷺ نے تمام قسم کے دباؤ کا بڑی ہمت سے مقابلہ کیا اور جب آپ کے چچا جناب ابو طالب نے قریش کے مطالبے پر آپ سے کہا کہ اے بھتیجے! مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈال جو میں اٹھا نہ سکوں تو آپ ﷺ نے سمجھا کہ شاید اُن کے چچا اُن کی مدد کرنے سے قاصر ہیں لیکن اس کے باوجود آپ کا حوصلہ جوان تھا اور ہدف واضح تھا اور وہ تمام حالات میں ہر قسم کے دباؤ کو ہمت اور حوصلہ سے برداشت کرتا تھا۔ آپ نے اُس موقع پر اپنا تاریخی جملہ فرمایا جو آپ کے برداشت کی بہترین مثال ہے۔ فرمایا:

''چچا جان! اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر چاند اور بائیں ہاتھ پر سورج رکھ دیں کہ میں اپنے ارادے سے باز آ جاؤں تو بھی میں اپنے ارادے سے باز نہیں آؤں گا اور اپنے مشن کو جاری رکھوں گا۔''

نبی محترم و مکرم ﷺ کی دعوت آپ کی برداشت اور قریشِ مکہ کے ظلم و ستم کی معرکہ آرائی ہے۔ قریش نے جب آپ ﷺ کی دعوت کو پھیلتے ہوئے دیکھا تو اُنہوں نے آپ ﷺ اور آپ کے صحابہ کو شدید اذیتیں دینا شروع کر دیں۔ اُنہوں نے آپ کو جھٹلایا' آپ کی ہجو کی اور آپ ﷺ پر جادوگری اور جنون وغیرہ کے الزامات بھی لگائے۔ لیکن ان سب مشکلات کے باوجود آپ ﷺ اپنے مقصد پر ڈٹے رہے اور کمال حوصلہ و جرأت سے اُن کا سامنا کرتے رہے۔ جب قریش اپنے ظلم و ستم کے باوجود اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہوئے تو اُنہوں نے آپ سے سودے بازی کی کوششیں شروع کر دیں اور آپ کو مال و دولت' مزید شادی اور علاج وغیرہ کی پیشکش کی۔ آپ ﷺ نے اس پیشکش کا جواب سورہِ سَجدَہ کی تلاوت سے دیا اور تحمل و برداشت کا دامن نہیں چھوڑا۔

اعلانِ نبوت کے بعد تین سال بڑی سختی اور آزمائش کے تھے۔ ابوجہل اور کفارِ مکہ کی کھلم کھلا مخالفت' مزاحمت' تضحیک اور سب و شتم کے باوجود آپ ﷺ نے تحمل کا مظاہرہ کیا۔ سال ۵ نبوی سے ۱۰ نبوی تک یعنی جناب ابو طالب کی وفات تک کفارِ مکہ نے تشدد کا مظاہرہ کیا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اُن کا مالک اُمیّہ بن خلف دوپہر کے وقت تپتی ریت پر لٹا کر اُنہیں طرح طرح کی اذیتیں دیتا۔ حضرت خباب رضی اللہ عنہ کو دہکتے کوئلوں پر لٹایا جاتا یہاں تک کہ اُن کی پیٹھ کی چربی باہر نکل آتی۔ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کو اِتنا مارا جاتا کہ وہ بے ہوش ہو جاتے۔ حضرت صہیب' حضرت ابوفکیہ' حضرت زبیر' حضرت ابوذر اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم پر ظلم'

مسلمان لونڈیوں لبینہ، زنیرہ، نہدیہ اور اُمّ عمیس رضی اللہ عنہن پر بے پایاں ظلم اور سفا کی تاریخ اسلامی کی کتاب میں مرقوم ہے۔ یہ حضور اکرم ﷺ کی تعلیمات ہی کا نتیجہ تھا کہ اِن مظلومین نے کمال صبر و استقلال کے ساتھ اُن پر کئے گئے مظالم کو بڑے حوصلے سے برداشت کیا۔

اِسی ظلم کی بناء پر آپ ﷺ نے مسلمانوں کو ہجرتِ حبشہ کا حکم دیا۔ شاہِ حبشہ نجاشی نے بے پایاں مذہبی رواداری کا مظاہرہ کیا اور مسلمانوں کو اپنے ہاں پناہ دی۔

شعب ابی طالب میں محصوری : اسلام کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لئے قریشِ مکہ نے ایک اور حربہ اختیار کیا کہ نبی علیہ السلام اور اُن کے ساتھیوں سے معاشرتی مقاطعہ کرتے ہوئے اُنہیں شعبِ ابی طالب میں بند کر دیا اور یہ قید و بند کا عرصہ تین سال تک جاری رہا جس دوران اِس بھرے جہان میں کوئی بھی شخص اُن سے بات چیت کرنے، خرید و فروخت کرنے اور لین دین کرنے کا روادار نہ تھا۔ آپ اور آپ کے صحابہ کرام نے یہ عرصہ انتہائی بھوک، پیاس اور کس مپرسی کے عالم میں گزارا اور درختوں کے پتے کھا کھا کر اور ایک دوسرے کی زبانیں چوس چوس کر گزارہ کیا۔ بھوک سے بچے تمام رات روتے تھے۔ محاصرہ میں رسولِ اکرم ﷺ اور بنو ہاشم اتنے کمزور ہوئے کہ کسی کی صورت پہچانی نہیں جاتی تھی لیکن کیا مجال کہ عزم و ثبات اور قوتِ برداشت کے اِن عظیم پہاڑوں کے ارادوں میں ذرہ بھر بھی لغزش آئی ہو۔ تاریخِ عالم ثبات و برداشت کی ایسی اعلیٰ و ارفع مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ تین سال کے بعد یہ معاشرتی مقاطعہ ختم ہو گیا۔

تبلیغ دین اور اِعلائے کلمۃ الحق کی خاطر آپ ﷺ طائف تشریف لے گئے تو وہاں کے بدبختوں نے نہ صرف آپ ﷺ کا پیغام ٹھکرایا بلکہ شہر کے غنڈوں کو آپ ﷺ کے پیچھے لگا دیا۔ اُنہوں نے آپ کو اس قدر پتھر مارے کہ آپ لہولہان ہو کر زمین پر آ رہے۔ آپ ﷺ کے خادم حضرت زید رضی اللہ عنہ آپ کو باغ میں لے گئے اور آپ کے زخم دھوئے۔ اِس قدر ظلم کئے جانے کے باوجود بھی آپ نے اُنہیں بددعا نہ دی بلکہ رب کے حضور عرض کناں ہوئے : اَللّٰهُمَّ اِهْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (الٰہی! میری قوم کو ہدایت عطا کیجئے کہ وہ نہیں جانتے کہ میں اُن کے بارے میں کیا چاہتا ہوں۔)

قریش کے ظلم و ستم میں مزید شدت پیدا ہو گئی۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو شدید ترین جسمانی اذیتیں دی جانے لگیں اور رسولِ اکرم ﷺ کو قتل کرنے کے منصوبے بننے لگے۔ آپ ﷺ نے جب یہ محسوس کیا کہ اب ظلم حد سے بڑھ رہا ہے اور ناقابلِ برداشت ہو گیا ہے تو آپ ﷺ نے باذنِ الٰہی مکہ سے مدینہ کو ہجرت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

مدینہ کی اسلامی ریاست کے قیام میں رسولِ اکرم ﷺ کا جذبہ برداشت: ہجرتِ مدینہ

کے دوران راستے کی ہر تکلیف کو برداشت کیا۔ مدینہ پہنچ کر مسجدِ نبوی کی تعمیر میں مزدور بن کر کام کیا۔ آپ نے انصار اور مہاجرین کو جمع کر کے مواخات کا نظام قائم کیا۔ یہ ایثار بے مثال تھا۔ ہجرتِ مدینہ کے بعد بھی کفار کی طرف سے ہر حملے کو برداشت کیا اور اپنے مشن پر ڈٹے رہے۔ غزواتِ بدر و اُحد اور خندق (اَحزاب) میں صعوبتوں کو برداشت کیا اور دلیرانہ مقابلہ کرتے رہے۔

اسلام میں برداشت اور مذہبی رواداری ہے اور غیر مسلموں کے معبدوں کا احترام ہے۔ مذہبی رواداری اور برداشت کی ایک روشن مثال حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دَور میں نجران کے وفد کی ہے۔ یہ وفد نصاریٰ کا تھا جو آپ ﷺ کی خدمت میں مدینہ منورہ میں حاضر ہوا۔ آپ علیہ السلام نے اِس وفد کی مہمانداری کی۔ مسجدِ نبوی میں نہ صرف اُنہیں جگہ دی بلکہ اُنہیں اُن کے اپنے طور طریقے پر عبادت کرنے کی اجازت بھی دی۔ (''اسلام کی مذہبی رواداری'' از ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم' ماخوذ از ''نقوش' جلد سوم' صفحہ ۶۶۶)

۹ ہجری میں آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بہت سے قبائلی وفود اور بعض ممالک کے سفارتی مشنوں کا مدینہ میں استقبال کیا۔ اِسی لئے اِس سال کو ''سَنَةُ الوفود'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اِن وفود کا استقبال رسولِ اکرم ﷺ کی طرف سے اُن کی تقالید' عقائد اور ضروریات کے اعتراف کا بہت بڑا مظاہرہ تھا۔ آپ نے ان وفود کو مکمل امان دی' اُن کی ضروریات کا انتظام کیا' اُن کی رہائش کے لئے رہائش گاہ مخصوص کی۔ مسجدِ نبوی میں ایک خاص جگہ اِن وفود سے ملاقات کے لئے مختص کر دی یہاں تک کہ بعض وفود کو مسجدِ نبوی میں اپنی عبادت کرنے کی اجازت بھی عطا فرمائی۔

جن وفود کا رسولِ اکرم ﷺ نے استقبال کیا' اُن کی فہرست بہت لمبی ہے۔ اِن وفود کی مدینہ میں آمد اور رسولِ اکرم ﷺ سے ملاقاتوں کے نتائج بہت حوصلہ افزا تھے۔ اسلامی دعوت نے لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا۔ جو علاقے فوجیوں سے فتح نہیں ہوئے تھے' اُنہیں رسولِ اکرم ﷺ کے کلمات نے اسلامی حکومت کے سامنے سرنگوں کر دیا۔ جو نتائج رسولِ اکرم ﷺ کی اس سیاسی حکمتِ عملی سے برآمد ہوئے' وہ اسلامی نظامِ حیات میں دوسروں کو برداشت کرنے کے اصولوں کو واضح کرتے ہیں۔ ان وفود کی آمد کے نتائج پر تبصرہ کرتے ہوئے Sir Arnold لکھتے ہیں:

''بے شک وہ بہترین معاملہ جو اِن مختلف وفود کے ساتھ نبی کریم نے روا رکھا اور جس اہتمام سے اُن کی شکایات کو سنا اور جس طرح حکمت کے ساتھ اُن کے اختلاف کو ختم کرایا اور ان میں سے جنہوں نے اسلام قبول کیا' اُنہیں قطعاتِ اراضی عطا فرمائے اور مسلمانوں کے لئے اُن کا نرمی کے جذبات کا اظہار کرنا وغیرہ جیسے کاموں نے آپ ﷺ کا نام اُن کے لئے محبوب بنا دیا۔ آپ کی شہرت پورے ملک جزیرۃ العرب میں پھیل گئی اور آپ ﷺ ایک عظیم سردار اور مہربان شخص کے طور پر معروف ہو گئے۔''

<u>رسولِ اکرم ﷺ کی سیاستِ خارجہ اور برداشت کے جذبات</u>: دعوتِ اسلام پوری دنیا کے لئے ہے کیونکہ ربِّ ذوالجلال والاکرام نے آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا۔ اس دعوت کو دنیا تک

پہنچانے کے لئے آنحضرت ﷺ نے مختلف حکمرانوں کو سفارتی مشن روانہ کئے جن کے ساتھ آپ نے جو خطوط ان حکمرانوں کو لکھے وہ رسول اکرم ﷺ کی خارجہ پالیسی میں دوسروں کو برداشت کرنے' اُن کے ساتھ پُرامن تعلقات قائم کرنے اور اسلامی ریاست کو بین الاقوامی سطح پر تسلیم کروانے جیسے بنیادی عناصر کی نشان دہی کرتے ہیں۔

اِن خطوطِ نبوی میں اساسی نقطہ یہ تھا کہ اُس موقف سے مذاکرات شروع کئے جائیں جس پر اتفاق پہلے سے موجود ہو۔ چنانچہ اس بنیادی نقطہ سے اپنی دعوت کا آغاز کرنا اور اپنے سفراء کو روانہ کرنا رسول اکرم ﷺ کی وہ بھرپور کوشش تھی جس کے ذریعے دوسری قوموں کے اندر اسلامی دعوت کو سمجھنے اور برداشت کرنے کے جذبات پیدا کرنا تھا۔ چنانچہ رسالتمآب ﷺ کے یہ سفارتی مشن جو حبشہ' روم' فارس' مصر اور بعض دوسرے اہم ممالک کے سربراہوں کی طرف روانہ کئے گئے' اپنے مقاصد میں کامیاب ہو گئے۔ کئی سربراہوں نے اسلام کو قبول کرنے کی خواہش کا اظہار کیا اور آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف تحفے روانہ کئے۔

يَومُ المَرْحَمة (عام معافی کا دن) : یکم جنوری 630ء مطابق ۱۰ رمضان المبارک ۸ھ کو آپ ﷺ دس ہزار صحابہ کے ساتھ مکہ مکرّمہ کی طرف روانہ ہوئے اور مکہ فتح کیا۔ اُس موقع پر آپ ﷺ نے عفو و درگزر' رواداری اور برداشت کی ایک عظیم الشان روایت قائم کی۔ بقول ڈاکٹر حمیداللہ:

''اکیس سال کی غیر منقطع کشاکش کے بعد مکہ پر اچانک اسلامی فوج کا قبضہ ہو گیا اور یہ جوہری بم سے بھی زیادہ بے بس کر دینے والا واقعہ تھا۔ فتح مکہ کے موقع پر سرورِ کائنات ﷺ نے اہلِ شہر کو جمع کر کے فرمایا تھا:

لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ إِذْهَبُوا فَانْتُمُ الطُّلَقَاءُ

''آج تم پر کوئی الزام باقی نہیں۔ جاؤ تم سب کو چھوڑا جاتا ہے۔''

(''رسولِ اکرم کی سیاسی زندگی'' از ڈاکٹر حمیداللہ' صفحہ ۳۲۶)

کاش کہ کوئی آئزن ہاور' کوئی سٹالن' کوئی میک آرتھر' محمد رّسول اللہ ﷺ کی اِس سنت پر عمل کی توفیق پاتا اور محرومین کی آئندہ انتقامی جنگ کے امکان کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر کے انسانوں کو امن و چین عطا کر سکتا۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے میثاقِ مدینہ کے ذریعے مذہبی رواداری اور برداشت کا درس دیا۔ بقول ڈاکٹر حمیداللہ ''یہ دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور تھا۔'' (''عہدِ نبوی میں نظامِ حکمرانی'' صفحہ ۷۵)

آپ ﷺ نے غیر مسلموں کو ایک قومیت کی لڑی میں پرو دیا۔ بقول محمد حسین ہیکل: ''معاہدین کی یہ بستی (شہرِ مدینہ) اس میں رہنے والوں کے لئے امن کا گہوارہ بن گئی۔'' (''حیاتِ محمد ﷺ'' صفحہ ۲۷۰)

آپ نے خطبہ حجۃ الوداع میں بین الاقوامی امن' رواداری اور برداشت کا درس دیا اور فرمایا:

''لوگو! تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری عزتیں ایک دوسرے کے لئے ایسی ہی حرام ہیں جیسے تمہارے لئے آج کا دن، اِس شہر اور اِس مہینہ کی حرمت ۔ خبردار! میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے لگو۔''

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر نے اپنی کتاب ''پیغمبرِ اعظم و آخر'' کے صفحہ ۶۳۹ میں کہا کہ نبی اکرم ﷺ نے خطبہ حجۃ الوداع میں باہمی معاملات میں دیانت، عزتِ نفس، رواداری اور مدارات کا درس دیا۔

سید اَسعد گیلانی ''رسولِ اکرم کی حکمتِ انقلاب'' کے صفحہ ۹۷ میں لکھتے ہیں: ''آپ نے دشمنوں کو اخلاق کے اسلحہ سے فتح کیا۔'' آپ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے :
''کوئی مسلمان بازار سے نیزہ لے کر گزرے تو اُس کے ایک حصے کو ہاتھ سے تھام لے تاکہ کسی مسلمان کو اذیت نہ پہنچے۔'' (صحیح بخاری)

مولانا صفی الرحمن مبارکپوری اپنی شہرہ آفاق کتاب ''سیرت الرحیق المختوم'' کے صفحہ ۶۷ پر رقمطراز ہیں:
''بردباری، قوتِ برداشت، قدرت پاکر درگزر اور مشکلات پر صبر ایسے اوصاف تھے جن کے ذریعہ اللہ نے آپ ﷺ کی تربیت کی تھی۔ نبی ﷺ کی بلند کرداری کا عالم یہ تھا کہ آپ ﷺ کے خلاف دشمنوں کی ایذا رسانی اور بدمعاشوں کی خودسری و زیادتی جس قدر بڑھتی گئی، آپ کے صبر و حلم میں اُسی قدر اضافہ ہوتا گیا۔''

نعیم صدیقی نے ''محسنِ انسانیت'' کے صفحہ ۵۹ میں درست کہا: ''حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قائدانہ بصیرت اور سیاسی حکمت کا مطالعہ ہم پر لازم ہے۔''

ہم تعلیماتِ نبوی ﷺ کی روشنی میں عدمِ برداشت کے مسئلے کو بخوبی حل کر سکتے ہیں۔ آپ کے ارشاداتِ گرامی ہیں :

(۱) مَنْ حَمَلَ عَلَيْنَا السِّلَاحَ فَلَيْسَ مِنَّا
''جس کسی نے ہم پر ہتھیار اٹھائے، اُس کا تعلق ہم سے نہیں۔''

بہ الفاظِ دیگر دوسروں پر اسلحہ سے حملہ آور ہونا عدمِ برداشت کی ایک صورت ہے۔

(۲) سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوقٌ وَقِتَالُهُ كُفْرٌ (متفق علیه)
''مسلمان کو گالی دینا گناہ کی بات ہے اور اُس کا قتل کرنا کفر ہے۔''

(۳) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ رَجُلاً قَالَ لِلنَّبِيِّ ﷺ: أَوْصِنِيْ قَالَ: لَا تَغْضَبْ فَرَدَّدَ

ذٰلِكَ مِرَارًا قَالَ : لَا تَغْضَبْ (صحیح البخاری)

''ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ مجھے کچھ نصیحت فرمائیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ غصہ مت کیا کرو۔ اُس شخص نے پھر اپنی وہی درخواست کئی بار دُہرائی کہ حضرت! مجھے کچھ نصیحت فرمائیں۔ مگر آپ ﷺ نے ہر دفعہ یہی فرمایا کہ غصہ مت کیا کرو۔''

(۴) لَيْسَ الشَّدِيْدُ بِالصُّرْعَةِ إِنَّمَا الشَّدِيْدُ الَّذِيْ يَمْلِكُ نَفْسَه، عِنْدَ الْغَضَبِ (صحیح مسلم)

''طاقتور وہ نہیں جو اپنے مدِّ مقابل کو پچھاڑ دے بلکہ طاقتور وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے پر قابو رکھے۔''

رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی نے ہمیشہ در پردہ دشمنوں کی حمایت کی۔ وہ واقعہ اِفک میں براہِ راست ملوّث تھا۔ بقول علامہ شبلی وعلامہ سید سلیمان ندوی:

''دشمنوں کی شماتت' ناموس کی بدنامی۔۔ یہ باتیں انسانی صبر وتحمل کے پیمانہ میں نہیں سماسکتیں۔ تاہم رحمتِ عالم ﷺ نے ان سب باتوں کے باوجود اُس کے ساتھ اچھا سلوک کیا۔'' (''سیرت النبی'' حصہ دوم' صفحہ ۲۱۱)

صحابہ کرام نے کئی بار آپ علیہ السلام سے اُس کے قتل کی اجازت چاہی مگر آپ نے سختی سے منع فرمادیا۔ نہ صرف حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عبداللہ بن اُبی کو معاف کیا بلکہ اُس کے مرنے کے بعد اُسے اپنی قمیص پہنائی۔

اہلِ طائف نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کیا سلوک کیا مگر ۹ ہجری میں جب اُن کا وفد مدینہ منورہ پہنچا تو آپ علیہ السلام نے اُنہیں صحنِ مسجد میں ٹھہرایا اور اُن سے عزت وحرمت سے پیش آئے۔

ایک دن ایک بدّو نے آکر اِس زور سے آپ کی چادر کھینچی کہ آپ علیہ السلام کی گردن مبارک سرخ ہو گئی۔ آپ ﷺ نے مڑکر اُس کی طرف دیکھا تو وہ کہہ رہا تھا کہ میرے اونٹوں کو غلہ سے لاد دے۔ اُس نے گستاخانہ جملے بھی کہے۔ آپ ﷺ نے اُس کے اونٹوں پر جَو اور کھجوریں لدوا دیں اور اُس سے کچھ تعرض نہ فرمایا۔ (بحوالہ علامہ شبلی نعمانی وعلامہ سید سلیمان ندوی ''سیرۃ النبی ﷺ'' حصہ دوم' صفحہ ۲۱۳)

''**عدمِ برداشت کا قومی رجحان**: پاکستان آج بے شمار مسائل سے نبرد آزما ہے۔ اُس پر بے شمار خطرات منڈلا رہے ہیں۔ فکری انتشار' خدمتِ خلق کے جذبے سے عاری' عدمِ برداشت کی عادی بیوروکریسی اور کرپٹ ٹیکنوکریسی' مجرمانہ تغافل' ثقافتی کنفیوژن' ثقافتی روایات کی توڑ پھوڑ' محبت' یگانگت' اُنسیت اور اپنائیت کا فقدان' مختلف قومیتوں کا اندیشہ' لسانی گروہ بندی' علاقائی عصبیتیں' صوبائی تعصب' ذات' برادری

علاقائی تفاوت، رنگ اورنسل کی بنیاد پر عدمِ برداشت کا رُجحان، مذہبی فرقہ واریت اور دہشت گردی کا رُجحان، اتحاد بین المسلمین کا فقدان، اسلام دشمن اور ملک دشمن عناصر اور تنظیموں کا منفی کردار، دلوں پر نفرتوں کا بوجھ، دماغوں پہ آلودگیوں کا انبوہ، جسم پر موٹے موٹے منافقت کے لبادے، اغوا، قتل، اغوا برائے تاوان، ڈاکے، بھیانک جرائم، سیاسی اور مذہبی رہنماؤں کا قتل، عصمت دری، خانہ سوزی، جسم سوزی، گولیوں کی گھن گرج، نت نئے بسائے جانے والے قبرستان، ظلم کی کالی اور بھیانک راتیں ۔۔ الغرض خوشرنگ زمین کو خون رنگین میں بدل دیا گیا۔ یہ سب عدمِ برداشت کی قباحتیں ہیں۔''

پاکستان میں عدمِ برداشت کا رجحان ملک کی سلامتی، بقا اور ترقی کے لئے رکاوٹ ہے۔ عدمِ برداشت کا رجحان حسب ذیل شعبوں میں ہے :

(۱) قومی سیاست میں عدمِ برداشت کا رُجحان۔
(۲) معاشرتی امور میں عدمِ برداشت کا رُجحان۔
(۳) مذہب میں عدمِ برداشت کا رُجحان۔

''1947-58ء کا دَور پاکستان کے لئے ابتلاء کا دَور تھا۔ خواجہ ناظم الدین، غلام محمد اور اسکندر مرزا کے دَور میں سیاست میں عدمِ برداشت کا رُجحان رہا۔ عدمِ برداشت کا مظاہرہ آئین ساز اسمبلی توڑنے کی صورت میں کیا گیا۔ 1969-71ء کے دوران ہم نے مشرقی پاکستان سے عدمِ برداشت کا مظاہرہ کیا۔ گو مشرقی پاکستان کی علیحدگی میں بین الاقوامی سیاست بھی کارفرما تھی تاہم ہم اپنے آپ کو کسی صورت میں بھی بری الذمہ قرار نہیں دے سکتے۔ 1973ء میں پہلی بار عوامی آئین بنا۔ اُس کے آرٹیکل نمبر 20 کے ذریعے مذہب کی آزادی کا تصوّر دیا گیا۔ نیز آرٹیکل نمبر 36 کے تحت اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کیا گیا اور اس کے بعد کی صورتِ حال بھی ہمارے سامنے ہے۔ 1988-89ء کے دوران میں بھی قومی سیاست میں عدمِ برداشت کا رجحان رہا۔''

''معاشرتی امور میں عدمِ برداشت کا رُجحان انتہائی مضر ہے۔ پاکستانی معاشرے میں اخوت کا جذبہ کم ہوتا نظر آ رہا ہے۔ معیشت تباہی کے دہانے پر آن کھڑی ہے جس سے جرائم میں اضافہ ہو رہا ہے۔ غریب لوگ غربت کو برداشت نہیں کر پاتے اور خودکشی کا سہارا لیتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کو معاف نہیں کرتے، اوروں کی زیادتیوں کو درگزر نہیں کرتے جس سے جھگڑے اور فسادات عام ہوگئے ہیں۔''

''پاکستان میں مذہبی جماعتوں میں بھی عدمِ برداشت کی وجہ سے فرقہ واریت نے جنم لیا ہے۔''

''فرقہ واریت: <u>عدمِ برداشت کی بدترین شکل</u> : قرآن حکیم نے اتفاق و اتحاد کا درس دیا اور فرمایا:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (آل عمران : ۱۰۳)

''اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ مت ڈالو۔'' (۳ : ۱۰۳)

''مذہبی نفرت کے بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَىْءٍ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَىْءٍ وَّ هُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ (البقرۃ : ۱۱۳)

''اور یہود کہتے ہیں کہ نصرانیوں کی بنیاد کسی شے (یعنی صحیح عقیدے) پر نہیں اور نصرانی کہتے ہیں کہ یہودیوں کی بنیاد کسی شے پر نہیں حالانکہ وہ (سب اللہ کی نازل کردہ) کتاب پڑھتے ہیں۔ اِسی طرح وہ مشرک بھی اُنہی جیسی بات کرتے ہیں۔''

''دہشت گردی۔ عدمِ برداشت کی بھیانک شکل : دَورِ جدید میں دہشت گردی عدمِ برداشت کی بھیانک اور خوفناک شکل ہے۔ دنیا کے مختلف ممالک میں دہشت گردی اور لاقانونیت زوروں پر ہے۔ عدمِ برداشت جب اقوامِ عالم میں بڑھ جائے تو پھر یہ دہشت گردی کی بدترین شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ آج انسانیت بربادی اور کشت وخون کے دہانے پر کھڑی ہے۔ اخوت' برداشت' باہمی ہمدردی اور محبت کا فقدان ہے۔ وقت کی اہم ضرورت ہے کہ دہشت گردی کے مسئلے کا بین الاقوامی طور پر حل تلاش کیا جائے۔''

''عدمِ برداشت کا بین الاقوامی رُجحان : قرآنِ حکیم میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے فسادٌ فِی البرّ و البحر کا ذکر کیا ہے۔ یہ فساد عالمی سطح پر ہے اور اُس کی اصل وجہ عدمِ برداشت ہے جو اقوامِ عالم کا وطیرہ بن چکا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے :

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ○ (اَلرُّوم : ۴۱)

''خشکی اور تری میں لوگوں کے کرتوتوں کی وجہ سے بلائیں پھوٹ پڑی ہیں اس غرض سے کہ اللہ اُنہیں اُن کے بعض اعمال کا مزہ چکھائے تاکہ وہ لوگ باز آجائیں۔'' (۴۱ : ۳۰)

آیتِ بالا کے ترجمہ کا خط کشیدہ حصّہ اس حقیقت کی نقاب کشائی کر رہا ہے کہ حضرتِ انسان کو اُن خاردار جھاڑیوں کی چبھن کو محسوس کرنا چاہئے جن سے اُس نے اپنی بہ لحاظِ دیگر ہموار زندگی کو پُر کرلیا ہے اور یہ کہ اُسے اپنے اَبنائے جنس اور خالقِ حقیقی کے خلاف کی گئی زیادتیوں اور گناہوں کے مہیب نتائج کا مزہ چکھنا چاہئے تاکہ وہ اصلاحِ احوال کرلے اور بازارِ حیات کے بند ہونے کی آخری گھنٹی بجنے سے پہلے اُن گناہوں سے تائب ہوجائے۔

''دَورِ جدید بدترین قسم کا فساد پہلی جنگِ عظیم اور دوسری جنگِ عظیم کی صورت میں دیکھ چکا ہے۔ جانی نقصانات کے علاوہ مالی نقصانات کی ہولناکیوں کا اندازہ اِن اعداد وشمار سے لگایا جاسکتا ہے:

(۱) پہلی جنگِ عظیم میں خرچ کا تخمینہ : 80 اَرب پونڈ۔

(۲) دوسری جنگِ عظیم میں 1939ء تا 1944ء روزانہ وہ رقم جو صرف برطانیہ جنگ پر خرچ کرتا رہا: ساڑھے 19 کروڑ پونڈ۔

''بین الاقوامی سطح پر عدمِ برداشت کی وجہ سے ہر سُو ایک فساد برپا ہے۔ افغانستان، کشمیر، فلسطین، بوسنیا، چیچنیا، اریٹریا، صومالیہ، الجزائر اور دنیا کے دیگر گوشوں میں امن مفقود رہا ہے۔ عدمِ برداشت کا رجحان اسلحہ کی دوڑ اور ایٹمی پھیلاؤ کی صورت میں نمودار ہو کر اقوامِ عالم میں عدمِ تحفظ کا احساس پیدا کر رہا ہے۔''

''اِس صدی میں عدمِ برداشت کے رجحان نے اقوامِ عالم کے امن کو پارہ پارہ کر دیا۔

چین کی خانہ جنگی (49-1945)	کوریا کی جنگ (53-1950)
انڈونیشیا میں فسادات (65-1958)	کانگو میں خانہ جنگی (64-1960)
الجیریا اور مراکش کے مابین جھگڑا (1963)	یمن میں خانہ جنگی (69-1962)
ویت نام کی جنگ (72-1965)	نائیجیریا میں خانہ جنگی (70-1967)
مصر اور اسرائیل کی جنگ (1967)	پاکستان اور انڈیا میں جنگیں 1965,71
انگولا میں خانہ جنگی (76-1975)	کمبوڈیا میں بحران (79-1978)

افغانستان کی جنگ (1978، 2002) اور دیگر ممالک میں جنگیں اقوام کے درمیان عدمِ برداشت کے رجحان کی وجہ سے ہوئیں۔ اس صدی کے اواخر میں روسی قیصریت کا عظیم الشان قصر آناً فاناً کھوکھلا ہو گیا۔ روسی اشتراکیت نے بدترین عدمِ برداشت کا مظاہرہ کیا۔ روسی کمیونزم کی زد میں آ کر ہلاک ہونے والوں کی تعداد اڑھائی کروڑ سے چار کروڑ کے درمیان بتائی جاتی ہے۔ آج دنیائے اسلام نئے عالمی نظام کی زد میں ہے۔''

''چند سال پہلے انڈیا نے عدمِ برداشت کی ایک بھونڈی مثال قائم کی۔ بابری مسجد پر لاکھوں ہندوؤں نے ہلّہ بول دیا اور گنبد شریف اور مینار مبارک کو شہید کر دیا اور آناً فاناً مسجد ملبے کا ڈھیر بن گئی۔ انڈیا نے اپنے متعصبانہ رویّے کا اظہار کر کے اپنی ہی ساکھ بین الاقوامی برادری میں برباد کر دی ہے۔ اِسی سرزمینِ پاک و ہند سے شاعرِ مشرق حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے مذہبی برداشت اور رواداری کے گیت الاپے تھے۔''

''مغرب اپنے آپ کو حقوقِ انسانی کا نقیب کہتا ہے مگر وہاں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کے درمیان عدمِ برداشت کا رجحان عروج پر پہنچ چکا ہے۔ شمالی آئرلینڈ اس عدمِ برداشت کی وجہ سے جہنم زار بن چکا ہے۔ ایٹمی ہتھیاروں کی صنعت عروج پر ہے۔ خدانخواستہ اُن کا استعمال دنیا میں قیامت برپا کر سکتا ہے۔'' (ماہنامہ ''منہاج القرآن'' لاہور، مارچ 2008ء، صفحات 26 تا 28)

''The Oxford Encyclopedia of the Modern Islamic World کے مطابق اِس

وقت دنیا میں مسلمانوں کی آبادی 1.2 ملین سے بھی زیادہ ہے۔ قریباً مسلمانوں کا 1/3 حصہ بطور اقلیت کے دنیا کے دیگر ممالک میں رہتا ہے۔ یہ تعداد 350 ملین سے بھی زیادہ ہے۔ اُن پر ہر وقت ملک بدر ہونے کی تلوار لٹکتی رہتی ہے۔ دنیا عدمِ برداشت کا شکار ہے۔ اس کے مقابلے میں جزیہ کی معمولی رقم لے کر اسلامی ریاست ذمیوں کے حقوق کی پاسبانی کرتی ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تو راہب خانوں اور گرجاؤں کو بھی مالی امداد دیتے تھے۔ زکوٰۃ کے آٹھ مصارف میں غیر مسلم بھی آ جاتے ہیں۔ ہارون الرشید کے دَور میں برامکہ کو جو آتش پرست تھے' اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا گیا۔ ہندوستان میں بھی مسلم بادشاہوں نے ہندوؤں اور دیگر مذاہب والوں سے رواداری اور نرمی کا سلوک رکھا۔ سلطنتِ عثمانیہ میں غیر مسلموں کو اہم عہدے ملے۔ محمد دوم (الفاتح) نے تو یونانی کلیسا کی مذہبی سربراہی قبول کر لی کیونکہ اُن کا اُس وقت کوئی سربراہ نہیں تھا۔ اس کے برعکس رنجیت سنگھ نے اپنے دَور میں بادشاہی مسجد کو اصطبل میں تبدیل کر کے عدمِ برداشت کا مظاہرہ کیا۔ اس کے علاوہ دنیا کے دیگر انقلابات میں تشدد اور عدمِ برداشت کی بھیانک مثالیں موجود ہیں۔''

''**تجاویز:** قومی اور بین الاقوامی سطح پر عدمِ برداشت کو روکنے کے لئے حسبِ ذیل تجاویز پیش کی جاتی ہیں:

(۱) مسلم ممالک حضور اکرم ﷺ کی سیرتِ مبارکہ کے اس پہلو (عفو و درگزر' برداشت و حلم) پر بین الاقوامی سیمینار کروائیں تاکہ نہ صرف مسلم اُمہ بلکہ مغربی دنیا تعصب سے باہر نکلے۔

(۲) عدمِ برداشت کا مسئلہ بلاشبہ بین الاقوامی ہے۔ سی ٹی بی ٹی (CTBT) طرز کے معاہدے بین الاقوامی سطح پر ہوئے ہیں لیکن دہشت گردی اور فرقہ واریت کو روکنے کے لئے UNO کردار ادا کرے اور بین الاقوامی سطح پر کانفرنس کرائے۔

(۳) مسلم ممالک سفارتی سطح پر اُن مسلم ممالک کو سمجھائیں جو فرقہ واریت کے لئے فنڈ مہیا کرتے ہیں۔ اس کا تدارک لازم ہے۔

(۴) عدمِ برداشت اور تشدد کے پس منظر میں اقتصادی عوامل بھی کارفرما ہوتے ہیں۔ مسلم اُمہ اپنی اقتصادی حالت بہتر بنائے۔ یہ محنت اور سائنسی ترقی ہی کی بدولت ممکن ہے۔ نیز سودی نظام کا بھی خاتمہ کرنا ہوگا۔

(۵) مسلم علماء فرقہ واریت کو روکنے کے لئے اُسوہ حسنہ پر عمل پیرا ہونے کی کاوش کریں۔

(۶) اتحاد بین المسلمین اور مشترکہ دفاع سے ہم امتِ مسلمہ کے خلاف زیادتیوں کا ازالہ کر سکتے ہیں۔

(۷) قومی سطح پر عدمِ برداشت کے مسئلے کا فوری سیاسی حل وقت کی ضرورت ہے۔

''الغرض دنیا کے عظیم ترین مفکر اور نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی اتباع ہی سے ہم عدمِ برداشت جیسے قومی اور بین الاقوامی رجحان کو روک سکتے ہیں۔'' (ایضاً' صفحہ 32)

(۹۷) اسلامی کردار (Islamic Character)

خالق اور ربِّ کائنات خود ارفع و اعلیٰ اور برگزیدہ ہے (سورۃ الحشر: ۲۳، ۲۴)، جو پیغمبر اُس نے ہمیں عطا کیا، وہ بھی اعلیٰ ترین اخلاقی اقدار کا نمونۂ کمال ہے جن کا پورے عالم میں کوئی نظیر نہیں (سورۃ القلم: ۴)، وہ کتابِ مبین جو اُس نے اپنے اِس پیغمبر آخر الزماں ﷺ پر نازل فرمائی، رحمدلی کی نقیب اور سرچشمۂ ہدایت ہے (سورہ یونس: ۵۷) اور جس ہستی کے ذریعے اُس نے اِس کتاب کا نزول فرمایا، اُس کا لقب ''امین'' یعنی جبریلِ امین ہے (سورۃ الشُّعراء: ۱۹۳)۔ لہٰذا اِن انتہائی اعلیٰ اور ممتاز القاب کے پیشِ نظر ربِّ جلیل اپنے بندوں کو ایسے ہی عمدہ اور حسین اوصاف سے یوں متصف دیکھنا چاہتا ہے کہ جن پر اُسے ناز ہو اور یوں روزِ ازل کو فرشتوں کا کیا ہوا یہ خیال غلط ثابت ہو جائے کہ آدم اللہ کی دھرتی پر جا کر فساد کا مرتکب ہوگا اور وہاں خون خرابہ کرے گا۔

اسلامی کردار کے کچھ اوصاف درجِ ذیل ہیں :

(1) اسلامی کردار کے حوالہ سے پہلی انتہائی اہم بات یہ ہے کہ ایک سچا مسلمان اپنی نفسانی اور سفلی خواہشات کا غلام نہیں ہوتا بلکہ وہ سرتا پا اپنے خالق و مالک کی رضا اور خوشنودی کا جویا اور اطاعت و فرماں برداری کا پیکر ہوتا ہے۔ اُس کی زندگی کا ہر سانس اپنے رویّہ میں اللہ کے ہاں گروی ہوتا ہے یعنی اگر وہ کوئی اچھا کام کرتا ہے تو اللہ اُس گروی کے دام چکا دیتا ہے اور اُس بندے کو گناہ اور ذلت سے بچا لیتا ہے اور اگر وہ کوئی برا کام کرتا ہے تو اللہ اُسے سزا دیتا ہے۔ سفلی اور شہوانی خواہشات کی پیروی کرنے والوں کی مذمت کرتے ہوئے قرآن فرماتا ہے:

أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوَاهُ وَأَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهِ غِشَاوَةً (الجاثية ۴۵ : ۲۳)

''کیا آپ نے اُس شخص کی بھی حالت دیکھی ہے جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا خدا بنا رکھا ہے اور اللہ نے اُسے سمجھ بوجھ کے باوجود گمراہ کر دیا اور اُس کے کان اور دل پر مہر لگا دی اور اُس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا۔''

اِس آیت سے ہمیں دو سبق ملتے ہیں: (۱) اگر انسان قوانینِ الٰہی کی پابندی نہ کرے جو خود اُس کی پاکیزہ فطرت کے اللہ کے بنائے ہوئے قوانین ہیں بلکہ وہ اپنی کج نفسی کی خواہشات کی پیروی کرے تو اس کا لازمی نتیجہ ہدایت اور رحمتِ الٰہی سے محرومی ہوتا ہے۔ اس صورت میں اُس کی تمام صلاحیتیں مائل بہ تخریب ہو جاتی ہیں اور جب تک وہ تائب ہوتے ہوئے اللہ کی طرف رجوع نہیں کرتا، اُسے کوئی بھی ہدایت نہیں دینے والا نہیں ہوتا (عبداللہ یوسف علیؒ نوٹ: ۴۷۶۱)۔ (۲) اپنی سفلی اور جنسی خواہشات کا غلام ہونا شرک کی قسم ہے کیونکہ ایسا آدمی اُن خواہشات کے آگے جھکتا اور سجدہ ریز ہوتا ہے اور وہ کچھ کر گزرتا ہے جو وہ اُسے کرنے کا حکم دیتی ہیں۔

(2) ہر کس و ناکس سے حسنِ اخلاق اور نرمی سے پیش آنا اسلامی کردار کا ایک اور وصف ہے جو حسبِ ذیل فرامینِ الٰہی کی اتباع (پیروی) میں ہے :

(۱) قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (البقرۃ : ۸۳)
''لوگوں سے (بالعموم) حُسنِ گفتار کو قائم رکھو۔'' (۲:۸۳)
(۲) لَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ (لقمٰن : ۱۸)
''لوگوں سے اپنا رُخ مت پھیر۔'' (۱۸ : ۳۱)

سورہ لُقمٰن میں ہی چلنے پھرنے اور گفتگو کے آداب کو یوں بیان کیا گیا ہے :
وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ O (۳۱:۱۹)
''اور اپنی چال میں میانہ روی اختیار کر اور اپنی آواز کو پست رکھ۔ بے شک سب سے بُری آواز گدھے کی ہوتی ہے۔'' (۱۹ : ۳۱)

بحمدہٖ تعالیٰ اس طرح اَخلاق وآداب کی جزئیات تک کی تعلیم ہماری شریعت نے دی ہے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک موقع پر فرمایا تھا :
لَا تَحْتَقِرَنَّ مِنَ الْمَعْرُوْفِ شَیْئًا وَّلَوْ اَنْ تَلْقٰی اَخَاكَ بِوَجْهٍ طَلْقٍ
'' کسی بھی نیکی کو ہرگز حقیر مت سمجھ' اگر چہ وہ اپنے (مسلمان) بھائی سے خندہ جبینی سے ملنا ہی کیوں نہ ہو۔''

(3) بیہودہ' فضول گفتگو اور کسی کی بدخواہی سے پرہیز: مسلمان کے نزدیک یہ زندگی ایک انتہائی قیمتی' قابلِ قدر سرمایہ ہے۔ اُس کے پاس اتنا وقت کہاں کہ وہ اُسے فضول' بیہودہ گفتگو اور واہیات مشاغل میں صَرف کرے۔ اپنے نیک ومقرّب بندوں کی ستائش میں اللہ عزّ وجلّ فرماتا ہے :
(۱) قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ O ۔۔۔ O الَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ O (المؤمنون : ۳)
''یقیناً (وہ) مؤمنین فلاح پا گئے ۔۔۔۔ جو لغو بات سے برکنار رہنے والے ہیں۔'' (۲۳:۳)
(۲) وَالَّذِیْنَ لَا یَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا O (الفرقان : ۷۲)
''اور وہ لوگ ایسے ہیں کہ بیہودہ باتوں میں شامل نہیں ہوتے اور جب وہ لغو مشغلوں کے پاس سے گزرتے ہیں تو شریفانہ گزر جاتے ہیں۔'' (۷۲ : ۲۵)

ہمارے زمانہ کے میلے' ٹھیلے' مختلف بازیوں کے جمگھٹے' ناچ رنگ کی محفلیں' تھیٹر' سینما وغیرہ سب اس کے تحت میں شامل ہیں۔ زُور کے ایک اور معنیٰ جھوٹی گواہی دینے کے بھی ہیں۔

''جب کچھ لوگ حضرت ابودُجانہ کے پاس اُن کی مرگ الموت میں آئے اور دیکھا کہ بیماری کے باوجود اُن کا چہرہ جگمگا رہا ہے تو اُنہوں نے آپ سے اس چمک اور جگمگاہٹ کی وجہ پوچھی۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے ہر چیز سے بڑھ کر دو چیزوں کو اپنایا ہے: اوّل تو یہ کہ میں نے کبھی فضول اور بیہودہ گفتگو نہیں کی اور دوم یہ کہ میرا دل مسلمانوں کی بدخواہی سے ہمیشہ دُور رہا۔'' (بحوالہ انگریزی ترجمہ "God-Oriented Life" صفحہ ۱۴۸)

(4) جھوٹی گواہی دینے اور فریب دہی سے اجتناب : سورۃ الفرقان میں ارشاد ہوا:

وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ (الفرقان : ۷۲)

''اللہ بزرگ و برتر کے وہ ایسے بندے ہیں جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔''

آیت کے اس حصہ کے تین معانی ہیں اور امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تینوں ہی اپنی جگہ درست ہیں: ایک تو یہ کہ اللہ کے یہ برگزیدہ بندے جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔ دوم یہ کہ وہ ایسی بات میں معاون نہیں بنتے جو جھوٹ یا دھوکہ دہی پر مبنی ہو۔ سوم یہ کہ (جیسا کہ پہلے بیان ہوا) وہ بیہودہ باتوں میں شامل نہیں ہوتے۔

(5) غصے کو ضبط کرنا عمدہ کردار کی علامت ہے : قرآن مجید نے کئی مقامات پر اُن لوگوں کی تعریف و توصیف کی ہے جو اپنے غصے؛ رغیظ و غضب کو دبا تے ہیں اور پی جاتے ہیں۔ مثلاً فرمایا:

(۱) وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ○ (آلِ عمران : ۱۳۴)

''(یہ لوگ) غصہ کے ضبط کرنے والے ہیں اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں۔ اور اللہ (ایسے ہی) حسنِ عمل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔'' (۳:۱۳۴)

(۲) وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ○ (اَلشُّوْرٰی : ۳۷)

''اور جب اُنہیں غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں۔'' (۳۷ : ۴۲)

''ارشاد یہ نہیں کہ صالحین و اُبرار کو غصہ سرے سے آتا ہی نہیں۔ غصہ کا اپنے موقع و محل پر نہ آنا دلیلِ حلم نہیں، دلیلِ جُبن و بے حمیتی ہے۔ کمال نہیں، نقص ہے۔ ہنر نہیں، عیب ہے۔ کمال اور ہنر یہ ہے کہ بندہ کو جب بے محل و بے جا غصہ آ جائے تو اُس کے مقتضا پر عمل نہ کرے بلکہ اپنی طبیعت کو قابو میں رکھے۔'' (ماجدی اردو، ص ۹۷۳)

''پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ایک مرتبہ پوچھا گیا کہ کونسا عمل بہتر ہے تو آپ نے فرمایا کہ حسن کردار سے بہتر کوئی عمل نہیں۔ سائل نے آپ کی دائیں جانب ہو کر آپ سے وہی سوال کیا تو پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا: ''حسنِ کردار بہترین عمل ہے۔'' سائل نے آپ کی بائیں جانب ہو کر پھر وہی سوال کیا کہ کون سی نیکی بہتر ہے۔ تو آپ نے فرمایا: ''حسنِ کردار بہترین عمل ہے۔'' تیسری مرتبہ بھی نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہی فرمایا کہ اچھا کردار تمام نیکیوں سے بڑھ کر ہے۔ سائل نے آپ کے پیچھے سے ہو کر پھر وہی سوال کیا تو پیغمبر علیہ السلام نے جواب دیا: کیا بات ہے کہ تم اچھے کردار کا مطلب نہیں سمجھ رہے؟ جہاں تک ممکن ہو غصہ نہ کیا کرو اور اچھے کردار کا یہی معنی ہے۔'' (المروزی بحوالہ "God-Oriented Life")

(6) ذاتی غصے کو غریب و محتاج کی امداد میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے : مسطح حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے غریب رشتہ دار تھے اور جناب صدیق اُن کی امداد کیا کرتے تھے۔ اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے مسطح منافقین کی جانب سے اُمّ المومنین سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے خلاف چلائے گئے واقعہِ اِفک میں اُن کے

آلہ کار بن گئے تھے۔ سیّدہ کے والدِ ماجد جناب ابوبکر کے لئے مسطح کی امداد بند کرنا قدرتی امر تھا۔ غصّہ کی حالت میں آپ قسم کھا بیٹھے کہ بس آج سے امداد موقوف۔ یہ بات مرتبہ صدّیقیت کے شایاں نہ تھی اور اس چھوٹی سی سزا دینے کی بھی رب تعالیٰ نے اُنہیں اجازت نہیں دی بلکہ سورۃ النّور میں آپ کو اسلام کے اعلیٰ اخلاقی کردار پر عمل پیرا ہونے اور امداد جاری رکھنے کا حکم دیا گیا اور فرمایا گیا:

وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا أَلَا تُحِبُّوْنَ أَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ (اَلنُّور : ۲۲)

''اور جو لوگ تم میں بزرگی اور وسعت والے ہیں' وہ قرابت داروں کو' مسکینوں کو اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو دینے سے قسم نہ کھا بیٹھیں۔ چاہئے کہ معاف کرتے رہیں اور درگزر کرتے رہیں۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہارے قصور معاف کر دے؟'' (۲۴ : ۲۲)

(7) کسی کو عطا کرنے میں لینے والے سے کوئی امید نہیں رکھنی چاہئے: یہاں قرآن مجید نے اپنے ماننے والوں کو اعلیٰ اخلاقی ضابطہ عطا کیا۔ قانونی اور تجارتی فارمولہ یہ ہے کہ آپ کسی سے لینے کے لئے اُسے کچھ دیتے ہیں اور بالعموم آپ کو یہ امید ہوتی ہے کہ آپ کی دی ہوئی چیز سے زیادہ قیمتی چیز آپ کو دی جائے۔ لیکن اس عمل کا روحانی پہلو یہ ہے کہ آپ لینے والے سے واپس دئے جانے کی کوئی امید نہ رکھیں۔ قرآن مجید مسلمانوں سے بندگانِ خدا کی دل و جان سے آمادہ بے لوث خدمت کرنے کی امید رکھتا ہے نہ کہ اس کے بدلے میں اُن سے کچھ وصول کرنے کی۔ چنانچہ سورۃ المُدَّثّر میں ارشاد ہوا:

وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ O (اَلْمُدَّثِّر: ۶)

''اور کسی کو اس غرض سے مت دیجئے کہ زیادہ معاوضہ ملے۔'' (۷۴ : ۶)

(8) عورت کا اپنی خانگی ذمہ داریوں کو نبھانا جہاد سے کم اہم نہیں: ایک خاتون نبی علیہ السلام کی بارگاہ میں حاضر ہوئی اور کہا کہ وہ کچھ دیگر خواتین کی طرف سے آئی ہے۔ ہم میں سے ہر ایک عورت خواہ آپ اُسے جانتے ہیں یا نہیں' یہی ایک سوال کرنا چاہتی ہے۔ مَردوں اور عورتوں کا خدا ایک ہی ہے اور آپ بھی عورتوں اور مَردوں دونوں کے رسول ہیں۔ مَردوں کے لئے اللہ نے جہاد کا حکم دیا ہے اور اگر وہ اس میں کامیاب ہوتے ہیں تو اُن کے لئے ثواب مقرر کیا گیا ہے۔ اگر وہ شہید ہو جائیں تو اُنہیں روزِ قیامت رحمتِ الٰہی کے ساتھ اٹھایا جائے گا اور رزقِ کثیر سے نوازا جائے گا۔ لیکن ہم عورتوں کے لئے کیا حکم دیا گیا؟ آپ نے جواب دیا:

''تمہارے لئے اپنے خاوندوں کی اطاعت و فرماں برداری اور اُن کے حقوق کو تسلیم کرنا جہاد کے مساوی ہے لیکن تم میں سے بہت کم ایسا کرنے والی ہیں۔'' (''الترغیب والترہیب'' لامام زکی الدین المنذری)

(9) چار اہم نصیحت کی باتیں: ابوذر غِفاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ مسلسل چھ دن تک اُنہیں ایک انتہائی اہم بات بتانے کے متعلق کہتے رہے۔ ساتویں دن آپ ﷺ نے فرمایا:

''میں تمہیں اپنی خلوت وجلوت دونوں میں خوفِ خدا کی نصیحت کرتا ہوں۔ جب تم سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو کسی اچھے عمل کے ذریعے اُس کی تلافی کیا کرو۔ کسی سے کچھ نہ مانگو' اگر تمہارا چابک زمین پر گر جائے تو کسی سے اُسے اٹھا کر تمہیں دینے کا نہ کہو اور اُن چیزوں کو غصب مت کرو جو تمہارے پاس بطورِ امانت رکھی گئی ہیں۔''

(10) کسی مسلمان کو حقارت سے دیکھنا اسلام کو خطرے میں ڈالنا ہے: ''ابوموسیٰ اشعری عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں کسی علاقہ کے گورنر تھے۔ حسن بن علی رضی اللہ عنہما ابن ابی طالب بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ مسلمانوں کا ایک وفد (بہ شمول عرب اور غیر عرب) ابوموسیٰ اشعری کے پاس آیا۔ ابوموسیٰ نے غیر عربوں کو محروم کرتے ہوئے عربوں میں فیاضانہ طور پر تحفے تحائف تقسیم کئے۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو جب اس بات کا علم ہوا تو اُنہوں نے ابوموسیٰ اشعری سے جواب طلب کیا کہ تم نے عربوں اور غیر عربوں کے مابین تقسیم میں مساوات کو قائم کیوں نہیں رکھا؟ جب ایک مسلمان اپنے مسلمان بھائیوں کو کسی بھی طرح بہ نظرِ حقارت دیکھتا ہے تو یہ بات اُس کے برا ہونے کے لئے کافی ثبوت ہے۔'' (بحوالہ "God-Oriented Life" صفحات ۱۵۰'۱۵۱)

(11) نظریہ خیر خلق (Humanitarianism): حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک بدّو نے مسجدِ نبوی میں پیشاب کر دیا۔ صحابہ کرام اُسے مارنے پیٹنے کے لئے دوڑے تو پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُنہیں اس سے روک دیا اور فرمایا:

''جس جگہ اُس نے پیشاب کیا ہے' وہاں پانی کا ایک برتن اُنڈیل دو۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں لوگوں کے لئے آسانی پیدا کرنے کے لئے (اِس دنیا میں) بھیجا ہے نہ کہ مشکلات پیدا کرنے کے لئے۔'' (صحیح بخاری)

(12) دھوکے باز سچے مسلمان نہیں ہوتے: بازار سے گزرتے ہوئے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک شخص کو گندم کا ڈھیر فروخت کرتے دیکھا۔ آپ ﷺ نے اپنی انگلیاں مبارک گندم میں سے گزاریں تو وہ گیلی ہو گئیں۔ آپ ﷺ نے گندم کے مالک سے پوچھا کہ تمہاری گندم گیلی کیوں ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ یہ بارش کی وجہ سے ہے۔ آپ نے فرمایا: ''تو تم نے لوگوں کے دیکھنے کے لئے اُس کے گیلے حصّے کو اوپر کیوں نہیں رکھا؟ یاد رکھو کہ دوسروں سے دھوکہ کرنے والے ہم میں سے نہیں۔'' (صحیح بخاری' صحیح مسلم)

(13) غلط کاروں کے لئے دعا: ایک مرتبہ ایک شرابی کو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہ میں لایا گیا۔ آپ نے اُسے کوڑے مارنے کا حکم صادر فرمایا۔ جب وہ شرابی کوڑے کھا کر رخصت ہوا تو حاضرین میں سے کچھ نے اُس پر لعنت کرنا شروع کی اور یہ بددعا دی کہ اللہ اُسے ذلیل و رُسوا کرے۔ اس پر نبی مکرّم ﷺ نے فرمایا: ''ایسے جذبات کو ہوا نہ دو اور اپنے بھائی کے خلاف شیطانی قوّت کے ساتھ شامل نہ ہو۔ بلکہ تمہیں تو یہ دعا کرنی چاہئے کہ اے اللہ! اُسے ہدایت عطا فرما اور اُس کی بخشش فرما۔''

(14) کسی مسلمان کو لعن طعن کرنا گناہِ عظیم ہے : سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ حیات میں اگر کسی کو مسلمان بھائیوں کو لعن طعن کرتا ہوا سنا جاتا تو اُسے بداَخلاقی کے گناہ کا مرتکب سمجھا جاتا تھا۔ (طبرانی)

(15) کسی کے گھر میں داخل ہونے کا شائستہ طریقہ : حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ وہ ایک دن رسالت مآب ﷺ کے ہمراہ تھے۔ حضرت علی کرّم اللہ وجہہ' تشریف لائے اور اندر آنے کی اجازت چاہی۔ اُنہوں نے دروازے پر بڑی ہی آہستگی سے دستک دی تو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُن کے لئے دروازہ کھولنے کو کہا۔ ایک اور موقع پر سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ رسالت مآب ﷺ سے ملنے آئے اور اندر آنے کی اجازت لینے کے بعد وہ دروازے کے سامنے کھڑے ہو گئے تاکہ وہ ٹھیک طور پر اندر دیکھ سکیں۔ نبی اکرم ﷺ نے اُنہیں دروازے کے ایک طرف کھڑا ہونے کا اشارہ کیا اور کچھ دیر کے بعد اُنہیں اندر آنے کو کہا اور فرمایا:
''اندر آنے کی اجازت طلب کرنے میں حقیقی وجہ یہی ہے کہ آنے والا گھر کے اندر کو نہ دیکھ سکے۔''

(16) مزدور کی مزدوری ادا کرنے میں عدمِ تاخیر : حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ اُنہوں نے نبی اکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا :
اَعْطُوا اَجِرَالْاَجِیْرَ قَبْلَ اَنْ یَّجِفَّ عَرَقُهٗ' (سنن ابن ماجه)
''مزدور کی مزدوری اُس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کر دیا کرو۔''

شعیب علیہ السلام کا موسیٰ علیہ السلام کو اپنی ملازمت میں رکھتے ہوئے اُنہیں یہ کہنا مَـــا أُرِیْـــدُ اَنْ اَشُــقَّ عَلَیْكَ (سورۃُ القَصَص : ۲۷) کہ میں تم پر کوئی سختی نہیں چاہتا' اس کا مطلب بھی مزدور کے حقوق کی پاسداری ہے۔

(17) لوگوں کو تکالیف اور مشکلات سے بچانا : فرمانِ نبوی ہے :
خَیْرُ النَّاسِ مَنْ یَّنْفَعُ النَّاسَ
''بہتر آدمی وہ ہے جو اپنے اَبنائے جنس کو فائدہ پہنچائے۔''

نبی علیہ السلام' صحابہ کرام' تابعین' تبع تابعین اور بعد میں آنے والے صالحین و بزرگانِ دین کی حیاتِ طیّبات حدیثِ مذکورہ کی عملی تعبیر کا عمدہ نمونہ ہیں۔

(18) مسلمان کا اپنے مسلمان بھائی سے قطع تعلق کرنا اُسے قتل کرنے کی طرح بُرا ہے : ابو خرش رضی اللہ عنہ نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ فرماتے ہوئے سنا :
''کسی مسلمان بھائی سے ایک سال تک قطع تعلق رہنا اُس کے خون بہانے کی طرح بُرا ہے۔'' (سنن ابو داؤد)

(19) معاشرتی تعامل Interaction کے لئے اسلامی معیار : اسلام تمام بنی نوع انسان کو تمام شعبہ ہائے حیات میں خواہ وہ مادّی ہوں یا روحانی' ہمہ وقتی رشد وہدایتِ الٰہی مہیا کرتا ہے۔ایک سماج کو کیسے زندگی گزارنی چاہئے' اُس کے افراد کا آپس میں بہ طورِ فرد رویّہ کیسا ہونا چاہئے اور بہ طور خاندان اور بہ طور اقتصادی اور معاشرتی وجود کیسا ہونا چاہئے' اِن سب باتوں کا تفصیلی خاکہ اسلام مہیا کرتا ہے۔

''اسلام نے معاشرتی تعامل کے ابدی اصولوں سے اقوام عالم کو اُس وقت متعارف کرایا جب دنیا ظلمت وجہالت کی گھٹاٹوپ تاریکیوں میں ٹامک ٹوئیاں مار رہی تھی اور کوئی بھی شخص ایسے عملی ضابطہ اخلاق کا تصوّر تک نہ کر سکتا تھا۔سماج کے افراد کے مابین برادرانہ احساسات کو پروان چڑھانے کے پیش نظر اسلام نے گفتگو' وعدہ وعہد' صداقت' شکرگزاری' مہمان نوازی' تبادلہ خیالات (Interview)' استقبالیہ الفاظ (سلام)' مصافحہ' کھڑے ہونے' بیٹھنے اور چلنے پھرنے کے معیار مقرر کئے۔یہ نظریاتی روداد نہیں: پیغمبرِ اسلام حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے اپنی حیاتِ طیّبہ میں اس کی عملی مثالیں پیش کیں کہ انہیں کامیابی سے کیسے نافذ کیا جاسکتا ہے۔آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کرام کو کبھی بھی ایسی چیز کے کرنے کا نہیں کہا جسے آپ نے عملی طور پر نہ کیا ہو۔قرآن مجید کے مطابق آپ خلقِ عظیم کے شہسوار ہیں (سورۃ القلم : ۴) اور اسی لئے قرآنِ حکیم نے تاکید اً فرمایا ہے :

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَاللّٰهَ كَثِيْرًاO (الاحزاب : ۲۱)

''تمہارے لئے رسول اللہ کا ایک عمدہ نمونہ موجود ہے یعنی اُس کے لئے جو اللہ اور روزِ آخرت سے ڈرتا ہو اور ذکرِ الٰہی کثرت سے کرتا ہو۔'' (۲۱ : ۳۳)

معاشرتی تعامل کے لئے اسلامی معیار کی تفصیل حسب ذیل ہے :۔

(i) ''اسلام زبان کو قابو میں رکھنے پر زور دیتا ہے کیونکہ گوشت پوست کے اس چھوٹے سے ٹکڑے سے بیہودہ گفتگو' غیبت' خوشامد' دروغ گوئی' منافقت' جھوٹی شہادت' جھگڑے' اختلاف و افتراق' افشائے راز' جادوگری' غیر اخلاقی مذاق' غیر اخلاقی گیت اور گالی گلوچ وغیرہ جیسی لاتعداد مصیبتیں پھوٹتی ہیں۔''

''ایک مرتبہ سفیان بن عبداللہ نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے دریافت کیا: اے اللہ کے رسول! آپ کو میرے لئے سب سے زیادہ کس چیز کا خطرہ ہے؟ پیغمبر ﷺ نے اپنی زبانِ مبارک کو پکڑ کر فرمایا: ''اِس سے خطرہ ہے۔'' اس لئے اگر زبان سے خطرہ ہو تو اس سے بچنے کا بہترین طریقہ سکوت (خاموشی) ہے جسے نبی علیہ السلام نے ساٹھ سالہ عبادتِ الٰہی سے بہتر فرمایا ہے۔''

(ii) ''معاشرے میں اعتماد حاصل کرنے کے لئے ایفائے عہد اُس کا لازمی جزو ہے۔نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی حیاتِ طیّبہ میں جو بھی وعدہ کیا' اُسے پورا کر کے دکھایا خواہ اُس کا ایفاء آپ کے حق میں تھا یا خلاف

تھا۔اسی لئے آپ کو سنِ بلوغ کو پہنچنے سے پہلے ہی ''الامین'' اور ''الصادق'' کے القاب مل گئے تھے۔ایک مرتبہ اپنے ایفائے عہد کے سلسلہ میں آپ نے ایک آدمی کا تین دن تک انتظار کیا جس نے ایک مقررہ جگہ پر آنا تھا لیکن وہ آنا بھول گیا۔حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ'': إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ

''منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب بات کرے تو جھوٹ بولے' جب وعدہ کرے تو پورا نہ کرے اور جب اُس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔''

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے متنبہ کیا:

''اُس شخص کا کوئی ایمان نہیں جو امانت دار نہیں اور اُس شخص کا کوئی دین نہیں جسے اپنے وعدے کا پاس نہیں۔''

سورہ بنی اسرائیل میں قرآنِ حکیم نے ایفائے عہد پر ان الفاظ میں زور دیا ہے:

وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولاً O (بنی اسرائیل: ۳۴)

''اور عہد کی پابندی رکھو' بے شک عہد کی باز پرس ہو گی۔'' (۳۴ : ۱۷)

امانت کو رُو بہ اصلاح کرنے کے لئے قرآن مجید نے تاکیداً فرمایا:

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمٰنٰتِ إِلٰى أَهْلِهَا (النساء: ۵۸)

''اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اُن کے اہل کو ادا کر دو۔'' (۵۸ : ۴)

امانت کے معروف معنی کے علاوہ عہدوں اور مناصب کا صحیح اور اہل لوگوں کو ملنا' خاوند کا اپنی بیوی کے لئے اور بیوی کا اپنے خاوند کے لئے امانت ہونا وغیرہ اسی حکم میں شامل ہیں۔

سورۃ المعارج کی آیت ۳۵ میں امانتوں اور وعدوں کو ایفا کرنے والوں کو عزت و تکریم کے باغوں میں رہنے کا مژدہ سنایا گیا ہے۔

(iii) ''باہمی لین دین میں شکر گزاری نوعِ انسان میں پیار و محبت اور خوش اخلاقی کے بندھن کو مضبوط کرتی ہے۔دراصل ہماری شکر گزاری کا سب سے زیادہ مستحق ہمارا خالق و مالک اللہ بزرگ و برتر ہے جس نے انسان کو پیدا فرمایا اور اُس پر لاتعداد انعامات و نوازشات نچھاور کئے۔نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

مَنْ لَّا يَشْكُرِ النَّاسَ لَا يَشْكُرِ اللّٰهَ

''جو شخص بندوں کا شکر ادا نہیں کرتا' وہ اللہ کا بھی شکر ادا نہیں کرتا۔''

اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

(iv) ''مہمان نوازی اور خاطر تواضع کو اسلامی تعلیمات میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ مہمانوں کو اُن کے معاشرتی درجہ سے قطع نظر بلانا چاہئے کیونکہ ایک حدیثِ مبارکہ ہے:
''بدترین وہ کھانا ہے جس میں اُمراء کو بلایا جائے اور غرباء کو نظر انداز کر دیا جائے۔''

اس کے ساتھ ساتھ دعوت کو اور پیش کئے گئے کھانے کو میزبان کے سماجی مرتبہ (Social Status) سے قطع نظر قبول کرنا چاہئے۔ قرآن مجید نے سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کے معزز مہمانانِ گرامی (فرشتے جو انسانی شکل میں آپ کے پاس آئے تھے) کی مثال میں آدابِ مہمان نوازی کو واضح کیا اور ہمیں بتایا ہے:
وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَا اِبْرٰهِیْمَ بِالْبُشْرٰی قَالُوْا سَلٰمًا قَالَ سَلٰمٌ" فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِیْذٍO فَلَمَّا رَاٰ اَیْدِیَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَیْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِیْفَةً (ھود: ۶۹،۷۰)
''اور بے شک ہمارے فرشتے ابراہیم کے پاس خوشخبری لے کر آئے، وہ بولے: آپ پر سلام ہو۔ ابراہیم نے کہا (تم پر) سلام، پھر دیر نہیں لگائی کہ آپ ایک تلا ہوا بچھڑا لے آئے۔ پھر جب آپ نے دیکھا کہ اُن کے ہاتھ اُس کھانے کی طرف نہیں بڑھ رہے تو اُنہیں اوپری سمجھے اور اُن سے دل میں خوفزدہ ہوئے۔''

فَمَا لَبِثَ (زیادہ دیر نہیں لگائی) کا لفظ مہمان نوازی کے آداب سکھا رہا ہے کہ مہمان کو جلدی کھانا پیش کیا جائے اور جو چیز فوراً دستیاب ہو، اُسے پیش کر دیا جائے اور اُس کے بعد دیگر لوازمات تلاش کئے جائیں اگر اُس کی دسترس میں ہوں اور زیادہ تکلفات کر کے اپنے آپ کو ضرر اور مشقت میں نہ ڈالا جائے۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام گائے کا بچھڑا اس لئے لائے تھے کہ ان کے اموال میں زیادہ تر گائیں تھیں۔ مہمان نوازی مکارمِ اخلاق، آدابِ اسلام اور انبیاء و صلحاء کی سنتوں اور اُن کے طریقوں میں سے ہے۔ فَلَمَّا رَاٰ سے معلوم ہوا کہ مہمان کو پاس بٹھانا، اُسے کھانا پیش کرنا اور اُس کی طرف دیکھنا عبادت ہے اور اُسے کہنا کہ کھاؤ، احسن طریقہ اور آدابِ میزبانی ہے۔ فقہاء مفسرین نے قَالُوْا سَلٰمًا قَالَ سَلٰمٌ" سے یہ نکالا ہے کہ سلام کہنا فرشتوں کا طریقہ ہے اور اہلِ اسلام میں بھی ہر دور میں رائج رہا ہے۔

مہمان کی عزت و تکریم کرنے کے بارے میں رسالت مآب ﷺ نے فرمایا:
مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَه،
(ریاض الصالحین: کتاب الادب، ج ۱، ص ۵۸۵)
''جو شخص اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے، اُسے اپنے مہمان کی عزت کرنی چاہئے۔''

(v) اسلام میں تحفے تحائف لینے دینے کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ نبی علیہ السلام نے فرمایا:
''ایک دوسرے کو تحفے تحائف دیا کرو کیونکہ تحفہ نفرت کو ختم کر دیتا ہے۔''

تحفے کا بدلہ تحفے میں دینا ایک معاشرتی فریضہ ہے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:
''جس شخص کو تحفہ دیا جائے اور اُس کے وسائل بھی ہیں تو اُسے اس کے بدلہ میں تحفہ دینا چاہئے اور جس کے

پاس وسائل نہیں تو اُسے معطی کا شکریہ ادا کرنا چاہئے۔''

(vi) ''تخلیہ کی مجالس میں اسلام تخلیہ (Privacy) کا احترام کرتا ہے۔ کسی سے ملنے کے لئے ایک اجنبی کو انتظار کرنا چاہئے اور اُس سے انٹرویو کا وقت لینا چاہئے۔ اگر تو اجازت مل جائے تو وہ اُس جگہ داخل ہو سکتا ہے ورنہ اُسے واپس ہو جانا چاہئے۔ اس بارے میں قرآنی تعلیمات بالکل واضح ہیں۔ چنانچہ متنبہ کیا گیا:

یٰاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِکُمْ حَتّٰی تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰی اَھْلِھَا ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ ○ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِیْھَا اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْھَا حَتّٰی یُؤْذَنَ لَکُمْ وَاِنْ قِیْلَ لَکُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا ھُوَ اَزْکٰی لَکُمْ وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ ''○ (النور: ۲۷، ۲۸)

''مؤمنو! اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل مت ہوا کرو جب تک کہ اجازت حاصل نہ کرلو اور اُن کے رہنے والوں کو سلام نہ کرلو۔ تمہارے حق میں یہی بہتر ہے تا کہ تم خیال رکھو۔ پھر اگر اُن میں تمہیں کوئی (آدمی) معلوم نہ ہو تو بھی اُن میں داخل نہ ہو جب تک تمہیں اجازت نہ مل جائے اور اگر تم سے کہہ دیا جائے کہ لوٹ جاؤ تو لوٹ جایا کرو، یہی تمہارے حق میں پاکیزہ تر ہے اور اللہ تمہارے اعمال کو خوب جانتا ہے۔'' (۲۷، ۲۸ : ۲۴)

ایک مرتبہ ایک صحابی نے آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے دریافت کیا: کیا اپنی والدہ سے ملنے کے لئے بھی مجھے اجازت لینے کی ضرورت ہوگی؟ تو آپ نے فرمایا: جی ہاں! اس کے لئے بھی اجازت لینا ہوگی۔

ایک مرتبہ ایک صحابی نے نبی اکرم ﷺ کے درِ دولت پر دستک دی تو پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ آنے والے نے کہا: ''میں ہوں''۔ اس پر نبی معظم ﷺ نے فرمایا: ''کون میں؟'' گویا اس میں آپ نے ناگواری کا اظہار فرمایا۔ لہٰذا صحیح شناخت کے لئے پورا نام بتا دینا ضروری ہے۔

(vii) ''سلام کہنے کا اسلامی طریقہ ''سلام'' کا لفظ کہنا ہے جس کا معنیٰ امن وسلامتی کا ہے۔ اس لفظ ''سلام'' کو بالعموم دوسری جانب سے بھی جواباً استعمال کیا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ پہلی ہی ملاقات میں دونوں جانبوں سے احساسِ تحفظ کی ضمانت ہے اور اِس کے پہلو بہ پہلو یہ بات بھی ہے کہ السلام علیکم کہنا خود بینی و خودنمائی کو کچل دیتا ہے۔ حکمِ قرآنِ حکیم ہے:

وَاِذَا حُیِّیْتُمْ بِتَحِیَّۃٍ فَحَیُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْھَا اَوْ رُدُّوْھَا (اَلنِّساء : ۸۶)

''جب تمہیں سلام کیا جائے تو تم اس سے بہتر طور پر سلام کیا کرو یا اُسی کو لوٹا دو۔'' (۸۶ : ۴)

مسلمان بھائی کو السلام علیکم کا جواب اُنہی الفاظ یعنی السلام علیکم میں دینا فرض ہے اور اِن الفاظ میں مزید اضافہ کرنا یعنی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ' کہنا ثوابِ کثیر وجزیل کا موجب ہے۔

امام الانبیاء ﷺ نے فرمایا: اَلْمَلَآئِکَۃُ تَعْجَبُ مِنَ الْمُسْلِمِ یَمُرُّ عَلَی الْمُسْلِمِ وَلَا یُسَلِّمُ عَلَیْہِ

''فرشتے اُس مسلمان پر تعجب کرتے ہیں جو مسلمان کے پاس سے گزرتا ہے مگر اُسے سلام نہیں کرتا۔''

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ بھی فرمایا:

حَقُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ خَمْس'': رَدُّالسَّلَامِ وَعِيَادَةُ الْمَرِيْضِ وَاتِّبَاعُ الْجَنَائِزِ وَاِجَابَةُ الدَّعْوَةِ وَتَشْمِيْتُ الْعَاطِسِ (صحيح بخاري، صحيح مسلم)

''مسلمان کے مسلمان پر پانچ حقوق ہیں: سلام کا جواب دینا' بیمار کی عیادت کرنا' جنازے کے ساتھ جانا' دعوت قبول کرنا اور چھینک مارنے والے کی چھینک کا جواب دینا۔''

(viii) ''مصافحہ کرنا (Handshaking) بھی حُسنِ نیت اور خلوص کی علامت ہے۔ اسلام کا طریقہ مصافحہ یہ ہے کہ دونوں ملنے والوں کے ہاتھوں میں دونوں کے دو ہاتھ ہوں نہ کہ ایک ہاتھ جیسا کہ دورِ جدید میں یہ رواج پاچکا ہے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

''جب دو مسلمان (بھائی) آپس میں ملتے ہیں' مصافحہ کرتے ہیں' اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرتے ہیں اور اُس کی بخشش طلب کرتے ہیں تو اُن دونوں کی بخشش کر دی جاتی ہے۔''

(ix) ''کسی معزز اور شریف آدمی کی تعظیم وتوقیر میں کھڑے ہونے کی اسلام میں اجازت ہے بشرطیکہ یہ بات اُس شخص میں غرور اور احساسِ برتری پیدا نہ کرے یا یہ کہ وہ شخص اپنے لئے دوسروں کے کھڑا ہونے کا خواہشمند نہ ہو۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تنبیہ فرمائی ہے:

''کوئی بھی شخص کسی کو اپنی نشست سے اِس لئے اُٹھنے کا نہ کہے کہ اُس کی نشست پر وہ بیٹھ جائے۔''

(x) ''آدابِ نشست کے بارے میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ تعلیم فرمائی:

(۱) ''دو آدمیوں کے درمیان اُن کی اجازت کے بغیر مت بیٹھا کرو۔''

(۲) ''مسلمان کا یہ فرض ہے کہ جب اُس کا بھائی اُس سے بیٹھنے کی جگہ کا کہے تو اُسے نو وارد کی جگہ بنانے کے لئے ایک طرف کو ہو جانا چاہئے۔''

قرآن مجید نے مجمع میں بیٹھنے اور اُس سے منتشر ہونے کا ایک راہ نما اصول مقرر کیا اور فرمایا:

''يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجَالِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا (المجادلة : ١١)

''مومنو! جب تمہیں کہا جائے کہ مجلس میں جگہ کھول دو تو جگہ کھول دیا کرو۔ اللہ تمہیں کھلی جگہ دے گا اور جب کہا جائے کہ اٹھ کھڑے ہو تو اُٹھ کھڑے ہوا کرو۔'' (۱۱ : ۵۸)

(xi) دینِ عالم ہونے کی حیثیت سے اسلام نے چلنے پھرنے کے اصولوں کو نظر انداز نہیں کیا اور فرمایا:

(۱) وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا (بنی اسرائیل: ۳۷ ؛ لُقمٰن : ۱۸)
''زمین میں اکڑ کر مت چلا کرو۔'' (۱۷:۳۷ ؛ ۳۱:۱۸)
(۲) وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا (الفرقان : ۶۳)
''اور (خدائے) رحمان کے (خاص) بندے وہ ہیں جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلتے ہیں۔'' (۶۳ : ۲۵)

''اس طرح اسلام نے معاشرتی آداب کے عام اصول سکھا کر اخلاقیات کی سطح کو بلند کیا اور ان اصولوں کو عملی شکل دے کر اسلامی سماج کو ایسا بنا دیا جس میں کینہ' نفرت' بدخواہی' تناؤ' دھوکہ دہی' حرص' نام ونمود' حسد اور کئی دیگر بیماریاں نام کو نہیں۔'' (ماخوذ از کتابچہ "Islam-- the Most Humane Religion" از ایس۔ایم معین قریشی' صفحات ۳۳ تا ۳۸)

نوٹ: مزید تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہوں اِسی انسائیکلو پیڈیا کی جلد سوم کے صفحات ۱۲۳۷ تا ۱۲۵۲۔

(20) ''**اسلام اور معاشرتی باہمی وابستگی**: کسی قوم کے زندہ ہونے اور شاہراہِ ترقی پر اُس کے تیز رفتاری سے گامزن ہونے کی سب سے بڑی دلیل اس حقیقت میں مضمر ہے کہ اُس کے افراد اتحاد واتفاق کی ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے ہیں۔اخوت ومحبت کا یہ بندھن اُس قوم کے افراد پر نہ صرف الٰہی انعامات و برکات کی بوچھاڑ کرتا ہے بلکہ سماج کی اجتماعی فلاح وبہبود اور تمام انسانیت کی خیرخواہی میں ممد ومعاون ہوتا ہے۔''

''کسی مضبوط نفسیاتی بنیاد کے بغیر کوئی بھی ٹھوس نظامِ اخلاق ممکن نہیں ہے۔راہبوں اور تارک الدنیا لوگوں کے بنائے ہوئے اخلاقی ضابطے ناکام ہوگئے کیونکہ اُنہوں نے انسان کی حیوانی جبلت کو نظرانداز کرتے ہوئے اُسے بنیادی طور پر معقول ہستی قرار دیا۔اِسی طرح عیش پسندوں (Epicureans) کے عقائد کو دھچکا لگا کیونکہ اُن کی بنیاد انسان کی حیوانی جبلت پر تھی اور اُن میں انسان کی معقولیت پسند فطرت کو نظرانداز کر دیا گیا تھا۔اسلام نے دنیاوی اور روحانی معاملات کے مابین توازن کو قائم کیا۔ایک طرف تو اُس نے رہبانیت (ترکِ دنیا) کی مخالفت کی (سورۃ الحدید: ۲۷) تو دوسری طرف اُس نے دنیاوی شان وشوکت کی مذمت کی (سورہ آل عمران :۱۴)۔مسلمان کا صحیح رویّہ یہی ہے کہ وہ نہ تو اس دنیا کو ترک کرنے پر راضی ہوتا ہے اور نہ ہی اس میں اس قدر مگن ہوتا ہے کہ وہ روحانی مستقبل کو فراموش کر دے۔اسلام نے اپنے پیروکاروں کو یہ دعا سکھائی ہے:

رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِO (البقرة : ۲۰۱)
''اے ہمارے پالنہار! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی اور آخرت میں بھی بھلائی عطا فرما۔'' (۲:۲۰۱)

''تاہم جیسا کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اِس دنیا سے اُس قدر لیا جائے جو اعمالِ صالحہ

ذریعے حُبِّ الٰہی کے لئے ناگزیر ہو۔ مادّی نعمتوں کے حصول میں انسان کو اپنے اَبنائے جنس سے میل ملاپ رکھنے کا مکلّف کیا گیا ہے۔ مشکلات کے مقابل صداقت وراستی کے معیار کو قائم رکھنے اور اپنے اَبنائے جنس کو الٰہی برکات میں شامل کرنے کے لئے ایسا ہونا بھی ضروری ہے۔ لہٰذا معاشرہ کی باہمی وابستگی تعلیماتِ اسلامی کا مغز ہے۔ پیغمبرِ اسلام حضرت محمد رّسول اللہ ﷺ نے تمام نسلِ انسانی کے لئے اس رویّہ کی پُرجوش مثال قائم کی کہ وہ اس کی تقلید کریں۔ زمانۂ شباب میں آپ ﷺ حلف الفضول کے معاہدہ میں شریک ہوئے جو کمزوروں اور ستم رسیدہ لوگوں کے حقوق کی تائید میں بنایا گیا تھا۔ اس معاہدے کا ہر فرد بے یارومددگار لوگوں کو ہر قسم کے جبر وتشدد سے تحفظ دلانے کا پابند تھا۔ آنے والے سالوں میں اس معاہدے نے آپ ﷺ کو خداداد ذہانت کے ذریعے خلقِ خدا کی خیر خواہی کی تربیت دی۔ جب آپ ﷺ جزیرۃ العرب کے ''سردار'' کے منصبِ اعلیٰ پر فائز ہوئے تو آپ نے ایسا نظام وضع کیا جس کے تحت ہر باشندہ اپنے والدین، بیوی بچوں، دوستوں اور عوام کے درمیان اُن سب کے حقوق کی تکمیل کرتا ہوا رہا تھا۔''

''اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ یہ دنیا انسان کے لئے بنائی گئی ہے اور دنیا کی ہر چیز انسان کے تابع کر دی گئی ہے۔ رحم دلی، بھوکے کو کھانا کھلانا، ایفائے عہد، خیرات وصدقات، وعظ ونصیحت جیسے بہت سے اعمالِ صالحہ اور نیکیاں سماجی تعلقات پر استوار ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا تھا:

خَیرُ النَّاسِ مَنْ یَّنفَعُ النَّاسَ

''لوگوں میں بہتر وہ ہے جس سے خلقِ خدا کو فائدہ پہنچے۔''

آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

''وہ مسلمان جو لوگوں سے میل ملاپ رکھتا ہے اور اُن کی طرف سے نقصان پہنچنے پر صبر کرتا ہے، اُس شخص سے بہتر ہے جو لوگوں سے میل ملاپ نہیں رکھتا اور نہ ہی اُن کی طرف سے نقصان پہنچنے پر صبر کرتا ہے۔''

''سورۃ التّوبۃ کی آیت ۷۱ میں مؤمنوں کو ایک دوسرے کے ''محافظ'' ہونے کا اعلان کیا گیا ہے بالکل اُسی طرح جس طرح سورۃ التوبۃ کی آیت ۶۷ میں منافقوں کو ایک دوسرے کا ''محافظ'' کہا گیا ہے۔

سماج کی باہمی وابستگی کا نظریہ صرف مسلمانوں تک ہی محدود نہیں بلکہ وہ تمام عالمِ انسانیت کو محیط ہے۔ اس حقیقت کو مکمل طور پر تسلیم کرتے ہوئے کہ دنیا مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کی ہے، اسلام تمام خلقِ خدا کو ایک کنبہ قرار دیتا ہے۔ پیغمبرِ اسلام ﷺ نے زور دیتے ہوئے فرمایا:

''تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اور اُس کی مخلوق میں بہترین وہ ہے جو اللہ کے کنبے کے ساتھ اچھا ہو۔''

''اس حقیقت کو مندرجہ ذیل حکمِ قرآن سے تقویت ملتی ہے جس کے مطابق نسلِ انسانی والدین کے ایک جوڑے سے پیدا کی گئی۔ اللہ کے نزدیک وہ سب ایک ہیں اور اُن میں زیادہ معزز وہ ہے جو نیک اور صالح ہے:

یٰٓأَیُّھَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّأُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا إِنَّ أَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ أَتْقٰکُمْ (اَلْحُجُرات: ۱۳)

۲۵۸۳ (اسلامی کردار)

''لوگو! ہم نے تم (سب) کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں مختلف قومیں اور خاندان بنا دیا کہ ایک دوسرے کو پہچان سکو' بے شک تم میں سے پرہیزگار تر اللہ کے نزدیک معزز تر ہے۔'' (۴۹ : ۱۳)

''مسلمان کو خود دوسروں کو نقصان پہنچانے سے نہ صرف منع کیا گیا بلکہ اُسے مثبت سوچ و عمل رکھنے اور دوسروں کو بھی نقصان پہنچانے سے روکنے کا کہا گیا۔ راستہ سے کوئی پتھر یا کانٹا ہٹانا معمولی عمل نظر آتا ہے لیکن وہ بہر حال عملِ صالح تو ہیں جن کا ربّ ذوالجلال والاکرام کی جانب سے ثواب دیا جائے گا۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسی نکتے پر زور دیتے ہوئے فرمایا:

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْهِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِهٖ

''تم میں سے کوئی اُس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے (مسلمان) بھائی کے لئے وہ کچھ نہ چاہے جو وہ اپنے لئے چاہتا ہے۔''

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ بھی فرمایا:

''ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ وہ نہ تو اُس پر ظلم ڈھاتا ہے اور نہ ہی مصیبت میں اُسے تنہا چھوڑتا ہے اور جو کوئی اپنے (مسلمان) بھائی کی حاجت روائی کرتا ہے' اللہ تعالیٰ اُس کی حاجت روائی کرے گا۔''

امام غزالی نے انسانی رویّہ میں دو قسم کی نیکیوں کو بیان کیا: سماجی تعلق اور الٰہی تعلق۔ اوّل الذکر کو اُنہوں نے ''عادات'' کا اور مؤخرالذکر کو اُنہوں نے ''عبادات'' کا نام دیا۔ ''عادات'' میں دوستوں' ہمسایوں' رشتہ داروں' حکمرانوں کے حقوق' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وغیرہ شامل ہیں۔ لہٰذا اسلام نے فرد کے عمل کی آزادی (Individualism)' آزادمنشی (Self-containment) اور محو بالذات (Self-centred-ness) ہونے کے ہر ممکنہ تصوّر کو مسترد کر دیا۔''

''اسلام ہر شخص کو مادّی اور اخلاقی میدانوں میں ایک دوسرے سے تعاون کرنے کی دعوت دیتا ہے اور اس ضمن میں امیر و غریب میں کوئی فرق نہیں۔ اُمراء جبکہ اپنی دولت کے ذریعے اچھائی کمائیں تو غرباء اپنے ہاتھوں اور زبان کے ذریعے اچھائی حاصل کریں اس طرح اسلامی نظام میں کوئی بھی تو ایسا نہیں جو کسی نہ کسی طرح بھلائی نہ کر پائے۔ انسانی نفسیات کو باہمی تعامل کی طرف راغب کرتے ہوئے اسلام نے انسان کو یقین دلایا کہ نیک عمل کرنے والا اپنی نیکی سے فائدہ پانے والا پہلا شخص ہوگا۔ چنانچہ فرمایا:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَیْهَا (حٰمٓ السجدة : ۴۶)

''جو کوئی نیک عمل کرتا ہے وہ اپنے فائدہ کے لئے کرتا ہے اور جو کوئی برا عمل کرتا ہے' اُس کا وبال بھی اُس پر پڑے گا۔'' (۴۱ : ۴۶)

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا خطبہ حجۃ الوداع بھی اس سلسلہ میں مینارۂ روشنی ہے۔

(۹۸) استغفارِ نبی ﷺ کی حکمت

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خطاب کرتے ہوئے ارشادِ باری تعالیٰ ہوا:

(۱) وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ (محمّد : ۱۹)

''اور دعا مانگا کریں کہ اللہ آپ کو گناہ سے محفوظ رکھے نیز ایمان والوں اور ایمان والیوں کے لئے بخشش طلب کریں۔'' (۴۷ : ۱۹)

(۲) اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًاO لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ (الفتح : ۱۔۲)

''بے شک ہم نے آپ کو ایک کھلم کھلا فتح دی تا کہ اللہ آپ کی (سب) اگلی پچھلی خطائیں معاف فرمادے۔'' (۴۸ : ۱۔۲)

یہاں ایک شبہ پیدا ہوتا ہے کہ سرورِ عالم ﷺ صغیرہ وکبیرہ تمام گناہوں سے معصوم ہیں اور استغفار کی تو اُس وقت ضرورت پڑتی ہے جب کوئی گناہ سرزد ہو جائے۔ جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام معصوم عن الخطا ہیں تو پھر استغفار کا کیا مطلب ہے؟ اس اِشکال کے متعدّد جواب دیے گئے ہیں:۔

(1) ''ذَنب'' کا معنیٰ عام طور پر ''گناہ'' کیا جاتا ہے۔ گناہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کی نافرمانی کو لیکن اہلِ لغت لفظ ''ذَنب'' کو ''الزام'' کے معنیٰ میں بھی استعمال کرتے رہتے ہیں اور الزام میں یہ ضروری نہیں کہ وہ فعل اُس شخص سے صادر بھی ہوا ہو بلکہ بسا اوقات بلاوجہ اِس فعل کی نسبت اُس شخص کی طرف کر دی جاتی ہے۔''

''قرآنِ کریم میں بھی ''ذَنب'' کا لفظ ''الزام'' کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ ایک دن موسیٰ علیہ السلام نے ایک اسرائیلی اور ایک قبطی کو باہم لڑتے دیکھا۔ قبطی، اسرائیلی کو زدوکوب کر رہا تھا۔ اسرائیلی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا تو اُنہیں مدد کے لئے پکارا۔ آپ نے پہلے قبطی کو منع کیا کہ غریب اسرائیلی پر ظلم وزیادتی نہ کرے۔ جب وہ باز نہ آیا تو آپ نے اُسے ایک مُکّا دے مارا جو اُس کے لئے جان لیوا ثابت ہوا۔ اپنے زیردست ساتھی کی مدد کرنا، اُس کے بچاؤ اور اپنے دفاع کے لئے حملہ آور کو مُکّا مارنا نہ شرعاً کوئی جرم ہے، نہ عرف میں یہ فعلِ قبیح ہے لیکن فرعون چونکہ آپ کا دشمن تھا اور انہیں حکومت کا باغی سمجھتا تھا، اُس نے آپ پر قتل کا الزام رکھا تھا اور اگر اُس کا بس چلتا تو وہ آپ کو وہی سزا دیتا جو قتلِ عمد کی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ فرعون کے پاس جاؤ اور اُسے دعوتِ حق دو تو آپ نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کی:

وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِO (الشُّعراء : ۱۴)

''اُنہوں نے مجھ پر الزامِ قتل لگا رکھا ہے، پس مجھے اندیشہ ہے کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔'' (۲۶:۱۴)

''اِس آیت میں ''ذَنب'' سے مراد گناہ نہیں بلکہ الزام ہے کیونکہ آپ نے اپنے اور اپنے اُمّتی کے بچاؤ

لئے یہ اِقدام کیا تھا۔ آپ کا ارادہ اُسے قتل کرنے کا ہرگز نہ تھا اور نہ عام طور پر مُکا لگنے سے موت واقع ہوتی ہے۔''

''اِن آیات کے سیاق وسباق کو مدِّ نظر رکھا جائے تو یہی معنیٰ (الزام) یہاں موزوں اور مناسب معلوم ہوتا ہے۔ غَفر کا معنیٰ چھپا دینا' دُور کر دینا۔ مَا تَقَدَّمَ سے مراد ہجرت سے پہلے اور مَا تَاَخَّرَ سے مراد ہجرت کے بعد۔ یعنی اے حبیبِ مکرّم! جو الزامات کفار آپ پر ہجرت سے پہلے عائد کیا کرتے تھے اور جو الزامات ہجرت کے بعد اب تک وہ آپ پر لگاتے رہے ہیں' اِس فتحِ مبین سے وہ سارے کے سارے نیست ونابود ہو جائیں گے اور اُن کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہے گا۔''

''پہلے ہم قرآنِ حکیم اور کتبِ حدیث سے اِن الزامات کی چھان بین کرتے ہیں اور اس کے بعد یہ وضاحت کریں گے کہ وہ الزامات اِس فتحِ مبین سے کس طرح دُور ہو گئے۔''

''ہجرت سے پہلے جو الزامات کفار کی طرف سے حضور سرورِ عالمیان ﷺ پر عائد کئے جاتے تھے' وہ یہ ہیں: یہ کاہن ہے' یہ شاعر ہے' یہ مجنون ہے' یہ ساحر ہے' یہ اوروں سے سن سن کر افسانے بنا لیتا ہے' اُسے کوئی اور پڑھاتا ہے' وغیرہ وغیرہ۔''

''ہجرت کے بعد کے الزامات کی فہرست کچھ یوں ہے:
''وہ کہتے کہ یہ شخص قوم میں اختلاف' انتشار پیدا کرنے والا ہے' اُس نے جنگ کی آگ بھڑکا کر مکہ کو اُجاڑ ڈالا ہے' بھائی کو بھائی سے' اولاد کو اپنے ماں باپ سے جدا کرنے والا ہے۔ اُس نے ہمارے محفوظ تجارتی راستوں کو خطرناک بنا دیا ہے اور ہمارے قومی انتظامات کو درہم برہم کر دیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔'' (''ضیاء القرآن''۔۔ پیر کرم شاہ الازہری' جلد چہارم' صفحات ۵۳۲' ۵۳۳)

(2) علامہ قرطبی نے سورہ محمّد کی آیت ۱۹ کے الفاظ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ کے دو معنیٰ ذکر کیے ہیں: (۱) اِسْتَغْفِرِاللّٰهَ اَنْ يَّقَعَ مِنكَ ذَنْب'' یعنی آپ اس بات سے اللہ کی مغفرت طلب کریں کہ آپ سے کوئی گناہ سرزد ہو۔ چنانچہ اوپر ترجمہ اِسی کے مطابق کیا گیا ہے۔ (۲) اِسْتَغْفِرْ لِيَعْصِمَكَ مِنَ الذُّنُوبِ یعنی استغفار کریں تا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو گناہوں سے بچائے رکھے۔''

(3) ''علامہ آلوسی لکھتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے درجات میں ہر لحظہ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اوپر والے درجے پر پہنچ کر جب نیچے والے درجے پر نگاہ پڑتی تو موجودہ رفعت کے مقابلہ میں وہ قصور محسوس ہوتا۔ اس لئے آپ ﷺ کثرت سے استغفار کیا کرتے۔'' (روح المعانی)

(4) ''عارف باللہ حضرت مولانا ثناء اللہ پانی پتی لکھتے ہیں کہ اِس حکم میں دو حکمتیں ہیں:

۲۵۸۶ (استغفارِ نبی ﷺ کی حکمت)

(۱) ''اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اُس کے احکام کی بجا آوری میں خواہ کتنی ہی کوشش کی جائے، انسان پر لازم ہے کہ اپنے قصور کا اعتراف کرتا رہے اور یہ سمجھے کہ جیسا مجھے کرنا چاہئے تھا مجھ سے نہیں ہو سکا۔ منعمِ حقیقی نے جو بے پایاں احسانات مجھ پر فرمائے ہیں، میں اُن کا شکر ادا نہیں کر سکا۔ یہ تصوّر انسان کا کمال ہے، نقص نہیں۔''

(۲) ''دوسری حکمت یہ ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اس لئے کثرت سے استغفار فرمایا کرتے تاکہ اُمت آپ ﷺ کی اِس سنت پر عمل پیرا رہے اور کوئی بھی اُمتی استغفار اور توبہ سے غفلت نہ برتے۔'' (مظہری)

(5) ''امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اِس آیت کے ضمن میں لکھا ہے کہ اِس آیت کی دو توجیہیں کی گئی ہیں: ایک توجیہ تو یہ ہے کہ خطاب اگرچہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہے لیکن مراد اُمّت ہے۔ یہ توجیہ درست نہیں کیونکہ مؤمنین کے لئے استغفار کا علیحدہ حکم دیا گیا ہے۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ یہاں ''ذَنب'' سے مراد گناہ یا نافرمانی نہیں بلکہ ترکِ افضل ہے۔ امام لکھتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ والا صفات اس سے منزّہ ہے کہ وہ افضل کو چھوڑ کر غیر افضل کریں۔ اس لئے امام رازی نے اپنی توجیہ پیش کی ہے۔ فرماتے ہیں: اِنَّ الْمُرَادَ تَوْفِيْقُ الْعَمَلِ الْحَسَنِ وَاجْتِنَابُ الْعَمَلِ الشَّنِيْءِ یعنی اچھے کام کی توفیق اور بُرے کاموں سے پرہیز۔ کیونکہ استغفار کا معنیٰ طلبِ غفران ہے اور غُفران کا معنیٰ کسی قبیح چیز کا ڈھانپ دینا ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی قبیح چیز کے ارتکاب ہی سے محفوظ رکھے جس طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شان ہے، یا گناہ کے ارتکاب کے بعد اُسے ڈھانپ دے جس طرح کہ مؤمنین اور مؤمنات کا حال ہے۔'' (''ضیاء القرآن'' ج ۴، ص ۵۱۵)

(6) بہاء الدین زکریا ملتانی کے شیخ حضرت شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہما فرماتے ہیں کہ یہ مقتضائے فرمانِ الٰہی وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى یعنی ''اے محبوبِ مکرم! آپ کی ہر آنے والی ساعت اور ہر آنے والی گھڑی گزشتہ ساعتوں اور لمحوں سے افضل اور اعلیٰ ہے۔'' اس لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا عقابِ ہمت خداداد رفعتوں اور بلندیوں کی طرف مصروفِ پرواز رہتا تھا۔ اس چھوڑی ہوئی منزل میں جو لمحہ گزرتا تھا، وہ بھی نگاہِ مصطفوی میں ایک ''ذَنب'' تھا جس سے بار بار استغفار کیا جا رہا ہے۔''

(7) ''ایک اور بڑی پیاری بات کہی گئی ہے کہ استغفار جو بظاہر تو طلبِ مغفرت ہے لیکن اس کا مدّعا اللہ تعالیٰ کی مزید محبت کی طلب ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ہر لمحہ استغفار و توبہ میں مصروف رہتا تھا اور درحقیقت ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں اضافے اور زیادتی کی التجا ہے:

وَ مِنْهَا اَنَّ فِي الْاِسْتِغْفَارِ وَ التَّوْبَةِ مَعْنًى لَّطِيْفًا وَ هُوَ اِسْتِدْعَاءٌ لِمَحَبَّةِ اللّٰهِ تَعَالٰى فَاِحْدَاثُهُ الْاِسْتِغْفَارَ وَالتَّوْبَةَ فِيْ كُلِّ حِيْنٍ اِسْتِدْعَاء'' لِمَحَبَّةِ اللّٰهِ تَعَالٰى (سُبُل الهُدٰى وَالرّشاد لِعلامه محمّد بن يوسف الشامى متوفى ۹۴۲ھ، ج ۷، ص ۱۰۲)

۲۵۸۷.(استغفارِ نبی ﷺ کی حکمت)

(8) ''انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے حقوقِ واجبہ ادا کرنے کی وجہ سے اور مباح امور مثلاً کھانے پینے' جماع کرنے' سونے' آرام کرنے' مسلمانوں سے باتیں کرنے' اُن کی مصلحتوں میں غور وفکر کرنے' دشمنوں سے جنگ کی تدبیر کرنے اور ایسے دوسرے کاموں میں مشغول ہو جانے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اُس سے دعا اور اُس کا مشاہدہ اور مراقبہ نہیں کر پاتے اور آپ ﷺ اپنے عظیم مقام کی وجہ سے اِسے بھی گناہ خیال فرماتے تھے کیونکہ آپؐ کا مقامِ عالی تو یہ ہے کہ آپ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر رہیں۔''

(9) ''علامہ جلال الدین سیوطی متوفّٰی ۹۱۱ھ لکھتے ہیں :

''اشکال یہ ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام تو معصوم ہیں حتّٰی کہ آپ صغیرہ گناہوں سے بھی معصوم ہیں تو پھر استغفار کے کیا معنٰی؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ استغفار کرنے سے گناہ کا صدور لازم نہیں آتا بلکہ استغفار میں اپنے ربّ کی طرف حاجت کا اظہار ہوتا ہے' تواضع ہوتی ہے اور اُمت کے لئے تعلیم ہوتی ہے تاکہ اُن کے لئے بھی استغفار کرنا سنت ہو جائے۔''

(10) شیخ عبدالحق محدث دہلوی متوفّٰی ۱۰۵۲ھ لکھتے ہیں:

''علامہ سبکی نے اس آیت کی تفسیر میں یہ کہا ہے کہ ہر چند کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا لیکن ربِّ ذوالجلال والاکرام نے آپ ﷺ کے شرف و مرتبہ کو ظاہر کرنے کے لئے یہ فرمایا: ہم نے آپ کے اگلے اور پچھلے ذَنْب بخش دیئے۔ کیونکہ بادشاہوں کا یہ طریقہ ہوتا ہے کہ اپنے خواص اور مقرّبین کو نوازنے کے لئے کہتے ہیں کہ ہم نے تمہاری اگلی پچھلی سب خطائیں معاف کر دیں اور تم سے کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ حالانکہ بادشاہ کو علم ہوتا ہے کہ اِس شخص نے کوئی خطا یا جرم نہیں کیا اور نہ آئندہ کرے گا لیکن اس کلام سے اُس شخص کی تعظیم اور تشریف کو بیان کرنا مقصود ہوتا ہے۔''

(11) ''شیخ عزالدین بن عبدالسلام نے اپنی کتاب ''نِهَايَةُ السُّول فِيمَا سخ مِن تَفْضِيلِ الرسول'' میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو تمام انبیاء علیہم السلام پر فضیلت دی ہے۔ پھر اُنہوں نے فضیلت کی دو وجوہات ذکر کی ہیں جن میں سے ایک وجہ یہ بیان کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے اگلے اور پچھلے تمام ذنوب (یعنی بہ ظاہر خلافِ افضل کاموں) کو بخش دیا ہے اور یہ بیان کیا ہے کہ انبیاء سابقین میں سے اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کی مغفرت کی خبر نہیں دی۔ یہی وجہ ہے کہ قیامت کے دن جب دیگر انبیاء علیہم السلام سے شفاعت طلب کی جائے گی تو سب ''نَفْسِی نَفْسِی'' کہیں گے اور ہیبتِ الٰہی سے شفاعت نہیں کریں گے اور جب رسول اللہ ﷺ سے لوگ شفاعت طلب کریں گے تو آپ فرمائیں گے: أَنَا لَهَا أَنَا لَهَا یعنی یہ میرا کام ہے۔ اور اس کا بیان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے آپ کے لئے فتح مبین کو ثابت کیا' پھر مغفرتِ ذنوب کا ذکر کیا' پھر اپنی نعمت پوری کرنے اور صراطِ مستقیم کی ہدایت پر ثابت رکھنے اور نصرِ عزیز کا ذکر کیا جس سے یہ ظاہر ہو گیا کہ اس آیت سے مقصود گناہوں کا ثابت کرنا نہیں بلکہ گناہوں کی نفی کرنا ہے۔'' (''تبیان القرآن'' علامہ غلام رسول سعیدی' ج ۱۱' ص ۲۰۷ـ۸)

(۹۹) اعتکاف

اعتکاف کا مصدر ع۔ک۔ف ہے اور اِعتَکَفَ فِی المَکان کا معنیٰ کسی جگہ میں تنہا ہو کے بیٹھ جانا ہے [القاموس العصری (انگریزی عربی لغت)۔۔الیاس انطون]۔لہٰذا اعتکاف کا لفظی معنیٰ ''تنہائی'' ہے اور جو تنہائی میں رہے' اُسے ''معتکف'' کہا جاتا ہے۔

شریعت کی اصطلاح میں اعتکاف عبادت کی خوبصورت اور امتیازی شکل ہے جس میں ایک مسلمان بالخصوص رمضان المبارک کے آخری دس دنوں میں اپنے تمام دنیاوی مشاغل سے دستبردار ہو کر اور ہر ایک سے الگ تھلگ ہو کر مسجد میں بیٹھ جاتا ہے۔اس دوران وہ دنیا کی ہر چیز سے تعلق توڑ لیتا ہے اور اپنے آپ کو بلا شرکتِ غیرے اپنے خالق و مالک کے حضور وقف کر دیتا ہے۔''اِس مکمل تخلیہ اور ذکر و اذکار اور توبہ و ندامت میں مشغول ہونے میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ اُس کا ایک خاص تعلق قائم ہو جاتا ہے۔اعتکاف کا امتیازی پہلو یہ ہے کہ معتکف جب تک اعتکاف کی حالت میں رہتا ہے' اُس کا ہر ہر لمحہ بہ شمول اُس کا کھانا' پینا یہاں تک کہ اُس کا اونگھنا اور سونا بھی عبادت میں لکھا جاتا ہے۔''

''حضرت عطا الخراسانی بیان کرتے ہیں کہ معتکف کی مثال اُس شخص کی سی ہے جو اللہ کی بارگاہ میں حاضر رہتا ہو اور فریاد کرتا ہو: اے اللہ! جب تک تو میری بخشش نہ فرمادے' میں یہاں سے نہیں ہلوں گا۔'' (''بدائع الصنائع'' بحوالہ "Rules of I'tikaf" صفحہ ا' ازمولانا تقی عثمانی)

اعتکاف کی اقسام حسب ذیل ہیں:

(۱) اعتکافِ مسنون: اعتکاف کی یہ وہ قسم ہے جسے رمضان المبارک کے آخری دس دنوں میں رمضان المبارک کی بیسویں شب سے شوال کا چاند نظر آنے تک ادا کیا جاتا ہے۔اسے ''اعتکافِ مسنون'' اس لئے کہا جاتا ہے کہ امام الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام ہر سال اُسے ادا فرمایا کرتے تھے۔''

(۲) اعتکافِ نفل: یہ اعتکاف سال میں کسی بھی وقت ادا کیا جا سکتا ہے۔

(۳) اعتکافِ واجب: یہ اعتکاف مندرجہ ذیل وجوہ کی وجہ سے واجب ہو جاتا ہے:

(i) کوئی نذر یا منّت ماننے سے۔

(ii) اعتکافِ مسنونہ سے محروم ہونے کی قضا۔

اعتکاف کرنا کن لوگوں کے لئے جائز ہے؟ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے :

(۱) معتکف کا صحیح الدماغ مسلمان ہونا ضروری ہے۔ سر پھرے آدمی یا کافر کا اعتکاف جائز نہیں۔ جس طرح ایک نابالغ بچہ نماز پڑھتا ہے یا روزہ رکھتا ہے' اُسی طرح نابالغ بچہ بھی اعتکاف کر سکتا ہے۔

(۲) عورت بھی اپنے گھر کا کوئی حصہ مخصوص کر کے اُس میں عبادت اور اعتکاف کر سکتی ہے لیکن اعتکاف کے لئے اُس کا اپنے شوہر سے اجازت لینا ضروری ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اعتکاف کے دوران حیض و نفاس میں نہ ہو۔

(۳) اعتکافِ مسنون اور اعتکافِ واجب میں معتکف کا روزے دار ہونا ضروری ہے۔ روزہ نہ ہونے کی صورت میں نہ تو اعتکافِ مسنون جائز ہوگا اور نہ ہی اعتکافِ واجب۔ اعتکافِ نفل میں روزے کا ہونا شرط نہیں۔

''اعتکاف کی جگہ : مسلمان مردوں کا اعتکاف صرف مسجد ہی میں جائز ہے اور سب سے متبرک اور قابلِ ترجیح اعتکاف وہ ہے جو مسجدِ حرام (مکہ مکرمہ) میں کیا جائے۔ پھر مسجدِ نبوی (مدینہ منورہ) میں اعتکاف کا درجہ ہے' اُس کے بعد مسجد اقصیٰ (القدس) میں اور ان سب کے بعد کسی بھی جامع مسجد میں۔''

''اعتکافِ مسنونہ کا معنیٰ اور اُس کا اثر : جیسا کہ بیان ہوا کہ رمضان المبارک کے آخری دس دنوں میں کیا جانے والا اعتکاف ''مسنون اعتکاف'' کہلاتا ہے۔ اس اعتکاف کا آغاز رمضان المبارک کے بیسویں روزے کی تکمیل پر ہوتا ہے اور شوال (عید) کا چاند نظر آنے تک رہتا ہے۔ اس حقیقت کے مدِنظر کہ اعتکاف رمضان کی اکیسویں شب سے اور غروبِ آفتاب کے آغاز سے ہوتا ہے' معتکف کے لئے رمضان کے بیسویں دن کی مغرب سے پہلے مسجد کی حدود میں داخل ہو جانا ضروری ہے تاکہ مسجد میں اُس کی موجودگی میں آفتاب غروب ہو۔''

''اعتکاف کی یہ قسم سنت المؤکدہ علی الکفایۃ ہے جس کا یہ معنیٰ ہے کہ مسجد کے وقوع پر رہنے والا کوئی شخص اگر اعتکاف کرے تو اُس علاقہ کے تمام اہالیان کی جانب سے اس سنت کی تکمیل ہو جاتی ہے اور اگر اُس پورے علاقہ سے کوئی شخص بھی اعتکاف نہ کرے تو تمام کے تمام لوگ گناہ گار رہوں گے۔''

''علاقہ کے لوگوں کی ذمہ داری اور اعتکاف کے اہم پہلو : (۱) مندرجہ بالا بیان سے معلوم ہوا کہ علاقہ میں رہنے والے ہر شخص کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اعتکاف کا وقت شروع ہونے سے پہلے ہی اس بات کو یقینی بنائے کہ آیا کوئی آدمی اُن کے علاقہ میں اعتکاف کرنے والا ہے یا نہیں۔ (۲) کسی شخص کو رقم یا معاوضہ دے کر اعتکاف میں بٹھانا جائز نہیں کیونکہ اعتکاف ایک عبادت ہے اور کسی کو معاوضہ دے کر اُس سے عبادت نہیں کرائی جا سکتی۔ اگر کسی علاقہ کا کوئی بھی شخص بہ تقاضائے حالات اعتکاف کرنے کے قابل نہیں تو کسی دوسرے علاقہ کے کسی بھی شخص کو اعتکاف

میں بٹھانے کا انتظام کرنا ضروری ہے۔''

''اعتکاف کا امتیازی پہلو یہ ہے کہ معتکف اعتکاف کے دوران مسجد کی حدود کے اندر رہے۔ قضائے حاجت کے علاوہ اُسے حدودِ مسجد کو ایک لحہ کے لئے بھی نہیں چھوڑنا چاہئے۔ اگر وہ کسی جائز شرعی وجہ کے بغیر حدودِ مسجد کو چھوڑے تو اعتکاف باطل ہو جائے گا۔''

''<u>حدودِ مسجد کا مطلب</u>: بہت سے لوگ حدودِ مسجد کا مطلب نہیں سمجھتے جس وجہ سے اُن کا اعتکاف باطل ہو جاتا ہے۔ اس لئے حدودِ مسجد کی اصطلاح کو بہ احتیاط سمجھنا ضروری ہے۔

''وہ مساجد جہاں کے وضو خانے مسجد کے ساتھ متصل ہیں' تو لوگ وضو خانوں کو مسجد کا حصّہ سمجھ کر بحالتِ اعتکاف اُن میں گھومنا پھرنا شروع کر دیتے ہیں اور اس طرح اُن کا اعتکاف باطل ہو جاتا ہے کیونکہ وضو خانہ مسجد کا حصّہ نہیں ہوتا۔ اس لئے معتکف کے لئے بغیر کسی شرعی عذر کے وہاں جانا جائز نہیں۔ اسی طرح مسجد کی وہ سیڑھیاں بھی جو مسجد میں داخلے کے لئے استعمال کی جاتی ہیں' بالعموم مسجد سے خارج ہوتی ہیں۔ اس لئے معتکف کے لئے بغیر کسی شرعی عذر کے وہاں جانا جائز نہیں۔ کچھ مساجد کے صحن میں بنے ہوئے حوض بھی مسجد کی حدود سے باہر ہوتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہوا کہ محولہ بالا تمام صورتوں میں حدودِ مسجد کا وضو خانے' سیڑھیوں اور حوض سے جدا ہونے کو یقینی بنایا جانا ضروری ہے اور یہ کہ حدودِ مسجد کہاں سے شروع ہوتی ہیں اور کہاں ختم ہوتی ہیں۔ اس ضمن میں قابلِ ترجیح بات یہ ہے کہ ہر مسجد کے نوٹس بورڈ پر بالخصوص معتکفین کی سہولت کے لئے حدودِ مسجد کو متعین کرنے والا نقشہ آویزاں کیا جائے۔''

''کچھ مساجد میں جہاں نمازِ جنازہ کے لئے مخصوص جگہ ہوتی ہے تو ایسی جگہ حدودِ مسجد سے باہر ہوتی ہے اور معتکف کو وہاں جانے کی اجازت نہیں ہے۔''

''کچھ مساجد میں امام اور مؤذن کے کوارٹر مسجد سے متصل بنائے ہوتے ہیں۔ یہ کوارٹر بھی حدودِ مسجد سے خارج ہیں اور اس لئے معتکف کو وہاں جانے کی اجازت نہیں۔ کچھ مسجدوں سے متصل امام کی نجی ضروریات کے لئے ایک کمرہ بنا ہوتا ہے۔ اگر مسجد کے بانی نے اسے مسجد کے حصہ کے طور پر مخصوص نہیں کیا تو یہ حصّہ بھی حدودِ مسجد میں نہیں اور اسی لئے معتکف وہاں نہیں جا سکتا۔ ہاں اگر مسجد کے بانی نے اُسے مسجد کے حصّہ کے طور پر بنایا ہو تو معتکف کو وہاں جانے کی اجازت ہے۔''

''کچھ مساجد کے متصل ایک جگہ بچوں کی تعلیم کے لئے مخصوص کی ہوتی ہے۔ اگر مسجد کے بانی نے اسے مسجد کے حصّہ کے طور پر مخصوص نہیں کیا تو معتکف کے لئے وہاں جانا جائز نہیں۔ کچھ مساجد میں کوئی جگہ یا کمرہ دریاں اور ...یاں وغیرہ رکھنے کے لئے مخصوص کیا ہوتا ہے تو ایسی جگہ بھی حدودِ مسجد میں شامل نہیں اگر مسجد کے بانی نے اُسے ...جد کے حصّہ کے طور پر مخصوص نہیں کیا۔ اس لئے معتکف اعتکاف شروع کرنے سے پہلے مسجد کے معتمدین سے حدودِ

مسجد کا جانا یقینی بنائے۔''

''اگر حدودِ مسجد ایک مرتبہ متعین ہو جائیں تو معتکف ایک لمحہ کے لئے بھی کسی شرعی عذر کے بغیر اُن حدود سے باہر نہیں جا سکتا ورنہ اُس کا اعتکاف باطل ہوگا۔''

''کسی شرعی مجبوری کے سبب مسجد کو چھوڑنا: ''شرعی ضرورت'' کی اصطلاح سے مراد وہ ضروریات ہیں جن کی بنیاد پر شریعت نے معتکف کو مسجد چھوڑنے کی اجازت دی ہے۔ ایسی ضروریات کے تحت اگر معتکف مسجد کو چھوڑتا ہے تو اس کا اعتکاف باطل نہیں ہوتا۔ ضروریاتِ شرعیہ حسبِ ذیل ہیں:۔

''(1) قضائے حاجت: (الف) معتکف قضائے حاجت یعنی ٹٹی پیشاب کرنے کے لئے مسجد کو چھوڑ سکتا ہے۔ پیشاب کرنے کے لئے اُسے مسجد کی قریب ترین جگہ کو جانا چاہئے جہاں وہ پیشاب کر سکے۔ ٹٹی کے لئے اگر طہارت خانہ مسجد سے متصل ہے اور وہاں ٹٹی کی جا سکتی ہو تو اُسے وہاں جانا چاہئے اور کسی دوسری جگہ جانے کی اُسے اجازت نہیں ہے۔ اگر معتکف اپنی عادت کی وجہ سے یا اس وجہ سے کہ اُسے اپنے گھر کے علاوہ کسی اور جگہ ٹٹی نہیں آتی تو اُسے اس مقصد کے لئے اپنے گھر کو جانے کی اجازت ہے اگرچہ طہارت خانہ مسجد سے متصل ہو۔ اگر معتکف کے ساتھ مذکورہ مجبوری نہیں ہے تو اُسے مسجد کے طہارت خانہ کو استعمال میں لانا چاہئے۔ اگر ایسا آدمی مسجد کے طہارت خانہ کو چھوڑ کر اپنے گھر کو جاتا ہے تو کچھ علماء کے نزدیک اُس کا اعتکاف باطل ہو جائے گا۔'' (فتاویٰ شامی)

''(ب) اگر مسجد میں طہارت خانہ (Toilet) نہیں ہے یا یہ کہ وہاں قضائے حاجت کرنا ممکن نہیں ہے یا سخت تکلیف (شدید قبض) کی صورت ہے، تو اِن تمام حالات میں اُسے گھر جانے کی اجازت ہے خواہ مسجد سے گھر جانے کا فاصلہ کتنا ہی ہو۔''

''(ج) اگر معتکف کے کسی دوست یا قرابتدار کا گھر مسجد کے قریب ہو تو قضائے حاجت کے لئے وہاں جانا اُس کے لئے ضروری نہیں۔ اس کے باوجود اُسے اپنے گھر جانے کی اجازت ہے اگر اُس کا گھر اُس کے دوست یا رشتہ دار کے گھر کے مقابل کچھ فاصلے پر ہے۔ فتاویٰ شامی کی عبارت ملاحظہ ہو:

وَلَوْ كَانَ بِقُرْبِ الْمَسْجِدِ بَيْتُ صَدِيْقٍ لَمْ يَلْزِمْ قَضَاءَ الْحَاجَةِ فِيْهِ

''اگر دوست کا گھر مسجد کے قریب ہو تو وہاں قضائے حاجت کے لئے جانا ضروری نہیں۔''

''(د) اگر معتکف کے دو گھر ہیں تو اُسے قضائے حاجت کے لئے قریب ترین گھر کو جانا چاہئے۔ اگر وہ بعید ترین گھر کو جائے تو کچھ علماء کے نزدیک اُس کا اعتکاف باطل ہو جائے گا۔'' عبارت ملاحظہ ہو:

إِنْ كَانَ لَهُ بَيْتَانِ قَرِيْبٌ وَبَعِيْدٌ قَالَ بَعْضُهُمْ: لَا يَجُوْزُ أَنْ يَمْضِيَ إِلَى الْبَعِيْدِ فَإِنْ مَضَى بَطَلَ اعْتِكَافُهُ (فتاویٰ شامی، فتاویٰ عالمگیری)

''(ڈ) اگر طہارت خانہ فارغ نہیں تو اُس کے فارغ ہونے تک انتظار کرنا چاہئے۔ قضائے حاجت سے فارغ ہوچکنے کے بعد ایک لمحہ کے لئے بھی وہاں رکنا جائز نہیں ہے ورنہ اُس کا اعتکاف باطل ہو جائے گا۔'' (ایضاً)

''(ذ) گھر میں یا طہارت خانے کو آتے جاتے ہوئے کسی کو سلام کہنے یا سلام کا جواب دینے یا مختصر سی گفتگو کرنے کی اجازت ہے بشرطیکہ ایسی مختصر گفتگو کے لئے وہ نہ رُکے۔'' (مرقاۃ)

''(ر) طہارت خانے کو تیز تیز قدموں سے آنا جانا ضروری نہیں۔ سست روی سے بھی آنے جانے کی اجازت ہے۔''

اِنْ کَانَ خَرَجَ لِحَاجَۃِ الْاِنْسَانِ اَنْ یَّمْشِیَ عَلٰی التَّؤُدَۃِ (فتاویٰ عالمگیری)

''(ڑ) قضائے حاجت کے لئے طہارت خانہ کو جاتے ہوئے کسی شخص کی فرمائش یا درخواست پر رکنا نہیں چاہئے۔ جاتے ہوئے معتکف کو ایسے دوسرے شخص کو اشارتاً سمجھا دینا چاہئے کہ وہ اعتکاف میں ہے اور وہ اُس مقصد کے لئے نہیں ٹھہر سکتا۔ اگر وہ کسی کی فرمائش یا درخواست پر ٹھہر جاتا ہے تو اُس کا اعتکاف باطل ہو جائے گا۔ اس اصول کا اطلاق اس حد تک ہے کہ اگر کسی قرضخواہ نے معتکف کو راہ میں روک لیا ہے تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک اعتکاف باطل ہو جائے گا۔'' عبارت ملاحظہ ہو:

وَلَوْخَرَجَ لِبَوْلٍ اَوْغَائِطٍ فَحَبَسَہُ الْغَرِیْمُ سَاعَۃً فَسَدَ اِعْتِکَافُہٗ عِنْدَ اَبِیْ حَنِیْفَۃَ رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی

''لہٰذا احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ معتکف راستے میں کسی بھی صورت میں نہ ٹھہرے۔''

''(ز) قضائے حاجت کے لئے اپنے گھر کو جانے والے کے لئے اُسے وہاں قضائے حاجت کے بعد وضو کرنے کی اجازت ہے۔''

''(2) غسل: احتلام یا مادہ منویہ کے انزال کی صورت میں غسلِ جنابت کے لئے معتکف کو مسجد سے باہر جانے کی اجازت ہے۔ اگر ایسا شخص مسجد میں کسی بڑے ٹب میں بیٹھ کر اس طرح غسل کرے کہ پانی مسجد میں نہ گرے تو اس صورت میں اُسے مسجد سے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔ اگر یہ ممکن نہ ہو یا کوئی شدید مجبوری ہو تو غسلِ جنابت کے لئے وہ باہر جا سکتا ہے (تفسیر فتح القدیر)۔ اگر مسجد میں غسل خانہ موجود ہے تو اُسے غسل مسجد ہی میں کرنا چاہئے اور اگر مسجد میں غسل خانہ نہیں ہے یا کسی بھی وجہ سے وہاں غسل کرنا ممکن نہیں یا کوئی انتہائی رکاوٹ ہے تو معتکف اپنے گھر جا کر غسل کر سکتا ہے۔''

''غسلِ جنابت کے علاوہ معتکف کو کسی اور غسل کے لئے مسجد کو نہیں چھوڑنا چاہئے مثلاً جمعہ کا غسل یا اپنے آپ کو تازہ دَم کرنے کا غسل۔ اگر اس مقصد کے لئے مسجد کو چھوڑا تو اُس کا اعتکاف باطل ہو جائے گا۔ اگر

معتکف جمعہ کا غسل یا تازہ دَم ہونے کا غسل کرنا چاہتا ہے تو اُسے غسل کا ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہئے کہ پانی مسجد میں نہ گرے۔ مثلاً یہ کہ وہ کسی ٹب میں بیٹھ کر غسل کرلے یا وہ مسجد کے کونے میں اس طرح غسل کرے کہ پانی مسجد سے باہر چلا جائے۔ نفل اعتکاف کی صورت میں ایسا کیا جا سکتا ہے۔ ایسی صورت میں جتنا وقت وہ غسل میں لگاتا ہے' تو اُس وقت تک کے لئے اُس کا اعتکاف مؤثر نہیں رہے گا۔''

''جہاں معتکف کو وضو کرنے کے لئے مسجد سے باہر جانے کی اجازت ہے تو اُسے وضو کے ساتھ مسواک اور ٹوتھ پیسٹ کرنے' صابن استعمال کرنے' اعضائے جسمانی کو تیل ملنے کی اجازت ہے۔ تاہم وضو کرنے کے بعد اُسے مسجد سے باہر رہنے یا راستے میں ٹھہرنے کی ایک لمحہ کے لئے بھی اجازت نہیں ہے۔''

''(3) کھانا پینا: اگر معتکف کو مسجد میں کھانا اور پانی پہنچانے کا انتظام ہے تو اُسے کھانا لانے کے لئے مسجد سے باہر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ ہاں اگر اُس کا ایسا کوئی انتظام نہیں ہے تو کھانا لانے کے لئے اُسے مسجد چھوڑنے کی اجازت ہے لیکن بہرصورت کھانا مسجد ہی میں لایا جائے اور وہیں کھایا جائے (البحر الرائق)۔ ایسے آدمی کو یہ ذہن نشین ہونا چاہئے کہ وہ مسجد کو اُس وقت چھوڑے جب وہ کھانا لا سکنے کے قابل ہو۔ لیکن اگر اُسے کھانا ملنے میں کچھ دیر انتظار کرنا پڑے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔''

''(4) اذان: (۱) اگر مؤذن خود معتکف ہے اور اذان کہنے کے لئے اُسے مسجد کو چھوڑنا ہے تو اُسے باہر جانے کی اجازت ہے لیکن اذان کہنے کے بعد اُسے وہاں ٹھہرنا نہیں چاہئے۔''

(۲) اگر کوئی شخص مؤذن نہیں لیکن وہ کسی خاص وقت کی اذان دینا چاہتا ہے تو اُسے اذان دینے کے لئے مسجد سے باہر جانے کی اجازت ہے۔''

(۳) اگر مسجد کے مینار کا دروازہ مسجد کے اندر واقع ہے تو معتکف کو مینار پر چڑھنے کی بالکل اجازت ہے کیونکہ وہ مسجد کا حصہ ہے لیکن اگر دروازہ یا مینار مسجد سے باہر ہے تو اذان دینے کی ضرورت کے علاوہ معتکف کو اُس مینارے پر چڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔'' (فتاویٰ شامی)

''(5) نماز جمعہ: (۱) قابلِ ترجیح بات یہ ہے کہ اعتکاف ایسی مسجد میں کیا جائے جہاں جمعہ کی نماز ہوتی ہو' تاکہ اُس کی ادائیگی کے لئے مسجد سے باہر جانے کی اُسے ضرورت پیش نہ آئے۔ تاہم اگر کسی مسجد میں نماز جمعہ نہیں ہوتی بلکہ صرف پنجگانہ نمازیں ہوتی ہیں تو ایسی مسجد میں اعتکاف کرنے کی اجازت ہے۔''

(۲) ایسی صورت میں نماز جمعہ ادا کرنے کے لئے کسی اور مسجد میں جانے کی اجازت ہے۔ تاہم اس مقصد کے لئے معتکف کو ایسے وقت میں مسجد کو چھوڑنا چاہئے کہ جامع مسجد میں پہنچنے پر اُس کے خیال میں وہ چار رکعت سنت ادا کرلے گا اور اس کے بعد خطبہ بھی اول تا آخر سن لے گا۔'' (فتاویٰ عالمگیری)

(۳) اگر معتکف کسی جامع مسجد میں نمازِ جمعہ ادا کرنے جاتا ہے تو مسجد میں فرض نماز ادا کرنے کے بعد سنت رکعت بھی ادا کرنی چاہئیں۔ اُس کے بعد اُسے اُس مسجد میں ٹھہرنے کی اجازت نہیں (فتاویٰ عالمگیری) ہاں اگر وہ کسی سخت ضرورت کے تحت کچھ وقت کے لئے وہاں ٹھہرتا ہے تو اُس کا اعتکاف باطل نہیں ہوگا کیونکہ وہ بہرحال رہا تو مسجد ہی میں ہے۔''

(۴) اگر معتکف نماز جمعہ کی ادائی کے لئے جامع مسجد میں جاتا ہے' پھر وہ وہاں ٹھہر جاتا ہے اور اعتکاف کا بقایا وقت وہیں گزارتا ہے تو اُس کا اعتکاف صحیح ہوگا لیکن ایسا کرنا مکروہ فعل ہے۔'' (ایضاً : فتح القدیر)

''(6) اعتکاف کے دوران مسجد کی تبدیلی : ہر معتکف کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنا اعتکاف اُسی مسجد میں مکمل کرے جہاں اُس نے اُسے شروع کیا تھا۔ تاہم اگر اُسے کسی ایسی شدید مشکل اور دقت کا سامنا ہے کہ اُس مسجد میں اعتکاف کی تکمیل اُس کے لئے ممکن نہیں مثلاً مسجد ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئی ہے۔ یا اُسے جبراً وہاں سے نکال دیا گیا ہے یا وہاں رہنے میں اُس کی زندگی یا جائداد کو شدید خطرہ ہے تو اُسے کسی دوسری مسجد میں منتقل ہونے اور اعتکاف کو وہاں مکمل کرنے کی اجازت ہے اور اس صورت میں اعتکاف باطل نہیں ہوگا بشرطیکہ مسجد چھوڑنے پر وہ سیدھا دوسری مسجد میں جائے اور راستے میں نہ تو کسی کا انتظار کرے اور نہ ہی ٹھہرے۔'' (ایضاً' فتح القدیر)

فَإِنْ خَرَجَ مِنَ الْمَسْجِدِ بِعُذْرٍ بِأَنَّ اِنْهِدَامِ الْمَسْجِدِ أَوْ أُخْرِجَ مُكْرِهًا فَدَخَلَ مَسْجِدًا آخَرَ مِنْ سَاعَتِهِ لَمْ يُفْسِدْ اِعْتِكَافُهٗ' اِسْتِحْسَانًا

(7) "نمازِ جنازہ اور مریض کی عیادت : (۱) معتکف کو نمازِ جنازہ میں شامل ہونے یا کسی مریض کی عیادت کرنے کے لئے مسجد چھوڑنے کی بالعموم اجازت نہیں ہے۔ تاہم اگر معتکف قضائے حاجت کے لئے مسجد سے باہر جائے اور اتفاقی طور پر راستے میں کسی شخص کی خیریت معلوم کرلے یا نماز جنازہ میں شامل ہو جائے تو اُس کا اعتکاف باطل نہیں ہوگا لیکن یہ بات اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ اُس نے نماز جنازہ میں شامل ہونے یا مریض کی عیادت کرنے کی نیت سے مسجد نہ چھوڑی ہو بلکہ مسجد چھوڑنے میں اُس کی نیت قضائے حاجت کی تھی جس کے بعد اُس نے نماز جنازہ میں شمولیت بھی کی اور مریض کی عیادت بھی کی۔'' (فتاویٰ شامی)

(۲) ''اگر معتکف اعتکاف کے شروع میں یہ نیت کرے کہ وہ اعتکاف کے دوران فلاں مریض کی عیادت بھی کرے گا یا نماز جنازہ میں بھی شامل ہوگا یا کسی اسلامی یا مذہبی اجتماع میں شرکت کرے گا تو ایسی صورت میں اُس کا اعتکاف باطل نہ ہوگا اور اِن مقاصد کے لئے اُسے مسجد سے باہر جانے کی اجازت ہے لیکن اس صورت میں اُس کا اعتکاف ''اعتکافِ مسنونہ'' کی بجائے ''اعتکافِ نفل'' ہوگا۔''

''وہ عوامل جن سے اعتکاف باطل ہو جاتا ہے: مندرجہ ذیل عوامل سے اعتکاف باطل ہو جاتا ہے:

(۱) اگر معتکف کسی اور مقصد کے لئے حدودِ مسجد کو چھوڑے اگرچہ وہ ایک لمحہ کے لئے ہی ہو تو ظاہر ہے کہ جب معتکف کے پاؤں مسجد سے باہر ہوں گے تو اُسے مسجد کو چھوڑنے والا ہی کہا جائے گا۔ تاہم اگر اُس کا سر مسجد سے باہر ہو تو اس کا اعتکاف باطل نہ ہوگا۔'' (البحر الرائق)

(۲) ''اگر معتکف کسی شرعی ضرورت کے تحت مسجد کو چھوڑے اور اُس ضرورت کی تکمیل کے بعد اگر وہ مسجد سے باہر ایک لمحہ کے لئے بھی ٹھہرے تو اُس کا اعتکاف باطل ہو جائے گا۔'' (فتاویٰ شامی)

(۳) ''اگر معتکف مسجد کو کسی شرعی وجہ یا ضرورت کے بغیر ارادتاً چھوڑے تو اعتکاف باطل ہو جائے گا۔ تاہم اگر مسجد کو چھوڑنا سہواً یا نسیاناً ہو تو اُسے اعتکاف کے باطل ہونے کا گناہ نہ ہوگا۔'' (ایضاً)

(۴) ''اگر معتکف غلطی سے مسجد کے اُس حصّہ میں یہ سمجھتے ہوئے داخل ہو کہ یہ مسجد ہی کا حصّہ ہے جبکہ در حقیقت وہ حصّہ مسجد سے خارج ہے۔ اس لئے اس غلطی سے بچنے کے لئے ۔۔ جیسا کہ پہلے بیان ہوا۔۔ اعتکاف شروع ہونے سے پہلے حدودِ مسجد کا یقین کر لینا از حد ضروری ہے۔''

(۵) ''اعتکاف کے لئے روزہ شرط ہے۔ اگر اعتکاف کے دوران روزہ ٹوٹ جائے تو اعتکاف باطل ہو جاتا ہے قطع نظر اِس کے کہ روزہ کسی جائز عذر کے تحت ٹوٹا یا نہیں، یا سہواً یا ارادتاً ٹوٹا۔ ایسی صورتوں میں اعتکاف باطل ہو جاتا ہے۔ روزہ سہواً ٹوٹنے کا مطلب یہ ہے کہ روزے دار کو اپنے روزہ دار ہونے کا علم ہے لیکن وہ کوئی ایسا غیر ارادی کام کر گزرتا ہے جو روزہ کے تقاضا کے خلاف ہے۔ مثلاً روزہ دار طلوعِ فجر تک کھاتا پیتا رہا یا غروبِ آفتاب سے پہلے اس غلط فہمی میں افطار کیا کہ وقتِ افطار ہو چکا ہے یا غرارہ کرتے ہوئے پانی غلطی سے حلق سے نیچے چلا گیا اگرچہ روزہ دار کو معلوم تھا کہ وہ روزہ سے ہے۔ ایسی تمام صورتوں میں روزہ ٹوٹ جاتا ہے جس کے نتیجہ میں اعتکاف باطل ہو جاتا ہے۔ تاہم اگر آدمی کو اپنا روزہ دار ہونا بھول جائے اور اسی نسیان کی حالت میں وہ کچھ کھا پی لے تو نہ تو اُس کا روزہ ٹوٹتا ہے اور نہ ہی اعتکاف باطل ہوتا ہے۔'' (دُرّ المختار، فتاویٰ شامی)

(۶) ''جماع کرنے سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے خواہ وہ ارادتاً کیا جائے یا سہواً، خواہ وہ دن میں کیا جائے یا رات میں، مسجد کے اندر کیا جائے یا اُس کے باہر اور خواہ انزال ہو یا نہ ہو۔ ایسی تمام صورتوں میں اعتکاف باطل ہو جاتا ہے۔ حکمِ ربِّ ذی الجلال والاکرام ہے:

وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عَاكِفُوْنَ فِي الْمَسَاجِدِ (البقرة : ۱۸۷)

''اور بیویوں سے اِس حال میں صحبت نہ کرو جب تم مسجدوں میں اعتکاف کئے ہو۔'' (۲:۱۸۷)

(۷) ''اعتکاف کے دوران بوسہ بازی اور بغل گیری کی اجازت نہیں ہے۔ اگر ایسا کرنے میں اِنزال

ہو جائے تو اعتکاف باطل ہو جاتا ہے لیکن اگر انزال نہ ہو تو اعتکاف باطل نہیں ہوتا اگرچہ ایسا کرنا غیر شرعی ہے۔''

''جن حالتوں میں اعتکاف کے توڑنے کی اجازت ہے: مندرجہ ذیل حالتوں میں اعتکاف کے توڑنے کی اجازت ہے:

(۱) ''اگر اعتکاف کے دوران کوئی ایسا مرض لاحق ہو جائے جس کا علاج مسجد کو چھوڑے بغیر ممکن نہ ہو۔''

(۲) ''کسی ڈوبتے ہوئے یا آگ میں جلتے ہوئے آدمی کو بچانے یا آگ کو بجھانے کے لئے مسجد کو چھوڑنے اور اِس طرح اعتکاف کو توڑنے کی اجازت ہے۔''

(۳) ''سرکاری وارنٹ گرفتاری ملنے پر معتکف اگر مسجد کو چھوڑنے پر مجبور ہو جائے۔''

(۴) ''اگر کسی جنازہ کے آنے پر کوئی اور آدمی نماز جنازہ پڑھانے کے لئے نہیں ہے تو اس صورت میں بھی نماز جنازہ پڑھانے کے لئے اعتکاف کے توڑنے کی اجازت ہے۔''

''اعتکاف توڑنے کے نتائج : قضا کرنے کے اصول : (۱) اگر مندرجہ بالا وجوہ میں سے کسی بھی وجہ سے ''اعتکافِ مسنون'' باطل ہو جائے تو اُس کی قضا صرف اُس دن کی واجب ہوگی جس میں اعتکاف باطل ہوا۔ پورے دس دنوں کی قضا کرنا واجب نہیں۔'' (فتاویٰ شامی) اُس دن کی قضا کرنے کا طریقہ حسب ذیل ہے:

''ماہِ رمضان کے علاوہ وہ کسی بھی دن روزہ رکھ کر ایک دن کا اعتکاف کر سکتا ہے۔ اگر کوئی آدمی آنے والے رمضان میں اعتکاف کی قضا کرلے تو یہ بھی صحیح ہوگا۔ لیکن چونکہ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے اس لئے جتنی جلدی ہو سکے قضا کر لینی چاہئے۔''

(۲) ''اگر اعتکافِ مسنونہ باطل ہو جائے تو مسجد کا چھوڑ دینا ضروری نہیں۔ اعتکاف کو بقایا دس دنوں کے لئے نفل اعتکاف کی نیت سے جاری رہنا چاہئے۔ اس طرح سنتِ مؤکدہ تو پوری نہیں ہوگی لیکن نفل اعتکاف کا ثواب مل جائے گا۔ اگر اعتکاف کسی غیر اختیاری غلطی کی وجہ سے باطل ہو جائے تو بعید نہیں کہ ربّ ذوالجلال والاکرام اپنی بے پایاں رحمت سے آخری دس دنوں کے اعتکافِ مسنون کا ثواب مرحمت فرما دے۔ لہٰذا قابلِ ترجیح بات یہ ہے کہ اعتکاف کے ٹوٹنے کی صورت میں اعتکاف کو آخری دس دنوں کے ختم ہونے تک جاری رکھا جائے۔ تاہم معتکف کو اعتکاف کے ٹوٹنے پر اُسے جاری نہ رکھنے کی اجازت ہے۔ اُسے اعتکاف توڑنے کے دن سے مسجد چھوڑنے اور دوسرے دن سے نفل اعتکاف کی نیت سے اعتکاف کرنے کی بھی اجازت ہے۔''

''(۳) اگرچہ فقہائے کرام نے واضح طور پر ایک دن کے اعتکاف کی قضا کا طریقہ نہیں لکھا' تاہم مندرجہ ذیل طریقہ عام اصولوں کے مطابق مناسب معلوم ہوتا ہے:

''اگر اعتکاف دن کے وقت باطل ہوا ہو تو صرف ایک دن کی قضا ہو گی یعنی قضا کی نیت سے معتکف کو صبح صادق سے پہلے پہلے روزہ کے ساتھ مسجد میں داخل ہو جانا چاہئے اور اُسی دن غروبِ آفتاب کے وقت مسجد چھوڑ دینی چاہئے۔ اور اگر اعتکاف رات کے وقت باطل ہوا ہو تو قضا رات اور دن دونوں کی ہونی چاہئے یعنی معتکف کو غروبِ آفتاب سے پہلے مسجد میں ہو جانا چاہئے' رات مسجد میں گزارے' روزہ رکھے اور دوسرے دن غروبِ آفتاب کے بعد مسجد چھوڑ دے۔''

''اعتکاف کے آداب: اس حقیقت کے مدِّنظر کہ اعتکاف کا مقصد اپنے آپ کو دنیاوی مشاغل سے آزاد کر دینا اور اپنے آپ کو مکمل طور پر ذکرِ الٰہی میں مشغول کر دینا ہے' معتکف کو بہ ایں وجہ اعتکاف کے دوران غیر ضروری گفتگو اور غیر ضروری کام سے گریز کرنا چاہئے۔ معتکف کو جو بھی وقت میسر ہو' اُسے نفل عبادت' عبادت کی دوسری صورتوں' تلاوتِ قرآن مجید اور ذکر و تسبیحات میں گزارنا چاہئے۔ علاوہ ازیں علمِ دین' خطباتِ دینی' نصیحتوں کے سیکھنے اور تعلیم دینے' اسلامی کتابوں کے مطالعہ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ حصولِ ثواب کا ایک ذریعہ بھی ہے۔''

''اعتکاف کے دوران مستحب اعمال: اعتکاف کے دوران مندرجہ ذیل اعمال مستحب ہیں:

(۱) کھانا پینا

(۲) ضروریاتِ زندگی سے متعلق ضروری لین دین اور خرید و فروخت۔ تاہم مسجد کو اس مقصد کے لئے استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ (فتاویٰ قاضی خاں)

(۳) محوِ خواب ہونا (نیند کرنا)۔

(۴) بال کٹوانا یا منڈوانا بشرطیکہ بال مسجد میں نہ گریں۔

(۵) گفتگو اور باتیں کرنا لیکن غیر ضروری گفتگو سے پرہیز کیا جائے۔ (فتاویٰ شامی)

(۶) نکاح کرنا یا اس قسم کے دیگر معاملات۔

(۷) لباس تبدیل کرنا' عطر اور تیل کا استعمال۔

(۸) مسجد میں کسی مریض کی مدد کرنا' اُس کی مرہم پٹی کرنا یا اُس کی دوا کا بندوبست کرنا۔

(۹) قرآن پڑھانا' اُس کے اوامر و نواہی کی تعلیم دینا اور علمِ دین سکھانا۔

(۱۰) غسل کرنا اور کپڑے سینا بشرطیکہ غسل کرنے کے دوران مسجد ہی میں رہے اور پانی مسجد سے باہر گرے۔ برتنوں کے دھونے میں بھی اِسی اصول کا اطلاق ہو گا۔''

(۱۱) بہ وقتِ ضرورت مسجد میں ہوا کا خارج کرنا۔

''علاوہ ازیں اعتکاف کے دوران اُن تمام اعمال و افعال کے کرنے کی اجازت ہے جو مکروہ نہیں یا جو اعتکاف کو باطل کر دیتے ہیں اور وہ اعمال و افعال جو بذاتِ خود حلال اور جائز ہیں۔''

''اعتکاف کے مکروہات : اعتکاف کے دوران مندرجہ ذیل افعال مکروہ ہیں :

''(۱) مکمل خاموشی سادھ لینا کیونکہ شریعت مطہرہ میں مکمل خاموشی سادھ لینا عبادت کی کوئی شکل نہیں۔ اگر معتکف خاموشی کو عبادت کی نیت سے اختیار کرتا ہے تو وہ بدعت کے گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ تاہم اگر کوئی شخص خاموشی کو عبادت نہیں سمجھتا اور جھوٹ' چغل خوری' طعن و تشنیع اور غیبت وغیرہ جیسے گناہوں سے بچنے کے لئے خاموش رہنے کی کوشش کرتا ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔'' (دُرّ المختار) تاہم بہ وقتِ ضرورت معتکف کو گفتگو کرنے سے پرہیز نہیں کرنا چاہئے۔''

''(۲) فضول اور بیہودہ گفتگو میں مشغول ہونا۔ ضرورت کے مطابق گفتگو کی اجازت ہے لیکن مسجد کو غیر ضروری گفتگو اور خود بینی و خود نمائی کی جگہ بنانے سے پرہیز کرنا لازم ہے۔''

''(۳) تجارتی سامان لانا اور اُسے مسجد میں ڈالنا۔

''(۴) اعتکاف کے لئے مسجد کے کسی ایسے حصّہ کو مخصوص کر لینا جو دوسرے معتکفین اور نمازیوں کے لئے تکلیف اور دقّت کا موجب ہو۔''

''(۵) کسی مسودے کے تحریر کرنے' یا کپڑے سینے یا معتکف کی جانب سے تعلیم دینے کی اجرت لینا (البحر الرائق)۔ تاہم اگر معتکف کو اعتکاف کے دنوں کے روزوں کے لئے ایسی اجرت لینے کے سوا چارہ نہیں تو خرید و فروخت کے قیاس پر اُسے ایسا کرنے کی اجازت ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔''

''خواتینِ خانہ کا اعتکاف : (۱) اعتکاف کی فضیلت صرف مَردوں تک ہی محدود نہیں' عورتیں بھی اس سے مستفید ہو سکتی ہیں۔ تاہم اُنہیں مسجد میں اعتکاف کرنے کی اجازت نہیں ہے بلکہ اُن کا اعتکاف اُن کے اپنے گھروں ہی میں ہوگا جس کا طریقِ عمل حسبِ ذیل ہے :

''عورتیں اپنے گھر میں اُس جگہ پر اعتکاف کریں جو عبادت اور نماز کے لئے مخصوص ہو اور باقی تمام گھر سے علیحدہ ہو۔ اگر قبل ازیں ایسی کوئی جگہ مخصوص نہیں کی گئی تو اعتکاف شروع کرنے سے پہلے ایسی جگہ مخصوص کر کے اعتکاف وہاں کرنا چاہئے۔''

(۲) ''اگر گھر میں نماز کے لئے کوئی مخصوص جگہ نہیں بنائی گئی جو باقی گھر سے علیحدہ ہو اور کسی وجہ سے ایسی

جگہ کا مخصوص کیا جانا ممکن بھی نہ ہو تو ایسی صورت میں خاتونِ خانہ گھر کے اندر کوئی بھی جگہ مخصوص کر کے وہاں اعتکاف کرسکتی ہے۔'' (فتاویٰ عالمگیری)

(۳) ''شادی شدہ عورت کے لئے اپنے خاوند سے اعتکاف کی اجازت لینا ضروری ہے کیونکہ اُس کے خاوند کی رضامندی کے بغیر اُس کا اعتکاف غیر شرعی ہوگا (فتاویٰ شامی)۔ تاہم خاوند کو بلا وجہ انکار کر کے اپنی بیوی کو اعتکاف کے ثواب سے محروم نہیں کرنا چاہئے اور اجازت دے دینی چاہئے۔''

(۴) ''اگر عورت نے اپنے خاوند کی اجازت سے اعتکاف شروع کیا اور بعد ازاں اُس کے خاوند نے اعتکاف مکمل کرنے سے روک دیا ہو تو خاوند کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں۔ اگر خاوند بیوی کو روکنے میں کامیاب ہو جائے تو بیوی کو اعتکاف مکمل کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔''

(۵) ''عورت حیض و نفاس کی حالت میں اعتکاف نہیں کرسکتی۔''

(۶) ''اعتکافِ مسنونہ کے آغاز سے پہلے عورت کو معلوم کر لینا چاہئے کہ اُس کے حیض کی تاریخ اعتکاف سے متصادم تو نہیں ہو رہی یا حیض اُس تاریخ سے تو شروع نہیں ہو رہے جب وہ اعتکاف میں ہوگی۔ اگر حیض کے ایام کی رمضان کے آخری دنوں میں توقع ہو تو اُسے اعتکافِ مسنونہ نہیں کرنا چاہئے اور ایامِ حیض کے شروع ہونے تک اُسے نفل اعتکاف کرنا چاہئے۔''

(۷) ''اگر اعتکاف کے دوران حیض آنا شروع ہو جائے تو حیض کے آتے ہی اعتکاف کو فوری طور پر چھوڑ دینا واجب ہے۔ ایسی صورت میں اُس کے لئے صرف اُس دن کی قضا کرنا واجب ہے جس دن اُس نے حیض کی وجہ سے اعتکاف چھوڑا۔ ایسی قضا کا طریقہ کار یہ ہے:

''جب عورت حیض سے پاک وصاف ہو جائے تو وہ کسی بھی دن روزہ رکھ لے اور اعتکاف کر لے۔ اگر رمضان کے کچھ دن باقی ہوں تو وہ رمضان ہی میں قضا کر لے جس میں رمضان کا روزہ ہی کافی رہے گا۔ اگر حیض سے اُس کے پاک وصاف ہونے پر ماہِ رمضان ختم ہو چکا ہے تو وہ اُس کے بعد کسی مخصوص دن میں اعتکاف کے مقصد سے روزہ رکھ لے اور ایک دن کی قضا کر لے۔''

(۸) ''عورت کے لئے گھر میں اعتکاف کی غرض سے کوئی جگہ مخصوص کرنا اعتکاف کے دوران مسجد کے حکم میں ہوگی اور کسی شرعی ضرورت کے بغیر وہ وہاں سے کسی اور جگہ نہیں جاسکتی ورنہ اُس کا اعتکاف ٹوٹ جائے گا۔''

''(۹) اعتکاف کی جگہ سے کسی دوسری جگہ جانے سے متعلق جو اصول مَردوں کے لئے ہیں، وہی عورتوں کے لئے ہیں اور جن ضروریات کی تکمیل کے لئے مَردوں کو جہاں جانے اور مسجد چھوڑنے کی اجازت ہے، بالکل اُسی طرح

عورتوں کو بھی ہے کہ وہ اُن کی تکمیل کے لئے اپنے گھر میں اعتکاف کی بنائی ہوئی مخصوص جگہ کو چھوڑ سکتی ہیں۔ اس طرح اعتکاف کے آغاز سے قبل ہی عورتوں کو اعتکافِ مسنون کے قواعد و ضوابط سے مکمل واقفیت حاصل کر لینی چاہئے۔"

"(۱۰) اعتکاف کے دوران اپنے اعتکاف کی جگہ پر بیٹھی ہوئی عورتیں سلائی بُنائی کر سکتی ہیں۔ خانگی امور و معاملات سے متعلق وہ گھر والوں کی راہ نمائی اور اُنہیں نصیحت بھی کر سکتی ہیں۔ لیکن وہ اعتکاف کی مخصوص جگہ کو نہیں چھوڑ سکتیں۔ قابلِ ترجیح بات یہ ہے اگر وہ اعتکاف کے دوران ذکر و اذکار، تلاوتِ قرآن اور دوسری عبادات پر توجہ مرکوز رکھیں۔ اُنہیں دوسرے معاملات پر زیادہ وقت صَرف نہیں کرنا چاہئے۔" (ماخوذ از "Rules of I'tikaf" (انگریزی ترجمہ) از مفتی محمد تقی عثمانی)

نوٹ: "اعتکاف میں داخل ہونے کے لئے نیت کا اظہار برملا طور پر زبان سے کرنا ضروری ہے۔ صرف دل میں اس کی نیت کر لینا کافی نہیں ہوگا"۔ فتاویٰ عالمگیریہ کی عبارت ملاحظہ ہو:

إِذَا أَرَادَ إِيْجَابَ الْإِعْتِكَافِ عَلٰى نَفْسِهٖ يَنْبَغِيْ أَنْ يُذْكَرَ بِلِسَانِهٖ وَلَا يَكْفِيْ لِإِيْجَابِ النِّيَّةِ بِالْقَلْب

"اعتکاف کے فضائل: اعتکاف جیسی خوبصورت عبادت کے فضائل میں یہاں کچھ احادیثِ نبوی کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ تاجدارِ انبیاء ﷺ نے فرمایا:

(۱) مَنِ اعْتَكَفَ يَوْمًا اِبْتِغَاءَ وَجْهِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ جَعَلَ اللهُ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ النَّارِ ثَلَاثَةَ خَنَادِقَ أَبْعَدَ مِمَّا بَيْنَ الْخَافِقَيْنِ (نیل الاوطار، مستدرک للحاکم)

(۲) اِعْتِكَافُ عَشْرٍ فِيْ رَمَضَانَ كَحَجَّتَيْنِ وَعُمْرَتَيْنِ (مجمع الزوائد، الطبرانی)

(۳) إِنَّ لِلْمَسَاجِدِ أَوْتَادًا أَلْمَلَائِكَةُ جُلَسَاءُ هُمْ إِنْ غَابُوْا يَفْقِدُوْنَهُمْ وَإِنْ مَرِضُوْا عَادُوْهُمْ وَإِنْ كَانُوْا فِيْ حَاجَةٍ أَعَانُوْهُمْ (الفتح الرّبّانی)

(۴) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ فِي الْمُعْتَكِفِ: هُوَ يَعْتَكِفُ الذُّنُوْبَ وَيَجْرِيْ لَهٗ مِنَ الْحَسَنَاتِ كَعَامِلِ الْحَسَنَاتِ كُلِّهَا (ابن ماجه، مشکوٰۃ المصابیح)

"(۱) جس نے اللہ بزرگ و برتر کی رضا کی خاطر ایک دن اعتکاف کیا تو اللہ تعالیٰ اُس کے اور نارِ جہنم کے درمیان تین خندقیں حائل کر دیتا ہے جن کا فاصلہ آسمان اور زمین کے فاصلے سے کہیں زیادہ ہے۔"

"(۲) رمضان المبارک کے دس دنوں کا اعتکاف دو حجوں اور دو عمروں کی طرح ہے۔"

"(۳) کچھ لوگ مسجدوں کی کھونٹیاں (یا کیلیں) بن جاتے ہیں (یعنی وہ ہر وقت مسجد ہی میں نظر آتے ہیں) فرشتے ایسے لوگوں کے مصاحب ہوتے ہیں۔ اگر یہ لوگ کسی وقت مسجد سے غیر حاضر ہوں تو فرشتے اُن کی تلاش میں ہوتے ہیں۔ اگر وہ بیمار پڑ جائیں تو فرشتے اُن کی عیادت کرتے ہیں اور اگر وہ کبھی حاجتمند ہوں تو فرشتے اُن کی حاجت براری کرتے ہیں۔"

(۴) "ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: اعتکاف کرنے والا گناہوں سے محفوظ ہو جاتا ہے اور اُس کے تمام اعمالِ صالحہ اُس کے لئے لکھ لئے جاتے ہیں۔"

''الغرض شبِ قدر کے فیوض و برکات سمیٹنے کے لئے رمضان المبارک کے اعتکافِ مسنونہ سے بڑھ کر اور کوئی بہتر یقینی طریقہ نہیں۔ ہر مسلمان کو معلوم ہے کہ اللہ ربّ العزت نے اِس رات کی اصل تاریخ کو چھپا کے رکھا ہے تاکہ مسلمان اِن راتوں میں عبادت میں مشغول رہیں۔ اعتکاف میں ہونے کی حالت میں بندہ عبادت میں مشغول سمجھا جائے گا اگرچہ وہ رات بھر نیند میں رہا ہو۔ اس طرح وہ لیلۃ القدر جیسی باسعید رات کے فیوض و برکات حاصل کرتا رہے گا۔ ایسے اعلیٰ و ارفع فضائل کی اِس رات کے مقابل دس راتوں کی تھوڑی سی کوشش کا کوئی مقابلہ نہیں۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اعتکاف سے خصوصی پیار اور لگاؤ تھا۔''

''__نفل اعتکاف__: ''(۱) رمضان المبارک کے آخری دس دنوں میں اگر کوئی شخص دس دنوں سے کم کی نیت کے ساتھ اعتکاف کرتا ہے تو ایسا اعتکاف نفل اعتکاف ہوگا۔''

''(۲) اعتکاف کی اِس قسم میں وقت، روزے، دن اور رات کی کوئی شرط نہیں۔ اگر آدمی کسی بھی وقت اور کسی بھی وقت تک کے لئے مسجد میں اعتکاف کی نیت سے داخل ہوتا ہے تو وہ ثواب کا مستحق ہوتا ہے۔''

''(۳) اگر کوئی آدمی مسجد میں داخل ہوتے وقت نماز ادا کرنے اس نیت کے ساتھ جاتا ہے کہ جب تک وہ مسجد میں رہے گا اور جتنا بھی وقت وہ وہاں گزارے گا، اعتکاف میں رہے گا تو ایسے شخص کو اعتکاف کا ثواب ملے گا۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اعتکاف کی نیت کے یہ الفاظ سکھائے ہیں:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ نَوَیْتُ سُنَّۃَ الْاِعْتِکَافِ (اے اللہ! میں سنتِ اعتکاف کی نیت کرتا ہوں۔)

''یہ ایسا آسان عمل ہے کہ اس کے لئے نہ تو زیادہ وقت کی ضرورت ہے اور نہ ہی زیادہ کوشش کی جبکہ اُسے ثوابِ عظیم ملتا ہے۔ بس، نیت اور توجہ کی ضرورت ہے اور اس ثواب سے محروم رہنے میں ہماری بدقسمتی ہوگی۔ ربّ کریم کی رحمت کا تقاضا ہے کہ بندہ اگر یہ عادت بنالے کہ جب بھی وہ کسی کام کے لئے مسجد میں جائے، وہ اعتکاف کی نیت کرلے تو وہ ثواب سے محروم نہیں رہے گا۔''

''(۴) نفل اعتکاف بندہ کے مسجد میں رہنے تک قائم رہتا ہے اور مسجد سے باہر آنے پر اعتکاف ختم ہو جاتا ہے۔''

''(۵) نفل اعتکاف کرنے والے کو اعتکاف اُس وقت یا دنوں کے لئے پورا کرنا چاہئے جس کی اُس نے نیت کی تھی۔ اگر وہ نیت کئے ہوئے وقت کے مکمل ہونے سے پہلے مسجد چھوڑ دیتا ہے تو اُسے اُس وقت کا ثواب ملے گا جو اُس نے مسجد میں گزارا۔ بقایا غیر مکمل وقت کو پورا کرنا اُس پر واجب نہیں اور نہ ہی اُس پر کوئی قضا ہے۔'' (فتاویٰ شامی)

''(۶) اگر کوئی آدمی تین دن کے اعتکاف کی نیت کرے اور بعد میں مسجد میں داخل ہونے کے بعد وہ کوئی ایسا عمل کرے جس سے اُس کا اعتکاف ختم ہو جائے تو ایسی صورت میں اُس کا اعتکاف مکمل ہو گیا یعنی جتنا وقت اعتکاف کے ختم ہونے سے پہلے وہ مسجد میں رہا، اُس کا ثواب اُسے ملے گا اور اُس پر اس کی کوئی قضا نہیں ہے۔''

(۱۰۰) حسد اور رشک (JEALOUSY & ENVY)

حسد (Jealousy) اِس منفی خواہش کا نام ہے کہ کسی دوسرے شخص کے مفادات' مقبوضات یا کارنامے اپنے قبضے میں آ جائیں۔ حسد کا متضاد ''رشک'' (Envy) ہے جو کچھ حالات میں مثبت خواہش پر مبنی ہوتا ہے۔

ایک سچا مسلمان تمام نوعِ انسانی کے لئے نیک نیتی اور خیر خواہی کا مجسمہ ہوتا ہے اور اِس فرمانِ الٰہی کے مطابق دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح اور فوقیت دیتا ہے:

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ'' (اَلْحَشْر : ۹)

''اور وہ (دوسروں کو) اپنے سے مقدم رکھتے ہیں اگر چہ وہ خود فاقہ سے ہوں۔'' (۹ : ۵۹)

یہ فضیلت کا اعلیٰ درجہ اور انتہائی مرتبہ ہے جو حضرات انصار کے لئے اُرشاد ہو رہا ہے۔ یہ حضرات مہاجرین کے حصّہ پر تو کیا رشک کرتے' خود اپنے پاس سے اُنہیں کھلاتے پلاتے رہتے تھے' چاہے خود اپنے فاقہ کی ہی نوبت کیوں نہ آ جائے۔ معلوم ہوا کہ سچا مسلمان نہ تو حاسد ہوتا ہے اور نہ ہی حسد اُس کی نہاد اور فطرت میں ہوتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ خیر اور قربانی کی محبت' حسد کی نقیض اور متضاد ہے۔ مؤمن حسد سے اس لئے نفرت کرتا ہے کہ وہ الٰہی تقسیم پر ناپسندیدگی کا دوسرا نام ہے۔ سورۃ الزُّخرف میں قرآنِ حکیم ایسے لوگوں کی ذہنیت پر تعجب کرتا ہے اور فرماتا ہے:

أَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَةَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا (اَلزُّخرف : ۳۲)

''تو کیا آپ کے پروردگار کی رحمتِ (خاصہ) کو تقسیم یہ لوگ کرتے ہیں' ہم نے تو اُن کے درمیان اُن کی دنیوی زندگی (تک) میں اُن کی روزی تقسیم کر رکھی ہے اور ہم نے اُن کے درجے ایک دوسرے سے بلند کر رکھے ہیں تا کہ ایک دوسرے سے کام لیتا رہے۔'' (۳۲ : ۴۳)

معاشرہ میں فرقِ مراتب بالکل فطری و طبعی ہے۔ کوئی دولتمند ہوگا تو کوئی نادار' کوئی افسر کوئی ماتحت۔ بے طبقات معاشرہ (Classless Society) کا لفظ ہی سرے سے بے معنی ہے۔ اس طرح یہ آیت نوعِ انسان کی مکمل مساوات کے غیر حقیقی نظریہ کو باطل اور بے بنیاد ثابت کرتی ہے۔ اِسی طرح آیت کا خط کشیدہ حصّہ سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کے ''دولت و جائداد کی مساوی تقسیم'' کے خیالی نظریات پر ضربِ کاری ہے۔ نوعِ انسانی کے کچھ طبقات یقینی طور پر عمدہ ذہنی صلاحیتوں اور اعلیٰ جسمانی قوّت کے ساتھ خصوصی مراعات کے مالک (Privileged) ہیں۔ قرآنِ حکیم کا حکم ہے کہ اِن خداداد نعمتوں پر حسد نہ کرو کیونکہ اُن کا اہتمام الٰہی نظام کی حکیمانہ تدبیر کے ساتھ کیا گیا ہے اور اُس حکیمِ مطلق کو بخوبی معلوم ہے کہ کسے نوازا جائے اور کسے محروم رکھا جائے۔

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ (اَلنِّساء : ۳۲)

''اور ایسے امر کی تمنا نہ کیا کرو جس میں اللہ نے تم میں سے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی ہے۔''

کوئی دولتمند ہے، کوئی حسین و جمیل ہے، کوئی خوش آواز ہے اور کسی کے قوائے جسمانی بہت مضبوط ہیں۔ اس قسم کے وہبی و طبعی فضائل کو قربِ حق میں مطلق دخل نہیں۔ آیت میں تعلیم ہے کہ اِن کی بنا پر ایک دوسرے پر رشک کرنا، ایک دوسرے کی جگہ پر ہونے کی حسرت و تمنا کرنا درست نہیں۔ قربِ حق میں دخل صرف عمل و اکتساب کو ہے۔

اور اُسی سورۃ النّساء میں نعمتِ نبوّت اور دنیاوی جاہ و قوّت پر حسد کرنے پر تعجب کیا جا رہا ہے:

أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلٰى مَا آتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهِ (النساء: ۵۴)

''تو کیا یہ لوگ اُن چیزوں کے باعث حسد کر رہے ہیں جو اللہ نے اُنہیں اپنے فضل سے دے رکھی ہیں۔''

حسد گھناؤنے احساسات کی ایک قسم کی ہے اور اسلام میں انتہائی قابلِ نفرت اور مکروہ فعل ہے۔ حاسد آدمی حسد سے پیدا ہونے والے کمزور و ضعیف غیظ و غضب کی انتہا میں اپنی انگلیاں کاٹ کاٹ کھانے کے سوا کچھ نہیں پاتا۔ وہ مکمل خسارے میں رہتا ہے اور اپنے ناپاک مقصد کے حصول کے قریب کبھی نہیں پھٹکتا۔ اس سلسلہ میں نبی اکرم ﷺ نے اپنے پیروکاروں کو حسد سے بچنے کا حکم دیا اور فرمایا:

اِيَّاكُمْ وَالْحَسَدَ فَاِنَّ الْحَسَدَ يَاْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا تَاْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ

''حسد سے بچتے رہو اس لئے کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح لکڑی کو آگ کھا جاتی ہے۔''

ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا:

لَا تَبَاغَضُوْا وَلَا تَحَاسَدُوْا وَلَا تَدَابَرُوْا وَلَا تَقَاطَعُوْا وَكُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا فَلَا يَحِلُّ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَّهْجُرَ أَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثٍ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

''آپس میں بغض نہ رکھو، ایک دوسرے سے حسد نہ کرو، ایک دوسرے سے رُوگردانی نہ کرو، ایک دوسرے سے قطع تعلق نہ کرو اور اے بندگانِ خدا! آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔ کسی مسلمان کے لئے اپنے مسلمان بھائی سے تین دن سے زیادہ قطع تعلق رہنا جائز نہیں۔''

سرطانی اور مہلک حسد جب عمل کی صورت اختیار کر لے تو زندگی کی تمام خوشیوں اور مادّی و روحانی فادات کو برباد کر کے رکھ دیتا ہے۔ دنیاوی مخالفتوں اور عداوتوں کی تہ میں عموماً اور اکثر حسد ہی کام کرتا ہوتا ہے۔ حسد کی کارفرمائیوں سے پناہ چاہنا دنیاوی تکالیف کے اسباب میں سے ایک بہت بڑے سبب سے پناہ چاہ لینا ہے۔ حسد اور اُس کی مضرتوں سے محفوظ رہنے کا بہترین ذریعہ نیک دلی اور صفائیِ قلب کے ساتھ رب العالمین کی پناہ میں آنے کا ہے جیسا کہ سورۃ الفلق میں ارشادِ باری تعالیٰ ہوا:

۲۶۰۴ (حسد اور رشک Jealousy & Envy)

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ O مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ O---- وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ O

''آپ کہہ دیجئے کہ میں صبح کے مالک کی پناہ لیتا ہوں' تمام مخلوقات کے شر سے ----اور حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرنے لگے۔'' (۱' ۲--- ۵ : ۱۱۳)

حاسد شخص یا حاسد طبقہ اپنے حسد کی وجہ سے ہمیشہ نقصان میں رہتا ہے۔ اس ظاہر و باہر حقیقت کی تقویت کے لئے قرآنِ حکیم سے متعدد مثالیں دی جاسکتی ہیں کیونکہ حسد کا منفی احساس جملہ قسم کے فیوض و برکات سے محروم ہے اور رب تعالیٰ کے قہر اور اُس کے غیظ و غضب کو دعوت دیتا ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) یوسف علیہ السلام اور اُن کے بھائیوں کا قصہ حاسد طبقہ کی آنکھیں کھول دیتا ہے۔ آپ کے سوتیلے بھائی آپ کے اُس مقام سے حاسد تھے جو آپ کو اپنے والد یعقوب علیہ السلام کے ہاں حاصل تھا۔ اپنے بے فائدہ اور کمزور حسد کی ہیجانی کیفیت اور حیاتِ انسانی کے پست میلان میں اُن بھائیوں نے آپ کو ایک گہرے' تاریک کنویں میں پھینک دیا۔ اُن کے اس عمل نے اُنہیں نا امیدی کی اتھاہ گراوٹ کے سوا کچھ نہ دیا۔ اس کے برعکس یوسف علیہ السلام پر رب کی رحمت ہوئی اور آپ مصر کے ہم عصر بادشاہ کی جانب سے وزیر مالیات مقرر ہوئے۔ اس کے نتیجہ میں آپ کے اُن سوتیلے بھائیوں کو جو ایک وقت میں آپ کے حاسد تھے' اب قحط اور خشک سالی کے مارے ذلت و ندامت کے ساتھ آپ کے آگے جھکنا پڑا اور یوسف علیہ السلام کے خلاف حسد اُن کے کسی کام نہ آیا۔

(۲) ربِّ ذوالجلال والاکرام نے مصر کے فرعون کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملا دیا جو حسد و رقابت کے محرکات کے تحت موسیٰ علیہ السلام کے مقدس مشن کی راہ میں سنگِ گراں بنا ہوا تھا ☆ جبکہ موسیٰ علیہ السلام کو اس راہ میں کوئی بھی نقصان نہیں پہنچا اور بالآخر آپ کو فرعون کے مکروفریب سے آزادی ملی اور اپنے مشن میں کامیاب ہوئے۔

(۳) یہی صورت جناب ابراہیم اور عیسیٰ علیہما السلام کی تھی جن کے ساتھ اُن کے لوگوں نے حاسدانہ سلوک کیا لیکن رب تعالیٰ نے اُن دونوں کو معجزانہ طور پر دشمن کی خباثت سے بچا لیا۔

(۴) قادرِ مطلق رب تعالیٰ نے مدینہ کے منافقین اور کفارِ مکہ کی ناپاک سازشوں کو بھی ناکام بنا دیا جو ہر وقت نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے رہتے تھے اور نورِ الٰہی کو بجھانے کے لئے ہر ناجائز حربے کی پناہ لیتے رہتے تھے لیکن ہر موقع پر اُنہیں بری طرح ناکامی اور نامرادی کا سامنا کرنا پڑا۔ قرآن فرماتا ہے:

یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ O (التوبۃ:۳۲)

☆ فرعونِ مصر نے مصر کے دریاؤں اور پانیوں کی ڈینگ ماری تھی کہ وہ اُس کے تحت میں بہہ رہے ہیں (سورۃ الزخرف:۵۱) تو رب تعالیٰ نے اُسے اُس کی ڈینگ کا مزہ چکھاتے ہوئے اُسے اُس کے اپنے پانیوں میں ڈبو دیا۔

۲۶۰۵ (حسد اور رشک Jealousy & Envy)

''وہ اللہ کے نور کو اپنے منہ سے بجھا دینا چاہتے ہیں حالانکہ اللہ کو (ہرصورت) نا منظور ہے سوائے اس کے کہ وہ اپنے نور کو کمال تک پہنچائے خواہ کافروں کو کیسا ہی ناگوار گزرے۔'' (۳۲ : ۹)

نُـورُاللہ سے مراد دینِ اسلام ہے۔ آیت کی صداقت پر اُمّت کی چودہ سو سال کی پوری تاریخ گواہ ہے۔ یہود و نصاریٰ، مشرکین غرض ہر مخالف و معاند مکر وحیلہ، زور و جبر کے ہر ممکن طریقہ سے اسلام کی بیخ کنی میں لگا ہوا ہے لیکن اس کے باوجود اسلام ہے کہ پھیلتا ہی چلا جا رہا ہے اور پیروانِ اسلام کی تعداد میں اضافہ روز افزوں ہو رہا ہے یہاں تک کہ مسیحی مشنریوں کو اعتراف ہے کہ بے دریغ روپیہ خرچ کرنے اور نہایت درجہ مستحکم نظام کے باوجود مسلمانوں کے مقابلہ میں اُن کے مشن افریقہ وغیرہ میں ناکام ہو رہے ہیں۔

سورۂ الحج میں خاتم النبیین ﷺ کے لئے الٰہی امداد کی پُر زور یقین دہانی کرائی گئی ہے اور اس طرح آپ کے مشن کے پکے دشمنوں اور حاسدوں کی فریبانہ چالوں کو ناکام بنا دینے کا مژدہ سنایا گیا ہے :

مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ O (الحج : ۱۵)

''جو شخص یہ خیال کرے کہ اللہ دنیا اور آخرت میں اپنے رسول کی مدد نہیں کرے گا تو اُسے چاہئے کہ ایک رسی آسمان تک تان لے پھر اُس (سلسلہ رسی) کو کاٹ دے، تو غور کرنا چاہئے کہ کیا اُس کی تدبیر اُس کی ناگواری کی چیز کو موقوف کرا سکتی ہے۔'' (۱۵ : ۲۲)

حسد کا ایک پہلو منفی ہوتا ہے جس میں حاسد بدخواہی اور بغض و کینہ کی آگ میں جلتے ہوئے محسود کی رحمتِ خداوندی اور انعامات کی ہلاکت چاہتا ہے۔ حسد کی یہ بدترین قسم ہے اور اسلام میں اس کی اجازت نہیں ہے۔

حسد کا ایک اور پہلو مثبت ہوتا ہے جسے رشک (Envy) کا نام دیا جاتا ہے اور جس میں انسان یہ چاہتا ہے کہ اُسے بھی وہ چیز ملے جس پر اُسے رشک ہے۔ چونکہ ایسے جذبے کا انسانوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا اس لئے اس کی اجازت ہے لیکن از روئے حدیثِ نبوی رشک صرف دو چیزوں میں جائز ہے :

لَا حَسَدَ اِلَّا فِي اثْنَتَيْنِ : رَجُلٌ'' آتَاهُ اللّٰهُ مَالاً فَسَلَّطَهٗ عَلٰى هَلَكَتِهٖ فِي الْحَقِّ وَرَجُلٌ ''آتَاهُ الْحِكْمَةَ فَهُوَ يَقْضِيْ بِهَا وَيُعَلِّمُهَا (صحیح بخاری)

''رشک صرف دو چیزوں میں جائز ہے : ایک تو وہ آدمی جسے اللہ نے مال دیا اور وہ اُسے اللہ کی راہ میں خرچ کر رہا ہے اور دوسرا وہ شخص جسے علمِ دین عطا کیا گیا جس کے مطابق وہ (لوگوں کے جھگڑوں کے) فیصلے کرتا ہے اور اُس کی تعلیم دیتا ہے۔''

(۱۰۱) عیسیٰ علیہ السلام (Jesus Christ) اور اُن کی والدہ

''**قرآنِ عزیز اور عیسیٰ علیہ السلام**: حضرت عیسیٰ علیہ السلام جلیل القدر اور اولوالعزم پیغمبروں میں سے ہیں اور جس طرح نبی اکرم ﷺ خاتم الانبیاء والرُّسُل ہیں، اُسی طرح عیسیٰ علیہ السلام خاتم الانبیائے بنی اسرائیل ہیں اور جمہور کا اِس پر اجماع ہے کہ محمد رّسول اللہ ﷺ اور عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا اور درمیان کا یہ زمانہ جس کی مدت تقریباً پانچ سوستر (۵۷۰) سال ہے، فَترۃُ الوحی (انقطاعِ وحی) کا زمانہ کہلاتا ہے۔''

''عیسیٰ علیہ السلام کی جلالتِ قدر اور عظمتِ شان کا ایک امتیازی نشان یہ بھی ہے کہ اگر انبیائے بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوّت و رسالت کا مقام امامت حاصل ہے تو عیسیٰ علیہ السلام مجدّدِ انبیائے بنی اسرائیل ہیں، اس لئے کہ قانونِ ربّانی (توراۃ) کے بعد بنی اسرائیل کی رُشد و ہدایت کے لئے انجیل (بائبل) سے زیادہ عظیم المرتبہ دوسری کوئی کتاب نازل نہیں ہوئی اور یہ ایک حقیقت ہے کہ انجیل کا نزول قانون توراۃ کی تکمیل ہی کی شکل میں ہوا یعنی نزولِ توراۃ کے بعد یہود نے جو قسم قسم کی گمراہیاں دینِ حق میں پیدا کر لی تھیں، انجیل نے توراۃ کی شارح بن کر بنی اسرائیل کو اُن گمراہیوں سے بچنے کی دعوت دی اور اس طرح تکمیلِ توراۃ کا فرض انجام دیا اور بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فراموش شدہ پیغامِ ہدایت عیسیٰ علیہ السلام ہی نے دوبارہ یاد دلایا اور تازہ بارانِ رحمت کے ذریعہ اس خشک کھیتی کو دوبارہ زندگی بخشی۔ مزید برآں یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام سرورِ کائنات محمد ﷺ کے سب سے بڑے منّاد اور مُبشر ہیں اور اِن ہر دو مقدّس پیغمبروں کے درمیان ماضی اور مستقبل دونوں زمانوں میں خاص رابطہ اور علاقہ پایا جاتا ہے۔''

''قرآنِ عزیز نے نبی اکرم ﷺ کی مماثلت کے سلسلہ میں اِن پاک ہستیوں کے واقعات سے بہت زیادہ بحث کی ہے، اُن میں حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام کی مقدّس ہستیاں زیادہ نمایاں نظر آتی ہیں۔''

''حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت قرآن کے تذکیر بایّام اللہ میں اس لئے زیادہ اہمیت رکھتی ہے کہ جس دینِ قویم اور ملّتِ بیضاء کا عروج و کمال محمد ﷺ کی تقدیس کے ساتھ وابستہ تھا اور جس ملت کی دعوت و تبلیغ کا محور و مرکز ذاتِ اقدس بننے والی تھی، وہ ملتِ ابراہیم کے نام سے موسوم ہے۔ مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرٰهِيمَ کیونکہ یہی وہ بوڑھے پیغمبر ہیں جنھوں نے شرک کے مقابلہ میں سب سے پہلے توحیدِ الٰہی کو ''حنیفیّت'' کا لقب دیا اور آئندہ ہمیشہ کے لئے خدا کی راہِ مستقیم کے لئے ''ملّتِ حنیفیہ'' کا امتیاز قائم کر دیا یعنی جو خدا کی پرستش کے لئے مظاہرِ کائنات کی پرستش کو وسیلہ بناتا ہے، وہ ''مشرک'' ہے اور جو خالقِ کائنات کی یکتائی کا قائل ہو کر براہِ راست اُسی کی پرستش کرتا ہے وہ ''حنیف'' ہے۔ پس اس مقدس پیغمبر نے خدا پرستی کے اس حقیقی تصور کو عملی حیثیت میں اس درجہ نمایاں کیا کہ مستقبل میں اَدیانِ حق کے لئے اُس کی پیروی حق و صداقت کا معیار بن گئی اور خدائے برتر کی جانب سے قبولیت کا یہ شرف عطا ہوا

کہ یہ مقدس پیغمبر کائناتِ رُشد وہدایت کا امامِ اکبر اور مجدِّدِ اعظم قرار پایا۔ وَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا (اور ابراہیم کی ملت کی پیروی کرو جو سب سے کٹ کر صرف خدا کی جانب جھکنے والا ہے۔)

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا (الحج : ۷۸)

''یہ ملت ہے تمہارے باپ ابراہیم کی' اُس نے تمہارا نام ''مسلم'' رکھا نزولِ قرآن سے قبل اور اِس قرآن میں بھی تمہارا نام مسلم ہے۔''

''موسیٰ علیہ السلام کی مقدس زندگی کا تذکرہ اس لئے اہمیت کا حامل ہے کہ اُن کی دعوت وتبلیغ کے واقعات یعنی قوم کی جہالت و نافرمانی' دشمنانِ خدا سے نبرد آزمائی' پیہم مصائب وآلام پر صبر واستقلال کا دوام و ثبات اور اسی قسم کے دوسرے کوائف وحالات میں اُن کے اور نبی اکرم ﷺ کے درمیان بہت زیادہ مشابہت و مناسبت پائی جاتی ہے اور اس لئے وہ واقعات وحالات قبول وانکارِ حق اور اُن سے پیدا شدہ نتائج کے سلسلہ میں بصیرت وعبرت کا سامان مہیا کرنے اور نظائر وشواہد کی حیثیت رکھتے ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام کی حیاتِ طیّبہ کا مقدس ذکر مسطورہ بالا خصوصیات وامتیازات کی بنا پر خاص اہمیت رکھتا ہے۔''

''غرض قرآنِ عزیز نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات وواقعات کو بسط وتفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور اُن کی حیاتِ طیّبہ کے دیباچہ کے طور پر اُن کی والدہ حضرت مریم علیہا السلام کے واقعاتِ زندگی کو بھی روشن کیا ہے تاکہ قرآن کا مقصد ''تذکیر بایام اللہ'' پورا ہو۔ یہ ذکرِ پاک قرآنِ عزیز کی تیرہ (۱۳) سورتوں میں ہوا ہے۔ اُن میں سے کسی جگہ نام مبارک ''عیسیٰ'' (سورہ آلِ عمران : ۴۵' ۵۲' ۵۵' ۵۹ ؛ سورۃ النساء : ۱۵۷' ۱۶۳' ۱۷۱ ؛ سورۃ المائدۃ : ۱۱۰' ۱۱۲' ۱۱۴' ۱۱۶ ؛ سورۃ الصّف : ۶ وغیرہ) سے یاد کیا گیا ہے اور کسی جگہ ''مسیح'' (سورہ آلِ عمران : ۴۵ ؛ سورۃ النساء : ۱۷۱' ۱۷۲ وغیرہ) اور ''عبداللہ'' (سورہ مریم : ۳۰ وغیرہ) کے لقب سے اور کسی مقام پر کنیت ''ابنِ مریم'' (سورہ آلِ عمران : ۴۵ ؛ سورۃ النساء : ۱۷۱ ؛ سورۃ المائدۃ : ۷۲' ۷۵' ۷۸ وغیرہ) کے اظہار کے ساتھ ہوا ہے۔''

''**عمران وحنّہ بنتِ فاقوذہ** : حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہما السلام کے حالات میں آتا ہے کہ بنی اسرائیل میں عمران نامی ایک عابد وزاہد شخص تھے اور اِسی زہد وعبادت کی وجہ سے نماز کی امامت بھی اُنہی کے سپرد تھی۔ اُن کی بیوی حنّہ بھی بہت پارسا اور عابدہ تھیں اور اپنی نیکی کی وجہ سے وہ دونوں بنی اسرائیل میں بہت زیادہ محبوب ومقبول تھے۔'' (تفسیر ابن کثیر جلد اوّل بحوالہ سورہ آلِ عمران)

''عمران صاحبِ اولاد نہیں تھے اور اُن کی بیوی حنّہ بنتِ فاقوذہ اولاد کی بہت زیادہ آرزومند تھیں۔ وہ اس کے لئے درگاہِ الٰہی میں دست بہ دعا اور قبولیتِ دعا کے لئے ہر وقت منتظر رہتی تھیں۔ بالآخر دل سے نکلی ہوئی دعا نے قبولیت کا جامہ پہنا اور حنّہ نے چندروز بعد محسوس کیا کہ وہ حاملہ ہیں۔ اُنہیں اس احساس سے اس درجہ مسرت ہوئی کہ اُنہوں نے نذر مان لی کہ جو بچہ پیدا ہوگا اُسے ہیکل (مسجدِ اقصیٰ) کی خدمت کے لئے وقف کردوں گی۔''

''بشر بن اسحٰق کہتے ہیں کہ حنہ ابھی حاملہ ہی تھیں کہ اُن کے شوہر عمران کا انتقال ہو گیا۔'' (فتح الباری' از حافظ ابنِ حجر عسقلانی' ج ٦' ص ٣٦٤)

''مریم علیہا السلام کی ولادت: جب ولادت کا وقت آ پہنچا تو حنہ کو معلوم ہوا کہ اُن کے بطن سے لڑکی پیدا ہوئی ہے۔ جہاں تک اولاد کا تعلق ہے' حنہ کے لئے یہ لڑکی بھی لڑکے سے کم نہ تھی مگر اُنہیں یہ افسوس ضرور ہوا کہ میں نے جو نذر مانی تھی وہ پوری نہیں ہو سکے گی کیونکہ لڑکی کس طرح مقدس ہیکل کی خدمت کر سکے گی لیکن اللہ تعالیٰ نے اُن کے افسوس کو یہ کہہ کر بدل دیا کہ ہم نے تیری لڑکی کو ہی قبول کیا اور اُس کی وجہ سے تمہارا خاندان بھی معزز و مبارک قرار پایا۔ حنہ نے لڑکی کا نام ''مریم'' رکھا جس کے معنیٰ سریانی زبان میں ''خادم'' کے ہیں (فتح الباری' ج ٦' ص ٣٦٥)۔ چونکہ یہ ہیکل کی خدمت کے لئے وقف کر دی گئیں اس لئے یہ نام موزوں سمجھا گیا۔
قرآنِ عزیز نے اس واقعہ کو معجزانہ اختصار کے ساتھ سورہ آلِ عمران میں یوں بیان کیا ہے:

اِذْقَالَتِ امْرَاَةُ عِمْرَانَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَافِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ○ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَا اُنْثٰی وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ وَلَیْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰی وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَاِنِّیْٓ اُعِیْذُهَا بِكَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا وَّكَفَّلَهَا زَكَرِیَّا (آلِ عمران: ٣٥-٣٧)

''(وہ وقت یاد کرو) جب عمران کی بیوی نے کہا: خدایا! میں نے نذر مان لی ہے کہ میرے پیٹ میں جو بچہ ہے وہ تیری راہ میں آزاد ہے۔ پس تو اُسے میری جانب سے قبول فرما' بے شک تو سننے والا جاننے والا ہے۔ جب اُس نے بچہ جنا تو کہنے لگی: پروردگار! میرے تو لڑکی پیدا ہوئی ہے اور اللہ خوب جانتا ہے جو اُس نے جنا اور لڑکا اور لڑکی یکساں نہیں ہیں (یعنی ہیکل کی خدمت لڑکی نہیں کر سکتی' لڑکا کر سکتا ہے) اور میں نے اُس کا نام مریم رکھا ہے اور میں اُسے اور اُس کی اولاد کو شیطان مردود کے فتنہ سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔ پس مریم کو اُس کے پروردگار نے بہت اچھی طرح قبول فرمایا اور اُس کی نشوونما اچھے طریق پر کی اور زکریا کو اُس کی کفالت کا نگراں بنا دیا۔'' (۳۵-۳۷ : ۳)

''حضرت مریم علیہا السلام جب سنِ شعور کو پہنچیں اور یہ سوال پیدا ہوا کہ مقدس ہیکل کی یہ امانت کس کے سپرد کی جائے تو کاہنوں ☆ میں سے ہر ایک نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اِس مقدس امانت کا کفیل مجھے بنایا جائے مگر اس امانت کی نگرانی کا اہل حضرت زکریا علیہ السلام سے زیادہ کوئی نہ تھا کیونکہ وہ مریم علیہا السلام کی خالہ ایشاع کے شوہر بھی تھے اور مقدس ہیکل کے معزز کاہن اور رب ذوالجلال کے نبی بھی تھے۔ اس لئے سب سے پہلے اُنہوں نے ہی اپنا نام پیش کیا مگر جب سب کاہنوں نے یہی خواہش ظاہر کی اور باہمی کشمکش کا اندیشہ ہونے لگا تو آپس میں یہ طے پایا کہ قرعہ اندازی کے ذریعے اس کا فیصلہ کر لیا جائے اور بقولِ روایاتِ بنی اسرائیل تین مرتبہ قرعہ اندازی کی گئی۔ وہ دریا میں اپنے قلم ڈالتے جن سے وہ تورات لکھا کرتے۔ مگر قرعہ کی شرط کے مطابق ہر مرتبہ زکریا علیہ السلام ہی کا نام نکلتا۔ کاہنوں نے جب یہ دیکھا کہ اس معاملہ میں زکریا علیہ السلام کے ساتھ تائیدِ غیبی ہے تو اُنہوں نے بخوشی اس فیصلہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا اور اس طرح یہ ''سعید امانت'' حضرت زکریا علیہ السلام کے سپرد کی گئی۔''

☆ کاہنوں سے وہ مقدس ہستیاں مراد ہیں جو ہیکل میں مذہبی رسوم ادا کرتی اور خدمتِ ہیکل پر مامور تھیں۔

۲۶۱۰ (عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کی والدہ)

''کیا عورت نبی ہو سکتی ہے؟ محمد بن اسحٰق، شیخ ابوالحسن اشعری، قرطبی، ابن حزم (نوراللہ مرقدہم) اس جانب مائل ہیں کہ عورت نبی ہو سکتی ہے بلکہ ابن حزم تو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت حوّا، سارہ، ہاجرہ، اُمّ موسیٰ، آسیہ اور مریم (علیھنّ السلام) سب نبی تھیں اور محمد بن اسحٰق کہتے ہیں کہ اکثر فقہاء اس کے قائل ہیں کہ عورت نبی ہو سکتی ہے اور قرطبی فرماتے ہیں کہ مریم علیہا السلام نبی تھیں۔''

''اِن حضرات کے اقوال کے برعکس خواجہ حسن بصری، امام الحرمین شیخ عبدالعزیز اور قاضی عیاض (نوّر اللہ مرقدھم) کا رُجحان اس جانب ہے کہ عورت نبی نہیں ہو سکتی اور اس لئے مریم علیہا السلام بھی نبی نہیں تھیں۔ قاضی عیاض اور ابنِ کثیر یہ بھی کہتے ہیں کہ جمہور کا مسلک یہی ہے اور امام الحرمین تو اجماع تک کا دعویٰ کرتے ہیں۔ جو علماء یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ عورت نبی نہیں ہو سکتی، وہ اپنی دلیل میں اِس آیت کو پیش کرتے ہیں :

وَمَا اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِىۡۤ اِلَيۡهِمۡ (النَّحل : ۴۳)

''اور ہم نے آپ سے پہلے مرد ہی رسول بنا کر بھیجے ہیں جن پر ہم وحی بھیجا کرتے تھے۔'' (۴۳ : ۱۶)

اور بالخصوص حضرت مریم علیہا السلام کی نبوت کے انکار پر وہ یہ دلیل دیتے ہیں کہ قرآنِ عزیز نے اُنہیں ''صدّیقہ'' کہا ہے جیسا کہ سورۃ المائدہ میں ہے:

مَا الۡمَسِيۡحُ ابۡنُ مَرۡيَمَ اِلَّا رَسُوۡلٌ ''قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِهِ الرُّسُلُ وَاُمُّهٗ صِدِّيۡقَةٌ'' (المائدۃ : ۷۵)

''مسیح ابنِ مریم ایک رسول کے سوا اور کچھ نہیں، اُن سے پہلے بھی اور رسول گزر چکے ہیں اور اُن کی والدہ ایک ولیہ تھیں۔'' (۷۵ : ۵)

اور سورۃ النّساء کی آیت ۶۹ میں قرآن عزیز نے منعم علیہم کی جو فہرست دی ہے وہ اس کے لئے نصِ قطعی ہے کہ ''صدیقیت'' کا درجہ نبوت سے کم ہے۔

اور جو حضرات عورت کے نبی ہونے کے قائل ہیں وہ فرماتے ہیں کہ قرآنِ عزیز نے حضرت سارہ، اُمّ موسیٰ اور حضرت مریم (علیہنّ السلام) کے متعلق جن واقعات کا اظہار کیا ہے، اُن میں یہ صراحت موجود ہے کہ اُن پر خدا کے فرشتے وحی لے کر نازل ہوئے اور اُنہیں من جانب اللہ بشارات سے سرفراز فرمایا اور اُن تک اپنی معرفت، عبادت کا حکم پہنچایا۔ چنانچہ حضرت سارہ کے لئے سورہ ھود اور سورۃ الذاریٰت میں اور اُمّ موسیٰ کے لئے سورۃ القصص میں اور مریم علیہا السلام کے لئے آلِ عمران اور سورہ مریم میں بواسطہ اور بلا واسطہ خطابِ الٰہی موجود ہے اور ظاہر ہے کہ ان مقامات پر وحی کے لغوی معنی (وجدانی ہدایت یا مخفی اشارہ) کے نہیں ہیں جیسا کہ آیت وَاَوۡحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحۡلِ (سورۃ النَّحل : ۶۸) میں شہد کی مکھی کے لئے وحی کا اطلاق کیا گیا ہے۔

اور خصوصیت کے ساتھ مریم علیہا السلام کے نبی ہونے کی یہ واضح دلیل ہے کہ سورہ مریم میں اُن کا ذکر اُسی

اسلوب کے ساتھ کیا گیا ہے جس طرح دیگر انبیائے کرام و رسل کا تذکرہ کیا ہے مثلاً : وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰى وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ؛ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ؛ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ؛ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ یا مثلاً وَاَرْسَلْنَا اِلَيْهَا رُوْحَنَا (ہم نے مریم کی طرف اپنے فرشتہ جبرئیل کو بھیجا) یا مثلاً اِنَّمَا اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ (میں بلا شبہ تیرے پروردگار کی جانب سے پیغام بر ہوں) نیز سورہ آلِ عمران میں مریم علیہا السلام کو ملائکۃ اللہ نے جس طرح اللہ کی جانب سے پیغام بر بن کر خطاب کیا وہ بھی اس دعویٰ کی روشن دلیل ہے۔''

''مریم علیہا السلام کے صدیقہ ہونے کے متعلق جو سوال ہے' اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر قرآن نے مریم علیہا السلام کو ''صدیقہ'' کہا ہے تو یہ لقب اُن کی شانِ نبوت کے اسی طرح منافی نہیں ہے جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے مسلّم نبی ہونے کے باوجود آیت يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ میں اُن کا صدیق ہونا اُن کے نبی ہونے کو مانع نہیں ہے بلکہ ذکر پاک مقامی خصوصیت کی بناء پر مذکور رہا ہے کیونکہ جو ''نبی'' ہے وہ بہر حال ''صدیق'' ضرور ہے البتہ اس کے برعکس ہونا ضروری نہیں ہے۔

<u>بحث کا خلاصہ</u> یہ ہے کہ مریم علیہا السلام حسب ذیل دلائل کے مدِّ نظر نہ تو نبیّہ تھیں اور نہ ہی رسول :

(۱) قرآن حکیم فرماتا ہے :

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ (اَلنَّحل : ۴۳)

''اور ہم نے آپ سے پہلے مرد ہی رسول بنا کر بھیجے ہیں جن پر ہم وحیٔ بھیجا کرتے ہیں۔'' (۴۳ : ۱۶)

(۲) افعال يُوْحِيْ (سورۃ الانعام:۱۱۲)' يُوْحُوْنَ (سورۃ الانعام: ۱۲۱)' اَوْحٰى (سورۃ النَّحل : ۶۸)اور اَوْحَيْنَا (سورۃ القَصَص : ۷) وحی کے لغوی معنیٰ میں نہیں ہیں بلکہ وجدانی راہنمائی کے معنیٰ میں ہیں۔ اگر لفظ ''وحی'' جو سورۃ الانعام کی آیات ۱۱۲' ۱۲۱ میں' سورۃ النَّحل کی آیت ۶۸ میں آیا' انسانوں اور جنوں میں سے بُرے لوگوں کو اور شہد کی مکھی کو نبی یا رسول نہیں بنا سکتا تو یہ لفظ اُمِّ موسیٰ اور مریم علیہا السلام کو نبیّہ یا رسول کیسے بنا سکتا ہے؟ رہا سوال مریم علیہا السلام کے پاس فرشتوں کا آنا اور اُن سے مخاطب ہونا' تو یہ اُن کے اُس استثنائی اعزاز و اکرام اور عظمت کی خاطر تھا جو اُنہیں اللہ کے ہاں حاصل تھا۔

<u>وَاصْطَفَاكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ (اللہ نے تجھے دنیا کی عورتوں پر برگزیدہ کیا) کا مفہوم</u> : جو علماء عورتوں میں نبوت کے قائل ہیں اور حضرت مریم علیہا السلام کو نبی تسلیم کرتے ہیں' اُن کے مسلک کے مطابق تو آیت وَاصْطَفَاكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ۞ کا مطلب صاف اور واضح ہے کہ حضرت مریم کو کائنات کی اُن تمام عورتوں پر فضیلت حاصل ہے جو نبی نہیں ہیں۔

لیکن جو علماء عورتوں کی نبوت کا انکار فرماتے ہیں اور مریم علیہا السلام کو نبیّہ نہیں مانتے' وہ اس آیت کی

مراد میں دو جدا جدا خیال رکھتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ آیت کا جملہ نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ عام ہے اور ماضی‘ حال اور مستقبل کی تمام عورتوں کو شامل ہے۔ اس لئے بلا شبہ حضرت مریم کو بغیر کسی استثناء کے کائناتِ انسانی کی تمام عورتوں پر فضیلت اور برتری حاصل ہے اور اکثر کا قول یہ ہے کہ آیت کے لفظ اَلْعٰلَمِیْن سے کائنات کی وہ تمام عورتیں مراد ہیں جو حضرت مریم علیہا السلام کی معاصر تھیں یعنی قرآن عزیز حضرت مریم علیہا السلام کے زمانہ کا واقعہ نقل کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں یہ بشارت دی کہ وہ اپنے زمانہ کی تمام عورتوں میں برگزیدہ اور صاحبِ کمال ہیں اور ہم نے اُن سب میں سے مریم کو چن لیا ہے اور اَلْعٰلَمِیْن کا یہ اطلاق وہی حیثیت رکھتا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اُمّت (بنی اسرائیل) کے لئے اِن آیات میں اختیار کی گئی ہے:

(i) فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ O (البقرۃ: ۴۷‘ ۱۲۲)

''(اے بنی اسرائیل!) میں نے تمہیں تمام جہانوں پر فضیلت بخشی۔'' (۴۷‘ ۱۲۲ : ۲)

(ii) وَلَقَدِاخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعَالَمِيْنَ O (اَلدُّخان : ۳۲)

''اور ہم نے بنی اسرائیل کو دنیا جہان پر فضیلت (اپنے) علم کے ماتحت ہی دی تھی۔'' (۳۲:۴۴)

اور جبکہ باتفاق آراء‘ بنی اسرائیل کی فضیلت کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اَلْعٰلَمِیْن سے اُن کی معاصر اُمم و اقوام مراد ہیں کہ ان میں سے اُمتِ موسیٰ علیہ السلام کو فضیلت حاصل ہے تو حضرت مریم علیہا السلام کی فضیلت کے باب میں بھی یہی معنیٰ مراد ہیں۔ حضرت مریم کا تقدس اور تقویٰ وطہارت‘ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کی والدہ کا شرف‘ مرد کے ہاتھ لگائے بغیر معجزہ کے طور پر اُن کے مشکوئے معلّٰی سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادتِ باسعادت بلاشبہ ایسے امور ہیں جن کی بدولت اُنہیں معاصر عورتوں پر فضیلت و برتری حاصل تھی۔

عیسیٰ علیہ السلام کی ولادتِ باسعادت: عابدہ و زاہدہ عفت مآب مریم علیہا السلام اپنے خلوت کدہ میں مشغولِ عبادت رہتیں اور ضروری حاجات کے علاوہ کبھی اُس سے باہر نہیں نکلتی تھیں۔ ایک مرتبہ مسجدِ اقصیٰ (ہیکل) کے مشرقی جانب لوگوں کی نگاہوں سے دُور کسی ضرورت سے ایک گوشہ میں تنہا بیٹھی تھیں کہ اچانک خدا کا فرشتہ (جبریل) انسانی شکل میں ظاہر ہوا۔ سیدہ مریم نے ایک اجنبی شخص کو اس طرح بے حجاب سامنے دیکھا تو گھبرا گئیں اور فرمانے لگیں: اِنِّیْ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا O (مریم : ۱۸)

''میں تجھ سے خدائے رحمان کی پناہ مانگتی ہوں اگر تو خدا ترس ہے۔'' (۱۸ : ۱۹)

فرشتے نے کہا: اِنَّمَا اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا O (مریم : ۱۹)

''بس میں تو تمہارے پروردگار کا ایلچی ہوں تاکہ تمہیں ایک پاکیزہ لڑکا دوں۔''

حضرت مریم نے یہ سنا تو از راہِ تعجب فرمانے لگیں:

اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلَامٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا O (مریم : ۲۰)

''میرے لڑکا کیسے ہو جائے گا درآنحالیکہ نہ مجھے کسی بشر نے ہاتھ لگایا ہے اور نہ میں بدچلن ہوں!''

فرشتے نے جواب دیا:

كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَلِنَجْعَلَهٗ آيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا○ (مریم: ۲۱)

''یہ یونہی ہوگا' تمہارے پروردگار نے کہا ہے کہ یہ میرے لئے آسان ہے اور یہ اس لئے بھی تاکہ ہم اُسے لوگوں کے لئے ایک نشان اور اپنی طرف سے سبب رحمت بنا دیں اور یہ طے شدہ بات ہے۔'' (۱۹:۲۱)

اور سورہ آلِ عمران میں ارشاد ہوا:

''مریم! اللہ تعالیٰ تجھے ایک ایسے لڑکے کی بشارت دیتا ہے جو اُس کا ''کلمہ'' ہوگا' اُس کا لقب ''مسیح'' اور اُس کا نام ''عیسیٰ'' ہوگا۔ وہ دنیا اور آخرت دونوں میں باوجاہت اور صاحبِ عظمت رہے گا کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے مقربین میں سے ہوگا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے نشان کے طور پر بحالتِ شیر خوارگی لوگوں سے باتیں کرے گا اور سنِ کہولت (بڑھاپے کا ابتدائی دَور) بھی پائے گا تاکہ کائنات کی رُشد و ہدایت کی خدمت کی تکمیل کرے اور یہ سب کچھ ضرور ہو کر رہے گا کہ رب تعالیٰ کا قانونِ قدرت یہ ہے کہ جب وہ کسی شے کو وجود میں لانا چاہتا ہے تو اُس کا محض یہ ارادہ اور حکم کہ ''ہو جا'' اُس شے کو نیست سے ہست کر دیتا ہے۔ یہ یونہی ہو کر رہے گا۔ اللہ تعالیٰ اُسے کتاب عطا کرے گا' اُسے حکمت سکھائے گا اور اُسے بنی اسرائیل کی رُشد و ہدایت کے لئے رسول اور اولوالعزم پیغمبر بنائے گا۔'' (آلِ عمران: ۴۵۔۴۹)

جبریلِ امین نے مریم علیہا السلام کو یہ بشارت سنا کر اُن کے گریبان میں پھونک دیا اور اس طرح اللہ تعالیٰ کا کلمہ اُن تک پہنچ گیا۔ سیّدہ نے کچھ عرصہ بعد خود کو حاملہ محسوس کیا تو بہ تقاضائے بشری اُن پر ایک اضطرابی کیفیت طاری ہوگئی اور اس کیفیت نے اُس وقت شدید صورت اختیار کر لی جب اُنہوں نے دیکھا کہ مدتِ حمل ختم ہو کر وقتِ ولادت قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ اُنہوں نے سوچا کہ اگر یہ واقعہ قوم کے اندر رہ کر پیش آیا تو چونکہ وہ لوگ حقیقتِ حال سے واقف نہیں' اس لئے نہیں معلوم کہ وہ کس کس طرح بہتان طرازیوں کے ذریعے کس درجہ پریشان کریں۔ اس لئے مناسب یہ ہے کہ لوگوں سے دُور کسی جگہ چلے جانا چاہئے۔ یہ سوچ کر وہ یروشلم (بیت المقدس) سے تقریباً نو میل کوہِ سراۃ کے ایک ٹیلہ پر چلی گئیں جو اَب ''بیت اللحم'' کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں پہنچ کر چند روز بعد دردِ زہ شروع ہوا تو تکلیف و اضطراب کی حالت میں کھجور کے ایک درخت کے نیچے تنے کے سہارے بیٹھ گئیں اور پیش آنے والے نازک حالات کا اندازہ کر کے انتہائی قلق اور پریشانی کی حالت میں کہنے لگیں:

يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا○ (مریم: ۲۳)

''کاش! میں اس سے پہلے مرگئی ہوتی اور بھولی بسری ہوگئی ہوتی۔'' (۱۹ : ۲۳)

یعنی کسی کو میری یہ بدنامی یاد بھی نہ رہ گئی ہوتی کہ فلاں بے شوہری عورت کے اولاد ہوئی تھی۔ یہ کلمات سیّدہ کی زبان پر فرطِ غیرت سے اور بدنامی کے خوف سے بے ساختہ آ گئے تھے۔ یہیں سے محققین نے یہ نکالا ہے کہ موت کی تمنا کسی دینی محرک اور داعیہ کے باعث جائز ہے' ورنہ احادیثِ مبارکہ میں اس کی ممانعت آئی ہے۔

موت کی آرزو کرنا گناہ ہے تو پھر سیّدہ مریم علیہا السلام نے یٰلَیْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ ھٰذَا کیوں کہا؟ اس کے جواب میں مفتی اقتدار احمد خان نعیمی فرماتے ہیں کہ موت کے لئے دعا کرنا گناہ ہے اور دعا زمانہ حال کے لئے ہوتی ہے یا مستقبل کے لئے۔ حضرت مریم کا یہ قول زمانہ ماضی کے لئے تھا کہ مِتُّ ماضی کا صیغہ ہے اور تمنا تھی نہ کہ دعا اور اِن حالات میں اپنی موت کی خواہش کرنا بالکل جائز ہے۔ (تفسیرِ نعیمی، جلد ۱۶، صفحہ ۱۷۶)

جس خدائے برتر نے سیّدہ کو ایسی بزرگی اور برتری بخشی، وہ کب اُنہیں اِس کرب اور بے چینی میں مبتلا رہنے دیتا۔ اس لئے اُس نے فرشتے کے ذریعے مریم علیہا السلام کے پاس پھر یہ پیغام بھیجا کہ جب تو اپنی قوم میں پہنچے اور وہ تجھ سے اس معاملہ کے متعلق سوالات کریں تو خود جواب نہ دینا بلکہ اشارے سے اُنہیں بتانا کہ میں روزہ دار ہوں اور اس لئے آج کسی سے بات نہیں کرسکتی۔ تمہیں جو کچھ دریافت کرنا ہے، اِس بچے سے دریافت کر لو۔ تب تیرا پروردگار اپنی قدرتِ کاملہ کا نشان ظاہر کرکے اُن کی حیرت کو دُور اور اُن کے قلوب کو مطمئن کردے گا۔ سیّدہ مریم علیہا السلام وحیِ الٰہی کے اِن پیغامات پر مطمئن ہوکر بچے کو گود میں لے کر بیت المقدس کو روانہ ہوئیں۔ جب شہر میں پہنچیں اور لوگوں نے آپ کو اس حالت میں دیکھا تو چہار جانب سے اُنہیں گھیر لیا اور کہنے لگے:

یٰمَرْیَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَیْئًا فَرِیًّاO یٰاُخْتَ ھٰرُوْنَ مَا کَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا کَانَتْ اُمُّكِ بَغِیًّاO

"اے مریم! تو نے تو بڑے غضب کی حرکت کی۔ اے ہارون کی بہن! نہ تمہارا والد ہی بُرا تھا اور نہ ہی تمہاری ماں بدکار تھی۔" (مریم : ۲۸)

مریم علیہا السلام نے حکمِ الٰہی کی تعمیل کرتے ہوئے لڑکے کی جانب اشارہ کردیا کہ جو کچھ دریافت کرنا ہے، اس سے معلوم کرلو۔ میں تو آج روزہ سے ہوں ☆ لوگوں نے یہ دیکھ کر انتہائی تعجب کے ساتھ کہا:

کَیْفَ نُکَلِّمُ مَنْ کَانَ فِی الْمَھْدِ صَبِیًّاO (مریم : ۲۹)

"ہم اس سے کیسے بات چیت کریں جو ابھی گہوارہ میں (پڑا ہوا) بچہ ہی ہے۔" (۱۹ : ۲۹)

مگر بچہ فوراً بول اُٹھا:

اِنِّیْ عَبْدُاللهِ اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّاO وَجَعَلَنِیْ مُبٰرَکًا اَیْنَ مَا کُنْتُ وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ مَادُمْتُ حَیًّاO وَ بَرًّا بِوَالِدَتِیْ وَ لَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّاO وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَیَوْمَ اَمُوْتُ وَیَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّاO (مریم : ۳۰-۳۳)

"میں اللہ کا بندہ ہوں، اُس نے مجھے کتاب دی اور اُس نے مجھے نبی بنایا اور میں جہاں کہیں بھی ہوں، اُسی نے مجھے بابرکت بنایا، جب تک میں زندہ رہوں۔ اُسی نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا اور مجھے میری والدہ سے نیکی کرنے والا بنایا اور مجھے سرکش و بدبخت نہیں بنایا۔ اور جس روز میں پیدا ہوا اور جس روز میں مروں گا اور جس روز میں زندہ کرکے اٹھایا جاؤں گا، میرے اوپر سلام ہے۔"

☆ بنی اسرائیل کے یہاں روزہ میں خاموشی بھی داخلِ عبادت تھی۔

قوم نے جب ایک شیر خوار بچے کی زبان سے یہ حکیمانہ کلام سنا تو حیرت میں رہ گئی اور اُنہیں یقین ہو گیا کہ مریم علیہا السلام کا دامن بلا شبہ ہر قسم کی بُرائی اور گندگی سے پاک ہے اور اس بچے کی پیدائش کا معاملہ یقیناً منجانب اللہ ایک ''نشان'' ہے۔ یہ خبر ایسی نہ تھی کہ پوشیدہ رہ جاتی۔ قریب اور بعید سب جگہ اس حیرت زدہ واقعہ اور عیسیٰ علیہ السلام کی معجزانہ ولادت کے چرچے ہونے لگے اور طبائع انسانی نے اِس مقدس ہستی کے متعلق شروع ہی سے مختلف کروٹیں بدلنا شروع کر دیں۔ اصحابِ خیر نے اُس ئے وجود کو اگر یمن وسعادت کا ماہتاب سمجھا تو اصحابِ شر نے اُس کی ہستی کو اپنے لئے فالِ بد جانا اور بغض و حسد کے شعلوں نے اندر ہی اندر اُن کی فطری استعداد کو کھانا شروع کر دیا۔ غرض اِسی متضاد فضا کے اندر اللہ تعالیٰ اپنی نگرانی میں اس مقدس بچہ کی تربیت اور حفاظت کرتا رہا تاکہ اس کے ہاتھوں بنی اسرائیل کے مردہ قلوب کو حیاتِ تازہ بخشے اور اُن کی روحانیت کے شجرِ خشک کو ایک مرتبہ پھر بار آور اور مثمر بنائے۔ قرآن فرماتا ہے:

وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ آيَةً وَّآوَيْنٰهُمَا اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ O (المؤمنون : ۵۰)

''اور ہم نے ابنِ مریم اور اُن کی والدہ کو ایک بڑا نشان بنایا اور ہم نے اُن دونوں کو بلند زمین پر پناہ دی جو ٹھہرنے کے قابل اور شاداب تھی۔'' (۵۰ : ۲۳) (قصص القرآن' ج ۴)

''یہ مقام کون سا تھا اور یہ واقعہ کب کا ہے؟ بعض اہلِ تفسیر کی رائے ہے کہ یہ ذکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے وقت کا ہے۔ اُس وقت سیّدہ مریم کسی بلند ٹیلے پر مقیم تھیں اور نیچے چشمہ تھا جیسا کہ سورہ مریم کی آیت ۲۴ میں ہے: قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا (تمہارے پروردگار نے تمہارے پائیں ہی میں ایک نہر پیدا کر دی ہے)۔ ابنِ کثیر نے اِسی کو ترجیح دی ہے لیکن اکثر محققین کی رائے میں اِس سے مراد ملکِ مصر ہے اور آیت کا تعلق ایک دوسرے قصّہ سے ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے زمانہ میں ملکِ شام کا حاکم ہیرودیس (Herod) تھا اور وہ نجوم و کہانت کے عروج کا زمانہ تھا۔ انجیل کی روایت ہے کہ اُسے نجومیوں سے یہ پتہ چلا کہ اسرائیلیوں کا آئندہ بادشاہ ایک گھر میں پیدا ہوا ہے۔ اُس نے چاہا کہ اُس بچہ کو پکڑ کر قتل کر ڈالے تاکہ آئندہ کے لئے اندیشہ ہی باقی نہ رہے۔ حضرت مریم عیسیٰ علیہ السلام کے ہمراہ وطن چھوڑ کر مصر کو روانہ ہو گئیں۔ آوَيْنٰهُمَا سے بھی اشارہ یہی نکلتا ہے کہ موقع کوئی خطرے کا تھا جس سے مریم اور ابن مریم علیہا السلام کو بچایا گیا اور مفسرین کا ایک بڑا گروہ اِسی طرف گیا ہے۔ دوسرے مقامات مثلاً دمشق' رملہ' ایلیا' بیت المقدس وغیرہ کے نام بھی نقل ہوئے ہیں۔'' (تفسیر ماجدی اردو' ص ۷۰۲' نوٹ : ۴۷)

''**بعثت و رسالت** : حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے قبل بنی اسرائیل ہر قسم کی بُرائیوں میں مبتلا تھے اور انفرادی و اجتماعی عیوب و نقائص کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جو اُن سے بچ رہا ہو۔ وہ اعتقاد و اعمال دونوں ہی قسم کی گمراہیوں کا مرکز و محور بن گئے تھے حتیٰ کہ اپنی ہی قوم کے ہادیوں اور پیغمبروں کے قتل تک پر دلیر ہو گئے تھے۔ یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کے متعلق مشہور ہے کہ اُس نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو اپنی محبوبہ کے اشارے پر کیسے عبرتناک طریقے پر شہید کرا دیا تھا اور اُس نے یہ سفاکانہ اقدام صرف اس لئے کیا کہ وہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی بڑھتی ہوئی روحانی مقبولیت کو برداشت نہ کر سکا اور اپنی محبوبہ سے ناجائز رشتہ پر اُن کے نہی عن المنکر (برائی سے بچانے کی ترغیب) کی تاب نہ لا

سکا اور یہ عبرتناک سانحہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیاتِ مبارکہ ہی میں اُن کی بعثت سے قبل پیش آ چکا تھا۔''

''بہر حال اِن ہی تاریک حالات میں جب حضرت یحییٰ علیہ السلام کے قتل کا واقعہ بھی ہو گزرا اور بنی اسرائیل نے خدا کے احکام کے خلاف بغاوت و سرکشی کی حد کر دی تب وہ وقتِ سعید آ پہنچا کہ جس مبارک بچہ نے حضرت مریم کی آغوش میں پیغامِ حق سنا کر بنی اسرائیل کو حیرت میں ڈال دیا تھا' سنّ رُشد کو پہنچ کر اُس نے یہ اعلان کر کے کہ ''وہ خدا کا رسول اور پیغمبر ہے اور رُشد و ہدایتِ خلق اُس کا فرضِ منصبی ہے'' قوم میں ہلچل پیدا کر دی۔ وہ شرفِ رسالت سے مشرف ہو کر اور حق کی آواز بن کر آیا اور اپنی صداقت و حقانیت کے نور سے تمام اسرائیلی دنیا پر چھا گیا۔ اس مقدس ہستی نے قوم کو للکارا اور اَحبار کی علمی مجلسوں' راہبوں کے خلوت کدوں' بادشاہوں اور اُمراء کے درباروں اور عوام و خواص کی محفلوں میں حتیٰ کہ کوچہ و بازاروں میں شب و روز یہ پیغامِ حق سنایا:

''لوگو! اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنا رسول اور پیغمبر بنا کر تمہارے پاس بھیجا ہے اور تمہاری اصلاح کی خدمت میرے سپرد فرمائی ہے۔ میں اُس کی جانب سے پیغامِ ہدایت لے کر آیا ہوں اور تمہارے ہاتھ میں خدا کا جو قانون (توراۃ) ہے اور جسے تم نے اپنی جہالت اور کجروی سے پسِ پشت ڈال دیا ہے' میں اُس کی تصدیق کرتا ہوں اور اُس کی مزید تکمیل کے لئے خدا کی کتاب (انجیل) لے کر آیا ہوں۔ یہ کتاب حق و باطل کا فیصلہ کرے گی اور آج جھوٹ اور سچ کے درمیان فیصلہ ہو کر رہے گا۔ سنو اور سمجھو اور اطاعت کے لئے خدا کے حضور جھک جاؤ کہ یہی دین و دنیا کی فلاح کی راہ ہے۔''

اب اِن حقائق اور اُن کے عواقب و نتائج کو قرآن کی زبانی سنئے اور ''اِحقاقِ حق اور اِبطالِ باطل'' کے لطف سے بہرہ ور ہو کر عبرت و موعظت حاصل کیجئے کیونکہ ''تذکیر بایّام اللہ'' سے قرآن کا مقصدِ عظیم یہی بصیرت و عبرت ہے:

(۱) وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوٰى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيقًا تَقْتُلُوْنَ O وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ O

''اور ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی اور اُن کے پیچھے ہم نے پے در پے پیمبر بھیجے اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو روشن نشانیاں عطا کیں اور ہم نے روح القدس کے ذریعے اُن کی تائید کی۔ تو کیا جب بھی کوئی پیمبر تمہارے پاس اُن (احکام) کے ساتھ آیا جو تمہارے جی کو نہ بھائے تو تم اکڑنے لگے' پھر کچھ کو تم نے جھٹلایا اور کچھ کو تم قتل ہی کرنے لگے۔ اور وہ کہتے ہیں کہ ہمارے دل (قبولِ حق کے لئے) غلاف میں ہیں۔ (یہ نہیں) بلکہ اُن کے کفر کرنے پر اللہ نے اُنہیں ملعون کر دیا ہے۔ پس بہت تھوڑے ہیں جو ایمان لے آئے ہیں''

(۲ : ۸۷'۸۸)

(۲) وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِآيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيعُوْنِ O اِنَّ اللّٰهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ O فَلَمَّا اَحَسَّ عِيسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْ اِلَى اللّٰهِ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ آمَنَّا بِاللّٰهِ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ O (آلِ عمران : ۵۰-۵۲)

''اور میں توراۃ کی تصدیق کرنے والا ہوں جو میرے سامنے ہے اور (میں اس لئے آیا ہوں) تا کہ تمہارے لئے بعض وہ چیزیں حلال کردوں جو (تمہاری کجروی کی وجہ سے) تم پر حرام کردی گئی تھیں اور میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی نشانی لے کر آیا ہوں' پس اللہ کا خوف کرو اور میری پیروی کرو۔ بلاشبہ اللہ میرا اور تمہارا پروردگار ہے پس اُسی کی عبادت کرو کہ یہی سیدھی راہ ہے۔ پھر جب عیسیٰ علیہ السلام نے اُن سے کفر محسوس کیا تو فرمایا: اللہ کے لئے کون میرا مددگار ہے تو شاگردوں نے جواب دیا: ہم ہیں اللہ کے (دین کے) مددگار' ہم اللہ پر ایمان لے آئے ہیں اور گواہ رہیئے کہ ہم نے اپنا سر (اُس کے حضور) جھکا دیا ہے۔''

(۳) وَاِذْقَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰةِ وَ مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْ بَعْدِی اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۝ (اَلصَّفّ : ۶)

''(اور وہ وقت یاد کرو) جب عیسیٰ ابنِ مریم نے کہا: اے بنی اسرائیل! میں تمہارے پاس اللہ کا پیمبر آیا ہوں تورات کی تصدیق کرنے والا جو مجھ سے پیشتر سے ہے اور ایک رسول کی بشارت دینے والا جو میرے بعد آنے والے ہیں جن کا نام احمد ہوگا' پھر جب وہ اُن کے پاس کھلے نشانات لائے تو وہ لوگ بول اٹھے کہ یہ تو صریح جادو ہے۔'' (۶ : ۶۱)

''آیاتِ بیّنات : اللہ تعالیٰ کے ہر نبی اور رسول کو اپنی نبوت و رسالت کی تصدیق کے لئے کچھ معجزات دے کر بھیجا جاتا ہے۔ یہ معجزات اُس کے اپنے ذاتی نہیں ہوتے بلکہ وہ اُس پر عطیہِ خداوندی ہوتے ہیں اور وقت کی ضرورت ہوتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کے دَور میں اُن کی قوم میں جادو اپنے زوروں پر تھا اور جادوگروں کی بڑی عزت و تکریم تھی۔ اِس سحر اور جادو کے مقابلہ کے لئے موسیٰ علیہ السلام کو معجزاتی عصائے موسوی دے کر بھیجا گیا۔ جدّ الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دَور میں علمِ نجوم اور علمِ کیمیا کا بڑا چرچا تھا۔ اس لئے ابراہیم علیہ السلام کو اُن کی قوم کے اِس عقیدے کے خلاف مضبوط اور مُسکت دلائل (حُجّہ: سورۃ الانعام: ۸۳) دے کر مبعوث کیا گیا کہ اِن اجرامِ فلکی کا لوگوں کی تقدیر (قسمت) پر ناگزیر اور مستقل اثر ہے۔ ہمارے نبیِ مکرّم ﷺ کے دَور میں عربوں میں فصاحت و بلاغت اپنے عروج اور نقطہِ کمال پر تھی اور اُنہیں اس پر بجا طور پر ناز بھی تھا۔ اُن کے غرور کو توڑنے کے لئے ربِّ ذوالجلال والاکرام نے فصاحت و بلاغت کا فقید المثال شاہکار قرآن مجید کی شکل میں بھیجا۔ عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں علمِ طب اور طبیعیات کا بہت شہرہ تھا۔ اُن کی طب کے جواب میں مُردوں کو (بہ اذنِ الٰہی) شفایاب کرنے جیسے معجزات کے ساتھ عیسیٰ علیہ السلام کو بھیجا گیا۔ عیسیٰ علیہ السلام کو عطا کئے گئے معجزات کی تفصیل سورہ آلِ عمران کی آیت ۴۹ میں یوں دی گئی ہے :

وَرَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ اَنِّیْ قَدْ جِئْتُکُمْ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ اَنِّیْٓ اَخْلُقُ لَکُمْ مِّنَ الطِّیْنِ کَهَیْئَةِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْهِ فَیَکُوْنُ طَیْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاُبْرِئُ الْاَکْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰهِ وَ اُنَبِّئُکُمْ بِمَا تَاْکُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ فِیْ بُیُوْتِکُمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝

''اور وہ بنی اسرائیل کا پیغمبر ہوگا (اور کہے گا) میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں' میں تمہارے لئے مٹی سے پرندوں کی مانند صورت بنا دیتا ہوں' پھر اُس میں دَم کر دیتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے' میں اللہ کے حکم سے مادرزاد اندھے اور برص دار کو شفایاب کر دیتا ہوں اور اللہ کے حکم سے مُردوں کو زندہ کر دیتا ہوں اور تم جو کچھ کھاتے ہو اور جو کچھ اپنے گھروں میں ذخیرہ جمع کرتے ہو' وہ تمہیں بتلا دیتا ہوں۔ بے شک اِن (سارے واقعات) میں تمہارے لئے ایک نشانی ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو۔''

اِن چہارگانہ خدائی نشانات (معجزات) کے علاوہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بغیر باپ کے پیدائش بھی ایک عظیم الشان ''خدائی نشان'' تھا جس کا بیان گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے۔

''آیاتِ بیّنات'' کا اگرچہ بکثرت اطلاق کتاب اللہ (قرآن' توراۃ' زبور' انجیل) اور اُن کی آیات پر ہوا ہے لیکن بعض بعض جگہ اُنہیں ''معجزات'' کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ جیسے (۱) صالح علیہ السلام کی ناقہ کے متعلق ارشاد ہے: هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ آيَةً (الاعراف: ۷۳) ''یہ اونٹنی تمہارے لئے (اللہ کی جانب سے) ایک نشان ہے۔'' (۲) حضرت مسیح اور اُن کی والدہ مریم (علیہما السلام) کے متعلق ارشاد ہے: وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَا آيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ (الانبیاء: ۹۱) ''ہم نے مریم اور اُن کے فرزند کو دنیا جہان والوں کے لئے ایک نشان بنا دیا۔'' (۳) (i) حضرت مسیح علیہ السلام کو جو معجزات عطا ہوئے تھے' اُن کے متعلق ارشاد ہوا: وَآتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ (البقرۃ: ۸۷) ''اور ہم نے عیسیٰ ابنِ مریم کو روشن نشانیاں (یعنی معجزات) عطا کئے۔'' (ii) إِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ إِنْ هٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ (المائدۃ: ۱۱۰) ''جب تم اُن کے پاس روشن نشانیاں لے کر آئے تھے تو اُن میں جو کفر اختیار کئے رہے' وہ بولے کہ یہ تو ایک کھلے ہوئے جادو کے سوا کچھ نہیں۔''

معجزہ پر ''برہان'' کا اطلاق اور کتاب اللہ کے جملوں پر ''آیت'' اور ''آیات اللہ'' کا اطلاق مجازاً نہیں بلکہ حقیقت ہے مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دو معجزوں عصاء اور ید بیضاء کے متعلق سورۃ القصص کی آیت ۳۲ میں ذکر ہوا: فَذٰنِكَ بُرْهَانَانِ مِنْ رَّبِّكَ ''پس تمہارے رب کی جانب سے یہ دو دلیلیں ہیں۔''

اور کتاب اللہ اور اُس کے جملوں پر ''آیت'' اور ''آیات'' کے اِطلاقات سے تو قرآن کی کوئی طویل سورۃ ہی خالی ہوگی۔ تمام قرآنِ حکیم میں جگہ جگہ اس کا استعمال اس کثرت سے ہوا ہے کہ اس کی فہرست مستقل موضوع بن سکتی ہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام کے دستِ مبارک پر جن معجزات کا ظہور ہوا یا اُن کی ولادت جس معجزانہ طریق پر ہوئی' یہود نے از راہِ حسد اُن کا انکار تو کیا لیکن بعض فطرت پرست مدعیانِ اسلام نے اِس انکار کو ذاتی مفاد کے

لئے نہیں بلکہ فطرت پرست اور منکرین خدا یورپین علمائے جدید سے مرعوبیت کی بناء پر یہ روش اختیار کی ہے تاکہ اُن کی مذہبیّت پر عجائب پرستی کا الزام عائد نہ ہو سکے۔ اِن حضرات میں سرسیّد اور مولوی چراغ علی بالخصوص قابلِ ذکر ہیں اور بعض وہ یہود صفت لوگ ہیں جو اپنی ذاتی غرض اور ناپاک مقصد کی خاطر از راہِ حسد و بغض حضرت مسیح علیہ السلام کے اِن معجزات کا نہ صرف انکار کرتے ہیں بلکہ تاویلاتِ باطل کے پردہ میں اُن کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ ان میں سے مرزا غلام احمد قادیانی اور محمد علی لاہوری خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

مرزا قادیانی اور لاہوری نے تو یہ ظلم کیا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے معجزہ اَنِّیْ اَخْلُقُ لَکُمْ مِّنَ الطِّیْنِ کَھَیْئَۃِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْہِ فَیَکُوْنُ طَیْرًا بِاِذْنِ اللّٰہِ کے متعلق یہ کہہ دیا کہ مسیح کا یہ عمل ایک تالاب کی مٹی کا رہینِ منت تھا اور معجزہ کچھ نہیں تھا۔ اُس تالاب کی مٹی کی یہ خاصیت تھی کہ جس کسی پرند کی شکل بنائی جاتی اور منہ سے دُم تک سوراخ رکھ دیا جاتا تو ہوا بھر جانے سے اُس میں آواز بھی پیدا ہو جاتی تھی اور حرکت بھی۔ گویا اَلعیاذ باللہ ان بدبختوں کے نزدیک حضرت مسیح علیہ السلام کی جانب سے منکروں کے مقابلہ میں یہ معجزانہ صداقت نہیں تھی بلکہ مداری یا شعبدہ باز کا تماشہ تھا (استغفر اللہ ونعوذ باللہ من شرورھم)۔

اسی طرح اِحْیَاءُ الْمَوْتٰی (مُردوں کو زندہ کر دینا) کے معجزہ کا بھی انکار کرتے ہوئے اُنہوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ قرآنِ عزیز نے یہ فیصلہ سنا دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ موت کے بعد کسی کو اس دنیا میں قبل از قیامت زندگی نہیں بخشے گا اور اپنے دعویٰ کی دلیل میں وہ یہ آیت پیش کرتے ہیں:

وَحَرَامٌ عَلٰی قَرْیَۃٍ اَھْلَکْنٰھَا اَنَّھُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ O (الانبیاء: ۹۵)

''اور ہم جس بستی کو ہلاک کر دیتے ہیں ناممکن ہے کہ وہ لوگ پھر لوٹ کر آئیں۔'' (۹۵ : ۲۱)

لطف یہ ہے کہ اگر پورے قرآن کو از اوّل تا آخر پڑھ جایئے تو کسی ایک آیت میں بھی آپ کو یہ فیصلہ نہیں ملے گا بلکہ اس دعویٰ کے خلاف متعدد مقامات پر اس کا اثبات ملے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں موت دینے کے بعد حیاتِ تازہ بخشی ہے مثلاً (۱) سورۃ البقرۃ کی آیاتِ ذبحِ بقرہ میں موت دینے کے بعد مُردہ کو دوبارہ زندگی دینے کا ذکر ہے۔ (۲) اسی سورۃ البقرۃ میں عزیر علیہ السلام کو وفات دینے کے بعد اُن کے دوبارہ زندہ کرنے کا بیان ہے۔ (۳) سورۃ البقرۃ میں ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں چار پرندوں کے ذبح ہو جانے کے بعد اُنہیں دوبارہ زندہ کئے جانے کا بیان ہے۔ (۴) اصحابِ کہف کی مثال بھی زیرِ نظر مسئلہ کی تائید کرتی ہے۔

تو جب کسی چیز کے مار دینے کے بعد اُس کا دوبارہ زندہ کرنا قرآنِ حکیم سے ثابت ہے تو سورۃ الانبیاء کی مذکورہ بالا آیت ۹۵ کی ایسی تاویل کرنا ضروری ہے جس سے اوپر بیان کردہ چاروں حقائق سے تصادم نہ ہو کیونکہ احکم الحاکمین کا کلام باہمی تضادات سے پاک اور منزہ و مبرّا ہے۔

اِس سلسلہ میں مفتی اقتدار احمد خان نعیمی فرماتے ہیں کہ لَا یَرْجِعُوْنَ کا لَا زائدہ ہے اور معنی یہ ہے کہ

ہر اُس قوم پر جنہیں ہم نے دنیا میں ہلاک کر دیا۔ پھر وہ دنیا میں لوٹ کر آئیں اور عزت، دولت اور مرتبے کی دنیا پائیں یعنی کفر پر مرنے والے نہ دوبارہ دنیا میں لوٹ سکتے ہیں، نہ دنیوی عزت پا سکتے ہیں اور نہ اُخروی عزت اُن کے نصیب میں ہے۔ نہ اِس حیاتِ دنیا کی مہلت میں وہ توبہ اور ایمان کی توفیق پائیں۔ یہ سب دروازے اُن بد نصیبوں پر بند ہو چکے ہیں اور حرام ہو چکے ہیں۔ دراصل آیت منکرین قیامت سے متعلق ہے۔ وہ اچھی طرح سن لیں کہ نہ لوٹنا اُن پر حرام اور ممنوع ہے یعنی ضرور لوٹیں گے، حساب و کتاب سنیں گے، ظلم و کفر کا بدلہ پائیں گے اور جہنم میں جائیں گے۔'''' (تفسیر نعیمی، جلد ۱۷، صفحات ۴۸۰، ۴۸۸)

''**عیسیٰ علیہ السلام کے حواری**: عیسیٰ علیہ السلام معاندین و مخالفین کی ہرزہ سرائیوں کے باوجود اپنے فرضِ منصبی ''دعوت الی الحق'' میں سرگرم عمل رہتے اور شب و روز بنی اسرائیل کی آبادیوں اور بستیوں میں پیغامِ حق سناتے اور روشن دلائل اور واضح آیات اللہ کے ذریعے لوگوں کو قبولِ حق و صداقت پر آمادہ کرتے رہتے تھے۔ خدا اور حکمِ خدا سے سرکش اور باغی انسانوں کی اِس بھیڑ میں ایسی سعید روحیں بھی نکل آئی تھیں جو عیسیٰ علیہ السلام کی دعوتِ حق پر لبیک کہتی اور سچائی کے ساتھ دینِ حق کو قبول کر لیتی تھیں۔ انہی پاک بندوں میں وہ مقدّس ہستیاں بھی تھیں جو عیسیٰ علیہ السلام کے شرفِ صحبت سے فیض یاب ہو کر نہ صرف ایمان ہی لے آئی تھیں بلکہ دینِ حق کی سربلندی اور کامیابی کے لئے اُنہوں نے جان و مال کی بازی لگا کر خدمتِ دین کے لئے خود کو وقف کر دیا تھا اور اکثر و بیشتر عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ رہ کر تبلیغ و دعوت کو سرانجام دیتی تھیں۔ اِسی خصوصیت کی وجہ سے وہ ''حواری'' ☆ (رفیق) اور ''انصار اللہ'' (اللہ کے دین کے مددگار) کے مقدس القاب سے معزز و ممتاز کی گئیں۔ چنانچہ اِن بزرگ ہستیوں نے پیغمبرِ خدا کی حیاتِ پاک کو اپنا اُسوہ بنایا اور سخت سے سخت اور نازک سے نازک حالات میں بھی اُن کا ساتھ نہیں چھوڑا اور ہر طرح معاون و مددگار ثابت ہوئیں۔ سورۃ المائدۃ میں اِنہیں اس طرح ظاہر کیا گیا:

وَاِذْ اَوْحَیْتُ اِلَی الْحَوَارِیّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِیْ وَبِرَسُوْلِیْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ O (المائدۃ: ۱۱۱)

''(اور وہ وقت یاد کرو) جب میں نے حواریوں کی جانب (اُن کے پیغمبر کی معرفت) وحی کی کہ مجھ پر اور میرے پیغمبر پر ایمان لاؤ تو اُنہوں نے جواب دیا: ہم ایمان لائے اور (اے اللہ!) گواہ رہنا کہ ہم بلاشبہ تیرے حکم کے آگے سر جھکائے ہوئے ہیں۔'' (۱۱۱ : ۵)

اور سورۃ الصف میں اُن کی مدح و ستائش یوں کی گئی:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ کَمَا قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ لِلْحَوَارِیّٖنَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰهِ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْۢ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ وَکَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ فَاَیَّدْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلٰی عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِیْنَ O (الصّف: ۱۴)

☆ ''حواریون'' کا لفظ ''حور'' سے ہے جس کا معنیٰ (۱) آنکھ کی سفیدی کا بہت زیادہ سفید ہونا اور اُس کے سیاہ حصے کا بہت زیادہ سیاہ ہونا ہے (القاموس المحیط، ج ۲، ص ۱۵) (۲) یا اس کا معنیٰ اُس شخص کا ہے جو کپڑوں کو کوٹنے اور دھونے کے ذریعے اُنہیں سفید کرتا ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کے شاگردوں کو یہ لقب یا تو اُن کی صفائیِ قلب کی وجہ سے ملا یا یہ کہ اُن کا پیشہ ملبوسات اور پارچات کو دھونا تھا۔ (Lane's Arabic-English Lexicon)

۲۶۲۱ (عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کی والدہ)

''اے ایمان والو! تم اللہ کے (دین کے) مددگار ہو جاؤ جیسا کہ عیسیٰ بن مریم نے جب حواریوں سے کہا: اللہ کی راہ میں کون میرا مددگار ہے؟ تو حواریوں نے جواب دیا: ہم ہیں اللہ (کی راہ) کے مددگار' پس بنی اسرائیل کی ایک جماعت ایمان لائی اور ایک گروہ نے کفر اختیار کیا' سو ہم نے مؤمنوں کی اُن کی دشمنی کے مقابلہ میں تائید کی پس وہ (مؤمن) غالب رہے۔'' (۶۱: ۱۴)

''جناب عیسیٰ علیہ السلام کے حواری بیشتر غریب اور مزدور طبقہ میں سے تھے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت وتبلیغ کے ساتھ ''سُنّۃ اللہ'' یہی جاری رہی ہے کہ اُن کی صدائے حق پر لبیک کہنے اور دینِ حق کے ساتھ جان سپاری کا مظاہرہ کرنے کے لئے اوّل غریب اور کمزور طبقہ ہی آگے بڑھتا ہے اور زبردست ہی فدا کاری کا ثبوت دیتے ہیں اور وقت کی صاحبِ اقتدار اور زبردست ہستیاں اپنے غرور اور گھمنڈ کے ساتھ مقابلہ اور معارضہ کے لئے سامنے آتی اور معاندانہ سرگرمیوں کے ساتھ اعلاء کلمۃ اللہ کی راہ میں سنگِ گراں بن جاتی ہیں لیکن جب خدا تعالیٰ کا قانون پاداشِ عمل اپنا کام کرتا ہے تو نتیجہ میں فلاح وکامرانی اِن کمزور فدایانِ حق ہی کا حصّہ ہو جاتا ہے اور متکبر ومغرور ہستیاں یا ہلاکت کے قعرِ مذلت میں جاگرتی ہیں اور یا مقہور ومغضوب ہوکر سرنگوں ہو جانے کے ماسوا کوئی چارہِ کار نہیں دیکھتیں۔''

''قرآن مجید کے بیان فَاَیَّدْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلٰی عَدُوِّھِمْ ''سو ہم نے مؤمنوں کی اُن کی دشمنی کے مقابلہ میں تائید کی'' میں اس تاریخی حقیقت کا اشارہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے رفع الی السماء کے بعد بھی پیغامِ حق کی دعوت وتبلیغ میں اِن حواریوں کی مستقل مزاجی اور عزمِ صمیم میں کوئی فرق نہیں آیا اور اُنہوں نے اپنے مشن کو پوری مستعدی سے جاری رکھا۔ سورۃ الصّف کی مذکورہ آیت ۱۴ میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اُمت کے افراد کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا جارہا ہے کہ وہ بھی عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کی طرح دعوتِ وتبلیغِ حق میں مستعد رہیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ اللہ کے ہاں عزت وتکریم اُنہی کے لئے مخصوص ہے جو اپنے خالق ومالک کی آواز پر ہمہ وقت سراپا لبیک وتسلیم رہتے ہیں۔

''**نزولِ مائدۃ**: مخلص اور فدا کار حواریوں کی جماعت اگرچہ صادق الامین اور راسخ الاعتقاد تھی مگر علمی ومجلسی تکلفاتِ گفت وشنید کے لحاظ سے سادہ لوح اور ضروریاتِ زندگی کے سروسامان کے لحاظ سے غرباء اور ضعفاء کی جماعت تھی۔ اس لئے اُنہوں نے ازراہِ سادگی وسادہ دلی عیسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ جس خدائے برتر میں یہ لامحدود طاقت ہے کہ اُس کا ایک نمونہ آپ کی ذاتِ اقدس اور وہ نشان (معجزات) ہیں جنہیں خدا تعالیٰ نے آپ کی تصدیقِ نبوّت ورسالت کے لئے آپ کے ہاتھ پر ظاہر فرمایا اُس خدا کی یہ طاقت بھی ضرور ہوگی کہ وہ ہمارے لئے غیب سے ایک دسترخوان نازل کر دیا کرے تاکہ ہم روزی کمانے کی فکر سے آزاد ہو کر بہ اطمینانِ قلب یادِ خدا اور دینِ حق کی دعوت وتبلیغ میں مصروف رہا کریں۔ عیسیٰ علیہ السلام نے یہ سن کر اُنہیں نصیحت فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کی طاقت بے غایت اور بے نہایت ہے لیکن کسی سچے بندے کے لئے یہ زیبا نہیں کہ وہ اللہ کو آزمائے' پس اللہ سے ڈرو اور ایسے خیالات سے بچو۔ یہ سن کر حواریوں نے جواب دیا: حاشا ہمارا تو یہ مقصد نہیں کہ ہم اللہ کو آزمائیں بلکہ ہمارا مطلب تو یہ ہے کہ رزق کی جدّ وجُہد سے دل کو مطمئن کر کے خدا کے اِس عطیّہ کو زندگی کا

سہارا بنالیں اور آپ کی تصدیق میں ہمیں حق الیقین کا اعتقادِ راسخ ہو جائے اور ہم اُس کی خدائی پر کائناتِ انسانی کے لئے شاہدِ عدل بن جائیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب اُن کا بڑھتا ہوا اِصرار دیکھا تو بارگاہِ الٰہی میں درخواست کی: اے خدا! تو ان کے سوال کو پورا کر اور آسمان نے ایسا مائدہ (دسترخوان) نازل فرما کہ وہ ہمارے لئے تیرے غضب کا مظہر ثابت نہ ہو بلکہ ہمارے اول وآخر سب کے لئے یادگار (عید) بن جائے اور تیرا ''نشان'' کہلائے اور اس ذریعہ سے ہمیں اپنے غیبی رزق سے شادکام کرے کیونکہ تو ہی بہتر رزق رساں ہے۔ اس دعا کے جواب میں اللہ نے وحی نازل فرمائی: عیسیٰ! تمہاری دعا قبول ہے' میں اُسے ضرور نازل کروں گا لیکن یہ واضح رہے کہ اس کھلی نشانی نازل ہونے کے بعد اگر ان میں سے کسی نے بھی میرے حکم کی خلاف ورزی کی تو اُنہیں عذاب بھی ایسا ہولناک دوں گا جو کائنات کے کسی انسان کو نہیں دیا جائے گا۔ قرآنِ عزیز نے نزولِ مائدہ کا اس معجزانہ اسلوبِ بیان کے ساتھ ذکر کیا ہے:

اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشَّاهِدِيْنَ ۝ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝ قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْۤ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّاۤ اُعَذِّبُهٗۤ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝
(المائدۃ: ۱۱۲-۱۱۴)

''اور (دیکھو) جب ایسا ہوا تھا کہ حواریوں نے کہا تھا: اے عیسیٰ ابنِ مریم! کیا تمہارا پروردگار آسمان سے ہمارے لئے ایک خوان اُتار سکتا ہے؟ عیسیٰ نے کہا: اللہ سے ڈرو (اور ایسی فرمائشیں نہ کرو) اگر تم ایمان رکھتے ہو۔ اُنہوں نے کہا: (اس سے مقصود قدرتِ الٰہی کا امتحان نہیں بلکہ) ہم چاہتے ہیں (ہمیں غذا میسر آئے تو) اس میں سے کھائیں اور ہمارے دل آرام پائیں اور ہم جان لیں کہ آپ نے ہمیں سچ بتایا تھا اور اس پر ہم گواہ ہو جائیں۔ اس پر عیسیٰ ابن مریم نے دعا کی: اے ہمارے پالنہار! ہم پر آسمان سے ایک خوان بھیج دے کہ اُس کا آنا ہمارے لئے اور ہمارے اگلوں اور پچھلوں سب کے لئے عید قرار پائے اور تیری طرف سے (فضل وکرم کی) ایک نشانی ہو۔ ہمیں روزی عطا فرما کہ تو سب سے بہتر روزی دینے والا ہے۔ اللہ نے فرمایا: میں تمہارے لئے خوان بھیجوں گا لیکن اُس کے بعد جو شخص (راہِ حق سے) انکار کرے گا تو میں اُسے (پاداشِ عمل میں) ایسا عذاب دوں گا کہ تمام دنیا میں کسی کو ویسا عذاب نہیں دیا جائے گا۔'' (۱۱۲-۱۱۴ : ۶)

کیا مائدہ نازل ہوا یا نہیں؟ قرآنِ عزیز نے اس کے متعلق کوئی تفصیل بیان نہیں کی اور نہ کسی مرفوع حدیث میں اس کا کوئی تذکرہ پایا جاتا ہے۔ البتہ آثارِ صحابہ وتابعین رضی اللہ عنہم میں تفصیلات ضرور مذکور ہیں۔

مجاہد اور حسن بصری رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ مائدہ کا نزول نہیں ہوا' اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اُس کے

نزول کو جس شرط کے ساتھ مشروط کر دیا' طلب کرنے والوں نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ انسان ضعیف البنیان اور کمزوریوں کا مجسمہ ہے' کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی لغزش یا معمولی خلاف ورزی کی بدولت اس دردناک عذاب کے سزاوار ٹھہریں' اپنی درخواست کو واپس لے لیا۔ علاوہ ازیں اگر مائدہ کا نزول ہوا ہوتا تو وہ ایسا نشانِ الٰہی (معجزہ) تھا کہ نصاریٰ اُس پر جس قدر بھی فخر کرتے' کم تھا اور اُن کے یہاں اس کی جس قدر بھی شہرت ہوتی وہ بے جا نہ ہوتی۔ تاہم اُن کے یہاں اس نزولِ مائدہ کا اس طرح کوئی تذکرہ نہیں پایا جاتا۔'' (تفسیر ابن کثیر' ج ۲' ص ۱۱۶)

''اور حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ یہ واقعہ پیش آیا اور مائدہ کا نزول ہوا۔ جمہور کا رُجحان اِسی جانب ہے اور اس کے نزول کی تفصیلات میں مختلف اقوال پائے جاتے ہیں مثلاً صرف ایک دن نازل ہوا یا چالیس روز تک نازل ہوتا رہا اور پھر اترنا بند ہو گیا۔ جن لوگوں کی خلاف ورزی کی وجہ سے بند ہوا' اُن پر سخت قسم کا عذاب بھی آ پہنچا۔ جو روایات یہ کہتی ہیں کہ مائدہ کا نزول صرف ایک دن نہیں بلکہ چالیس دن تک جاری رہا' وہ بند ہو جانے کا سبب یہ بیان کرتی ہیں کہ نزولِ مائدہ پر حکم یہ ہوا کہ اس کو فقیر و مسکین اور مریض ہی کھائیں' تونگر اور بھلے چنگے نہ کھائیں مگر چند روز تعمیل کے بعد لوگوں نے آہستہ آہستہ اس کی خلاف ورزی شروع کر دی' یا یہ حکم ملا تھا کہ اُسے کھائیں تو سب مگر اگلے دن کے لئے ذخیرہ نہ کریں مگر کچھ عرصہ کے بعد اس کی خلاف ورزی ہونے لگی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف مائدہ کا آنا بند ہو گیا بلکہ خلاف ورزی کرنے والے خنزیر اور بندر کی شکل میں مسخ کر دیئے گئے۔'' (''قصص القرآن''۔ حفظ الرحمٰن سیوہاروی' جلد چہارم' صفحات ۸۵' ۸۶)

''بہرحال ان آثار میں جو قدر مشترک ہے اُس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعا قبول فرمائی تو مشیتِ باری تعالیٰ کا یہ حکم ہوا کہ مائدہ تیار ہو۔ چنانچہ لوگوں کی آنکھوں دیکھتے اللہ کے فرشتے فضائے آسمانی سے اُسے لے کر اترے۔ اُدھر فرشتے اُسے لے کر آہستہ آہستہ اتر رہے تھے اور اِدھر عیسیٰ علیہ السلام انتہائی خشوع و خضوع کے ساتھ بارگاہِ الٰہی میں دست بہ دعا تھے کہ مائدہ آ پہنچا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اول دو رکعت نمازِ شکر ادا کی اور پھر مائدہ (خوان) کو کھولا تو اُس میں تلی ہوئی مچھلیاں اور تر و تازہ پھل اور روٹیاں موجود پائیں اور خوان کھولتے ہی ایسی نفیس خوشبو نکلی کہ اُس کی مہک نے سب کو مست کر دیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ کھائیں مگر لوگوں نے اِصرار کیا کہ ابتداء آپ کریں۔ آپ نے فرمایا: یہ میرے لئے نہیں ہے' تمہاری طلب پر نازل ہوا ہے۔ یہ سن کر سب گھبرائے کہ نہ معلوم اس کا نتیجہ کیا ہو کہ اللہ کا رسول تو نہ کھائے اور ہم کھائیں۔ آپ نے یہ دیکھ کر ارشاد فرمایا: اچھا! فقراء' مساکین' معذورین اور مریضوں کو بلاؤ' یہ اُن کا حق ہے۔ تب ہزار ہا بندگانِ خدا نے شکم سیر ہو کر کھایا مگر مائدہ کی مقدار میں کوئی فرق نہ آیا۔☆ (ایضاً' ص ۸۷)

اس مسئلہ میں حضرت شاہ عبدالقادر (نوّر اللہ مرقدہ)' مجاہد اور حسن بصری رحمہما اللہ کے ہم نوا معلوم ہوتے ہیں اور نزولِ مائدہ سے متعلق ان دونوں جماعتوں سے الگ ایک اور لطیف بات موضح القرآن میں ارشاد فرماتے ہیں:

☆ یہ واقعات بڑی تفصیل کے ساتھ تمام کتبِ تفسیر میں موجود ہیں۔

۲۶۲۴ (عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کی والدہ)

هَلْ يَسْتَطِيْعُ ''ہو سکے'' یہ معنی کہ ہمارے واسطے تمہاری دعا سے اس قدر خرقِ عادت کرے یا نہ کرے فرمایا: اِتَّقُوا اللّٰہَ (اللہ سے ڈرو) یعنی بندہ کو چاہئے کہ اللہ کو نہ آزمائے کہ میرا کہنا مانتا ہے یا نہیں اگرچہ خداوند (آقا و مالک) بہتیری مہربانی کرے۔ وَنَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ یعنی برکت کی امید پر مانگتے ہیں۔ اور مشہور ہے کہ معجزہ آزمانے کو نہیں کہتے۔ وہ خوان یکشنبہ کو اترا جو نصاریٰ کی عید کا دن ہے جیسے ہم کو روزِ جمعہ ملا۔ بعضے کہتے ہیں کہ وہ خوان چالیس روز تک اترا اور پھر بعض نے ناشکری کی یعنی حکم یہ تھا کہ فقراء اور مریض کھائیں نہ کہ بھلے چنگے اور تونگر۔ پھر قریباً اسی آدمی سور اور بندر ہو گئے' مگر یہ عذاب پہلے یہود میں ہوا تھا' پیچھے کسی کو نہیں ہوا۔'' ☆

''اور بعضے کہتے ہیں کہ مائدہ نہ اترا۔ تہدید سن کر مانگنے والے ڈر گئے' نہ مانگا لیکن پیغمبر کی دعا عبث نہیں اور اس کلام (قرآن) میں نقل کرنا بے حکمت نہیں۔ شاید اس دعا کا اثر یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی اُمّتِ نصاریٰ آسودگیِ مال سے ہمیشہ رہی اور اُن میں جو کوئی ناشکری کرے تو شاید آخرت میں سب سے زیادہ عذاب پائے۔ اس میں مسلمان کو عبرت ہے کہ اپنا مدّعا خرقِ عادت کی راہ سے نہ چاہے' اسبابِ ظاہری پر قناعت کرے تو بہتر ہے۔ اور پھر اُس کی شکر گزاری بہت مشکل ہے۔'' (موضح القرآن' سورہ مائدہ)

اِس سلسلہ میں حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے موعظت و بصیرت کے متعلق بہت خوب بات فرمائی:

''عیسیٰ علیہ السلام سے اُن کی قوم نے نزولِ مائدہ کی درخواست کی تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ جواب ملا کہ تمہاری درخواست اس شرط کے ساتھ منظور کی جاتی ہے کہ نہ اس میں خیانت کرنا' نہ اُسے چھپائے رکھنا اور نہ اسے ذخیرہ کرنا ورنہ یہ بند کر دیا جائے گا اور تم کو ایسا عبرت ناک عذاب دوں گا جو کسی کو نہ دیا جائے گا۔''

''(اے معشرِ عرب!) تم اپنی حالت پر غور کرو کہ اونٹوں اور بکریوں کی دُم پکڑ کر جنگلوں میں چراتے پھرتے تھے۔ پھر خدا تعالیٰ نے اپنی رحمت سے تمہارے درمیان ہی سے ایک برگزیدہ رسول مبعوث فرمایا جس کے حسب و نسب سے تم اچھی طرح واقف ہو۔ اُس نے تمہیں یہ خبر دی کہ عنقریب تم عجم پر غالب آ جاؤ گے اور اُس پر چھا جاؤ گے اور اُس نے تمہیں سختی کے ساتھ منع فرمایا کہ مال و دولت کی فراوانی دیکھ کر تم ہرگز چاندی اور سونے کے خزانے جمع نہ کرنا مگر قسم بخدا کہ زیادہ لیل و نہار نہ گزریں گے کہ تم ضرور سونے چاندی کے خزانے جمع کرو گے اور اس طرح خدائے برتر کے دردناک عذاب کے مستحق ہو جاؤ گے۔'' (تفسیر ابنِ کثیر' جلد ۲' سورہ مائدۃ)

عیسیٰ علیہ السلام کا رَفع الی السّماء (زندہ آسمان پر اُٹھایا جانا): حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے نہ تو شادی کی اور نہ ہی بود و باش کے لئے گھر بنایا۔ آپ شہر شہر اور گاؤں گاؤں اللہ کا پیغام سناتے اور دینِ حق کی دعوت و تبلیغ کا فرض انجام دیتے اور جہاں بھی رات آ پہنچتی' وہیں کسی سر و سامانِ راحت کے بغیر شب بسر کر لیتے۔

☆ شاہ صاحب کا مسلک یہ ہے کہ واقعہ مسخ صحیح نہیں ہے۔

اور چونکہ اُن کی ذاتِ اقدس سے مخلوقِ خدا جسمانی و روحانی دونوں طرح کی شفا اور تسکین پاتی تھی اس لئے جس جانب بھی اُن کا گزر ہوتا، خلقت کا انبوہِ کثیر حُسنِ عقیدت کے ساتھ جمع ہو جاتا اور والہانہ محبت کے ساتھ آپ پر نثار ہو جانے کو تیار رہتا تھا۔''

''یہود کو اِس دعوتِ حق کے ساتھ جو بغض و عناد تھا' اس نے اس بڑھتی ہوئی مقبولیت کو انتہائی حسد اور سخت خطرہ کی نگاہ سے دیکھا اور جب اُن کے مسخ شدہ قلوب کسی طرح اُسے برداشت نہ کر سکے تو اُن کے سرداروں' فقیہوں اور صدوقیوں نے ذاتِ اقدس کے خلاف سازش شروع کی اور طے یہ پایا کہ اس ہستی کے خلاف کامیابی حاصل کرنے کی سوائے اس کے کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ بادشاہِ وقت کو مشتعل کر کے آپ کو دار پر چڑھا دیا جائے۔''

''یہود اگرچہ اپنے زمانہ کے بت پرست بادشاہ ہیرودیس کے اقتدار کو اپنی بدبختی سمجھ کر اُس سے متنفر تھے مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف قلوب میں مشتعل حسد کی آگ نے اور صدیوں کی غلامی سے پیدا شدہ پست ذہنیت نے ایسا اندھا کر دیا کہ انجام اور نتیجہ کی فکر سے بے پرواہو کر وہ بادشاہ کے دربار میں جا پہنچے اور عرض کیا: عالی جاہ! یہ شخص نہ صرف ہمارے لئے بلکہ حکومت کے لئے بھی خطرہ بنتا جا رہا ہے۔ اگر اس کا فوری استیصال نہ کر دیا گیا تو ہمارا دین صحیح حالت میں باقی نہ رہ سکے گا اور اندیشہ ہے کہ کہیں آپ کے ہاتھ سے حکومت کا اقتدار بھی نہ چلا جائے اس لئے کہ اس شخص نے عجیب وغریب شعبدے دکھا کر خلقت کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے اور ہر وقت اس گھات میں لگا رہتا ہے کہ عوام کی طاقت کے بل پر قیصر اور آپ کو شکست دے کر خود بنی اسرائیل کا بادشاہ بن جائے۔ اس شخص نے لوگوں کو صرف دنیوی راہ سے ہی گمراہ نہیں کیا بلکہ اُس نے ہمارے دین تک کو بھی بدل ڈالا اور وہ لوگوں کو بددین بنانے میں منہمک ہے۔ پس اِس فتنہ کا انسداد از بس ضروری ہے تاکہ بڑھتا ہوا یہ فتنہ ابتدائی منزل ہی میں کچل ڈالا جائے۔''

''غرض کافی گفت وشنید کے بعد بادشاہ نے اُنہیں عیسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کر کے شاہی دربار میں مجرم کی حیثیت سے پیش کرنے کی اجازت دے دی۔ بنی اسرائیل کے سردار' فقیہ اور کاہن یہ فرمان حاصل کر کے بے حد مسرور ہوئے اور فخر و مباہات کے ساتھ ایک دوسرے کو مبارکباد دینے لگے کہ آخر ہماری سازش کارگر ہوئی اور ہماری تدبیر کا تیر ٹھیک ٹھاک نشانے پر بیٹھ گیا۔ وہ کہنے لگے کہ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ خاص موقع کا منتظر رہا جائے اور کسی خلوت اور تنہائی کے موقع پر اس طرح آپ کو گرفتار کیا جائے کہ عوام میں ہیجان نہ ہونے پائے۔''

''حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کے حواریوں کا مکالمہ گزشتہ صفحات میں سورہ آلِ عمران اور سورۂ الصّف کے حوالہ سے نقل کیا جا چکا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب یہود کے کفر و انکار اور معاندانہ ریشہ دوانیوں کو محسوس کیا تو ایک جگہ اپنے حواریوں کو جمع کر کے اُن سے فرمایا کہ بنی اسرائیل کے سرداروں اور کاہنوں کی معاندانہ سرگرمیاں تم سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ اب وقت کی نزاکت اور کڑی آزمائش و امتحان کی گھڑی کی قربت کا تقاضا ہے کہ تم سے سوال کروں کہ تم میں وہ کون افراد ہیں جو اس کفر و انکار کے سیلاب کے سامنے سینہ سپر ہو کر اللہ کے دین کے ناصر و مددگار بنیں گے۔ آپ علیہ السلام کا یہ ارشادِ مبارک سن کر سب نے بڑے جوش و خروش اور

صداقتِ ایمانی کے ساتھ جواب دیا کہ ہم ہیں اللہ کے دین کے مددگار اور خدائے واحد کے پرستار۔ آپ گواہ ہیں کہ ہم مسلم وفا شعار ہیں اور درگاہِ باری میں اپنی اِس اطاعت کوشی پر استقامت کے لئے یوں دست بدعا ہیں: اے پروردگار! ہم تیری اتاری ہوئی کتاب پر ایمان لے آئے اور صدقِ دل کے ساتھ تیرے پیغمبر کے پیرو ہیں۔ خدایا! تو ہمیں صداقت وحقانیت کے فداکاروں کی صف میں لکھ لے۔"

مسیح علیہ السلام کے حواریوں کے نام :انجیل متی کے مطابق اِن حواریوں کے نام یہ ہیں :۔

(۱) پطرس (Peter) (۲) اندریاس (Andrew)
(۳) یعقوب بن زبدی (James S/o Zebedee) (۴) فلپس (Phillips)
(۵) یوحنابن زبدی (John S/o Zebedee) (۶) توما (Thomas)
(۷) برتلمائی (Bartholomew) (۸) متّی (Mathew)
(۹) یعقوب بن حلفی (James S/o Alphaeus) (۱۰) شمعون قنائی (Simon--the Canaanite)
(۱۱) یہوداہ اسکریوتی (Judas Iscariot)
(۱۲) تدّی (Lebbaeus Soneame Thaddaeus) (ماہنامہ مؤمن لاہور،جولائی ۲۰۰۵ء،ص ۲۱)

"اہلِ علم کے بیان کے مطابق حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد بنی اسرائیل کہلاتی ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کے اعلانِ رسالت سے پہلے یہ سب ایک ہی مذہب پر تھے لیکن جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اعلانِ نبوت فرمایا تو جو لوگ آپ پر ایمان لائے، وہ عیسائی کہلائے اور جنہوں نے آپ کی رسالت کا انکار کیا، یہودی کہلائے۔"

"محرّفین انجیل کی یہ جرأت بھی قابلِ غور ہے کہ اُنہوں نے ان برگزیدہ اور متبرک ہستیوں کو بھی الزام تراشی سے نہیں چھوڑا اور یہاں تک آگے بڑھے کہ اُن کے بیان کے مطابق آپ کے ایک حواری یہوداہ نے چند سکّوں کے عوض آپ کو گرفتار کروادیا۔ ایک اور حواری پطرس نے آپ کی گرفتاری کے بعد خوف زدہ ہو کر تین بار آپ کا انکار کیا اور باقی حواری اس مصیبت اور خطرے کے وقت آپ کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اس کے برخلاف قرآنِ کریم نے اِن الزامات سے حوارئین کو بَری قرار دیا ہے اور اُن کے ایمان واستقامت اور عظمتِ کردار کی تعریف کی ہے۔" (ایضاً)

"**یہود اور نصاریٰ کا عقیدہ**: یہود اور نصاریٰ دونوں کا مشترک بیان یہ ہے کہ یہود کے سرداروں اور کاہنوں کو یہ اطلاع ملی کہ اِس وقت یسوع علیہ السلام لوگوں کی بھیڑ سے الگ اپنے شاگردوں (حواریوں) کے ساتھ ایک بند مکان میں موجود ہیں۔ یہ موقع بہترین ہے اور اسے ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔ چنانچہ یہ لوگ فوراً ہی موقع پر پہنچ گئے اور چاروں طرف سے مکان کا محاصرہ کر کے یسوع علیہ السلام کو گرفتار کر لیا اور توہین وتذلیل کر کے شاہِ وقت کے دربار میں لے گئے تاکہ وہ آپ کو سولی پر لٹکائے۔ اگرچہ بادشاہ نے عیسیٰ علیہ السلام کو بے قصور سمجھ کر چھوڑ دینا چاہا مگر بنی اسرائیل کے اشتعال پر مجبوراً اُنہیں سپاہیوں کے حوالے کر دیا۔ سپاہیوں نے آپ کو کانٹوں کا تاج پہنایا، منہ پر تھوکا، کوڑے لگائے اور ہر طرح کی توہین وتذلیل کرنے کے بعد مجرموں کی طرح سولی

پر لٹکا دیا، دونوں ہاتھوں میں میخیں ٹھونک دیں، سینہ کو برچھی کی طرح اَنی سے چھید دیا اور اِس کس مپرسی کی حالت میں آپ نے یہ کہتے ہوئے جان دے دی : ایلی ایلی لما سبقتنی"

یہ تو تھا چاروں انجیلوں کی متفقہ اور مفروضہ داستان کا خلاصہ جس سے قدرتی طور یہ اثر پڑتا ہے کہ مسیح علیہ السلام کی موت انتہائی بے بسی کی حالت میں دردناک طریقہ سے ہوئی اور اگرچہ اللہ کے پاک اور مقدس بندوں کے لئے یہ کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی بلکہ مقربینِ بارگاہِ صمدی کے لئے اس قسم کی کڑی آزمائشوں کا مظاہرہ اکثر ہوتا رہا ہے لیکن اس واقعہ کا یہ پہلو اس کے مفروضہ اور گھڑے ہوئے ہونے پر روزِ روشن کی طرح شاہد ہے کہ یسوع علیہ السلام نے ایک اولوالعزم پیغمبر کی طرح اس واقعہ کو صبر و رضائے الٰہی کے ساتھ انگیز نہیں کیا بلکہ ایک انتہائی مایوس انسان کی طرح اللہ سے شکوہ کرتے ہوئے جان دے دی۔ ایلی ایلی لما سبقتنی کہتے ہوئے جان دے دینا مایوسی اور شکوہ کی وہ صورتِ حال ہے جو کسی طرح بھی مسیح علیہ السلام کے شایانِ شان نہیں کہی جا سکتی۔ پھر اس واقعہ کا یہ پہلو بھی کم حیرت زا نہیں ہے کہ بقول انجیل کے یسوع مسیح نے اس حادثہ سے قبل تین مرتبہ خدا تعالیٰ سے یہ درخواست کی: "اے میرے باپ! اگر ہو سکے تو یہ موت کا پیالہ مجھ سے ٹل جائے۔" اور جب یہ درخواست کسی طرح قبول نہ ہوئی تو مایوس ہو کر یہ کہنا پڑا: "اگر یہ میرے پئے بغیر نہیں ٹل سکتا تو تیری مرضی پوری ہو۔"

"حیرت کی بات یہ ہے کہ جبکہ عقیدۂ "کفارہ" کے مطابق مسیح علیہ السلام کا یہ معاملہ خدا اور (العیاذ باللہ) اُس کے بیٹے کے درمیان طے شدہ تھا تو پھر اِس درخواست کے کیا معنی اور اگر یہ لوازمِ بشریت کی بنا پر تھا تو خدا کی مرضی معلوم ہو جانے اور اُس پر قناعت کر لینے کے بعد پھر یہ بے صبر اور مایوس انسانوں کی طرح جان دینے کا کیا سبب؟"

"یہود کی گھڑی ہوئی اِس داستان کو چونکہ نصاریٰ نے قبول کر لیا تو یہود از راہِ فخر و غرور اس پر بے حد مسرور ہیں اور کہتے ہیں کہ مسیح ناصری اگر "مسیح موعود" ہوتا تو خدا تعالیٰ اس بیکسی اور بے بسی کے ساتھ اُسے ہمارے ہاتھ میں نہ دیتا کہ وہ مرتے وقت تک خدا سے شکوہ کرتا رہا کہ اُسے بچائے مگر خدا نے اُس کی کوئی مدد نہ کی حالانکہ ہمارے باپ دادا اس وقت بھی کانی اشتعال دیتے رہے کہ اگر تو واقعی خدا کا بیٹا اور "مسیحِ موعود" ہے تو کیوں تجھ کو خدا نے ہمارے ہاتھوں اس ذلت سے نہ بچایا۔"

"واقعہ یہ ہے کہ نصاریٰ کے پاس جب اِس چبھتے ہوئے الزام کا کوئی جواب نہیں تھا اور واقعہ کی ان تفصیلات کو مان لینے کے بعد "عقیدۂ کفارہ" کی کوئی قیمت باقی نہیں رہ جاتی تھی تب اُنہوں نے واقعہ کی اِن تفصیلات کے بعد ایک پارۂ بیان کا اور اضافہ کیا جو ایسی ہستی کا رخ روشن پیش کرتا ہے جو خدائی صفات سے متصف ذاتِ باری تعالیٰ کی مقرب اور پیش آمدہ واقعات سے مطمئن و مسرور ہے بلکہ ان کے وقوع کی متمنی اور اُنہیں اپنے ادائے فرض کا اہم جزء سمجھتی ہے۔"

<u>قرآن مجید اور عقیدہ رفع الی السّماء</u> : قرآنِ حکیم نے بتایا کہ جس زمانہ میں بنی اسرائیل،

۲۶۲۸ (عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کی والدہ)

پیغمبرِ برحق اور رسولِ خدا عیسیٰ بن مریم کے خلاف خفیہ تدبیروں اور سازشوں میں مصروف اور ان پر نازاں تھے' اُسی زمانہ میں خدائے برتر کے قانونِ قضا وقدر نے یہ فیصلہ نافذ کر دیا کہ کوئی طاقت اور مخالف قوت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام پر قابو نہیں پا سکتی اور ہماری محکم تدبیر اُسے دشمنوں کے ہر ''مکر'' سے محفوظ رکھے گی اور نتیجہ یہ نکلا کہ جب بنی اسرائیل نے اُن پر نرغہ کیا تو اُنہیں پیغمبرِ خدا پر کسی طرح دسترس حاصل نہ ہو سکی اور اُنہیں بہ حفاظتِ تمام اُٹھا لیا گیا اور جب بنی اسرائیل مکان میں گھسے تو صورتِ حال اُن پر مشتبہ ہو گئی اور وہ ذلت اور رسوائی کے ساتھ اپنے مقصد میں ناکام رہے اور اس طرح خدا نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا جو عیسیٰ بن مریم کی حفاظت کے لئے کیا گیا تھا۔

اس اِجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب عیسیٰ علیہ السلام نے یہ محسوس کیا کہ اب بنی اسرائیل کے کفر و انکار کی سرگرمیاں اِس درجہ بڑھ گئی ہیں کہ وہ میری توہین وتذلیل بلکہ قتل کے لئے سرگرمِ سازش ہیں تو انہوں نے خاص طور سے ایک مکان میں اپنے حواریوں کو جمع کیا اور اُن کے سامنے صورتِ حال کا نقشہ پیش کر کے ارشاد فرمایا: امتحان کی گھڑی سر پر ہے۔ کڑی آزمائش کا وقت ہے' حق کو مٹانے کی سازشیں پورے شباب پر ہیں۔ اب میں تمہارے درمیان زیادہ دیر نہیں رہوں گا' اس لئے میرے بعد دینِ حق پر استقامت' اُس کی نشر و اشاعت اور نصرت کا معاملہ صرف تمہارے ساتھ وابستہ ہو جانے والا ہے۔ اس لئے مجھے بتاؤ کہ خدا کی راہ میں سچا مددگار کون کون ہے؟ حواریوں نے یہ کلامِ حق سن کر کہا: ہم سب ہی خدا کے دین کے مددگار ہیں' ہم سچے دل سے خدا پر ایمان لائے ہیں اور اپنی صداقتِ ایمانی کا آپ ہی کو گواہ بناتے ہیں اور یہ کہنے کے بعد انسانی کمزوریوں کے پیشِ نظر اپنے دعویٰ پر ہی بات ختم نہیں کر دی بلکہ درگاہِ الٰہی میں دست بدعا ہو گئے کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں تو اس پر ہمیں استقامت عطا فرما اور ہمیں اپنے دین کے مددگاروں کی فہرست میں لکھ لے۔

اس جانب سے مطمئن ہو کر اب حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے فریضہ دعوت و ارشاد کے ساتھ ساتھ منتظر رہے کہ دیکھئے معاندین کی سرگرمیاں کیا رخ اختیار کرتی ہیں اور خدائے برحق کا کیا فیصلہ صادر ہوتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ میں قرآنِ عزیز کے ذریعے یہود و نصاریٰ کے ظنون واَوہامِ فاسدہ کے خلاف ''علم و یقین کی روشنی'' بخشتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ جس وقت معاندین اپنی مخالفانہ تدبیروں میں سرگرمِ عمل تھے' اُسی وقت ہم نے بھی اپنی قدرتِ کاملہ کی مخفی تدبیر کے ذریعے یہ فیصلہ کر لیا کہ عیسیٰ بن مریم کے متعلق معاندینِ حق کی تدبیر کا کوئی گوشہ بھی کامیاب نہیں ہونے دیا جائے گا اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کی پوشیدہ تدابیر کے مقابلہ میں کسی کی پیش نہیں جا سکے گی اس لئے کہ اُس کی تدبیر سے بہتر کوئی تدبیر ہو ہی نہیں سکتی:

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۖ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ ۝ (آلِ عمران: ۵۴)

''اور اُنہوں (یہود) نے (عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف) خفیہ تدبیر کی اور اللہ نے (یہود کے مکر کے خلاف) خفیہ تدبیر کی اور اللہ سب سے بہتر خفیہ تدبیر کا مالک ہے۔'' (۳ : ۵۴)

لغتِ عرب میں ''مَکر'' کے معنی خفیہ تدبیر اور دھوکا کرنے کے ہیں اور علمِ معانی کے قاعدہ ''مشاکلہ'' کے مطابق جب کوئی شخص کسی کے جواب یا دفاع میں خفیہ تدبیر کرتا ہے تو خواہ وہ اَخلاق اور مذہب کی نگاہ میں کتنی ہی

عمدہ تدبیر کیوں نہ ہو اس کو بھی ''مکر'' ہی سے تعبیر کیا جاتا ہے جیسا کہ ہر زبان کے محاورہ میں بولا جاتا ہے: ''برائی کا بدلہ برائی ہے۔'' حالانکہ ہر شخص یہ یقین رکھتا ہے کہ برائی کرنے والے کے جواب میں اُسی قدر مقابلہ کا جواب دینا اُخلاق اور مذہب دونوں کی نگاہ میں ''برائی'' نہیں ہے۔ تاہم تعبیر میں دونوں کو ہم شکل ظاہر کر دیا جاتا ہے اور اسی کو ''مشاکلہ'' کہتے ہیں اور یہ فصاحت و بلاغت کا اہم جزء سمجھا جاتا ہے۔

غرض خفیہ تدبیر دونوں طرف سے تھی۔ ایک جانب بُرے بندوں کی بُری تدبیر اور دوسری جانب خدائے برتر کی بہترین تدبیر۔ نیز ایک جانب قادرِ مطلق کی تدبیرِ کامل تھی جس میں نقص و خامی کا امکان نہیں اور دوسری جانب دھوکے اور فریب کی خام کاریاں تھیں جو تارِ عنکبوت ہو کر رہ گئیں۔

آخر وہ وقت آ پہنچا کہ بنی اسرائیل کے کاہنوں، سرداروں اور فقیہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ایک بند مکان میں محاصرہ کر لیا۔ ذاتِ اقدس اور حواری مکان کے اندر بند ہیں اور دشمن چاروں طرف سے محاصرہ کئے ہوئے ہیں۔ لہٰذا اب قدرتی طور پر یہ سوال ہوا کہ وہ کیا صورت ہے کہ جس سے دشمن ناکام رہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کسی طرح کا بھی گزند نہ پہنچے تاکہ خدائے قادر کا وعدۂ حفاظت اور دعویٰ تدبیر خیر پورا ہو۔ تو اس کے متعلق قرآن نے بتایا کہ بے شک خدا کا وعدہ پورا ہوا اور اُس کی تدبیرِ محکم نے عیسیٰ علیہ السلام کو دشمنوں کے ہاتھوں سے ہر طرح محفوظ رکھا اور صورت یہ پیش آئی کہ اُس نازک گھڑی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو وحیِ الٰہی نے یہ بشارت سنائی:

إِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيسٰى إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ○ (آل عمران: ۵۵)

''(وہ وقت ذکر کے لائق ہے) جب اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ سے کہا: اے عیسیٰ! بلاشبہ میں تیری مدت کو پورا کرنے والا ہوں اور تجھے اپنی جانب اُٹھا لینے والا ہوں اور تجھے کافروں (بنی اسرائیل) سے پاک رکھنے والا ہوں اور جو تیری پیروی کریں گے، اُنہیں تیرے منکروں پر قیامت تک کے لئے غالب رکھنے والا ہوں، پھر میری جانب ہی لوٹنا ہے، پھر میں ان باتوں کا فیصلہ کروں گا جن کے بارے میں تم (آج) جھگڑ رہے ہو۔'' (۳ : ۵۵)

کچھ ذاتی اور دنیاوی اغراض کی خاطر مرزا غلام احمد قادیانی نے کہا کہ لفظ ''وفات'' اور ''موت'' باہم مترادف اور ہم معنی ہیں لیکن ایسا کہنا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ پورے قرآن مجید میں لفظِ ''مَوت'' کا فاعل صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کو کہا گیا ہے کیونکہ موت دینا صرف اُسی کا کام ہے۔ قرآنی مثالیں ملاحظہ ہوں:

كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتٰى (تو مُردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے۔)

وَأُحْيِي الْمَوْتٰى بِإِذْنِ اللّٰهِ (میں عیسیٰ بہ حکمِ الٰہی مُردوں کو زندہ کرتا ہوں۔)

يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (اللہ تعالیٰ زمین کے مردہ اور خشک ہو جانے کے بعد اُسے زندگی دیتا ہے۔)

فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (اللہ بارش کے ذریعے زمین کو اُس کے مردہ ہونے کے بعد زندگی بخشتا ہے)۔
وَهُوَ يُحْيِ الْمَوْتٰى (مُردوں کو وہی تو زندگی دیتا ہے۔)

اس کے برعکس ''وفات'' کا فاعل اللہ تعالیٰ اور اُس کے فرشتے دونوں ہو سکتے ہیں۔قرآنی مثالیں ملاحظہ ہوں:
تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ (اَلنِّسآء : ۹۷) [اُن لوگوں کی جان فرشتے قبض کرتے ہیں۔]
تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا (الانعام : ۶۱) [اُس کی روح ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) قبض کر لیتے ہیں۔]
اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ (الانفال: ۵۰) [جب فرشتے ان کافروں کی جان قبض کرتے جاتے ہوں۔]
يَتَوَفّٰكُمْ مَلَكُ الْمَوْتِ (الٓمّ السجدة : ۱۱) [تمہاری جان موت کا فرشتہ قبض کرتا ہے۔]
اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ (اَلزُّمَر:۴۲) [اللہ جانوں کو قبض کرتا ہے۔]

مزید برآں یہ کہ قرآنِ حکیم میں "موت" اور "حیات" ایک دوسرے کے متضاد بیان ہوئے ہیں جبکہ لفظِ "وفات" کا کوئی متضاد لفظ نہیں ہے۔قرآنی مثالیں ملاحظہ ہوں:
وَلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً (الفرقان : ۳) [وہ نہ تو کسی کی موت کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ ہی زندگی کا۔]
خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ (اَلْمُلْك : ۲) [اُسی نے موت اور زندگی کو پیدا فرمایا۔]

پس ثابت ہوا کہ "وفات" اور ''موت'' کے لفظ مترادف اور ہم معنیٰ نہیں ہیں اور مختلف مفاہیم میں استعمال ہوئے ہیں۔ تُوفّی کے حقیقی معنیٰ ''موت'' نہیں بلکہ پورا لے لینے یا قبض کرنے کے ہیں۔مثلاً:
وَ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ (اَلنَّحل : ۱۱۱)
''اور ہر جی کو پورا دیا جائے گا جو اُس نے کمایا ہے۔''

اس میں تُوفّی کا فاعل اللہ تعالیٰ اور مفعول نفسِ انسانی ہے۔تاہم یہ واضح اور صاف بات ہے کہ یہاں تُوفّی بمعنی موت نہیں بن سکتے۔لہٰذا مرزا قادیانی کا پیش کردہ مفروضہ خود اختراعی ہے اور ردّ کئے جانے کے قابل ہے۔

تو اَب جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہ اطمینان دِلا دیا گیا کہ اِس سخت محاصرہ کے باوجود دشمن تمہیں قتل نہ کر سکیں گے اور تمہیں غیبی ہاتھ ملاءِ اعلیٰ کی جانب اُٹھا لے گا اور اس طرح دشمنانِ دین کے ناپاک ہاتھوں سے آپ ہر طرح محفوظ کر دئے جائیں گے تو یہاں پہنچ کر ایک دوسرا سوال پیدا ہوا کہ یہ کس طرح ہوا اور واقعہ نے کیا صورت اختیار کر لی؟ کیونکہ یہود و نصاریٰ تو کہتے ہیں کہ مسیح کو سولی پر لٹکایا گیا اور مار ڈالا گیا۔تب قرآن نے بتایا کہ مسیح ابن مریم علیہما السلام کے قتل وصلیب کی پوری داستان سرتا سر غلط اور جھوٹ ہے بلکہ اصل معاملہ یہ ہے کہ جب مسیح علیہ السلام کو بقیدِ حیات ملاءِ اعلیٰ کی جانب اُٹھا لیا گیا اور اس کے بعد جس مکان میں دشمن گھسے تو اُن پر صورتِ حال مشتبہ کر دی گئی اور وہ کسی طرح نہ جان سکے کہ آخر اس مکان میں سے مسیح علیہ السلام کہاں چلا گیا۔قرآن فرماتا ہے:

۲۶۳۱ (عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کی والدہ)

وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللهِ وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ وَ إِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَ مَا قَتَلُوهُ يَقِينًا O بَلْ رَّفَعَهُ اللهُ إِلَيْهِ وَكَانَ اللهُ عَزِيزًا حَكِيمًا O (النساء: ۱۵۷، ۱۵۸)

''اور (یہود ملعون قرار دیئے گئے) اپنے اس قول کی وجہ سے کہ ہم نے مسیح عیسیٰ بن مریم پیغمبر خدا کو قتل کر دیا حالانکہ اُنہوں نے نہ اُسے قتل کیا اور نہ ہی سولی پر چڑھایا بلکہ (اللہ کی خفیہ تدبیر کی بدولت) اصل معاملہ اُن پر مشتبہ ہو گیا اور جو لوگ اُن کے قتل کے بارہ میں جھگڑ رہے ہیں، بلاشبہ وہ اس (عیسیٰ) کی جانب سے شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ اُن کے پاس حقیقتِ حال کے بارہ میں ظن (اٹکل) کی پیروی کے سوا علم کی روشنی نہیں ہے اور اُنہوں نے عیسیٰ کو یقیناً قتل نہیں کیا بلکہ عیسیٰ (علیہ السلام) کو اللہ نے اپنی جانب (ملاءِ اعلیٰ کی جانب) اٹھا لیا اور اللہ غالب، حکمت والا ہے۔'' (۱۵۷، ۱۵۸ : ۴)

قرآنِ حکیم کا یہ وہ بیان ہے جو یہود و نصاریٰ کے اختراعی افسانہ کے خلاف اُس نے حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق دیا ہے۔ دونوں بیانات قارئین کے سامنے ہیں اور عدل و انصاف کا ترازو بھی اُن کے سامنے ہے۔

یہود کو شبہ اور دھوکا میں ڈال دیا گیا اس طرح کہ جو شخص آپ کو قتل کرنے یا قید کرنے آپ کے پاس آیا، اُسے جناب عیسیٰ علیہ السلام کا ہم شکل بنا دیا گیا جس کا نام ططیانوس یا یوطا تھا۔ یا آپ کے ایک حواری سرجس کو اُس کی اپنی خواہش پر آپ کا ہم شکل بنا دیا گیا اور اُسے سولی دے دی گئی، یہ واقعہ جمعہ کے دن بعد از نماز عصر ہوا (تفسیر ابن کثیر)۔

اختلاف سے مراد اُن کا یہ جھگڑا ہے کہ آیا حضرت مسیح قتل و مصلوب ہوئے یا کوئی دوسرا شخص۔ بعض نے کہا کہ یہ حضرت مسیح ہی ہیں کیونکہ اُن کا چہرہ مسیح جیسا ہے۔ بعض نے کہا کہ یہ مصلوب کوئی اور آدمی ہے کیونکہ اس کے باقی اعضاء مسیح جیسے نہیں۔ نیز اگر مسیح مصلوب ہوئے تو ہمارا آدمی ططیانوس کہاں گیا۔ غرضکہ وہ فیصلہ نہ کر سکے کہ مصلوب کون ہے۔ یا اِس سے مراد عیسائیوں کا اختلاف ہے کہ بعض عیسائیوں نے کہا کہ ہم نے اُنہیں زندہ آسمان پر جاتے دیکھا ہے۔ بعض نے کہا کہ ہم نے اُنہیں صلیب پر لٹکے دیکھا غرضکہ اُن کا آپس میں دھول دھپا رہا۔

بَلْ رَّفَعَهُ اللهُ إِلَيْهِ: بَلْ گزشتہ مضمون کی نفی اور اگلے مضمون کے ثبوت کے لئے آتا ہے۔ رَفع کا معنیٰ اٹھا لینا، بلند کرنا اور چڑھانا۔ چڑھانا کبھی جسمانی ہوتا ہے اور کبھی رتبہ و مرتبہ کا ہوتا ہے۔ لیکن جب اس کے بعد اِلٰی یا عَلٰی آئے تو اس سے جسمانی اٹھانا مراد ہوتا ہے۔ یوں ہی جب اٹھانے کا مفعول کوئی جسم ہو تو اس سے بلندیٔ مکان مراد ہوتی ہے جیسے وَرَفَعَ أَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ (یوسف علیہ السلام نے اپنے والدین کو تخت پر بٹھایا)۔ چونکہ یہاں رَفع کے بعد اِلٰی ہے لہٰذا اس سے جسمانی بلندی مراد ہے نہ کہ مرتبہ اور درجہ میں بلندی کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمام رسولوں کا مرتبہ اعلیٰ و ارفع ہے۔ یہ معنیٰ لینے سے عیسیٰ علیہ السلام کے مرتبے کی بلندی کے کیا معنیٰ ہوں گے کہ وہ پہلے ہی سے بلند ہیں۔ ہٗ کا مرجع رب تعالیٰ ہے۔ اپنی طرف اٹھا لینے سے مراد ایسے مقام پر اٹھا لینا ہے جہاں کسی انسان کی بادشاہت نہ ہو یعنی آسمان پر۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے مسیح علیہ السلام کو اپنی طرف اٹھا لیا۔

وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا (اور اللہ تعالیٰ غالب' حکمت والا ہے) چونکہ اِس اٹھانے پر بہت سے عقلی اعتراضات ہو سکتے تھے مثلاً یہ کہ جسمِ انسانی بغیر سیڑھی آسمان پر کیسے چڑھ گیا۔ زمہریر اور آگ کے طبقہ میں محفوظ کیسے رہا؟ آسمان پر غذا اور ہوا نہیں تو وہاں زندگی کیسی؟ اِن خرافات کے لئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ غالب بھی ہے' جو چاہے کرے۔ وہ بغیر آلہ آسمان پر پہنچا بھی سکتا ہے اور بغیر غذا اور ہوا زندہ بھی رکھ سکتا ہے جیسے مرغی کے چوزہ کو انڈے میں زندہ رکھتا ہے اور حکمت والا بھی ہے کہ اس اٹھانے میں اس کی لاکھوں حکمتیں ہیں لہٰذا بغیر چون و چرا یہ سب کچھ مان لو۔

حیاتِ مسیح علیہ السلام کے قرآنی ثبوت: عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان کو زندہ اٹھایا جانا آیاتِ قرآنیہ' احادیثِ صحیحہ' اقوالِ صحابہ کرام و جمیع مفسرین و محدثین سے ثابت ہے۔ آیاتِ قرآنیہ ملاحظہ ہوں:

(۱) وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ ○ (آلِ عمران: ۵۴) ''اور اُنہوں نے خفیہ چال چلی اور اللہ نے خفیہ تدبیر کی اور اللہ سب خفیہ تدبیر کرنے والوں سے بہتر ہے۔'' اِس آیت کی تفسیر امام رازی' جلال الدین السیوطی' شاہ ولی اللہ محدث دہلوی' خازن و مدارک سب نے یہی کی ہے کہ یہود نے عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دینے کی خفیہ تدبیر کی مگر رب تعالیٰ نے اُنہیں خفیہ طریقہ سے بچالیا کہ اُنہیں زندہ آسمان پر اٹھالیا اور جو آپ کو پکڑوانے آیا تھا اُسے عیسیٰ علیہ السلام کی شکل دے کر سولی پر چڑھا دیا گیا۔ (۲) اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِس کی تفسیر بھی امام رازی' امام سیوطی و دیگر عام مفسرین نے یہی کی ہے کہ اے عیسیٰ! ہم تمہیں پورا لینے والے ہیں اس طرح کہ تمہیں آسمان پر اٹھالیں گے۔ (۳) وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ اِلٰى قَوْلِهٖ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ (اُنہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو نہ تو قتل کیا اور نہ ہی سولی پر چڑھایا بلکہ اُن پر معاملہ مشتبہ کر دیا گیا تھا۔۔۔ پکی بات ہے کہ اُنہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی طرف اٹھالیا) امام رازی اور دیگر مفسرین نے کہا کہ اِن آیات میں قرآنِ حکیم نے عیسیٰ علیہ السلام کے قتل اور اُن کے سولی پر چڑھائے جانے کا صاف انکار کیا ہے اور اُن کے اِس جسم کے ساتھ اٹھائے جانے کا اقرار کیا ہے۔ اگرچہ ہر جگہ اللہ کی ہے مگر چونکہ آسمان بالخصوص تجلّی گاہِ الٰہی ہے کہ نہ وہاں کسی جن و بشر کی ظاہری سلطنت ہے' نہ وہاں کفر' شرک' گناہ اور معصیت ہیں۔ اس لئے اُس طرف اٹھائے جانے کو رب تعالیٰ نے اپنی طرف اٹھانا قرار دیا۔ فرماتا ہے: ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِى السَّمَآءِ (کیا تم اُس سے مامون و محفوظ ہو جو آسمان میں ہے؟) اِرْجِعِىْٓ اِلٰى رَبِّكِ (اے نفسِ مطمئنہ! اپنے رب کی طرف لوٹ جا) ابراہیم علیہ السلام نے ملکِ شام کی طرف جاتے وقت فرمایا تھا: اِنِّىْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّىْ (میں اپنے رب کی طرف جانے والا ہوں)۔ ایسے ہی یہاں فرمایا: رَافِعُكَ اِلَىَّ۔ تفسیر کبیر نے فرمایا کہ اس سے مراد ہے رَافِعُكَ اِلٰى مَحَلِّ كَرَامَتِىْ نیز تفسیر کبیر نے یہ بھی فرمایا کہ وفات ایک جنس ہے جس کی بہت سی قسمیں ہیں۔ بعض موت سے ہوتی ہیں اور بعض آسمان پر اٹھائے جانے سے۔ رَافِعُكَ اِلَىَّ نے وفات کی تعیین کر دی کہ وہ موت سے نہ ہوگی بلکہ اٹھائے جانے سے ہوگی' لہٰذا آیت میں تکرار نہیں ہے۔
(۴) وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا خازن و مدارک نے فرمایا کہ یہاں بجائے تخلیص کے تطہیر فرمانے میں

عیسیٰ علیہ السلام کی انتہائی عظمتِ شان کا اظہار ہے اور اس سے کفار میں اور عیسیٰ علیہ السلام میں مکانی فاصلہ کر دینا مراد ہے کہ کفار زمین پر رہ جائیں اور عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر بلا لئے جائیں۔ (۵) وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا (النساء : ۱۵۹) عام محدثین و مفسرین اور صحابہ کرام نے اس آیت کا ترجمہ یہی فرمایا کہ سارے اہلِ کتاب عیسیٰ علیہ السلام پر اُن کی وفات سے پہلے اُن پر ایمان لے آئیں گے اور عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے دن کفار کے خلاف گواہ ہوں گے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اِس آیت کی یہی تفسیر نقل کی جس سے صاف معلوم ہوا کہ ابھی عیسیٰ علیہ السلام نے وفات نہیں پائی کیونکہ ابھی تمام اہلِ کتاب اُن پر ایمان نہیں لائے' لاکھوں یہودی اُن کے خلاف ہیں۔ مَوْتِهٖ کی ضمیر کا اہلِ کتاب کی طرف لوٹانا اور یہ معنیٰ کرنا کہ ہر اہلِ کتاب اپنی موت سے پہلے عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آتا ہے' ضعیف ہے کیونکہ موت کے وقت کا ایمان معتبر نہیں ہے۔ (۶) وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا (اَلزُّخْرُف : ۶۱) (اور عیسیٰ علیہ السلام تو قیامت کے یقین کا ایک ذریعہ ہیں تو تم لوگ اس میں ہرگز شک مت کرو)۔ صحابہ کرام اور عام محدثین و مفسرین نے اس کی تفسیر یہ فرمائی کہ عیسیٰ علیہ السلام کا اترنا قیامت کی پہچان اور نشانی ہے' اس میں شک ہرگز نہ کرو جس سے معلوم ہوا کہ آپ دوبارہ زمین پر آئیں گے اور آپ کا تشریف لانا قیامت کی پہچان اور نشانی ہے (تفسیر کبیر)۔ تفسیر دُرِّ منثور نے عبداللہ ابنِ عباس' ابوہریرہ' مجاہد اور حسن رضی اللہ عنہم سے روایت کی کہ اِنَّهٗ' اَیْ خُرُوْجُ عِيْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ یعنی اس سے مراد قیامت سے پہلے عیسیٰ علیہ السلام کا خروج ہے۔ (۷) يُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا (آلِ عمران : ۴۶) (عیسیٰ علیہ السلام لوگوں سے کلام پنگوڑے میں بھی اور بڑی عمر میں بھی کریں گے) آپ کہولت سے پہلے ۳۳ برس کی عمر میں آسمان پر اٹھا لئے گئے' اگر آپ اب آسمان سے نہ اتریں تو كَهْلًا (پیرانہ سالی) میں لوگوں سے بات کرنے کے معنیٰ درست نہ ہوں گے۔ (۸) وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ (المائدۃ : ۱۱۰) (اور جب میں نے بنی اسرائیل کو عیسیٰ پر دست درازی کرنے سے روکے رکھا)

حیاتِ مسیح علیہ السلام کے احادیثِ نبوی میں ثبوت: (۱) بخاری' مسلم و مشکوٰۃ نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَيُوْشِكَنَّ اَنْ يَّنْزِلَ فِيْكُمُ ابْنُ مَرْيَمَ حَكَمًا عَدْلًا فَيَكْسِرُ الصَّلِيْبَ وَيَقْتُلُ الْخِنْزِيْرَ وَيَضَعُ الْجِزْيَةَ وَيَفِيْضُ الْمَالُ حَتّٰى لَا يَقْبَلُهٗ اَحَدٌ" حَتّٰى تَكُوْنَ السَّجْدَةُ الْوَاحِدَةُ خَيْرًا مِّنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا ثُمَّ يَقُوْلُ اَبُوْ هُرَيْرَةَ : فَاقْرَءُوْا اِنْ شِئْتُمْ وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ (اَشراطُ السَّاعة۔ یوسف بن عبداللہ بن یوسف الوابل' ص ۳۴۷' الدمام ۱۴۱۵ھ)

''بخدا! عیسیٰ ابنِ مریم حاکم و عادل ہو کر تم میں اتریں گے' صلیب کو توڑیں گے' خنزیر کو فنا کریں گے' جزیہ کا حکم ساقط کریں گے۔ مال کی اتنی کثرت ہوگی کہ کوئی زکوٰۃ نہ لے گا۔ اُس زمانہ میں ایک سجدہ دنیا بھر سے افضل ہوگا اور ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ اگر چاہو تو پڑھ لو وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ"

(۲) امام مسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنْ أُمَّتِیْ یُقَاتِلُوْنَ عَلَی الْحَقِّ ظَاهِرِیْنَ إِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ فَیَنْزِلُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ فِیْکُمْ فَیَقُوْلُ اَمِیْرُهُمْ : صَلِّ بِنَا فَیَقُوْلُ : لَا (ایضاً ص ۳۴۸)

''میری اُمّت کا ایک گروہ قیامت تک حق پر جنگ کرتا رہے گا یہاں تک کہ تم میں عیسیٰ علیہ السلام آ جائیں تو مسلمانوں کا امیر آپ سے کہے گا کہ آپ ہمیں نماز پڑھائیں تو آپ انکار کردیں گے کہ یہ حق امتِ محمدی کا ہے۔''

(۳) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

کَیْفَ اَنْتُمْ اِذَا اُنْزِلَ ابْنُ مَرْیَمَ فِیْکُمْ وَاِمَامُکُمْ مِّنْکُمْ (صحیح بخاری، کتاب: احادیث الانبیاء، باب: نزول عیسیٰ بن مریم علیہما السلام)

''تمہاری کیفیت کیسی ہوگی جب تم میں عیسیٰ ابنِ مریم اُتریں گے اور تمہارا امام تم ہی میں سے ہوگا۔''

(۴) امام احمد نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

اِنِّیْ اَوْلَی النَّاسِ بِعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ لِاَنَّهٗ لَمْ یَکُنْ بَیْنِیْ وَبَیْنَهٗ نَبِیٌّ، وَاِنَّهٗ نَازِلٌ فَاِذَا رَاَیْتُمُوْهُ فَاعْرِفُوْهُ (مسند امام احمد، المستدرك للحاكم)

''میں عیسیٰ ابنِ مریم کے (بہ لحاظ زمانہ) قریب تر ہوں کیونکہ میرے اور اُن کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے، اور عیسیٰ ابنِ مریم یقیناً (آسمان سے) اتریں گے، جب تم اُنہیں دیکھو تو (بطورِ نبی) اُنہیں پہچان لینا۔''

(۵) تابعی امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اِنَّهٗ حَیٌّ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰکِنْ اِذَا نَزَلَ آمَنُوْا بِهٖ اَجْمَعُوْنَ (تفسیر طبری ۶/۲۱)

''عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے ہاں زندہ ہیں، جب آپ (آسمان سے) نزول فرمائیں تو اُن پر تم سب ایمان لے آنا۔''

(۶) ابن جوزی نے ''کتاب الوفا'' میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا: عیسیٰ علیہ السلام زمین پر اتریں گے، نکاح کریں گے، صاحبِ اولاد ہوں گے، یہاں پینتالیس سال قیام فرمائیں گے، پھر وفات پائیں گے اور میرے ساتھ میرے مقبرہ میں دفن ہوں گے۔ روزِ قیامت ہم اور عیسیٰ علیہ السلام ایک ہی مقبرہ سے اٹھیں گے۔

حیاتِ مسیح علیہ السلام کے ثبوت علمائے اسلام سے: (۱) امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فقہِ اکبر میں فرماتے ہیں کہ دجّال کا نکلنا، یاجوج ماجوج کا خروج، آفتاب کا مغرب سے طلوع ہونا، عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان سے اترنا ساری علاماتِ قیامت ہیں اور حق ہیں۔ (۲) امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ لوگ کھڑے ہوئے نماز کی تکبیر سن رہے ہوں گے کہ بادل چھائے گا اور اچانک عیسیٰ علیہ السلام اُتریں گے۔ (۳) علامہ زُرقانی شرح مواہب اللدُنیہ میں فرماتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام اتر کر ہمارے نبی کی شریعت پر فیصلہ فرمائیں گے۔ وہ اگرچہ اُمّتِ محمدیہ کے خلیفہ ہوں گے لیکن ساتھ ہی نبی بھی ہوں گے۔ کیونکہ موت سے نبوّت زائل نہیں ہوتی۔ (۴) امام شافعی اور اُن کے تمام متبعین

جلال الدین السیوطی، رازی وغیرہم نے عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری تسلیم کی۔ اسی طرح امام بخاری، امام مسلم، ترمذی، ابوداؤد وغیرہ محدثین نیز امام غزالی، امام جوزی وغیرہ کا بھی یہی عقیدہ تھا۔ (تفسیر نعیمی، ج ۳، ص ۳۰۵، ۳۰۶)

(۵) حافظ ابن حجر عسقلانی ''فتح الباری'' میں فرماتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام نے انجیل میں حضور علیہ السلام کی اُمّت کی فضیلت پڑھی تو اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ اُنہیں حضور ﷺ کا اُمّتی بنا دے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا کو شرفِ قبول بخشا اور آپ کو طویل زندگی بخشی یہاں تک کہ آپ آخر زمانہ میں دینِ محمدی کے مجدّد بن کر اتریں گے۔ (اشراطُ السّاعۃ۔۔ یوسف بن عبداللہ بن یوسف الوابل، صفحہ ۳۵۶)

حیاتِ مسیح علیہ السلام پر چند سوالات مع جوابات: (۱) اگر عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر ہوں تو لازم آتا ہے کہ درجہ میں حضور ﷺ سے درجہ میں بڑھ جائیں کہ حضور علیہ السلام زمین پر ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ صدر جہاں بیٹھے، صدر ہی ہے۔ اونچے نیچے ہونے میں درجے کا مدار نہیں۔ ورنہ ستارے، چاند، سورج اور ملائکہ آسمان پر ہی ہیں تو کیا وہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے درجہ میں بڑھ کر ہیں؟ موتی پانی میں نیچے ہوتا ہے اور بلبلہ اوپر تو کیا بلبلہ موتی سے افضل ہے؟ (۲) مرزا قادیانی نے ایک اور پٹخنی کھائی اور لوگوں کو بیوقوف بناتے ہوئے یہ استدلال پیش کیا کہ اگر عیسیٰ علیہ السلام کو آسمانوں میں زندہ مان لیا جائے تو اُنہیں حضور ﷺ سے افضل اور فائق ماننا پڑے گا کیونکہ حضور ﷺ (معاذ اللہ) وفات پا چکے ہیں اور بہرحال زندگی، موت کی نسبت زیادہ افضل اور قیمتی ہوتی ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے اپنی قبورِ مبارکہ میں زندہ ہونے سے متعلق قرآن وحدیث میں متعدد مُسکت ثبوت موجود ہیں جنہیں ''حیاتِ انبیاء علیہم السلام'' کے عنوان کے تحت انشاء اللہ آئندہ صفحات میں بیان کیا جائے گا۔☆ مرزا قادیانی کے خود اختراعی عقیدے کے جواب میں بڑے ہی افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مرزا کے نزدیک افضل اور مفضول کے درمیان حیات (زندگی) ہی افضلیت کا معیار ہے۔ کم از کم ایک ذی ہوش اور باعقل انسان کے نزدیک یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ حیاتِ انسانی کی قدر و قیمت اُس کی ذاتی خوبیوں اور اوصافِ حمیدہ پر منحصر ہوتی ہے نہ کہ اُس کی زندگی پر۔ علاوہ ازیں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام جیسی مقدّس اور فخرِ کائنات ہستی کو وجہِ نزاع بنانا حماقت کی بات ہے اور مذہبی روح کے خلاف ہے کیونکہ قرآنِ مجید نے آپ کو تمام عالم کی مخلوقاتِ ارضی وسماوی پر فضیلت بخشی ہے اور یہ کہنے میں مؤلف حق بجانب ہے کہ پورا قرآنِ مجید نعتِ رسول ﷺ کا عطر بیز اور عطر فشاں گلدستہ ہے۔

حُسنِ یوسُف، دمِ عیسیٰ، یدِ بیضا داری آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

(۳) اگر عیسیٰ علیہ السلام آسمانوں میں زندہ ہیں تو وہاں اُن کے کھانے پینے کا کیا انتظام ہے اور رفع حاجت کہاں کرتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب بچہ شکمِ مادر میں تھا تو وہاں باورچی خانہ کہاں تھا؟ اور بیت الخلا کس جگہ بنا تھا؟ جو رب بچے کو ماں کے پیٹ میں باورچی خانہ اور ٹٹی خانہ کے بغیر نو ماہ زندہ رکھ سکتا ہے تو کیا وہ عیسیٰ علیہ

☆ سرِ دست اِسی انسائیکلوپیڈیا کی جلد اوّل کے صفحات ۱۴۵ تا ۱۴۷ اور جلد چہارم کے صفحات ۱۶۸۲، ۱۶۸۳ کا مطالعہ کرلیا جائے تو انشاء اللہ فائدہ ہوگا۔

السلام کو ان ضرورتوں کے بغیر زندہ نہیں رکھ سکتا؟ اب اُن کی زندگی فرشتوں کی سی ہے۔ دجّال کی آمد پر مسلمان ذکرِ الٰہی سے زندگی گزاریں گے۔ بعض اولیاء اللہ نے برسوں غذا نہ کھائی اور ذکرِ الٰہی سے زندہ رہے۔ ایسے ہی عیسیٰ علیہ السلام ذکر اللہ سے زندہ ہیں۔ (تفسیر نعیمی، جلد سوم، ص ۳۰۵)

نزولِ مسیح کی حکمتیں: (۱) نزولِ مسیح علیہ السلام میں یہود کے اِس زعمِ باطل کا ردّ ہے کہ ہم نے عیسیٰ کو صلیب پر چڑھا کر اُن کا چراغِ زندگی گل کر دیا۔ رب تعالیٰ اُنہیں آسمان سے زمین پر نازل فرما کر اُن کے جھوٹ کو ظاہر فرما دے گا۔ (۲) نزولِ مسیح علیہ السلام میں نصاریٰ کے جھوٹے دعووں کا ردّ ہے جو وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق کرتے رہے۔ وہ اُنہیں خدا یا خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔ (۳) ایک اور وجہ عیسیٰ علیہ السلام کی وہ دعا ہے جسے حافظ ابن حجر عسقلانی نے ''فتح الباری'' میں بیان کیا جس کا حوالہ گزشتہ صفحہ ۲۶۳۵ کے نمبر (۵) کے تحت دیا جا چکا ہے۔

عیسیٰ علیہ السلام سے عقیدہ کی بابت یہود و نصاریٰ کا باہمی اختلاف: یہود اور نصاریٰ دونوں اگرچہ عیسیٰ علیہ السلام کے مصلوب و مقتول ہونے میں باہم متفق ہیں، تاہم اس ضمن میں اُن کے عقیدے کی بنیاد ایک متضاد قاعدے پر مبنی ہے۔ یہود قتل و صلیب کی وجہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اُن کے نزدیک وہ (معاذ اللہ) ''مسیحِ ضلالت'' تھے اور نصاریٰ وجہِ صلیب یہ بتاتے ہیں کہ وہ خدا کے بیٹے تھے جو کائنات کے گناہوں کا کفارہ بننے کے لئے بھیجے گئے تھے تاکہ پاپی دنیا پاپ سے پاک ہو جائے اور صدیوں بعد جب قرآن مجید نے ''امرِ حق'' کو واضح اور مسیح ابن مریم سے متعلق حقیقتِ حال کو روشن کیا تب بھی دونوں جماعتوں نے جماعتی حیثیت سے اُسے قبول کرنے سے انکار کر دیا لہٰذا قدرتِ حق کا فیصلہ ہوا کہ خود مسیح بن مریم علیہما السلام ہی وقتِ موعود پر نازل ہو کر قرآن کے فیصلہ کی تصدیق کر دیں اور یہود و نصاریٰ کے باطل عقائد کا خود بخود اس طرح خاتمہ ہو جائے اور اس کے بعد مدعیانِ اہلِ کتاب کو شرک و باطل کی پیروی کے لئے کوئی گنجائش باقی نہ رہے اور اللہ کی حجت اُن پر تمام ہو جائے۔

جیسا کہ اوپر بیان ہوا، سورۃ النساء کی آیات ۱۵۷، ۱۵۸ میں قرآنِ مجید نے واضح طور پر اعلان کیا کہ عیسیٰ علیہ السلام کے مصلوب و مقتول ہونے کا عقیدہ ایک لعنت ہے اور سراسر نقصان و ذلت کا سودا ہے۔ اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کے ذریعے گناہوں کے کفارہ کا عقیدہ بھی کھلی گستاخی اور اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھنے سے کم نہیں۔

قرآنِ مجید اور عقیدہ تثلیث (Doctrine of TRINITY): نصاریٰ کا بہ بانگ دہل یہ دعویٰ ہے کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکار ہیں لیکن دراصل وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے پیغمبر عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات سے بہت دُور ہو گئے کیونکہ انہوں نے اپنے مذہب میں عقیدۂ تثلیث کو شامل کر لیا۔ اس عقیدے کی بنیاد عجیب تضادات (Antinomianism) پر ہے۔

عقیدۂ تثلیث ہے کیا چیز؟ اور ''اَب'' ''اِبن'' اور ''رُوح القُدُس'' کی تعبیرات کی حقیقت کیا ہے۔ یہ مسئلہ بھی مسیحیت کے اُن مباحث میں سے ہے جن کا فیصلہ کن جواب کبھی نہ مل سکا اور جس قدر اُسے صاف اور واضح کرنے کی کوشش کی گئی، اس میں الجھاؤ اور پیچیدگی کا اضافہ ہی ہوتا گیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ جس عقیدہ کو مسیحیت

میں اُساسی اور بنیادی حیثیت حاصل تھی، وہی ''معمہ'' بن کر رہ گیا اور قدیم و جدید علمائے نصاریٰ کو یہ کہنا پڑا کہ تثلیث میں توحید ہے اور توحید میں تثلیث۔ یہ مذہب کا ایسا مسئلہ ہے جو دنیا میں حل نہیں ہو سکتا اور دوسرے عالم میں پہنچ کر ہی یہ عقیدہ حل ہوگا۔ اس لئے یہاں اُسے عقل سے سمجھنے کی کوشش کرنا فضول ہے بلکہ خوش عقیدگی کے ساتھ قبول کر لینا ہی نجات کی راہ ہے چنانچہ اواخر اُنیسویں صدی کے مشہور عیسائی عالم پادری فنڈر (Funder) نے ''میزان الحق'' میں یہی بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔''

''تاہم اِس صنم پرستانہ فلسفہ کی جو تشریحات کی گئی ہیں، اُنہیں مختصر طور پر یوں سمجھنا چاہئے کہ اِس کائناتِ ہست و بود کو جس میں ہم بس رہے ہیں ''عالم ناسوت'' کہا جاتا ہے اور ملاءِ اعلیٰ جس کا تعلق عالمِ غیب سے ہے، وہ اور اُس سے ماوراء جہاں نہ زمین و زماں اور نہ مکین و مکاں کا گزر ہے، جہاں سب کچھ ہے لیکن مادیت سے بالاتر اور وراء الوراء ہے، اُس کا نام عالمِ لاہوت'' ہے۔ تو جب زیر و بالا اور بلند و پست کچھ بھی نہ تھا اور ازل کی غیر محدود وسعت میں ''وقت'' ایک بے معنی لفظ تھا، اُس وقت تین اقنوم تھے: ''باپ'' ''بیٹا'' اور ''روح القدس'' اور ان ہی تین اقانیم کی مجموعی حقیقت کا نام ''خدا'' ہے۔ رومن کیتھولک، پروٹسٹنٹ اور اِن دونوں سے جدا کلیسہِ شرقی تینوں ہی اس پر متفق ہیں اور اِسی کو دینِ مسیحیت کی روح یقین کرتے ہیں اور بڑی جسارت کے ساتھ دعویٰ کرتے ہیں کہ ''کتابِ مقدس'' کی تصریحات اِسی کا اعلان کرتی ہیں۔'' (قصص القرآن، ج ۴، ص ص ۱۹۲، ۱۹۳)

''اس عجوبہِ روزگار عقیدہ نے اس حد پر پہنچ کر جو نئے نئے مباحث وافکار پیدا کئے، اُن کا مطالعہ کرنے سے دیدہِ حیرت اور چشمِ عبرت کے لئے بہت کچھ سامان مہیا ہو جاتا ہے۔ بڑی بڑی مذہبی کونسلوں، بڑے بڑے کلیساؤں کے بشپوں اور پاپاؤں نے اِس عقیدہ کی تشریح میں درج ذیل عجیب وغریب مباحث پیدا کئے:۔

''باپ: اقانیمِ ثلاثہ میں ''اَب'' یعنی باپ پہلا اقنوم ہے۔ اسی سے اقنومِ ثانی کی ولادت ہوئی اور عالمِ لاہوت میں یہ کبھی بھی دوسرے اور تیسرے اقانیم سے جدا نہیں ہوا، مگر مسیحی فرقوں میں کنیسہ کی عام تعلیم کے مطابق اکثر فرقے یہ کہتے ہیں کہ وحدتِ لاہوت میں تینوں کا درجہ مساوی ہے اور کسی کو کسی پر برتری حاصل نہیں ہے اور آریوسی کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے بلکہ دوسرا اقنوم ''بیٹا'' اقنومِ اوّل کی طرح ازلی نہیں ہے، البتہ عالمِ پست و بالا سے غیر معلوم مدت پہلے اقنومِ اوّل سے پیدا ہوا ہے۔ اس لئے اس کا درجہ ''باپ'' کے بعد اور اس سے کم ہے۔ مقدونی فرقہ کہتا ہے کہ صرف دو ہی اقنوم ہیں: ''باپ'' اور ''بیٹا''۔ ''روح القدس'' مخلوق ہے اور فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے جس کا پایہ تمام ملائکۃ اللہ سے بلند ہے۔ طلیطلہ کی کونسل کا یہ فیصلہ ہے کہ روح القدس ''باپ'' اور ''بیٹا'' دونوں سے پھوٹ کر نکلی ہے مگر قسطنطنیہ کی کونسل روح القدس کو صرف باپ ہی سے صادر ہونا بتلاتی ہے اور قدیم و جدید فرقوں میں سے ایک بڑی جماعت اقنومِ ثالث مریم علیہا السلام کو تسلیم کرتی اور روح القدس کے اقنوم ہونے کا انکار کرتی ہے۔''

''بیٹا: یہ اُس شکلِ انسانی پر بولا جاتا ہے جو عام قانونِ قدرت کے مطابق مرد و عورت کے جنسی تعلقات

کا نتیجہ ہوتا ہے مگر عقیدہ تثلیث کے مطابق وہ عالمِ لاہوت میں ''باپ'' سے جدا بھی نہیں ہے اور پیدا بھی ہے اور پھر بعض کے نزدیک اس کی پیدائش ازلی ہے اور بعض کے نزدیک غیر ازلی۔ آگے چل کر کہتے ہیں کہ جب ''باپ'' کی مشیت کا فیصلہ ہوا تو اقنومِ ثانی ''بیٹا'' عالمِ ناسوت (کائناتِ ہست و بود) میں مریم کے بطن سے پیدا ہو کر ''مسیح'' کہلایا اور بعض کا تو یہ دعویٰ ہے کہ خود باپ ہی عالمِ ناسوت میں بیٹا بن کر مریم کے بطن سے پیدا ہوا اور مسیح کی شکل میں روشناس ہوا۔ طرفہ تماشا یہ کہ بعض کے نزدیک تو اقنومِ ثانی ''اِبن'' کو اقنومِ اوّل ''اَب'' پر برتری اور تفوق حاصل ہے۔''

''رُوحُ القُدُس: اسی طرح ''رُوح القُدُس'' کے متعلق بھی سخت اختلاف ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ وہ اقنوم ہی نہیں ہے اس لئے عالمِ لاہوت میں اُسے الوہیت حاصل نہیں ہے۔ مقدونی اور آریوسی کہتے ہیں کہ وہ ملائکۃ اللہ میں سے ہے اور ان میں سب سے برتر و بلند ہے۔ ماراتو ینوس کہتا ہے کہ روح القدس کی تعبیر مجاز ہے اور اللہ تعالیٰ کے افعال پر مجازاً اس کا اطلاق کیا جاتا ہے ورنہ الگ سے اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس بنا پر اس قول کے قائلین کو ''مجازیین'' کہا جاتا ہے اور علمائے جدید میں کلارک کہتا ہے کہ الہامی کتابوں (عہد نامہ قدیم و جدید) میں کسی ایک جگہ بھی ''الوہیت'' کا درجہ نہیں دیا گیا۔ فرقہ مقدونی نے الوہیتِ روح القدس کا انکار کرتے ہوئے شدّ و مد سے یہ کہا ہے کہ اگر جوہرِ اُلوہیت میں روح القدس کو بھی دخل ہوتا تو یا وہ مولود ہوتی یا غیر مولود۔ اگر مولود ہے تو اُس کے اور ''ابـــــن'' کے درمیان کیا فرق رہا اور اگر غیر مولود ہے تو اُس کے اور ''اَب'' کے درمیان کیا امتیاز ہے؟ ان کے مقابلہ میں دوسری جماعتیں کہتی ہیں کہ ''روح الـــقُــدُس'' کو بھی اُلوہیت حاصل ہے۔ بعض کلیسہ ''روح القدس'' کا فقط اقنومِ اول (باپ) سے صادر ہونا مانتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ ''باپ'' اور ''بیٹا'' دونوں سے اس کا صدور ہوا ہے۔ یہ اختلاف بھی عیسائی فرقوں کے درمیان سخت کشاکش کا سبب رہا ہے۔ کیونکہ ۳۸۱ عیسوی میں منعقدہ کونسل قسطنطنیہ نے ''منشورِ ایمانی'' میں یہ واضح کر دیا تھا کہ روح القدس کا صدور ''باپ'' ہی سے ہوا ہے اور عرصہ تک یہی عقیدہ مسیحی دنیا میں نافذ رہا لیکن ۴۴۷ عیسوی میں اوّل ہسپانیہ کے کلیسہ نے، پھر فرانس کے کلیسہ نے اور اس کے بعد تمام لاطینی رومن کلیساؤں نے اس ترمیم کو جزوِ عقیدہ بنا لیا کہ ''روح القدس'' کا صدور اقنومِ اوّل (باپ) اور اقنومِ ثانی (بیٹا) دونوں سے ہوا ہے۔ عیسائی علماء کہتے ہیں کہ دراصل یہ بحث ۸۶۶ عیسوی میں سب سے پہلے شرق کے بطرق فوتیوس نے اس لئے پیدا کی کہ اُن کی اور اُن کی جماعت کی یہ خواہش تھی کہ کسی طرح شرق (یونان) کے کلیسہ کو غرب و روم کے کلیسہ سے جدا کر دیا جائے اور مشرق و مغرب کے کلیساؤں کا اتحاد باقی نہ رہنے دیا جائے۔'' (''قصص القرآن''۔ حفظ الرحمن سیوہاروی، ج ۴، ص ص ۱۹۲ تا ۱۹۸)

عقیدہِ تثلیث کے بارے میں مسیحیت کے اکابرین کی آراء: (۱) ''عقیدہِ تثلیث ایسے ہی واضح ہے جیسے ایک شفاف کپ میں پانی رکھا ہو، کہ تین ہستیاں ہیں جن میں سے ہر ایک خدا اور ہر ایک مالک ہے۔'' ("The True Christian Religion"... Swedenborg, p. 244)

(۲) ''اس طرح دنیائے عیسائیت شرک میں مشرکین کی طرح ملوث ہوگئی ہے۔ عیسائیوں نے خدائے واحد کو زبانی طور پر تسلیم کیا جبکہ فی الحقیقت اُن کا ایمان تین ہستیوں پر ہے جن میں سے اُن کے نزدیک ہر ایک خدا اور اللہ ہے۔'' (ایضاً ص ۸۱۷)

(۳) ''مسیحیت کے عقیدہ تثلیث میں تین ہستیوں کو اِلٰہ کا درجہ حاصل ہے جن میں سے ہر ایک خدا اور ہر ایک ربّ ہے۔۔۔اس عقیدے سے ذہنِ انسانی ایک ایسے خلفشار سے دوچار رہا ہے کہ اُسے یہ معلوم نہیں کہ آیا خدا ایک ہے یا تین ہیں۔ایک خدا تو اُن کے ہونٹوں پر ہے جبکہ اُن کے خیالات میں خدا تین ہیں۔'' (ایضاً ص ۵)

(۴) ''مذہب عیسائیت کے مرکزی اصول کا صرف یہی مطلب ہے کہ دراصل خدا تین نمایاں ہستیوں کا مجموعہ ہے: باپ' بیٹا اور روح القدس۔یہ تینوں ہستیاں درجہ و مرتبہ میں باہم مساوی' ہمیشہ قائم و دائم اور ایک ہی قدر و قیمت کی حامل ہیں اور وہ تینوں ایک جیسی شان و شوکت اور ایک جیسی تعظیم و تقدیس کا استحقاق رکھتی ہیں۔''

(Pallen and Wynne's New Catholic Dictionary)

(۵) ''عقیدہ تثلیث جو تا ہنوز عیسائیوں کے عقیدہ میں تین بڑی جزئیات کو شامل ہے' اس خیال کو حدِ کمال تک پہنچاتا ہے کہ عیسائیت کا ایک خدا دراصل تین مختلف ہستیوں سے بنا ہے یعنی ایک خدا ''باپ'' ہے دوسرا خدا ''عیسیٰ (علیہ السلام)'' ہے اور تیسرا خدا ''روح القدس'' ہے۔یہ ''روح القدس'' ایک ایسی عارفانہ ہستی ہے جس کے ''باپ'' اور ''بیٹے'' کے ساتھ ناقابلِ فہم تعلق نے لاکھوں عیسائی علماء اور پادریوں کے ذہنوں پر گزشتہ اُنیس صدیوں سے شدید زور ڈالا ہوا ہے۔''

("Riddle of the Universe"... Haeckel, p. 227)

قرآن اور عقیدہ تثلیث: نزولِ قرآن کے وقت جمہور مسیحی جن بڑے فرقوں میں تقسیم تھے' تثلیث کے متعلق اُن کا عقیدہ تین جدا جدا اصولوں پر مبنی تھا۔ایک فرقہ کہتا تھا کہ مسیح عین خدا ہے اور خدا ہی بشکلِ مسیح دنیا میں اتر آیا ہے۔دوسرا فرقہ کہتا تھا کہ مسیح ابن اللہ (خدا کا بیٹا) ہے اور تیسرا کہتا تھا کہ وحدت کا راز تین میں پوشیدہ ہے: باپ' بیٹا اور مریم۔اور اس جماعت میں بھی دو گروہ تھے اور دوسرا گروہ حضرت مریم کی جگہ ''روح القدس'' کو اقنومِ ثالث کہتا تھا۔غرض وہ حضرت مسیح کو ثَالِثُ ثَلٰثَة (تین میں کا تیسرا) تسلیم کرتے تھے۔اس لئے قرآن کی صدائے حق نے تینوں جماعتوں کو جدا جدا بھی مخاطب کیا ہے اور یکجا بھی اور دلائل و براہین کی روشنی میں مسیحی دنیا پر یہ واضح کر دیا ہے کہ اس بارہ میں راہِ حق ایک اور صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ مسیح مریم کے بطن سے پیدا شدہ انسان اور اللہ کا سچا پیغمبر اور رسول ہے۔باقی جو کچھ بھی کہا جاتا ہے وہ باطلِ محض ہے' خواہ اُس میں تفریط ہو جیسا کا یہود کا عقیدہ ہے کہ العیاذ باللہ آپ علیہ السلام شعبدہ باز اور مفتری تھے۔یا افراط ہو جیسا کہ نصاریٰ کا عقیدہ ہے کہ وہ (العیاذ باللہ) خدا ہیں اور خدا کے بیٹے ہیں یا تین میں کے تیسرے ہیں۔

قرآنِ عزیز نے صرف یہی نہیں کیا کہ نصاریٰ کے تردیدی پہلو کو ہی اس سلسلہ میں واضح کیا ہو بلکہ اس کے علاوہ حضرت مسیح علیہ السلام کی شانِ رفیع کی اصل حقیقت کیا ہے اور عنداللہ اُنہیں کیا قربت حاصل ہے' اس پر بھی نمایاں روشنی ڈالی ہے تاکہ اس طرح یہود کے عقیدہ کی بھی تردید ہو جائے اور افراط و تفریط سے جدا راہِ حق آشکارا نظر آئے۔

مسیح علیہ السلام اللہ کے مقرب بندے اور برگزیدہ رسول ہیں: قَالَ اِنِّیْ عَبْدُاللّٰہِ

آتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا O وَجَعَلَنِیْ مُبٰرَکًا اَیْنَ مَا کُنْتُ وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ مَا دُمْتُ حَیًّا O وَبَرًّا بِوَالِدَتِیْ وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا O وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَیَوْمَ اَمُوْتُ وَیَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا O (مریم : ۳۰-۳۳)

''(وہ بچہ) بول اٹھا: میں اللہ کا بندہ ہوں' اُس نے مجھے کتاب دی اور اُس نے مجھے نبی بنایا اور اُسی نے مجھے بابرکت بنایا میں جہاں کہیں بھی ہوں اور اُس نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا جب تک میں زندہ رہوں۔ اور مجھے میری والدہ سے نیکی کرنے والا بنایا اور مجھے سرکش و بدبخت نہیں بنایا اور میرے اوپر سلامتی ہے جس روز میں پیدا ہوا اور جس روز میں مروں گا اور جس روز میں زندہ کر کے اُٹھایا جاؤں گا۔'' (۱۹ : ۳۰-۳۳)

اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَیْهِ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ O وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِی الْاَرْضِ یَخْلُفُوْنَ O وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوْنِ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ O (الزّخرف : ۵۹-۶۱)

''وہ (عیسیٰ علیہ السلام) تو بس ہمارے ایک بندے تھے کہ اُن پر ہم نے اپنا فضل کیا تھا اور اُنہیں بنی اسرائیل کے لئے ایک نمونہ بنایا تھا اور اگر ہم چاہتے تو ہم تم سے فرشتے پیدا کر دیتے جو زمین میں یکے بعد دیگرے رہا کرتے۔ اور وہ (عیسیٰ علیہ السلام) قیامت کے یقین کا ایک ذریعہ ہیں تو تم لوگ اس میں شک مت کرو اور تم لوگ میری پیروی کرو' یہی سیدھی راہ ہے۔'' (۴۳ : ۵۹-۶۱)

''اور اگر ہم چاہتے تو ہم تم سے فرشتے پیدا کر دیتے۔ الخ'' یعنی یہ چیز تو مسیح علیہ السلام کی بِن باپ پیدائش سے کہیں بڑھ کر ہوتی۔ مطلب یہ کہ اللہ تو ہر چیز پر قادر ہے اور بے باپ کی ولادت سے بھی کہیں زیادہ عجیب و غریب چیزوں پر خوب قدرت رکھنے والا ہے۔'' (تفسیر ماجدی اردو' ص ۹۸۶' نوٹ: ۴۸)

''اس کا دوسرا معنی یہ ہے کہ اے لوگو! اگر ہم چاہتے تو ہم تم سے فرشتوں کو پیدا کر دیتے اور تمہارے بعد فرشتے زمین پر اس طرح رہتے جس طرح تمہاری اولاد تمہارے بعد رہتی ہے اور جس طرح ہم نے عیسیٰ کو عورت سے بغیر مرد کے پیدا کر دیا تاکہ تم ہماری عظیم قدرت کو پہچانو اور تم یہ جان لو کہ فرشتوں کا بھی اسی طرح پیدا ہونا ممکن ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے بہت بلند ہے کہ فرشتے اُس کی بیٹیاں ہوں۔'' (''تبیان القرآن''۔ علامہ غلام رسول سعیدی' جلد دہم' ص ۷۰۳)

''اور وہ (عیسیٰ علیہ السلام) قیامت کے یقین کا ایک ذریعہ ہیں۔'' اس میں اشارہ ہے مسیح علیہ السلام کی آمدِ ثانی کی طرف یعنی آپ کا دوبارہ ظہور قربِ قیامت کی ایک یقینی علامت ہے۔ (ماجدی اردو' ص ۹۸۶)

وَاِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْ بَعْدِی اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ (اَلصّفّ : ۶)

۲۶۴۱ (عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کی والدہ)

"اور (وہ وقت بھی قابلِ ذکر ہے) جب عیسیٰ بن مریم نے کہا کہ اے بنی اسرائیل! میں تمہارے پاس اللہ کا پیغمبر آیا ہوں' تورات کی تصدیق کرنے والا ہوں جو مجھ سے پیشتر سے ہے اور ایک رسول (معظم) کی بشارت دینے والا ہوں جو میرے بعد آنے والا ہے جن کا نام احمد ہوگا۔" (۶ : ۶۱)

اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ اِس مختصر سے فقرے کے اندر ہی بہت سی گمراہیوں کی تردید آ گئی۔ اور اس کا اثبات ہوا کہ (۱) عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت بنی اسرائیل کی جانب تھی' کُل دنیا کی جانب نہ تھی۔ (موجودہ مسیحیت کی تردید)۔
(۲) اس کا اثبات کہ آپ حق تعالیٰ کی طرف سے رسولِ برحق تھے۔ نعوذ باللہ کوئی مفتری نہ تھے (یہود کی تردید)۔
(۳) آپ حق تعالیٰ کے ایک مقرب ترین بندہ تھے۔ خود الوہیت کے مدعی کسی معنی میں بھی نہ تھے (مسیحیت کی تردید)۔

"انجیل برنابا کے نام سے آج جو انجیل حواری برنابا کی جانب منسوب' دنیا میں موجود ہے' اُس میں تو یہ پیش گوئیاں بہت صاف اور کھلے لفظوں میں ہیں لیکن خود مسیحیوں کو بھی جو چار انجیلیں مسلّم ہیں' اُن میں سے بھی ایک میں یہ عبارتیں آج تک مل رہی ہیں۔۔۔۔ مسیحی جس یونانی لفظ کے ترجمہ سے خود مطمئن نہیں ہیں اور اس کا ترجمہ کبھی "تسلی دہندہ" سے کرتے ہیں' کبھی "مددگار" سے اور کبھی "وکیل"' کبھی "شفیع" سے' وہ اصل میں PERICLUTOS ہے جو صحیح ترجمہ لفظ "احمد" ہی (بمعنی محمود وستودہ) کا ہے۔" (تفسیر ماجدی اردو' ص ۱۱۰۴' نوٹ: ۸)

مسیح علیہ السلام نہ خدا ہیں اور نہ خدا کے بیٹے: لَقَدْ کَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ قُلْ فَمَنْ یَّمْلِکُ مِنَ اللّٰہِ شَیْئًا اِنْ اَرَادَ اَنْ یُّھْلِکَ الْمَسِیْحَ ابْنَ مَرْیَمَ وَ اُمَّہٗ وَ مَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا وَلِلّٰہِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَھُمَا یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ (المائدۃ: ۱۷)
"وہ لوگ یقیناً کافر ہو گئے جنہوں نے کہا کہ خدا ہی تو عین مسیح ابنِ مریم ہے۔ آپ فرما دیجئے کہ اچھا اگر وہ ہلاک کر دینا چاہے مسیح ابنِ مریم اور اُن کی والدہ کو اور جو کوئی بھی زمین پر ہے سب کو' تو اللہ سے کون کسی کو بچا سکے اور آسمانوں پر اور زمین پر اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے' اُس سب پر اللہ ہی کی حکومت ہے' وہ جو کچھ چاہے پیدا کر دیتا ہے۔" (۵ : ۱۷)

لَقَدْ کَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ وَقَالَ الْمَسِیْحُ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اعْبُدُوا اللّٰہَ رَبِّیْ وَرَبَّکُمْ اِنَّہٗ مَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰہُ عَلَیْہِ الْجَنَّۃَ وَمَاْوٰہُ النَّارُ وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ
"وہ لوگ یقیناً کافر ہو گئے جنہوں نے کہا کہ خدا ہی تو عین مسیح ابنِ مریم ہے۔ حالانکہ خود مسیح نے کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل! میرے پروردگار اور اپنے پروردگار (یعنی) اللہ کی عبادت کرو۔ جو کوئی اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرے گا تو اللہ اُس پر جنت حرام کر دے گا اور اُس کا ٹھکانا دوزخ کی آگ ہے اور (ایسے) ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔" (۵ : ۷۲)

یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰہِ اِلَّا الْحَقَّ اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ

۲۶۴۲ (عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کی والدہ)

مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ اَلْقَاهَا اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَاتَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ سُبْحٰنَهٗ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝ (النساء : ۱۷۱)

''اے اہلِ کتاب! اپنے دین میں مبالغہ نہ کرو اور اللہ کے بارے میں حق کے سوا کوئی بات نہ کہو۔ مسیح عیسیٰ ابنِ مریم تو بس اللہ کے پیمبر اور اُس کا کلمہ ہی ہیں جسے اللہ نے مریم تک پہنچایا تھا اور اُس کی طرف سے روح ہیں' پس اللہ اور اُس کے پیمبروں پر ایمان لے آؤ اور یہ نہ کہو کہ خدا تین ہیں' (اس سے) باز آجاؤ' تمہارے حق میں یہی بہتر ہے۔ اللہ تو بس ایک ہی معبود ہے' وہ اس سے پاک ہے کہ اُس کے بیٹا ہو' جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے' (سب) اُسی کا ہے اور اللہ ہی کارساز ہونا کافی ہے۔'' (۴ : ۱۷۱)

دین میں غلو اور مبالغہ کرنا یہ ہے کہ عقائد و مسائل میں اضافہ و افراط کو اپنی طرف سے داخل کر دیا جائے خواہ کسی نیت سے ہو۔ اہلِ کتاب سے یہاں مراد اہلِ انجیل یعنی نصاریٰ ہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام کے کَلِمَۃُ اللّٰہ ہونے کا یہ معنیٰ ہے کہ آپ بغیر کسی واسطہ اور نطفہ کے محض اللہ تعالیٰ کے کلمہ کُنْ اور اُس کے امر سے پیدا ہوئے جیسا کہ سورہ آلِ عمران کی آیت ۵۹ میں فرمایا گیا۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ ہر انسان اللہ کے کُنْ فرمانے سے پیدا ہوتا ہے تو پھر ہر انسان کو کَلِمَۃُ اللّٰہ ہونا چاہیے' عیسیٰ علیہ السلام کی کیا تخصیص ہے؟ اس کا جواب امام غزالی نے یہ دیا ہے کہ ہر انسان کی پیدائش کا ایک سببِ قریب ہے اور ایک سببِ بعید ہے۔ سببِ قریب نطفہ ہے اور سببِ بعید اللہ کا کُنْ فرمانا ہے۔ چونکہ عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا کوئی سببِ قریب نہیں تھا' اس لئے اُنہیں خصوصیت کے ساتھ کُنْ کی طرف نسبت دی گئی ورنہ ہر انسان بلکہ دنیا کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کے کلمہ کُنْ سے ہی پیدا ہوئی ہے۔ کَلِمَۃُ اللّٰہ کی وہ بشارت ہے جو حضرت مریم سلام اللہ علیہا کو عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے سلسلہ میں دی گئی تھی (بحوالہ سورہ آلِ عمران: ۴۵)۔

عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کی طرف سے رُوح کہنے کی متعدد وجوہ ہیں: (۱) جب کوئی چیز بہت زیادہ طاہر اور نظیف ہو تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ روح ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام چونکہ نطفہ کی آمیزش کے بغیر محض نفخ جبریل سے پیدا ہوئے تھے اس لیئے وہ عام انسانوں کی بہ نسبت بہت طاہر اور طیب تھے' اس لئے اُنہیں روح فرمایا گیا۔ (۲) آپ اپنی نبوّت اور تبلیغ کی وجہ سے لوگوں کے دین میں حیات پیدا کرنے کا سبب تھے اور اُن میں روحانیت پیدا کرنے کا باعث تھے' اس لئے اُنہیں رُوح فرمایا گیا جس طرح سورۃُ الشُّورٰی کی آیت ۴۲ میں قرآن مجید کو رُوح فرمایا گیا۔ (۳) آپ لوگوں سے برائیوں کو دُور کرتے اور اُنہیں نیکیوں سے آراستہ کرتے اور لوگوں کے حق میں یہی رحمت ہے کہ اُنہیں شر سے نکال کر خیر کی طرف لایا جائے اس لحاظ سے آپ اللہ کی طرف سے رحمت ہیں جیسا کہ سورۃ المُجادلۃ کی آیت ۲۲ میں فرمایا: وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ یعنی اُن کی اپنی طرف سے رحمت سے تائید فرمائی۔ (۴) کلامِ عرب میں روح پھونک کو کہتے ہیں۔ جبریل علیہ السلام نے حضرت مریم کے گریبان میں پھونک ماری تھی جس سے حضرت عیسیٰ پیدا ہوئے اس لئے اُنہیں رُوح فرمایا گیا اور چونکہ یہ پھونک اللہ کے اِذن اور اُس کے اَمر سے تھی' اس لئے فرمایا گیا رُوْحٌ مِّنْهُ (وہ اللہ کی طرف سے روح ہیں)۔ سورۃُ التَّحریم کی آیت ۱۲ میں بھی پھونک پر روح کا اطلاق ہے: فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا (تو ہم نے مریم کے چاکِ گریبان میں اپنی طرف سے بہ ساطت جبریل روح پھونک دی)۔

۲۶۴۳ (عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کی والدہ)

رُوح کی اللہ کی طرف اضافت تعظیم اور تشریف کے لئے ہے یعنی آپ اللہ کی طرف سے پسندیدہ، معظم اور عالی قدر روح ہیں جس طرح بیتُ اللہ اور ناقۃُ اللہ کہا گیا ہے۔

جیسا کہ بیان ہوا، عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق تین خدا ہیں: اللہ، عیسیٰ اور مریم اور وہ انہیں اقانیم ثلاثہ کہتے ہیں اور ہر اقنیم کا دوسری اقنیم میں حلول مانتے ہیں۔ عیسائیوں کا ایک اور فرقہ اللہ، عیسیٰ اور روح القدس کو تین خدا مانتا ہے۔ عیسائی ان تینوں کو الگ الگ خدا بھی مانتے ہیں اور ان تینوں کو ایک خدا بھی کہتے ہیں۔ آیت میں فرمایا گیا کہ یہ نہ کہو کہ تین خدا ہیں یا تین اقانیم ہیں اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کی عین ہے اور ان میں سے ہر ایک کامل خدا ہے اور اُن کا مجموعہ بھی ایک خدا ہے کیونکہ اس نظریہ سے اُس توحیدِ خالص کا انکار ہوتا ہے جس کی دعوت عیسیٰ علیہ السلام نے دی۔ تثلیث کو جمع کرنا غیر معقول ہے اور اجتماع الاضداد ہے۔

پھر فرمایا کہ اللہ واحد ہے، مستحقِ عبادت صرف وہی ہے۔ وہ تعدّد، اجزاء اور اقانیم سے منزّہ ہے اور نہ وہ اجزاء سے مرکّب ہے کیونکہ مرکب اپنے اجزاء کا محتاج ہوتا ہے اور جو کسی کی طرف محتاج ہو وہ خدا نہیں ہوسکتا۔ وہ سُبحان ہے یعنی وہ ہر عیب سے مکمل طور پر پاک ہے: (۱) بیٹا باپ کی جنس سے ہوتا ہے، رب جنسیت سے پاک ہے۔ (۲) اولاد کی ضرورت مغلوب کو ہوتی ہے۔ کبھی تو شہوت سے مغلوب ہوکر جماع کرتا ہے جس سے اولاد ہوجاتی ہے، کبھی دشمنوں کی قوّت سے مجبور ہوکر اولاد کی خواہش کرتا ہے جو قوّتِ بازو بنے اور اس کے ذریعے رشتہ داریاں بڑھیں اور وہ مجبور ہوکر نہ رہے۔ رب تعالیٰ ہر طرح کی مغلوبیت سے پاک، لہٰذا اولاد سے پاک۔ (۳) بیٹا باپ کا جز ہوتا ہے، رب اس سے بھی پاک ہے۔ (۴) بیٹا حاصل کرنے میں بیوی کا تعاون ضروری ہے، رب دوسرے کی امداد سے بھی پاک۔ (۵) بیٹے کے لئے رب کی بیوی ماننا ہوگی اور رب بیوی سے بھی پاک ہے۔ (۶) ضروری ہے کہ بیوی شوہر کی کُفو یعنی مثل ہو اور رب مثلیت سے پاک ہے۔ (۷) اولاد کے لئے مادّے کا ہونا لازم ہے جس سے رب کا مادّی ہونا لازم آتا ہے اور وہ مادّہ سے پاک، لہٰذا اولاد سے بھی پاک ہے۔

''جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اُسی کا ہے'' اگر رب کی کوئی اولاد ہوتی تو رب تعالیٰ بعض کا مالک ہوتا اور بعض کی مالک اُس کی اولاد یا بیٹا ہوتا کیونکہ اولاد باپ کے مال کی ایک طرح مالک و قابض ہوتی ہے۔ لیکن آسمان و زمین کی سب چیزیں بلاشرکتِ غیرے اللہ ہی کی ہیں۔ ثابت ہوا کہ اُس کا کوئی بیٹا اور اولاد نہیں ہے۔

مندرجہ بالا بحث سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ جہاں قرآن مجید یہودیوں کے تفریط پر مبنی عقیدے کے برعکس عیسیٰ علیہ السلام کی نبوّت کے مقامِ اعلیٰ کو اجاگر کرتا ہے، وہاں عیسائیوں کے افراط پر مبنی عقیدۂ تثلیث اور عیسیٰ علیہ السلام کے ابنُ اللہ (اللہ کا بیٹا) ہونے کی بھی پُرزور مذمّت کرتا ہے۔ کَلِمَۃ اور رُوح کی قرآنی اصطلاحات کا وہ معنیٰ نہیں جو عیسائی پادریوں نے سمجھا۔ جیسا کہ بیان ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کا بندہ ہونے میں عار محسوس نہیں کرتے جس طرح فرشتے عار محسوس نہیں کرتے۔ فخر الدین رازی کہتے ہیں کہ یہاں فرشتوں کے ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر عیسیٰ علیہ السلام کچھ مافوق الفطرت قوّتوں کے مالک ہیں، تو فرشتوں میں بھی ایسے کام کرنے کی استعداد ہے

جو انسانی طاقت سے ماوراء ہیں۔ لیکن اس کے باوجود فرشتے اللہ تعالیٰ کے عاجز بندے رہنے میں فخر محسوس کرتے ہیں اور اپنی کسی قوت کو اپنی ذاتی یا کسبی قوت نہیں سمجھتے بلکہ وہبی اور عطائی سمجھتے ہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام کا بھی یہی حال ہے۔ اسی مضمون کو جاری رکھتے ہوئے قرآن نے یہ بات ایک اور جگہ کسی اور ڈھنگ سے کی ہے:۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (المائدة : ۱۷)

''وہ لوگ یقیناً کافر ہو گئے جنہوں نے کہا کہ اللہ ہی تو مسیح ابن مریم ہے۔ آپ فرما دیجئے کہ اچھا اگر اللہ مسیح ابن مریم اور اُن کی والدہ کو اور جو کچھ بھی زمین پر ہے' ہلاک کر دینا چاہے تو اللہ سے کون اُنہیں ذرّہ بھر بھی بچا سکے گا اور آسمانوں پر اور زمین پر اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے' اُن (سب) پر اللہ ہی کی حکومت ہے' وہ جو کچھ چاہے پیدا کر دیتا ہے اور اللہ کو ہر چیز پر پوری قدرت ہے۔'' (۱۷ : ۵)

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ۝ (النّسآء : ۱۷۲)

''مسیح (علیہ السلام) ہرگز اللہ کا بندہ ہونے سے عار نہ کریں گے اور نہ ہی مقرب فرشتے' اور جو کوئی اللہ کی بندگی سے عار کرے گا اور تکبر کرے گا تو اللہ اپنے پاس سب کو جمع کرے گا۔'' (۱۷۲ : ۴)

اللہ کا بندہ ہونا کوئی توہین والی چیز نہیں۔ مسیح اور ملائکہ مقربین تو اس پر فخر کرتے ہیں نہ یہ کہ وہ عار محسوس کریں۔ سچ پوچھیں تو مراتبِ شرف میں عبدیّت مرتبہِ اعلیٰ ہے کہ ربِّ ذوالجلال والاکرام نے اپنے محبوب علیہ السلام کو عبد کے لقب سے نوازا (بحوالہ سورہ بنی اسرائیل : ۱ ؛ سورۃ النّجم : ۱۰ ؛ سورۃ الجِنّ : ۱۹ ؛ سورۃ العَلَق : ۱۰) اور نمازی ہر نماز میں آپ کی عبدیّت کا اقرار کرتا ہے۔

مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ كَانَا يَاْكُلَانِ الطَّعَامَ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝ (المائدة : ۷۵)

''مسیح ابنِ مریم سوائے ایک رسول کے اور کچھ نہیں ہیں' اُن سے قبل بھی اور رسول گزر چکے ہیں اور اُن کی والدہ ایک ولیّہ تھیں' دونوں ہی کھانا کھاتے تھے' دیکھئے ہم کس طرح صاف دلائل اُنہیں بیان کرتے ہیں' پھر دیکھئے کہ وہ کدھر کو اُلٹے چلے جا رہے ہیں۔'' (۷۵ : ۵)

فخر الدین رازی کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کی والدہ محترمہ کا کھانا کھانے میں دو باتیں بیان کی گئی ہیں: اوّل تو یہ کہ جس شخص کی تخلیق ماں سے ہوئی ہو' اُس کی زندگی کی کوئی نہ کوئی ابتدا ضرور ہوگی اور جس کی ابتدا ثابت ہو اُس کا مخلوق اور فانی ہونا لازمی امر ہے۔ دوم یہ کہ اس میں اس حقیقت کا حوالہ ہے کہ دونوں ماں

بیٹے پر دوسرے انسانوں کی طرح قانونِ قدرت برابر لاگو تھا جبکہ اللہ تعالیٰ حی وقیوم ہے اور اُسے کسی چیز کی احتیاج نہیں' لہٰذا اِن روشن دلائل کے مدِّ نظر عیسیٰ و مریم علیہا السلام خدا نہیں ہو سکتے۔

آیت کی ابتدا نے عیسیٰ علیہ السلام کا مرتبہ اور مقام واضح کر دیا جس میں ایک طرف تو مسیحی افراط کا ردّ آ گیا جو آپ کو اُوتار سمجھتے تھے تو دوسری طرف یہودی تفریط کا ردّ ہے جو معاذ اللہ آپ کو ایک شعبدہ باز ساحر قرار دیتے تھے۔ اِبنِ مریم کے الفاظ لا کر مسیح پرستوں کو یہ بتا دیا کہ مسیح تو ایک عورت' فانی عورت کے بطن سے پیدا ہوئے تھے' وہ بشر کے سوا اور کیا ہو سکتے ہیں! آپ سے پہلے بھی تمام انبیاء علیہم السلام نے عورت سے جنم لیا اور عیسیٰ علیہ السلام بھی اُنہی میں سے ایک رسول ہیں۔ صِدِّیقہ کے لفظ میں یہود کا پورا ردّ آ گیا جو معاذ اللہ آپ کی عصمت تک کو متہم کر رہے تھے۔ فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام اپنے تمام کمالاتِ بشری کے باوجود حوائجِ بشری سے منزّہ و بالاتر نہ تھے۔ مقدّس ماں اور اُن کا مقدّس تر فرزند دونوں بہر حال قوائے بشری ہی سے مرکب تھے اور کھانے' پینے اور ساری بشری ضرورتوں کے محتاج تھے۔ تو جو ایسے صاحبِ احتیاج ہوں' اُنہیں اُلوہیّت اور خدائی کا مرتبہ دیتے ہوئے تثلیث پرستوں کو شرم نہیں آتی؟ کہ وہ اِس طرح کے خرافات میں برابر پڑے ہوئے ہیں کہ ''باپ' بیٹا اور رُوح القدس'' تین جدا جدا اور مستقل اقنوم ہیں۔

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنّٰى يَكُوْنُ لَه' وَلَد'' وَّلَمْ تَكُنْ لَّه' صَاحِبَة'' وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْم'' O (الانعام : ۱۰۱)

''وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے' اُس کے اولاد کہاں سے ہو سکتی ہے درآنحالیکہ اُس کی بیوی ہی نہیں' اور اُسی نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور وہی ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔'' (۶ : ۱۰۱)

''یہ آیت ہندوؤں' بابِل کے لوگوں اور مصریوں کی طرح کئی لوگوں کے شرک کے ردّ میں ہے جن کا عقیدہ ہے کہ ہر دیوتا کی ایک نسوانی ساتھی یا بیوی ہے۔ ہندو شرک میں مزید پیشقدمی ہوئی۔ اُن کی مذہبی کتاب اُپنشد کے مطابق ''خدا کو بھی اولاد کی خواہش تھی اور اپنی تشہیر کے لئے وہ اپنے لئے بیوی چاہتا تھا۔'' ("Status of Women in Ancient India"... Indira, pp. 129-130)

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ نِ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِئُوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ O (التّوبة : ۳۰)

''اور یہود کہتے ہیں کہ عُزیر اللہ کے فرزندِ مجازی ہیں اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کے فرزندِ مجازی ہیں' یہ اُن کا قول ہے محض اُن کے منہ سے (بک دینے کا)' یہ بھی اُنہی لوگوں کی طرح ایسی باتیں کرنے لگے جو اُن سے پہلے کافر ہو چکے ہیں' اللہ اُنہیں غارت کرے' وہ کدھر بہکے جا رہے ہیں۔'' (۹ : ۳۰)

عقیدہ تثلیث کا منطقی ردّ از روئے قرآن: (1) سورہ آلِ عمران کی آیت ۵۹ میں ارشاد ہوا:

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَه' مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَه' كُنْ فَيَكُوْنُ O

''بے شک اللہ کے نزدیک عیسیٰ کا حال آدم کے حال جیسا ہے' اللہ نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا' پھر اُن سے کہا: وجود میں آ جاؤ تو وہ وجود میں آ گئے۔'' (۳ : ۵۹)

یہ جواب ہے اُس مشہور مسیحی شبہ کا کہ جب مسیح کی پیدائش ساری دنیا کے عام ضابطہ کے خلاف باپ کے توسط کے بغیر ہوئی تو اُنہیں فوق البشر کی بجائے محض بشر کیسے تسلیم کیا جائے؟ جواب یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کو بشر تو تم خود ہی تسلیم کرتے ہو جبکہ اُن کی پیدائش تو عجیب تر طور پر ہوئی یعنی وہاں ماں اور باپ دونوں میں سے کسی کا بھی توسط نہ تھا لیکن یہاں عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش میں ایک توسط ماں کا تو موجود ہے تو جب ماں اور باپ دونوں واسطوں کے نہ ہونے کے باوجود تم آدم علیہ السلام کو بشر مان رہے ہو تو یہاں عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں ایک واسطہ ہونے کے باوجود اُنہیں بشر ماننے میں کیا رکاوٹ ہے؟

(2) مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ O وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ O

(آلِ عمران: ۷۹، ۸۰)

"کسی بشر سے یہ نہیں ہوسکتا کہ اللہ تو اُسے کتاب، حکمت اور نبوّت عطا کرے اور وہ لوگوں سے یہ کہنے لگے کہ تم اللہ کے علاوہ میرے بندے بن جاؤ بلکہ (وہ تو یہی کہے گا) کہ اللہ والے بن جاؤ، (یہ) اس لئے (اور بھی) کہ تم کتاب (آسمانی) پڑھاتے ہو اور خود بھی (اُسے) پڑھتے ہو۔ اور نہ وہ تمہیں اس کا حکم دے گا کہ تم فرشتوں اور پیغمبروں کو پروردگار قرار دو، کیا وہ تمہیں تمہارے اسلام لانے کے بعد کفر کا حکم دے گا!" (۳: ۷۹، ۸۰)

خطاب نصاریٰ سے ہے کہ تمہارے پاس تعلیم و تعلم کے لئے کتابِ آسمانی موجود ہے اور پھر تم ایسے جہل و ضلالت میں گرفتار ہو! امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں یہ نکتہ خوب پیدا کیا ہے کہ علم و تعلیم و دراست کا تقاضا یہی ہے کہ انسان با خدا بن جائے۔ پس اگر ان مشغلوں سے یہ مقصود ہی نہیں رکھتا تو وہ اپنا وقت ضائع کر رہا ہے اور ایسے علم اور قلب سے حدیثِ نبوی میں پناہ مانگی گئی ہے۔

"عیسیٰ (علیہ السلام) کی تصویر خالصتاً ایک انسان اور بشر کی تصویر ہے۔ آپ نے اپنی قوم کے سامنے اپنے آپ کو عقلِ کل یا معلمِ اخلاق کے طور پر پیش نہیں کیا بلکہ اللہ کی طرف سے بھیجے گئے پیغام رساں کے طور پر پیش کیا اور اِس لحاظ سے آپ اللہ کی بادشاہت کے حوالے سے اُس کے سفیرِ اعظم ہیں۔" ("The Hibbart Journal" of London ---- October, 1934, p. 30)

"خالص تاریخی بنیادوں پر عیسیٰ (علیہ السلام) کے بارے میں جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ یہ کہ آپ ایک خاص ماحول میں رہنے والے انسان ہی تھے۔ (تحریف شدہ) انجیل کے عقیدہ کے مطابق آپ کا خدا ہونا انسانی اختراع ہے۔" (ایضاً، اکتوبر 1935، ص 374)

"عیسائی عقائد کے رسمی اعلان (Nicene Creed) کے مطابق جو ۳۲۵ء میں ناسایا میں منعقد ہونے

والی پہلی کونسل کی قرارداد پر مبنی ہے' کی تعلیم ہی تین الٰہی ہستیوں کی ہے اور وہ تین خداؤں کا انکار کرتی ہے۔'' ("Phases of Faith" ... Newman, p. 33)

اور انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا (Encyclopaedia Britannica) کے الفاظ میں:
''عیسائیت کے عقیدۂ تثلیث کو اِن الفاظ میں بہتر طور پر بیان کیا جا سکتا ہے کہ باپ خدا ہے' بیٹا خدا ہے اور روح القدس خدا ہے۔ اس کے باوجود وہ تین خدا نہیں بلکہ خدائے واحد ہیں۔'' (جلد ۲۲' ص ۴۷۹)

(3) وَاِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰھَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ قَالَ سُبْحٰنَکَ مَایَکُوْنُ لِیْ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ بِحَقٍّ اِنْ کُنْتُ قُلْتُہٗ فَقَدْ عَلِمْتَہٗ تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَلَا اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِکَ اِنَّکَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِO مَا قُلْتُ لَھُمْ اِلَّا مَا اَمَرْتَنِیْ بِہٖ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ رَبِّیْ وَرَبَّکُمْ وَکُنْتُ عَلَیْھِمْ شَھِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْھِمْ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْھِمْ وَاَنْتَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَھِیْدٌO اِنْ تُعَذِّبْھُمْ فَاِنَّھُمْ عِبَادُکَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَھُمْ فَاِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُO قَالَ اللّٰہُ ھٰذَا یَوْمُ یَنْفَعُ الصّٰدِقِیْنَ صِدْقُھُمْ لَھُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا اَبَدًا رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُO لِلّٰہِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِیْھِنَّ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌO
(المائدۃ: ۱۱۶-۱۲۰)

''اور (وہ وقت بھی یاد رکھنے کے قابل ہے) جب اللہ فرمائے گا کہ اے عیسیٰ ابنِ مریم! کیا تم نے لوگوں سے یہ کہہ دیا تھا کہ اللہ کے سوا مجھے اور میری والدہ کو بھی معبود بنالو۔ عیسیٰ عرض کریں گے: تو پاک ہے' میرے لئے یہ کسی طرح بھی ممکن نہ تھا کہ میں ایسی بات کہہ دیتا جس کا مجھے کوئی حق ہی نہ تھا۔ اگر میں نے کہا ہوتا تو یقیناً آپ کو اس کا علم ہوتا۔ تو جانتا ہے جو کچھ میرے دل میں ہے اور میں نہیں جانتا جو کچھ تیرے دل میں ہے' بے شک تو ہی تو ہے پوشیدہ باتوں کا خوب جاننے والا۔ میں نے اُن سے سوائے اس کے کچھ بھی نہیں کہا تھا جس کا تو نے مجھے حکم دیا تھا (یعنی یہ کہ) میرے اور اپنے پروردگار کی پرستش کرو' جب تک میں اُن کے درمیان رہا میں اُن پر گواہ رہا' پھر جب تو نے مجھے اٹھا لیا (جب سے) تو ہی اُن پر نگران ہے اور تو تو ہر چیز پر گواہ ہے۔ تو اگر تو اُنہیں عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو اُنہیں بخش دے تو بھی تو زبردست ہے' حکمت والا ہے۔ اللہ فرمائے گا آج وہ دن ہے جب سچوں کے کام اُن کا سچ آئے گا اُن کے لئے باغات ہوں گے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی اُن میں وہ ہمیشہ ہمیش کو رہیں گے' اللہ اُن سے خوش رہا اور وہ اللہ سے خوش رہے' یہی بڑی کامیابی ہے۔ اللہ ہی کی سلطنت ہے آسمانوں اور زمین کی اور جو کچھ اُن میں ہے اُس (سب) کی اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔'' (۱۱۶-۱۲۰ : ۵)

معلوم رہے کہ قرآنِ حکیم نے عیسیٰ علیہ السلام کو ہمیشہ ''ابنِ مریم'' کی کنیت دی ہے یعنی آپ ایک خاتون

کے بیٹے ہونے کے لحاظ سے دوسرے انسانوں کی طرح فانی ہیں اور آپ خدا کے بیٹے نہیں یا کسی بھی طرح اللہ کے مساوی نہیں۔ قرآنِ حکیم کا یہ انداز اس حقیقت کی طرف متوجہ کرتے ہوئے یہ زور دیتا ہے کہ آپ ایک انسان ہیں۔ اللہ کی آخری کتاب کے معجزات میں سے یہ ایک معجزہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی بات کرتے ہوئے وہ ایک طرف تو یہود و نصاریٰ کے مزعومات کی تردید کرتا ہے اور ایسی زبان استعمال کرتا ہے جو عیسائیوں کے الوہیت کے عقیدے اور یہود کی عیسیٰ علیہ السلام کی کھلی مذمت کے جواب میں کافی ہے۔

ظاہر ہے کہ سوال سے مقصود استفہام و استفسار نہیں بلکہ مسیح پرستوں اور مریم پرستوں پر مزید حجت قائم کرنا اور اُنہیں اور زیادہ خجل ولا جواب کرنا اور اُنہیں خود اُنہی کی نظروں میں ذلیل کرنا ہے (تفسیر قرطبی)۔ بعض اہلِ باطل نے مَا فِیْ نَفْسِكَ کے الفاظ سے حق تعالیٰ کی تجسیم نکالنا چاہی ہے اور کہا ہے کہ نفس سے مراد شخص ہوتا ہے لیکن امام رازی نے فرمایا کہ اوّل تو ذات اور نفس مرادف (ہم معنیٰ) ہیں، شخصیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور پھر نَفْسِیْ کے مقابلہ میں نَفْسِكَ لانا ہی قاعدہِ مشاکلت عربی اسلوبِ بیان میں فصیح تر ہے (تفسیر کبیر)۔

حضرت مسیح علیہ السلام کے اس کلام میں مسیحیوں کے اس عقیدہ کی بھی تردید ہوگئی کہ قیامت میں عدالت کا کام خدا کا نہیں بلکہ (معاذ اللہ) خدا کے بیٹے کے ہاتھ میں ہوگا۔ چنانچہ موجودہ انجیل میں ہے: ''باپ کسی کی بھی عدالت نہیں کرتا بلکہ اُس نے عدالت کا سارا کام بیٹے کے سپرد کیا ہے۔'' (یوحنا ۵:۲۳)

اب عیسیٰ علیہ السلام کے اپنے ایک کلام کو بھی ملاحظہ کرتے جایئے جس میں آپ نے اپنے معبود اور الٰہ ہونے پر نفرت کا اظہار کیا۔ آپ نے فرمایا:

> ''لوگوں کا ہجوم قریب ہوا اور جب اُنہیں آپ کی بابت علم ہوا تو وہ چیخنے لگے: اے ہمارے خدا! خوش آمدید اور وہ آپ کی اس طرح حد درجہ تعظیم و تکریم کرنے لگے جیسے اللہ کی کی جاتی ہے۔ اس پر عیسیٰ علیہ السلام شدید طور پر کراہے اور فرمایا: پاگلو! میرے سامنے سے ہٹ جاؤ کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ اِن گھناؤنے الفاظ کی پاداش میں زمین نہیں کھل کر مجھے اور تمہیں ہڑپ نہ کر لے۔'' (Ragg's "The Gospel of Barnabas", p. 213)

> ''مذہب عیسائیت اور عیسیٰ علیہ السلام کے مذہب کے مابین عظیم فرق ہے۔ یہودیت کی سرزمین پر یونانی فلسفہ پر اٹھائے گئے اصول کی ساخت اور خود عیسیٰ علیہ السلام کے عقیدے کے مابین بڑا فرق ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کا عقیدہ تو ایسا سیدھا سادہ عقیدہ تھا جس میں ہر کہ و مہ آپ کے ساتھ شریک ہے۔''
> ("Christianity and History"... Harnack, p. 15)

''اِبنُ اللہ'' کی ترکیب اگرچہ عیسیٰ علیہ السلام نے ہی استعمال کی ہو تو اس کا مطلب اُس شخص سے زیادہ کچھ نہیں جس نے اپنے آپ کو رضائے الٰہی کے تابع کر دیا ہو جس طرح کہ انسان کا بیٹا اپنے باپ کا مطیع و فرمانبردار ہوتا ہے اور بالآخر اُس بیٹے کو یہ یقین ہوتا ہے کہ باپ کی محبت میں خدا کی محبت ہے جیسا کہ خود

عیسیٰ علیہ السلام نے اِس کا اظہار فرمایا ہے: اپنے دشمنوں سے پیار کرو اور اُن لوگوں کے لئے دعا کرو جو تمہیں اذیت پہنچاتے ہیں تاکہ تم اپنے اُس باپ کے بیٹے بن جاؤ جو آسمان میں ہے۔'' ("Jesus in Modern Criticism" ... Schmiedel, p. 40)

(4) لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ O (اَلْمائدة: ۷۳)

''یقیناً وہ لوگ کافر ہو گئے جنہوں نے کہا کہ خدا تین میں سے تیسرا ہے' حالانکہ سوائے اللہ کے کوئی معبود نہیں اور اگر یہ لوگ اپنے (اِن) اقوال سے باز نہ آئے تو اُن میں سے جو لوگ کافر رہیں گے' اُن پر دردناک عذاب واقع ہو کر رہے گا۔'' (۵ : ۷۳)

مِنْهُمْ میں مِنْ تبعیضیہ ہے۔ علمِ الٰہی میں یہ بات تھی کہ ان میں سے بہت سے لوگ اپنے اس مشرکانہ عقیدہ سے باز آ جائیں گے اور ایمان لے آئیں گے۔ ایسے لوگ اس وعید سے خارج ہیں۔

''تثلیث کے اِس ناقابلِ فہم عقیدے کا تعارف عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان کو اٹھائے جانے (رفع الی السماء) کے کافی عرصہ بعد بولس (Bolus) نامی ایک یہودی نے کرایا۔ عقیدۂ تثلیث اُس وحدتِ الٰہی کے بالکل منافی ہے جس پر آسمانی کتابوں میں زور دیا گیا ہے۔ اس لئے لوگوں نے اس عقیدے کا انکار کیا اور عیسیٰ علیہ السلام کو گوشت پوست کے بنے ہوئے خدا کے طور پر تسلیم نہیں کیا بلکہ خدا کی اعلیٰ ترین مخلوق کے طور پر قبول کیا یا اُس انسانِ کامل کے طور پر تسلیم کیا جس نے خدا کے متعلق صحیح اور سچے عقیدے کی تعلیم دی۔'' (Encyclopaedia Britannica, Vol. 5, p. 634)

عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات خالصتاً موحدانہ تھیں: اپنے تمام انبیائے سابق کی طرح عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات بھی خالص توحید پر مبنی تھیں' نہ کہ وہ جو ہم شرک پر مبنی آج کی عیسائی دنیا میں دیکھتے ہیں۔ قرآن نے بہ تاکید یہ بات کہی ہے کہ مشرکانہ تعلیم دینا نبوّت کے منصبِ ارفع کے شایانِ شان نہیں اور ایسا ہونا ناممکنات میں سے ہے:

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ O (آلِ عمران: ۷۹)

''کسی بشر کی شان کے لائق نہیں کہ اللہ تو اُسے کتاب و حکمت اور نبوّت عطا کرے پھر وہ لوگوں سے یہ کہتا پھرے کہ اللہ کو چھوڑ کر تم میرے بندے بن جاؤ بلکہ (وہ تو یہی کہے گا) کہ اللہ والے بن جاؤ (یہ) اس لئے (بھی) کہ تم کتابِ (آسمانی) پڑھاتے ہو اور خود بھی (اُسے) پڑھتے ہو۔'' (۳ : ۷۹)

عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو جن کی طرف وہ بھیجے گئے تھے' واضح الفاظ میں یہ تعلیم دی تھی:

اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ O (آلِ عمران: ۵۱)

''میرا اور تمہارا پروردگار بالیقین اللہ ہی ہے، پس اُسی کی عبادت کرو، یہی سیدھی راہ ہے۔'' (۵۱ : ۳)

''ایریس (Arius) کی تعلیم یہ تھی کہ ابن اللہ ایک مخلوق ہے اور ایک وقت وہ بھی تھا جب ابن اللہ کا کوئی وجود نہ تھا۔'' (ایضاً، جلد ۲، صفحہ ۵۹۸)

''حقیقت تو یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات خالصتاً توحید الٰہی اور صرف خدائے واحد کی پرستش پر مبنی تھیں بالکل اُسی طرح جس طرح آپ کے پیشرو رسولوں کی تعلیمات تھیں۔ یہ ضابطہ عقائد تقریباً ۲۵۰ء تک اِس موقف کے ساتھ رہا: ''قادرِ مطلق اللہ پر میرا ایمان ہے۔'' ("Articles of the Apostolic Creed"... Theodre Zahn, p. 33)

(5) مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ O عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ O (المؤمنون : ۹۲)

''اللہ نے کسی کو بھی بیٹا نہیں بنایا اور نہ اُس کے ساتھ کوئی اور معبود ہے، اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کو جدا کر لیتا اور (پھر) ایک دوسرے پر چڑھائی کرتا۔ اللہ ان باتوں سے پاک ہے جو وہ اُس کی نسبت بیان کرتے ہیں۔ وہ پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا ہے، پس وہ اُن لوگوں کے شرک سے بالاتر ہے۔'' (۹۱، ۹۲:۲۳)

''مشرک قوموں کی خرافی روایات اور اَصنامیات (Mythology) ان قصوں سے بھری پڑی ہیں کہ فلاں دیوتا اور فلاں دیوتا میں یوں جنگ ہوئی، اُس نے اُس پر یوں چڑھائی کی، وہ اُس پر یوں غالب آیا۔ قرآن نے ایک مختصر سے بلیغ فقرے میں اُن لوگوں کی دیومالا کا گویا ست کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ پھر فرمایا کہ اللہ کے نہ کوئی بیٹا ہے جیسا کہ بدنصیب مسیحیوں نے سمجھ رکھا ہے اور نہ اُس کے کوئی بیٹی ہے جیسا کہ بدبخت مشرکوں نے گھڑ لیا ہے۔ استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کئی معبود ہوتے تو یہ نظامِ عالم پارہ پارہ ہو کر رہ جاتا۔ لیکن ایسا نہ ہونا ظاہر ہے۔ اس لئے اِس مفروضے پر جمے رہنا گویا بداہت کا انکار کئے جانا ہے۔'' (تفسیر ماجدی اردو، صفحہ ۷۰۶، نوٹ: ۸۱)

''عقیدہ تثلیث کے ردّ میں سوشنس (Socianus) نے یہ اعلان کیا کہ ''مسیح علیہ السلام کی فطرت الٰہی فطرت تھی'' اِن وجوہ کی بنا پر کتب سماویہ کی تعلیمات کے خلاف ہے: (۱) مسیح علیہ السلام کو اللہ نے پیدا کیا (۲) کتب سماویہ (تورات و انجیل) کی رُو سے مسیح علیہ السلام ایک انسان تھے۔ (۳) کتب سماویہ میں بیان شدہ جو معجزات مسیح علیہ السلام نے دکھائے، وہ آپ پر عطیہ خداوندی تھے اور (۴) مسیح علیہ السلام نے اِن تمام معجزات کو اپنی طرف نہیں بلکہ اللہ کی طرف منسوب کیا۔'' (تلخیص از: "Historical & Critical Reflections upon Mohammetonism & Socianism"... A. Reland)

۲۶۵۱ (عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کی والدہ)

عیسیٰ علیہ السلام کے مصلوب ہونے کے ردّ میں ہمیں جان ٹولینڈ (John Toland) کی کتاب میں یہ بیان ملتا ہے :

"مسیح علیہ السلام کو پھانسی نہیں دی گئی بلکہ آپ کی جگہ کسی اور آدمی کو پھانسی دی گئی۔ اس لئے آپ علیہ السلام اُن لوگوں پر ہنس دئے جنہیں یہ یقین تھا کہ اُنہوں نے آپ کو پھانسی دی ہے۔" (The Nazarens, p. 18)

(6) قُلْ هُوَاللّٰهُ اَحَدٌ O اَللّٰهُ الصَّمَدُ O لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ O وَلَمْ يَكُنْ لَّه كُفُوًا اَحَدٌ O
"آپ کہہ دیجئے کہ وہ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ نہ اُس کے کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ کوئی اس کے برابر کا ہے۔" (۱۔۴ : ۱۱۲)

"سورۃُ الاخلاص تمام کی تمام نہ صرف عیسائیوں اور یہودیوں کے قادرِ مطلق اللہ کے متعلق جھوٹے عقیدے کو کھوکھلا کرتی ہے بلکہ تمام مشرک مذاہب کو بھی کھوکھلا کرتی ہے۔ مثلاً ویدوں میں ہے: دیوتا بذاتِ خود ابتدائی مخلوق تھے۔ وہ قدرت کی نیم جسمی (Semi-anthropomorphised) قوت تھے۔" ("Influence of Islam on Indian Culture"... Tara Chand, p. 4)

اسلام کے لائے ہوئے معقول، بے مثال اور سادہ عقیدہ سے متاثر ہو کر فلپ ہٹی اور بنسن جیسے مغربی قلمکاروں نے اس طرح اسلام کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے :

"اس غیر مصالحتی توحید میں جو اپنے اندر ایک سادہ اور ایک واجب الوجود ہستی میں گرمجوش ایمان رکھتی ہے، مذہب اسلام کی عظیم قوت پنہاں ہے۔" ("Islam--A Way of Life" --- P.K. Hitti, p.129)

"عیسیٰ علیہ السلام کا بطورِ مسیح اسلامی تصوّر اَسّی (۸۰) ویں کتاب الادعیہ (Psalm) اور دانیال کے واضح تصوّر میں درج شدہ تحریر سے متفق ہے جس میں انسان کے بیٹے کو زمین سے آسمان کو اٹھتے ہوئے بیان کیا گیا ہے نہ کہ آسمان سے زمین کو آتے ہوئے۔ اسلام کا یہ طغرائے امتیاز ہے کہ اس کے خالق اللہ نے اپنا تعلق حقیقت کے ساتھ جوڑا ہے نہ کہ سینٹ پال کی عیسائیت کے ساتھ۔" ("Islam, or True Christianity" ... Bunsen, p. 154)

<u>توحید کے بارے میں قرآنِ حکیم کا منطقی استدلال (Ratiocination)</u>: سورۃ البقرۃ میں ارشاد ہوا:
وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَه بَلْ لَّه مَافِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلٌّ لَّه قٰنِتُوْنَ O بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِذَا قَضٰى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَه كُنْ فَيَكُوْنُ O (البقرۃ: ۱۱۶، ۱۱۷)
"اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ نے بیٹا بنا لیا ہے، وہ تو (اس سے) پاک ہے، اصل یہی ہے کہ جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے، اُسی کی مِلک ہے، سب اُسی کے مطیع و فرمانبردار ہیں۔ وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے،

وہ جب کسی کام کا کرنا ٹھہرا لیتا ہے، تو بس اتنا ہی اس سے کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔" (۱۱۶، ۱۱۷ : ۲)

آیاتِ بالا کا تجزیہ : (ا) سُبحٰنَہٗ: (i) فطرت کے ناقابلِ تغیر قانون کے مطابق باپ اور بیٹا ایک ہی نوع (Specie) کے ہوتے ہیں۔ یعنی گدھے میں سے گدھا، چھپکلی میں سے چھپکلی اور اسی طرح انسان میں سے انسان پیدا ہوتا ہے۔ اگر اللہ کا کوئی بیٹا ہوتا تو وہ بھی اپنے باپ یعنی اللہ کی نوع میں سے ہوتا جبکہ اللہ تعالیٰ ہر قسم کی نوع سے پاک ہے۔

(ii) بیٹے کے حصول کے لئے مادہ (منویہ) کا ہونا ضروری ہے اور اللہ اس سے پاک ہے کہ اُس کا مادّہ ہو کیونکہ وہ خود کوئی مادّی شے نہیں ہے۔

(iii) آدمی بیٹے کا حصول اس لئے بھی کرتا ہے کہ اُس کی موت کے بعد اُس کا نام زندہ رہے۔ موت بذاتِ خود مخلوق ہے اور یہ بات الوہیت کے خلاف ہے کہ موت اُس پر غالب آجائے (یعنی خالق کو موت آجائے) چونکہ اللہ تعالیٰ لافانی اور حیّ و قیّوم ہے بلکہ کائنات کو زندگی دینے والا اور اُن کا روزی رساں ہے، اس لئے وہ بیٹا بنانے سے پاک ہے۔

(iv) آدمی کو بیٹے کی احتیاج ضرورت کے تحت ہوتی ہے اور یہ انسان کی کمزوری ہے جبکہ اللہ تعالیٰ ہر انسانی کمزوری سے پاک ہے۔

(v) بیٹے کے حصول کے لئے بیوی کا وجود ناگزیر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کوئی جیون ساتھی یا بیوی نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں بیوی بھی اللہ کی نوع میں سے ہوگی اور وہ اُس کے مساوی اور اُس جیسی ہوگی۔

(vi) بیٹے کے حصول کے لئے بیوی کا تعاون بھی ضروری ہے اور اللہ تعالیٰ کسی کا تعاون اور مدد لینے سے بہت دُور اور اُس سے پاک ہے۔

(vii) بیٹا اپنے باپ کا جزو اور اُس کا حصّہ ہوتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کا کوئی بیٹا ہوتا تو وہ اپنے باپ (اللہ) کا جزو ہوتا اور اللہ تعالیٰ اس بات سے پاک ہے کہ کوئی مخلوق اُس کا جزو ہو۔ لہٰذا اُلوہیت اور پدریت ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔

(viii) مخلوق ہونے کے لحاظ سے بیٹا اپنے باپ سے بہرصورت رتبہ میں کمتر ہوتا ہے۔ اگر اللہ نے اپنے لئے کوئی بیٹا بنایا ہوتا تو سوال یہ ہے کہ آیا بیٹا اُس (اللہ) کی طرح غیر مخلوق ہے یا مخلوق ہے اور اس وجہ سے اُس سے کم تر ہے اور کسی اور طبقے سے اُس کا تعلق ہے؟ اول الذکر صورت میں ثنویت (Dualism) کا صاف نتیجہ نکلتا ہے اور مؤخر الذکر صورت میں کیا ایک کامل ہستی کی شان کے لائق ہے کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے۔

(ix) ایک وقت وہ تھا جب بیٹے (یعنی عیسیٰ علیہ السلام) کا قبل از پیدائش وجود نہ تھا۔ اگر بیٹا خدا ہوتا یا اُلوہیت کی کسی بھی صفت سے متصف ہوتا تو وہ تمام اوقات اور ہر زمانہ میں موجود ہوتا کیونکہ ہر جا ظہوری (Omnipresence) اُلوہیت کی نمایاں صفت ہوتی ہے۔

"لیوک کی انجیل (Luke's Gospel) سے ظاہر ہوتا ہے کہ لیوک کا یہ عقیدہ تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام کا اپنی والدہ مریم علیہا السلام کے بطن سے پیدا ہونے سے پہلے کوئی وجود نہیں تھا۔ کیونکہ:

۲۶۵۳ (عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کی والدہ)

3.23.38 میں عیسیٰ علیہ السلام کا نسب نامہ دیا گیا ہے۔
4.24 اور 8.33 میں عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا پیغمبر تسلیم کیا گیا ہے۔
7.16 اور 24.19 میں عیسیٰ علیہ السلام کو پیغمبر کہا گیا ہے۔
3,13,26 اور 4,27,30 میں پطرس اور کچھ دوسرے رسولوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بندہ کہا۔
17.24, 30 میں لیوک نے عیسیٰ علیہ السلام کو ''انسان کا بیٹا'' کہا ہے جنہیں الٰہی نگرانی کے تحت ایک اہم منصب کے لئے مقرر کیا گیا اور جس نے دنیا کو مائل بہ اصلاح کیا۔ ("A List of False Reading of the Scripture"--- T. Lindsey)

(ii) بَلْ لَّهٗ مَافِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے، سب اُسی کی مِلک ہے)

شادی اور نکاح سے پہلے آدمی اپنی جائداد اور اثاثے کا اکیلا مالک ہوتا ہے لیکن شادی کے بعد اُس کی بیوی بھی اُس کی ملکیت میں حصہ دار بن جاتی ہے اور جب اُن کے ہاں کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ بھی اُس ملکیت کا حصہ دار بن جاتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کا کوئی بیٹا ہوتا تو اُسے اللہ تعالیٰ کی ملکیتوں میں مالک ہونے کا حق حاصل ہوتا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین میں موجود ہر چیز کا بلا شرکتِ غیرے اللہ ہی مالک ہے۔

(iii) كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ O (سب اُسی کے مطیع و فرمانبردار ہیں) : شروع میں بیٹا اپنے والدین کا محتاج ہوتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اُس کے والدین بوڑھے ہوتے جاتے ہیں اور ایک وقت وہ آتا ہے جب والدین اپنے بیٹے اور اُس کی مدد کے محتاج ہو جاتے ہیں۔ اگر اللہ کا کوئی بیٹا ہوتا تو وہ بیٹا ایک وقت میں اپنے باپ (یعنی اللہ) کا محتاج ہوتا اور کسی دوسرے وقت میں اُس کا باپ (یعنی اللہ) اپنے بیٹے کی مدد کا محتاج ہوتا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ تمام کائنات اُسی کی مدد کی محتاج ہے اور اُسے کسی بھی وقت کسی کا محتاج نہیں ہونا پڑا۔

(iv) بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (آسمانوں اور زمین کا موجد ہے) : اپنے سامنے کوئی نمونہ یا نقشہ رکھے بغیر اُس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔ سعادت مند بیٹا وہ ہوتا ہے جس کی صلاحیتیں اور قابلیتیں اپنے باپ کے کارناموں کی طرح ہوں اور کچھ نہیں تو کم از کم وہ اپنے باپ کی طرح کے کام تو کرے۔ اگر اللہ کا کوئی بیٹا ہوتا تو کسی آسمان یا زمین کی پیدائش تو بیٹے کے حصے میں جاتی جبکہ حقیقت یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین کی پیدائش کا جسیم و عظیم کام تو دُور کی بات ہے، کائنات میں کوئی بھی تو مکھی کا پر تک پیدا کرنے کے بھی قابل نہیں ہے۔

(v) وَاِذَا قَضٰى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ O (وہ جب کسی کام کا کرنا ٹھہرا لیتا ہے، تو بس اتنا ہی اُس سے کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔) : اولاد اور بیٹے کا حصول ایک تدریجی عمل ہے اور اُسے پل جھپکنے میں حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ حصول کے اس عمل میں ہر والد کو اس کے تقاضے پورا کرنے کے بعد کچھ انتظار کرنا پڑتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اُس کا بیٹا پیدا ہو یا نہ ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا جیون ساتھی بہ حکمِ الٰہی ہمیشہ بانجھ اور بے ثمر رہے۔

رب تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ ایسے تقاضوں اور رکاوٹوں سے بہت دُور ہے کیونکہ رکاوٹیں الوہیت کے خلاف ہیں۔ اُس کا کُن کہہ دینا آفرینش (پیدائش) کا دروازہ کھول دیتا ہے۔

علّت و معلول کا قانون (The Law of Causality): یعنی سبب و نتائج کا باہمی ربط اور یہ اصول کہ کوئی بات سبب کے بغیر نہیں ہوتی۔ سبب اپنے نتیجہ سے پہلے موجود ہوتا ہے جبکہ نتیجہ بعد میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔

''بالعموم یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ ایک معلوم محرک شے سے بالکل مماثل اور ایک جیسے نتائج برآمد ہوں گے اگر اُن کا اہتمام تنظیمی حالات کے تحت کیا جائے۔ تاہم سائنسدانوں میں علّت و معلول کے اصول کی مختلف شکلوں کا تسلیم کرنا قدرتی ردّعمل اور بے اختیارانہ نہیں ہے۔ ڈیوڈ ہیوم (David Hume) کا استدلال یہ تھا کہ دو مظاہر کے مابین کوئی داخلی ربط نہیں ہوتا۔ اگر آگ کا وجود ہے تو حرارت کا وجود بھی ہو گا لیکن ضروری نہیں کہ ایک شے دوسری شے کو وجود میں لائے۔'' (Dictionary of Contemporary Thought... David Kirby, p. 7)

اللہ تعالیٰ کی ہر جا ظہوری (Omnipresence) علّت و معلول کے قانون سے بالاتر ہے کیونکہ وہ کسی قانون کا پابند نہیں۔ تمام قوانین اُسی کے وضع کردہ ہیں اور یہ بات الوہیت کے اعلیٰ و ارفع مقام کے خلاف ہے کہ وہ اپنی کسی بھی مخلوق کا مطیع ہو۔ قرآن مجید اس حقیقت کو یوں بیان کرتا ہے:۔

(۱) عام قانونِ قدرت کے تحت آدم علیہ السلام کو باپ اور ماں کے ملاپ سے پیدا ہونا چاہئے تھا۔ ماں اور باپ کا باہمی ملاپ سبب ہے اور اُس کے نتیجہ میں بچے کا پیدا ہونا اُن کے جنسی اختلاط کا نتیجہ ہے۔ لیکن اس قانون کے برعکس آدم علیہ السلام ماں باپ کے ملاپ کے بغیر مٹی سے پیدا ہوئے (بحوالہ سورۃ الحِجر: ۲۸)

(۲) عیسیٰ علیہ السلام باپ کے بغیر شکمِ مادر سے پیدا ہوئے۔ یہ پھر نر اور مادہ کے باہمی ملاپ کے عمومی قانون کے خلاف ہے اگرچہ عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش آدم علیہ السلام کی پیدائش سے کم حیرت انگیز ہے۔ قرآن مجید نے انتہائی بلیغ اور مختصر الفاظ میں ان دونوں پیدائشوں کو یوں بیان کیا ہے:

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَاللّٰهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ O

''بے شک اللہ کے نزدیک عیسیٰ کا حال آدم کے حال جیسا ہے' اللہ نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا' پھر اُن سے کہا: وجود میں آجاؤ تو وہ وجود میں آ گئے۔'' (۳ : ۵۹)

اگر یہ کہا جائے کہ عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا ہوئے تو آدم علیہ السلام بھی تو بغیر باپ کے پیدا ہوئے بلکہ آدم علیہ السلام تو ماں اور باپ دونوں کے بغیر پیدا ہوئے۔ جب ان دونوں ہستیوں کی پیدائش کی ماہیت ایک جیسی ہے تو عیسیٰ علیہ السلام کی طرف دائمیت اور الوہیت کو منسوب کرنے کی کیا گنجائش ہے؟ اس طرح قرآن مجید ذہنِ انسانی کو معقول ہونے کی دعوت دیتا ہے اور کہتا ہے کہ انسانی دستاویزات غلط ہو سکتی ہیں لیکن وحیِ الٰہی میں غلطی

یا خطا کا گمان تک نہیں ہوسکتا۔ اس لئے یہاں کسی شک وارتیاب کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں:

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَO (آلِ عمران: ۶۰)

''آپ کے رب کی جانب سے حق بات یہی ہے' پس (اے مخاطب!) شبہ کرنے والوں میں سے نہ ہوجانا۔'' (۳:۶۰)

عقیدہِ متناقضہ☆(Antinomianism Belief): یہ عقیدہ بھی ''الٰہی نظریہ انتخاب'' کے خلاف ہے جسے قرآنِ حکیم نے مسترد کردیا۔ اِس عقیدے کا مطلب یہ ہے کہ عیسائی اخلاقی قوانین کی پابندی سے آزاد ہیں کیونکہ رحمتِ خداوندی اُن کے شاملِ حال ہوتی ہے۔ اس عقیدے کو پہلے سینٹ پال کی طرف منسوب کیا گیا جس نے یہ اعلان کیا کہ اُس کے مخالفین نے اُس کے اِس بیان پر خواہ مخواہ الزام لگایا تھا: ''نیکی کے حصول کے لئے برائی کا ارتکاب کیوں نہ کیا جائے؟'' (رومیو ۳:۸)۔ ابتدا میں نظریہ باطنیت کے کچھ حامیوں (Gnosticists) نے جنس اور دوسرے معاملات میں عقیدہِ متناقضہ کو اپنا لیا اور کہا کہ لوگ صرف روحانی معاملات میں اللہ کے حضور جوابدہ ہوں گے۔ سولھویں صدی کے لگ بھگ یورپ میں رومی کلیسا کی بدعنوانیوں کی اصلاح کے لئے اُٹھنے والی ''تحریکِ اصلاح'' کے زمانے میں مارٹن لوتھر کے کچھ پیروؤں نے اُس کے اِس نظریہ کو اپنا لیا کہ قانون کا اطلاق ایک عیسائی کی زندگی پر نہیں ہوتا۔ (Academic American Encyclopedia, Vol. 2, p. 64) USA 1981

قرآن مجید نے انتہائی منطقی طور پر اور مُسکت زورِ استدلال کے ساتھ اُن کے اِس عقیدہِ متناقضہ کو رد کیا ہے:

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى نَحْنُ اَبْنَآءُ اللهِ وَاَحِبَّآءُه ' قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ (المائدة: ۱۸)

''اور یہود اور عیسائی کہتے ہیں کہ ہم خدا کے بیٹے اور اُس کے چہیتے ہیں۔ آپ فرما دیجئے تو پھر خدا تمہیں تمہارے گناہوں پر سزا کیوں دیتا ہے' وہ جسے چاہے گا بخشے گا اور جسے چاہے گا سزا دے گا۔'' (۵:۱۸)

یعنی کیا دوستوں اور پیاروں کو بھی یوں ذلیل ورُسوا کیا جاتا ہے جیسے تمہیں کیا جارہا ہے اور کیا اپنے پیاروں پر عذابِ الٰہی کے بادل اِسی طرح منڈلاتے رہتے ہیں جیسے تم پر منڈلاتے رہتے ہیں؟ حقیقت تو یہ ہے کہ تم بھی دوسرے انسانوں کی طرح انسان ہو۔ رحمت اور سزا کا جو قاعدہ اُن کے لئے مقرر ہے' تم بھی بلا امتیاز واستثناء اُنہی کی طرح عام قاعدہ کے تحت میں داخل ہو یعنی جزا وسزا کا جو قانون ساری دُنیا کے لئے ہے' وہی تمہارے لئے بھی ہے۔

عقیدہِ کفّارہ (Atonement): موجودہ مسیحیت کا دوسرا عقیدہ جس نے دینِ مسیحیت کی حقیقت کو برباد کرڈالا ''کفّارہ'' کا عقیدہ ہے جس کی بنیاد اس تخیّل پر ہے کہ تمام کائنات جس میں نیکوکار اور انبیاء ورُسل سب شامل ہیں' ابتدائے آفرینش ہی سے گنہگار ہے۔ آخر رحمتِ الٰہی کو جوش آیا اور اُس کی مشیت نے ارادہ کیا کہ

☆ عقیدہِ متناقضہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس میں باہم دو متضاد باتیں بہ یک وقت جمع ہوگئی ہیں یعنی اللہ کے پیارے اور چہیتے ہونا اور پھر اُن کے بہ زعمِ خود اللہ کے چہیتے ہونے کے باوجود اللہ کا اُنہیں سزا دینا۔

بیٹے کو کائناتِ ارضی میں بھیجے اور وہ مصلوب ہو کر اوّل و آخر تمام کائنات کے گناہوں کا کفّارہ ہو جائے اور اِس طرح دنیا کو نجات حاصل ہو سکے لیکن اِس عقیدے کے قوام بنانے کے لئے چند ضروری اجزاء کی ضرورت تھی جن کے بغیر یہ عمارت کھڑی نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس لئے عہدِ رسول میں سب سے پہلے مسیحیت نے یہودیت کے اِس عقیدے کو تسلیم کر لیا کہ اُنہیں صلیب پر بھی چڑھایا گیا اور مار بھی ڈالا گیا اور اُسے شرفِ قبولیت دینے کے بعد دوسرا قدم یہ اٹھایا کہ ''الوہیت'' کے باوجود مسیح علیہ السلام کا صلیب پانا اور قتل ہونا اپنے لئے نہیں بلکہ کائنات کی نجات کے لئے تھا۔ چنانچہ جب اُس پر یہ حادثہ گزر گیا تو اُس نے پھر اُلوہیت کی چادر اوڑھ لی اور عالمِ لاہوت میں باپ اور بیٹے کے درمیان دوبارہ لاہوتی سلسلہ قائم ہو گیا۔''

''پس جب مذہب میں خدائے برتر کے ساتھ صحتِ عقیدہ اور نیک عملی مفقود ہو کر نجات کا دار و مدار' عمل و کردار کی بجائے ''کفارہ'' پر قائم ہو جائے تو اس کا حشر خدا معلوم!''

''قرآنِ حکیم نے اِسی لئے جگہ جگہ یہ واضح کیا ہے کہ نجات کے لئے عقیدہ کی صحت یعنی صحیح خدا پرستی اور نیک عملی کے سوا کوئی دوسری راہ نہیں ہے اور جو شخص بھی اِس ''راہِ مستقیم'' کو ترک کر کے خوش عقیدگی اور اوہام و ظنون کو اُسوہ بنائے گا اور نیک عملی اور صحیح خدا پرستی پر گامزن نہ ہوگا' وہ بلاشبہ گمراہ ہے اور راہِ مستقیم سے یکسر محروم:

إِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصَارٰى وَالصَّابِئِيْنَ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ O (البقرۃ: ۶۲)

''بے شک جو لوگ ایمان لا چکے ہیں اور جو لوگ یہودی اور نصاریٰ اور صابی ہوئے' (غرض) جو کوئی بھی اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان لے آئے اور نیک عمل کرے' تو اِن سب کے لئے اُن کے پروردگار کے پاس اُن کا اجر ہے اور اُن کے لئے نہ کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ کوئی غم کریں گے۔'' (۲:۶۲)

''یعنی قرآن کی دعوتِ اصلاحِ ادیان و مِلل کا مقصد یہ نہیں ہے کہ یہودی' نصرانی' صابی گروہوں کی طرح ایک نیا گروہ مؤمنوں کے نام سے اس طرح اضافہ کر دے کہ گویا وہ بھی ایک قومی' نسلی یا ملکی گروہ بندی ہے کہ خواہ اس کی خدا پرستانہ زندگی اور عملی زندگی کتنی ہی غلط اور برباد ہو یا سرے سے مفقود ہو مگر اس گروہ بندی کا فرد ہونے کی وجہ سے ضرور کامیاب اور خدا کی جنت و رضا کا مستحق ہے۔ قرآن کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے بلکہ وہ یہ اعلان کرنے آیا ہے کہ کوئی شخص کسی بھی گروہ اور مذہبی جماعت سے تعلق رکھتا ہو' اگر اُس نے قرآن کی تعلیمِ حق کے مطابق خدا پرستی اور نیک عملی کو اختیار کر لیا ہے تو بلاشبہ وہ نجات یافتہ اور کامیاب ہے ورنہ تو وہ اگر مسلمان گھر میں پیدا ہوا' پلا اور بڑھا اور اِسی سوسائٹی میں زندگی گزار کر مر گیا مگر قرآن کی دعوتِ حق کے مطابق خدا پرستی اور نیک عملی دونوں سے محروم یا مخالف رہا تو اُس کے لئے کوئی کامیابی اور فوز و فلاح نہیں ہے۔ باقی رہا مسیحیت کے کفارہ کا خصوصی مسئلہ تو قرآن نے اُس کے ابطال اور تردید کے لئے یہ راہ اختیار کی کہ جن بنیادوں پر اُسے قائم کیا گیا' اُن کی جڑ ہی کاٹ دی۔ چنانچہ گزشتہ سطور میں صلیب اور قتلِ مسیح کے انکار و رفع الی السماء کے اِثبات کے مبحث میں اس پر کافی روشنی پڑ چکی ہے۔'' (''قصص القرآن''۔ حفظ الرحمٰن سیوہاروی' جلد چہارم' صفحات ۲۱۰۔۲۱۲)

Dummelow نے عقیدۂ کفارہ کی اس طرح تائید کی :

''ہمارے آقا مسیح نے اپنے باپ (خدا) کی فرزندانہ اطاعت کی توثیق کرتے ہوئے اعلان کیا کہ اُسے اپنے باپ کی تمام طاقت استعمال کرنے کا اختیار ہے یعنی اُن لوگوں پر طاقت کا استعمال جو گناہوں میں ڈوبے ہوئے ہیں کہ اُنہیں نئی زندگی مل جائے۔ اسی طرح بیٹا جب بھی چاہے اس طاقت واختیار کا استعمال کرتا ہے۔ کیونکہ باپ کسی شخص کو نہیں پرکھتا بلکہ اُس نے قوتِ فیصلہ بیٹے کے سپرد کر رکھی ہے۔''
(Commentary on the Holy Bible"... Dummelow, p. 784)

سوشنس (Socianus) نے عقیدہ کفارہ کی اِن وجوہ کی بنا پر تردید کی :

''مسیح (علیہ السلام) گناہوں کے لئے لامحدود قربانی نہیں دے سکتے تھے کیونکہ انجیل کے بیان کے مطابق مسیح علیہ السلام نے تھوڑے وقت کے لئے تکلیف جھیلی۔ ایک محدود وقت کی تکلیف ابدی تکلیف کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں۔ ایک لامحدود ہستی کی تکلیف ابدی تکلیف کی جگہ نہیں لے سکتی۔''

قرآن مجید اور عقیدۂ کفّارہ : قرآن مجید نے مختلف مقامات پر عقیدۂ کفارہ کا رد کیا ہے' مثلاً :
(i) وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ" وِّزْرَ اُخْرٰی (الانعام: ۱۶۴؛ بنی اسرائیل : ۱۵؛ فاطر: ۱۸)
''کوئی بوجھ اُٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔'' (۶:۱۶۴؛ ۱۷:۱۵؛ ۳۵:۱۸)

مشرک قوموں کا تو ذکر ہی کیا' خود اہلِ کتاب (یہود ونصاریٰ) کے ہاں انفرادی ذمہ داری مٹ مٹا کر سارا زور مسئلہ ''کفارہ'' وغیرہ پر رہ گیا تھا۔ قرآن مجید میں اِسی لئے اِن عقائد کی پُر زور تردید بار بار مختلف عنوانات سے ہوتی رہتی ہے اور یہاں بھی مقصود شخصی ذمہ داری ومسئولیت کا اثبات ہے۔

(ii) مَنِ اهْتَدٰی فَاِنَّمَا یَهْتَدِیْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیْهَاوَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ" وِّزْرَ اُخْرٰی وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِیْنَ حَتّٰی نَبْعَثَ رَسُوْلًاO (بنی اسرائیل : ۱۵)
''جو کوئی ہدایت کی راہ چلتا ہے سو وہ اپنے ہی نفع کے لئے سیدھی راہ پر چلتا ہے اور جو کوئی بے راہی کرتا ہے تو وہ بھی اپنے ہی لئے بے راہ ہوتا ہے اور کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا اور ہم کبھی سزا نہیں دیتے جب تک ہم کسی رسول کو ہم بھیج نہیں دیتے۔'' (۱۵ : ۱۷)

یہاں یہ عام قاعدہ بیان کر دیا گیا کہ تبلیغِ دین' رسول یا اُس کے کسی نائب کے ذریعے سے ہو جانا ضروری ہے اور اس کے بغیر کسی قوم پر عذاب نہیں آتا۔ محققین نے اس سے استنباط کیا ہے کہ جن قوموں تک رسول کی اِصلاً خبر

نہیں پہنچی وہ کفر و معاصی پر معذّب نہ ہوں گے۔ یہیں سے فقہاء نے یہ بھی نکالا ہے کہ کوئی کافر حربی اسلام لے آئے اور اُسے نماز' زکوٰۃ وغیرہ کے احکام کی خبر نہ پہنچے تو جب تک اُسے اطلاع نہ پہنچ لے تو اُس پر اِن واجبات و فرائض کی قضا نہیں ہے۔'' (تفسیر ماجدی اردو' صفحہ ۱۰۵۸' نوٹ: ۲۶)

(iii) كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ O (اَلطُّور: ۲۱)
''ہر شخص اپنے اعمال میں اسیر ہوگا۔'' (۲۱: ۵۲)

''علامہ آلوسی لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کو عمل میں جو قوّتیں اور عقل و فہم کی جو نعمتیں عطا فرمائی ہیں وہ بطورِ قرض ہیں اور اُن کے بدلہ میں بندے کا نفس اللہ تعالیٰ کے پاس بطورِ رہن ہے۔ اگر وہ قرض ادا کرے گا تو وہ رہن شدہ نفس اُسے واپس دے دیا جائے گا ورنہ بحق قرض خواہ ضبط ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کے اِس قرض کی ادائیگی کی صورت یہ ہے کہ انسان ان قوّتوں اور نعمتوں کو اُس کے حکم کے مطابق استعمال کرے۔ اگر اُس نے ایسا کیا تو وہ نفس اُسے واپس مل جائے گا' بصورتِ دیگر وہ گروی ہی رہے گا اور اُسے رہائی نصیب نہ ہوگی۔'' (ضیاء القرآن' ج ۴' ص ۶۵۰)

(iv) اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرٰى O وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِ نْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى O وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى O (اَلنَّجم: ۳۸-۴۰)
''کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا اور انسان کو صرف اپنی ہی کمائی ملے گی اور یہ کہ انسان کی سعی بہت جلد دیکھ لی جائے گی۔'' (۳۸-۴۰: ۵۳)

''سو اِس اعلان اور اطلاع کے بعد بھی انسان کا اپنی ذاتی ذمہ داری کی طرف سے غافل رہنا کیسا عجیب ہے! اَنْ لَّيْسَ لِلْاِ نْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى یعنی ایک کا ایمان دوسرے کے کام نہ آئے گا۔ مشرک جاہلی قوموں میں تو خیر یہ وبا عام تھی۔ یہود اہلِ کتاب کے ہاں بھی یہ عقیدہ پختہ طور پر قائم ہو گیا تھا کہ موروثوں اور بزرگوں کا مقبولین میں سے ہونا' اَخلاف و اولاد کے لئے بالکل کافی ہے اور جو لوگ پیمبروں میں سے ہیں' اُنہیں کچھ ہاتھ پیر ہلانے بلکہ تصحیح عقائد تک کی ضرورت نہیں اور مسیحیت نے تو نجات کا سارا دارومدار کفارہ کے عقیدے پر ٹھہرا دیا۔ اس کے برعکس قرآنِ حکیم سارا زور ہر فرد کی ذمہ داری اور مسئولیت پر دیتا ہے اور نجات کا دارومدار فضلِ خداوندی کے بعد اِسی کو ٹھہراتا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی اسی مسئلہ کا اثبات ہے۔۔۔ رہا یہ مسئلہ کہ کوئی شخص اپنے کسی دوست' عزیز' بزرگ وغیرہ کے لئے اپنے کچھ حقوق اپنی خوشی سے چھوڑ دے تو یہ اس آیت کے ہرگز منافی نہیں۔ یہ تو مؤمن کے حق میں دوسرے مؤمن کی طرف سے دعا کی صورت ہے' یہ کیوں نہ قبول ہوگی۔ اور اَموات کے ایصالِ ثواب کا مسئلہ احادیثِ صحیحہ متعدّدہ کی بناء پر اپنی جگہ بالکل ثابت ہے۔'' (تفسیر ماجدی اردو' صفحہ ۱۰۵۴' نوٹ: ۳۳)

وفاتِ مسیح علیہ السلام : چالیس سالہ دورِ حکومت کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کا انتقال ہو جائے گا اور آپ نبی اکرم ﷺ کے پہلو میں دفن ہوں گے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث میں سے ہے:

فَیَمْکُثُ اَرْبَعِیْنَ سَنَۃً ثُمَّ یُتَوَفّٰی وَیُصَلِّی عَلَیْہِ الْمُسْلِمُوْنَ وَیَدْفِنُوْنَہٗ' (مسند امام احمد' سنن ابی داؤد' مصنف ابن ابی شیبہ' صحیح ابن حبان' تفسیر ابن جریر)
''پھر وہ کائناتِ ارضی پر اتر کر چالیس سال قیام فرمائیں گے اور اُس کے بعد وفات پا جائیں گے' مسلمان اُن کی نمازِ جنازہ پڑھیں گے اور اُنہیں دفن کر دیں گے۔''

اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے بہ سندِ حسن محمد بن یوسف بن عبداللہ بن سلام کے سلسلہ سے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے:
قَالَ مَکْتُوْبٌ'' فِی التَّوْرٰۃِ صِفَۃُ مُحَمَّدٍ وَعِیْسَی بْنَ مَرْیَمَ یُدْفَنُ مَعَہٗ' (تفسیر ابن کثیر' ج ۱' ص ۵۸۴)
''عبداللہ بن سلام (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا: تورات میں محمد ﷺ کی صفت (حلیہ وسیرت) مذکور ہے اور یہ بھی مسطور ہے کہ عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) اُن کے ساتھ (پہلو میں) دفن ہوں گے۔''

''اناجیلِ اربعہ: حضرت مسیح علیہ السلام پر جو انجیل نازل ہوئی تھی' کیا موجودہ چاروں انجیلیں وہی ہیں یا یہ حضرت مسیح کے بعد کی تصانیف ہیں؟ اس کے متعلق تمام اہلِ علم کا جن میں نصاریٰ بھی شامل ہیں' اتفاق ہے کہ اِن میں سے کوئی ایک بھی حضرت مسیح علیہ السلام کی انجیل نہیں ہے اور نہ اُس کا ترجمہ ہے لیکن پھر اِن موجودہ انجیلوں کے متعلق عیسائی کیا کہتے ہیں اور ناقدین کی رائے کیا ہے۔ یہ مسئلہ تفصیل طلب ہے۔''

''یہ بات بہر حال تسلیم شدہ ہے کہ موجودہ چاروں انجیلوں کے متعلق نصاریٰ کے پاس کوئی ایسی سند موجود نہیں جس کی بنا پر وہ یہ کہہ سکیں کہ اُن کی روایات کا سلسلہ یا اُن کی ترتیب و تالیف کا زمانہ حضرت مسیح یا اُن کے شاگردوں (حواریوں) تک پہنچتا ہے۔ نہ اس کے لئے کوئی مذہبی سند ہے اور نہ تاریخی بلکہ اس کے خلاف خود عیسائیت کی مذہبی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ پہلی صدی عیسوی سے چوتھی صدی عیسوی کے اوائل تک عیسائیوں میں اکیس سے زیادہ انجیلیں الہامی یقین کی جاتی اور رائج و معمول بہا تھیں لیکن ۳۲۵ عیسوی میں نالیسیا کی کونسل نے اُن میں سے صرف چار کو منتخب کر کے باقی کو متروک قرار دے دیا اور سخت حیرت کا مقام ہے کہ کونسل کا یہ انتخاب کسی تاریخی اور علمی بنیاد پر نہیں ہوا بلکہ ایک طرح کی فال نکالی گئی اور اُسے الہامی اشارہ تسلیم کر لیا گیا۔ چنانچہ اِن اکیس سے زائد انجیلوں میں سے بعض یورپ کے قدیم کتب خانوں میں پائی گئی ہیں۔''

(۱) ''انجیلِ متّی: یہ سب سے قدیم انجیل تسلیم کی جاتی ہے بہ ایں ہمہ اس کے متعلق نصاریٰ میں سے علمائے متقدمین تو بالاتفاق اور علمائے موجودہ میں سے اکثر اس کے قائل ہیں کہ موجودہ انجیل متّی اصل نہیں ہے بلکہ اُس کا ترجمہ ہے' اس لئے کہ اصل کتاب عبرانی میں تھی جو اَب ناپید ہے۔ لیکن یہ اصل کا ترجمہ ہے یا اس میں تحریف ہوئی ہے۔ اس کے متعلق کوئی تاریخی سند موجود نہیں حتیٰ کہ مترجم کا نام تک معلوم نہیں اور نہ یہ معلوم ہوا کہ کس زمانہ میں یہ ترجمہ ہوا اور مشہور عیسائی عالم جرجیس زوبن الفتوحی اللبنانی نے اپنی کتاب میں تصریح کی ہے کہ متّی نے اپنی انجیل بیت المقدس میں بیٹھ کر ۳۹ عیسوی میں عبرانی زبان میں تصنیف کی تھی۔''

''(۲) انجیل مرقس: اس کے متعلق مشہور عیسائی عالم پطرس گوا ماگ اپنی کتاب ''مروج الاخبار فی تراجم الابرار'' میں مرقس کی سوانح حیات پر لکھتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ نسلاً یہودی اور پطرس حواری عیسیٰ (علیہ السلام) کا شاگرد تھا۔ رومیوں نے جب عیسائیت اختیار کرلی تو اُن کے مطالبہ پر اُس نے یہ انجیل تصنیف کی۔ مرقس اُلوہیتِ مسیح کا منکر تھا اور اُس نے اپنی انجیل میں اُس حصّہ کو بھی نہیں لیا جس میں حضرت مسیح علیہ السلام پطرس کی مدح کرتے ہیں۔ عیسائی دنیا کو اس بارے میں اختلاف ہے کہ مرقس کی انجیل کب تصنیف ہوئی۔''

''(۳) انجیل سینٹ لوقا: علمائے نصاریٰ میں جس قدر اختلاف متّی کی انجیل سے متعلق ہے' اُس سے بھی زیادہ لوقا کی انجیل کی صحت و عدم صحت کے متعلق ہے۔ الفاروق کے مصنف فرماتے ہیں کہ مسٹر گڈل اپنے رسالہ ''الہام'' میں دعویٰ کرتا ہے کہ لوقا کی انجیل الہامی نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ لوقا نے خود اپنی انجیل کی ابتداء میں لکھا ہے کہ یہ انجیل اُس نے شاہ فیلکس کے ساتھ خط و کتابت کی بناء پر لکھی ہے۔''

''(۴) انجیل یوحنّا: اس کے متعلق نصاریٰ کا عام عقیدہ یہ ہے کہ یہ حضرت مسیح علیہ السلام کے محبوب شاگرد (حواری) یوحنا زبدی کی ہے۔ زبدی صیاد' یوحنا کے والد کا نام تھا۔ نصاریٰ میں مشہور بارہ حواریوں میں سے سب سے زیادہ اِنہی کو تقدّس حاصل ہے۔ ۹۶ عیسوی میں پادریوں' لاٹ پادریوں کی مجلسِ مشاورت ہوئی اور اُنہوں نے یوحنا کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست پیش کی کہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کی باتیں تحریر کریں اور جو باتیں دوسری انجیلوں میں پائی جاتی ہیں' اُن کے ماسوا جو کچھ معلوم ہو وہ لکھیں' خصوصیت سے الوہیتِ مسیح کا مسئلہ ضرور لکھیں تاکہ ہماری جماعت کے خلاف ہمارے ہاتھ مضبوط ہوں۔ یوحنا اُن کی بات نہ ٹال سکے اور یہ انجیل لکھنے پر مجبور ہوئے۔ مسیحی علماء اس انجیل کے زمانہ تصنیف کی تعیین میں مختلف نظر آتے ہیں مگر اُن کے مقابلہ میں اُن مسیحی علماء کی تعداد کم نہیں ہے جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یوحنا کی انجیل' حواری یوحنا کی تصنیف ہرگز نہیں ہے۔''

''یہ بات بھی کم حیرت کے لائق نہیں ہے کہ یہ اناجیلِ اربعہ جن جن زبانوں میں منقول ہیں' اُن کی عبارات و کلمات کے تحفظ اور بقاء کی کبھی پروا نہیں کی گئی بلکہ ایک ہی زبان کے مختلف ایڈیشنوں اور اشاعتوں میں بہ کثرتِ الفاظ اور جملوں کی تبدیلی' کمی اور بیشی موجود ہے۔ خصوصاً جن مقامات پر علمائے نصاریٰ اور علمائے اسلام کے درمیان بشارات کے سلسلہ میں یہ بحث آگئی ہے کہ اُن کا مصداق خاتم الانبیاء ﷺ ہیں یا حضرت مسیح علیہ السلام ہیں یا کوئی اور نبی۔ نیز جن مقامات پر الوہیتِ مسیح کی صراحت میں فرق پڑتا نظر آتا ہو' اُنہیں کافی تختۂ مشق بنایا جاتا رہا ہے۔۔۔۔ غرض موجودہ چاروں انجیلیں الہامی نہیں ہیں اور نہ اُن کے الہامی ہونے کی روایتی سند ہے اور نہ تاریخی۔'' (''قصص القرآن''۔۔ حفظ الرحمٰن سیوہاروی' جلد چہارم' صفحات ۱۷۵۔۱۸۳ ملخص)

حیاتِ مسیح علیہ السلام اور آپ کا زمین کو اترنے کا ثبوت قرآنِ حکیم اور احادیث کی روشنی میں: جیسا کہ سورہ آلِ عمران کی آیت ۵۵ اور سورۃ النساء کی آیت ۱۵۸ میں بیان ہوا' عیسیٰ علیہ السلام کو بہ رحمتِ الٰہی جسم اور روح کے ساتھ اوپر آسمان کو اٹھا لیا گیا اور اِس طرح اُنہیں دشمنوں (یہود) کی دست درازی سے بچا لیا گیا۔

۲۶۶۱ (عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کی والدہ)

عیسیٰ علیہ السلام کا اب تک قید بہ حیات ہونا اور وفات نہ پانا درجِ ذیل سورہ آلِ عمران کی آیت ۴۶ اور سورۃ النساء کی آیت ۱۵۹ سے ثابت ہے:

(۱) وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا (آلِ عمران : ۴۶)

''اور عیسیٰ علیہ السلام لوگوں سے گہوارہ میں بھی اور پختہ عمر میں بھی بات کریں گے۔'' (۳ : ۴۶)

کَھْل کا اطلاق تیس (۳۰) سے اوپر پچاس (۵۰) سال کی عمر تک ہوتا ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے بچپن اور پھر پختہ عمری کے ذکر سے اشارہ اس طرف بھی ہو گیا کہ (۱) ہر انسان کی طرح آپ کا نشو و نما بھی تدریجًا ہوتا رہا اور یہ نشو و نما خود ردِّ الوہیت پر ایک مستقل دلیل ہے۔ (۲) بچپن اور پختہ عمری کے ذکر کے بعد عالمِ شباب کا ذکر نہ کرنا اُس زمانہ میں آپ کے رفع الی السماء اور حیاتِ سماوی کی طرف اشارہ ہے (تفسیر بیضاوی)

(۲) وَإِنْ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ (اَلنساء : ۱۵۹)

''اور اہلِ کتاب میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو آپ (علیہ السلام) پر اپنے مرتے وقت تک ایمان نہ لے آئے۔'' (۴ : ۱۵۹)

قَبْلَ مَوْتِہٖ میں ہ ضمیر کا تعلق عیسیٰ علیہ السلام سے ہے ☆ جس کا مطلب یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی وفات سے پہلے اہلِ کتاب بہ شمولِ یہود اُن کے سچے پیغمبر ہونے پر ایمان لے آئیں گے اور یہ خوب معلوم ہے کہ تمام اہلِ کتاب آپ علیہ السلام کی رسالت پر اب تک ایمان نہیں لائے' لہٰذا جسم اور روح سمیت آپ کی حیات ثابت ہو گئی۔ اور محولہ بالا دونوں آیات آپ کے آسمانوں پر زندہ ہونے کی دلیل ہیں۔

آیتِ مذکورہ کی درجِ بالا تفسیر پر جمہور مفسرین کا اتفاق ہے۔ شہرہ آفاق محدّث' عالی مرتبہ مفسر اور انتہائی مستند مؤرّخِ اسلام۔ عماد الدین ابن کثیر' عبداللہ بن عباس اور حسن بصری رضی اللہ عنہما کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آیت کی تفسیر حضرت قتادہ' عبدالرحمٰن اور اکثر مفسرین کی ہے اور یہی تفسیر صحیح اور درست ہے جیسا کہ ہم ایک مضبوط و مُسکت دلیل سے اِسے ثابت کریں گے۔'' (تفسیر ابن کثیر' جلد اوّل)

اور محدّثین کے سرتاج۔ حافظ ابن حجر عسقلانی درجِ بالا تفسیر کی حمایت میں رقمطراز ہیں:

''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس تفسیر پر اعتماد کیا ہے اور آپ کی تفسیر کو ابن جریر طبری نے سعید بن جبیر اور ابو رجعہ کے بیان میں درج کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا

☆ اس آیت کی ایک اور تاویل یہ ہے کہ قَبْلَ مَوْتِہٖ میں ہ ضمیر کا تعلق اہلِ کتاب سے ہے جس کا مطلب یہ ہو گا کہ اپنے مرنے سے پہلے ہر یہودی اور عیسائی عیسیٰ علیہ السلام کے مرتبہ عالی اور سچے رسول کو تسلیم کرتے ہوئے اُن پر ایمان لے آئے گا اگرچہ اُس وقت کا ایمان بے فائدہ ہو گا اور قابلِ قبول نہ ہو گا۔

کہ قَبۡلَ مَوۡتِہٖ میں ہ ضمیر کا تعلق عیسیٰ علیہ السلام سے ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی وفات سے پہلے اہلِ کتاب بہ شمولِ یہود اُن کے سچے پیغمبر ہونے پر ایمان لے آئیں گے۔ قسم بخدا! عیسیٰ علیہ السلام حیات ہیں اور اہلِ کتاب آپ کے زمین کو اترنے پر آپ پر ایمان لے آئیں گے۔'' (فتح الباری۔۔شرح صحیح بخاری' جلد ششم' صفحہ ۳۰۴)

حیاتِ مسیح علیہ السلام احادیث نبویہ کی روشنی میں : (۱) صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ابوقتادہ انصاری رضی اللہ عنہ کے مولا حضرت نافع سے یہ حدیث ملتی ہے جس میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

کَیۡفَ اَنۡتُمۡ اِذَا نَزَلَ ابۡنُ مَرۡیَمَ فِیۡکُمۡ وَاِمَامُکُمۡ مِّنۡکُمۡ (کتاب الانبیاء)

''تم کیا محسوس کرو گے جب عیسیٰ ابن مریم تمہاری طرف (آسمان سے) نزول کریں گے جبکہ تم میں سے کوئی شخص نماز کی امامت کرا رہا ہوگا۔''

(۲) محدّث ابنِ ابی حاتم اور مشہور و مستند محدّث و مفسّر ابن جریر طبری نے حسن بصری رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث روایت کی جس میں نبی اکرم ﷺ نے یہودیوں سے فرمایا:

اِنَّ عِیۡسٰی لَمۡ یَمُتۡ وَاِنَّہٗ رَاجِعٌ اِلَیۡکُمۡ قَبۡلَ یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ

''بے شک عیسیٰ علیہ السلام (ابھی) مرے نہیں ہیں اور دراصل وہ تمہاری طرف روزِ قیامت سے پہلے لوٹیں گے۔''

(۳) ابنِ جریر طبری اور ابنِ ابی حاتم سورہ آلِ عمران کی آیت ۶۱ کی تفسیر میں حضرت ربیع بن انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے ایک طویل حدیث بیان کرتے ہیں جس میں نبی اکرم ﷺ نے عیسائیوں کے وفدِ نجران سے فرمایا:

اَلَسۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ اَنَّ رَبَّنَا حَیٌّ لَا یَمُوۡتُ وَاَنَّ عِیۡسٰی یَاۡتِیۡ عَلَیۡہِ الۡفَنَآءُ

''کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہمارا پروردگار زندہ ہے' اُسے فنا نہیں اور یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام کو موت آنی ہے۔''

یہاں یہ بات توجہ طلب ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے یَاۡتِیۡ (مضارع) کا فعل استعمال کیا ہے جس کا تعلق زمانہ مستقبل سے ہوتا ہے اور ماضی کا صیغہ اَتٰی عَلَیۡہِ استعمال نہیں فرمایا جس کا صاف اور واضح مطلب یہی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام ابھی فوت نہیں ہوئے بلکہ آنے والے زمانہ میں فوت ہوں گے۔

(۴) علامہ ابنِ کثیر نے اپنی تفسیر میں عیسیٰ علیہ السلام کے زمین کو نزول سے متعلق کچھ احادیث اس عنوان کے تحت بیان کی ہیں:

''ذِکۡرُ الۡاَحَادِیۡثِ الۡوَارِدَۃِ فِیۡ نُزُوۡلِ عِیۡسٰی ابۡنِ مَرۡیَمَ عَلَیۡہِمَا الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ اِلَی الۡاَرۡضِ مِنَ السَّمَآءِ فِیۡ آخِرِ الزَّمَانِ قَبۡلَ یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ''

۲۶۶۳ (عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کی والدہ)

''عیسیٰ علیہ السلام کا روزِ قیامت سے پہلے آسمان سے زمین کو نزول سے متعلق احادیثِ واردہ کا بیان''

اِن سلسلہ احادیث کو بیان کرنے کے بعد علامہ آخر میں بیان کرتے ہیں:
''ابوہریرہ' ابنِ مسعود' عثمان ابن العاص' ابواُمامہ' النواس بن سمعان' عبداللہ بن عمرو ابن العاص' مجمع بن حارثہ' ابوشریحہ اور حذیفہ بن اُسید رضی اللہ عنہم سے مروی اِن احادیث کا سلسلہ جو ہم تک پہنچا ہے' مسلسل اور جاری ہے۔ اِن احادیث میں عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے طریق اور نزول کی جگہ کا بیان ہے۔'' (تفسیر ابنِ کثیر' جلد اوّل' صفحات ۵۷۸' ۵۸۳)

(۵) صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث ہے جس میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا:
وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَیُوْشِکَنَّ اَنْ یَّنْزِلَ فِیْکُمْ اِبْنُ مَرْیَمَ حَکَمًا عَدلاً فَیَکْسِرُ الصَّلِیْبَ وَ یَقْتُلُ الْخِنْزِیْرَ وَیَضَعُ الْجِزْیَۃَ حَتّٰی لَایَقْبَلُہٗ اَحَد" حَتّٰی تَکُوْنَ السَّجْدَۃُ الْوَاحِدَۃُ خَیْرًا مِّنَ الدُّنْیَا وَمَا فِیْھَا ثُمَّ یَقُوْلُ اَبُوْھُرَیْرَۃَ: فَاقْرَءُ وْا مَا شِئْتُمْ "وَاِنْ مِّنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِہٖ قَبْلَ مَوْتِہٖ" مُتَّفَق" عَلَیْہِ (مشکوۃ: باب نزول عیسیٰ علیہ السلام)
''قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں مجھ محمد کی جان ہے' تم پر ایک وقت آئے گا جب عیسیٰ علیہ السلام ایک منصف ثالث کی حیثیت سے تم میں اتریں گے۔ آپ صلیب کو توڑیں گے' خنزیر کو قتل کریں گے' جزیہ کو ختم کریں گے' آپ دولت کو اس فیاضی سے تقسیم کریں گے کہ اُس وقت کوئی بھی اُسے قبول نہیں کرے گا۔ اُس وقت اللہ کو ایک سجدہ کرنا تمام دنیا و مافیہا سے بہتر ہوگا۔ اس کے بعد ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس حقیقت کی تصدیق کے لئے سورۃ النساء کی آیت ۱۵۹ کو پڑھ لو جس میں فرمایا گیا: ''اہلِ کتاب میں کوئی بھی ایسا نہیں جو اپنے مرنے سے پہلے عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہ لے آئے۔''

حَکَمًا عَدلاً کا مطلب یہ ہے کہ آپ عیسائیت کو کالعدم قرار دیں گے اور تمام لوگوں کو اسلام یعنی دینِ حنیف کے قبول کرنے کا حکم فرمائیں گے۔
فَیَکْسِرُ الصَّلِیْبَ: یہ عیسیٰ علیہ السلام کے صلیب دیئے جانے یا قتل ہونے سے متعلق نصاریٰ اور یہود کے غلط عقیدے کے ردّ میں ہوگا۔
وَیَقْتُلُ الْخِنْزِیْرَ: یہ ثابت کرنے کے لئے ہے کہ آپ خاتم الانبیاء ﷺ کے اُمّتی ہونے کی حیثیت سے نازل ہوئے ہیں اور چونکہ خاتم الانبیاء ﷺ کی شریعت میں خنزیر (پالتو ہو یا جنگلی) حرام ہے' اس لئے اے نصاریٰ اور یہودیو! اس کی پرورش کرنا اور کاروبار کرنا بھی حرام ہے۔
یَضَعُ الْجِزْیَۃَ: کا مطلب یہ ہے کہ عیسائیت منسوخ ہو جائے گی اور تمام لوگوں کو اسلام (دینِ حنیف) قبول کرنا ہوگا اور مسلمان ہونے کی وجہ سے اُنہیں جزیہ نہیں دینا پڑے گا۔

’’آپ کے زمانہ میں لوگ اِس حد تک خوشحال اور مرفہ الحال ہوں گے کہ کوئی بھی شخص مالی امداد کا محتاج نہ ہوگا۔ علاوہ ازیں لوگ عبادت کرنے کو عزیز رکھیں گے اور اُسے تمام دنیاوی ترجیحات پر مقدم رکھیں گے اور مذہبی فرائض کی ادائیگی میں وہ دلی سکون اور طمانیتِ قلبی محسوس کریں گے۔‘‘

(۶) عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: وَاللّٰهِ لَيَنْزِلَنَّ ابْنُ مَرْيَمَ حَكَمًا عَدْلًا فَلَيَكْسِرَنَّ الصَّلِيْبَ وَلَيَقْتُلَنَّ الْخِنْزِيْرَ وَلَيَضَعَنَّ الْجِزْيَةَ وَلَتُتْرَكَنَّ الْقِلَاصُ فَلَا يُسْعٰى عَلَيْهَا وَلَتَذْهَبَنَّ الشَّحْنَاءُ وَالتَّبَاغُضُ وَالتَّحَاسُدُ وَلَيَدْعُوَنَّ اِلَى الْمَالِ فَلَا يَقْبَلُهُ أَحَدٌ‘‘ (رواہ مسلم)

’’ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے اُنہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بخدا! عیسیٰ بن مریم ایک عادل حاکم کی حیثیت سے ضرور بالضرور نازل ہوں گے‘ وہ یقیناً صلیب کو توڑیں گے‘ خنزیر کو قتل کریں گے‘ جزیہ اُٹھادیں گے۔ اونٹوں کو سواری کے لئے چھوڑ دیا جائے گا ☆ اور اُن پر سواری نہیں کی جائے گی۔ عداوت‘ بغض وحسد کا نام ونشان نہ ہوگا۔ لوگوں کو مال قبول کرنے کے لئے بلایا جائے گا لیکن کوئی اُسے قبول نہیں کرے گا۔‘‘

(۷) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنْ أُمَّتِيْ يُقَاتِلُوْنَ عَلَى الْحَقِّ ظَاهِرِيْنَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ فَيَنْزِلُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ فَيَقُوْلُ أَمِيْرُهُمْ: تَعَالَ صَلِّ لَنَا فَيَقُوْلُ: لَا اِنَّ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ أُمَرَاءُ تَكْرِمَةَ اللّٰهِ هٰذِهِ الْأُمَّةِ (صحیح مسلم)

’’عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میری اُمّت کا ایک گروہ اللہ کے نام پر مسلسل لڑتا رہے گا اور وہ روزِ قیامت تک غالب آجائے گا۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے اور لوگوں کا امیر آپ کو نماز کی امامت کے لئے بلائے گا تو آپ جواب دیں گے: تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت حاصل ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کا یہ فرمان اُس عزت وتکریم کی بدولت ہے جو اللہ اِس اُمّتِ (محمدیہ) کو عطا کی ہے۔‘‘

(۸) عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: فَاِذَا جَاؤُ الشَّامَ خَرَجَ (الدَّجَّالُ) فَبَيْنَاهُمْ يَعُدُّوْنَ الْقِتَالَ يُسَوُّوْنَ الصُّفُوْفَ اِذْ أُقِيْمَتِ الصَّلٰوةُ فَيَنْزِلُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ

’’ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے‘ اُنہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب مسلمان ملک شام کو پہنچ جائیں گے تو دجّال کا خروج ہوگا۔ جب مسلمان اُس سے قتال کے لئے تیاری کررہے ہوں گے اور اپنی صفوں کو درست کررہے ہوں گے‘ نماز کی اقامت کہی جائے گی تو (اُس وقت) عیسیٰ بن مریم کا نزول ہوگا۔‘‘ (صحیح مسلم)

(۹) عَنْ حُذَيْفَةَ بْنِ الْأَسَيْدِيِّ قَالَ: أَشْرَفَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَنَحْنُ نَتَذَكَّرُ السَّاعَةَ فَقَالَ:

☆ سورۃ التّکویر کی آیت ۴ وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ (اور جب اونٹنیاں چھٹی پھرنے لگیں) میں بھی یہی مضمون آیا ہے۔

لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰی تَرَوْا عَشَرَ آیَاتٍ : طُلُوْعَ الشَّمْسِ مِنْ مَّغْرِبِهَا وَالدُّخَانَ وَالدَّابَّةَ وَ خُرُوْجُ یَاجُوْجَ وَ مَاجُوْجَ وَ نُزُوْلُ عِیْسَی بْنِ مَرْیَمَ وَالدَّجَّالَ وَ ثَلَاثَةَ خُسُوْفٍ : خَسْفٌ" بِالْمَشْرِقِ وَخَسْفٌ" بِالْمَغْرِبِ وَخَسْفٌ" بِجَزِیْرَةِ الْعَرَبِ وَنَارٌ" تَخْرُجُ مِنْ قَعْرِ عَدَنَ تَسُوْقُ وَتَحْشُرُ النَّاسَ تَبِیْتُ مَعَهُمْ حَیْثُ بَاتُوْا وَتَقِیْلُ مَعَهُمْ حَیْثُ قَالُوْا (صحیح مسلم، مسند امام احمد، سنن ابن ماجه، سنن دارمی)

"حضرت حذیفہ بن الأسیدی بیان کرتے ہیں کہ جس دوران ہم روزِ قیامت کے بارے میں باہم بات کر رہے تھے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں اوپر سے جھانکا اور فرمایا کہ قیامت اُس وقت تک نہیں آئے گی جب تک تم دس نشانیاں نہ دیکھ لو: (۱) سورج کا مغرب سے طلوع ہونا ☆ (۲) دھواں (۳) دابۃ الارض کا خروج (سورۃ النمل: ۸۲) ☆☆ (۴) یاجوج ماجوج کا خروج (۵) عیسیٰ علیہ السلام کا نزول اور (۶) دجّال کا قتل۔ اور (۷-۹) تین علامتیں زمین کے نگل جانے سے متعلق ہیں: ایک مشرق میں، دوسری مغرب میں اور تیسری جزیرۃ العرب میں (۱۰) ملکِ عدن سے آگ کا بھڑکنا جو لوگوں کو منتشر کر دے گی۔ جب لوگ رات کو سو جائیں گے تو آگ بھی آرام کرے گی اور جب لوگ دوپہر کو قیلولہ کریں گے تو آگ بھی قیلولہ کرے گی۔"

(۱۰) عَنْ مُجَمِّعِ بْنِ حَارِثَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: یَقْتُلُ ابْنُ مَرْیَمَ الدَّجَّالَ بِبَابِ لُدٍّ

"مجمع بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: عیسیٰ ابنِ مریم (علیہما السلام) دجّال کو بابِ لُد ☆☆☆ کے پاس قتل کریں گے۔" (مسند امام احمد، ترمذی)

عیسیٰ علیہ السلام کی تدفین امام الانبیاء ﷺ کے پہلو میں ہوگی: جیسا کہ قبل ازیں بیان ہوا کہ چالیس سال حکومت کرنے کے بعد عیسیٰ علیہ السلام وفات پائیں گے اور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پہلو میں دفن ہوں گے۔ اس سلسلہ میں دو احادیث کا حوالہ صفحہ ۲۶۵۹ پر دیا جا چکا ہے۔ چند مزید احادیث درج ذیل ہیں:

(۱) عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ : قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اِنِّیْ اَرٰی اَعِیْشُ بَعْدَكَ فَتَاْذَنُ لِیْ اَنْ اُدْفَنَ مَعَكَ فَقَالَ: وَأَنّٰی لَكِ بِذٰلِكَ الْمَوْضِعِ مَافِیْهِ اِلَّا مَوْضِعُ قَبْرِیْ وَقَبْرِ أَبِیْ بَكْرٍ وَعُمَرَ وَعِیْسَی بْنِ مَرْیَمَ

☆ یہ شاید سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کے فرمان کی تعظیم و تکریم کے لئے ہے جب آپ نے شاہِ وقت نمرود کے دعوائے الوہیت کو غلط ثابت کرنے کے لئے اُس سے کہا تھا کہ "اللہ تو وہ ہے جو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے۔ اگر تو واقعی رب ہے تو ذرا اُسے مغرب سے نکال کے دکھا دے۔" (سورۃ البقرۃ: ۲۵۸)

☆☆ تمثیلی زبان میں اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ جانور انتہائی مادیت گزیدگی کا نمائندہ ہوگا۔ یہ بذاتِ خود اس بات کی علامت ہوگا کہ اُس وقت توبہ کا دروازہ بند ہو چکا ہوگا۔

☆☆☆ یہ دمشق کے حفاظتی قلعے کے دروازے کا نام ہے۔

۲۶۶۶ (عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کی والدہ)

''حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے کہا کہ میں چاہتی ہوں کہ آپ کے بعد زندہ رہوں' لہٰذا میں آپ کے پہلو میں دفن ہونے کی اجازت چاہتی ہوں۔ نبی ﷺ نے فرمایا: یہ کیسے ممکن ہے جبکہ میرے ہاں ابوبکر' عمر اور عیسیٰ ابن مریم کی قبور کے علاوہ کوئی اور جگہ نہیں ہے!''

''امام حسن اور پھر عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما کی روضہ رسول میں تدفین کے لئے کوشش کی گئی لیکن مندرجہ بالا وجہ (حدیث) سے ایسا نہ ہوسکا۔'' (''مظاہر حق'' ۔شرح مشکوٰۃ المصابیح' باب : نزول عیسیٰ علیہ السلام' جلد چہارم' صفحہ ۳۶۰)

(۲) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: يَنْزِلُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ الْاَرْضَ فَيَتَزَوَّجُ وَ يُوْلَدُ لَه' وَ يَمْكُثُ خَمْسًا وَّ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ثُمَّ يَمُوْتُ فَيُدْفَنُ مَعِيَ فِيْ قَبْرِيْ فَأَقُوْمُ أَنَا وَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ فِيْ قَبْرٍ وَّاحِدٍ بَيْنَ أَبِيْ بَكْرٍ وَّعُمَرَ("كتاب الوفاء" لابن الجوزى)

''حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے' اُنہوں نے کہا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: عیسیٰ بن مریم زمین پر اتریں گے' نکاح فرمائیں گے' اُن کی اولاد ہوگی۔ زمین میں وہ چالیس برس رہیں گے پھر آپ وفات پائیں گے اور میرے مقبرے میں میرے (پہلو میں) دفن ہوں گے۔ بروزِ قیامت میں اور عیسیٰ بن مریم اپنی قبر سے ابوبکر اور عمر کے ساتھ باہر نکلیں گے۔'' (''کتاب الوفاء'' لابن الجوزی)

(۳) أَخْرَجَ الْبُخَارِيُّ فِيْ تَارِيْخِهٖ وَالطَّبْرَانِيُّ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ سَلَّامٍ قَالَ: يُدْفَنُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَصَاحِبَيْهِ فَيَكُوْنُ قَبْرُه' رَابِعًا

''امام بخاری نے اپنی تاریخ میں اور طبرانی نے عبداللہ بن سلام سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ عبداللہ بن سلام نے کہا: عیسیٰ بن مریم رسول اللہ ﷺ اور آپ کے دو صحابہ (ابوبکر و عمر) کے پہلو میں دفن ہوں گے تو (اس طرح) عیسیٰ علیہ السلام کی قبر چوتھی قبر ہوگی۔''

اِس سلسلہ میں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ''مُسند'' میں متعدد احادیث نقل کی ہیں۔ جن میں سے ایک حدیث میں جس کے راوی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں' نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:۔

''عیسیٰ علیہ السلام زمین پر اترنے کے بعد لوگوں کو دعوتِ اسلام دیں گے۔ آپ کے زمانہ میں اسلام کے سوا باقی تمام اَدیان کالعدم ہوجائیں گے۔ شیر اونٹوں کے ساتھ' چیتے گایوں اور بھیڑوں کے ساتھ چرنے لگیں گے اور بچے سانپوں کے ساتھ کھیلیں گے جو اُنہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔''

سیّد الاولیاء حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کی حیاتِ طیّبہ اور آپ

کے بروزِ قیامت زمین پر اُترنے کی تصدیق کے لئے تفسیر ابنِ کثیر، تفسیر دُرِّ منثور، تفسیر ابن جریر طبری، کنز العمال اور مسند امام احمد وغیرہ کا مطالعہ کیا جائے۔

عیسیٰ علیہ السلام کی حیاتِ طیّبہ اور آپ کے معجزات پر کچھ اعتراضات اور جوابات

قادیانیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا انکار کیا ہے اور اس طرح وہ دانستہ طور پر یہود کی طرح تغیّر و تبدّل کا شکار ہوئے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کے خود اختراعی اور خانہ ساز ''مثیلِ مسیح''۔۔ مرزا غلام احمد قادیانی کی ذات میں کوئی بھی تو عمدہ بات نہیں تھی اور وہ اندر سے بالکل خالی تھا۔ اس لئے قادیانیوں نے عیسیٰ علیہ السلام پر خداداد معجزات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس سلسلہ میں اُن کے اعتراضات کا جائزہ ہدیہ قارئین ہے

(1) عیسیٰ علیہ السلام کا مٹی سے بنے ہوئے پرندے میں پھونک مارنے اور اُس کے اُڑ جانے (بحوالہ سورہ آلِ عمران: ۴۹) سے متعلق وہ یہ کہتے ہیں کہ پیدا کرنا بلا شرکتِ غیرے اللہ تعالیٰ کی صفت ہے جیسا کہ وہ خود قرآن میں فرماتا ہے: اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ (اللہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے)' خَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ (اُس نے ہر چیز کو پیدا کیا) لَا یَخْلُقُوْنَ شَیْئًا وَّھُمْ یُخْلَقُوْنَ (وہ کسی کو پیدا نہیں کر سکتے اور وہ خود بھی مخلوق ہیں)۔

قادیانیوں کا کہنا یہ ہے کہ اگر عیسیٰ علیہ السلام کو پرندوں میں پھونک مار کر اُنہیں پیدا کرنے کو مان لیا جائے تو اس سے عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت اور خدا ہونے کو ماننا پڑے گا۔ پھر مشرکین اور مسلمانوں میں کیا فرق باقی رہے گا کہ مشرکوں نے اپنے بتوں کو خدا مان لیا اور اس طرح وہ کافر ہو گئے۔ جبکہ مسلمان عیسیٰ علیہ السلام کی (معاذ اللہ) الوہیت پر ایمان لا کر مرتد ہو جائیں گے۔ لہٰذا قادیانیوں کے نزدیک آیتِ مذکورہ کا مطلب یہ ہے:

''میں تمہارے دلوں کو ایمان کے نور سے منوّر کرتا ہوں جس سے وہ پرندوں کی شکل اختیار کر کے اللہ کی راہوں پر چل پڑتے ہیں اور یہاں مٹی کے پرندے مراد نہیں ہیں۔'' (بیان القرآن۔ محمد علی لاہوری)

محمد علی لاہوری قادیانی کے نزدیک مذکورہ بالا ترجمہ کی تصدیق اُس حدیث سے ہوتی ہے جس میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ شہداء کی رُوح سبز رنگ کی چڑیوں کے پیٹ میں ہوتی ہے اور وہ جنت میں گھومتی پھرتی ہیں اور یہی معنیٰ سورہ آلِ عمران کی آیت ۴۹ کا ہے۔

ایک اور مقام پر اُس نے لکھا ہے:

''موت کے بعد دنیا کی طرف رجوع کرنا قانونِ فطرت کے خلاف ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ جنت میں شہداء دنیا کی طرف واپس آنا چاہتے ہیں لیکن اُن کی خواہش کی تکمیل نہیں ہوتی کیونکہ یہ قانون کے

خلاف ہے۔ پس عیسیٰ علیہ السلام مردہ کو زندہ نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اگر مُردہ نے اپنی عمر پوری کرنے کے بعد مرنا ہوتا تو اُسے دوبارہ زندگی کیسے ملتی۔ اور اگر اُس کی زندگی ابھی باقی ہے تو اُس کی موت وقت سے پہلے کیوں کر ہوئی؟

جواب: خَلق کے دو معنی ہیں: (۱) کسی چیز کو پیدا کرنا اور اُسے نیست سے ہست میں لانا (۲) کسی چیز کی تشکیل کرنا اور ڈھالنا۔ پہلے معانی کی رُو سے پیدا کرنے کی خصوصیت بلا شرکتِ غیرے اللہ کے ساتھ خاص ہے جبکہ دوسرے معنیٰ کی رُو سے یہ ملکہ انسانوں کو بھی حاصل ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام پرندے کی شکل بناتے تھے اور اُس میں زندگی اللہ دیتا تھا۔ عیسیٰ علیہ السلام اپنے اس معجزے میں خود مختار نہیں تھے بلکہ یہ آپ پر عطیہ خداوندی تھا۔ قرآنِ حکیم جب بھی آپ کے معجزات کا ذکر کرتا ہے، وہ وہاں بـاذن الله کے لفظ لاتا ہے (جیسا کہ سورہ آلِ عمران کی آیت ۴۹ اور سورۃ المائدۃ کی آیت ۱۱۰ میں آیا) تا کہ لوگ عیسیٰ علیہ السلام کو الوہیت کا مرتبہ دینے کی غلطی نہ کر بیٹھیں۔

محمد علی لاہوری کی تاویل میں نہ تو عیسیٰ علیہ السلام کی کوئی خصوصیت ملتی ہے اور نہ ہی اُس میں معجزہ کی کوئی جھلک ہے کیونکہ تمام انبیاء علیہم السلام نورِ ایمان سے لوگوں کے دلوں کو متوّر کرتے رہے ہیں۔ رسولوں اور نبیوں جیسی عظیم المرتبت ہستیوں کی تو بات ہی کچھ اور ہے، قلوب و اذہان کو متوّر کرنے کا کام تو اولیاء اللہ نے بھی کیا ہے۔

رہا اِس بات پر اِصرار کہ موت کے بعد دوبارہ زندگی پانا قانونِ قدرت کے خلاف ہے، تو یہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ "معجزہ ایک غیر معمولی وقوعہ ہوتا ہے جو براہِ راست اللہ کے اِذن سے ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ اللہ قادرِ مطلق کی قدرتِ کاملہ و مطلقہ کو مان لیا جائے تو ایمان لانے میں کوئی مشکل نہیں رہتی کہ وہ جیسے بھی چاہے اور جو بھی چاہے اور جس انداز میں چاہے، معجزہ دکھا سکتا ہے۔ تمام تر الٰہی قوانین کے ہوتے ہوئے معجزہ خالق و مالکِ حیات، اللہ کی آزادانہ رضا کا اظہار ہے جو اُس کے ارادے کی اُس تکمیل کا نام ہے جو دیکھنے والوں کے لئے عجیب و غریب ہوتا ہے۔"

اِن معترضین اور نقادوں کو کیا یہ معلوم نہیں کہ ربِّ ذوالجلال والاکرام نے حضرت عُزیر علیہ السلام کو ایک سو سال تک موت دینے کے بعد دوبارہ زندگی بخشی (بحوالہ سورۃ البقرۃ: ۲۵۹)۔ علاوہ ازیں قرآنِ حکیم میں درجِ ذیل واقعات بھی حق کے متلاشیوں کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہیں:

سورۃُ البَقَرَۃ: آیات ۵۵، ۵۶، ۷۲، ۷۳، ۲۴۳، ۲۶۰ اور اصحابِ کہف کا ۳۰۹ سال کے بعد زندہ ہونا (بحوالہ سورۃُ الکَہف: ۲۵)۔

ایک حدیث کے مطابق دجّال لوگوں کو مارنے کے بعد اُنہیں زندہ کرے گا۔ اگر قرآنی متن اور احادیث کے معانی تمثیلاً لئے جائیں تو پھر قرآن و حدیث بازیچہ اَطفال ہی بن کے رہ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ایسی کج رویوں سے محفوظ رکھے!

<u>اِس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ موت کے بعد زندگی نہ دینا قادرِ مطلق کا قانون ہے لیکن موت کے بعد زندگی دینا اُس کی قدرتِ کاملہ کا مظہر اور معجزہ ہے۔"</u>

۲۶۶۹ (عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کی والدہ)

(2) عیسیٰ علیہ السلام کا مادر زاد اندھے کو بینا کر دینے اور کوڑھی کو شِفا یاب کر دینے کے سلسلہ میں (بحوالہ سورہ آلِ عمران: ۴۹) محمد علی لاہوری کا کہنا ہے کہ طب و طبابت میں مشغول ہونا نبوت کی شان کے لائق نہیں کیونکہ اُس کا کام تو اپنی قوم تک پیغام الٰہی کا پہنچانا ہوتا ہے نہ کہ اُن کا علاج کرنا۔ لہٰذا قادیانیوں کے نزدیک یہاں اَکْمَہَ سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے دل رسالت کے تابندہ اور روشن پہلو کو دیکھنے سے اندھے تھے۔ قرآن کہتا ہے:

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى الصُّدُوْرِ O (الحج: ۴۶)

''دراصل آنکھیں اندھی نہیں ہو جایا کرتیں بلکہ دل جو سینوں میں ہیں، وہ اندھے ہو جایا کرتے ہیں۔'' (۲۲:۴۶)

''اِسی طرح اُس کا کہنا ہے کہ لفظ اَبْـرَص (کوڑھی) بھی اُسی مفہوم میں آیا ہے اور اس سے مراد وہ برائی اور بدی ہے جو بظاہر بڑی دلکش اور جاذب معلوم ہوتی ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں اُن لوگوں کا علاج کرتا ہوں جو دل کے اندھے پن کی دلدل میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں اور اُن لوگوں کا بھی جو بدی میں پھنس کر کوڑھی ہو گئے ہیں اور اس طرح میں اُنہیں ایمان اور خدا خوفی (تقویٰ) کی راہ دکھا کر شِفا یاب اور رُو بہ صحت کر دیتا ہوں۔'' (''بیان القرآن''۔ محمد علی لاہوری قادیانی)

جواب: ذاتی تاویل کے دروازے ہر کہ و مہ کے لئے کھلے ہیں۔ لیکن جہاں تک استدلال کے میدان کا تعلق ہے، ہم یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہیں کہ آیت (۴۹) مذکورہ کی تاویل گزشتہ چودہ صدیوں میں کس نے اس طرح کی ہے جس طرح اوپر بیان ہوئی؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ رسالت کا اصل مقصد پیغامِ الٰہی کا پہنچانا ہوتا ہے لیکن رسالت کی تصدیق و موافقت کے لئے معجزات ناگزیر ہیں۔ معجزہ کا مطلب فریقِ مخالف کو عاجز اور بے بس کر دینا ہوتا ہے اور یہ تبھی ممکن ہے جب ایسی قانون شکن چیزیں (یعنی معجزات) لوگوں کو اس طرح دکھائی جائیں کہ اُن کے ماہرین اور یدِ طولیٰ رکھنے والے لوگ بے بس ہو کے رہ جائیں تاکہ وہ معجزہ رسالت کا مدلل اور مُسکت ثبوت اور خدا داد اختیار کا کام دے سکے۔ چونکہ عیسیٰ علیہ السلام کے دَور میں طبابت اور دوا سازی اپنے عروج پر تھی، لہٰذا طبیبوں اور معالجوں کو عاجز و لاچار کرنے کے لئے عیسیٰ علیہ السلام کو طبابت کے معجزات عطا کئے گئے جس کی حدیث لٹریچر میں متعدد احادیثِ نبوی موجود ہیں۔ لیکن مرزا قادیانی کے پیرو اپنے موقف کی تائید میں کوئی ایک ثبوت بھی پیش نہیں کر سکتے۔'' (''تذکرۃ الانبیاء''۔ حافظ قاضی عبدالرزاق چشتی، صفحات ۲۲۷، ۲۲۳)

(3) قادیانیوں کا کہنا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام بن باپ کے پیدا نہیں ہوئے کیونکہ اُن کی والدہ مریم کی شادی یوسف نجار سے ہوئی تھی اور آپ یوسف نجار کے بیٹے ہیں۔ اس کی وجہ اُن کے نزدیک یہ ہے کہ بن باپ کے پیدائش قانونِ فطرت کے خلاف ہے اور قرآن مجید نے واضح طور پر انسانی پیدائش کے قانون کو یوں بیان کر دیا ہے:

(۱) اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ (الحج: ۵)

''بے شک ہم نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر بوٹی سے۔'' (۲۲:۵)

(۲) ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ O (الٓمّٓ السجدة: ۸)

''پھر اُس کی نسل نچڑے ہوئے بے قدرے پانی سے چلائی۔'' (۸ : ۳۲)

(۳) اِنَّا خَلَقنَا الاِنسَانَ مِنْ نُّطفَةٍ اَمشَاجٍ (اَلدّھر : ۲)
''بے شک ہم نے انسان کو مخلوط (ملے جلے) نطفہ سے پیدا کیا۔'' (۲ : ۷۶)

(4) اپنے دلائل کو آگے بڑھاتے ہوئے قادیانیوں کا کہنا ہے کہ قرآن نے بعض مقامات پر مریم علیہا السلام کے بارے میں فرمایا : اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا (الانبیاء : ۹۱ ; اَلتَّحریم : ۱۲) یعنی مریم نے اپنے ناموس کو محفوظ رکھا۔ اَحْصَنَتْ کا لفظ حِصْن سے ماخوذ ہے جس کا معنیٰ ''قلعہ'' کا ہے۔ شادی شدہ مرد اور شادی شدہ عورت کو عربی زبان میں بالترتیب مُحْصَن اور مُحْصَنة کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو رشتہ اِزدواج میں منسلک کرنے کے ذریعے شیطانی حملوں کے خلاف قلعہ بند کر لیتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ مریم قلعہ بند یعنی شادی شدہ تھیں اور قرآن وانجیل سے ثابت ہوا کہ اُن کی شادی کے نتیجہ میں عیسیٰ علیہ السلام ایک انسان سے پیدا ہوئے ہیں۔

جواب: قرآن مجید نے عیسیٰ علیہ السلام کی بن باپ پیدائش کے کئی حوالے دیئے ہیں۔ مثلاً فرمایا :
(۱) اِنَّ مَثَلَ عِیسٰی عِندَ اللّٰہِ کَمَثَلِ آدَمَ (آل عمران : ۵۹)
''بے شک عیسیٰ علیہ السلام کی مثال اللہ کے نزدیک آدم علیہ السلام کی سی ہے۔'' (۵۹ : ۳)

اس کا مطلب یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کی حیران کن ماہیت آدم علیہ السلام کی طرح ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام تو بن باپ کے پیدا ہوئے' اُسی طرح آدم علیہ السلام بھی بن باپ کے پیدا ہوئے۔ اس سے عیسیٰ علیہ السلام کی بن باپ پیدائش ثابت ہوگئی۔

(۲) قرآنِ حکیم نے ہر جگہ عیسیٰ علیہ السلام کو ''عیسیٰ بن مریم'' کا لقب دیا ہے جبکہ اُصولی طور پر ہر بچے کو ماں کی بجائے اپنے باپ کی طرف نسبت دی جاتی ہے۔ اگر عیسیٰ علیہ السلام باپ کے فرزند ہوتے تو اُنھیں اپنے باپ کی طرف ہی نسبت دی جاتی۔

(۳) جب یہود نے آپ کی والدہ ماجدہ سیّدہ مریم علیہا السلام کو زنا کی تہمت لگائی تو شیر خوار عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی ماں کی گود ہی میں اپنی ماں کی عفت و براءت بیان کی۔ اگر آپ شادی شدہ تھیں تو یہود نے اُن پر ایسا الزام کیوں لگایا؟ اور یوسف نجار کا اتنا ہی بیان کافی ہوجاتا کہ عیسیٰ اُس کا بیٹا ہے۔

(۴) عیسیٰ علیہ السلام کے اَلقاب ''روحُ اللّٰہ'' اور ''کلِمةُ اللّٰہ'' ہیں کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کُنْ سے پیدا ہوئے۔

(۵) قرآن مجید نے حضرت مریم علیہا السلام کے اس قول کو کئی بار بیان کیا کہ مجھے کسی بشر نے چھوا تک نہیں۔ اگر سیّدہ کی شادی کسی سے ہو چکی ہوتی تو آپ کے اس قول کا چہ معنیٰ دارد؟

(۶) بحوالہ سورہ مریم : آیات ۲۲، ۲۳ سیّدہ مریم علیہا السلام کو اپنے گھر سے کافی دُور ایک گمنام جگہ پر کھجور کے درخت کے نیچے دردِ زہ محسوس ہوا۔ اگر آپ یوسف نجار کی زوجہ تھیں تو اپنے گھر سے باہر دردِ زہ کی تکالیف سہنے کے کیا معنیٰ ؟ کیا اس درد کے سہنے کے لئے گھر کی چار دیواری کافی نہیں تھی ؟

نوٹ : یاد رہے کہ قادیانیوں کا یہ عقیدہ یہودی نوعیت کا ہے کہ یہود نے علامہ آلوسی کے مطابق مریم سلام اللہ علیہا کو یوسف نجار کے ساتھ متہم کیا تھا: وَالْیَهُوْدُ تَقْذِفُ اُمَّهٗ بِیُوْسُفَ النَّجَّار (روح المعانی، ج ۲، ص ۱۶۳)

(5) سورہ آلِ عمران کی آیت ۱۴۴ میں ہے : قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ؛ (محمد ﷺ سے قبل بھی اور رسول گزر چکے ہیں) وہ کہتے ہیں کہ کسی استثناء کے بغیر تمام پیغمبر وفات پا چکے ہیں اور اُن وفات یافتگان میں عیسیٰ علیہ السلام بھی شامل ہیں۔

جواب : خَلَتْ کے لفظ کا ترجمہ غلط کیا گیا ہے۔ اگر معترضین کے ترجمہ کو درست تسلیم کیا جائے تو سورۃ الفتح کی آیت ۲۳: سُنَّةَ اللهِ الَّتِیْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ کا ترجمہ کیا یہی کریں گے کہ سنت اللہ قبل ازیں مر چکی؟ جبکہ اُسی آیت سے متصل یہ فرمایا گیا: وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللهِ تَبْدِیْلاً کہ تم طریقِ الٰہی میں ہرگز کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔

دراصل خَلَتْ کا لفظ خَلاَ یَخْلُوْا سے ماخوذ ہے بمعنیٰ خالی ہونا اور اسی سے ''خلوت'' کا لفظ ہے بمعنی تنہائی کی جگہ جیسا کہ بیت الخلاء کے لئے مستعمل ہے کہ وہ لوگوں سے چھپ کر تنہائی کی جگہ ہوتی ہے نہ کہ موت کا گھر۔ اس لغوی توضیح کو مدِّ نظر رکھنے سے سورہ آلِ عمران کی مذکورہ آیت ۱۴۴ کا ترجمہ یہی ہوگا کہ محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پہلے اور بھی رسول گزر چکے ہیں۔ اس گزر چکنے میں سابقہ انبیاء علیہم السلام کا بذریعہ وفات گزر جانا اور عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان کی طرف اٹھایا جانا بھی شامل ہے۔

لفظ خَلاَ کی مزید تشریح کے لئے یہ آیات بھی ملاحظہ ہوں :

(۱) وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِهِمْ (البقرۃ : ۱۴)
''اور جب وہ (منافقین) اپنے شیطانوں کے پاس اکیلے ہوتے ہیں۔'' (۲:۱۴)

(۲) سُنَّةَ اللهِ الَّتِیْ قَدْ خَلَتْ فِیْ عِبَادِهٖ (المؤمن : ۸۵)
''اللہ نے اپنا یہی معمول مقرر کیا ہے جو اُس کے بندوں میں ہوتا چلا آیا ہے۔'' (۴۰:۸۵)

(6) اگر عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان کی طرف اُٹھائے جانے کو تسلیم کر لیا جائے تو آپ کی ٹٹی پیشاب، نیند اور خوراک جیسی روزمرّہ ضروریات کیسے پوری ہوتی ہیں؟

جواب : قادرِ مطلق خالق، عیسیٰ علیہ السلام کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے کافی ہے۔ یہ وہ اللہ ہے جو بچے کی شکمِ مادر میں نشو ونما کرتا ہے۔ کئی جھلیوں کی تہہ میں بند اُسے وہاں آکسیجن کے ذریعے تنفّس بھی مل رہا ہے اور ماں کے خون کے ذریعے غذا بھی مل رہی ہے۔ فَتَبَارَکَ اللہُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ

(7) بعض اوقات پوشیدہ اور غائب چیزوں کا اظہار نجومی بھی کر دیتے ہیں تو کیا اس حیثیت سے اُنہیں علمِ غیب کا الٰہی عطیہ حاصل ہوتا ہے؟ (اعتراض بحوالہ سورہ آلِ عمران: آیت ۴۹ کا آخر)

جواب : علمِ غیب وہ ہوتا ہے جسے نہ تو اِستدلال و اِستدراک وعقل اور نہ ہی کسی اور ذریعے سے معلوم کیا جا سکے۔ نجومی، کاہن اور رَمّال پوشیدہ اور غیب کی باتوں کو تعویذ گنڈوں یا شیطانی ذرائع کی وساطت سے بتاتے ہیں جو اکثر و بیشتر اور بالعموم غلط ہوتی ہیں۔ کیونکہ اِن شیطانی لوگوں کا علم یقینی اور حتمی نہیں ہوتا جبکہ پیغمبر کا علم وحیِ خالق ہونے کی وجہ سے حتمی اور یقینی ہوتا ہے اور ہر قسم کی خطا سے مبرّا و منزّہ ہوتا ہے۔

(8) سورۃ الزُّمَر کی آیت ۳۰ : اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ O

''(اے نبیِ معظم!) آپ کو بھی وفات یافتہ ہونا ہے اور اُنہیں بھی مرنا ہے۔'' (۳۹:۳۰)

عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کو واضح طور پر ثابت کرتی ہے کیونکہ آیت مذکورہ میں تمام انبیاء علیہم السلام بہ شمول محمد ﷺ کے سب کا ذکر ہے۔

جواب : مذکورہ بالا آیت (۳۰) میں ھُمْ کی ضمیر اُن کفار کے لئے ہے جو نبیِ مکرّم ﷺ کے متعلق کہا کرتے تھے کہ ایک دن اُنہیں وفات پانی ہے اور یہ کہ آپ کی وفات کے بعد آپ کا دینِ توحید بھی فنا ہو جائے گا کیونکہ آپ کے مشن کو جاری رکھنے کے لئے آپ کی کوئی نرینہ اولاد نہیں ہے۔ اُن کے اس طنز کے جواب میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو تسلی و تشفی دی جا رہی ہے کہ اگر آپ نے وفات پانی ہے تو کیا اِن کفار کو دائمی زندگی کی ضمانت مل چکی ہے؟ اُنہیں دوسروں کا خیال رکھنے کی بجائے خود اپنی فکر کرنی چاہئے۔

آیتِ مذکورہ اپنی ماہیت میں عمومی ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اِس کا کوئی تعلق نہیں۔ قرآنِ حکیم کی کئی ایسی آیات ہیں جن کا اطلاق خصوصی نہیں بلکہ عمومی ہے۔ مثلاً انسانی پیدائش کے متعلق قرآن فرماتا ہے:

(۱) اَلَمْ نَخْلُقْکُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّھِیْنٍ O (اَلْمُرْسَلٰت: ۲۰) (کیا ہم نے تمہیں بے قدر پانی سے نہیں بنایا؟)

(۲) خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ O یَّخْرُجُ مِنْ بَیْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ O (الطّارق: ۶،۷)

''وہ ایک اُچھلتے پانی سے پیدا کیا گیا جو پشت اور پسلیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔'' (۸۶:۶،۷)

یہ دونوں آیات بھی عمومی ہیں اور وہ آدم وحوّا اور عیسیٰ علیہم السلام کی پیدائش کو شامل نہیں کیونکہ اُن میں سے کوئی بھی مادہ (منویہ) سے پیدا نہیں ہوا۔ یہی صورت سورۃ الزُّمَر کی آیت ۳۰ کی ہے اور اس کا عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

عقیدہ ''تثلیث'' کی مختصر تاریخ :عیسیٰ علیہ السلام کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد پہلی صدی عیسوی میں آپ کے پیروکار توحیدِ خداوندی پر قائم رہے۔ یہ بات اس حقیقت سے واضح ہے کہ قریباً سال ۹۰ عیسوی میں Shepherd of Hermes نامی لکھی گئی کتاب کو چرچ کی جانب سے کتابِ وحی سمجھا گیا۔ بارہ احکامات میں سے پہلا Command جو اُس کتاب میں شامل ہے' یوں شروع ہوتا ہے:

''سب سے پہلی بات تو یہ کہ اللہ کے ایک ہونے پر ایمان لایا جائے اور یہ کہ اُس نے تمام چیزوں کو اُس وقت پیدا کیا اور اُنہیں منظم کیا جب کسی چیز کا وجود نہیں تھا۔ اُس میں ہر چیز شامل ہے لیکن وہ کسی میں شامل نہیں ہے۔'' ("The Apostolic Fathers".. E.J. Goodspeed)

Theodre Zahn کے مطابق سال ۲۵۰ عیسوی تک عیسائیت کا عقیدہ ایمانی یہی تھا کہ قادرِ مطلق اللہ پر میرا ایمان ہے۔ ("Articles of the Apostolic Creed", p. 33)

''سال ۱۸۰ء اور ۲۱۰ عیسوی کے درمیان قادرِ مطلق کے نام سے پہلے ''باپ'' یعنی ''Father'' کے لفظ کا اضافہ کیا گیا جس کی کلیسا کے راہ نماؤں کی جانب سے سخت مخالفت کی گئی۔ اِن مخالفین میں بشپ وکٹر (Victor) اور بشپ زیفائیسس (Bishop Zephysius) کے نام سرِ فہرست ہیں۔ اُنہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو الوہیت کا درجہ دینے کی مخالفت کی اور عیسیٰ علیہ السلام کی اصل تعلیمات کے مطابق توحیدِ باری تعالیٰ پر اور اس بات پر زور دیا کہ اگر چہ عیسیٰ علیہ السلام رسول ہیں لیکن بہر حال وہ دوسرے انسانوں کی طرح ایک انسان ہیں اگر چہ اُنہیں اپنے خالق و مالک کے ہاں بڑا رتبہ حاصل ہے۔ یہی عقیدہ شمالی افریقہ اور مغربی ایشیا کے کلیساؤں کا تھا۔''

''جونہی عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات مختلف علاقوں میں پھیلیں تو اُن کا رابطہ دوسری ثقافتوں اور تہذیبوں سے ہوا اور اربابِ اختیار کی جانب سے اُنہیں کچھ مخالفتوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔۔۔۔ دراصل یونانیوں کے کثرت الٰہ یعنی کئی خداؤں کا عقیدہ ہی تھا جس نے اِس عقیدہ تثلیث کی تشکیل میں بڑا کردار ادا کیا۔ اور بالآخر عیسیٰ علیہ السلام کو تدریجی ارتقاء کے ذریعے پیغمبر سے خدا تک کا رتبہ دے دیا۔''

سال ۳۲۵ عیسوی میں عقیدۂ تثلیث کو روایت پسند (Orthodox) عیسائی عقیدہ ہونے کا اعلان کیا گیا۔ اُس وقت بھی کچھ لوگ اِس عقیدے پر ایمان نہیں لائے کیونکہ اُنہوں نے کتبِ سماویہ میں اس کی کوئی سند نہیں پائی تھی۔

عیسیٰ علیہ السلام کی خالص تعلیمات کی زبوں حالی جس کا نتیجہ لازمی طور پر دنیائے عیسائیت میں کثرتِ الٰہ کو تسلیم کرنے میں ہوا' کبھی بھی بغیر چیلنج کے نہیں رہی۔ سن ۳۲۵ عیسوی میں جب عقیدۂ تثلیث کو سرکاری طور پر روایت پسند عیسائی عقیدے کا حصہ بنانے کی تجویز ہوئی تو شمالی افریقہ کا ایک عیسائی راہنما ایریئس (Arius) کن سٹینٹائن (Constantine) اور کیتھولک کلیسا کی مجتمع قوت کے خلاف کھڑا ہوا' اور اُنہیں یاد دلایا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے ہمیشہ

توحید الٰہی کا سبق دیا۔ Constantine نے اِن ''تکلیف دِہ'' موحدین کو اپنی تمام تر قوّت اور درندگی کے ساتھ کچلنے کی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہا۔ عقیدۂ تثلیث لوگوں میں بہت افراتفری کا موجب بنا اور اکثر لوگوں کو اِس پر سوچے سمجھے بغیر ایمان لانے کو کہا گیا۔ تاہم عقلی طور پر اِسے ثابت کرنے کی کوشش سے لوگوں کو روکنا ممکن نہ تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ تین مکتب ہائے فکر معرضِ وجود میں آئے:

''پہلے مکتبِ فکر کا تعلق سینٹ آگسٹائن (St. Augustine) سے ہے جس کا زمانہ چوتھی صدی عیسوی کا ہے۔ اُس کا عقیدہ یہ تھا کہ عقیدۂ تثلیث کو ثابت تو نہیں کیا جا سکتا' ہاں اُسے بیان کیا جا سکتا ہے۔ دوسرا مکتبِ فکر سینٹ وکٹر (St. Victor) کا ہے جو بارھویں صدی عیسوی کا ہے۔ اُس کا عقیدہ یہ تھا کہ عقیدہ تثلیث کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ثابت بھی کیا جا سکتا ہے۔ اور چودھویں صدی عیسوی میں تیسرے مکتبِ فکر کی پیداوار ہوئی جس کا کہنا یہ تھا کہ عقیدۂ تثلیث کو نہ تو بیان کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اسے ثابت کیا جا سکتا ہے بلکہ اسے اندھا دھند تسلیم کر لیا جائے اور اس پر ایمان لایا جائے۔''

''طاقت وقوّت کا کلیسا عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات سے جس قدر دُور ہوتا گیا' اُسی قدر اُس کے راہنما اربابِ اختیار کی خواہشات کے ہتھے چڑھتے گئے۔ عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات اور اربابِ اقتدار کی خواہشات کے مابین فرق دھندلا گیا اور تعلیماتِ عیسوی اور خواہشاتِ اقتدار آپس میں گڈمڈ ہونا شروع ہوئیں تو کلیسا نے ریاست سے جدا ہوتے ہوئے زیادہ سے زیادہ طاقت حاصل کر لی۔''

''عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات سے اِن انحرافات کی ہمیشہ مخالفت رہی۔ کلیسا جتنا زیادہ طاقتور ہوتا گیا' اُسی قدر وہ تثلیث کے انکار کرنے کا بہت زیادہ خطرہ بلکہ بہت حد تک موت کا پیغام بن گیا۔ اگرچہ لوتھر (Luther) نے کلیسا کو خیرباد کہہ دیا تھا لیکن اُس کی بغاوت پوپ کی اتھارٹی کے خلاف تھی نہ کہ رومن کیتھولک چرچ کے بنیادی عقیدے کے خلاف۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس نے ایک نئے کلیسا کی بنیاد رکھی اور اُس کا سربراہ بن گیا۔ عیسائیت کے تمام بنیادی اصول وعقائد تسلیم کر لئے گئے اور جوں کے توں رہنے دیئے گئے۔ اس چیز نے کچھ اصلاح شدہ کلیساؤں اور فرقوں کو جنم دیا لیکن قبل از اصلاح عیسائیت جوں کی توں قائم رہی۔''

''شمالی افریقہ اور مغربی ایشیا میں ایریئس (Arius) کی تعلیمات کو لوگوں کی اکثریت نے قبول کر لیا جو اسلام کے آتے ہی فوراً مسلمان ہو گئے اور اُنہوں نے اسلام کو سچے دین کے طور پر قبول کر لیا کیونکہ اُن کا خدائے واحد اور عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات پر پختہ ایمان تھا۔ اُس نے یہ دلیل کہا کہ اگر عیسیٰ فی الواقع خدا کا بیٹا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ باپ کو بیٹے سے پہلے موجود ہونا چاہیے۔ لٰہذا وہ وقت ماننا پڑے گا جب بیٹے کا وجود نہیں تھا۔ معلوم ہوا کہ بیٹا مخلوق ہے جو ایک جوہر کا مرکب ہے یا وہ ہستی ہے جس کا وجود ہمیشہ نہیں تھا۔ چونکہ خدا دائم اور قائم بالذات ہے تو عیسیٰ علیہ السلام اُس جوہر کے نہیں ہو سکتے جس جوہر کا خدا ہے۔''

اریئس (Arius) نے ہمیشہ عقل اور منطقی استدلال میں بات کی اور اپنے موقف پر بڑی جرأت اور استقامت کا اظہار کیا۔ اُس نے کہا کہ چونکہ عیسیٰ علیہ السلام کو خدا نے پیدا کیا' لہٰذا عیسیٰ کا وجود محدود ہے' لا متناہی نہیں اور اس لئے عیسیٰ دائمیت (ہمیشگی) کی خصوصیت کے حامل نہیں' صرف خدا دائم ہے۔ چونکہ عیسیٰ علیہ السلام مخلوق ہیں' اس لئے اسباب پر مبنی دوسری مخلوقات کی طرح آپ بھی تغیر و تبدّل سے مبرّا نہیں۔ صرف خدا کو تغیر و تبدل نہیں۔ اس طرح اُس نے ثابت کیا کہ عیسیٰ خدا نہیں ہیں۔ منطقی طور پر اریئس نے اپنے دلائل میں بائبل کے کچھ حوالہ جات بھی دئے جو کہیں بھی تثلیث کا درس نہیں دیتے۔ اگر عیسیٰ علیہ السلام نے یہ کہا: ''میرا باپ مجھ سے عظیم تر ہے'' (John 14.28 -- the Bible) اور پھر یہ یقین رکھنا کہ خدا اور عیسیٰ باہم مساوی ہیں تو پھر یہ تو بائبل کی صداقت کا انکار کرنا ہوگا۔

''اکثر لوگ اب اس بات سے آگاہ ہیں کہ مروّجہ اور متداول عیسائیت کا عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات سے کچھ بھی تعلق نہیں۔ گزشتہ دو صدیوں کے دوران مؤرخین کی تحقیق نے عیسائیت کے ''گورکھ دھندوں'' پر ایمان لانے کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی اور اس حقیقت کو ثابت کیا ہے کہ کلیسا کے عیسیٰ کا تاریخ کے عیسیٰ (علیہ السلام) سے کوئی تعلق اور واسطہ نہیں اور یہ بات دُنیائے عیسائیت کے سچ ہونے میں کوئی مدد نہیں کرتی۔''

''اپنے عہد کا ممتاز موحّد فرانس ڈیوڈ (۱۵۱۰۔۱۵۷۹) ہے۔ ۱۵۶۹ء میں ہنگری میں منعقد کی گئی کلیسا کی تیسری نمائندہ مجلس ہنگری کی ایک مؤرخ کے فیصلہ میں ہوئی جو ''فیصلہ کن مباحثے'' کو شامل تھی اور جس سے توحید کی آخری فتح ثابت ہوگئی۔'' ("A History of Unitarianism" .. E.M. Wilbur) شاہِ وقت نے خود اس کی صدارت کی اور اس میں ملک کے اعلیٰ ترین سول اور فوجی عہدیداروں نے شرکت کی۔ ڈیوڈ کے دلائل حسبِ ذیل تھے:

> ''خدا (باپ) صرف ایک ہے جس سے ہر چیز وجود میں آئی اور جو ہر چیز سے بلند و بالا ہے' جس نے ہر چیز اپنے کلمہِ حکمت سے اور اپنے نفخہ سے پیدا کی۔ اس خدا کے علاوہ کوئی دوسرا خدا نہیں' نہ ہی تیسرا' نہ ہی چوتھا' نہ ہی مادیت میں اور نہ ہی ذات میں کیونکہ کتبِ سماوی کہیں بھی تین خداؤں یا خدا کے بیٹے کی تعلیم نہیں دیتیں جو کہ صرف انسانی ایجاد و اختراع اور توہم ہے اور اس لئے اِسے مسترد ہونا چاہئے۔ عیسیٰ علیہ السلام کا خدا سے تعلق اُس قسم کا ہے جو خدا نے اُنہیں عطا کیا۔ خدا اپنی الوہیت کی شہنشاہیت میں دیگر تمام چیزوں سے بالاتر رہا۔ باپ (خدا) نے عیسیٰ علیہ السلام کو روح القدس کے ذریعے پیدا کیا۔ باپ (خدا) نے اُسے تقدس کا درجہ دے کر دنیا میں بھیجا۔''

''اس مباحثی مجلس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کولازر (Kolozsar) کا تقریباً تمام شہر خدائے واحد پر ایمان لے آیا۔ توحید کے عقیدے کو قانونی تحفظ مل گیا۔ ۱۵۷۱ عیسوی میں ٹرانسلوانیا (Transylvania) میں توحیدی تعلیمات پر مبنی کم و بیش پانچ سو مجالس کا انعقاد ہوا۔''

۲۶۷۶ (عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کی والدہ)

''لیلو فرانسکو سوزینی (Leilo Francesco Sozini 1525-1562) اور فاسٹو پاؤلو سوزینی (1539-1604) وحدانیت کی تاریخ میں دو ممتاز نام ہیں۔ بعد میں فاسٹو سوزینی Socianus کے نام سے مشہور ہوا۔ اُس نے ایک کتاب ذاتی اور نجی اشاعت (private circulation) کے لئے گمنام طور پر شائع کی کیونکہ اُس وقت کلیسا کی تعلیم سے کھلے طور پر اختلاف کرنا بہت خطرناک تھا۔ اگرچہ Socianus اس حقیقت سے بالکل بے خبر تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو نہ تو صلیب پر چڑھایا گیا اور نہ ہی اُنہیں دوبارہ زندہ کیا گیا اور یہ کہ عقیدۂ تثلیث بالکل بے بنیاد ہے' Socianus اس عقیدے اور اس کے ساتھ ساتھ عقیدۂ کفارہ (Atonement) ☆ کی لغویت کو ثابت کرنے میں کامیاب رہا۔''

''Socianus نے اس بات پر زور دیا کہ دنیا کے وجود میں آنے سے پہلے عیسیٰ علیہ السلام کا وجود نہیں تھا۔ عیسیٰ علیہ السلام کو خدائی قوّت اور خدائی بصارت حاصل تھی اور یہ قوت و بصارت اُن کی اپنی یا ذاتی نہیں تھی۔ اُنہیں خدائے عظیم و کبیر کی جانب سے ایک مشن کے لئے نوعِ انسانی کی طرف مبعوث کیا گیا۔ Socianus نے اِس بات پر بھی زور دیا کہ قدرتِ مطلقہ و کاملہ صرف اور صرف خدا کی خاصیت ہے۔ ایک محدود ذات' غیر محدود ہستی کا مقیاس اور پیمانہ نہیں ہوسکتی۔ اس لئے خدا کی ماہیت سے متعلق تمام انسانی تصورات و مزعومات کو ناکافی اور کوتاہ سمجھا جائے۔ خدا کی مرضی اور ارادہ بالکل آزاد ہے اور وہ کسی قانون کی پابند نہیں ہے۔ اُس کا مقصد اور اُس کا ارادہ انسانی ذہن سے پوشیدہ ہے۔ انسان کو ارادے کا اختیار تو دیا گیا ہے لیکن دراصل وہ بے قوّت ہے۔''

''Socianus نے کہا کہ چونکہ ہر چیز پر قدرتِ کاملہ و قاہرہ رکھنے والی ہستی صرف ایک ہی ہوسکتی ہے' لہٰذا تین مقتدر ہستیوں کی بات کرنا بے عقلی کی بات ہے۔ خدا اپنے جوہر کے لحاظ سے نہ صرف اپنی قسم میں بلکہ عدد میں بھی ایک اور یکتا ہے۔ خدا کی ہستی کثرتِ الٰہ کو شامل نہیں بلکہ وہ تو یکتا اور لاشریک ہے۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ عددی جوہر ایک ہے تو پھر اس بات کو بھی مان لیا جائے کہ ایک ہی عددی ہستی ہے۔''

Socianus نے عقیدۂ تثلیث کی اِس بنیاد پر بھی تردید کی کہ عیسیٰ علیہ السلام کے لئے بہ یک وقت دو ماہیتوں کا ہونا ممکن نہیں۔ اُس نے کہا کہ دو جسمانی وجود جن کی خاصیتیں متضاد اور ایک دوسرے کی مخالف ہوں' ایک ذات میں جمع نہیں ہوسکتیں اور وہ خاصیتیں فنائیت اور غیر فنائیت (دائمیت) کی ہیں یعنی ابتدا کا ہونا اور ابتدا کا نہ ہونا' تغیر پذیر (ناپائیدار) اور نا قابلِ تبدل و تغیر۔ علاوہ ازیں دو ماہیتیں جن میں سے کوئی اس قابل ہی نہیں کہ ایک جدا ہستی کی تشکیل کرے' ایک ذات میں نہیں سمٹ سکتیں۔ اس صورت میں دو ہستیاں پیدا ہوں گی جس کے نتیجہ میں دو عیسیٰ ہوں گے جن میں سے ایک الٰہی عیسیٰ اور دوسرا انسانی عیسیٰ ہوگا۔ کلیسا نے کہا کہ عیسیٰ کی تشکیل الٰہی اور انسانی ہے جس طرح انسان گوشت پوست اور روح کا مجموعہ ہوتا ہے۔ Socianus نے اس کا یہ جواب دیا کہ اس صورت میں یہ بات اس عقیدے سے بالکل مختلف ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام میں دو ماہیتیں اس طرح جمع ہوگئی ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کی تشکیل الٰہی اور انسانی خاصیت دونوں سے ہوئی ہے۔ انسان میں گوشت پوست اور روح یوں باہم جوڑ

☆ عقیدۂ کفارہ کی وضاحت صفحات ۲۶۵۵' ۲۶۵۶ پر کی جاچکی ہے۔

دئے گئے ہیں کہ انسان نہ صرف روح کا نام ہے اور نہ ہی صرف گوشت پوست کا۔

''Socianus نے اِس بات پر بھی زور دیا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی ماہیت کا الوہیت ہونا بذاتِ خود کتب سماویہ کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ اوّل تو یہ کہ خدا نے عیسیٰ (علیہ السلام) کو پیدا کیا۔ دوم یہ کہ کتب سماوی کی تعلیم یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام ایک انسان اور بشر تھے۔ سوم یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام کو جو بھی فوقیت اور برتری حاصل تھی وہ از روئے کتب سماویہ آپ پر عطیہ خداوندی تھا۔ چہارم یہ کہ کتب سماویہ انتہائی وضوح کے ساتھ بیان کرتی ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام نے کبھی بھی اُن معجزات کو اپنی طرف منسوب نہیں کیا یا یہ کہ کسی الٰہی صفت کے مالک ہونے کی وجہ سے وہ معجزات ظہور پذیر ہوتے ہیں بلکہ اُنہوں نے ہمیشہ اُنہیں خدا (باپ) کی طرف منسوب کیا۔''

Socianus نے کہا کہ عقیدہ تثلیث کو تسلیم کرنے کی ایک وجہ مشرک فلسفہ کا اثر ہے جیسا کہ Toland کے اِس اقتباس سے ظاہر ہے:

''Socianus کے ماننے والے اور دوسرے موحدین بڑے وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ بے دین لوگوں نے عیسائیت میں اپنی قدیمی کثرت پرستی اور مُردہ لوگوں کا الٰہ بنا دینے کو متعارف کرایا: اس طرح عیسائیت کا نام تو باقی رہا لیکن اُس کی حقیقت بدل گئی اور اُن کی ذاتی دلچسپیوں، مفادات اور ضرورتِ وقت کی تسکین ہوگئی۔'' ("The Nazarens".. John Toland)

''اب یہ بات واضح ہوگئی کہ Socianus کی تحریروں کو اس قدر مقبولیت کیوں حاصل ہوئی۔ یہ تحریریں لوگوں کو نہ صرف صحیح تصویر دکھانے کی خاطر ماضی کی طرف لے گئیں کہ عیسیٰ کون تھے اور کس لئے آئے تھے بلکہ اِن تحریروں نے اُس طاقت کے ختم کرنے میں بھی مدد دی جو کلیسا کو لوگوں پر حاصل تھی۔ Socianus کی عظمت اس حقیقت میں پنہاں ہے کہ اُس نے ایک ایسی دینیات پیش کی جو بہ یک وقت منطق اور بائبل کی بنیاد پر تھی۔ اس لئے اُس کے مخالفین کے لئے اُس کی تحریروں کو رَدّ کرنا بڑا مشکل کام تھا۔ سوشنزم (Socianism) کے لئے اُس وحشت ناک طریق پر کہ جس طرح اُسے دبایا گیا، ہمدردی کے جذبات غالب ہیں۔ عقیدۂ تثلیث کے خلاف یقینی ردِّ عمل ہے۔ بہت سے عیسائی مفکرین Socianus کے عقائد کی تائید کرتے ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت اور اس سے متعلق مختلف معتقدات کا انکار کرتے ہیں۔''

''جان بڈل (John Biddle 1615-1662) انگلینڈ میں ''بابائے وحدانیت'' کے طور پر جانا جاتا ہے۔ 1641ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی سے ایم۔ اے کرنے کے بعد اُس نے اپنے مذہبی نظریات کا دوبارہ جائزہ لینا شروع کیا اور عقیدۂ تثلیث کے جواز پر شک کرنا شروع کیا۔ وہ یورپی موحدین کے فکر و نظر سے متاثر تھا کیونکہ اب تک Socianus کی تعلیمات انگلینڈ میں پہنچ چکی تھیں۔ اربابِ اختیار کی جانب سے عقیدہ تثلیث کی حفاظت

کے لئے کچھ اقدامات کئے گئے۔ جون 1640ء میں منعقدہ کینٹر بری اور نیویارک کے اجلاسوں میں Socianus کی کتابوں کی درآمد' طباعت اور تشہیر پر پابندی لگانے کا فیصلہ کیا گیا۔ ہر کہ ومہ کو تنبیہ کی گئی کہ جس شخص نے بھی اِن کتابوں پر یقین کیا' اُسے جلاوطن کر دیا جائے گا۔ کچھ قلمکاروں اور مفکرین نے اس فیصلہ کی کھلے طور پر مذمّت کی لیکن نتیجہ بے ثمر رہا۔''

جان بِڈل John Biddle نے ایک پمفلٹ بہ عنوان ''روح القدس کی الوہیت کے انکار میں بارہ دلائل'' شائع کیا جس میں خطاب عیسائی قاری کو کیا گیا تھا۔ 6 ستمبر 1647ء کو پارلیمنٹ کے حکم کی رُو سے پمفلٹ کو جلا دیا گیا۔ 2 مئی 1648ء کو ایک انتہائی سخت آرڈی ننس پاس کیا گیا جس کے مطابق عقیدۂ تثلیث کے منکر یا عیسیٰ علیہ السلام یا روح القدس کی الوہیت کے منکر کو موت کی سزا تجویز کی گئی اور اس میں کلرجی (Clergy) کی سفارش بھی نہیں چلے گی۔''

بڈل نے بیان کیا کہ جو ذات اپنی جگہ بدل لے' وہ خدا نہیں ہو سکتی۔ روح القدس جگہ بدلتا ہے لہٰذا وہ خدا نہیں ہے۔ اُس نے اس منطق کی یوں وضاحت کی کہ اگر خدا جگہ بدلتا ہے تو پھر وہ اُس جگہ پر نہیں ہوگا جس پر وہ پہلے تھا بلکہ اُس جگہ پر ہوگا جہاں وہ پہلے نہیں تھا اور یہ بات اُس کی قدرتِ کاملہ اور الوہیت کے خلاف ہے۔ اس لئے یہ خدا نہیں تھا جو عیسیٰ کے پاس آیا بلکہ ایک فرشتہ تھا جو خدا کے نام پر آیا تھا۔

جان بِڈل John Biddle نے عہدنامہ جدید (انجیل) سے ایک آیت پر بھی بحث کی جس کا حوالہ کلیسا کے مدار المہام اپنے نظریہ تثلیث کی حمایت میں پیش کرتے تھے۔ یہ John 5.7 ہے جو اس طرح ہے:

''تین ہستیاں ہی تو ہیں جن کا اندراج آسمانوں میں ہے: باپ' کلمہ اور روح القدس اور یہ تینوں (دراصل) ایک ہی ہیں۔''

''بڈل نے کہا کہ آیت عام سمجھ بوجھ (Common Sense) کے خلاف ہے۔ یہ آیت کتبِ سماویہ کی دوسری آیات سے متصادم اور اُن کے مخالف ہے۔ علاوہ ازیں آیت کا قدیم یونانی انجیل کے نسخوں میں وجود تک نہیں اور نہ ہی سریانی تراجم میں اور نہ ہی بہت قدیم لاطینی ایڈیشنز میں ہم اس کا کوئی نشان پاتے ہیں۔ لہٰذا معلوم یہی ہوتا ہے کہ آیت کا الحاق و تحریف کی گئی ہے اور اسے جدید و قدیم تبصرہ نگاروں نے ردّ کر دیا۔'' ("True Opinion Concerning the Holy Trinity"... John Biddle)

ملٹن' جان بڈل کا ہم عصر تھا اور وہ بہت حد تک اُس کا ہم خیال تھا۔ وہ بڈل کی طرح برملا بولنے والا اور صاف گو (Outspoken) نہیں تھا۔ ملٹن نے بائبل کی تعلیم سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ کئے:

''روح القدس ہمہ داں(Omniscient) نہیں ہے' وہ ہر جا موجود بھی نہیں ۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ روح القدس الٰہی کام کرنے کی وجہ سے خدا کا جزء ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر روح القدس کوComforter کیوں کہا جاتا ہے جو عیسیٰ (علیہ السلام) کے بعد آئے گا جو اپنے بارے میں بات نہیں کرتا اور جس کی طاقت موہوبہ اور عطائی ہے(John 16.7-14)۔ پس یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ Comforter کی اصطلاح کو اس کے ظاہری مفہوم میں قبول کرنے کی بجائے اُس پیغمبر کو جو عیسیٰ (علیہ السلام) کے بعد آئے گا' روح القدس کا نام دیا جانا اور اُسے خدا کہنا غیر مختتم ذہنی انتشار پیدا کرتا ہے۔'' ("The Christian Doctrine".. John Milton)

ملٹن کو ایریئس (Arius) سے اتفاق تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام دائم ہستی نہیں ہیں ۔ وہ کہتا ہے کہ عیسیٰ کو پیدا کرنے یا نہ کرنے میں خدا کی مرضی تھی ۔ آخر میں وہ یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ عیسیٰ (علیہ السلام) ''وقت کی حدود' کے اندر پیدا ہوئے اور یہ کہ اُسے کوئی ایسا اقتباس نہیں مل سکا جس سے عیسیٰ (علیہ السلام) کی دائمی نسل سے ہونا ثابت ہو۔ یہ مفروضہ کہ عیسیٰ (علیہ السلام) اگرچہ ذاتی اور عددی طور پر ایک اور ہستی ہیں لیکن وہ لازماً خدا کی صفات میں مشترک ہیں' عجیب ہے اور معقولیت کے خلاف ہے۔ یہ مفروضہ نہ صرف عقل سے متصادم ہے بلکہ روحانی شہادت کے بھی خلاف ہے۔''

''سر آئزک نیوٹن(Sir Isaac Newton 1642-1727) عہد نامہ عتیق (تورات) کی تمثیلی یا دُہری تاویل کے خلاف تھا۔ وہ تمام کتبِ سماویہ کی ایک جیسی سند پر یقین نہیں رکھتا تھا۔۔ بالآخر نیوٹن کو یہ کہنا پڑا:

''لفظ 'دیوتا Deity' اپنی ماتحتی چیزوں پر غلبے اور بالادستی کا مظہر ہے جبکہ لفظ 'خدا God' بالعموم آقا اور مالک ہونے کا مظہر ہے۔ ہر آقا خدا نہیں ہوا کرتا۔ ایک روحانی ہستی میں بااختیار عملداری کا ہونا خدا کی تشکیل کرتا ہے۔ اگر وہ بااختیار عملداری حقیقی ہے تو وہ ہستی فی الواقع خدا ہے' اگر وہ جعلی ہے تو نتیجہ جھوٹا خدا ہے اور اگر وہ عملداری بالاتر ہے تو عظیم و کبیر خدا ہے۔'' ("Anti-trinitarian Biographies", Vol. 3, --- A. Wallace)

''تھامس ایملن (Thomas Emlyn) نام کا ایک اور مشہور آدمی عقیدۂ تثلیث کا معتقد1663-1741 کے دوران ہوا ہے۔ وہ اُن ممتاز برگزیدہ لوگوں میں شامل ہو گیا جن میں عقیدہ تثلیث کے ردّ کرنے کی جرأت تھی اور اُن کا خدائے واحد پر ایمانِ کامل تھا۔ ایملن نے یہ ثابت کیا کہ بائبل میں لفظ ''خدا' استعمال ہوا ہے جو اپنے ماتحتوں پر اختیاری عملداری اور غلبے کا مظہر ہے کیونکہ خدا ہی ہر چیز سے عظیم تر ہے اور کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز اُسی کے تابع فرمان ہے۔''

۲۶۸۰ (عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کی والدہ)

''1790 میں آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹی کے طلباء سے خطاب کرتے ہوئے لنڈ سےLindsey (1723-1808) نے درج ذیل روشن و تابندہ حقائق پر زور دیا جو ہر کہ ومہ کی سمجھ میں آجاتے ہیں جنہیں کتب سماویہ پر ایمان رکھنے والے تمام لوگوں کو جلد یا بہ دیر تسلیم کر لینا چاہئے:

''یہ کہ خدا صرف ایک ہی ہے جو تمام کائنات کا خالق اور تمام چیزوں کا آقا و مالک اور شہنشاہ ہے۔''

''یہ کہ مقدس عیسیٰ بنی اسرائیل (یہود) کی طرف مبعوث کئے گئے' عیسیٰ خدا کے بندے تھے جنہیں اللہ نے بڑی تعظیم وتکریم دی اور اُنہیں ممتاز کیا۔''

''یہ کہ روح القدس کوئی آدمی یا ذہین ہستی نہیں بلکہ غیر معمولی خداداد قوت کا حامل ہے جنہیں عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں اُنہیں عطا کیا گیا اور بعد ازاں ابتدائی عیسائیوں کو عطا کیا گیا تا کہ اُنہیں تبلیغ کی طاقت دے کر وہ انجیل کی اشاعت کامیابی کے ساتھ کر سکیں۔''

''یہ کہ خدا' عیسیٰ علیہ السلام اور روح القدس کے متعلق یہی نظریہ ہے جس کی تعلیم رسولوں نے دی اور جس کی تبلیغ یہود اور مشرکین کو کی گئی۔'' ("The Epic of Unitarianism" .. D.B. Parke, p.47)

لنڈ سے نے عیسیٰ علیہ السلام کے پجاریوں سے یہ سوال کیا کہ اگر عیسیٰ علیہ السلام اُن کے سامنے نمودار ہو گئے اور اُن سے درج سوالات کئے تو اُن کا ردِّ عمل کیا ہوگا؟

''تم لوگوں نے اپنی ریاضتوں کو میرے ساتھ وابستہ کیوں کیا؟ کیا میں نے کبھی تمہیں ایسا کرنے کو کہا یا یہ کہا ہو کہ مجھے (مذہبی) عبادت کی ہستی بنالو؟''

''کیا میں نے تمہیں یکساں طور پر اور آخر وقت تک اپنی مثال نہیں دی کہ جیرے اور اپنے خالق و مالک (باپ) سے دعا کیا کرو' نہ کہ مجھ سے۔''

''جب میرے شاگردوں نے مجھ سے دعا کرنے کی تعلیم دینے کی درخواست کی (Luke 11.1.2) تو کیا میں نے اُنہیں خدا سے دعا کرنے کی تعلیم نہیں دی تھی؟''

''کیا میں نے کبھی اپنے آپ کو خدا کہا یا تمہیں یہ کہا ہو کہ دنیا کا خالق میں ہوں اور اس لئے میری عبادت کرو؟'' ("A List of False Reading of the Scriptures" .. T. Lindsey)

''جوزف پریسٹلے (Joseph Priestly 1733-1804) عقیدۂ توحید کے ماننے والوں کے لئے تاریخی اور فلسفیانہ دونوں لحاظ سے ایک جامع دلیل ہے۔توحیدِ الٰہی کی تائید میں کتبِ سماویہ اور قدیم عیسائی پاپاؤں کی تحریروں سے اُس نے مدلل اور معقولیت کے ساتھ استدلال کیا۔ اُس نے لکھا کہ غیر معقول بات کو اگر طاقت ومنصب کی تائید حاصل ہو تو یہ معقولیت کے آگے ہرگز نہیں ٹھہر سکتی۔ .. "The Epic of Unitarianism" D.B. Parke, p.48)

ولیم ایلری چیننگ (William Ellery Channing 1780-1842) نے عقیدۂ تثلیث کو کبھی قبول نہیں کیا۔ اُس نے اِس بات پر زور دیا کہ خدا اپنی کتابِ سماوی میں کبھی تضاد بیانی نہیں کرتا کہ ایک جگہ پر کچھ کہے اور دوسری جگہ پر کچھ اور کہے۔ اس لئے ہمیں کسی ایسی تاویل میں یقین نہیں کرنا چاہئے جو کسی تسلیم شدہ صداقت کے خلاف ہو۔ چیننگ اس بات پر مصر تھا کہ انسان کو عقل سے کام لینا چاہئے۔ ''خدا نے ہمیں ایک معقول فطرت دی ہے اور وہ ہم سے اس کا جواب لے گا۔ اگر ہم نے اس سے کام نہ لیا تو اِس کا نقصان ہمیں ہوگا۔ وحیِ الٰہی میں ہم سے بطور معقول انسان خطاب کیا گیا ہے:

''عقیدۂ تثلیث پر بڑا اعتراض یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے اصول میں مداخلتِ بےجا اور ایک اہم قانون کی خلاف ورزی ہے۔ توحید عبادت کا اہم مقصد ہے جسے وحیِ الٰہی میں اوّلیں مقام حاصل ہے۔ اس لئے اس قانون میں ہر قسم کے تغیر وتبدل یا اس کے مخالف کسی اور ضابطے کو شک کی نگاہ سے دیکھا جائے گا کیونکہ یہ کثرت پرستی اور تعدّدِ الٰہ کا موجب ہوگا اور اس طرح بت پرستی کے مترادف ہوگا۔'' ("The History of Jesus Christ"... J. Priestly)

''عیسائی مذہب اور عیسیٰ علیہ السلام کے دیئے ہوئے مذہب میں بڑا فرق ہے۔ یہودی سرزمین پر یونانی فلسفے سے تعمیر شدہ عقیدے کی ساخت اور خود عیسیٰ علیہ السلام کے عقیدے کے مابین بڑا فرق ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کا عقیدہ بالکل سادہ ہے جس میں ہر کہ ومہ شریک ہے۔'' ("Christianity and History"... Harnack, p.15)

حرفِ آخر (نتیجہ): جیسا کہ بہ دلائل ثابت کیا گیا کہ عقیدہ تثلیث نام کی کوئی چیز کتب وصحفِ سماویہ میں نہیں ہے۔ یہ بھی بالوضوح بیان کیا گیا کہ عقیدۂ تثلیث کا معقول لوگوں کے لئے تسلیم کرنا یا اُس کا ذہن میں تصوّر تک لانا ناممکن ہے کیونکہ یہ تضاد بیانی کو شامل ہے اور یہی تضاد بیانی اُسے بے معنیٰ اور بے مقصد بنانے کے لئے کافی ہے۔

(۱۰۲) جبریل علیہ السلام

''جبریل'' عبرانی لفظ ہے جو ''ایل'' (بمعنیٰ خدا) اور ''جبر'' (بمعنیٰ عبد اور بندہ) کا مرکب ہے۔ لہٰذا جبریل کا معنیٰ ''عبداللہ'' یعنی اللہ کا بندہ ہوا۔ آپ کا اصل نام عبدالجلیل اور لقب عبدالفتوح ہے۔ آپ سب سے اعلیٰ منصب رکھنے والے فرشتے (Arch-angel) ہیں اور آپ کے ذریعے اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں تک وحی بھیجتا رہا ہے۔ پیغمبروں تک وحیِ الٰہی پہنچانے کے علاوہ جبریل دوسرے فرائض اب بھی انجام دیتے ہیں جبکہ ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد مسلّمہ طور پر نبوت کا اختتام ہو چکا ہے۔'' [''نزھۃُ القاری'' (اردو شرح صحیح بخاری) از مفتی محمد شریف الحق' مبارک پوری۔ انڈیا' صفحہ ۲۶۱]

جبریل علیہ السلام کی ملکوتی تصویر: اپنی ملکوتی شکل میں جبریل علیہ السلام کے چھ سو پَر ہیں جن سے موتی اور لعلِ یاقوت جھڑتے رہتے ہیں۔ جبریل اس قدر جسیم ہیں کہ تمام فضا اُن کے وجود سے پُر ہے۔ ہمارے نبی ﷺ نے جبریل علیہ السلام کو اُن کی اصل شکل میں دو مرتبہ دیکھا۔

جبریل علیہ السلام کے القاب: قرآنِ حکیم میں جبریل علیہ السلام کے بیان کردہ القاب یہ ہیں:

(۱) رُوحُ القُدُس : (سورۃ البقرۃ: آیت ۸۷ ؛ المائدۃ: آیت ۱۱۰ ؛ النحل: آیت ۱۰۲)

(۲) رُوحُ الامین : (سورۃ الشعراء : آیت ۱۹۳)

(۳) رُوح : (سورہ مریم: آیت ۱۷ ؛ سورۃ المعارج : آیت ۴ ؛ سورۃ القدر: آیت ۴)

(۱) **رُوحُ القُدُس** : اسلام کے رُوحُ القُدُس کا عیسائیت کے Holy Ghost سے کوئی اشتراک نہیں۔ ہاں رُوحُ القُدُس کو Holy Ghost کہہ دیا گیا ہے اور یہ Holy Ghost عقیدہ تثلیث کی تیسری ہستی ہے جو باپ اور بیٹے کی مشترک روح ہے۔ (Pallen and Wynne's New Catholic Dictionary, p. 451)۔ اسلام میں ایسا کوئی لغو قضیہ نہیں ہے جو اس بات کی تائید کرے کہ Holy Spirit خدائے برتر کو شامل ہے اور اس لئے باپ اور بیٹے کی طرح اُس کی عبادت کی جائے (Hastings' Encyclopaedia of Religion and Ethics, Vol. XI, p. 798)۔ اور نہ ہی اُس میں ایسا مشرکانہ اصول ہے کہ Holy Spirit مقتدرِ اعلیٰ اور حیات بخش ہستی ہے جس کی تخلیق باپ سے ہوئی ہے اور جس کی عبادت باپ اور بیٹے کے ساتھ ساتھ کی جاتی ہے اور حمد و ستائش کی جاتی ہے۔'' (انسائیکلو پیڈیا بری ٹینیکا' طبع ۱۴' ج ۱۱' ص ۶۳۵ بحوالہ تفسیر ماجدی انگریزی (16-A/375)۔

(۲) **رُوحُ الامین** : امین کی صفت کا حامل وہ ہوتا ہے جو (۱) لائقِ اعتماد ہو۔ (۲) اپنے اعتماد پر پورا اترے۔ (۳) امانت کے تقاضوں کا پوری طرح پابند ہو اور امانت میں اپنی طرف سے کسی قسم کی کمی بیشی نہ کرے۔ (۴) اپنی منفعت اور مفاد کا چاہنے والا نہ ہو۔

(۳) رُوح : قرآنِ حکیم نے ملائکہ مقربین و خواص کو ''روح'' ہی سے تعبیر کیا ہے (مفردات القرآن ۔ امام راغب اصفہانی) مراد اس سے جبریل علیہ السلام ہیں اور فرّاء لغوی نے کہا کہ سورہ مریم کی آیت ۱۷ میں رُوح کی اضافت اللہ کی طرف ایسی ہی ہے جیسی ''اللہ کی زمین'' اور ''اللہ کا آسمان'' بولا جاتا ہے۔

اُمُّ المؤمنین سیّدہ خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا جب پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو پہلی وحی کے نزول پر اپنے چچا ورقہ بن نوفل ☆ کے پاس لے گئیں تو ورقہ رضی اللہ عنہ نے جبریل علیہ السلام کو ''ناموسِ موسیٰ'' کا لقب دیا تھا جس کا معنیٰ صحیح بخاری کے الفاظ میں ☆☆ وہ ہستی ہے جو غیب پر مطلع ہو لیکن اُسے غیر متعلقین سے چھپاتا ہو اور متعلقین سے اُس کا اظہار کرتا ہو۔

کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ نبی علیہ السلام کی وحیِ الٰہی کے ابتدائی تین سالوں میں وحی لانے کی ذمہ داری اسرافیل علیہ السلام کو سونپی گئی تھی اور جبریل علیہ السلام کو اُن کی جگہ بعد میں مقرر کیا گیا۔ لیکن یہ بات غلط ہے اور حقائق کے خلاف ہے۔ فترۃ الوحی کے چالیس دن کے زمانہ میں بھی جبریل پیغمبر ﷺ کے پاس آتے رہے لیکن اس دوران آپ کوئی وحی نہیں لائے۔ صحیح مسلم اور نسائی کی روایت کے مطابق جس کے راوی عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہیں، اِس عرصہ میں حضرت اسرافیل علیہ السلام نبی اکرم ﷺ کے پاس حاضر ہوتے رہے اور آپ کے آگے ''نبیِ عبد'' یا ''نبیِ ملک'' ہونے کے اختیار کو پیش کرتے رہے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اوّل الذکر یعنی ''نبیِ عبد'' ہونے کو یہ کہتے ہوئے اختیار کیا کہ اگر میں ''نبیِ ملک'' کے لقب کو اختیار کروں تو پہاڑ سونے میں بدل جائیں اور میرے ہمراہ ہولیں۔'' (''نُزھۃ القاری''۔ مفتی محمد شریف الحق، صفحہ ۲۶۲)

جبریل علیہ السلام کی فضیلت : سے متعلق سورۃ البقرۃ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہوا:

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَ هُدًى وَّ بُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ○ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ○ (البقرۃ : ۹۷، ۹۸)

''(اے نبی!) فرما دیجئے کہ جو کوئی جبریل کا دشمن ہو تو اس (جبریل) نے تو آپ کے دل پر اللہ کے حکم سے یہ قرآن اتارا (جو) اگلی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے اور مؤمنوں کے لئے ہدایت و بشارت ہے۔ جو کوئی اللہ کا، اُس کے فرشتوں کا، اُس کے رسولوں کا، جبریل و میکائیل کا دشمن ہو تو اللہ اِن کافروں کا دشمن ہے۔'' (۲ : ۹۷، ۹۸)

☆ سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے والد خویلد اور ورقہ کے والد نوفل دونوں اسد بن عبدالعزّیٰ کے بیٹے تھے اور آپس میں حقیقی بھائی تھے۔ لہٰذا ورقہ سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے چچا تھے۔ ورقہ نے ۴ سالِ نبوت میں وفات پائی اور اُنہیں نبی علیہ السلام کی رسالت پر پختہ ایمان تھا، اس لئے بلا شک و شبہ ورقہ رضی اللہ عنہ کا شمار اصحابِ نبی رضوان اللہ علیہم اجمعین میں کیا جاتا ہے۔'' (''نُزھۃ القاری''۔ مفتی محمد شریف الحق، صفحات ۲۵۳، ۲۵۶)

☆☆ صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں: اَلنَّامُوْسُ: صَاحِبُ السِّرِّ الَّذِیْ یَطلعه، بِمَا یَسْتُرُہٗ عَنْ غَیْرِہٖ

۲۶۸۴ (جبریل علیہ السلام)

قُلْ کہہ کے اپنی بات بھی منہ سے تیرے سنی　　اِتنی ہے گفتگو تری اللہ کو پسند

اِن آیات کا شانِ نزول تفسیر کبیر' عزیزی اور روح البیان میں بہ روایت طبرانی' بیہقی اور مسند امام احمد وغیرہ میں یہ بیان ہوا کہ ختمی مرتبت علیہ الصلوٰۃ والسلام جب ہجرت فرما کر مدینہ منورہ میں تشریف لائے تو فدک کے یہود کی ایک جماعت اپنے سردار عبداللہ بن صوریا کو لے کر امتحان کی غرض سے آپ علیہ السلام کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئی۔ ابنِ صوریا بولا کہ ہماری کتاب میں نبی آخر الزماں کی چند علامتیں لکھی ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہ علامتیں دیکھیں۔ فرمایا: تحقیق کرلو۔ وہ بولا: بتایئے کہ آپ کے سونے کا کیا حال ہے؟ فرمایا: ہماری آنکھیں سوتی ہیں لیکن دل بیدار رہتا ہے۔ بولا: آپ نے سچ کہا' آخری نبی کی یہی علامت ہے۔ پھر بولا: اچھا چند باتیں دریافت کرتا ہوں جنہیں نبی کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ فرمایا: پوچھو۔ وہ بولا: کیا وجہ ہے کہ بچہ کبھی ماں کے ہم شکل ہوتا ہے اور باپ کے۔ فرمایا کہ بچہ ماں اور باپ دونوں کے مادہ منویہ سے بنتا ہے مگر اُن میں سے جس کا مادہ منویہ اوپر رہے یا جس کا مادہ رحم میں پہلے داخل ہو' یا جس کا مادہ منویہ زیادہ اور غالب ہو' بچہ اُسی کی شکل پر پیدا ہوتا ہے۔ بولا: بہت ٹھیک۔ اچھا! یہ بتایئے کہ بچے کا کون سا عضو ماں کی منی سے اور کون سا عضو باپ کی منی سے بنتا ہے؟ فرمایا: ہڈی اور پٹھے باپ کی منی سے اور گوشت' خون' بال اور ناخن ماں کی منی سے بنتے ہیں۔ بولا: بالکل سچ ہے۔ اچھا! یہ بتایئے کہ جنتیوں کو جنت میں پہلے کون سی غذا دی جائے گی؟ فرمایا: مچھلی اور بیل کا گوشت۔ بولا: ٹھیک ہے۔ بتایئے کہ یعقوب علیہ السلام نے اپنے پر کونسی غذا حرام کی تھی اور کیوں کی تھی؟ فرمایا: اُنہیں عرق النساء کی بیماری تھی۔ آپ نے نذر مانی تھی کہ اے اللہ! اگر مجھے اس بیماری سے نجات ملے تو میں اپنی مرغوب غذا یعنی اونٹ کا گوشت اور دودھ اپنے پر حرام کرلوں گا۔ ابنِ صوریا بولا کہ آپ کی تمام باتیں سچی ہیں۔ بس ایک بات اور بتا دیجئے تو میں اپنی جماعت کے ساتھ آپ پر ایمان لے آؤں گا۔ آپ پر وحی کون لاتا ہے اور آپ کا رفیق اور غم گسار کون سا فرشتہ ہے؟ فرمایا: جبریل علیہ السلام ہی سارے پیغمبروں پر وحی لاتے ہیں اور یہی اُن کے بھی رفیق تھے۔ بولا: ہم تو ایمان نہ لائیں گے۔ فرمایا: کیوں؟ وہ بولا: جبریل تو یہود کا پرانا دشمن ہے۔ اگر میکائیل قرآن لاتے ہوتے تو ہم ایمان لے آتے۔ فرمایا: اُس نے تم سے کیا دشمنی کی؟ بولا: ایک دشمنی نہیں' بیسیوں دشمنیاں کیں۔ کہ (۱) رسالت ہمارے خاندان میں تھی' اب جبریل نے یہ عہدہ بنی اسمٰعیل کو دے دیا۔ (۲) ہمارے بزرگوں پر عذاب لانے والا یہی ہے۔ (۳) ہمارے پیغمبروں نے خبر دی تھی کہ ایک لڑکا بخت نصر عراق میں فلاں تاریخ کو پیدا ہوگا اور فلاں جگہ رہے گا۔ وہ بیت المقدس کو ویران اور بنی اسرائیل کو تباہ اور غارت کرے گا۔ ہمارے بزرگوں نے چند قاتل وہاں اُسے قتل کرنے کے لئے بھیجے۔ اُنہوں نے اُس بچے پر قابو بھی پالیا مگر جبریل نے آ کر اُسے بچالیا جس پر اسی بخت نصر نے ہماری قوم کو ہلاک کر ڈالا۔ بتایئے ان سے بڑھ کر ہمارا دشمن کون ہوسکتا ہے؟ اس کے جواب میں یہ آیاتِ کریمہ اتریں۔ (تفسیر نعیمی' جلد اوّل' صفحات ۶۶۳' ۶۶۴) جن میں جبریل علیہ السلام کے مقام و مرتبتِ عالی کو بیان کیا گیا۔ تفسیر خزائن العرفان نے اس جگہ فرمایا: اس میں اشارتاً یہ بھی فرما دیا گیا کہ وہ زمانہ گیا جب جبریل عذاب لاتے تھے۔ اب تو وہ بشارتیں لا رہے ہیں۔ تم پھر بھی اُن کی عداوت سے باز نہیں آتے۔ یعنی پہلے جبریل علیہ السلام کے دو کام تھے: مسلمانوں کے لئے خوشخبری لانا اور کفار کے لئے عذاب۔ مگر اب سلطنت مصطفیٰ کا دور دورہ ہے' اب اُن کا کام صرف بشارت لانا ہے' عذاب لانا بند ہوگیا۔ (ایضاً' ص ۶۶۶)

۲۶۸۵ (جبریل علیہ السلام)

جبریل علیہ السلام دیگر ملائکہ سے افضل ہیں۔ اس لئے سورۃ البقرۃ کی آیت ۹۸ میں اُن کا ذکر میکائیل سے پہلے ہوا۔ نیز آپ قرآنِ کریم کی وحی اور علم لائے جو کہ غذائے روح ہیں۔ میکائیل علیہ السلام بارش وغیرہ لاتے ہیں جس سے بدن کی بقا ہے اور روح بدن سے افضل ہے۔ اسی لئے اس کی غذا بھی بدن کی غذا سے افضل ہوئی۔ نیز قرآنِ حکیم نے جبریل علیہ السلام کی صفت میں فرمایا: مُطَاعٍ ثَمَّ أَمِيْنٍ (سورۃُ التّکویر: ۲۱) یعنی فرشتہِ وحی جبریل علیہ السلام تو فرشتوں میں بھی سروری اور سرداری کا مرتبہ رکھتے ہیں (تفسیر مدارک)۔ أمیـن کا وصف بیان کر کے اِس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہوگیا کہ اُن کی پیام رسانی میں ادنیٰ دخل بھی خیانت کو نہیں۔ نہ لفظاً نہ معنیً نہ سہواً نہ عمداً۔ قرآن کا لانے والا یہ فرشتہ جب اِن اوصاف کا مالک ہے تو یہ ناممکن ہے کہ خود اُس کی طرف سے کوئی خیانت ہوئی ہو اور یہ بھی ممکن نہیں کہ کسی خارجی ذریعہ سے اس کلام میں کہانت کی آمیزش ہو۔ یہ سب اُن منکرین کے جواب میں ارشاد ہو رہا ہے جو رسول اللہ ﷺ کو نعوذ باللہ کاہن اور قرآن کو آپ کا کلام سمجھ رہے تھے۔

''نیز جبریل علیہ السلام کے ذمہ انبیائے کرام کی خدمت رہی اور دوسرے انتظام کرنے والے فرشتوں کے ذمہ عام مخلوق کی خدمت اور بڑے مخدوم کا خادم بھی بڑا ہوتا ہے۔ تفسیر عزیزی نے طبرانی کی ایک روایت بیان فرمائی کہ فرشتوں میں افضل حضرت جبریلِ امین ہیں، دنوں میں افضل جمعہ، مہینوں میں افضل ماہِ رمضان، راتوں میں افضل شبِ قدر اور عورتوں میں افضل سیّدہ مریم سلام اللہ علیہا ہیں۔'' (تفسیر نعیمی ــ مفتی احمد یار خاں گجراتی، جلد اوّل، صفحہ ۶۶۸)

جبریل علیہ السلام کی انبیائے کرام کی طرف آمد کی تعداد: حسبِ ذیل ہے:

حضرت آدم علیہ السلام کی طرف	:	۱۲ مرتبہ
حضرت اِدریس علیہ السلام کی طرف	:	۴ مرتبہ
حضرت نوح علیہ السلام کی طرف	:	۵۰ مرتبہ
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف	:	۴۲ مرتبہ
حضرت یعقوب علیہ السلام کی طرف	:	۴ مرتبہ
حضرت ایوّب علیہ السلام کی طرف	:	۳ مرتبہ
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف	:	۱۰ مرتبہ (تین مرتبہ اُن کی شیر خوارگی کے زمانہ میں اور ۷ مرتبہ اُن کی پختہ عمری میں)
امام الانبیاء ﷺ کی طرف	:	چوبیس ہزار مرتبہ (زرقانی، جلد اوّل، صفحہ ۲۳۴)

(۱۰۳) الجہاد فی الاسلام

لفظ ''جہاد'' کا مصدر ج ہ د = جھد بمعنیٰ سعی اور کوشش ہے۔ بالفاظِ دیگر کسی چیز اور نصب العین کے حصول کی کوشش میں اپنی تمام تر صلاحیتوں اور قوّتوں کو وقف کر دینے کا نام ''جہاد'' ہے۔

اسلامی اصطلاح میں مسلمانوں کا اعلائے کلمۃ الحق (اسلام) کی اشاعت اور اُسے عام کرنے کی راہ میں ہر قسم کی رکاوٹ کو دُور کرنے کی انتہائی کوشش کا نام ''جہاد'' ہے۔ لہٰذا اللہ کی راہ میں کوشش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان کو رضائے الٰہی کی خاطر حتی الوسع ہر قسم کی کوشش کرنی چاہیئے تاکہ احکاماتِ الٰہی کی تعمیل اور حق و صداقت کا بول بالا ہو سکے۔

اسلام نے جہاد فی سبیل اللہ کی حسبِ ذیل چار بڑی اقسام وضع کی ہیں جنہیں تقاضائے حالات کے مطابق اختیار کیا جا سکتا ہے:

(۱) جہاد بالنفس (۲) داخلی جہاد
(۳) جہاد بذریعہ علم و دعوت (۴) جہاد بذریعہ شمشیر (جسمانی جہاد)

(۱) جہاد بالنفس : یہ جہاد کی انتہائی اعلیٰ قسم ہے جس کی بابت سورۃ النّازعٰت میں ارشاد ہوا :

فَاَمَّا مَنْ طَغٰی ۝ وَاٰثَرَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا ۝ فَاِنَّ الْجَحِیْمَ هِیَ الْمَاْوٰی ۝ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَی النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰی ۝ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰی ۝ (آیات ۳۷۔۴۱)

''تو جس کسی نے سرکشی کی ہو گی اور دُنیوی زندگی کو ترجیح دی ہو گی تو ایسے کا ٹھکانہ بس دوزخ ہی ہو گا۔ اور جو کوئی اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا ہو گا اور نفس کو خواہش سے روکا ہو گا تو ایسے کا ٹھکانہ جنت ہی ہے۔ (۷۹ : ۳۷۔۴۱)

اور اِسی جہاد بالنفس کے ضمن میں ختمی مرتبت علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشادِ گرامی ہے:

لَیْسَ الشَّدِیْدُ بِالصُّرَعَةِ اِنَّمَا الشَّدِیْدُ الَّذِیْ یَمْلِكُ نَفْسَهٗ عِنْدَ الْغَضَبِ (اربعین نووی)

''طاقتور وہ نہیں جو (اپنے) مدِّ مقابل کو پچھاڑ دے' دراصل طاقتور تو وہ ہے جو غصّہ کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھے۔'' (اربعین امام نووی)

(۲) داخلی جہاد : مسلم معاشرہ میں اُٹھنے والی برائیوں کے خلاف جہاد ''داخلی جہاد'' ہے۔ ایسی برائیوں کا قلع قمع شروع ہی سے کر دینا چاہیئے کیونکہ وہ اسلام کی عمارت میں بہت بڑا خطرہ ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے اِن برائیوں کے خلاف اس حدیث میں تنبیہ کی ہے:

۲۶۸۷ (الجہاد فی الاسلام)

''مجھ سے پہلے اللہ کے ہر پیغمبر کے ایسے مخلص پیرو کار اور ساتھی تھے جنہوں نے وفادارانہ طور پر ایمان کو اپنایا اور اپنے پیغمبر کی تعلیمات سے تمسک کیا لیکن اُن کے بعد ایسے بے وفا لوگ آئے جن کے اعمال و افعال پیغمبروں کی تعلیم سے مختلف تھے اور جنہوں نے اُس چیز کو شہرہ دیا جس کا حکم اُن کے مذہب میں نہیں تھا۔ وہ شخص جو جسمانی طور پر ایسے لوگوں کے خلاف نبرد آزما ہوتا ہے' سچا مؤمن ہے۔ وہ جو زبانی طور پر ایسے لوگوں کے خلاف نبرد آزما ہوتا ہے' وہ بھی سچا مؤمن ہے۔ وہ جو ایسے لوگوں کے خلاف اپنے دل میں کراہت محسوس کرتا ہے' وہ بھی سچا مؤمن ہے لیکن مؤخر الذکر ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے اور اس کے بعد ایمان کا کوئی درجہ نہیں ہے۔''

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ فرمان بظاہر خبر کے طور پر نہیں بلکہ یہ حکم اور امر ہے۔ اس کا مقصد مسلمانوں کو تنبیہ کرنا ہے کہ اُنہیں ایسے حالات کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ یہ فرمانِ عالی اُس عمل کو بھی تجویز کرتا ہے جو ایسے حالات میں اُنہیں اپنانا چاہئے۔ یہ حدیثِ نبوی دو چیزوں کی وضاحت کرتی ہے:

اوّل تو یہ کہ مسلم سماج میں جو بھی برائی ابھرے' اُس کے قلع قمع کرنے کا نام ''جہاد'' ہے۔

دوم یہ کہ کسی برائی کے دبانے کے مختلف طریقے مسلمانوں کے ایمان کے درجے کے مطابق ہوں گے۔

''برائی کے خلاف نبرد آزما ہونے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ (i) اِس کے خلاف پوری جسمانی قوّت کو بروئے کار لا کر اُسے مکمل طور پر معدوم کر دیا جائے۔ (ii) اگر کسی وجہ سے جسمانی قوّت کے استعمال کی ہمت نہیں ہے تو اس مقصد کے لئے زبانی طریق کا بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ لوگوں کو وعظ و نصیحت کی جائے اور رب تعالیٰ کی ناراضی اور آخرت کی زندگی میں اس کے نتائج سے اُنہیں ڈرایا جائے۔ اگر یہ تدبیریں ناکام رہتی ہیں تو لوگوں کو سرزنش کی جائے شاید کہ وہ باز آ جائیں۔ (iii) اگر برائی کی مذمّت برملا کرنے کی جرأت نہیں تو کم از کم اتنا تو ہو کہ برائی کو دل میں برا سمجھا جائے اور آدمی برائی سے اتنا متنفر ہو کہ اُس کا محض تصوّر کرنا ہی اُس کے رنج و اَلم کا باعث بن جائے۔ اُس کے لئے برائی پُر آزار بات (Eye-sore) ہو جائے اور اُس کی شدید خواہش ہو کہ بدی کو جڑ سے اکھیڑ دیا جائے۔ وہ دعا کرتا ہے کہ گناہ اور برائی میں ملوث شخص گناہ کی آلودگی سے پاک و صاف ہو جائے اور اُس کی اصلاح ہو جائے۔ اُس کا ضمیر بحال ہوتا ہے اور اُس کا ایمان بیدار ہوتا ہے حتیٰ کہ وہ برائی کے خلاف اپنے ردِّ عمل کو بڑھاتا رہتا ہے اور اُس کی لعنت سے وہ اپنے کو آزاد رکھتا ہے۔''

''مسلم سماج کو تمام برائیوں سے پاک و صاف رکھنے کے یہ تین عملی طریقے ہیں اور صرف یہی ممکنات ہیں۔ اُن میں سے ہر ایک طریقہ ''جہاد'' ہے اور اُن میں سے ہر طریقہ حق و صداقت کو قائم کرنے کی کوشش کا جزء ہے۔ حق و صداقت کے لئے سعی و کوشش کا نام ہی تو ''جہاد فی سبیل اللہ'' ہے۔''

''برائی کے استیصال کے لئے اُن کوششوں کو جنہیں حدیثِ بالا میں ''جہاد فی سبیل اللہ'' کا نام دیا گیا ہے کسی حدیث میں ''تغیر المنکر'' (یعنی برائی کو بدل دینا) کا نام بھی دیا گیا ہے۔ مثلاً آقا علیہ السلام نے فرمایا:

مَنْ رَآی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ وَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِیْمَان (صحیح مسلم، مشکوٰۃ)

"تم میں سے جو کوئی کسی برائی کو دیکھے تو اُسے اپنے ہاتھ (طاقت) سے روک دے۔ اگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تو زبان سے روکے اور اگر یہ بھی نہیں کر سکتا تو (کم از کم) اُسے اپنے دل میں تو برا سمجھے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔" (صحیح مسلم، مشکوٰۃ)

ایسی کوششوں کو "نہی عن المنکر" بھی کہا گیا ہے۔ مثلاً فرمایا:
(۱) "نیکی کا حکم دو اور برائی سے روکو۔" (سورہ لقمن: ۱۷)
(۲) "ایک دوسرے کو نیکی کی ترغیب دو اور بدعملی سے روکو۔" (ترمذی)

اِن تمام مثالوں سے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ "مسلم سماج کے برے عناصر کے خلاف کوشش کرنا" اور اُن کے "غلط اور برے طریقوں" کی اصلاح کرنا اور اُنہیں "برائی سے روکنا" دراصل یہ سب ایک ہی چیز کے مختلف اظہار ہیں۔ ان میں سے ہم جس طریقے کو بھی اختیار کر لیں تو ہمارے مدِّ نظر مقصد میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

"ایک اور چیز جو اِن احادیثِ نبوی سے واضح طور پر سامنے آتی ہے' یہ ہے کہ جہاد مسلم سماج کا اجتماعی فرض ہے۔ نہ ہی افراد اور نہ ہی ریاست اس فریضہ سے مستثنیٰ ہے۔ اس عظیم ذمہ داری میں اُن میں سے ہر ایک اپنی حیثیت کے مطابق حصہ دار ہے۔ قرآنِ حکیم میں اس نکتے کو مزید واضح کہا گیا ہے۔ افراد کے معاملے میں قرآن کہتا ہے:
وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ (التوبۃ: ۷۱)
"اور ایمان والے اور ایمان والیاں ایک دوسرے کے (دینی) رفیق ہیں۔ وہ نیک باتوں کا (آپس میں) حکم دیتے ہیں اور بری باتوں سے روکتے رہتے ہیں۔" (۷۱ : ۹)

اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر مسلمانوں کی دائمی خصوصیت ہے اور اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کا ایک پہلو ہے۔ جہاں کہیں بھی مسلمان کا وجود ہوگا وہ مسلسل اس فرض کی تعمیل کرتا ہوا پایا جائے گا۔

اسلامی ریاست کے بارے میں قرآن فرماتا ہے:
اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَآتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ (اَلحَجّ: ۴۱)
"(یہ لوگ ایسے ہیں کہ) اگر ہم اُنہیں زمین میں حکومت دے دیں تو وہ نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں اور (دوسروں کو بھی) نیکی کا حکم دیں اور برے کاموں سے منع کریں۔" (۴۱ : ۲۲)

''یہ ہے اسلامی طرزِ حکومت کی سچی اور اصلی تصویر۔ گورنمنٹ اگر سچے مسلمانوں کی قائم ہو جائے تو مسجدیں آباد و پُر رونق ہو جائیں۔ ہر طرف سے تکبیر و تہلیل کی صدائیں گونجا کریں۔ بیت المال سے کوئی ننگا' بھوکا نہ رہ جانے پائے۔ عدالتوں میں انصاف بکنے کی بجائے ملنے لگے۔ رشوت' جعلسازی اور دروغ حلفی کا بازار سرد پڑ جائے۔ امیر کو غریب کی تحقیر اور ایذا کا کوئی حق اور موقع نہ رہ جائے۔ غیبتیں' بدکاریاں' چوریاں' ڈاکے خواب و خیال ہو کے رہ جائیں۔ آبکاری کے محکمہ کو کوئی پانی دینے والا بھی نہ رہے' مہاجنی کوٹھیوں' سود خور ساہوکاروں' بینکوں کے ٹاٹ الٹ جائیں۔ گویّے' نچنیے اگر تائب نہ ہوں تو شہر بدر کر دیئے جائیں۔ سینما' تھیٹر اور تمام شہوانی تماشا گاہوں کے پردوں کو آگ لگادی جائے۔ گندہ' فحش' افسانہ وعشقیہ شاعری کی جگہ صالح و پاکیزہ ادبیات لے لے۔ غرض یہ کہ یہ دنیا' دنیا رہ کر بھی نمونۂ جنت بن جائے۔'' (تفسیر ماجدی اردو' صفحہ ۶۸۶' نوٹ: ۷۷)

(۴) **جہاد بذریعہ علم و دعوت**: جہاد کی یہ قسم اس بات کو شامل ہے کہ غیر مسلمین کی جانب سے اسلام کے متعلق جو شکوک وشبہات پیدا کیے گئے ہیں اور کفار کی طرف سے جو اعتراضات اور دلائل پیش کیے گئے ہیں' اُن کا جواب ایسے قاطع طور پر دیا جائے کہ اسلام کے خلاف کوئی شک وشبہ' اعتراض' ابہام یا استدلال باقی نہ رہے۔ نبی اکرم ﷺ کی مکی زندگی کا زمانہ کلی طور پر اسی جہاد میں گزرا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ حکم دیا:

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ○ (الفرقان: ۵۲)

''سو آپ کافروں کا کہنا مانئے اور قرآن کے ذریعہ سے اُن کا مقابلہ زور شور سے کیجئے۔'' (۲۵:۵۲)

''فقہاء نے کہا ہے کہ اعلاء کلمۃ الحق اور ترکِ دعوت کے باب میں کافروں کی رعایت و اطاعت حرام ہے اور اعلانِ قرآن و تبلیغ بالقرآن میں غایت درجہ کوشش اور جہاد واجب ہے۔'' (ماجدی)

بندۂ خدا بے ایمان اور دل آزار نقادوں کی پروا نہیں کیا کرتا۔ وہ وحیِ الٰہی کے ہتھیار کے ذریعے جہادِ عظیم جاری رکھتا ہے۔ ''قرآن کے ذریعہ سے اُن کا مقابلہ زور شور سے کیجئے'' کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں کفار کے آگے اُن قرآنی دلائل کو پیش کرتے رہنا چاہئے جس سے اسلام کی صداقت و حقانیت ثابت ہو جائے اور اُن دلائل کی بے ثمری اور لغویت ظاہر ہو جائے جو وہ اپنے کفر کی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ استدلال کے اُس طریقہ کے ذریعے جو قرآن نے تمہیں بتایا ہے تمہیں کفار کی حجت کی ناکامی کو واضح کر دینا چاہئے۔ تمہیں اِس مہم کو اُس وقت تک جاری رکھنا چاہئے جب تک وہ اپنے جعلی' خانہ ساز دلائل میں مات نہ کھا جائیں اور مجبور ہو کر ہار نہ مان لیں۔

نبی آخر الزماں ﷺ نے اِس قسم کے جہاد کو لسانی جہاد بھی کہا ہے۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا:
''کافروں کے خلاف اپنی دولت' اپنی جانوں اور اپنی گفتگو کے ذریعے جہاد کرو۔'' (ابوداؤد)

اِس قسم کے جہاد میں آدمی دشمن کے خلاف عقل و استدلال' علم اور ذہانت کے ہتھیار سے لیس ہوتا ہے۔ یہ جہاد اُس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک دشمن کی تمام فلسفیانہ اور ذہانتی فصیل زمیں بوس نہیں ہو جاتی۔ اس مقصد

کے لئے علم کی ہر شاخ کو بروئے کار لانا ہوگا۔ دینیات' طبیعیات' تاریخ' ثقافت' اقتصادیات' سیاسیات' سائنس' فلسفہ غرضیکہ علم کی ہر شاخ کو بلا کسی استثناء کے کام میں لانا ہوگا۔ اُس انداز اور رویّہ کے تعارف کی یہاں چنداں ضرورت نہیں جو قرآن حکیم نے کافر عربوں کے اعتراضات اور معتقدات کے سلسلہ میں روا رکھا۔ اس سلسلہ میں یہ قرآنی فیصلہ قضیے کو واضح کر دے گا:

وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ۝ (الفرقان: ۳۳)

''اور یہ لوگ جیسا بھی عجیب سوال آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں' ہم اُس کا جواب ٹھیک اور وضاحت میں بڑھا ہوا آپ کو بتا دیتے ہیں۔'' (۳۳ : ۲۵)

''ایسا جواب جو قطعی بھی ہوتا ہے اور قریب الفہم بھی۔ جواب کی دو خوبیاں ہیں: ایک ذاتی کہ فی نفسہٖ قاطع مادہ شبہ ہو اور دوسری اضافی کہ اپنی وضاحت کے سبب قریب الفہم ہو۔ اَلْحَقّ میں اوّل خوبی اور وَاَحْسَنَ تَفْسِیْرًا میں دوسری خوبی کی طرف اشارہ ہے۔'' (ماجدی' ص ۳۵ے' نوٹ: ۳۷)

قرآن حکیم نے اس قسم کے جہاد کے لئے ایک بنیادی اصول وضع کیا ہے اور حکم دیا ہے:

وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ (النّحل: ۱۲۵)

''اور اُن کے ساتھ پسندیدہ و شائستہ طریقے سے بحث کیجئے۔'' (۱۲۵ : ۱۶)

ایک طریقہ کار کی خصوصیت کا اندازہ حاصل ہونے والی کامیابی سے لگایا جا سکتا ہے۔ ''مبلّغ کا اندازِ خطاب ایسا ہونا چاہئے جس کے لفظ لفظ سے اخلاص و محبت کے چشمے اُبل رہے ہوں' اُس کی آواز کا زیر و بم شفقت و پیار کا آئینہ دار ہو اور اگر بھٹکا ہوا راہی آمادۂ پیکار ہو جائے اور بحث و مناظرہ تک نوبت جا پہنچے تو اَحسن طریقہ سے مناظرہ کرو جس میں خشونت نہ ہو۔ اپنی علمی برتری کے گھمنڈ میں تہذیب اور شائستگی کا دامن نہ چھوٹنے پائے' فریقِ مخالف کو ہر قیمت پر نیچا دکھانے کی کوشش نہیں ہونی چاہئے۔ مبلغ کے پیشِ نظر فقط حق کی سربلندی ہو۔ جب تک کوئی مبلّغ اِن خوبیوں سے متصف نہ ہو' اُسے اس میدان میں قدم نہ رکھنا چاہئے۔ اس معیار پر پورا اترنے کے لئے علم و آگاہی کی وسعتوں کے علاوہ مکارمِ اخلاق اور محاسنِ خصائل سے مزیّن ہونا بھی ضروری ہے اور یہ نعمت کسی صاحبِ دل کی صحبت سے حاصل ہو سکتی ہے۔'' (''ضیاء القرآن'' از کرم شاہ الازہری' جلد دوم' صفحہ ۶۱۸' نوٹ: ۱۴۳)

''جہاد کی اِس قسم کے لئے ایک اور لازمی صفت صبر و استقلال کی ہے۔ اگرچہ یہ صفت بظاہر اپنی اصل میں اضافی ہے لیکن اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے اور اس کوشش کو باثمر کرنے میں یہ ناگزیر ہے۔ یہ حقیقت جانی پہچانی ہے کہ دعوتِ اسلام کو اکثر خوش آمدیدی حاصل نہیں ہوتی۔ کافر جنہیں اسلام پیش کیا جاتا ہے' اتنے فراخ دل اور دیانتدار نہیں ہوتے کہ وہ تبلیغ کو متانت و سنجیدگی کے ساتھ سن سکیں اور معقولیت کے ساتھ بحث کر سکیں۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ سامعین اپنے تعصب اور جذبات میں بہہ جاتے ہیں اور عزت و وقار کا غلط تصوّر اس کے منظر کو بگاڑ ڈالتا ہے۔ وہ سنجیدہ دلائل اور معقول منطق کا جواب درشت زبان اور سخت ناگوار رویّہ سے دیتے ہیں۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صحابہ کرام کے

طریقہِ تبلیغ میں خلوص، لگن، شیریں کلامی اور معقولیت میں کون زیادہ ہوگا لیکن اُنہوں نے بھی ناقابلِ برداشت صورتِ حال کا سامنا کیا اور اُنہیں ایسی صورتِ حال سے نمٹنے کی پہلے ہی تنبیہ کر دی گئی اور فرمایا گیا:

وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا أَذًى كَثِيْرًا وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ O (آلِ عمران : ۱۸۶)

''اور یقیناً تم بہت سی دل آزاری کی باتیں اُن سے بھی سنو گے جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی ہے اور اُن سے بھی جو مشرک ہیں، اور اگر تم صبر کرو اور خدا خوفی اختیار کرو تو یہ تاکیدی احکام میں سے ہے۔'' (۱۸۶: ۳)

أَذًى كَثِيْرًا میں دینِ اسلام کی تحقیر، پیغمبر کی توہین وغیرہ سب چیزیں آ گئیں۔ قرآنِ مجید کی یہ پیش گوئی آج تک کیسی صحیح چلی آ رہی ہے۔ یہود کی، مسیحیوں کی، ہندوؤں کی زبانوں سے اپنے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام، اپنے دین اور اپنی کتابِ مبارکہ کے بارہ میں کیا کچھ سننا نہیں پڑ چکا ہے۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ خیر خواہی کا جواب اُجڈ پن سے اور خوش کن سلام کا جواب گالیوں اور دشنام طرازی سے دیا جاتا ہے اور مضبوط دلائل کا جواب پتھروں سے دیا جاتا ہے۔ بات یہاں تک ختم نہیں ہو جاتی بلکہ معاملہ اور بھی سنجیدگی اختیار کر جاتا ہے۔ لیکن اسلامی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ایسی مشکلات اور دل آزاریوں کو بالکل خاطر میں نہ لایا جائے اور نوعِ انسان کو اپنے خالق و مالک کی عبادت و اطاعت کی طرف مسلسل بلاتے رہنا چاہئے اور یہ کام کسی دھتکار اور ڈانٹ ڈپٹ کے خوف کے بغیر ہونا چاہئے۔ حالات کتنے ہی ناموافق اور سنگین ہوں، مسلمان کو حالات سے مصالحت تک کا نہیں سوچنا چاہئے۔ نبی علیہ السلام کو رب تعالیٰ نے ایسے موقع پر یوں تلقین کی:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ O (اَلْحِجر : ۹۴)

''جس کا آپ کو حکم دیا گیا ہے، اُسے صاف سنا دیجئے اور مشرکوں کی پروا نہ کیجئے۔'' (۹۴ : ۱۵)

سچی اور کھری بات تو یہ ہے کہ دعوتِ اسلام ''جہاد'' کا درجہ جب پاتی ہے جب اسے مخالفت اور مزاحمت کے شدید طوفان میں ادا کیا جائے۔

(۴) جہاد بالسیف (جسمانی جہاد) : جسمانی قوت کے ساتھ جہاد کا حکم اُن لوگوں کے خلاف دیا گیا ہے جو اسلام کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں اور اِس جہاد کو راہ کے صاف ہونے تک جاری رہنا چاہئے۔ جہاد کا یہ آخری پہلو ہے اور اس کا دوسرا نام ''قتال'' ہے۔ عملی طور پر جہاد کی یہ قسم بہت مشکل اور بحرانی کیفیت کی حامل ہے لیکن دینِ اسلام کی اشاعت میں اسے بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس کی عظیم اہمیت کو اُس وقت اجاگر کیا گیا جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو پہلے پہل یہ حکم دیا:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (البقرۃ: ۲۱۶)

''تم پر جہاد فرض کر دیا گیا ہے درآنحالیکہ وہ تم پر گراں ہے☆ لیکن کیا عجب تم کسی چیز کو ناپسند کرتے ہو اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو۔'' (۲۱۶ : ۲)

''**جنگ کا اسلامی تصور**: اسلامی نظریہ جنگ کے مطابق جنگ کا اصلی مقصد حریفِ مقابل کو ہلاک کرنا اور نقصان پہنچانا نہیں بلکہ محض اُس کے شر کو دفع کرنا ہے۔ اس لئے اسلام یہ اصول پیش کرتا ہے کہ جنگ میں صرف اُتنی ہی قوّت استعمال کرنی چاہئے جتنی دفعِ شر کے لئے ناگزیر ہو اور اس قوّت کا استعمال صرف اُنہی طبقوں کے خلاف ہونا چاہئے جو عملاً برسرِ پیکار ہوں یا جن سے شر کا اندیشہ ہو۔ باقی تمام انسانی طبقات کو جنگ کے اثرات سے محفوظ رہنا چاہئے۔۔۔ جنگ کا یہ تصوّر اُن تصورات سے مختلف تھا جو عام طور پر غیر مسلم دماغوں میں موجود تھے۔ اس لئے اسلام نے تمام رائج الوقت الفاظ اور اصطلاحات کو چھوڑ کر جہاد فِی سبیل اللہ کی الگ اصطلاح وضع کی جو اپنے معنی موضوع لہٗ پر ٹھیک ٹھیک دلالت کرتی ہے اور وحشیانہ جنگ کے تصوّرات سے اُسے بالکل جدا کر دیتی ہے۔ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :

جَاءَ رَجُلٌ'' اِلَی النَّبِیِّ ﷺ فَقَالَ : اَلرَّجُلُ یُقَاتِلُ لِلْمَغْنَمِ وَالرَّجُلُ یُقَاتِلُ لِلذِّکْرِ وَالرَّجُلُ یُقَاتِلُ لِیُرٰی مَکَانُہٗ، فَمَنْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ؟ قَالَ: مَنْ قَاتَلَ لِتَکُوْنَ کَلِمَۃُ اللّٰہِ ھِیَ الْعُلْیَا وَ ھُوَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ

''ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور بولا کہ کوئی شخص مالِ غنیمت حاصل کرنے کے لئے جنگ کرتا ہے، کوئی شہرت و ناموری کے لئے اور کوئی اپنی بہادری دکھانے کے لئے جنگ کرتا ہے۔ فرمایئے کہ اِن میں سے کس کی جنگ راہِ خدا میں ہے؟ حضور ﷺ نے جواب دیا کہ راہِ خدا کی جنگ تو صرف اُس شخص کی ہے جو محض اللہ کا بول بالا کرنے کے لئے لڑے۔'' (''الجہاد فی الاسلام''۔۔ سیّد ابو الاعلیٰ مودودی، صفحات ۲۱۷، ۲۱۹)

مقصدِ جہاد: قرآن مجید نے کچھ مقامات پر مقصدِ جہاد کو بیان کیا ہے۔ مثلاً :

(i) وَقَاتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ (الانفال : ۳۹)

''اور اُن سے لڑو یہاں تک کہ فسادِ (عقیدہ) باقی نہ رہے اور دین سارے کا سارا اللہ ہی کے لئے ہو جائے۔'' (۳۹ : ۸)

یہاں یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ کفار کو ایمان لانے پر مجبور کیا جائے اور دنیا میں فقط اسلام ہی باقی رکھا جائے۔ حدیث میں بھی ہے : اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یَشْھَدُوْا اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ (مشکوٰۃ : کتاب الایمان) یعنی ''مجھے لوگوں سے اُس وقت تک جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے جب تک وہ کلمہ نہ پڑھ لیں کہ اللہ کے سوا

☆ اِس بات میں اسلام کے خلاف اِس پراپیگنڈے کا رد ہے کہ مسلمان خونخوار اور خونریزی کے عادی ہیں، اور فطرتاً جھگڑالو ہیں اور یہ کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلا ہے۔ اس موضوع پر اس مقالہ کے آخر میں غیر مسلمان کے تاثرات ملاحظہ کئے جائیں۔

کوئی معبودِ برحق نہیں۔'' اس کا جواب یہ ہے کہ یہ آیت اور حدیث کفارِ عرب کے لئے ہے۔ دوم یہ کہ آیت وحدیث میں حَتّٰی لام کے معنیٰ میں ہے یعنی تم دنیا کے لئے نہیں بلکہ فساد مٹانے اور اسلام پھیلانے کی نیت سے جہاد کرو۔ جب تک جنگ کی آگ بجھ نہ جائے اور اسلام سے دینی رکاوٹیں اُٹھ نہ جائیں کہ مسلمانوں کو دینی آزادی حاصل ہو۔ اگر قبولِ اسلام جبری ہوتا تو لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْن کیوں فرمایا گیا نیز غیر مسلمین کو اسلامی حکومت کے زیرِ نگیں صدہا سال تک امن وامان سے اور عقیدے کی آزادی کے ساتھ رہنے کی اجازت کیوں دی گئی؟

''فتنہ'' کی تحقیق: عام طور پر فتنہ وفساد کے معنیٰ یہ سمجھے جاتے ہیں کہ کسی بات پر دو جماعتوں میں جھگڑا ہو جائے' پہلے گالم گلوچ ہو' پھر فریقین کے مستعد آدمی اینٹ' پتھر یا لاٹھی پونگے یا تلوار بندوق سے مسلح ہو کر میدان میں کود پڑیں' ایک دوسرے کے سر پھوڑیں اور خوب قتل وغارت کر کے آتشِ غضب کو ٹھنڈا کر لیں۔ اگرچہ فتنہ وفساد کا اطلاق اس مشغلہ پر بھی ہوتا ہے لیکن قرآنی اصطلاح میں ان الفاظ کا مفہوم اِس قدر تنگ نہیں ہے بلکہ اور بہت سے اخلاقی جرائم بھی ان کے تحت آتے ہیں۔ خود قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اس کی مراد فتنہ وفساد سے کیا ہے؟''

''لغت میں فِتَن کے معنیٰ ہیں سونے کو تپا کر دیکھنا کہ وہ کھوٹا ہے یا کھرا۔ اِسی لغوی معنیٰ کے اعتبار سے یہ لفظ انسان کے آگ میں ڈالے جانے پر بولا جاتا ہے جیسا کہ سورۃ الذاریت کی آیت ۱۳ میں ہے: یَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ (جس دن وہ لوگ آگ میں تپائے جائیں گے)۔ پھر مجازاً اس سے ہر وہ چیز مراد لی گئی ہے جو انسان کو امتحان اور آزمائش میں ڈالنے والی ہو چنانچہ مال ودولت اور اہل وعیال کو ''فتنہ'' کہا گیا (سورۃ التغابن: ۱۵) کیونکہ یہ چیزیں انسان کو اِس آزمائش میں ڈال دیتی ہیں کہ وہ حق کو زیادہ عزیز رکھتا ہے یا اُن کو۔ راحت اور مصیبت کو بھی ''فتنہ'' کہا گیا: وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً (سورۃ الانبیاء: ۳۵) کیونکہ اِن دونوں حالتوں میں بھی انسان کی آزمائش ہوتی ہے۔ انقلاباتِ زمانہ اور تاریخ کی نیرنگیوں کو بھی ''فتنہ'' کہا گیا: اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِیْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْمَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ (سورۃ التوبۃ: ۱۲۶) (کیا وہ دیکھتے نہیں کہ وہ ہر سال ایک بار یا دو بار کسی آفت میں پھنسے ہی رہتے ہیں پھر بھی وہ نہ توبہ کرتے ہیں اور نہ ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں)۔ کسی کی طاقت سے زیادہ اُس پر بار ڈالنے کو بھی ''فتنہ'' کہتے ہیں: وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّیْ وَلَا تَفْتِنِّیْ ((سورۃ التوبۃ: ۴۹) (ان منافقین میں کوئی ایسا بھی ہے جو کہتا ہے کہ مجھے رخصت دے دیجئے اور مجھے خرابی میں نہ ڈالئے)۔

ان تمام مثالوں سے معلوم ہوا کہ ''فتنہ'' کے اصل معنیٰ امتحان اور آزمائش کے ہیں' خواہ وہ فائدہ کے لالچ اور لذّت کی چاٹ اور محبوب چیزوں کی بخشش کے ذریعے سے ہو' یا نقصان کے خوف اور مصائب کی مار اور ایذا رسانی کے ذریعہ سے ہو۔ یہ آزمائش اگر اللہ کی طرف سے ہو تو برحق ہے کیونکہ وہ انسان کا خالق ہے اور وہ اپنے بندوں کا امتحان لینے کا حق رکھتا ہے اور اُس کے امتحان کا مقصد انسان کو بہتر اور بلند تر حالت کی طرف لے جانا ہے۔ لیکن اگر یہی آزمائش انسان کی طرف سے ہو تو یہ ظلم ہے کیونکہ انسان کو اس کا حق نہیں ہے۔ اور انسان جب کبھی دوسرے انسان کو فتنہ میں ڈالتا ہے تو اُس کی غرض یہ ہوتی ہے کہ اُس کی آزادیِ ضمیر سلب کر لے اور اُسے

اپنی بندگی پر مجبور کر دے اور اُسے اخلاقی اور روحانی پستی میں مبتلا کر دے۔ اِس مؤخر الذکر مفہوم میں فتنہ کا لفظ تقریباً انگریزی لفظ (Persecution) کا ہم معنیٰ ہے۔ مگر انگریزی لفظ میں اِتنی وسعت نہیں جتنی ''فتنہ'' میں ہے۔ قرآن حکیم میں اس کی جو تفصیلات دی گئی ہیں' وہ حسبِ ذیل ہیں:

(۱) کمزوروں پر ظلم کرنا' اُن کے جائز حقوق سلب کرنا' اُن کے گھر بار چھین لینا اور اُنہیں تکلیفیں پہنچانا (بحوالہ سورۃ النحل: آیت ۱۱۰)

(۲) جبر و استبداد کے ساتھ حق کو دبانا اور قبولِ حق سے لوگوں کو روکنا (بحوالہ سورہ یونس: ۸۳)

(۳) اللہ کی راہ سے روکنا (بحوالہ سورہ اَنفال: ۳۶)

(۴) لوگوں کو گمراہ کرنا اور حق کے خلاف دھوکا و فریب اور طمع و اِکراہ کی کوششیں کرنا (بحوالہ سورہ بنی اسرائیل: ۷۳)

(۵) غیر حق کے لئے جنگ کرنا اور ناجائز اَغراض کے لئے قتل و خون اور جتھہ بندی کرنا (الاحزاب: ۱۴)

(۶) پیروانِ حق پر باطل پرستوں کا غلبہ اور چیرہ دستی (الانفال: ۷۳)

''فساد'' کی تحقیق: کسی چیز کے حالتِ اعتدال سے نکل جانے کو لغت میں ''فساد'' کہتے ہیں۔ اس کی ضد ''صلاح'' ہے۔ لغوی معنی کے اعتبار سے تو ہر وہ فعل جو عدل و صلاح کے خلاف ہو' فساد ہے لیکن قرآن مجید میں عموماً اس کا اطلاق اجتماعی اَخلاق اور نظامِ تمدن و سیاست کے بگاڑ پر کیا گیا ہے۔ مثلاً (۱) قرآن' فرعون اور عاد و ثمود کو فساد کا الزام دیتا ہے:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ۝ وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۝ وَفِرْعَوْنَ ذِي الْاَوْتَادِ ۝ الَّذِيْنَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ۝ فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ ۝ (الفجر: ۶-۱۲)

''کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ آپ کے پروردگار نے قومِ عاد کے ساتھ اور ستونوں والے عادِ اِرم کے ساتھ کیا معاملہ کیا' جس کا مثل شہروں میں پیدا نہیں کیا گیا اور قومِ ثمود کے ساتھ (کیا کیا) جو وادی میں پتھر تراشتے تھے اور فرعون میخوں والے کے ساتھ (کیا کیا)۔ اِن لوگوں نے ملکوں میں سرکشی کی اور اُن میں بہت فساد پھیلایا۔'' (۶-۱۲ : ۸۹)

(۲) قومِ لوط کو خلافِ فطری فعل میں ملوّث ہونے کی وجہ سے ''مفسد'' کہا گیا ہے۔

(۳) مدین کے لوگوں کو بھی ''مفسد'' کہا گیا کہ وہ ناپ تول میں کمی کے مرتکب تھے۔

(۴) چوری کو بھی ''فساد'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں پر جب گندم ناپنے کے پیمانے کی چوری کا الزام لگایا گیا تو اُنہوں نے کہا: ''بخدا! تم جانتے ہو کہ ہم زمین میں فساد پھیلانے نہیں آئے اور ہم چور نہیں ہیں۔'' (سورہ یوسف: ۷۳)

(۵) بادشاہوں کی ملک گیری سے جو تباہی پھیلتی ہے اور اُس کے اثر سے مفتوح قوموں کے اخلاق میں جو

کمینہ پن پیدا ہوتا ہے اُسے بھی ''فساد'' کہا گیا ہے (بحوالہ سورۃ النّمل: ۳۴)

(۶) قرآنِ حکیم میں ''فساد'' کی ایک جامع تعریف یہ کی گئی ہے کہ اُن روابط اور تعلقات کو خراب کرنا اور اُن رشتوں پر تیشہ چلانا جو فی الحقیقت انسانی تمدن کی بنیاد ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَا اَمَرَاللّٰهُ بِهٖ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ (الرَّعْد: ۲۵)

''اور جو لوگ اللہ کے عہد کو اُس کی پختگی کے بعد توڑتے رہتے ہیں اور اُسے کاٹتے رہتے ہیں جس کے لئے اللہ نے جوڑے رکھنے کا حکم دیا ہے اور زمین میں فساد کرتے رہتے ہیں' ایسوں پر لعنت ہے اور اُن کے لئے اُس جہان میں خرابی ہے۔'' (۲۵ : ۱۳)

یعنی یہ لوگ حقوق اللہ اور حقوق العباد سب میں شریعتِ الٰہی کی خلاف ورزی کرتے رہتے ہیں۔ آیت سے ثابت ہوا کہ عقائدِ شرکیہ اور اعمالِ شرک وفسق سے ملک میں ہر طرح کی ابتری ہی ظہور پذیر ہوتی رہتی ہے۔ (تفسیر کبیر)

يَقْطَعُوْنَ مَا اَمَرَاللّٰهُ بِهٖ اَنْ يُّوْصَلَ کے معنی عام مفسّرین نے بہت محدود لئے ہیں۔ وہ اسے صرف قطعِ رِحم کے معنی میں لیتے ہیں۔ مگر درحقیقت اس سے وہ تمام جائز تعلقات مراد ہیں جو مختلف تمدنی اور عمرانی حیثیات سے بنی نوع انسان کے افراد اور جماعتوں میں قائم ہوتے ہیں۔ مثلاً عزیزوں اور رشتہ داروں کے تعلقات' میاں بیوی کے تعلقات' دوستوں اور ہمسایوں کے تعلقات' لین دین اور کاروباری معاملہ کے تعلقات' عہد و پیمان اور باہمی اعتماد کے تعلقات' مختلف ملکوں اور حکومتوں کے تعلقات۔ چونکہ یہی روابط انسانی تمدّن کی بنیاد ہیں اور اِنہی کے بہترین طریقہ سے قائم رہنے پر دنیا کے امن اور خوشحالی کا انحصار ہے اور اِنہی کو توڑنے اور خراب کر دینے سے دنیا میں لڑائی جھگڑے پھیلتے ہیں' اس لئے اللہ تعالیٰ نے اُن کے قطع کرنے کو ''فساد'' سے تعبیر کیا اور اس پر لعنت کی وعید فرمائی۔

(۷) اُس طرزِ حکومت کو بھی ''فساد'' سے تعبیر کیا گیا ہے جس میں حاکمانہ طاقت کو اچھے مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی بجائے ظلم وستم اور غارت گری کے لئے استعمال کیا جائے (بحوالہ سورۃ البقرۃ: آیت ۲۰۵)۔

اب اگر اُن برائیوں پر دوبارہ ایک غائر نظر ڈالی جائے جنہیں قرآن نے ''فتنہ وفساد'' سے تعبیر کیا ہے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ وہ سب کی سب ایک ناحق شناس' ناخداترس اور بداصل نظامِ حکومت سے پیدا ہوتی ہیں۔ اوّل تو ایسی حکومت فی نفسہٖ ایک فتنہ ہے کیونکہ وہ حکومت کے منشائے اصلی کے خلاف ہوتی ہے' پھر اُس کی برائی کسی ایک دائرہ تک محدود نہیں رہتی بلکہ تمام برائیوں کا سرچشمہ اور فتنہ وفساد کے تمام اصول وفروع کا منبع بن جاتی ہے۔ اسی سے اللہ کی راہ سے روکا جاتا ہے' اسی سے حق وانصاف کا گلا گھونٹا جاتا ہے' اسی سے بدکاروں اور ظالموں کو اپنے برے اعمال کی قوّت حاصل ہوتی ہے' اسی سے اخلاق کو تباہ کرنے والے اور عدلِ اجتماعی (Social Justice) کو غارت کرنے والے قوانین نافذ ہوتے ہیں' اسی کی بدولت دنیا میں جنگ وخونریزی کی آگ بھڑک اُٹھتی ہے' اسی سے

قوموں اور ملکوں پر بلائیں نازل ہوتی ہیں اور خلاصہ کلام یہ کہ یہی وہ چیز ہے جس کی قوت کسی نہ کسی حیثیت سے ہر بدی وبدکاری کا وسیلہ یا اُس کے قائم ہونے اور باقی رہنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ پس اسلام نے بدی کے استیصال اور بدکاری کے دفع وانسداد کے لئے یہ کارگر تدبیر بتلائی کہ منظم جِدّ وجُہد (جہاد) سے اور اگر ضرورت پڑے اور ممکن ہو تو جنگ (قتال) کے ذریعہ سے ایسی تمام حکومتوں کو مٹا دیا جائے اور اُن کی جگہ وہ عادلانہ ومنصفانہ نظام حکومت قائم کیا جائے جس کی بنیاد خدا کے خوف پر اور اُس کے مقرر کئے ہوئے مستقل ضابطوں پر رکھی جائے جو شخصی یا طبقاتی یا قومی اغراض کی بجائے خالص انسانیت کے مفاد کی خدمت کرے، جس کے قیام کا مقصد نیکی کو پروان چڑھانا اور بدی کو مٹانا ہو اور جس کے کارکن صرف وہی لوگ ہوں جو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو اپنی زندگی کا واحد نصب العین سمجھتے ہوں اور اپنی بڑائی کے لئے نہیں بلکہ انسانیت کی بہتری اور اللہ کی خوشنودی کے لئے عنانِ حکومت سنبھالیں۔''

''قرآن مجید کو اٹھا کر دیکھئے، جگہ جگہ آپ کو یہی نظر آئے گا کہ ظالموں اور جباروں کی اطاعت سے روکا گیا ہے اور انسان کو تاکید کی گئی ہے کہ وہ باطل کے اتباع اور جبر واستکبار کی اطاعت سے اپنے آپ کو ہلاکت میں مبتلا نہ کرے۔ چنانچہ فرمایا گیا:

وَلَا تُطِيعُوٓا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ ۝ الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ (الشّعراء: ١٥١، ١٥٢)

''اور حدود سے نکل جانے والوں کی اطاعت نہ کرو، جو ملک میں فساد کرتے رہتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔'' (٢٦: ١٥١، ١٥٢)

قرآنِ حکیم نے کہیں صاف طور پر بتلا دیا کہ ایک ملک ہلاک ہی اُس وقت ہوتا ہے جب اُس کی دولت اور حکومت کی باگیں بدکار لوگوں کے ہاتھوں میں چلی جاتی ہیں۔ قرآن مجید اُن لوگوں کے تجاوز عن الحدود کی بھی بات اِسی پیرایے میں کرتا ہے جو ایسے عیش وآرام میں پڑے ہوئے ہوں جو سماجی انحطاط کا باعث بنتا ہے اور جس کا نتیجہ معاشرے کی ہلاکت وبربادی کی صورت میں نکلتا ہے۔ اس حقیقت کو سورہ بنی اسرائیل (١٧) میں یوں بیان کیا:

وَإِذَا أَرَدْنَا أَنْ نُهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيرًا ۝

''اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کر لیتے ہیں تو اُس (بستی) کے رئیسوں کو (طاعت وخیر کا) حکم بھیجتے ہیں، مگر وہ اُس میں (اُلٹا) نافرمانی کرنے لگتے ہیں، تو اُن پر حجت واجب ہو جاتی ہے (یعنی فرمانِ عذاب واجب ہو جاتا ہے)، پھر ہم اُس (بستی) کو غارت کر ڈالتے ہیں۔'' (١٧: ١٦)

احکامِ الٰہی کی اطاعت کا یہ حکم رسول کے ذریعہ سے ملتا تو اُمّت کے عوام وخواص سب ہی کو ہے لیکن خواص کی حیثیت چونکہ پیشوا کی ہوتی ہے اس لئے اُن کا ذکر بالخصوص کیا گیا، عوام تو بس اُنہی کے پیرو ہوتے ہیں۔ فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ کے الفاظ اس بارے میں صریح ہیں کہ گرفت یکایک اور بلا اطلاع نہیں ہو جاتی۔ پوری طرح موقع دینے اور ہر طرح کے اِتمامِ حجت کے بعد ہی ہوتی ہے۔ رؤسائے قوم اور اُن کا بااقتدار طبقہ اطاعتِ رسول کو اپنے ذاتی وقار کا مسئلہ بنا کر اُس کی مخالفت بڑھ چڑھ کر کرنے لگتا ہے اور اُس بستی کو گناہوں اور بدکاریوں کا

اکھاڑا بنا دیتا ہے۔ اُس وقت عذابِ الٰہی کی بجلی کوندتی ہے اور اُن کے خرمنِ حیات کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیتی ہے۔ اس سے اگلی آیت ۱۷ میں فرمایا کہ اگر تم ہمارے اس قانون کا عملی ثبوت چاہتے ہو تو حضرت نوح علیہ السلام کے بعد آنے والی قوموں کے حالات پر نگاہِ عبرت ڈالو کہ کس طرح اُنہیں اُن کی بدعملیوں کی پاداش میں ہلاک کیا گیا۔

''فخر الدین رازی کہتے ہیں کہ آیتِ بالا میں ''اَمَر'' کا معنیٰ اضافہ کر دینا ہے۔ اس لحاظ سے آیت کا معنیٰ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ جب کسی بستی کو تباہ کرنا چاہتا ہے تو وہ اُس بستی کے مرفہ الحال اور باثروت لوگوں کو تعداد میں بڑھا دیتا ہے۔ ایسے لوگ حکمِ الٰہی کی اطاعت کرنے اور اپنے ابنائے جنس سے فیّاضانہ سلوک کرنے کی بجائے بالکل اس کے الٹ کرتے ہیں اور بدعنوانی کو پھیلاتے ہیں۔ رازی کہتے ہیں کہ ایسے لوگوں کا بالخصوص ذکر کیا گیا ہے کیونکہ اُنہیں اپنے خالق کی عنایات اور خصوصی توجہ کا زیادہ ممنون ہونا چاہئے تھا۔ ابنِ کثیر کہتے ہیں کہ جب اللہ کسی قوم کو تباہ کرنا چاہتا ہے تو وہ بدخصلت لوگوں کو اُن کا سردار بنا دیتا ہے۔''

''رحمتِ خداوندی غلط کار کو اپنی اصلاح کرنے کا ہر موقع دیتی ہے اور جب کجروی اس قدر عام ہو جاتی ہے کہ سزا دینا ناگزیر ہو جاتا ہے تو پھر اللہ کا جذبۂ رحمت اور جذبۂ انصاف اکٹھا کام کرتے ہیں۔ اہلِ منصب اور اہلِ ثروت یا ذہین لوگوں سے بات کے سمجھنے اور اُس پر عمل کرنے کی توقع کی جاتی ہے لیکن اس کے باوجود بھی وہ 'تجاوز عن الحد کریں' تو اُنہیں مزید کوئی مہلت نہیں دی جاتی اور قانون سے ناواقفیت کو اُن کا عذر کے طور پر قبول نہیں کیا جاتا۔ اس طرح اُن کے خلاف حکمِ الٰہی کا وقوع ثابت ہو جاتا ہے اور اُن کی سزا اپنے اختتام کو پہنچ جاتی ہے۔'' ("The Qur'anic Concept of History" ... Mazheruddin Siddiqi)

(ii) وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا (الحج : ۴۰)

''اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے سے دفع نہ کرتا تو صومعے اور گرجے اور معبد اور مسجدیں جن میں اللہ کا ذکر کثرت سے کیا جاتا ہے' مسمار کر دئے جاتے۔'' (۴۰ : ۲۲)

اس آیت مبارکہ میں صرف مسلمانوں کی مسجدوں ہی کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ تین اور چیزوں کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ یعنی صَوَامِعُ' بِيَع اور صَلَوٰت۔ صَوَامِع سے مراد عیسائیوں کے راہب خانے' مجوسیوں کے معابد اور صابیوں کے عبادت خانے ہیں۔ بِيَع کے لفظ میں عیسائیوں کے گرجے اور یہودیوں کے کنائس دونوں داخل ہیں۔ یہ جامع الفاظ استعمال کرنے کے بعد صَلَوٰت کا ایک اور وسیع لفظ استعمال کیا جس کا اطلاق عبادت کی ہر جگہ پر ہوتا ہے اور ان سب کے آخر میں مَسٰجِد کا ذکر کیا ہے۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر اللہ عادل انسانوں کے ذریعہ سے ظالم انسانوں کو دفع نہ کرتا رہتا تو اتنا فساد ہوتا کہ عبادت گاہیں تک بربادی سے نہ بچتیں جن سے ضرر کا کسی کو اندیشہ نہیں ہوسکتا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ فساد کی سب سے زیادہ مکروہ صورت یہ ہے کہ ایک قوم عداوت کی راہ سے دوسری قوم کے معبدوں تک کو برباد کر دے اور پھر نہایت بلیغ انداز میں اپنے اس منشا کا بھی اظہار کر دیا

کہ جب کوئی گروہ ایسا فساد برپا کرتا ہے تو ہم کسی دوسرے گروہ کے ذریعہ سے اُس کی شرارت کا استیصال کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ جنگ کی اسی مصلحت کو سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۵۱ میں جالوت کی سرکشی اور حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھ سے اُس کے مارے جانے کا ذکر کرتے ہوئے یوں بیان فرمایا ہے:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ ذُوْفَضْلٍ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ O

''اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ سے دفع نہ کرتا تو زمین فساد سے بھر جاتی۔ مگر دنیا والوں پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔'' (۲۵۱ : ۲)

سورۃ المائدۃ کی آیت ۶۴ میں قوموں کی باہمی عداوت کا ذکر کر کے ارشاد ہوتا ہے:

کُلَّمَا اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَھَا اللّٰہُ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ الْمُفْسِدِیْنَ O

''یہ لوگ جب کبھی جنگ و خونریزی کی آگ بھڑکاتے ہیں تو اللہ اُسے بجھا دیتا ہے۔ یہ لوگ زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر اللہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا۔'' (۶۴ : ۵)

جہاد فی سبیل اللہ: یہی فساد و بدامنی، طمع و ہوس، بغض و عداوت اور تعصب و تنگ نظری کی جنگ ہے جس کی آگ کو فرو کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کو تلوار اٹھانے کا حکم دیا ہے اور فرمایا ہے:

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُ O الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّا اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ (الحج : ۳۹، ۴۰)

''جن لوگوں سے جنگ کی جا رہی ہے، اُنہیں لڑنے کی اجازت دی جاتی ہے کیونکہ اُن پر ظلم ہوا ہے اور اللہ اُن کی مدد پر یقیناً قدرت رکھتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے بے قصور نکالے گئے ہیں، اُن کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے۔'' (۳۹، ۴۰ : ۲۲)

یہ قرآن میں پہلی آیت ہے جو جہاد کے بارے میں اتری۔ اِس میں جن لوگوں کے خلاف جنگ کا حکم دیا گیا ہے، اُن کا قصور یہ نہیں بتایا کہ اُن کے پاس ایک زرخیز ملک ہے یا وہ تجارت کی ایک بڑی منڈی کے مالک ہیں یا وہ ایک دوسرے مذہب کی پیروی کرتے ہیں بلکہ اُن کا جرم صاف طور پر یہ بتایا گیا ہے کہ وہ ظلم کرتے ہیں، لوگوں کو بے قصور اُن کے گھروں سے نکالتے ہیں اور اِس قدر متعصب ہیں کہ محض اللہ کو رب کہنے پر تکلیف پہنچاتے ہیں اور مصیبتوں کے پہاڑ توڑتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے خلاف صرف دینی مدافعت ہی میں جنگ کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ دوسرے مظلوموں کی اعانت و حمایت کا بھی حکم دیا گیا ہے اور تاکید کی گئی ہے کہ کمزور و بے بس لوگوں کو ظالموں کے پنجے سے چھڑایا جائے۔ سورۃ النساء میں ارشادِ باری تعالیٰ ہوا:

وَمَا لَکُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اَخْرِجْنَا مِنْ ھٰذِہِ الْقَرْیَۃِ الظَّالِمِ اَھْلُھَا وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْکَ وَلِیًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْکَ نَصِیْرًا O (اَلنِّسَآء : ۷۵)

''تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں اُن کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہیں لڑتے جو کہتے ہیں

کہ اے ہمارے پالنہار! ہمیں اِس بستی سے نکال جہاں کے لوگ بڑے ظالم اور جفا کار ہیں اور ہمارے لئے خاص اپنی طرف سے ایک محافظ اور مددگار مقرر فرمادے۔'' (۷۵ : ۴)

ایسی جنگ کو جو ظالموں اور مفسدوں کے مقابلہ میں اپنی مدافعت اور کمزوروں' بے بسوں اور مظلوموں کی اعانت کے لئے کی جائے' اللہ نے خاص ''راہِ خدا کی جنگ'' قرار دیا ہے جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ یہ جنگ بندوں کے لئے نہیں بلکہ خدا کے لئے ہے اور بندوں کی اَغراض کے لئے نہیں بلکہ خاص خدا کی خوشنودی کے لئے ہے۔ اس جنگ کو اُس وقت تک جاری رکھنے کا حکم دیا گیا ہے جب تک خدا کے بے گناہ بندوں پر نفسانی اغراض کے لئے دست درازی اور جبر وظلم کرنے کا سلسلہ بند نہ ہو جائے۔ چنانچہ فرمایا: قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَاتَكُوْنَ فِتْنَةٌ'' (اُن سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے) اور حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا (یہاں تک کہ جنگ اپنے ہتھیار ڈال دے) اور فساد کا نام ونشان اِس طرح مٹ جائے کہ اُس کے مقابلہ پر جنگ کی ضرورت باقی نہ رہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی بتا دیا ہے کہ اِس مَبنی برحق جنگ کو خونریزی سمجھ کر چھوڑ دینے یا اس میں جان و مال کا نقصان دیکھ کر تامل کرنے کا نتیجہ کس قدر خراب اور بھیانک ہو سکتا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے حمایتِ حق کی جنگ کی مصلحت وضرورت ظاہر کرنے کرنے اور تاکید فرمانے ہی پر قناعت نہیں کی بلکہ یہ تصریح بھی فرمادی:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا۝ (النساء: ۷۶)

''ایمان والے راہِ خدا میں جنگ کرتے ہیں اور کافر ظلم وسرکشی کی خاطر لڑتے ہیں۔ پس شیطان کے دوستوں سے جنگ کرو کہ شیطان کی جنگ کا پہلو کمزور ہے۔'' (۷۶:۴)

''یہ ایک قولِ فیصل ہے جس میں حق اور باطل کے درمیان پوری حد بندی کر دی گئی ہے۔ جو لوگ ظلم کو مٹانے کے لئے جنگ کریں وہ راہِ خدا کے مجاہد ہیں۔ ہر وہ جنگ جس کا مقصد حق وانصاف کے خلاف بندگانِ خدا کو تکلیف دینا ہو' جس کا مقصد حق داروں کو بے حق کرنا اور اُنہیں اُن کی جائز ملکیتوں سے بے دخل کرنا ہو' جس کا مقصد اللہ کا نام لینے والے لوگوں کو ناحق ستانا ہو' وہ سبیلِ طاغوت کی جنگ ہے اور اُسے خدا سے کچھ واسطہ نہیں۔ ایسی جنگ کرنا ایمان کا کام نہیں ہے۔ البتہ جو لوگ ایسے ظالموں کے مقابلہ میں مظلوموں کی حمایت ومدافعت کرتے ہیں' جو دنیا سے ظلم وطغیان کو مٹا کر عدل وانصاف قائم کرنا چاہتے ہیں' جو سرکشوں اور فسادیوں کی جڑ کاٹ کر بندگانِ خدا کو امن واطمینان سے زندگی بسر کرنے اور انسانیت کے اعلیٰ نصب العین کی طرف ترقی کرنے کا موقع دیتے ہیں' اُن کی جنگ راہِ خدا کی جنگ ہے۔ اُن کا مظلوموں کی مدد کرنا گویا خود خدا کی مدد کرنا ہے اور نصرتِ الٰہی کا وعدہ اِنہی کے لئے ہے۔''

کن صورتوں میں مدافعانہ جنگ واجب ہو جاتی ہے؟ ذیل میں اُن تمام صورتوں کو مع قرآنی آیات کے جمع کر دیا گیا ہے جن میں مدافعانہ جنگ کا حکم دیا گیا ہے:۔

(1) ظلم وتعدی کا جواب : بقول اکابر مفسرین پہلی آیت جو جہاد کے متعلق اتری، وہ سورۃ الحج کی یہ آیت ہے:

أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ O الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ (الحج : ۳۹، ۴۰)

"جن لوگوں سے جنگ کی جا رہی ہے، اُنہیں لڑنے کی اجازت دی جاتی ہے کیونکہ اُن پر ظلم ہوا ہے اور اللہ اُن کی مدد پر یقیناً قدرت رکھتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے بے قصور نکالے گئے ہیں، اُن کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے۔" (۳۹، ۴۰ : ۲۲)

دوسری آیت جسے علامہ ابنِ جریر اور بعض دوسرے مفسّرین جنگ کی پہلی آیات قرار دیتے ہیں، سورۃ البقرۃ کی یہ آیات ۱۹۰، ۱۹۱ ہیں:

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ O وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ

"اللہ کی راہ میں اُن لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور حد سے نہ بڑھو کیونکہ اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور اُنہیں مارو جہاں کہیں بھی اُنہیں پاؤ اور اُنہیں نکال دو جہاں سے اُنہوں نے تمہیں نکالا ہے کیونکہ فتنہ قتل سے زیادہ بُری چیز ہے۔" (۱۹۰، ۱۹۱ : ۲)

اِن دونوں آیات سے حسبِ ذیل احکام نکلتے ہیں:۔

(۱) جب مسلمانوں پر ظلم وستم ڈھایا جائے تو اُن کے لئے مدافعت میں جنگ کرنا واجب ہے۔

(۲) جو لوگ مسلمانوں کے گھر بار چھینیں، اُن کے حقوق سلب کریں اور اُنہیں اُن کی ملکیتوں سے بے دخل کریں تو اُن کے ساتھ مسلمانوں کو جنگ کرنی چاہیے۔

(۳) جب مسلمانوں پر اُن کے مذہب کے باعث تشدّد کیا جائے اور اُنہیں محض اس لئے ستایا جائے کہ وہ مسلمان ہیں تو مسلمانوں کے لئے اپنی مذہبی آزادی کی خاطر جنگ کرنا واجب ہو جاتا ہے۔

(۴) دشمن غلبہ کر کے جس سرزمین سے مسلمانوں کو نکال دے یا مسلمانوں کے اقتدار کو وہاں سے مٹا دے، اُسے دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور جب کبھی مسلمانوں کو طاقت حاصل ہو تو اُنہیں اُن تمام مقامات سے دشمن کو نکال دینا چاہیے جہاں سے اُس نے مسلمانوں کو نکالا ہے۔

(2) راہِ حق کی حفاظت : سورۃ الانفال میں جن کافروں کے خلاف جنگ کرنے اور اُن کی جڑ کاٹ دینے کا حکم دیا گیا ہے، اُن کا ایک قصور یہ بتایا گیا ہے :

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَسَيُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ (الانفال : ۳۶)

"کافر لوگ اپنے مال اس لئے خرچ کرتے ہیں تاکہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکیں اور وہ اس مقصد کے لئے مال صَرف کئے جائیں گے یہاں تک کہ اُنہیں پچھتانا پڑے گا پھر وہ مغلوب کئے جائیں گے۔"

سورہ محمد کی آیت اوّل و چہارم میں زیادہ وضاحت کے ساتھ فرمایا:

اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَضَلَّ اَعْمَالَھُمْ O --- فَاِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰی اِذَا اَثْخَنْتُمُوْھُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَھَا

”جن لوگوں نے دینِ حق کو ماننے سے انکار کر دیا اور اللہ کی راہ سے روکنے لگے، اُن کے اعمال اللہ نے ضائع کر دیئے --- پس جب تمہاری ان منکروں سے مڈ بھیڑ ہو تو (اُن کی) گردنیں مارو یہاں تک کہ اُن کی طاقت کو کچل ڈالو۔ اس کے بعد قید کی گرفت کو مضبوط کرو اور اُنہیں گرفتار کر لو، پھر تمہیں اختیار ہے کہ خواہ احسان کا معاملہ کرو یا فدیہ لے لو۔ یہ عمل اُس وقت تک جاری رکھو جب تک جنگ اپنے ہتھیار نہ ڈال دے۔“

اِن آیات سے معلوم ہوا کہ اللہ کی راہ سے روکنا بھی ایک ایسا جرم ہے جس کے خلاف جنگ ضروری ہے۔ ”اللہ کی راہ“ سے مراد وہی دینِ حق ہے جسے قرآن مجید نے صراط مستقیم بھی کہا ہے۔ اور یہ قرآن مجید کے اندازِ بیان کی انتہائی خوبی ہے کہ اُس نے دین کو ”راستہ“ سے تعبیر کیا۔ گویا وہ ایک طریق ہے جو سیدھا منزل تک لے جاتا ہے اور جس پر شیطان اور اولیائے شیطان رہزنی کرتے ہیں۔

(3) دغابازی اور عہد شکنی کی سزا: سورۃ الانفال (۸) میں ایک اور جرم جس کے خلاف جنگ کرنے کا حکم ہے، یہ بتایا گیا ہے:۔

اَلَّذِیْنَ عٰھَدْتَّ مِنْھُمْ ثُمَّ یَنْقُضُوْنَ عَھْدَھُمْ فِیْ کُلِّ مَرَّۃٍ وَّھُمْ لَا یَتَّقُوْنَ O فَاِمَّا تَثْقَفَنَّھُمْ فِی الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِھِمْ مَّنْ خَلْفَھُمْ لَعَلَّھُمْ یَذَّکَّرُوْنَ O وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِیَانَۃً فَانْۢبِذْ اِلَیْھِمْ عَلٰی سَوَآءٍ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْخَآئِنِیْنَ O (الانفال : ۵۶-۵۸)

”جن لوگوں سے آپ نے معاہدہ کیا تھا، وہ بار بار اپنے عہد کو توڑتے ہیں اور بدعہدی سے پرہیز نہیں کرتے۔ پس اگر آپ جنگ میں اُنہیں پا لیں تو اُنہیں سخت سزا دے کر اُن لوگوں کو خوف زدہ و پراگندہ کر دیں جو اُن کے پیچھے ہیں (یعنی اُنہیں ایسی سزا دیں جو اُن کے بعد والوں کے لئے موجب عبرت ہو) کیا عجب کہ وہ کچھ سبق حاصل کریں۔ اور اگر آپ کو کسی قوم سے دغا کا خوف ہو تو برابری کو ملحوظ رکھ کر علی الاعلان اُن کا عہد اُن کی طرف پھینک دیجئے۔ یقیناً اللہ دغابازوں کو پسند نہیں کرتا۔“ (الانفال)

سورۃ التوبۃ میں اِنہی بدعہد اور دغاباز مشرکوں کے متعلق فرمایا:

کَیْفَ یَکُوْنُ لِلْمُشْرِکِیْنَ عَھْدٌ عِنْدَ اللّٰہِ وَعِنْدَ رَسُوْلِہٖۤ اِلَّا الَّذِیْنَ عٰھَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَکُمْ فَاسْتَقِیْمُوْا لَھُمْ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ O کَیْفَ وَاِنْ یَّظْھَرُوْا عَلَیْکُمْ لَا یَرْقُبُوْا فِیْکُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّۃً یُرْضُوْنَکُمْ بِاَفْوَاھِھِمْ وَتَاْبٰی قُلُوْبُھُمْ وَاَکْثَرُھُمْ فٰسِقُوْنَ O ---- لَا یَرْقُبُوْنَ فِیْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّۃً وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُعْتَدُوْنَ O --- وَاِنْ نَّکَثُوْٓا اَیْمَانَھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَھْدِھِمْ وَطَعَنُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّۃَ الْکُفْرِ اِنَّھُمْ لَآ اَیْمَانَ لَھُمْ لَعَلَّھُمْ یَنْتَھُوْنَ O اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّکَثُوْٓا اَیْمَانَھُمْ وَھَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَھُمْ بَدَءُوْکُمْ اَوَّلَ مَرَّۃٍ اَتَخْشَوْنَھُمْ فَاللّٰہُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْہُ اِنْ کُنْتُمْ

۲۷۰۲ (الجہاد فی الاسلام)

مُّؤْمِنِیْنَ O قَاتِلُوْهُمْ یُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَیْدِیْكُمْ وَیُخْزِهِمْ وَیَنْصُرْكُمْ عَلَیْهِمْ وَیَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِیْنَ O (التوبة: ۷، ۸، ۱۰، ۱۲ تا ۱۴)

"اِن مشرکوں کے لئے اللہ اور اُس کے رسول کے نزدیک عہد کیسے ہوسکتا ہے، سوائے اُن لوگوں کے جن سے تم نے مسجدِ حرام کے پاس معاہدہ کیا تھا، سو وہ جب تک عہد پر قائم رہیں تم بھی قائم رہو کیونکہ اللہ پرہیزگاروں کو پسند کرتا ہے۔ مگر اُن بدعہدوں سے کیوں کر معاہدہ ہوسکتا ہے جن کی حالت یہ ہے کہ جب تم پر وہ غلبہ و فتح حاصل کرلیں تو نہ تم سے قرابت کا لحاظ رکھیں اور نہ عہد و اقرار کا۔ وہ تمہیں زبان سے خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر اُن کے دل انکار کرتے ہیں (یعنی وہ دل میں تمہیں نقصان پہنچانے کی فکر میں رہتے ہیں) اور اُن میں اکثر بدکار و سرکش ہیں۔۔ وہ کسی مؤمن کے ساتھ قرابت یا عہد و اقرار کا لحاظ نہیں کرتے اور یہی لوگ زیادتی کرنے والے ہیں۔۔۔۔ اگر وہ عہد کرنے کے بعد اپنی قسموں کو توڑ دیں اور تمہارے دین پر حملے کریں تو کفر کے پیشواؤں کے ساتھ جنگ کرو کیونکہ (اس کے بعد معلوم ہوگیا کہ) اُن کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں۔ کیا عجب کہ وہ اپنی حرکات سے باز آجائیں۔ کیا تم ایسے لوگوں سے جنگ نہ کرو گے جنہوں نے اپنی قسموں کو توڑ دیا اور رسول کو نکال دینے پر تُل گئے اور اُنہوں نے ہی اوّل مرتبہ تم پر پیش دستی کی۔ کیا تم اُن سے ڈرتے ہو؟ حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حق دار ہے کہ اُس سے ڈرو اگر تم ایمان دار ہو۔ اُن سے تم ضرور جنگ کرو، اللہ اُنہیں تمہارے ہاتھوں سے عذاب دے گا اور اُنہیں رسوا کرے گا اور تمہیں اُن پر فتح بخشے گا اور مؤمنوں کے دلوں کو شفا بخشے گا۔"

اِن تمام آیات اور اُن کے شانِ نزول پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ :

(۱) جو لوگ مسلمانوں سے عہد کر کے توڑ دیں، اُن سے جنگ کرنی چاہئے۔ اس حکم میں وہ کفار بھی شامل ہیں جو مسلمانوں سے اطاعت کا معاہدہ کر کے پھر حکومتِ اسلامیہ کے خلاف بغاوت کریں۔

(۲) جس سے معاہدہ تو ہو مگر اُن کا رویّہ ایسا مخالفانہ و معاندانہ ہو کہ اسلام اور مسلمانوں کو ہر وقت اُن سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ لگا رہے تو اُنہیں علی الاعلان فسخِ معاہدہ کی کھلی اطلاع (Notice) دے دینی چاہئے اور اُس کے بعد اُن کی کھلی دشمنی کا منہ توڑ جواب دینا چاہئے۔

(۳) جو لوگ بار بار بدعہدی اور دغابازی کریں اور جن کے عہد و اقرار کا کوئی اعتبار نہ رہے اور جو مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں اخلاق و انسانیت کے کسی ضابطے کا لحاظ نہ رکھیں، اُن سے دائمی جنگ کا حکم ہے اور صرف اِسی صورت میں اُن سے صلح ہوسکتی ہے کہ وہ توبہ کریں اور اسلام لے آئیں ورنہ اُن کے اثر سے اسلام اور دارالاسلام کو محفوظ رکھنے کے لئے قتل، گرفتاری، محاصرہ اور ایسی ہی دوسری جنگی تدابیر اختیار کرتے رہنا ضروری ہے۔

(4) اندرونی دشمنوں کا استیصال : اِن بیرونی دشمنوں کے علاوہ کچھ اندرونی دشمن بھی ہیں جو ظاہر میں دوست مگر باطن میں اسلام کی جڑ کاٹنے والے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اُس جماعت میں داخل ہیں جس کے لئے قرآنِ حکیم نے "منافق" کا جامع لفظ استعمال کیا ہے اور اُن کے بارے میں یہ حکم دیا ہے :

(۱) یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ وَمَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ (التوبة: ۷۳)

''اے نبی! کافروں اور منافقین سے جہاد کیجئے اور اُن پر سختی کیجئے' اُن کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔'' (۹:۷۳)

(۲) لَئِنۡ لَّمۡ یَنۡتَہِ الۡمُنٰفِقُوۡنَ وَ الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ وَّ الۡمُرۡجِفُوۡنَ فِی الۡمَدِیۡنَۃِ لَنُغۡرِیَنَّکَ بِہِمۡ ثُمَّ لَا یُجَاوِرُوۡنَکَ فِیۡہَاۤ اِلَّا قَلِیۡلًا ۛۚۖ O مَّلۡعُوۡنِیۡنَ ۚۛ اَیۡنَمَا ثُقِفُوۡۤا اُخِذُوۡا وَ قُتِّلُوۡا تَقۡتِیۡلًا O (احزاب: ۶۰۔۶۱)

''اگر منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے' اور مدینہ میں بُری خبریں اُڑانے والے (اپنی معاندانہ حرکات سے) باز نہ آئے تو ہم آپ کو اُن پر مسلّط کر دیں گے اور پھر وہ اس شہر میں آپ کے ہمسائے نہ رہ سکیں گے مگر تھوڑے دن' جہاں وہ ملیں گے پکڑے جائیں گے اور خوب قتل کئے جائیں گے۔''

(۳) وَدُّوۡا لَوۡ تَکۡفُرُوۡنَ کَمَا کَفَرُوۡا فَتَکُوۡنُوۡنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوۡا مِنۡہُمۡ اَوۡلِیَآءَ حَتّٰی یُہَاجِرُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَخُذُوۡہُمۡ وَ اقۡتُلُوۡہُمۡ حَیۡثُ وَجَدۡتُّمُوۡہُمۡ ۪ وَ لَا تَتَّخِذُوۡا مِنۡہُمۡ وَلِیًّا وَّ لَا نَصِیۡرًا O (النسآء: ۸۹)

''یہ لوگ چاہتے ہیں کہ تم بھی اسی طرح منکرِ حق ہو جاؤ جس طرح یہ خود منکرِ حق ہیں تا کہ تم اور وہ برابر ہو جائیں۔ پس تم اُن میں سے کسی کو اپنا دوست نہ بناؤ جب تک کہ وہ اللہ کی راہ میں اپنے گھروں سے نہ نکلیں۔ اگر وہ انحراف کریں (اعانتِ کفر سے باز نہ آئیں) تو اُنہیں پکڑو اور جہاں پاؤ اُنہیں مارو اور اُن میں سے کسی کو اپنا دوست اور حمایتی نہ بناؤ۔'' (۴: ۸۹)

(5) حفاظتِ امن: دشمنوں کی ایک اور قسم وہ ہے جو دارالاسلام کے اندر رہ کر یا باہر سے آ کر اس میں فساد پھیلاتی ہے' ڈاکے ڈالتی ہے' قتل و غارت کا بازار گرم کرتی ہے اور حکومتِ اسلامی کے امن و امان میں خلل برپا کرتی ہے یا تشدّد کے ذریعہ سے نظامِ اسلامی کا تختہ اُلٹنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کے متعلق قرآن مجید یہ حکم دیتا ہے:

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیۡنَ یُحَارِبُوۡنَ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ وَ یَسۡعَوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ فَسَادًا اَنۡ یُّقَتَّلُوۡۤا اَوۡ یُصَلَّبُوۡۤا اَوۡ تُقَطَّعَ اَیۡدِیۡہِمۡ وَ اَرۡجُلُہُمۡ مِّنۡ خِلَافٍ اَوۡ یُنۡفَوۡا مِنَ الۡاَرۡضِ ؕ ذٰلِکَ لَہُمۡ خِزۡیٌ فِی الدُّنۡیَا وَ لَہُمۡ فِی الۡاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ O اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَقۡدِرُوۡا عَلَیۡہِمۡ ۚ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ O (المائدۃ: ۳۳' ۳۴)

''جو لوگ اللہ اور اُس کے رسول سے لڑتے ہیں اور ملک میں (لوٹ مار سے) فساد پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں' اُن کی سزا یہ ہے کہ وہ قتل کئے جائیں یا پھانسی دئے جائیں یا اُن کے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں۔ یہ رسوائی تو اُن کے لئے دنیا میں ہے اور (اس کے علاوہ) آخرت میں بھی بڑا عذاب ہے' سوائے اُن لوگوں کے جو اس سے پہلے کہ تم اُن پر قدرت پاؤ (یعنی گرفتار کرو) توبہ کر لیں تو جان لو کہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔'' (۵ : ۳۳' ۳۴)

(6) مظلوم مسلمانوں کی حمایت: مدافعانہ جنگ کی ایک اور صورت جس میں مسلمانوں کو تلوار اٹھانے کی

اجازت دی گئی ہے، یہ ہے کہ مسلمانوں کی کوئی جماعت اپنی کمزوری و بیچارگی کے باعث دشمنوں کے پنجہ میں گرفتار ہو جائے اور اُس میں اِتنی قوّت نہ ہو کہ اپنے آپ کو چھڑا سکے۔ ایسی حالت میں دوسرے مسلمانوں پر جو آزاد ہوں اور جنگ کی قوّت رکھتے ہوں، یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اپنے اِن مظلوم بھائیوں کو اس ظلم سے نجات دلانے کے لئے جنگ کریں۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہوا:

وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا○ (اَلنِّسَآء : ۷۵)

”تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں اُن کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہیں لڑتے جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پالنہار! ہمیں اِس بستی سے نکال جہاں کے لوگ بڑے ظالم اور جفا کار ہیں اور ہمارے لئے خاص اپنی طرف سے ایک محافظ اور مددگار مقرر فرما دے۔“ (۴ : ۷۵)

دوسری جگہ وضاحت کے ساتھ اِس اعانت کی ضرورت بیان کی ہے اور اس طرح اس کی تاکید فرمائی ہے:

وَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَالَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ وَاللهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ○ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ○ (الانفال: ۷۲، ۷۳)

”جو لوگ ایمان تو لائے ہیں مگر دارالکفر کو چھوڑ کر دارالاسلام میں نہیں آئے، تمہارا اُن سے کوئی تعلقِ میراث نہیں جب تک کہ وہ ہجرت نہ کریں۔ البتہ اگر وہ دین کے بارے میں تم سے مدد طلب کریں تو تم پر اُن کی مدد کرنا لازم ہے، سوائے اُس صورت کے جبکہ وہ کسی ایسی قوم کے خلاف مدد مانگیں جس سے تمہارا معاہدہ ہو۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُسے دیکھتا ہے۔ جو لوگ کافر ہیں وہ ایک دوسرے کے ولی اور مددگار ہیں، پس اگر تم (مسلمانوں کی مدد) نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد ہو گا۔“ (۸: ۷۲، ۷۳)

اِس آیت میں آزاد مسلمانوں اور غلام مسلمانوں کے تعلقات کو نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔ پہلے مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ سے یہ بتایا گیا ہے کہ جو مسلمان دارالکفر میں رہنا قبول کریں یا رہنے پر مجبور ہوں، اُن سے دارالاسلام کے مسلمانوں کے تمدنی اور سیاسی تعلقات نہیں رہ سکتے یعنی نہ وہ باہم شادی بیاہ کے رشتے قائم کر سکتے ہیں اور نہ اُنہیں ایک دوسرے کا ورثہ و ترکہ مل سکتا ہے۔ نہ فَے اور غنیمت سے اُنہیں کوئی حصہ پہنچ سکتا ہے اور نہ صدقات کے مصارف میں وہ داخل ہو سکتے ہیں، اور نہ اسلامی حکومت میں کوئی منصب اُنہیں دیا جا سکتا ہے جب تک کہ وہ دارالکفر سے ہجرت کر کے دارالاسلام کی رعایا نہ بن جائیں۔ لیکن میراث و ورثہ کے یہ تمام تعلقات منقطع کر دینے کے باوجود ایک تعلق یعنی نصرت و مددگاری کا تعلق پھر بھی منقطع نہیں کیا اور اِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ سے صاف طور پر یہ بتلا دیا کہ نصرت کا یہ تعلق دین کے ساتھ قائم ہے۔ جب تک کوئی شخص مسلمان ہے، خواہ وہ دنیا کے کسی کونہ میں ہو، اُس سے مسلمانوں کا تعلقِ نصرت و مددگاری کسی حال میں منقطع نہیں ہو سکتا۔ اگر اُس کے

دین کو کوئی خطرہ ہو یا اُس پر ظلم ہو اور وہ دینی رشتہ کا واسطہ دے کر مدد مانگے تو مسلمانوں پر اُس کی مدد کو پہنچنا فرض ہے' بشرطیکہ جس کے خلاف مدد مانگی گئی ہے اُس سے مسلمانوں کا معاہدہ نہ ہو کیونکہ معاہدہ ہونے کی حالت میں مسلمانوں کے لئے عہد کی پابندی اپنے مسلمان بھائی کی مدد سے زیادہ ضروری ہے اور اُن کے لئے جائز نہیں ہے کہ معاہدہ کی مدت ختم ہونے سے پہلے اُس کی مدد کریں۔ یہ حکم بیان کرنے کے بعد اِس نصرت واعانت کی ضرورت جتائی ہے اور فرمایا ہے کہ دیکھو یہ کفار اسلام کے مٹانے میں ایک دوسرے کی کیسے مدد کرتے ہیں اور اپنی آپس کی مخالفتوں اور دشمنیوں کے باوجود مسلمانوں کے مقابلہ میں کس طرح یک مشت اور یک جان ہو جاتے ہیں۔ پس اگر تم بھی دینی رشتہ کو ملحوظ رکھ کر آپس میں ایک دوسرے کے مددگار نہ بنو تو روئے زمین میں کیسا فتنہ اور فسادِ عظیم برپا ہو؟ ''فتنہ'' کا لفظ جیسا کہ پہلے بیان ہوا' قرآنی اصطلاح میں غلبہ کفر اور پیروانِ دینِ حق کے مبتلائے مصیبت و ذلت ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور اسی طرح ''فساد'' بھی ہدایت پر ضلالت (گمراہی) کے غالب ہونے اور نیکی وصلاح کار کے مٹ جانے کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی کسی جماعت کے مٹائے جانے یا اُس کے راہِ حق سے بھٹکا دئے جانے کو ''فتنہ و فساد'' سے تعبیر کرتا ہے اور اس فتنے کا مقابلہ کرنا مسلمانوں پر فرض قرار دیتا ہے۔''

دفاع کی غرض و غایت: یہ ہے کہ مسلمان اپنے دین اور اپنے قومی وجود کو کسی حال میں بدی و شرارت سے مغلوب نہ ہونے دیں اور یہ بدی جس راہ سے بھی خروج کرے' خواہ باہر سے یا اندر سے' اُس کا سر کچلنے کے لئے وہ ہر وقت مستعد رہیں۔ پھر اس کے لئے صرف اُسی وقت تلوار اٹھانے کی ہدایت نہیں دی گئی جب بدی اپنا سر نکالے اور فتنہ پردازی شروع کر دے بلکہ اس کے مقابلہ پر ہر وقت کمر بستہ و مستعد رہنے کی تاکید کی گئی ہے تاکہ اُسے سر نکالنے کی جراٴت ہی نہ ہو سکے اور اُس پر حق کی ایسی ہیبت بیٹھی رہے کہ اُس کا دف اندر ہی اندر مر جائے:

وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِن دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لَا تُظْلَمُونَ (الانفال: ۶۰)

''اُن کے مقابلہ کے لئے جس قدر تمہارے اِمکان میں ہو' سامانِ جنگ اور ہمیشہ تیار رہنے والے گھوڑے مہیا رکھو۔ اس سے تم اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو اور اُن کے سوا اُن دوسرے لوگوں کو جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ اُنہیں جانتا ہے' مرعوب وخوف زدہ کر دو گے۔ اس کام میں جو کچھ تم راہِ خدا میں خرچ کرو گے' وہ تمہیں (دنیا میں امن وامان اور ترقی اسلام کی صورت میں اور آخرت میں خوشنودیِ الٰہی کی صورت میں) پورے کا پورا واپس مل جائے گا اور تم پر ہرگز ظلم نہ کیا جائے گا۔'' (۶۰ : ۹)

یہ آیت بتاتی ہے کہ مسلمانوں کی جنگی ضروریات کے لئے اُس قسم کی عارضی فوجِ ردیف (Militia) کافی نہیں ہو سکتی جو خاص ضرورت کے موقع پر جمع کی جائے اور ضرورت رفع ہونے کے بعد منتشر کر دی جائے بلکہ اُنہیں مستقل فوجِ مرابطہ (Standing Army) رکھنی چاہئے جو ہمیشہ کیل کانٹے سے لیس رہے۔ آیت کے الفاظ پر غور کرنے سے عجیب عجیب معانی ظاہر ہوتے ہیں۔ سامانِ جنگ کی نوعیت کو صرف لفظ قُوَّۃ سے بیان کیا ہے جو پہلی صدی

ہجری کے تیروں اور دبابوں پر' چودھویں صدی کی توپوں' ہوائی جہازوں اور آبدوز کشتیوں پر اور اُس کے بعد آنے والی صدیوں کی بہترین جنگی اختراعات پر یکساں حاوی ہے۔ مَا اسۡتَطَعۡتُمۡ کے لفظ نے قُوَّة کی کمیت کو مسلمانوں کی قدرت واستطاعت پر موقوف کر دیا یعنی اگر وہ ایک فوجِ گراں مہیا کرنے کی طاقت رکھتے ہوں تو اُنہیں وہی کرنی چاہئے لیکن اگر اُن میں اتنی قوت نہ ہو اور وہ بڑی بڑی توپیں' بڑے بڑے جنگی جہاز' بڑے بڑے مہلک آلاتِ جنگ حاصل نہ کرسکیں تو اُن سے یہ فرض ساقط نہیں ہو جاتا بلکہ اُنہیں ہر اُس وسیلہِ جنگ کو اختیار کرنا چاہئے جو دشمنانِ حق سے مقابلہ کرنے میں کام آسکے اور جسے حاصل کرنا مسلمانوں کے لئے ممکن ہو۔ پھر رِبَاطِ الۡخَیۡل کے لفظ میں مستعد رکھنے کی مصلحت بتاتے ہوئے تُرۡهِبُوۡنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمۡ وَاٰخَرِيۡنَ مِنۡ دُوۡنِهِمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَهُمۡ اَللّٰهُ يَعۡلَمُهُمۡ کے الفاظ میں سیاست کا یہ نکتہ سمجھایا ہے کہ اگر کوئی قوم اپنی فوجی طاقت کو مضبوط رکھتی ہے تو اس سے صرف یہی فائدہ نہیں ہوتا کہ جو طاقتیں اُس کی علانیہ دشمن ہوں' وہ اس سے مرعوب وخوفزدہ رہتی ہیں بلکہ رفتہ رفتہ لوگوں پر اُس کی ایسی دھاک جم جاتی ہے کہ اُس سے دشمنی کرنے کا خیال بھی دلوں میں نہیں آتا اور وہ سرکش قوتیں جو اُسے کمزور اور غافل دیکھ کر حملہ کر دینے میں ذرا تامّل نہ کریں' اُس کی اِس طرح مطیع اور دوست بنی رہتی ہیں کہ اُسے اُن کی طبیعت میں چھپی ہوئی سرکشی کا علم بھی نہیں ہوتا۔ اس کے بعد علم المعیشت کی اس حقیقت کو ذہن نشین کرایا ہے کہ اس حفظِ ماتقدّم کی تیاری میں جو روپیہ صَرف ہوتا ہے' اُسے یہ نہ سمجھو کہ وہ تم سے ہمیشہ کے لئے ضائع ہو گیا اور اُس کے فوائد سے تم محروم ہو گئے۔ نہیں بلکہ وہ تمہیں واپس ملتا ہے اور اِس صورت میں واپس ملتا ہے کہ تم پر ظلم نہیں ہوسکتا اور ظلم سے محفوظ رہنے کی صورت میں تمہیں پُرامن زندگی کے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ يُوَفَّ اِلَيۡكُمۡ وَاَنۡتُمۡ لَا تُظۡلَمُوۡنَ میں دنیا وآخرت دونوں میں فوائد حاصل ہونے اور دونوں میں ظلم سے بچے رہنے کا وعدہ مضمر ہے اور درحقیقت اس جملہ سے دونوں مقصود ہیں۔'' (''الجہاد فی الاسلام''۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی' صفحات ۶۲ تا ۸۲)

کیا حیاتِ انسانی میں جنگ ناگزیر ہے؟ بقول افلاطون ''انسان ایک معاشرتی جانور ہے'' اور یہ اُس کی فطرت اور نہاد میں ہے کہ وہ تن تنہا زندگی بسر نہیں کرسکتا' لہٰذا اُس کے لئے اپنے اَبنائے جنس کے ساتھ تعلقات رکھنے ناگزیر ہیں۔ یہ تعلقات جس قدر وسیع ہوں گے' مسائل اُتنے ہی زیادہ ہوں گے۔ انسانی سماج فرشتوں کا سماج تو ہے نہیں کہ اُن سے کوئی خطا اور غلطی نہ ہو۔ شرپسند افراد اور شرپسند جماعتیں ہر وقت ہر معاشرے میں موجود ہوتی ہیں جو دوسروں کو امن وحفاظت میں رہنے دینا نہیں چاہتیں۔ وہ اخلاق وانسانیت کی تمام حدود کو پھاند جاتی ہیں اور دوسروں کے حقوق کو ناحق غصب کرنا اپنا فطری حق سمجھتی ہیں۔ ایسی خطرناک صورتِ حال میں اپنے حقوق کے تحفظ کی خاطر جنگ نہ صرف جائز ہو جاتی ہے بلکہ وہ مسلمانوں پر فرض ہو جاتی ہے اور یہ بات معقول حد تک ضروری بن جاتی ہے کہ ایسے تباہ کن عناصر کو طاقت اور قوت کے ذریعے کچل دیا جائے تاکہ بے ضرر اور شرفاء کا طبقہ امن وآشتی میں رہے۔ جیسا کہ سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۵۱ اور سورۃ الحج کی آیت ۴۰ میں الٰہی منصوبے کے تحت ''توازنِ اقتدار'' (Balance of Power) کو اجاگر کیا گیا ہے۔ آیاتِ مذکورہ کا حوالہ صفحات ۲۶۹۷' ۲۶۹۸ پر موجود ہے۔

سورۃ النساء کی ایک اور آیت جنگ کی اہمیت اور ضرورت پر نہ صرف زور دیتی ہے بلکہ مسلمانوں کو

ترغیب دیتی ہے کہ وہ اپنے مظلوم و مجبور مسلمان بھائیوں، بہنوں کی جہاد کے ذریعے مدد کریں:

وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًاO (اَلنِّسآء : ۷۵)

"تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں اُن کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہیں لڑتے جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پالنہار! ہمیں اِس بستی سے نکال جہاں کے لوگ بڑے ظالم اور جفا کار ہیں اور ہمارے لئے خاص اپنی طرف سے ایک محافظ اور مددگار مقرر فرما دے۔" (۷۵ : ۴)

آیت میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ شر پسندوں کے خلاف جنگ کریں اور اُن سے ہرگز خوف نہ کھائیں کیونکہ شر اور بدی کا مقدر بالآخر معدومیت اور ہلاکت ہے اور فتح حق و صداقت ہی کو ہونی ہے۔ اسلام میں جنگ کا تصور ذاتی دفاع و تحفظ میں منطقی اقدام کے طور پر ہے۔ جنگ کی ناگزیریت اور ضرورت کے متعلق ڈبلیو جے گوٹس (W. J. Goats) لکھتا ہے:

"جنگ تاریخِ انسانی کا جزوی عنصر ہے۔" ("Armed Forces as Power", p. 15)

اگر اسلام تلوار اور خونریزی کا اتنا ہی مشتاق اور شوقین ہوتا تو صدیوں تک اقلیتوں نے اسلامی حکومتوں کے تحت امن و امان کی زندگی کیسے بسر کی؟ علاوہ ازیں اگر اسلامی تعلیمات جنگ و جدل اور عسکری دہشت گردی پر مبنی ہوتیں تو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اپنے دشمنوں کے ساتھ چپقلش کو ختم کرنے کے لئے معاہدہ کرنے کی ترغیب نہ دیتا اگر دشمن بامقصد گفت و شنید کے لئے راغب ہو۔ سورۃ الانفال میں ارشادِ باری تعالیٰ ہوا:

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (الانفال : ٦١)

"اگر وہ (کفار معاندین) صلح کی طرف جھکیں تو (آپ کو اختیار ہے کہ) آپ بھی اس طرف جھک جائیں اور اللہ پر بھروسہ رکھیں۔" (٦١ : ٨)

Karen Armstrong لکھتی ہیں:

"مسلح جنگ کے لئے عربی الفاظ کی تعداد بہت ہے جیسے حرب، سریا، معرکہ یا قتال۔ اگر جنگ مسلمانوں کا عظیم اور واحد مقصد ہوتی تو مذکورہ الفاظ کو قرآن استعمال کرتا۔ نہیں بلکہ اس کی بجائے قرآن نے ایک انتہائی بلیغ لفظ (جہاد) کا انتخاب کیا ہے جو اپنے اندر وسیع معنی رکھتا ہے۔ جہاد اسلام کے پانچ ارکان میں سے نہیں اور نہ ہی وہ مذہب کی مرکزی آڑ ہے جیسا کہ مغرب کا عام نظریہ ہے۔ بلکہ یہ مسلمانوں کا فرض بنتا ہے کہ وہ اخلاقی، روحانی اور سیاسی ہر محاذ پر شر اور بدی کے خلاف نبرد آزما رہیں تاکہ ایک منصف اور عمدہ سماج کی تشکیل الٰہی احکامات کے مطابق ہو جہاں غریب و بے بس لوگوں کا استحصال نہ ہو۔ جنگ و جدل بعض اوقات ضروری بھی ہوتی ہے لیکن یہ کُل "جہاد" کا ایک ادنیٰ جزء ہے۔"

("Muhammad -- the Biography of the Prophet", p. 168)

۲۷۰۸ (الجھاد فی الاسلام)

سورۃالبقرۃ کی درج ذیل آیت ۱۹۰ نے تین اہم سوالوں کے جوابات سے پردہ اٹھایا ہے :

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ O

''اور تم اللہ کی راہ میں اُن لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں' اور حد سے آگے نہ بڑھو کہ اللہ کو حد سے تجاوز کرنے والے پسند نہیں ہیں۔'' (۱۹۰ : ۲)

اور وہ تین اہم سوال اور اُن کے جواب یہ ہیں :

(1) جہاد کس مقصد کی خاطر کیا جائے؟ اِس کا جواب قرآن کے الفاظ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ میں موجود ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ''جہاد'' خالصتاً لوجہ اللہ اور کلمۃ اللہ کی سربلندی کے لئے کیا جائے نہ کہ اپنے کسی ذاتی یا دنیاوی مقصد کے لئے۔ مار دھاڑ' لوٹ مار' ملک کی توسیع پسندی' نسلی عداوت' تعصب' تجارتی اور صنعتی تفوق اور غلبے کے لئے نہ کیا جائے کیونکہ ان مقاصد کو جہاد کے شریفانہ مقاصد نہیں سمجھا سکتا۔

(2) کن کے خلاف مسلمانوں کو جہاد کرنا چاہیے؟ اس کا جواب قرآنی متن یُقَاتِلُوْنَکُمْ میں موجود ہے یعنی جہاد اُن کے خلاف ہونا چاہیے جو تم سے لڑتے ہیں یا تم پر حملہ کرنے کے موقع کے انتظار میں رہتے ہیں۔

(3) کن حالات کے تحت اسلام نے مسلمانوں کو جہاد کی اجازت دی ہے؟ قرآنی الفاظ لَا تَعْتَدُوْا میں اس کا جواب موجود ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جب ایک ستم رسیدہ شخص یا ستم رسیدہ لوگوں کی جماعت انتقام لینے کے لئے مشتعل ہو اور آتشِ انتقام اپنے پورے عروج پر ہو' اُس وقت مسلمان کو اخلاقیات و انسانیت کی حدود کو نہ پھاندنے اور کسی کی طرف دستِ تظلّم دراز نہ کرنے کی تنبیہ کی گئی ہے۔ قرآن کے الفاظ میں یہ ''عُدوان'' یعنی حدود سے نکل جانا ہوگا جس کا جواز ہم سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۹۳ کے اِن الفاظ میں پاتے ہیں : فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَی الظّٰلِمِیْنَ یعنی اگر وہ باز آجائیں تو سختی کسی پر بھی نہیں سوائے (اپنے حق میں) ظلم کرنے والے کے۔

کفارِ مکہ کی جانب سے کئے گئے مظالم کو سہنے کے بعد جب مسلمان اپنے وطن مکہ مکرمہ کو خیرباد کہنے پر مجبور ہو گئے تو مدینہ پہنچنے پر وہ وہاں ایک خود مختار' آزاد ریاست قائم کرنے کے قابل ہو گئے اور ایک وقت کے ستائے ہوئے' دبائے ہوئے اِن لوگوں کو بدقوّتوں کے خلاف تلوار اٹھانے کی اجازت دی گئی :

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُ O الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّا اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ (الحج : ۳۹' ۴۰)

''جن لوگوں سے جنگ کی جارہی ہے' اُنہیں لڑنے کی اجازت دی جاتی ہے کیونکہ اُن پر ظلم ہوا ہے اور اللہ اُن کی مدد پر یقیناً قدرت رکھتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے بے قصور نکالے گئے ہیں' اُن کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے۔'' (۳۹' ۴۰ : ۲۲)

یہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ جہاد کرنے کی محض وجہ ظلم و تعدّی کا قلع قمع کرنا ہے۔ ترتیب زمانی کے لحاظ سے

قرآن مجید کی یہ پہلی آیت ہے جس میں مسلمانوں کو اپنے تحفظ کی خاطر تلوار اٹھانے کی اجازت دی گئی' جو ہجرتِ مدینہ سے کچھ دیر پہلے نازل ہوئی۔ مسلمانوں کی چودہ سوسالہ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ اسلام کی شمشیر بُرّاں اپنے نیام سے باہر نکلنے کو اُس وقت بے تاب ہوئی جب اسلام یا مسلمانوں کو ظلم وتضحیک کا نشانہ بنایا گیا۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا عسکری ضابطہ اخلاق: اسلام کے فوجی ضابطہ اخلاق کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ مُحاربین یعنی لڑنے والوں (Belligerents) کو دو طبقوں میں تقسیم کیا گیا: ایک اہلِ قتال (Combatants) دوسرے غیر اہلِ قتال (Non-combatants)۔ اہلِ قتال وہ ہیں جو عملاً جنگ میں حصّہ لیتے ہیں یا عقلاً وعُرفاً حصّہ لینے کی قدرت رکھتے ہیں یعنی جوان مرد۔ غیر اہلِ قتال وہ ہیں جو عقلاً وعُرفاً جنگ میں حصّہ نہیں لے سکتے یا عموماً نہیں لیا کرتے مثلاً عورتیں' بچے' بوڑھے' بیمار' زخمی' اندھے' اپاہج' مجنون' سیاح' خانقاہ نشین زاہد' معبدوں اور مندروں کے مجاور اور ایسے ہی دوسرے بے ضرر لوگ۔ اسلام نے طبقہ اوّل کے لوگوں کو قتل کرنے کی اجازت دی ہے اور طبقہ دوم کے لوگوں کو قتل کرنے سے منع کر دیا ہے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فوجی ضابطے کا تعلق زیادہ تر اِسی طبقہ دوم سے ہے جس کی اہم شِقیں یہ ہیں:

(۱) دشمن کو ظالمانہ طریقہ سے یا اُسے وحشیانہ طور پر اذیت دے کر مارنے سے منع کر دیا گیا۔ عبداللہ بن یزید انصاری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ:

نَهَى النَّبِيُّ ﷺ عَنِ النُّهْبِي وَالْمُثْلَةِ

''نبی ﷺ نے لوٹ کے مال اور مُثلہ (قطعِ اعضاء) سے منع فرمایا۔''

(۲) طبقہ دوم کے لوگوں یعنی غیر متحاربین جن کا ذکر اوپر ہوا (یعنی عورتیں' بچے' کمزور وضعیف' بوڑھے' غلام اور نوکر) کے قتل سے روک دیا گیا۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

لَا تَقْتُلُوا شَيْخًا فَانِيًا وَلَا طِفْلًا صَغِيرًا وَلَا امْرَأَةً

''نہ کسی بوڑھے' ضعیف کو قتل کرو' نہ چھوٹے بچے کو اور نہ عورت کو۔''

(۳) اسیرانِ جنگ کے قتل اور اُن کے اعضاء کی قطع برید کی ممانعت کر دی گئی۔ اس ضمن میں مسز اینی بسانت کہتی ہیں:

''ہمیں معلوم ہے کہ آپ نے اسیرانِ جنگ کے قتل کے عالمی طریقہ کو روک دیا اور اپنے فوجیوں کو اپنے مقبوضہ دشمن سے انتہائی مہربانی سے پیش آنے کی تعلیم دی۔'' (''کمالا لیکچرز)

(۴) ظلم وتعدّی' تجاوز عن الحد اور غیر اسلامی کاموں کی قانوناً بندش کر دی گئی۔

(۵) فصلوں کی تباہ کاری اور درختوں کو غیر ضروری طور پر کاٹنے کی ممانعت کر دی گئی۔ جنگی ضروریات کا

تقاضا ہو تو درختوں کو کاٹنے اور جلا کر میدان صاف کر دینے کی اجازت ہے جیسا کہ بنی نضیر کے محاصرے میں کیا گیا لیکن محض تخریب کی نیت سے ایسا کرنا بالاتفاق ممنوع ہے۔

محمد بن اسحاق کی تحقیق یہ ہے کہ غزوہ بنی نضیر میں جب اس طرح درختوں کو کاٹا جانے لگا (جو صحابہ کرام کا ذاتی فعل تھا اور اُنہوں نے محاصرہ کی ضروریات سے مجبور ہو کر بلا اجازتِ نبی چند درخت کاٹ لئے تھے) تو بنو قریظہ نے آپ ﷺ کو کہلا بھیجا کہ اے محمد! تم تو فساد سے منع کرتے ہو اور کہتے ہو کہ میں اصلاح کرنے آیا ہوں، پھر یہ درخت کیوں کاٹ رہے ہو؟ کیا یہ اصلاح ہے؟ اس پر آپ ﷺ اور مسلمان متفکر ہوئے لیکن اللہ نے اُنہیں تسلی دیتے ہوئے فرمایا: مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ (سورۃ الحشر: ۵) یعنی "لینہ نامی کھجور کے جو درخت تم نے کاٹے یا اُنہیں اُن کی جڑوں پر قائم رہنے دیا، سو یہ دونوں اللہ ہی کے حکم کے موافق ہیں۔" (۵ : ۵۹)

اس ضمن میں امام ابو محمد زہرہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُوْصِي بِأَنْ لَّا يَقُوْمَ الْجَيْشُ بِإِتْلَافِ زَرْعٍ أَوْ قَطْعِ شِجَرٍ أَوْ قَتْلِ الضِّعَافِ مِنَ الذُّرِّيَّةِ وَالنِّسَاءِ وَالرِّجَالِ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ رَأْيٌ فِي الْحَرْبِ وَلَمْ يَشْتَرِكُوْا فِيْهِ بِأَيِّ نَوْعٍ ("خاتم النّبيين" جلد ۲، ص ۵۸۵، دار الفكر العربي قاہرہ، ۱۹۸۱ء)

"نبی اکرم ﷺ فوج کو یہ ہدایت دے کر بھیجا کرتے تھے کہ وہ فصلوں کو نقصان نہ پہنچائیں، درختوں کو نہ کاٹیں، ضعیف و کمزور لوگوں، عورتوں اور اُن لوگوں کو قتل نہ کریں جن کا جنگ میں کوئی حصہ یا دخل نہیں۔"

(۶) غذائی ضروریات کے سوا جانوروں کا ذبح کرنا روک دیا گیا۔ اگر راستہ میں دودھ دینے والے جانور مل جائیں تو اُن کا دودھ دوہ کر پینے کی بھی اجازت نہیں دی گئی تاوقتیکہ اُن کے مالکوں سے اجازت نہ لے لی جائے۔ شدید ضرورت کی حالت میں صرف اتنی اجازت ہے کہ باآوازِ بلند تین پکار کی جائے تاکہ اگر کوئی مالک ہو تو آ جائے اور جب کوئی نہ آئے تو پی لو۔ (الجہاد فی الاسلام، صفحہ ۲۲۷)

(۷) تجاوز عن الحد خواہ وہ کسی بھی قسم کی ہو، سے روک دیا گیا۔

(۸) اسیرانِ جنگ اور جانوروں کو نذرِ آتش کرنے کی ممانعت کر دی گئی۔

(۹) اسیرانِ جنگ کو اپنی فوج کے خلاف لڑنے پر مجبور کرنے یا کسی مقصد کے حصول کے لئے اُنہیں آلہ کار بنانے سے روک دیا گیا۔ ("مسلمانوں کے تہذیبی کارنامے"۔ نور احمد، صفحات ۱۱۷، ۱۱۸)

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قائم کردہ اس حیرت انگیز ''ضابطہ اخلاق'' پر ریمنڈ لی روج Raymond Lerouge نامی ایک مستشرق بھی گواہ ہے کہ وہ لکھتا ہے :

''پیغمبر محمد (ﷺ) نے اپنے سپاہیوں کو ہدایت دیتے ہوئے فرمایا: دھوکہ بازی اور فریب دہی مت کرو۔ بچوں کو قتل مت کرو۔ جب تم کسی دشمن کی فوج سے اُن کے اپنے علاقہ میں لڑو تو اُس ملک کے امن پسند مکینوں پر تشدد مت کرو۔ صنف نازک (عورت) سے تعرض مت کرو۔ شیر خوار بچوں اور بیماروں پر ترس کھاؤ۔ گھروں کو تباہ نہ کرو اور کھیتوں کو تاخت و تاراج مت کرو۔ باغات کی تباہی مت چاہو اور کھجور کے درختوں کو مت کاٹو۔'' ("Vie de Muhamet", p. 164)

سبحان اللہ والحمد للہ! اُس کے پیارے محبوب ﷺ نے جنگ جیسی ہیبت ناک چیز کو رحم و کرم کا مظہر بنا دیا جبکہ اس کے مقابل نام نہاد ''مہذب'' قوموں نے دنیا کو جنگ کے دو مہیب اور خوفناک تحفے دیئے ہیں جن کی لائی ہوئی تباہی کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ شہروں، قصبوں، ہسپتالوں، مادر ہائے علمی اور عبادت گاہوں کے پُرامن مکینوں کی بلا وجہ تباہی کے منظر سے شرافت اور انسان دوستی کا سر شرم کے مارے جھک جاتا ہے۔ دیگر نقصانات کے علاوہ انسانی زندگیوں کے عظیم نقصان کا سرسری اندازہ انسان کو ہیبت ناک حد تک خوفزدہ ہونے کے لئے کافی ہے۔ امریکی بمبارڈمنٹ سے ہیروشیما اور ناگاساکی ناقابلِ تصور تباہی فرعون اور نمرود کی متشددانہ خباثت سے کم نہیں جو اُنہوں نے اپنی رعایا پر روا رکھی تھی۔

مغرب کی تاریخ جنگ کی شرمناک کہانی: صلیبی جنگوں کی تاریخ کا ہر ہر صفحہ بلا وجہ خونریزی کا ناقابلِ تردید باب ہے جسے صدیوں تک دنیا کے سامنے ''امن و آشتی'' کے لبادے میں پیش کیا جاتا رہا۔ یورپ بہت سے پوشیدہ قدرتی رازوں کو بے نقاب کرنے کا دعویدار ہے لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ وہ تا ہنوز ''تین میں ایک'' اور ''ایک میں تین'' کے معمّہ کو حل کرنے کے قابل نہیں ہوسکا جبکہ اسلام نے ''جنگ میں امن'' کے مسئلے کو بہ آسانی حل کرانے کے ذریعے اقوامِ عالم سے امن کے اپنے آفاقی پروگرام کو منوا لیا ہے۔ الغرض دو عالمی جنگوں میں انسانی زندگیوں کے نقصان کا خاکہ ذیل میں دیا جاتا ہے:

جنگ عظیم اوّل میں انسانی جانوں کا ضیاع

نام ملک	مقتولین کی تعداد (ہندسوں میں)	مقتولین کی تعداد (لفظوں میں)
روس	۱۷،۰۰،۰۰۰	سترہ لاکھ
جرمنی	۱۶،۰۰،۰۰۰	سولہ لاکھ
فرانس	۱۳،۷۰،۰۰۰	تیرہ لاکھ ستر ہزار
اٹلی	۴،۶۶،۰۰۰	چار لاکھ چھیاسٹھ ہزار
آسٹریا	۸،۰۰،۰۰۰	آٹھ لاکھ
برطانیہ	۷،۰۰،۰۰۰	سات لاکھ

ترکی	۲٬۵۰٬۰۰۰	دو لاکھ پچاس ہزار
بلجیئم	۱٬۲۰٬۰۰۰	ایک لاکھ بیس ہزار
بلغاریہ	۱٬۰۰٬۰۰۰	ایک لاکھ
رومانیہ	۱٬۰۰٬۰۰۰	ایک لاکھ
مانٹی گری	۱٬۰۰٬۰۰۰	ایک لاکھ
ریاستہائے متحدہ امریکہ	۵۰٬۰۰۰	پچاس ہزار
کل میزان	۷۳٬۳۸٬۰۰۰	تہتر لاکھ' اڑتیس ہزار

(''رحمۃ للعالمین''۔ محمد سلیمان منصور پوری' جلد ۲' صفحہ ۲۴۲)

جنگِ عظیم دوم کے دوران انسانی جانوں کا ضیاع

نام ملک	مقتولین کی تعداد (ہندسوں میں)	نام مقتولین کی تعداد (لفظوں میں)
روس	۲٬۱۰٬۰۰٬۰۰۰	دو کروڑ' دس لاکھ
جرمنی	۱۶٬۰۰٬۰۰۰	سولہ لاکھ
پولینڈ	۱۹٬۰۰٬۰۰۰	اُنیس لاکھ
چین	۳۰٬۰۰٬۰۰۰	تیس لاکھ
جاپان	۲۷٬۵۰٬۰۰۰	ستائیس لاکھ پچاس ہزار
آسٹریا	۷٬۰۰٬۰۰۰	سات لاکھ
رومانیہ	۷٬۰۰٬۰۰۰	سات لاکھ
فِن لینڈ	۱٬۸۳٬۰۰۰	ایک لاکھ تراسی ہزار
چیکوسلوواکیہ	۶۰٬۰۰۰	ساٹھ ہزار
سلاواکیہ	۳۰٬۵۰٬۰۰۰	تیس لاکھ پچاس ہزار
ریاستہائے متحدہ امریکہ	۱۰٬۷۰٬۰۰۰	دس لاکھ ستر ہزار
برطانیہ	۱۴٬۳۰٬۰۰۰	چودہ لاکھ تیس ہزار
فرانس	۱۰٬۰۰٬۰۰۰	دس لاکھ
اٹلی	۱۱٬۰۰٬۰۰۰	گیارہ لاکھ
یوگوسلاویہ	۱۶٬۸۵٬۰۰۰	سولہ لاکھ پچاسی ہزار
ہنگری	۶٬۰۰٬۰۰۰	چھ لاکھ
ہالینڈ	۲٬۷۵٬۰۰۰	دو لاکھ پچھتر ہزار
بلجیئم	۷۲٬۰۰۰	بہتر ہزار
فلپائن	۳۰٬۰۰۰	تیس ہزار
میزان :	۴٬۳۴٬۴۳٬۰۰۰	چار کروڑ چونتیس لاکھ تینتالیس ہزار

(''اسلام اور امنِ عالم''۔۔ بدر القادری' صفحہ ۱۵۶' فرید بک سٹال' لاہور)

حقوقِ انسانی کے نام نہاد ''متولیوں'' کی جانب سے تیسری جنگِ عظیم کی طرف پیش قدمی

درجِ ذیل تفصیل سے فوجی میدان میں عمدہ منصوبہ بندی پر مبنی تیاری اور کثیر تعداد میں سامانِ جنگ کی فراہمی کا اندازہ بہ آسانی لگایا جاسکتا ہے:۔

''انتہائی محتاط اندازے کے مطابق دنیا میں کم وبیش پچاس ہزار اٹامک ہتھیار ہیں۔ اِن میں سے ستائیس ہزار ہتھیار سابقہ سوویٹ یونین کے پاس' اُنیس ہزار یو ایس اے کے پاس' چھ سو فرانس کے پاس' چار سو برطانیہ کے پاس' اڑھائی سو چین کے پاس اور ڈیڑھ سو اسرائیل کے پاس ہیں۔'' (روزنامہ ''ڈان'' کراچی مؤرخہ ۱۳ مارچ ۱۹۹۲)

''۱۹۴۵ کی یو ایس اے اور جاپان کی جنگ میں امریکہ نے ہیروشیما (جاپان) پر دو چھوٹے ایٹم بم گرائے اور اس کے تین دن بعد دوسرا بم ناگاساکی پر گرایا گیا۔ پہلا بم (ہیروشیما پر) گرانے میں ستر ہزار انسانی جانوں کا ضیاع ہوا اور اِتنے ہی زخمی ہوئے۔ ناگاساکی میں تیس ہزار آدمی لقمۂ اجل بنے اور اتنی ہی تعداد میں وہاں زخمی ہوئے۔'' (''مغربی تمدن کی ایک جھلک''۔۔۔ سید مجتبیٰ موسوی' صفحہ ۷' ترقی اردو بیورو' دہلی (انڈیا)

''کیمونزم کے نفاذ کے ابتدائی دنوں میں روس نے اُنیس لاکھ آدمیوں کو موت کی سزا دی' ۲۹ لاکھ لوگوں کو دوسری شدید سزائیں ملیں اور پچاس ہزار لوگوں کو ملک بدر کر دیا گیا۔ کوریا کی دوسالہ جنگ میں جس کی کوئی ٹھوس وجہ بھی نہ تھی' پچاس لاکھ مردوں' عورتوں اور بچوں کو لقمۂ اجل بننا پڑا اور ایک کروڑ زخمی ہوئے چین میں کیمونزم کے نفاذ میں آسانی پیدا کرنے کے لئے ڈیڑھ کروڑ زمینداروں کو سولی پر لٹکا دیا گیا۔'' (جریدہ ''اشرف'' کراچی: سیرہ نمبر ربیع الثانی ۱۴۱۶ھ/۱۹۹۵ء' صفحہ ۱۶۴)

''برطانیہ میں کیمونزم ممالک کے جلاوطن لوگوں کی جانب سے Inter Denominational Service کے نام سے ایک تنظیم قائم کی گئی جس کا مقصد کیمونزم انتقام کے شکار ہونے والوں کے شماریاتی معلومات کو اکٹھا کرنا تھا۔ اِس تنظیم نے یورپ میں کیمونزم کا شکار ہونے والوں کے متعلق ذیل کی معلومات جاری کیں:

روسی حملے میں جو لوگ لقمۂ اجل بنے	۵'۰۰'۰۰۰ (پانچ لاکھ)
اقلیتوں اور غیر انقلابیوں کا قتلِ عام	۲۰'۰۰'۰۰۰ (بیس لاکھ)
روسی لیبر کیمپوں میں یورپی قیدیوں کی اموات	۱'۰۰'۰۰۰ (ایک لاکھ)

(''مشرقی یورپ میں مسلمانوں کا عروج وزوال''۔۔۔ فیض احمد شہابی' صفحہ ۱۳۵' ادارہ معارفِ اسلامی' لاہور ۱۹۸۷ء)

''عراق کے خلاف ۴۲ روزہ جنگ میں حقوقِ انسانی کے نام نہاد ''متولی'' اور صلیبیوں کے سرغنہ امریکہ نے

عراق پر آٹھ ہزار زہریلے کیمیائی بم گرائے جو ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرائے بموں سے ساڑھے سات گنا زیادہ تھے۔

''قدرت کی ستم ظریفی یہ ہوئی کہ اقوامِ متحدہ کی سیکورٹی کونسل کا مؤرخہ 6 اگست 1990 کا اعلان زیادہ اثر انگیز نتائج لانے کا موجب ہوا۔ عراق پر تجارتی پابندی عائد کرنے کے نتیجہ میں پانچ لاکھ عراقی باشندے اور کم و بیش پانچ سال کی عمر کے ساڑھے تین لاکھ بچے پانچ سال میں لقمہ اجل بن گئے۔ ایک ہی سال میں ایک ماہ سے کم عمر کے چھ ہزار بچے موت کی نیند سُلائے گئے۔'' (جریدہ ''الدّعوۃ'' اسلام آباد' جنوری رفروری ۱۹۹۶ء بحوالہ ''رسولِ اکرم ﷺ اور رواداری'' از ڈاکٹر حافظ محمد ثانی' ص ۲۵۵)

بوسنیا میں مسلمانوں کا سنگدلانہ قتلِ عام -- یہ بوسنیا یورپ کی مسیحی دنیا میں واحد اسلامی ریاست تھی -۔اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ۱۰۹۹ء کی پہلی انتقامی صلیبی جنگ کے تسلسل میں تھا۔ ظلم اور جابرانہ تشدّد کے تمام تاریخی ریکارڈ کو توڑتے ہوئے اور وحشت و بربریت کی حدود کو پھاندتے ہوئے سرب کمانڈر جنرل میلاڈک (General Maleduck) نے انتہائی فاتحانہ انداز میں یہ بیان دیا:

''ترکوں سے صدیوں پرانا انتقام لینے کا وقت اب ہمارے ہاتھوں میں ہے اور میں سرب قوم کو سربرینیکا تحفہ کے طور پر دیتا ہوں۔''

''پچیس ہزار مسلمان باشندوں کا یہ شہر اقوامِ متحدہ' یورپ' امریکہ اور اُن کے اتحادیوں کے زیرِ نگرانی دو دنوں میں اس طرح خالی کرالیا گیا کہ ایک جائزے کے مطابق چھ ہزار آدمیوں سے زائد جن میں اکثر کی عمر بیس سے چالیس سال کے درمیان تھی' موت کے گھاٹ اتار دئے گئے۔'' (ہفت روزہ ''تکبیر'' مؤرخہ ۲۶ دسمبر ۱۹۹۶ء)

بوسنیا میں جنگ بندی کے ایک سال بعد ایک یورپی صحافی ٹیوڈر وِلا نامی نے ایک اعصاب شکن رپورٹ پیش کی جس کی روشنی میں سرب مظالم اور وحشت و بربریت کو غیر مبہم طریق سے اجاگر کیا گیا ہے۔ اُس کی رپورٹ یہ ہے کہ مسلمانوں کو اُن کے گھروں سے اُن علاقوں سے نکالا گیا جو سرب حکومت کے قبضہ میں تھے۔ سڑکوں اور شاہراہوں کے راہ گزروں کو جمع کر کے لبِ دریا لے جایا گیا جہاں اُنہیں جانوروں کی طرح بے دردی سے ذبح کر دیا گیا۔ اُن کی کثیر التعداد تڑپتی ہوئی لاشوں پر مٹی ڈال دی گئی۔ اور کیمپوں میں رہنے والے مہاجرین پر اقوامِ متحدہ کی سخت نگرانی کے تحت ڈھائی گئی ظلم و بربریت کا کیا کہنا۔ پتھر کی صلابت جیسے دل رکھنے والے سربوں نے مسلمانوں کے سروں کو ہتھوڑوں سے چورا چورا کیا' اُن کی کھوپڑیاں توڑ ڈالیں۔ بندوقوں کے دستوں سے معصوم بچوں کی کھوپڑیوں کو چکنا چور کیا۔ ٹیوڈر وِلا کا بیان ہے کہ کچھ شہروں میں مسلمانوں کو بڑے تنوروں میں زندہ جلا دیا گیا۔ اس طرح اس وحشت ناک قتلِ عام کے انتہائی ناپاک اور تاریک ترین جرم میں دس لاکھ مسلمانوں میں سے اڑھائی لاکھ مسلمان سرب صلیبیوں کے ہاتھوں بے رحمی سے قتل کر دئے گئے۔ (ہفت روزہ ''الدعوۃ'' کراچی' اگست ۱۹۹۶)

<u>نبی اکرم ﷺ کے غزوات کے دوران انسانی جانوں کے ضیاع کی تفصیل</u>: غزوات کا یہ عرصہ نبی علیہ

۲۷۱۵ (الجہاد فی الاسلام)

اسلام کے دس سالہ مدنی دور کو شامل ہے اور اس عرصہ میں اللہ کی راہ میں لڑی گئی اِن جنگوں میں طرفین کی جانب سے انسانی جانوں کے نقصان کو معلوم کر کے آدمی حیران رہ جاتا ہے۔ الابواء' سیف البحر' بواط' العشیرہ اور بدرِ اُولیٰ کے ابتدائی غزوات اور سرایا میں طرفین میں سے کسی فریق کو کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔ ذیل میں کفار کے مقتولین اور مسلمان شہداء کی تفصیل دی جاتی ہے :

نام غزوہ/سریہ	کفار کے مقتولین کی تعداد	مسلمان شہداء کی تعداد
۱۔ سریہ عبداللہ بن جحش	۱	---
۲۔ غزوہ بدرالکبریٰ	۷۰	۱۴
غزوہ بدر کے بعد دو مشرکوں کو اُن کے سنگین جرم کے باعث قتل کیا گیا	۲	--
۳۔ غزوہ سویق	۱	--
۴۔ غزوہ بنی سلیم	--	۳
۵۔ یہودی قبیلہ بنی قینقاع کی جلاوطنی کے عمل میں مقتولین کی تعداد	۲	--
۶۔ تین یہودیوں کو اُن کی شرارت کے جرم میں تہ تیغ کیا گیا۔	۳	--
۷۔ غزوہ اُحد	۲۲	۷۰
۸۔ غزوہ حمراء الاسد	۱	--
۹۔ یومِ رجیع	--	۶
۱۰۔ غزوہ بنی نضیر	۱	--
۱۱۔ غزوہ ذات الرقاع	--	۱
۱۲۔ غزوہ خندق	۳	۲
۱۳۔ غزوہ بنی قُریظہ	۷۰۰ (یہودی)	--
۱۴۔ غزوہ ذی قرد	۵	--
۱۵۔ غزوہ بنی مصطلق	۲	--
۱۶۔ سریہ بنی قضاعہ	۱۴	--
۱۷۔ سریہ موتہ	۱۲	۳
۱۸۔ غزوہ فتحِ مکہ	۱۲	--
۱۹۔ غزوہ حُنین وہوازن	۷۵	۴
۲۰۔ غزوہ طائف	--	۱۲
۲۱۔ غزوہ تبوک	--	۱
میزان :	۹۲۶	۱۱۶

(''بدرالکبریٰ''۔۔ ابوخلیل شوقی' جلد اوّل' صفحات ۱۷۔۱۹ طبع مصر ۱۴۱۱ھ)

اِس طرح فریقین کی کل اَموات کی تعداد ۹۲۶+۱۱۶=۱۰۴۲ بنتی ہے اور اس تعداد کا موازنہ اوپر دی گئی نام نہاد ''مہذب'' اور ''حقوقِ انسانی کے متولیان'' کی طرف سے اموات کی تعداد سے کیجئے تو معلوم ہوگا کہ انسانی جانوں کے اس قدر قلیل ضیاع کی قیمت پر نوعِ انسان کو انسانیت دوستی اور انسانیت کے ضابطہ اخلاق کے نام پر جو جائز فوائد حاصل ہوئے' اُن کی تعداد بے حد و بے شمار ہے جس کی مثال پوری تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔

جہاد فی سبیل اللہ کی فضیلت: یہی وہ جہاد فی سبیل اللہ ہے جس کی فضیلت سے قرآن وحدیث کے صفحات بھرے پڑے ہیں اور جس کے متعلق سورۃ الصّفّ کی آیت ۱۰'۱۱ میں فرمایا گیا:

يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ O تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ O

''مومنو! کیا میں تمہیں ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں دردناک عذاب سے بچالے؟ وہ تجارت یہ ہے کہ تم اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اُس کی راہ میں اپنی جان اور مال سے جہاد کرو' یہ تمہارے لئے بہترین کام ہے اگر تم جانو۔'' (۱۰'۱۱ : ۶۱)

جس میں لڑنے والوں کی تعریف اس طرح کی ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ O (الصّفّ: ۴)

''اللہ اُن لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اُس کی راہ میں اس طرح صف باندھے ہوئے جم کر لڑتے ہیں گویا وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔'' (۴ : ۶۱)

جس کی بلندی وعظمت کی گواہی سورۃ التوبۃ کی آیات ۱۹'۲۰ میں اِس شان سے دی ہے:

اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجَاهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ O اَلَّذِيْنَ آمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَ جَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ O

''کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجدِ حرام کے آباد کرنے کو اُن لوگوں کے کام کے برابر ٹھہرایا ہے جو اللہ اور یومِ آخر پر ایمان لائے اور راہِ خدا میں لڑے؟ اللہ کے نزدیک یہ دونوں برابر نہیں ہیں۔ اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ جو لوگ ایمان لائے' جنہوں نے (حق کی خاطر) گھر چھوڑا اور اللہ کی راہ میں جان و مال سے لڑے' اُن کا درجہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا ہے اور یہ لوگ (حقیقت میں) کامیاب ہیں۔''

پھر یہی وہ حق پرستی کی جنگ ہے جس میں ایک رات کا جاگنا ہزار راتیں جاگ کر عبادت کرنے سے بڑھ کر ہے' جس کے میدان میں جم کر کھڑے ہونا گھر بیٹھ کر ساٹھ برس تک نمازیں پڑھتے رہنے سے افضل بتایا گیا ہے' جس میں جاگنے والی آنکھ پر دوزخ کی آگ حرام کردی گئی ہے' جس کی راہ میں غبار آلود ہونے والے قدموں سے وعدہ کیا

گیا ہے کہ وہ کبھی آتشِ دوزخ کی طرف نہ لے جائے جائیں گے اور اس کے ساتھ ان لوگوں کو جو اس سے بچ کر گھر بیٹھ جائیں اور اس کی پکار سن کر کسمسانے لگیں، اس غضب ناک لہجے میں تنبیہ کی گئی ہے:

قُلْ اِنْ كَانَ آبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَا اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ O (اَلتَّوبة : ۲۴)

''(اُن سے) فرما دیجئے اگر تمہیں اپنے باپ، بیٹے، بھائی، بیویاں، رشتہ دار اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس کے مندے پڑ جانے کا تمہیں ڈر لگا رہتا ہے اور وہ گھر بار جنہیں تم پسند کرتے ہو، اللہ اور اُس کے رسول اور اُس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ عزیز ہیں تو بیٹھے انتظار کرتے رہو یہاں تک کہ اللہ اپنا کام پورا کر دے۔ یقین رکھو کہ اللہ فاسقوں کو کبھی ہدایت نہیں دیتا۔'' (۹ : ۲۴)

فضیلتِ جہاد از روئے احادیث:

(۱) عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اَيُّ الْعَمَلِ اَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى؟ قَالَ: اَلصَّلَاةُ عَلٰى وَقْتِهَا قُلْتُ: ثُمَّ اَيٌّ؟ قَالَ: بِرُّ الْوَالِدَيْنِ قُلْتُ: ثُمَّ اَيٌّ؟ قَالَ: اَلْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

''حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے سوال کیا: اے اللہ کے رسول! کون سا عمل اللہ کو سب سے زیادہ پسند ہے۔ آپ نے فرمایا: اپنے وقت پر نماز پڑھنا۔ میں نے کہا: پھر کونسا؟ آپ نے فرمایا: ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا: میں نے کہا: پھر کونسا؟ آپ نے فرمایا: اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔'' (صحیح بخاری: کتاب المواقیت، باب: فضل الصلاۃ علی وقتھا؛ صحیح مسلم: کتاب الایمان، باب: کون الایمان باللہ تعالیٰ افضل الاعمال)

(۲) عَنْ اَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: لَغَدْوَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ رَوْحَةٌ خَيْرٌ مِّنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

''حضرت اَنس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ کی راہ میں ایک صبح یا ایک شام گزارنا، دنیا اور جو کچھ اس میں ہے، سے بہتر ہے۔'' (صحیح بخاری: کتاب الجہاد، باب: الغدوۃ والروحۃ فی سبیل اللہ؛ صحیح مسلم: کتاب الامارۃ، باب: فضل الغدوۃ والروحۃ فی سبیل اللہ)

(۳) عَنْ سَلْمَانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ يَقُوْلُ: رِبَاطُ يَوْمٍ وَّ لَيْلَةٍ خَيْرٌ مِّنْ صِيَامِ شَهْرٍ وَّقِيَامِهٖ وَاِنْ مَاتَ فِيْهِ جَرٰى عَلَيْهِ عَمَلُهُ الَّذِيْ كَانَ يَعْمَلُ وَاُجْرِيَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ وَاَمِنَ الْفَتَّانَ (صحیح مسلم)

''حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: سرحد پر ایک رات اور دن کو پہرہ دینا ایک مہینے کے روزے رکھنے اور اُس کی شب بیداری سے بہتر ہے

اور اگر اُس سال وہ فوت ہو گیا تو اُس کا وہ (نیک) عمل جاری رہے گا جو وہ کرتا تھا (یعنی اُس کا ثواب برابر اُسے ملتا رہے گا) اور اُس پر اُس کی (جنت کی) روزی جاری رہے گی اور وہ آزمائش میں ڈالنے والے سے محفوظ رہے گا۔'' (صحیح مسلم: کتاب الرباط' باب: فضل الرباط فی سبیل اللہ)

'' اَلْفَتَّان (آزمائش میں ڈالنے والا) سے مراد وہ دو فرشتے ہیں جو قبر میں مُردے سے سوال کرتے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑی آزمائش ہے جس سے ہر مرنے والے کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ تاہم مؤمن اس مرحلے سے بہ آسانی گزر جاتا ہے کیونکہ اللہ کی توفیق سے وہ صحیح جواب دے دیتا ہے۔'' ('' ریاض الصالحین'' (اردو ترجمہ) از ابو زکریا یحییٰ بن شرف النووی' جلد دوم' صفحہ ۴۲۵)

(۴) عَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَامِنْ مَّكْلُوْمٍ يُكَلَّمُ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِلَّا جَاءَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَكَلْمُهٗ يَدْمٰى: اَللَّوْنُ لَوْنُ دَمٍ وَالرِّيْحُ رِيْحُ مِسْكٍ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)
''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: وہ زخم خوردہ جو اللہ کی راہ میں زخمی ہوتا ہے' قیامت کے دن اِس حال میں آئے گا کہ اُس کے زخم سے خون بہتا ہوگا' اُس کا رنگ خون کا رنگ ہوگا اور اُس کی مہک کستوری کی مہک ہوگی (صحیح بخاری: کتاب الذبائح' باب المسک' صحیح مسلم: کتاب الامارۃ باب: فضل الجہاد والخروج فی سبیل اللہ)

(۵) عَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: اِنَّ فِی الْجَنَّةِ مِائَةَ دَرَجَةٍ اَعَدَّهَا اللّٰهُ لِلْمُجَاهِدِيْنَ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَا بَيْنَ الدَّرَجَتَيْنِ كَمَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ (صحیح بخاری: کتاب الجہاد' باب: درجات المجاہدین فی سبیل اللہ)
''ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جنت میں سَو درجے ہیں جو اللہ نے راہِ الٰہی میں جہاد کرنے والوں کے لئے تیار کئے ہیں۔ دو درجوں کے درمیان اِتنا فاصلہ ہے جتنا آسمان اور زمین کے درمیان ہے۔''

(۶) عَنْ أَبِیْ عَبْسٍ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ جَبْرٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَا اغْبَرَّتْ قَدَمَا عَبْدٍ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَمَسَّهُ النَّارُ (صحیح بخاری: کتاب الجہاد' باب: من اغبرت قدماہ فی سبیل اللہ)
''حضرت ابو عبس عبد الرحمن بن جبر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ نہیں ہوسکتا کہ کسی بندے کے قدم اللہ کی راہ (جہاد) میں غبار آلودہ ہوں اور پھر اُنہیں جہنم کی آگ بھی چھوئے۔'' (صحیح بخاری)

(۷) عَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَا يَلِجُ النَّارَ رَجُلٌ بَكٰى مِنْ

خَشْيَةِ اللّٰهِ حَتّٰى يَعُوْدَ اللَّبَنُ فِي الضَّرْعِ وَلَا يَجْتَمِعُ عَلٰى عَبْدٍ غُبَارٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ دُخَانُ جَهَنَّمَ (سنن ترمذی: ابواب فضائل الجہاد، باب: ماجاء فی فضل الغبار فی سبیل اللہ)

''ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: وہ آدمی جہنم میں داخل نہیں ہوگا جو اللہ کے ڈر سے رو پڑا یہاں تک کہ دودھ تھنوں میں واپس چلا جائے اور کسی آدمی پر اللہ کی راہ کا گرد وغبار اور جہنم کا دُھواں اکٹھا نہیں ہوگا۔''

اس میں تعلیق بالمحال کا بیان ہے یعنی جس طرح یہ ممکن نہیں ہے کہ تھنوں سے نکلا ہوا دودھ تھنوں میں واپس چلا جائے، اُسی طرح یہ ناممکن ہے کہ اللہ کے ڈر سے رونے والا شخص جنت میں نہ جائے اور اسی طرح میدانِ جہاد میں گرد وغبار سے آلود ہونے والا مجاہد جہنم کے دھویں سے محفوظ رہے گا۔ میدانِ جہاد کا غبار اور جہنم کا دھواں اکٹھے نہیں ہو سکتے۔

(۸) عَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ جَهَّزَ غَازِيًا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَقَدْ غَزَا وَمَنْ خَلَفَ غَازِيًا فِيْ أَهْلِهِ بِخَيْرٍ فَقَدْ غَزَا (صحیح بخاری: کتاب الجہاد، باب: فضل من جہز غازیا اوخلفہ بخیر؛ صحیح مسلم: کتاب الامارۃ، باب: فضل اعانۃ الغازی)

''حضرت زید بن خالد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے اُنہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے کسی غازی کو اللہ کی راہ میں تیار کیا (اُسے جہاد کا ساز وسامان دیا) تو یقیناً اُس نے خود جہاد کیا اور جس نے کسی مجاہد کی اُس کے گھر میں بھلائی کے ساتھ جانشینی کی، اُس نے بھی یقیناً جہاد کیا۔''

(۹) عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: مَا أَحَدٌ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ يُحِبُّ أَنْ يَّرْجِعَ إِلَى الدُّنْيَا وَلَهُ مَا عَلَى الْأَرْضِ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا الشَّهِيْدُ يَتَمَنّٰى أَنْ يَّرْجِعَ إِلَى الدُّنْيَا فَيُقْتَلَ عَشْرَ مَرَّاتٍ لِمَا يَرٰى مِنَ الْكَرَامَةِ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمَا يَرٰى مِنْ فَضْلِ الشَّهَادَةِ (صحیح بخاری: کتاب الجہاد، باب: تمنی المجاهد أن یرجع الی الدنیا؛ صحیح مسلم: کتاب الامارۃ، باب: فضل الجہاد فی سبیل اللہ)

''حضرت اَنس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: جنت میں جانے والا کوئی شخص ایسا نہیں جو دنیا میں لوٹنے کو پسند کرے گا اور (یہ کہ) اس کے لئے زمین میں کوئی چیز ہو سوائے شہید کے۔ وہ آرزو کرے گا کہ وہ دوبارہ دنیا میں آئے اور دس مرتبہ شہید کیا جائے، کیونکہ وہ (شہادت سے ملنے والی بزرگی کو دیکھے گا۔''
ایک اور روایت میں ہے کیونکہ شہادت کی فضیلت کو وہ دیکھے گا۔''

(۱۰) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: يَغْفِرُ اللّٰهُ لِلشَّهِيْدِ كُلَّ ذَنْبٍ إِلَّا الدَّيْنَ (صحیح مسلم: کتاب الامارۃ، باب: من قتل فی سبیل اللہ کفرت خطایاہ الا الدین)

''حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ سوائے قرض کے' شہید کی ہر غلطی کو معاف کر دیتا ہے۔''

(۱۱) عَنْ سَهْلِ بْنِ حُنَيْفٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ : مَنْ سَأَلَ اللّٰهَ تَعَالَى الشَّهَادَةَ بِصِدْقٍ بَلَّغَهُ اللّٰهُ مَنَازِلَ الشُّهَدَاءِ وَإِنْ مَاتَ عَلَى فِرَاشِهِ (صحیح مسلم: کتاب الامارۃ' باب: استحباب طلب الشہادۃ)

''حضرت سہل بن حُنَیف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص سچے دل سے اللہ تعالیٰ سے شہادت کی دعا مانگتا ہے' اللہ تعالیٰ اُسے شہداء کے مرتبوں پر پہنچا دے گا اگرچہ اُسے موت اپنے بستر پر ہی آئے۔''

(۱۲) عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ : مَا يَجِدُ الشَّهِيْدُ مِنْ مَسِّ الْقَتْلِ إِلَّا كَمَا يَجِدُ مِنْ مَسِّ الْقَرْصَةِ (سنن ترمذی: ابواب فضائل الجہاد' باب: ماجاء فی فضل المرابط)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: شہید قتل سے اتنی ہی تکلیف محسوس کرتا ہے جتنی تم میں سے کوئی شخص چیونٹی کے کاٹنے کی تکلیف محسوس کرتا ہے۔''

(۱۳) عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ : مَنِ احْتَبَسَ فَرَسًا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ إِيْمَانًا بِاللّٰهِ وَتَصْدِيْقًا بِوَعْدِهٖ فَإِنَّ شَبَعَهٗ وَرِيَّهٗ وَرَوْثَهٗ وَبَوْلَهٗ فِيْ مِيْزَانِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (صحیح بخاری: کتاب الجہاد' باب من احتبس فرسا)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے اللہ پر ایمان رکھتے ہوئے اور اُس کے وعدے کی تصدیق کرتے ہوئے اللہ کی راہ میں گھوڑا پالا تو یقیناً اُس کی گھاس' اُس کی سیرابی' اُس کی لید اور اُس کا پیشاب قیامت کے دن اُس کے پلڑے میں ہوگا (اُس کے اعمال میں شامل ہو کر تُلیں گے۔)''

(۱۴) عَنْ أَبِيْ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ : جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ بِنَاقَةٍ مَخْطُوْمَةٍ فَقَالَ : هٰذِهٖ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ : لَكَ بِهَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ سَبْعُ مِائَةِ نَاقَةٍ كُلُّهَا مَخْطُوْمَةٌ'' (صحیح مسلم: کتاب الامارۃ' باب فضل الصدقۃ فی سبیل اللہ)

''حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی مہار ڈالی ہوئی ایک اونٹنی رسولِ خدا ﷺ کے پاس لے کر آیا اور عرض کیا: یہ اللہ کی راہ میں (جہاد کے لئے) ہے تو آپ نے فرمایا: تیرے لئے اِس کے بدلے قیامت کے دن سات سو اونٹنیاں ہوں گی' سب کی سب مہار والی ہوں گی۔''

(۱۵) عَنْ أَبِيْ حَمَّادٍ وَيُقَالُ : أَبُوْسُعَادٍ وَيُقَالُ :أَبُوْعَامِر وَيُقَالُ: أَبُوا الاَسْوَدِ وَيُقَالُ: أَبُوْعَبْس أَنَّه، قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: مَنْ عَلِمَ الرَّمْیَ ثُمَّ تَرَكَه، فَلَيْسَ مِنَّا أَوْفَقَدْ عَصٰی (صحیح مسلم: کتاب الامارۃ، باب : فضل الرمی والحث علیہ)

''حضرت ابوحماد اور بعض کے نزدیک ابوسعاد، یا ابوعامر، یا ابواالاسود یا ابوعبس رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے تیراندازی کا فن سیکھا، پھر اُس نے اُسے چھوڑ دیا (یعنی فراموش کردیا) وہ ہم میں سے نہیں، یا (فرمایا) اُس نے یقیناً نافرمانی کی۔''

(۱۶) وَعَنْهُ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ:سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ: إِنَّ اللهَ يُدْخِلُ بِالسَّهْمِ الْوَاحِدِ ثَلَاثَةَ نَفَرٍفِي الْجَنَّةِ: صَانِعَه، يَحْتَسِبُ فِيْ صَنْعَتِهِ الْخَيْرَ وَالرَّامِيَ بِهٖ وَمُنْبِلُه، وَارْمُوْا وَ ارْكَبُوْا وَاَنْ تَرْمُوْا أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ أَنْ تَرْكَبُوْا وَمَنْ تَرَكَ الرَّمْیَ بَعْدَ مَاعُلِّمَه، رَغْبَةً عَنْهُ فَإِنَّهَا نِعْمَة'' تَرَكَهَا أَوْقَالَ : كَفَرَهَا (سنن ابی داود: کتاب الجہاد، باب فی الرمی)

''سابق راوی ہی بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ ایک تیر کی وجہ سے تین آدمیوں کو جنت میں داخل فرمائے گا: اُس کے بنانے والے کو جو اُس کے بنانے میں بھلائی (ثواب) کی نیت رکھے، تیرانداز کو اور ترکش سے تیر نکال نکال کر دینے والے کو، تم تیراندازی اور سواری (کا فن) سیکھو اور مجھے تمہارا تیراندازی کا سیکھنا تمہارے سواری سیکھنے سے زیادہ محبوب ہے اور جس نے بے رغبتی کی وجہ سے تیراندازی کا فن سکھائے جانے کے بعد چھوڑ دیا تو اُس نے ایک (حاصل شدہ) نعمت کو چھوڑ دیا، یا فرمایا: اُس نے نعمت کی ناشکری کی۔''

(۱۷) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ عَبَسَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ : سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ: مَنْ رَمٰی بِسَهْمٍ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ فَهُوَ لَه، عِدْلُ مُحَرَّرَةٍ (سنن ابی داود، کتاب العتق باب: ایّ الرقاب افضل، سنن ترمذی، ابواب فضائل الجہاد، باب: ماجاء فی فضل الرمی فی سبیل اللہ)

''حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا جس نے اللہ کے راستے میں ایک تیر چلایا، تو اُس کے لئے ایک غلام آزاد کرنے کے برابر ثواب ہے۔''

(۱۸) عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ : لَا تَتَمَنَّوْا لِقَاءَ الْعَدُوِّ وَاسْأَلُوْااللهَ الْعَافِيَةَ فَإِذَا لَقِيْتُمُوْهُمْ فَاصْبِرُوْا (صحيح بخاري: كتاب الجهاد، باب: لا تتمنوا لقاء العدوّ؛ صحيح مسلم : كتاب الجهاد، باب: كراهية تمني لقاء العدوّ)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دشمن سے لڑنے کی آرزو نہ کیا کرو اور اللہ سے عافیت کا سوال کیا کرو لیکن جب تمہارا اُن سے مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو۔''

فضیلتِ جہاد کی وجہ :غور کیجئے کہ جہاد فی سبیل اللہ کی اِتنی فضیلت اور تعریف کس لئے ہے؟ مجاہدین

کو بار بار کیوں کہا گیا کہ وہی کامیاب ہیں اور اُنہی کا درجہ بلند ہے؟ اور اس سے بچ کر گھر بیٹھنے والوں کو ایسی تنبیہات کیوں کی گئیں؟ جواب یہ ہے کہ اِن آیات و احادیث میں کامیابی اور عظمت کے معنی کسی جگہ مال و دولت اور ملک و سلطنت کا حصول نہیں بتائے گئے اور قرآن میں کہیں بھی یہ کہہ کر جہاد فی سبیل اللہ کی رغبت نہیں دلائی گئی کہ اس کے عوض تمہیں دنیا کی دولت اور حکومت ملے گی بلکہ اس کے برعکس ہر جگہ جہاد فی سبیل اللہ کے عوض صرف اور صرف اللہ کی خوشنودی اور اُس کے ہاں بڑا درجہ ملنے اور عذابِ الیم سے محفوظ رہنے کی امید دلائی گئی ہے۔ ایک جگہ تجارت کا گر سکھایا ہے (سورۂ الصف: ۱۰) جس سے گمان ہوا کہ شاید یہاں کچھ دھن دولت کا ذکر ہو۔ لیکن یہاں بھی تجارت کی حقیقت یہی نکلتی ہے کہ اللہ کی راہ میں جان و مال کھپاؤ اور اُس کے عوض نجات حاصل کرو۔ ایک اور جگہ جہاد سے جی چرانے والوں کو اِس بات پر ڈانٹا جا رہا ہے کہ وہ بیوی بچوں کی محبت میں گرفتار پائے جاتے ہیں اور اپنے کمائے ہوئے مال اور اپنی تجارت کے مندا ہونے اور اپنے محبوب مکانوں کے چھٹنے کا خوف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں حالانکہ دنیا میں اللہ کی راہ میں جنگ کر کے جو لوگ ملک فتح کرتے ہیں' اُنہیں دھن دولت بھی خوب ملتی ہے' اُن کی تجارت بھی خوب چمکتی ہے اور اُنہیں مفتوح قوم سے چھینی ہوئی عالیشان عمارتیں بھی رہنے کو ملتی ہیں۔''

''پھر جب اس جہاد سے دنیا کی دولت اور ملک گیری مقصود نہیں ہے تو آخر اِس خونریزی سے اللہ کو کیا ملتا ہے کہ وہ اُس کے عوض اِتنے بڑے درجے دے رہا ہے؟ آخر اِس پُر خطر کام میں کیا رکھا ہے کہ اس کی بھاگ دوڑ سے گرد آلود ہونے والے قدموں تک کو اَلطاف وعنایات کا مورد بنایا جاتا ہے؟ اور آخر اس میں وہ کونسی کامیابی مُضمر ہے کہ اِس خشک و بے مزہ جنگ میں لڑنے والوں کو بار بار کامیابی و کامرانی کا مژدہ سنایا جا رہا ہے؟ اس کا جواب اِسی لَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ (سورۃ البقرۃ: ۲۵۱) اور اِلَّا تَفْعَلُوْہُ تَکُنْ فِتْنَۃٌ فِی الْاَرْضِ وَفَسَادٌ کَبِیْرٌ (سورۃ الانفال: ۷۳) میں پوشیدہ ہے اور جس کا حوالہ صفحات ۲۶۹۸ اور ۲۷۰۴ پر دیا جا چکا ہے۔ اُسے یہ گوارا نہیں ہے کہ اُس کے بندوں کو بے قصور ستایا اور تباہ و برباد کیا جائے' اُسے یہ پسند نہیں کہ طاقتور کمزوروں کو کھا جائیں' اُن کے امن وچین پر ڈاکے ڈالیں اور اُن کی اخلاقی' روحانی اور مادّی زندگی کو ہلاکت میں مبتلا کریں۔ اُسے یہ منظور نہیں کہ دنیا میں سیسہ کاری' بداعمالی' ظلم و بے انصافی اور قتل و غارت گری قائم رہے۔ وہ پسند نہیں کرتا کہ اُس کے خاص بندوں کو مخلوق کا بندہ بنا کر اُن کی انسانی شرافت پر ذلت کا داغ لگایا جائے۔ پس جو گروہ بغیر کسی معاوضہ کی خواہش' بغیر کسی دھن دولت کے لالچ' بغیر کسی ذاتی نفع کی تمنا کے' محض اللہ کی رضا کی خاطر دنیا کو اس فتنہ سے پاک کرنے کے لئے اور اس ظلم کو دُور کر کے اُس کی جگہ عدل قائم کرنے کے لئے کھڑا ہو جائے اور اِس نیک کام میں اپنی جان و مال' اپنی تجارت کے فوائد' اپنے بال بچوں اور باپ بھائیوں کی محبت اور اپنے گھر بار کے عیش و آرام' سب کو قربان کر دے' اُس سے زیادہ اللہ کی محبت اور اُس کی رضا مندی کا مستحق کون ہو سکتا ہے؟ اور لیلائے کامرانی کی آغوش اس کے سوا اور کس کے لئے کھل سکتی ہے؟''

''جہاد فی سبیل اللہ کی یہی فضیلت ہے جس کی بناء پر اُسے تمام انسانی اعمال میں ایمان باللہ کے بعد سب سے بڑا درجہ دیا گیا ہے۔ اور بہ غور دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ درحقیقت یہی چیز تمام فضائل و مکارمِ اخلاق کی روح ہے۔ انسان کی یہ اسپرٹ کہ وہ بدی کو کسی حال میں برداشت نہ کرے اور اُسے دور کرنے کے لئے ہر قسم کی

قربانی دینے کے لئے تیار رہے' انسانی شرافت کی سب سے اعلیٰ اسپرٹ ہے اور عملی زندگی کی کامیابی کا راز اِسی اسپرٹ میں مضمر ہے۔ جو شخص دوسروں کے لئے بدی کو برداشت کرتا ہے' اُس کی اخلاقی کمزوری اُسے بالآخر اِس پر بھی آمادہ کر دیتی ہے کہ وہ خود اپنے لئے بدی کو برداشت کرنے لگے اور جب اُس میں برداشت کا یہ مادّہ پیدا ہو جاتا ہے تو پھر اُس پر ذلّت کا وہ درجہ آتا ہے جسے خدا نے اپنے غضب سے تعبیر کیا ہے (بحوالہ سورہ آلِ عمران: ۱۱۲)۔ اس درجہ میں پہنچ کر آدمی کے اندر شرافت و انسانیت کا کوئی احساس باقی نہیں رہتا۔ وہ جسمانی و مادّی غلامی ہی نہیں بلکہ ذہنی و روحانی غلامی میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے اور کمینگی کے ایسے گڑھے میں گرتا ہے جہاں سے اُس کا نکلنا محال ہو جاتا ہے۔ اس کے بالمقابل جس شخص میں یہ اخلاقی قوّت موجود ہو کہ وہ بدی کو محض بدی ہونے کے باعث بُرا سمجھے اور انسانی برادری کو اُس سے نجات دلانے کے لئے اَن تھک جدّ و جُہد کرتا رہے' وہ ایک سچا اور اعلیٰ درجے کا انسان ہوتا ہے اور اُس کا وجود عالمِ انسانی کے لئے رحمت و برکت ہوتا ہے۔''

''جہاد کی اِس حقیقت کو جان لینے کے بعد یہ سمجھ لینا بہت آسان ہے کہ قوموں کی زندگی میں اِسے کیا درجہ حاصل ہے اور نظامِ تمدّن کو درست رکھنے کے لئے اِس کی کس قدر ضرورت ہے۔ اگر دنیا میں کوئی ایسی قوّت موجود ہو جو بدی کے خلاف پیہم جہاد کرتی رہے اور تمام سرکش قوّتوں کو اپنی اپنی حدود کی پابندی پر مجبور کرے تو نظامِ تمدّن میں یہ بے اعتدالی ہرگز نظر نہ آئے کہ آج سارا عالم ظالموں اور مظلوموں' آقاؤں اور غلاموں میں بٹا ہوا ہے اور تمام دنیا کی اخلاقی و روحانی زندگی کہیں غلامی و مظلومی کے باعث اور کہیں غلام سازی و جفا پیشگی کے باعث تباہ و برباد ہو رہی ہے۔ بدی کو دوسروں سے دفع کرنا تو ایک بہت بڑا درجہ ہے' اگر اُسے خود اپنے سے دفع کرنے کا احساس بھی ایک قوم میں موجود ہو اور اُس کے مقابلہ میں وہ اپنے عیش و آرام کو' اپنی دولت و ثروت کو' اپنی نفسانی لذّات اور اپنی جان کی محبت کو' غرض کسی چیز کو بھی عزیز نہ رکھے تو وہ کبھی ذلیل و خوار نہیں ہو سکتی اور اُس کی عزت کو کوئی قوت پامال نہیں کر سکتی۔ حق کے آگے سر جھکانا اور ناحق کے آگے سر جھکانے پر موت کو ترجیح دینا ایک شریف قوم کا خاصہ ہونا چاہئے اور اگر وہ اِعلائے کلمۃ الحق اور اعانتِ حق کی قوت نہ رکھتی ہو تو اُسے کم از کم تحفظِ حق پر سختی کے ساتھ ضرور قائم رہنا چاہئے جو شرافت کا کم سے کم درجہ ہے۔ لیکن اس درجے سے گر کر جو قوم اپنے حق کی حفاظت بھی نہ کر سکے اور اُس میں ایثار و قربانی کا فُقدان اِس قدر بڑھ جائے کہ بدی و شرارت جب اُس پر چڑھ کر آئے تو وہ اُسے مٹانے یا خود مٹ جانے کی بجائے اُس کے ماتحت زندہ رہنے کو قبول کر لے تو ایسی قوم کے لئے دنیا میں کوئی عزت نہیں ہے اور اُس کی زندگی یقیناً موت سے بدتر ہے۔ اِسی رمز کو سمجھانے کے لئے خدا نے بار بار اپنی حکیمانہ کتاب میں اُن قوموں کا ذکر کیا ہے جنہوں نے بدی کے خلاف جہاد کرنے میں جان و مال اور لذّاتِ نفسانی کا ٹوٹا دیکھ کر اس سے جی چُرایا اور بدی کا تسلّط قبول کر کے اپنے اوپر ہمیشہ کے لئے خسران و نامرادی کا داغ لگا لیا۔ ایسی قوموں کو خدا ''ظالم قومیں'' کہتا ہے یعنی اُنہوں نے اپنے اعمال سے خود اپنے اوپر ظلم کیا اور حقیقۃً وہ اپنے ہی ظلم سے تباہ ہوئیں۔ چنانچہ ایک جگہ اُن کی مثال اس طرح دی ہے:

اَلَمْ يَاْتِهِمْ نَبَاُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَقَوْمِ اِبْرٰهِيْمَ وَاَصْحٰبِ مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكٰتِ اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ○ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (التوبة : ۷۰' ۷۱)

'' کیا اِن لوگوں کو اُن قوموں کی خبر نہیں پہنچی جو اُن سے پہلے ہو گزری ہیں یعنی نوح کی قوم اور عاد وثمود اور قومِ ابراہیم اور اصحابِ مدین اور اُلٹی ہوئی بستیوں والے' اُن کے پاس اُن کے پیغمبر کھلی کھلی ہدایتیں لے کر آئے مگر اللہ نے اُن پر ظلم نہیں کیا بلکہ اُنہوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا۔ جو ایمان دار مرد اور ایماندار عورتیں ہیں وہ باہم ایک دوسرے کے مددگار ہیں' وہ نیکی کا حکم کرتے ہیں اور بدی کو روکتے ہیں۔'' (۹ : ۷۱٬۷۰)

یہاں پچھلی قوموں کے ظلم برنفسِ خود کا ذکر کرتے ہی جو ایمان داروں کی یہ صفت بتائی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے یار و مددگار ہیں اور نیکی کو قائم کرتے اور بدی کو روکتے ہیں' تو اِس سے صاف یہی بتلانا مقصود ہے کہ اِن مٹنے والی قوموں نے نیکی کا حکم کرنا اور بدی کو روکنا چھوڑ دیا تھا اور یہی اُن کا وہی ظلم تھا جس نے بالآخر اُنہیں تباہ کیا۔

<u>حرفِ آخر</u>: یہ بات ذہن نشین رہے کہ اسلام تلوار اور خونریزی کا شیدا اور مشتاق ہرگز نہیں ہے۔ امن و آشتی اُس کا طغرائے امتیاز ہے اور جہاد اُس کی مستثنیات میں سے ہے جسے بدی کے مٹانے اور صرف امن و سلامتی کے استحکام کے لئے ضرورتاً اپنایا گیا ہے۔

اسلام کی امن پسند فطرت کے بارے میں غیر مسلمین کی آراء

(1) ''مغرب میں اسلام کے متعلق کلیتاً غلط بیانات بعض اوقات جہالت اور بعض اوقات منظم طور پر اسلام کو رُسوا کرنے اور داغدار کرنے کا نتیجہ ہیں۔ تمام جھوٹی باتوں میں جو اسلام کے متعلق کہی جاتی ہیں' سب سے زیادہ سنجیدہ بات حقائق سے متعلق ہے جبکہ غلط فہمی کی بناء پر آراء قابلِ معذرت ہیں۔ حقائق کو اپنی حقیقت کے خلاف پیش کیا جاتا ہے۔ اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک اور مستند طور پر قابلِ احترام مصنفین کی تحریروں میں صریح جھوٹ کو پڑھ کر آدمی پریشان ہو جاتا ہے۔'' ("The Bible, the Koran and Science"... Dr. Maurice Bucaille, pp. 110, 111)

(2) ''اسلام کے خلاف ظلم و بربریت کے الزام کا جواب آسان ہے۔ ایک مملکت کے سربراہ محمد (ﷺ) نے جو اپنے لوگوں کی حیات اور اُن کی آزادی کے محافظ تھے' عدل و انصاف کے تقاضوں کی تعمیل میں مجرموں کو کڑی سزائیں دیں۔ آپ کے رویّے کو آپ کے وقت کی روشنی میں اور اُس وحشت و بربریت کے سماج کی روشنی میں دیکھنا چاہئے جس میں آپ رہ رہے تھے۔ اللہ کے دین کے مبلّغ ہونے کی حیثیت سے محمد (ﷺ) ایک شریف انسان تھے اور اپنے ذاتی دشمنوں پر بھی مہربان تھے۔ آپ کی ذات میں عدل و انصاف اور رحمدلی باہم آمیز تھے جو دو ایسی شریف ترین خصوصیات ہیں جن کا انسانی ذہن تصوّر کر سکتا ہے۔ اِس حقیقت کی تائید کئی ایسی مثالوں سے کرنا مشکل نہیں ہے جو آپ کی سوانح حیات میں پائی جاتی ہیں۔ آپ کا ایک سوانح نگار لکھتا ہے:

''حیاتِ انسانی کی جنگ کی اِس ہیبت ناک ضرورت کو آپ کے عمل نے کم ظالمانہ عمل کر دیا۔ ایک اور

مصنف لکھتا ہے کہ آپ اپنے فوجیوں کو یہ حکم دینے کے عادی تھے: بوڑھوں، خواتین اور بچوں سے گریز کرو، جو لوگ تمہاری مزاحمت نہیں کرتے اُن کے گھر منہدم کرنے سے اجتناب کرو، اُن کی روزی کے ذرائع کو تباہ نہ کرو، باثمر درختوں اور نخلستانوں کو اپنی دستبرد سے محفوظ رکھو۔'' ("An Interpretation of Islam" ... Prof. Laura Veccia Vaglieri, p. 28)

(3) ''محمد (ﷺ) کو جو طنز وطعن، اور قریش کے ظلم وتعدی کا ایک صابر شکار تھے، اور جنہیں عطیہ خداوندی کے تحت اپنے دشمنوں سے حفاظت کا مشن دے کر بھیجا گیا تھا، کو مجبوراً تلوار اٹھانا پڑی۔ اُس یادگار دن (ہجرتِ مدینہ) سے ابھی دو سال بھی گزرنے نہ پائے تھے جب خدا نے انتہائی ستم رسیدہ مسلمانوں کو طاقت کا جواب طاقت سے دینے کی اجازت دی جس سے اسلام کے عروج اور ایک حقیقی معاشرتی اور سیاسی انقلاب کی ابتدا ہوئی جب محمد (ﷺ) کے پیروکاروں نے اہلِ مکّہ کے خلاف پہلی جنگ (بدر) جیتی۔ اُس دن سے شاید چند ایک ناگزیر رکاوٹوں کے سوا اسلام نے مذہبی اور سیاسی میدانوں میں کفر کے خلاف مڈ بھیڑوں، جنگوں اور فتوحات کے غیر منقطع (مسلسل) سلسلوں کا مشاہدہ کیا۔'' (مضمون بہ عنوان ... "What Made Islam a World-force" Prof. Laura Veccia Vaglieri, in the "Light" Lahore, November 24, 1958)

(4) ''(اسلام کے خلاف) ظلم کا الزام بہ مشکل ہی غور کئے جانے کے قابل ہے۔ میں یہودیوں کی سزا کے متعلق پہلے ہی بات کر چکا ہوں جس سے الزام کی بنیاد بنتی ہے۔ جنگِ بدر کے بعد محمد (ﷺ) کا قیدیوں کے ساتھ رویّہ، مدینہ میں اپنے دشمنوں کے ساتھ حلیمانہ رواداری، اپنی قوم کے ساتھ آپ کی شرافت، بچوں اور بے زبان جانوروں سے آپ کی محبت والفت اور سب سے بڑھ کر مکّہ میں آپ کے پُر امن داخلے اور اپنی جان کے دشمنوں کو عام معافی دینے کی طرف رجوع کرنا چاہئے، وہ دشمن جنہوں نے اٹھارہ سال تک آپ کو توہین اور اذیت کا نشانہ بنائے رکھا اور بالآخر وہ کھلی جنگ کرنے پر اتر آئے۔ یہ سب حقائق اس حقیقت کے مظہر ہیں کہ ظلم وتشدّد محمد (ﷺ) کی فطرت کا حصّہ نہ تھے۔'' ("Glimpses of Muhammad".. Stanley Lane Poole, published in the Journal "Islamic Literature" of November, 1956)

(5) ''ایک اور الزام جو اکثر آپ محمد (ﷺ) پر لگایا جاتا ہے، ظلم وتشدّد کا ہے۔ وہ سختی جس کا یہاں ذکر ہونا چاہئے، دشمنوں کے خلاف نہیں بلکہ صرف غدّاروں کے خلاف تھی اور اگر ان (غدّاروں) کے معاملے میں کوئی سختی تھی بھی تو وہ خود خدا کی طرف سے مبنی بر انصاف تھی۔ محمد (ﷺ) کو انتقامی فطرت ہونے کا الزام دینا نہ صرف آپ کے روحانی مقام کے ساتھ سنجیدہ ناانصافی ہوگی بلکہ حقائق کو مسخ کرنا ہوگا، اور پھر اُسی معیار کو سامنے رکھتے ہوئے بنی اسرائیل کے بہت سے پیغمبروں کی اور خود بائبل کی بھی مذمت ہوگی۔ آپ کے ارضی مشن کے فیصلہ کن پہلو یعنی مکّہ پر قبضہ کرنے کے وقت اللہ کے رسول (ﷺ) نے فوق البشر (Superhuman) شرافت ونجابت کا مظاہرہ کیا جبکہ آپ کی فاتح فوج کی رائے متفقہ طور پر اس کے برعکس تھی۔'' ("Understanding Islam"... Frithjof Schuon, p. 89)

(6) ''مغرب کی عیسائی اقوام میں یہ عام تاثر ہے کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلا ہے۔ ملکِ شام، مصر اور فلسطین کی بہ سرعت فتوحات کا خاکہ سابقہ باب میں دیا جا چکا ہے۔ تاہم اِن فتوحات کا انتہائی دلچسپ پہلو یہ ہے کہ مفتوح قوم پر اسلام زبردستی نہیں ٹھونسا گیا۔ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، رسول اللہ (ﷺ) نے یہودیوں یا عیسائیوں کے جبری مسلمان ہونے کی وکالت نہیں کی تھی۔ یہودِ مدینہ کو قتل کئے جانے یا مدینہ سے باہر نکالے جانے کی وجہ یہی تھی کہ یکجا قبائل ہونے کے طور پر اُنہوں نے پیغمبر (علیہ السلام) کے مشن کی مخالفت کی تھی۔ بہ الفاظِ دیگر اُن کی مخالفت سیاسی تھی نہ کہ دینی۔ اُن کی آخری تباہی کے بعد کچھ یہودی انفرادی طور پر مدینہ میں اپنے کاروبار میں رہے اور اگر وہ پیغمبر (علیہ السلام) کی سرگرمیوں میں مزاحم ہونے سے رک گئے تو اُن پر مذہب کی تبدیلی کا کوئی دباؤ نہیں ڈالا گیا۔۔۔ قرآن میں کئی ایسی آیات ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ پیغمبر کا کام تنبیہ کرنا ہے نہ کہ تشدّد کرنا۔''
("The Life and Times of Muhammad"... Sir John Glubb, p. 385)

(7) ''اس تعصب کے متعلق کہ محمدی گروہ ایک ظالم گروہ ہے، لوگوں کا علاج کرنا مبنی بر مصلحت ہے۔ اس کی تشہیر اس طرح کی گئی کہ لوگ یا تو مرنا قبول کر لیں یا عیسائیت کو چھوڑ کر اسلام قبول کر لیں۔ یہ بات کسی بھی طرح درست نہیں ہے اور پاپائیت کے رویّہ کے مقابل صلیبی جنگوں کے زمانے کے مسلمانوں (Saracens) کا رویّہ انجیل کی تعلیم کے مطابق مسکینیت کا تھا۔ پاپائیت کا ظلم آدم خوروں کی بربریت سے بھی بڑھ گیا تھا۔''
("Apology for Muhammad and the Koran"... John Davenport, p. 47) 1862 Edn.

(8) ''مسلمان فوجیوں کی یہ تصویر کہ وہ ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے ہاتھ میں قرآن تھامے پیشقدمی کر رہے ہیں، بالکل غلط اور جھوٹ ہے۔''
("Islam"... A.S. Tritton, p. 21:London 1951)

(9) ''تاہم تاریخ اس بات کو واضح کرتی ہے کہ دنیا میں تیزی سے پھیلتے ہوئے مسلمانوں کا بزورِ شمشیر مفتوح اقوام کو اسلام کا (جبراً) منوانا مسلمان کا روایتی قصہ (Legend) ہے جس میں مسلمان کو تشدّد پسند کہا گیا لیکن یہ ایک انتہائی رنگ برنگی، لغو، فرضی حکایت ہے جس کا تکرار مؤرخوں نے اکثر کیا ہے۔''
("Islam at the Crossroads"... De Lacy O'Leary, p. 8, 1923 Edition)

(10) ''واقعاتی طور پر یہ مسلّمہ حقائق اس خیال کو جسے وسیع طور پر عیسائی تحریروں میں پروان چڑھایا گیا ہے، مسترد کرتے ہیں کہ جہاں کہیں بھی مسلمان گئے، اُنہوں نے لوگوں کو بزورِ شمشیر اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا۔''
("The Prospects of Islam"... Lawrence E. Browne, p. 14, London 1944)

(11) ''جہاد فی الواقع لازمی نہ تھا سوائے اُن لوگوں کے خلاف جن کا کوئی الہامی مذہب نہ تھا یا جو اسلام کے وجود کو بلائے جان سمجھتے تھے۔۔۔ جہاد تو صرف بے اعتدالیوں کے خلاف اسلام کی حفاظت کے لئے کیا گیا۔ جونہی تجاوز عن الحد اور بے اعتدالی ختم ہوئی، مسلمانوں نے مفتوح اقوام سے ہمیشہ عظیم رواداری کا مظاہرہ

کیا اور اُنہیں اپنی قانون سازی اور مذہبی عقائد میں کھلی آزادی دے دی۔'' (La Grande Encyclopaedia, p. 1006: 1894 Edition)

(12) ''میں اُس شخص کی بہترین زندگی کے متعلق کچھ جاننا چاہتا تھا جس کا آج بھی لاکھوں انسانوں کے دلوں پر قبضہ ہے۔۔۔۔ میں بالآخر اس بات کا قائل ہوگیا کہ اُن دنوں منصوبۂ حیات میں اسلام کے لئے تلوار نے جگہ نہیں بنائی بلکہ یہ بے لچک سادگی' پیغمبر (علیہ السلام) کی انتہائی کسرِ نفسی' معاہدوں کی محتاط خیال داری' آپ (علیہ السلام) کی اپنے دوستوں اور پیروکاروں کے ساتھ شدید لگن' آپ کی شجاعت' آپ کی بیبا کی اور (بندوں سے) بے خوفی' آپ کا خدا پر اور اپنے مشن پر کامل بھروسہ' اِن سب عوامل نے مل کر اسلام کے لئے (لوگوں کے دلوں میں) جگہ بنائی۔ تلوار نے نہیں بلکہ صرف اِنہی عوامل نے ہر چیز کو اُن کے لئے آسان بنادیا اور وہ ہر رکاوٹ پر غالب آگئے۔'' ("Young India"... Mahatma Gandhi, quoted in "The Light" Lahore of 16th September, 1924)

(13) ''محمڈنزم (اسلام) کی اشاعت وتشہیر کو تمام تر قوت اور زورِ بازو کی طرف منسوب کرنا ایک عام سی غلطی ہے۔ لیکن قوت و طاقت اُس وحشت و بربریت کے ہیجانی اور ہنگامہ خیز جتھے کو جو کسی متفقہ عمل کے عادی ہی نہیں تھے اور فوجی تنظیم کے ضابطوں کو تسلیم کرنے والے ہی نہ تھے' ایک صدی سے کم عرصے میں (اُس زمانے کی) تین عظیم مملکتوں پر غالب آنے کے قابل نہیں بناتی۔ ابتدا میں اسلام کی حکمتِ عملی بلائے جان نہیں بلکہ زیادہ تر مصالحانہ تھی جس نے سخت کلامی کے ذریعے حزبِ مخالف کو مشتعل کرنے کی بجائے اپنے اصولوں کو بہ دلائل جاگزیں کرنے کو ترجیح دی۔'' ("History of the Moorish Empire in Europe"... S.P. Scott, Vol. 1, pp. 120, 121, 94, 95 : 1904 Edition)

(14) ''تاہم بہ حیثیتِ مجموعی مجھے بہر حال یہ تسلیم کرنا ہے کہ محمد (ﷺ) دین میں تشدد کے حق میں نہیں اور نہ ہی کبھی اُسے قبول کیا ہے۔'' ("Islam"... Leonard, p. 72)

(15) ''جن لوگوں کے ملک پر عربوں نے قبضہ کیا' وہاں ہمیں لوگوں کو جبراً اسلام قبول کرنے کی کوئی کوشش نہیں ملتی۔ یہ سچ ہے کہ لوگوں کو مسلمان ہونے کی دعوت تو دی گئی اور قبولِ اسلام پر کچھ مراعات وحقوق کا بھی اعلان کیا گیا لیکن طاقت وقوت کا استعمال نہیں کیا گیا اور عیسائیوں' یہودیوں اور زرتشتیوں سب کو ایک مقرر شدہ ٹیکس (جزیہ) ادا کرنے پر مذہب وعقیدہ کی مکمل آزادی دی گئی۔'' ("The Persians"... Sir E. D. Ross, p. 54)

(16) ''بزورِ شمشیر تمام مذاہب کی بیخ کنی کے فرض کے ایک خبیث ومہلک اصول کی نسبت مسلمانوں کی طرف کی گئی ہے۔ جہالت وتعصب پر مبنی اس الزام کی قرآن نے' مسلمان فاتحین کی تاریخ نے' اُن کے عوام نے اور عیسائیوں کی عبادت پر قانونی رواداری نے تردید کی ہے۔'' ("The Decline and Fall of the Roman Empire"... Edward Gibbon, Vol IV, p. 193)

(17) ''بالخصوص ہم اس الزام کو رسوا کن بلکہ کمینہ پن سمجھتے ہیں کہ محمد (ﷺ) نے امن و آشتی، طاقت و قوت اور فتحمندی کی راہ بنانے کے لئے تلوار اٹھائی۔ اسلام پر ''مذہب شمشیر'' ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے، ایک ایسا مذہب جس نے تشدد اور عدم رواداری کو تقدس کا درجہ دے کر صحیح روحانیت کو ترک کر دیا۔ یہ ایک ایسا تصور ہے جس نے اسلام کو قرونِ وسطیٰ سے مغرب کی عیسائی دنیا میں تندخو بنا کے پیش کیا اگر چہ اُس وقت عیسائی خود مشرقِ وسطیٰ میں اپنی مقدس جنگوں میں مصروف تھے۔ آج ہر دلعزیز کتابیں اور ٹیلیویژن پروگرام بالعموم ''اسلام کا غیظ و غضب'' ''اسلام کی تلوار'' ''مقدس غیظ وغضب'' یا ''مقدس دہشت گردی'' جیسے عنوانات دل بہلاوے کے طور پر قائم کرتے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ حق وصداقت کو مسخ کرنا ہے۔ ہر مذہب کی اپنی ایک خاص تخلیقی صلاحیت اور کسی چیز کو جانچنے کی ایک خاص فطری صلاحیت ہوتی ہے جو اُس کے تجسس کو حتمی مطلب اور قدر کے لئے ممتاز کرتی ہے۔'' ("Muhammad --- A Biography of the Prophet"... Karen Armstrong, p. 164 under the head "Holy War".

(18) ''مغرب میں ہم اکثر محمد (ﷺ) کو اپنی تلوار کو لہراتے ہوئے فوجی کمانڈر تصور کرتے ہیں تاکہ وہ اسلام کو مذبذب دنیا پر بزورِ شمشیر عائد کر سکیں۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ محمد (ﷺ) اور ابتدائی مسلمان اپنی زندگی کی جنگ لڑ رہے تھے اور اُنہوں نے ایسا منصوبہ اپنے ہاتھوں میں لیا تھا جس میں تشدد ناگزیر تھا۔ کوئی بھی نتیجہ خیز معاشرتی اور سیاسی تبدیلی کبھی بھی خونریزی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکی اور چونکہ محمد (ﷺ) افراتفری اور ابتری کے دور میں رہ رہے تھے، اس لئے امن و آشتی کو بزورِ شمشیر ہی حاصل کیا جا سکتا تھا۔ مسلمان اپنے پیغمبر کے مدنی سالوں کو سنہرا دور دیکھتے ہیں لیکن وہ زمانہ بھی غم واندوہ، تاسف، دہشت گردی اور خونریزی کا تھا۔ اُمتِ مسلمہ ملکِ عرب کی خطرناک تشدد پسندی کو سخت گیر کوشش ہی سے ختم کرنے کے قابل ہوئی۔'' (ایضاً)

(19) ''مسلمان عیسیٰ علیہ السلام کے پُرامن پیغام کا احترام کرتے ہیں (اگرچہ قرآن کا بیان ہے کہ عیسائی لڑنے والے ہو سکتے ہیں) لیکن وہ اس بات کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ بعض اوقات طاقت کا استعمال ضروری ہوتا ہے۔ اگر جابر اور سخت ناپسندیدہ حکومتوں کی فوجی لحاظ سے مزاحمت نہ ہوتی تو بدی تمام دنیا پر چھا جاتی۔ بعض اوقات پیغمبر (علیہم السلام) تک جنگ کرنے اور قتل کرنے پر مجبور ہوئے جیسا کہ داؤد علیہ السلام نے اللہ کی مدد کے ساتھ جالوت کو قتل کیا۔ قرآن فرماتا ہے:

لَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ (سورۃ البقرۃ: ۲۵۱)

''اگر اللہ بعض لوگوں کو بعض کے ذریعے دفع نہ کرتا تو (روئے) زمین پر فساد برپا ہو جاتا۔''

''بہت سے عیسائی اس منصفانہ جنگ کے تصور سے اتفاق کریں گے یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ ایک ہٹلر یا Ceausescu کے خلاف جنگ کرنا اور مسلح مقابلہ کرنا ہی بااثر طریقہ ہے۔ لہٰذا ایک پُرامن مذہب ہونے کی

بجائے جو دوسرا رخسار بھی (پٹنے کے لئے) پیش کرتا ہے' اسلام ظلم و جبر اور بے انصافی کے خلاف تلوار اٹھاتا ہے۔ مسلمان کو یہ احساس دامن گیر ہوتا ہے کہ کمزور و ناتواں اور ستم رسیدہ کی بھرپور حمایت کرنا اُس کا مقدس فریضہ ہے۔ آج جب مسلمان اپنے دشمنوں کے خلاف دعوتِ جہاد دیتے ہیں تو دراصل وہ اِسی قرآنی نصب العین کا جواب دے رہے ہوتے ہیں۔'' (ایضاً)

(20) ''مغرب میں صدیوں سے ہم نے محمد (ﷺ) کو وحشت انگیز ہستی' ظالم جنگجو اور سنگدل سیاستدان کے طور پر سمجھا ہے۔ لیکن آپ تو بڑے ہی رحم دل اور نفیس احساسات کے مالک تھے۔ مثلاً آپ جانوروں سے بہت پیار کرتے تھے اور اگر آپ (علیہ السلام) کسی بلّی کو اپنے چغے پر سوتا ہوا دیکھ لیتے تو آپ اُس کے آرام میں مخل ہونے کا تصوّر تک نہیں کر سکتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ کسی معاشرے کی آزمائش کا معیار اُس کا جانوروں کے ساتھ رویّے کا ہے۔ تمام مذاہب اِس قدرتی (جانوروں کی) دنیا سے پیار و احترام کے رویّے کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور محمد (ﷺ) مسلمانوں کو یہی تعلیم دیتے تھے۔ زمانہ جاہلیت میں لوگ جانوروں سے ظالمانہ طور پر پیش آتے تھے: وہ (زندہ) جانوروں کے گوشت کے لوتھڑے کاٹ کر کھا جاتے تھے اور اونٹوں کی گردنوں میں المناک چھلّے ڈال دیتے تھے۔ محمد (ﷺ) نے ہر قسم کے اذیت ناک داغنے اور ٹھپہ لگانے اور جانوروں کو لڑانے سے روک دیا۔ ایک روایت کے مطابق ایک شخص سخت گرمی کے دن ایک پیاسے کتے کو پانی پلانے کی وجہ سے جنت میں بھیج دیا گیا اور ایک عورت جس نے اپنی بلّی کو بھوکا رکھ کر مار دیا تھا' دوزخ میں بھیج دی گئی۔ اِن روایات کا تحفظ۔ ظاہر کرتا ہے کہ مسلم دنیا میں (ایسی) اقدار کی کتنی اہمیت تھی اور اُس سماج نے کس سرعت سے انسانیت نواز اور رحم دل منظر کی طرف پیش قدمی کی۔'' (ایضاً' صفحہ ۲۳۱)

(21) ''اگر آج مسلمانوں کو ہماری مغربی روایات اور تنظیمات کو مکمل طور پر سمجھنے کی ضرورت ہے تو مغرب میں ہمیں اپنے قدیم تعصب کو ترک کر دینے کی ضرورت ہے۔ شاید اس کا آغاز غیر معمولی ذہنی رُجحان رکھنے والے' گرم جوش شخص یعنی محمد (ﷺ) کی ہستی سے ہونا چاہئے جن کے بعض افعال و اعمال کو تسلیم کرنا ہمارے لئے مشکل ہے لیکن جن کی عبقریت (غیر معمولی ذہنی صلاحیت) گہرے نظم و ضبط کی حامل تھی' اُنہوں نے ایک مذہب اور ثقافتی روایت کی بنیاد رکھی اور مغرب کی فرضی حکایت کے برعکس جس کی بناء تلوار اور زورِ بازو پر نہیں تھی اور جس مذہب کا نام ''اسلام'' ہے' وہ امن و عافیت اور مصالحت کا آئینہ دار ہے۔'' (ایضاً' صفحہ ۲۶۶)

(22) ''مغرب میں یہ عام تاثر ہے کہ مذہب کے اس پُر جوش جذبے کو بزورِ شمشیر ممکن بنایا گیا۔ لیکن دَورِ جدید کا کوئی بھی عالم اس نظریہ کو قبول نہیں کرتا اور قرآن واضح طور پر آزادیٔ ضمیر کی حمایت کرتا ہے۔ یہ شہادت بڑی ٹھوس اور مضبوط ہے کہ اسلام نے مختلف مذاہب کے لوگوں کو خوش آمدید کہا جب تک اُن کا مسلمانوں کے ساتھ رویّہ خوش آئند رہا اور وہ جزیہ کی شکل میں ٹیکس ادا کرتے رہے۔ محمد (ﷺ) نے ہمیشہ مسلمانوں کو اہلِ کتاب (یہود

ونصاریٰ) سے تعاون کرنے کی تعلیم دی۔ یہ سچ ہے کہ مسلمانوں کی عیسائیوں یا یہودیوں کے ساتھ اکثر اوقات جنگیں بھی ہوئیں (جس کی وجہ بعض اوقات یہ بھی ہوئی کہ قدیم مذاہب میں جنگ لازمی امر تھا) اور قرآن میں اِن جنگوں سے متعلق قدیم تشدّد کے حوالے موجود ہیں۔ لیکن یہ شہادت اغلب ہے کہ اہلِ کتاب کو بالعموم عمدہ رویّہ دیا گیا اور اُن کی خواہش کے مطابق اُن کے مذہب کو تقدّس کا درجہ اور عبادت کی آزادی دی گئی۔''

''مغرب میں بہت سے لوگ جو اپنی کتب تاریخ کے مطالعہ سے یہ یقین کرنے لگے ہیں کہ مسلمان وحشت و بربریت کے حامل کافر تھے۔ اُنہیں یہ بات سمجھنی مشکل لگتی ہے کہ ہماری علمی زندگی سائنس' طب' ریاضی' جغرافیہ اور فلسفہ کے میدانوں میں مسلمان علماء و فضلاء سے کس قدر گہرے طور پر متاثر ہوئی ہے۔ صلیبی لوگ جنہوں نے مسلمانوں سے لڑنے کے لئے ارضِ مقدّس پر حملہ کیا' پریم و محبت' قابلِ رشک بہادری' جنگ کرنے اور حکومت کرنے کا نیا نظریہ لے کر یورپ کو پلٹے۔ ہمارے اس نظریہ کو کہ ایک جامعہ (یونیورسٹی) کو کیسا ہونا چاہئے' اُن مسلمان علماء و فضلاء نے اصلاح پذیر کیا جنہیں تاریخ پر پورا عبور حاصل تھا اور جو اپنے ساتھ بہت سے یونانی علوم لائے۔''

''اکثر مذاہب سے بڑھ کر اسلام اپنے دائرے کے اندر کی تمام نسلوں' رنگوں اور قوموں کے بھائی چارے کی تعلیم دیتا ہے۔ اسلام پادریت کی کوئی تعلیم نہیں دیتا اور یہودی مذہب کی طرح وہ مرقع نگاری کی حوصلہ شکنی کرتا ہے۔'' ("Islam -- the Misunderstood Religion" ... James A. Michener, published in the Reader's Digest of May, 1955 : American Edn.

(23) ''شروع زمانہ کے مسلمانوں کی اِس تصویرکشی سے بڑھ کر زیادہ کوئی لغو بات نہیں ہوسکتی کہ وہ اپنے مذہب میں عصبیت زدہ اور متشدّد تھے' جو ملک عرب سے نکل کر مفتوح اقوام کو یا تو قرآن یا تلوار دینے آئے۔ عیسائیوں کو اپنا مذہب ترک کرنے پر مجبور نہیں کیا گیا۔ گیارھویں اور بارھویں صدی عیسوی میں صلیبی جنگوں کے زمانہ میں ملکِ شام اور مصر کے لوگ مسلمان عربوں کی حکومت کے تحت عملی طور پر عیسائی تھے۔'' ("Islam at the Crossroads", De Lacy O'Leary, p. 242)

(24) ''کیا یہ متحارب (لڑاکا) رویّہ محمد (ﷺ) کے منصوبے کا حصّہ تھا؟ اس کا جواب یقینی طور پر نفی میں ہے۔ ابتدائی اسلام کی فوجی مہم جوئیاں اسلام کے اصل پروگرام کا حصّہ نہیں تھیں۔ اِن مہمات میں پیغمبر (علیہ السلام) اور آپ کے خلفائے راشدین جھجک اور ہچکچاہٹ کا رویّہ ظاہر کرتے نظر آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ مجبور کئے گئے اور اُنہوں نے جنگوں کی کمان تردّد کے ساتھ اور پس و پیش کرتے ہوئے سنبھالی۔ مکہ کے لوگوں کے خلاف مہم میں فوجی رویّہ جبری حالات کا ناگزیر نتیجہ تھا۔ مکہ کے لوگ عملی طور پر مسلمانوں کے دشمن تھے اور اُن لوگوں کا اِس نئے دین (اسلام) کو قبول کرنے والوں کے خلاف اذیت ناک رویّہ تھا۔'' ("Arabic Thought and its Place in History" ... De Lacy O'Leary, pp. 58, 59)

(25) ''یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ عیسائی معاشرے کیسے بتدریج انحطاط پذیر ہوئے۔ رواداری کی واحد مثال اسلام نے قائم کی اور عیسائیت کی دُنیا میں رواداری کا تصوّر مسلمانوں کے رواداری کے رویّہ کا رہینِ منت ہے۔'' ("Islam, Europe and the Empire" ... Norman Daniel, pp. 242, 243)

(26) ''اہلِ عرب خون کے پیاسے وحشی لوگ نہیں تھے جو غارت گری اور تباہی و بربادی پر کمربستہ ہوں بلکہ اس کے برعکس وہ قدرتی طور پر طبّاع (غیر معمولی طور پر ذہین) نسل کے تھے' سیکھنے سکھانے کے مشتاق اور اُن ثقافتی تحفوں کے قدردان تھے جنہیں قدیم تہذیبوں نے آگے پہنچانا تھا۔'' ("The New World of Islam" ... A. M. Lothrop Stoddard Ph. D., p. 1, London 1932 Edition)

(27) ''عرب فتوحات کے ابتدائی زمانہ میں ہم مذہب کی جبری تبدیلی یا تشدّد اور اذیت رسانی نام کی کوئی چیز نہیں سنتے۔ غالبًا اس بات کو بڑا دخل ہے کہ عیسائی مذہب کے ساتھ مسلمانوں کے رواداری کے رویّہ نے ملک کے جلد حصول کو آسان بنا دیا۔۔۔ ہم راہبوں اور راہبات کے لاتعداد صومعات (اقامت گاہوں) کے علاوہ متعدد نئی عبادت گاہوں کے قیام کے متعلق پڑھتے ہیں جو مسلمان حکمرانوں کے تحت بغیر کسی مداخلت کے خوب پھلے پھولے۔ راہب کھلے عام اپنے طریقے کے اونی لباس میں ظاہر ہوتے تھے اور پادریوں کو اپنے مقدّس منصب کے چھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کا مذہب عیسائیوں کو عدالتوں میں اعلیٰ عہدے دیے جانے یا اسلامی فوجوں میں خدمت بجا لانے سے نہیں روکتا تھا۔'' ("The Preaching of Islam"... T. W. Arnold, pp. 134, 135)

(28) محمد (ﷺ) کی وفات کی خبر سن کر عرب قبائل کی چیخ و پکار ''ہائے غضب ہوا محمد (ﷺ) کی ذات پر'' تھی۔ ''جب تک آپ حیات تھے' میں اپنے دشمنوں سے امن و آشتی اور حفاظت میں تھا'' کی چیخ و پکار ملکِ عرب کے دُور دراز علاقوں میں سنی گئی۔'' (ایضاً' صفحہ ۴۱)

(29) ''یہ ظاہر کرنا ضروری ہے کہ جب محمد (ﷺ) نے اپنے آپ کو مسلّح پیروکاروں کی جماعت کا سربراہ پایا تو آپ ایک امن پسند مبلّغ سے یک دَم ایسے متعصب شخص میں نہیں بدلے (جیسا کہ ہم میں سے اکثر کا خیال ہے) جس کے ہاتھ میں تلوار ہو اور جو اپنے مذہب کو حتی الوسع جبراً منوا رہا ہو۔''

''یورپی مصنّفین اکثر یہ کہتے ہیں کہ محمد (ﷺ) کی ہجرتِ مدینہ کے وقت سے اور وہاں کے بدلتے ہوئے حالات سے آپ (علیہ السلام) بالکل ایک نئے کردار میں نظر آتے ہیں اور یہ کہ اب آپ مبلّغ' تنبیہ کرنے والے' اُن لوگوں کی طرف بھیجے گئے (معاذ اللہ) رسول اللہ نہیں رہے جنہیں آپ نے اپنے پر وحی شدہ مذہب کی صداقت کو باور

کراتا تھا' بلکہ اب وہ ایسے غیر محتاط' متعصب شخص معلوم ہوتے ہیں جو اپنی طاقت وقوت کے تمام وسائل اور ملک داری کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے آپ کو اور اپنی آراء کو منوانے پر کمربستہ ہو۔"

"لیکن یہ خیال غلط ہے کہ مدینہ میں محمد (ﷺ) نے تبلیغ اور اسلام کے مشن کو ایک طرف رکھ دیا تھا یا یہ کہ جب آپ کے پاس ایک کثیر فوج ہوگئی تو آپ کافروں کو قبولِ اسلام کی دعوت دینے سے رک گئے تھے۔ ابنِ سعد نے "طبقات" میں اور قلقشندی نے "صبح الاعشیٰ" میں پیغمبر (علیہ السلام) کی طرف سے سرداروں اور مختلف عرب قبائل کے افراد کے نام اسلام قبول کرنے کی دعوت میں لکھے گئے کچھ خطوط کا ذکر کیا ہے۔ یہ خطوط اُن کے علاوہ ہیں جو ملکِ عرب کی حدود سے باہر کے فرمانرواؤں کو دعوتِ اسلام دیتے ہوئے لکھے گئے۔" (ایضاً' صفحات ۳۳'۳۴)

(30) "اسلام کی تلوار بہ ظاہر اختیار واقتدار کو اللہ کے دین کی خدمت میں بروئے کار لائی جس نے عملاً ایک نئی قوت کی فتح میں کردار ادا کیا یعنی ایک نئی ذہانتی وعلمی زندگی کا جوبن پر آنا جس نے بالآخر تمام دیگر مذاہب و عقائد کو دفن کر کے رکھ دیا۔ بظاہر اسلام کا یکایک عروج اور ڈرامائی توسیع انسانی تاریخ میں ایک بہت ہی پُرکشش باب کی تشکیل کرتا ہے۔۔۔۔ آج تعلیم یافتہ دنیا نے اس عامیانہ (گھٹیا) نظریے کو مسترد کر دیا ہے کہ اسلام کا عروج سنجیدہ ومتین اور روادار لوگوں پر تعصبانہ رویے کی فتح تھا۔ اسلام کی غیر معمولی کامیابی کی بڑی وجہ اس کی انقلابی اہمیت تھی۔" ("Historical Role of Islam" ... M. N. Roy)

(30) "آخر کار یہ بات ذہن نشین رہے کہ اسلام انتہائی رواداری اور بُردباری کا مذہب ہے جبکہ متعصب دنیائے عیسائیت نے اصل حقائق کو مسخ کر کے رکھ دیا' بالخصوص عیسائی مشنریوں کی جانب سے بہتان طرازی کے تمام انداز مشتہر کئے گئے۔" (An Essay on Islam ... Venkata Ratnam, p. 7, 1922 Madras Edition.

(31) "مذہبی رواداری میں مسلمان کے لئے کوئی افسوس کی بات نہیں۔ اپنی رعایا پر تشدد کرنے اور اُن پر جبراً اسلام عائد کرنے کی بجائے (جیسا کہ جانگلوس لوگوں نے یہودیوں کے ساتھ کیا) عربوں نے اُنہیں عبادت کے معاملے میں آزاد چھوڑ دیا کہ وہ جس کی چاہیں عبادت کریں۔۔۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائی نئی حکومت سے مطمئن تھے اور اُنہوں نے برملا اس بات کو تسلیم کیا کہ وہ مسلمانوں کی حکمرانی کو فرنگیوں یا جانگلوسوں کی حکمرانی پر ترجیح دیتے ہیں۔"

"دراصل بہت سے عیسائی کسی بھی طرح اپنی نسل پر زور دینے میں بے چین و بے قرار نہ تھے۔ اُنہوں نے اطمینان اور سکھ کا سانس لیا کہ اُن سے اچھا برتاؤ کیا جاتا ہے' اُن کی خواہش کے مطابق اُنہیں مذہب کی آزادی

حاصل ہے اور اُن کے حکمرانوں کی طرف سے کوئی رکاوٹ و مزاحمت نہیں ہے۔ وہ تجارت میں اور امیر و مالدار ہونے میں بھی آزاد تھے۔ اس کے علاوہ اُنہیں اور کیا چاہئے تھا' البتہ اپنی پرانی بادشاہت کی بحالی وہ ضرور چاہتے تھے۔ اور چونکہ اس کا حصول اُس وقت ناممکن تھا' وہ اپنے نرم خو اور حلیم و بُردبار حاکموں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے میں مطمئن اور قانع تھے۔'' ("Moors in Spain" ... Stanley Lane-Poole, pp. 47, 83 : 1920 London Edition).

(32) ''مسلمانوں کا دوسرے عقائد کے ساتھ رویّہ کبھی بھی غیر رواداری کا نہیں رہا جیسا کہ اُس زمانہ میں دنیائے عیسائیت کا تھا۔۔۔ عیسائی لوگ وزارت جیسے کلیدی و اعلیٰ مناصب پر ترقی پانے کے اہل سمجھے جاتے تھے اور اس میں مذہب (عیسائیت) چھوڑنے کی کوئی شرط نہ تھی۔ صلیبی جنگوں کے دَور میں بھی جب مذہبی مخالفت انتہائی شدت اختیار کر گئی تھی' عیسائی افسران کچھ کم اور شاذ نہ تھے' وگرنہ مسلمان قائلینِ نظریہ انتظامی عُہدوں پر عیسائیوں کی تعیناتی کے خلاف لعن طعن کی بوچھاڑ کبھی نہ کرتے۔ قدرتی طور پر مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں جانب سے گاہے گاہے تشدد اور انتہا پسندی ظاہر ہوتی رہی ہے تاہم وہ استثنائی صورتیں تھیں۔ گیارھویں صدی عیسوی تک عیسائی جنازوں کے جلوس عیسائیت کی تمام علامات کے ساتھ بغداد کی شاہراہوں سے گزرتے تھے اور خلل اندازی اور افراتفری کے واقعات شاذ و نادر اور استثنائی تھے۔ مصر میں عیسائی تہواروں کو مسلمان آبادی کسی حد تک تعطیل کے دن سمجھتی تھی۔''

''صلیبی جنگوں' ترکی جنگوں اور یورپ کی بڑی توسیع نے عیسائیت اور اسلام کے درمیان خلیج کو اور فراخ کر دیا جبکہ مشرق کو بتدریج کلیسا کے زیر اثر لایا گیا تو فرق اور گہرا ہو گیا۔ تاہم یہ نظریہ کہ مسلمان فاتحین اور اُن کے جانشین عیسائیت کی متعصبانہ نفرت سے گرم جوش ہوئے' عیسائیوں کا خود اختراعی' خانہ ساز افسانہ ہے۔'' ("Christianity and Islam" ... C. H. Becker, pp. 32, 33 : 1909 London Edition)

(34) ''سپین میں اسلامی حکومت کی اپنی عیسائی رعایا کے ساتھ رواداری اور دو مذہبوں (عیسائیت اور اسلام) کے پیروکاروں کے مابین اور دونوں سماجوں میں کسی حد تک ہم آہنگی' انجذاب باہمی اور ارتباطِ باہمی کی رہینِ منت تھی۔ باہمی شادیاں عام ہو گئیں۔۔۔ بہت سے عیسائیوں نے عرب نام اختیار کر لئے اور خارجی مشاہدات میں کسی حد تک اُنہوں نے اپنے مسلمان ہمسایوں کی نقالی کی' مثلاً بہت سے عیسائیوں کا ختنہ کیا گیا۔'' ("The Preaching of Islam" ... T. W. Arnold, p. 136)

قرآن و حدیث' تاریخِ اسلامی اور درج بالا اکابر غیر مسلمین کے بیانات کے مدِّنظر یہ کہنا کہ (معاذ اللہ) اسلام وحشت و بربریت اور خونریزی کا مذہب ہے' حقائق کا منہ چڑانا نہیں تو اور کیا ہے؟ (مؤلف)

(۱۰۴) جزیہ (JIZYA)

جزیہ کا لغوی معنی: (۱) ''جزیہ کا لغوی معنی ہے اِکتفاء'' (غریب الحدیث' ج ۱' ص ۴۳۔ علامہ ابوعبید القاسم بن سلام ہروی (م ۲۲۴ھ) مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت۔

(۲) ''امام فخر الدین رازی نے واحدی سے نقل کیا ہے کہ جزیہ ''جزی'' سے بنا ہے جس کا معنی ہے کسی واجب کو ادا کرنا۔'' (تفسیر کبیر' ج ۵' ص ۲۵)

(۳) علامہ علاء الدین محمد بن علی الحصکفی الحنفی (م ۱۰۸۷ھ) لکھتے ہیں کہ جزیہ کا لغوی معنی الجزاء (بدلہ) ہے اور یہ قتل کا بدل ہے کیونکہ جب کوئی ذمی جزیہ ادا کر دیتا ہے تو اُس سے قتل ساقط ہو جاتا ہے اور الجزاء سزا کو بھی کہتے ہیں۔''

جزیہ کا اصطلاحی معنی: (۱) ''اصطلاح میں جزیہ اُس رقم کو کہتے ہیں جو ذمّی اپنی حفاظت کے لئے ادا کرتا ہے۔'' (تفسیر کبیر' ج ۵' ص ۲۵)

(۲) ''جزیہ ایک ٹیکس ہے جو اسلامی مملکت کے غیر مسلم شہریوں سے وصول کیا جاتا ہے جو اسلامی مملکت کی بالا دستی کو قبول کرتے ہوئے ایک پُر امن شہری کی طرح وہاں آباد ہونے کا معاہدہ کریں۔'' (''ضیاء النبی''۔۔ پیر کرم شاہ الازہری' ج ۴' ص ۳۰۱)

جزیہ کا حکم سورۃ التوبۃ کی آیت ۲۹ میں اس طرح آیا ہے:

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ۝

''اہلِ کتاب میں سے اُن سے لڑو جو نہ اللہ پر اور نہ روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ اُن چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جو اللہ اور اُس کے رسول نے حرام کی ہیں اور نہ سچے دین کو قبول کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ رعیّت ہو کر اور اپنی پستی کا احساس کر کے جزیہ دیں۔'' (۲۹ : ۹)

اَلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ سے مراد اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) ہیں جیسا کہ اُوْتُوا الْكِتٰبَ سے ظاہر ہے۔ یہ دونوں قومیں اللہ تعالیٰ اور قیامت کو ماننے کی دعویدار ہیں مگر درحقیقت دونوں صحیح طرح نہیں مانتیں۔ عیسائی عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا اور یہودی عُزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا مانتے ہیں۔ یونہی یہودی جنت میں کھانے پینے کی نعمتوں کے منکر ہیں اور عیسائی جنت میں صرف روحانی داخلہ مانتے ہیں نہ کہ جسمانی۔ نیز لوگ اِن دونوں کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وسیلہ کے بغیر مانتے ہیں لہٰذا اُن کا ایمان صحیح نہیں ہے۔

وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اس میں یہود و نصاریٰ کے دوسرے دو جرموں کا ذکر ہے۔ رَسُوْلُهٗ سے مراد نبی کریم ﷺ کی ذاتِ اقدس ہے۔ عبارت کا مقصد یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ اُن چیزوں کو حرام نہیں سمجھتے

جنہیں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حرام کیا ہے جیسے خنزیر' مردار' شراب' سود' جوا' زنا وغیرہ۔ یا جنہیں نبی ﷺ نے حرام قرار دیا ہے جیسے ریچھ' بھیڑیا' شیر وغیرہ۔ وہ یہ سب کھاتے ہیں۔''

وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَق یہ یہود و نصاریٰ کے پانچویں عیب کا بیان ہے۔ دِيْنَ الْحَق سے مراد دینِ مصطفوی یعنی اسلام ہے کہ یہ دین باقی تمام ادیان کا ناسخ ہے اور اس کے آنے پر باقی تمام ادیان منسوخ ہوگئے اور انہیں اب اختیار کرنا کفر ہے۔ عبارت کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ منسوخ نہ ہونے والا اللہ کا دین (اسلام) قبول نہیں کرتے۔

مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰب سے مراد سارے اہلِ کتاب کفار ہیں۔ اس میں بتایا گیا کہ یہاں مشرکین مراد نہیں۔ اگرچہ جہاد سب کے خلاف ہوگا مگر جزیہ صرف اہلِ کتاب سے لیا جائے گا' مشرکینِ عرب سے نہیں۔

حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ یہ فرمانِ عالی قَاتِلُوْا ---الخ کی انتہا ہے۔ عطاء سے مراد اپنے ذمّہ لازم کر لینا کیونکہ اگر یہود و نصاریٰ جزیہ دینا منظور کر لیں تو اُن کے خلاف جہاد نہ ہوگا۔ جزیہ دینے کا انتظار نہیں کیا جائے گا۔

''علامہ ابن تیمیہ نے حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ کی تفسیر میں لکھا ہے: وَالْمُرَادُ بِاِعْطَائِهَا اِلْتِزَامُهَا یعنی اس سے مراد صرف یہ ہے کہ وہ عقدِ معاہدہ پر قائم رہیں۔ جس طرح تمام حکومتوں کے قوانین میں ٹیکس دیتے رہنا وفاداری اور پابندیِ قانون کی دلیل ہے اور نہ ادا کرنا بے وفائی اور غداری کی دلیل ہے۔ اسی طرح جزیہ دیتے رہنا بھی پابندیِ عہد کی دلیل ہے اور اُس کا ادا نہ کرنا نقضِ عہد کا ہم معنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جزیہ صرف لڑنے کے قابل مردوں پر عائد کیا گیا ہے۔ عورتیں' نابالغ بچے' دیوانے اور از کار رفتہ بوڑھے' اندھے اور اپاہج وغیرہ سب اُس سے مستثنیٰ ہیں۔ ''بدائع الصنائع'' میں ہے:

لِاَنَّ اللّٰهَ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى اَوْجَبَ الْجِزْيَةَ عَلٰى مَنْ هُوَ مِنْ اَهْلِ الْقِتَالِ لِقَوْلِهٖ تَعَالٰى: قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ الْاٰيَة وَالْمُقَاتَلَةُ مُفَاعَلَةٌ مِّنَ الْقِتَالِ فَتَسْتَدْعِيْ اَهْلِيَّةَ الْقِتَالِ مِنَ الْجَانِبَيْنِ فَلَا تَجِبُ عَلٰى مَنْ لَيْسَ مِنْ اَهْلِ الْقِتَالِ

''اللہ تعالیٰ نے جزیہ صرف اُن لوگوں پر مقرر کیا ہے جو اہلِ قتال ہیں جیسا کہ آیت قَاتِلُوا الَّذِيْنَ میں لفظ قَاتِلُوْا سے معلوم ہوتا ہے۔ مُقاتلہ کے لئے جانبین سے قتال کی اہلیت شرط ہے۔ پس جن لوگوں میں یہ اہلیت نہیں' وہ قتال اور جزیہ دونوں سے مستثنیٰ ہیں۔''

يَد'' کا لفظ بہت معنوں میں آتا ہے: ہاتھ' غنا' اطاعت و فرمانبرداری' انعام و احسان' نقد' عجز و انکساری' نعمت' غلبہ وغیرہ۔ (روح المعانی)۔ یہی چند احتمالات ہیں:

(۱) يَد'' بمعنی ہاتھ۔ اور اس سے مراد کافر دینے والے کا ہاتھ ہے یعنی کافر خود اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کر دے' کسی کے ہاتھ نہ بھیجے۔

(۲) يَد'' بمعنی ہاتھ۔ اور ہاتھ سے مراد لینے والے حاکم اسلام کا ہاتھ ہے۔

(۳) یَد" بمعنی غنا ہے اور عَن سببیہ ہے یعنی کافر غنی اپنے غنا کی وجہ سے جزیہ دے' فقیر کافر پر جزیہ نہیں۔
(۴) یَد" بمعنی اطاعت ہے یعنی کفار مسلمانوں کی اطاعت کرتے ہوئے جزیہ دیں نہ کہ سرکشی کرتے ہوئے
(۵) یَد" بمعنی انعام واحسان ہے یعنی کفار احسان کی بناء پر جزیہ دیں کہ مسلمان اُنہیں قتل نہیں کرتے بلکہ اُن کی حفاظت کا انتظام کرتے ہیں۔
(۶) یَـــد" بمعنی نقد ہے۔ یعنی جزیہ نقد دینا ہوگا' اس کا ادھار نہیں۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک پیشگی یعنی شروع سال میں اور شوافع کے ہاں آخر سال میں ادا کرنا ضروری ہے۔ (تفسیر کبیر)
(۷) یَـــد" بمعنی عجز وانکساری ہے۔ یعنی رعایا کا سا عجز وانکسار کرتے ہوئے جزیہ دیں نہ کہ اکڑتے اور دھونس جماتے ہوئے۔
(۸) یَـــد" بمعنی نعمت ہے۔ یعنی کفار جزیہ کو نعمت سمجھ کر بخوشی ادا کریں' اُسے بوجھ یا جرمانہ سمجھ کر نہ دیں کیونکہ وہ اس وجہ سے قتل وغارت سے بچے ہیں (روح المعانی)۔
(۹) یَد" بمعنی غلبہ ہے۔ یعنی مسلمانوں کو اپنا سلطان مانتے ہوئے اور اپنے کو رعایا سمجھتے ہوئے جزیہ دیں نہ کہ اُنہیں محتاج وضرورت مند سمجھ کر۔

وَهُمْ صٰغِرُوْنَ ۞ (ذلیل وحقیر ہوکر) یعنی وہ ادائے جزیہ کے وقت اپنا چھوٹا ہونا اور مسلمان حاکم کو اپنے سے بڑا ظاہر کریں اس طرح کہ (i) سواری پر سے نہ دیں' سواری سے نیچے اتر کر دیں۔ (ii) اپنا ہاتھ اونچا کرکے نہ دیں بلکہ نذرانہ دینے کی طرح ہاتھ نیچا رکھیں۔ (iii) کسی کے ہاتھ نہ بھیجیں اور نہ ہی منی آرڈر کریں' خود حاکم کے حضور پیش ہو کر دیں۔" (تفسیر نعیمی ـ ـ مفتی احمد یار خاں گجراتی' ج ۱۰' ص ص ۲۵۳'۲۵۴)

علامہ ابن قیم نے وَهُمْ صٰغِرُوْنَ کی تشریح کی ہے:
اَلصَّغَارُ هُوَ الْتِزَامُهُمْ بِجَرْيَانِ اَحْكَامِ اللهِ، تَعَالٰى عَلَيْهِمْ وَ اِعْطَاءُ الْجِزْيَةِ هُوَ الصَّغَارُ
"اِس آیت میں صغار سے مراد اُن کا قانونِ الٰہی کے احکام کی تنفیذ پر راضی ہونا اور آئینِ عدل کی پابندی کرنا ہے۔ اس اطاعت وانقیاد کی علامت کے طور پر اُن کا جزیہ دینا ہی صغار ہے۔"

"دشمنانِ اسلام نے جزیہ کی وجہ سے اسلامی نظام سیاست پر اعتراضات کی بوچھاڑ کی ہے اور اسلام کے بارے میں لوگوں کے ذہنوں میں غلط تصورات پیدا کرنے کی ناپاک مساعی کی ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ جزیہ کے بارے میں تفصیل سے لکھا جائے تاکہ معترضین کے اعتراضات کا اطمینان بخش جواب دیا جاسکے اور اسلام کے اِس بے عدیل نظام کے بارے میں ساری غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جاسکے۔"

"اسلامی مملکت کے باشندوں کو ہم دو حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں: (۱) مسلم رعایا اور (۲) غیر مسلم رعایا

"غیر مسلم رعایا کی پھر دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم اُن لوگوں کی ہے جنہوں نے جنگ کئے بغیر صلح کی اور صلح نا

کے مطابق اسلامی مملکت کی شہریت قبول کر لی۔ دوسری قسم اُن غیر مسلموں کی ہے جنہوں نے جنگ میں شکست کھانے کے بعد گھٹنے ٹیکے اور مملکتِ اسلامیہ میں پُر امن شہری کی حیثیت سے سکونت پذیر ہو گئے۔ اِن دونوں قسموں کو آسانی کے لئے ہم ''اہلِ ذمہ'' کے نام سے یاد کر سکتے ہیں۔''

''مملکتِ اسلامیہ میں سکونت پذیر اِن تینوں طبقات کی جان' مال اور عزت و آبرہ کی حفاظت کی ذمہ داری اسلامی حکومت پر عائد ہوتی ہے۔ یہ ذمہ داری صرف قول کی حد تک نہیں بلکہ عملی طور پر ان سے عہدہ برآ ہونا اسلامی مملکت کا دینی فریضہ ہے۔''

''مسلمان رعایا بیت المال میں جو رقم جمع کراتی ہے' اُسے زکوٰۃ و عُشر کہتے ہیں جو مَردوں' عورتوں' بچوں (بچوں پر صرف عُشر) سب پر فرض ہے اور ذمی رعایا جو رقم بیت المال میں جمع کراتی ہے' اُسے ''جزیہ'' کہتے ہیں۔ یہ وہ جزیہ ہے جس کے بارے میں اسلام کے سیاسی حریفوں نے ایک کہرام مچا رکھا ہے۔ اسلام کے رخِ زیبا کو شکوک وشبہات کی گرد سے غبار آلود کرنے میں اپنی ساری قوتیں صَرف کر رہے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ غیر مسلموں کے ساتھ امتیازی سلوک برتا جاتا ہے یعنی جزیہ صرف غیر مسلموں سے وصول کیا جاتا ہے' مسلمانوں سے وصول نہیں کیا جاتا۔ ایک مملکت کا شہری ہونے کی حیثیت سے دونوں کے ساتھ مساوی سلوک ہونا چاہئے تھا لیکن اسلام نے غیر مسلموں کے ساتھ امتیازی سلوک برتا ہے۔ کبھی کہتے ہیں کہ غیر مسلموں کو مالی مشکلات میں مبتلا کرنے کے لئے اُن پر جزیہ کی ادائیگی لازمی قرار دی گئی ہے اور اُن کے اعتراضات کی تان اِس بات پر آکر ٹوٹتی ہے کہ جزیہ کا اصل مقصد یہ ہے کہ غیر مسلموں پر یہ مالی تاوان لگا کر اُنہیں اپنا مذہب چھوڑ کر دینِ اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے۔

آیئے! ہم حقیقت کی روشنی میں اِن اعتراضات کا جائزہ لیں :۔

(ا) کہا جاتا ہے کہ جزیہ صرف غیر مسلموں سے وصول کیا جاتا ہے' مسلمانوں سے وصول نہیں کیا جاتا اور یہ امتیازی برتاؤ ہے جو ناروا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بالکل جھوٹا الزام ہے۔ جس طرح پہلے بتایا جا چکا ہے کہ مسلمان بھی اپنے کمائے ہوئے مال میں سے بہ صورتِ زکوٰۃ و عُشر وصدقات حصّہ دیتے ہیں جو مقدار میں جزیہ کی مقدار سے کئی گنا زیادہ ہوتا ہے۔ نیز مسلمانوں کے پاس اگر بہ صورت بھیڑ بکریاں' گائیں' بھینیں' گھوڑے اور اونٹ مویشی ہوں تو ان کی زکوٰۃ بھی مسلمانوں کو ادا کرنا پڑتی ہے حالانکہ ذمی رعایا سے مویشیوں پر کسی قسم کا لگان یا ٹیکس وصول نہیں کیا جاتا۔''

''مسلمان عورت یا مسلمان بچہ اگر صاحبِ نصاب ہو تو اُنہیں بھی لازمی طور پر اپنے اموال کی زکوٰۃ و عشر دینا پڑتا ہے۔ ان کے برعکس کسی ذمی عورت اور بچے سے کوئی جزیہ نہیں لیا جاتا۔''

''خود ہی سوچئے کہ اسلام نے مالی ذمّہ داریوں کے نقطہ نظر سے ذمّیوں کو کتنی مراعات سے بہرہ ور کیا ہے۔ بجائے اس کے کہ اِن حقائق کو سمجھا جاتا' حق بات کا اعتراف کیا جاتا اور اسلام کی فیّاضی کا شکریہ ادا کیا جاتا'

اُلٹا یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ اسلام غیر مسلم رعایا سے امتیازی سلوک روا رکھتا ہے۔ آپ خود ہی فیصلہ کریں کہ اُن کا یہ الزام کہاں تک صحیح ہے؟

(۲) ''اُن کا دوسرا الزام کہ جزیہ ایک مالی تاوان ہے' جس سے اسلامی حکومت اپنی غیر مسلم رعایا کو زیر بار کرتی ہے اور اُنہیں مالی دشواریوں سے دوچار کرتی ہے۔ اس بارے میں اتنا کہنا کافی ہے کہ اگر آپ جزیہ کی مقدار سے آگاہ ہو جائیں تو یہ الزام خود بخود کالعدم ہو جائے گا۔''

جزیہ کی مقدار: ''حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک غیر مسلموں کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے: دولتمند طبقہ' متوسط طبقہ اور فقراء۔ امراء پر اڑتالیس درہم سالانہ یعنی چار درہم ماہانہ۔ متوسط طبقہ پر چوبیس درہم سالانہ یعنی دو درہم ماہانہ اور تیسرے طبقے پر بارہ درہم سالانہ یعنی ایک درہم ماہانہ۔''

''آپ خود سوچئے کہ کیا یہ اتنا بوجھ ہے جو اُن کے لئے ناقابلِ برداشت ہے اور اُنہیں طرح طرح کی مالی پریشانیوں میں مبتلا کرنے کا باعث بن سکتا ہے؟ یہ ایک نہایت ہی قلیل اور حقیر سی رقم ہے جو قطعاً بوجھ تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔''

(۳) اُن کی آخری تہمت کہ جزیہ عائد کرنے کا مقصد یہ ہے کہ غیر مسلموں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کر دیا جائے۔ اس کے سراسر کذب وافتراء ہونے میں ذرا شک نہیں۔ جس دین کا بنیادی اصول ہی یہ ہو کہ ''دین قبول کرنے میں کسی پر جبر نہیں کیا جائے گا'' اُس دین کے پیروکار کسی پر جبر کر کے اُسے مسلمان بنانے میں کیوں اپنا وقت اور اپنی قوّت ضائع کریں گے؟ آپ خود سوچیں کیا عقیدہ اِتنی حقیر اور کم مایہ چیز ہے کہ اِتنی قلیل سی رقم کی ادائیگی سے بچنے کے لئے انسان اپنے پہلے عقیدہ کو چھوڑ کر ایک نیا عقیدہ قبول کر لے جسے اُس کا ضمیر تسلیم نہیں کرتا۔ لوگ تو اپنے عقیدہ کی حفاظت میں اپنا وطن چھوڑ دیتے ہیں' اپنی عمر بھر کی کمائی پر لات مار دیتے ہیں اور اگر اپنے عقیدہ کی راہ میں سر کٹانا پڑے تو اُسے بھی بصد مسرّت قبول کر لیتے ہیں۔ عقیدہ اِتنی ارزاں اور حقیر چیز نہیں ہے کہ دولتمند لوگ سالانہ ۴۸ درہم کے عوض اور متوسط طبقہ سالانہ ۲۴ درہم کے عوض اور تیسرا طبقہ ۱۲ درہم سالانہ کے عوض اُسے بیچ دے۔ اگر کوئی شخص اتنی قلیل رقم پر اپنا عقیدہ بدلتا ہے تو اُس کی تبدیلی قطعاً کسی کے لئے قابلِ افسوس نہیں ہونی چاہئے۔ یہ چیز بھی ذہن نشین رہے کہ ہر غیر مسلم پر جزیہ کی ادائیگی لازم نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے چند شرائط کا ہونا ضروری ہے۔ اگر ان شرائط میں سے کوئی شرط بھی نہ پائی جائے تو جزیہ ساقط ہو جائے گا۔''

''شرائطِ جزیہ: (۱) عاقل ہو' بالغ ہو' مرد ہو۔
(۲) جسمانی عوارض سے محفوظ ہو یعنی اپاہج' اندھا' پیرِ فرتوت اور دائم المرض نہ ہو۔
(۳) آزاد ہو۔
(۴) ایسا مفلس نہ ہو جو بے روزگار ہو۔

''اِن شرائط سے معلوم ہوا کہ دیوانہ' نابالغ بچہ' عورت' اپاہج' اندھا' پیر فرتوت' دائم المرض' غلام اور بیروزگار' یہ سب لوگ جزیہ ادا کرنے کے حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ اگر جزیہ کا مقصد غیر مسلموں کو جبراً مسلمان بنانا ہوتا تو ان سب پر جزیہ لگایا جاتا۔ کم از کم نابالغ بچے اور عورت سے تو ضرور جزیہ وصول کیا جاتا کیونکہ مسلمان نابالغ بچے اور عورت پر زکوٰۃ و عُشر ادا کرنا لازمی ہے۔ ان تمام افراد کو مستثنیٰ کرنے سے کیا ان لوگوں کے الزام کی تردید نہیں ہوجاتی کہ جزیہ کا مقصد لوگوں کو جبراً مسلمان بنانا ہے؟''

''یہ صرف نظریات ہی نہیں بلکہ مسلمانوں نے اپنے عہدِ اقتدار میں اِن احکامات و نظریات پر عمل بھی کیا ہے۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اپنی ''کتاب الخراج'' میں تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جن غیر مسلم قوموں اور قبیلوں سے صلح کی اور اُنہیں صلح نامے لکھ کر دیئے' اُن میں یہ جملہ موجود ہے:۔

أَيُّمَا شَيْخٍ ''ضَعُفَ عَنِ الْعَمَلِ أَوْأَصَابَتْهُ آفَةٌ'' مِّنَ الْأٰفَاتِ أَوْكَانَ غَنِيًّا فَافْتَقَرَ وَصَارَ أَهْلُ دِيْنِهٖ يَتَصَدَّقُوْنَ عَلَيْهِ طُرِحَتْ وَعِيْلَ مِنْ بَيْتِ الْمَالِ وَعِيَالُهٗ' مَاأَقَامَ فِيْ دَارِالْإِسْلَامِ (کتاب الخراج)

''اگر کوئی بوڑھا کام کرنے کے قابل نہ رہے یا بدنی بیماریوں میں سے کوئی بیماری اُسے لگ جائے یا پہلے وہ مالدار تھا' اب محتاج ہوگیا اور اُس کے ہم مذہب اُسے صدقہ و خیرات دینے لگیں' اِن حالات میں اُس سے جزیہ ساقط ہوجائے گا اور اُس کا اور اُس کے اہل و عیال کا خرچہ بیت المال سے ادا کیا جائے گا جب تک وہ دارالاسلام میں سکونت پذیر رہے۔'' (''کتاب الخراج'' لامام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ)

''حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے عہد خلافت میں ایک روز ایک گلی سے گزر رہے تھے۔ دیکھا کہ ایک بوڑھا ایک مکان کے دروازے پر کھڑا بھیک مانگ رہا ہے۔ آپ چپکے سے گئے اور اُس کا بازو پکڑ لیا۔ اُس سے بھیک مانگنے کی وجہ پوچھی۔ اُس نے کہا: أَسْئَلُ الْجِزْيَةَ وَالْحَاجَةَ وَالسِّنَّ میں اس لئے بھیک مانگ رہا ہوں کہ مجھے جزیہ ادا کرنا ہے' خود کمانے سے عاجز ہوں۔ اپنی ضروریاتِ زندگی پوری کرنا ہیں اور اِدھر بڑھاپا ہے۔ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اُس کا ہاتھ پکڑا اور اپنے گھر لے گئے۔ اپنے ہاں سے اُسے کچھ دیا۔ پھر بیت المال کے خازن کو بلایا اور اُسے ہدایت کی:

أُنْظُرْ هٰذَا وَضُرَبَاءَهٗ' فَوَاللّٰهِ مَا أَنْصَفْنَاهُ إِنْ أَكَلْنَا شَبِيْبَتَهٗ ثُمَّ نَخْذُلُهٗ عِنْدَالْهَرَمِ إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَوَضَعَ عَنْهُ الْجِزْيَةَ وَضُرَبَاءِهٖ (ایضاً ص ۷۲)

''اِس کا اور اِس جیسے سب لوگوں کا خیال رکھو۔ بخدا! ہم نے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا کہ ہم نے اُس کی جوانی کی کمائی سے تو جزیہ وصول کیا اور جب وہ بوڑھا ہوگیا تو ہم نے اُسے نظرانداز کردیا۔ دراصل صدقات تو فقراء کے لئے ہوتے ہیں۔ پھر آپ نے اُس سے اور اُس جیسے معذور لوگوں کو جزیہ معاف کردیا۔''

<u>جزیہ کی اصل وجہ</u>: جزیہ لگانے سے نہ تو غیر مسلموں کے ساتھ امتیازی برتاؤ کرنا مقصود ہے' نہ اُنہیں مالی لحاظ سے زیر بار کرنا مقصود ہے اور نہ اس کی غرض و غایت یہ ہے کہ اُنہیں جبراً مسلمان بنایا جائے۔ یہاں ایک بات ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ مسلمان اور غیر مسلم رعایا سے جو رقم وصول کی جاتی ہے' اُن کے مختلف نام کیوں مقرر

کئے گئے ہیں جن سے طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہیں؟ جو بھی کسی سے وصول کیا جاتا ہے' اُس کے لئے ایک ہی نام مقرر کیا جاتا جس میں مسلم اور غیر مسلم کا کوئی امتیاز نہ ہوتا تو بہت سے شکوک وشبہات پیدا ہی نہ ہوتے اور اسلام کے مخالفین کو لب کشائی کی جرأت ہی نہ ہوتی۔''

''اس کے لئے گزارش ہے کہ ناموں کے اختلاف کی ایک اہم وجہ ہے جسے کسی قیمت پر نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ زکوٰۃ وعُشر جو مسلمانوں کے ذمہ واجب الاداہے' یہ اسلام کی دوسری عبادتوں کی طرح ایک عبادت ہے لیکن غیر مسلم رعایا جو اسلام کو اپنا دین نہیں مانتی' اُن کے مالی واجبات کو زکوٰۃ وعُشر سے موسوم کرنا قرینِ انصاف نہیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اسلام اُن لوگوں سے اپنے نظام عبادات پر عمل کرنے کا مطالبہ کر رہا ہے جو اُس کی سچائی کو مانتے ہی نہیں تو یہ کتنی بے انصافی ہے کہ اِن غیر مسلموں کو اسلام کے پیش کردہ نظام عبادت کا پابند بنایا جائے اور اُنہیں کہا جائے کہ نمازیں ادا کرو' رمضان المبارک کے روزے رکھو یا تم بھی زکوٰۃ وعُشر ادا کرو۔ اسلام کی عادلانہ روح اِس دھاندلی کو ہرگز قبول نہیں کرسکتی۔ اس لئے اُن کے ذمہ جو مالی واجبات ہیں' اُنہیں الگ نام دیا گیا تاکہ مسلمانوں کے مالی واجبات اور اہلِ ذمہ کے مالی واجبات میں امتیاز برقرار رہے۔'' (ضیاء النبی' ج ۴' ص ۳۱۰)

''**موجودہ دَور میں جزیہ کی حیثیت**: مندرجہ بالا تشریح سے اِس امر کی وضاحت بھی ہوگئی کہ اگر اہلِ ذمہ اپنے اپنے اسلامی ملکوں کے دفاع کے لئے برضا ورغبت تیار ہوجائیں تو اُن سے جزیہ ازخود ساقط ہوجائے گا۔ اگر وہ اس بات پر تیار نہ ہوں تو بہ حیثیت اُس مملکت کے شہری کے' اُن پر لازم ہے کہ وہ مملکت کے دفاعی اخراجات میں حصہ ڈالیں اور یہی جزیہ ہے۔ لیکن اگر وہ اس بات پر بھی تیار نہ ہوں اور صرف جزیہ کے لفظ سے اُنہیں چڑ (Allergy) ہو تو اس کا کوئی اور نام بھی رکھا جاسکتا ہے جس طرح بنو تغلب سے جو جزیہ وصول کیا جاتا تھا' اُسے ''صدقہ'' کہا جاتا تھا۔'' (ایضاً صفحہ ۳۱۶)

''**جزیہ وصول کرنے میں نرمی**: جزیہ اور خراج کی وصولی کے لئے ذمیوں پر تشدد کرنا منع ہے۔ سیدنا علی کرّم اللہ وجھہ' نے اپنے ایک عامل کو بھیجتے ہوئے فرمایا:

''اُن کے جاڑے' گرمی کے کپڑے' اُن کے کھانے کا سامان اور اُن کے جانور جن سے وہ کھیتی باڑی کرتے ہیں' خراج وصول کرنے کی خاطر ہرگز نہ لیں۔ نہ کسی کو درہم وصول کرنے کے لئے کوڑے مارنا' نہ کسی کو کھڑا رکھنے کی سزا دینا' نہ خراج کے عوض کسی چیز کا نیلام کرنا کیونکہ ہم جو اُن کے حاکم بنائے گئے ہیں تو ہمارا کام نرمی سے وصول کرنا ہے۔ اگر تم نے میرے حکم کے خلاف کیا تو اللہ تعالیٰ میری بجائے تمہیں پکڑے گا اور اگر مجھے تمہاری خلاف ورزی کی خبر پہنچی تو میں تمہیں معزول کردوں گا۔'' (کتاب الخراج)

آپ کرّم اللہ وجھہ' کا یہ بھی حکم ہے کہ جزیہ کے عوض اُن کی اَملاک کا نیلام نہیں کیا جاسکتا چنانچہ فرمایا:

لَا تَبِیْعَنَّ لَھُمْ فِیْ خِرَاجِھِمْ حِمَارًا وَلَا بَقَرَۃً وَلَا کِسْوَۃً شَیْئًا وَلَا صنفًا (فتح البیان)

''خراج میں اُن کا گدھا یا اُن کی گائے یا اُن کے کپڑے یا اس قسم کی کوئی چیز ہرگز نہ بیچنا۔''

امام ابویوسف اپنی "کتاب الخراج" میں لکھتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جب عراق کا خراج آتا تھا تو دس ذمہ دار افسر کوفہ سے اور دس بصرہ سے اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے اور چار مرتبہ شرعی قسم کھا کر آپ کو یقین دلاتے کہ یہ رقم حلال ہے اور کسی مسلمان یا ذمی سے ظلم کے ساتھ وصول نہیں کی گئی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شام کے گورنر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو جو فرمان لکھا تھا' اُس میں منجملہ دیگر احکام کے ایک یہ بھی تھا:

وَامْنَعِ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ ظُلْمِهِمْ وَالْإِضْرَارِ بِهِمْ وَأَكْلِ أَمْوَالِهِمْ إِلَّا بِحِلِّهَا (کتاب الخراج' ص۹)

"مسلمانوں کو اُن پر ظلم کرنے اور اُنہیں ضرر پہنچانے اور ناجائز طریقہ سے اُن کے مال کھانے سے منع کرنا۔"

ملک شام کے سفر کے دوران حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ اُن کے عامل جزیہ وصول کرنے کے لئے ذمیوں کو سزائیں دے رہے ہیں تو آپ نے فرمایا:

لَا تُعَذِّبِ النَّاسَ فَإِنَّ الَّذِيْنَ يُعَذِّبُوْنَ النَّاسَ فِي الدُّنْيَا يُعَذِّبُهُمُ اللهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (کتاب الخراج' ص۱۷)

جزیہ کی مقدار مقرر کرنے میں بھی ذمیوں پر تشدد کرنا ممنوع ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وصیت ہے کہ:

لَا تُكَلِّفُوْا فَوْقَ طَاقَتِهِمْ (کتاب الخراج' ص ص ۸ '۸۲)

"جتنا مال دینا اُن کی طاقت سے باہر ہو' اُس کے ادا کرنے کی اُنہیں تکلیف نہ دو۔"

ذمیوں کے حقوق: (۱) ذمیوں کے خون کی قیمت مسلمان کے خون کے برابر ہے۔ اگر کوئی مسلمان ذمی کو قتل کر دے تو اُس کا قصاص اُسی طرح لیا جائے گا جس طرح مسلمان کے قتل کرنے کی صورت میں لیا جاتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے عہد مبارک میں ایک مسلمان نے ایک ذمی کو قتل کیا تو آپ (ﷺ) نے اُس کے قتل کا حکم دیا اور فرمایا:

أَنَا أَحَقُّ مَنْ وَفَّى بِذِمَّتِهِ (اُس کے ذمہ کو وفا کرنے کا زیادہ حقدار میں ہوں)

حضرت عمر فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں قبیلہ بکر بن وائل کے ایک شخص نے حیرہ کے ایک ذمی کو قتل کر دیا جس پر آپ نے حکم دیا کہ قاتل کو مقتول کے وارثوں کے حوالے کیا جائے۔ چنانچہ وہ مقتول کے وارثوں کو دے دیا گیا جنہوں نے اُسے قتل کر دیا۔ ("برہان" شرح مواہب الرحمن' ج ۳' ص ۲۸۷)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ' کے زمانۂ خلافت میں ایک مسلمان پر ایک ذمی کے قتل کا الزام لگایا گیا۔ ثبوت مکمل ہونے کے بعد آپ نے قصاص کا حکم دے دیا۔ مقتول کے بھائی نے آکر عرض کیا کہ میں نے خون معاف کیا۔ مگر آپ مطمئن نہ ہوئے اور فرمایا: شاید لوگوں نے تجھے ڈرایا دھمکایا ہے۔ اُس نے کہا: نہیں مجھے خوں بہا مل چکا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اُس کے قتل سے میرا بھائی واپس نہیں آجائے گا۔ تب آپ نے قاتل کو رہا کیا اور فرمایا:

مَنْ کَانَ لَہٗ ذِمَّتُنَا فَدَمُہٗ کَدَمِنَا وَدِیَتُہٗ کَدِیَتِنَا ("بُرہان" شرح مواہب الرحمٰن، ج ۲، ص ۲۸۷)
"جو کوئی ہمارا ذمّی ہو اُس کا خون ہمارے خون کی طرح اور اُس کی دیت ہماری دیت کی طرح ہے۔"

(۲) "تعزیرات میں ذمّی اور مسلمان کا درجہ مساوی ہے۔ جرائم کی جو سزا مسلمان کو دی جائے گی، وہی ذمّی کو بھی دی جائے گی۔ ذمّی کا مال مسلمان چُرائے یا مسلمان کا مال ذمّی چُرائے، دونوں صورتوں میں چور کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ ذمّی کسی مسلمان عورت سے زنا کرے یا مسلمان کسی ذمّی عورت سے زنا کرے، دونوں صورتوں میں سزا یکساں ہوگی۔" (کتاب الخراج، ص ۱۰۸، ۱۰۹)

(۳) "دیوانی قانون میں بھی ذمّی اور مسلمان کے درمیان کامل مساوات ہے۔ حضرت علی کرّم اللہ وجہہ کے ارشاد اَمْوَالُھُمْ کَاَمْوَالِنَا کے معنی ہی یہ ہیں کہ اُن کے مال کی ویسی ہی حفاظت ہونی چاہیے جیسی مسلمانوں کے مال کی ہوتی ہے۔ اِس بارے میں ذمّیوں کے حقوق کا اتنا لحاظ رکھا گیا ہے کہ اگر کوئی مسلمان اُن کی شراب یا اُن کے خنزیر کو بھی تلف کردے تو اُس پر ضمان لازم آئے گا۔ دُرُّ المختار میں ہے :

وَیَضْمَنُ الْمُسْلِمُ قِیْمَۃَ خَمْرِہٖ وَخِنْزِیْرِہٖ اِذَا اَتْلَفَہٗ (جلد ۳، ص ۲۷۳)
"مسلمان اُس کے شراب اور اُس کے سُور کی قیمت ادا کرے گا اگر وہ اُسے تلف کردے۔"

(۴) عقدِ ذمّہ مسلمانوں کی جانب ابدی لزوم رکھتا ہے یعنی وہ عقد باندھنے کے بعد پھر توڑ دینے کے مختار نہیں ہیں لیکن دوسری جانب ذمّیوں کو اختیار ہے کہ جب تک چاہیں اُس پر قائم رہیں اور جب چاہیں، توڑ دیں۔ "بدائع الصنائع" میں ہے:

وَاَمَّا صِفَۃُ الْعَقْدِ فَھُوَ لَازِم" فِیْ حَقِّنَا حَتّٰی لَایَمْلِکُ الْمُسْلِمُوْنَ نَقْضَہٗ بِحَالٍ مِّنَ الْاَحْوَالِ وَاَمَّا فِیْ حَقِّھِمْ فَغَیْرُ لَازِم (ج ۷، ص ۱۱۲)

(۵) "ذمّی خواہ کیسے ہی بڑے جرم کا ارتکاب کرے، اُس کا ذمّہ نہیں ٹوٹتا حتی کہ جزیہ بند کردینا، مسلمان کو قتل کرنا یا کسی مسلمان عورت کی آبروریزی کرنا بھی اُس کے حق میں ناقضِ ذمّہ نہیں ہے۔ البتہ صرف دو صورتیں ایسی ہیں جن میں عقدِ ذمّہ باقی نہیں رہتا۔ ایک یہ کہ وہ دارالاسلام سے نکل کر دشمنوں سے جاملیں، دوسرے یہ کہ حکومتِ اسلامیہ کے خلاف علانیہ بغاوت کرکے فتنہ وفساد برپا کریں۔" (بدائع الصنائع، جلد ۷، ص ۱۱۳ ؛ فتح القدیر، ج ۴، ص ص ۳۸۱، ۳۸۲)

(۶) "ذمّیوں کے شخصی معاملات اُن کی شریعت (Personal Law) کے مطابق طے کئے جائیں گے، اسلامی قانون اُن پر نافذ نہیں کیا جائے گا۔ جن افعال کی حرمت اُن کے مذہب میں بھی ثابت ہے، اُن سے تو وہ ہر حال میں منع کئے جائیں گے البتہ جو افعال اُن کے ہاں جائز اور اسلام میں ممنوع ہیں، اُنہیں وہ اپنی بستیوں میں

آزادی کے ساتھ کرسکیں گے اور خالص اسلامی آبادیوں ☆ میں حکومتِ اسلامیہ کو اختیار ہوگا کہ اُنہیں آزادی دے یا نہ دے۔ ''بدائع الصنائع'' میں ہے :

وَلَایَمْنَعُوْنَ مِنْ اِظْهَارِ شَیْءٍ مِمَّا ذَكَرْنَامِنْ بَیْعِ الْخَمْرِوَالْخِنْزِیْرِ وَالصَّلِیْبِ وَضَرْبِ النَّاقُوْس فِیْ قَرْیَةٍ اَوْ مَوْضِعٍ لَیْسَ مِنْ اَمْصَارِ الْمُسْلِمِیْنَ وَلَوْكَانَ فِیْهِ عَدَد''كَثِیْر''لِاَهْلِ الْاِسْلَامِ وَاِنَّهَا یُكْرَهُ ذٰلِكَ فِیْ اَمْصَارِ الْمُسْلِمِیْنَ وَهِیَ الَّتِیْ یُقَامُ فِیْهَاالْجُمَعُ وَالْاَعْیَادُوَالْحُدُوْدُ-----وَاَمَّا اِظْهَارُ فِسْقٍ یَعْتَقِدُوْنَ حُرْمَتَه' كَالزِّنَا وَسَائِرِ الْفَوَاحِشِ الَّتِیْ حَرَام''فِیْ دِیْنِهِمْ فَاِنَّهُمْ یُمْنَعُوْنَ مِنْ ذٰلِكَ سَوَاء'' كَانُوْا فِیْ اَمْصَارِ الْمُسْلِمِیْنَ اَوْفِیْ اَمْصَارِهِمْ (ج ۷ ص ۱۱۳)

''جو بستیاں اور مقامات اَمصارِ مسلمین میں سے نہیں ہیں' اُن میں ذمّیوں کو شراب وخنزیر بیچنے اور صلیب نکالنے اور ناقوس بجانے سے نہیں روکا جائے گا خواہ وہاں مسلمانوں کی کتنی ہی کثیر تعداد آباد ہو۔ البتہ یہ افعال اَمصارِ مسلمین میں مکروہ ہیں جہاں جمعہ وعیدَین اور حدود قائم کی جاتی ہوں---رہا وہ فسق جس کی حرمت کے وہ بھی قائل ہیں مثلاً زنا اور دوسرے تمام فواحش جو اُن کے دین میں بھی حرام ہیں تو اس کے اظہار سے اُنہیں ہر حال میں روکا جائے گا خواہ اَمصارِ مسلمین میں ہوں یا خود اُن کے اپنے امصار میں۔''

''لیکن اَمصارِ مسلمین میں بھی اُنہیں صرف صلیبوں اور مورتیوں کے جلوس نکالنے اور علانیہ ناقوس بجاتے ہوئے بازاروں میں نکلنے کی ممانعت کی گئی ہے۔☆☆ اپنے قدیم معابد کے اندر رہ کر وہ تمام شعائر کا اظہار کرسکتے ہیں' حکومتِ اسلامیہ اس میں دخل دینے کی مجاز نہیں ہے۔''

(۸) ''اَمصارِ مسلمین میں ذمّیوں کے جو معابد پہلے سے موجود ہوں' اُن سے تعرض نہیں کیا جاسکتا۔ اگر وہ ٹوٹ جائیں تو اُنہیں اُسی جگہ دوبارہ بنالینے کا حق ہے۔ لیکن نئے معبد بنانے کا حق نہیں ہے۔'' (''بدائع الصنائع'' ج ۷' ص ۱۱۴) بحوالہ ''الجہاد فی الاسلام''۔۔سید مودودی' صفحہ ۲۸۳ تا ۲۹۱)

(۹) ''جو مقامات اَمصارِ مسلمین نہیں ہیں اُن میں ذمّیوں کو نئے معابد بنانے کی بھی عام اجازت ہے۔ اِسی طرح جو مقامات ''مِصر'' نہ رہے ہوں یعنی امام نے اُنہیں ترک کرکے اقامتِ جمعہ وعیدَین اور اقامتِ حدود کا سلسلہ بند کردیا ہو' اُن میں بھی نئے معابد کی تعمیر اور اظہارِ شعائرِ کفر جائز ہے۔'' (ایضاً)

(۱۰) ''فقہائے اسلام نے نادہندوں کے حق میں اتنی اجازت دی ہے کہ اُنہیں تادیباً قید بے مشقت

☆ ''خالص اسلامی آبادیوں'' سے مراد وہ مقامات ہیں جو اصطلاحِ شرع میں ''اَمصارُ المسلمین'' کہلاتے ہیں۔ اس لفظ کا اطلاق اُنہی مقامات پر ہوتا ہے جن کی زمین مسلمانوں کی مِلک ہو اور جن کو مسلمانوں نے اظہارِ شعائرِ اسلام کے لئے مخصوص کرلیا ہو۔

☆☆ اَمصارِ مسلمین میں یہ قیود عائد کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تصادم کے مواقع پیدا نہ ہوں۔ افسوس ہے کہ بعد کے لوگوں نے اس کا منشا کچھ اور سمجھا۔

کی سزا دی جاسکتی ہے۔ امام ابو یوسف نے کہا ہے:

وَلٰكِنْ يُرْفَقُ بِهِمْ وَيُحْبَسُوْنَ حَتّٰى يُؤَدُّوْا مَا عَلَيْهِمْ (کتاب الخراج' ص ۷۰)

''لیکن اُن کے ساتھ نرمی کی جائے گی' اُنہیں اُس وقت تک قید (بے مشقت) میں رکھا جائے گا جب تک وہ اپنے ذمہ واجبات ادا نہ کر دیں۔''

(۱۱) ''جو ذمّی محتاج اور فقیر ہو جائیں اُنہیں صرف جزیہ ہی معاف نہیں کیا جائے گا بلکہ اُن کے لئے اسلامی خزانہ سے وظائف بھی مقرر کئے جائیں گے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اہلِ حیرہ کو جو امان نامہ لکھ دیا تھا' اُس کا حوالہ گزشتہ ۲۷۳۹ پر دیا جاچکا ہے۔''

(۱۲) ''اگر کوئی ذمّی مرجائے اور اُس کے حساب میں جزیہ کا بقایا واجب الادا ہو تو وہ اُس کے ترکہ میں سے وصول نہیں کیا جائے گا اور نہ اُس کے ورثاء پر اُس کا بوجھ ڈالا جائے گا۔ امام ابو یوسف لکھتے ہیں:

اِنْ وَجَبَتْ عَلَيْهِ الْجِزْيَةُ فَمَاتَ قَبْلَ اَنْ تُؤْخَذَ مِنْهُ اَوْاُخِذَ بَعْضُهَاوَبَقِيَ الْبَعْضُ لَمْ يُؤْخَذْ بِذٰلِكَ وَرَثَتُه' وَلَمْ تُؤْخَذْ مِنْ تَرِكَتِهٖ (کتاب الخراج' صفحہ ۷۰)

(۱۳) ''مسلمان تاجروں کی طرح ذمّی تاجروں کے اموالِ تجارت پر بھی ٹیکس لیا جائے گا جبکہ اُن کا راس المال ۲۰۰ درہم تک پہنچ جائے یا وہ ۲۰ مثقال سونے کے مالک ہو جائیں (کتاب الخراج' صفحہ ۷۰)۔ اس میں شک نہیں کہ قدیم زمانے میں فقہاء نے ذمّی تاجر پر تجارتی محصول ۵% اور مسلمان تاجر پر اڑھائی فیصد تجویز کیا تھا لیکن یہ فعل قرآن و حدیث کی کسی نص پر مبنی نہ تھا بلکہ اجتہاد پر مبنی تھا اور وقتی مصالح اِسی کے متقاضی تھے۔ اُس زمانہ میں مسلمان زیادہ تر جہاد اور اسلامی سرحدوں کی حفاظت میں مشغول رہتے تھے اور تمام تجارت ذمّیوں کے ہاتھوں میں آ گئی تھی' اس لئے مسلمان تاجروں کی ہمت افزائی اور اُن کی تجارت کے تحفظ کے لئے اُن پر ٹیکس کم کر دیا گیا۔''

(۱۴) ''ذمّی فوجی خدمت سے مستثنیٰ ہیں اور دشمن سے ملک کی حفاظت کو تنہا مسلمانوں کے فرائض میں داخل کیا گیا ہے۔ چونکہ اُن سے جزیہ اِسی حفاظت کے معاوضہ میں وصول کیا جاتا ہے' اس لئے اسلام نہ تو اُنہیں فوجی خدمت کی تکلیف دینا اور نہ ہی اُن کی حفاظت سے عاجز ہونے کی صورت میں جزیہ وصول کرنا جائز سمجھتا ہے۔ اگر مسلمان اُن کی حفاظت نہ کر سکیں تو اُنہیں ذمّیوں کے اموالِ جزیہ سے فائدہ اٹھانے کا کوئی حق باقی نہیں رہتا۔ جنگِ یرموک کے موقع پر رومیوں نے مسلمانوں کے مقابلہ پر ایک زبردست فوج جمع کی اور مسلمانوں کو شام کے تمام مفتوح علاقے چھوڑ کر ایک مرکز پر جمع ہونے کی ضرورت لاحق ہوئی تو حضرت ابو عبیدہ ابن الجراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے اُمراء کو لکھا کہ جو کچھ جزیہ و خراج تم نے ذمّیوں سے وصول کیا ہے' اُنہیں واپس کر دو اور اُن سے کہو کہ ''اب ہم تمہاری حفاظت سے عاجز ہیں' اس لئے ہم نے جو مال تمہاری حفاظت میں وصول کیا تھا' اُسے واپس کرتے

ہیں'' (کتاب الخراج: صفحہ ۱۱۱)۔ اِس حکم کے مطابق تمام لشکروں کے اُمراء نے جمع شدہ رقم واپس کر دی۔'' ☆

''ذمّیوں کے لباس کا مسئلہ: اِس مسئلہ پر مخالفین کو بہت کچھ اعتراض کی گنجائش مل گئی ہے مگر افسوس ہے کہ ابتدا میں اس کی جو حیثیت تھی' اُسے بعد میں غلط صورت دے دی گئی اور اسی سے لوگوں کو یہ خیال کرنے کا موقع مل گیا کہ اسلام نے ذمّیوں کی تحقیر و تذلیل کے لئے ایک مخصوص لباس اور ایک مخصوص وضع معاشرت مقرر کر رکھی ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے زمانہ کے بعض معاہدات میں اِس قسم کی شرط موجود ہے کہ اہل الذمہ ایک خاص قسم کا لباس نہ پہنیں اور مسلمانوں سے مشابہت اختیار نہ کریں مثلاً حیرہ کے معاہدہ میں یہ الفاظ ملتے ہیں:

وَلَهُمْ كُلُّ مَالَبِسُوْا مِنَ الزِّيِّ اِلَّا زِيَّ الْحَرْبِ مِنْ غَيْرِ اَنْ يَّتَشَبَّهُوْا بِالْمُسْلِمِيْنَ (کتاب الخراج' ص ۸۵)
''اور اُنہیں حق ہوگا کہ جیسا لباس چاہیں پہنیں مگر فوجی لباس نہ پہنیں اور مسلمانوں سے مشابہت اختیار نہ کریں۔''

اِسی طرح دمشق کے معاہدہ میں جس کی شرائط خود عیسائیوں کی طرف سے پیش کی گئی تھیں یہ الفاظ موجود ہیں:
وَلَا نَتَشَبَّهُ بِهِمْ فِيْ شَيْءٍ مِنْ مَّلَابِسِهِمْ فِيْ قَلَنْسُوَةٍ وَّلَا عَمَامَةٍ وَلَا فَرْقِ شَعْرٍ (ابن کثیر' ج ۴' ص ۲۷۵)
''ہم مسلمانوں سے اُن کے لباس میں کسی قسم کی مشابہت نہ اختیار کریں گے' نہ ٹوپی میں' نہ پگڑی میں' نہ جوتیوں میں اور نہ مانگ نکالنے میں۔''

''امام ابو یوسف نے بھی اپنی ''کتاب الخراج'' کے صفحات ۷۲' ۷۳ میں اس قسم کے احکام بہ تفصیل بیان کئے ہیں کہ ذمّیوں کو مسلمانوں کے ساتھ وضع قطع میں مشابہت اختیار نہ کرنی چاہئے۔''

''یہ سب احکام بلاشبہ ہمارے ائمہ سے منقول ہیں لیکن ان کا مقصد دراصل تحقیر نہیں ہے بلکہ مختلف ملتوں کے لوگوں کو باہم خلط ملط ہونے سے روکنا ہے ☆☆۔ چنانچہ جس طرح ذمّیوں کو مسلمانوں کے ساتھ تشبّہ اختیار کرنے سے روکا گیا ہے' اُسی طرح مسلمانوں کو بھی ذمّیوں کے مشابہ بن کر رہنے سے منع کر دیا گیا ہے۔ لباس کے تشابہ میں جو مفاسد پوشیدہ ہیں' اُن سے اسلام غافل نہیں ہے۔ بالخصوص محکوم قوموں میں اکثر یہ عیب پیدا ہو جایا کرتا ہے کہ وہ اپنے قومی لباس اور اپنی قومی معاشرت کو ذلیل سمجھنے لگتے ہیں اور حاکم قوم کا لباس اور طرزِ معاشرت اختیار

☆ بلاذری نے لکھا ہے کہ جب مسلمانوں نے حمص میں جزیہ کی رقم واپس کی تو وہاں کے باشندوں نے کہا کہ ''تمہاری حکومت کی انصاف پسندی ہمیں اُس ظلم و ستم کے مقابلہ میں زیادہ محبوب ہے جس میں ہم مبتلا تھے۔ اب ہم ہرقل کے عامل کو اپنے شہر میں ہرگز نہ گھسنے دیں گے تاوقتیکہ لڑ کر مغلوب نہ ہو جائیں۔'' (''فتوح البلدان'' ص ۱۳۷ طبع یورپ بحوالہ ''الجہاد فی الاسلام۔۔ سید مودودیؒ صفحہ ۲۹۶)

☆☆ بدقسمتی سے فقہائے متاخرین نے بھی اس کی غرض تحقیر ہی سمجھی ہے اور اسی لئے اپنی کتابوں میں لکھ دیا ہے کہ هٰذَا الْاِظْهَارُ آثَارُ الذِّلَّةِ عَلَيْهِمْ لیکن ائمہ سلف کا کوئی قول منقول نہیں ہے۔ خود حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو اِن احکام کے واضع ہیں' نے کبھی یہ نہیں فرمایا کہ تشبہ سے منع کرنے کا مقصد ذمّیوں کو ذلیل کرنا ہے۔

کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ یہ غلامانہ ذہنیت آج بھی دنیا کی محکوم قوموں میں موجود ہے۔ خود ہندوستان میں ہم دیکھتے ہیں کہ بے شمار ہندی نژاد حضرات انگریزی لباس بڑے شوق سے پہنتے ہیں اور اُسے پہن کر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ گویا وہ ترقی کے کسی بہت ہی اعلیٰ مرتبہ پر پہنچ گئے ہیں حالانکہ کسی انگریز نے کبھی ہندوستانی لباس نہیں پہنا اور اگر خالص انگریزی سوسائٹیوں میں کبھی پہنا بھی ہے تو تفاخر کے لئے نہیں بلکہ تفنّن اور مسخرہ پن کے لئے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ انگریز کے ہند و پاکستان سے چلے جانے کے بعد جو انگریز پاکستان میں نوکر کی حیثیت سے رہ گئے ہیں' انہوں نے مسندِ حکمرانی سے اُترنے کے بعد بھی کبھی یہ محسوس نہ کیا کہ اب یہاں اُنہیں عزت حاصل کرنے کے لئے پاکستانی لباس پہننا چاہئے۔''

''نفسیاتِ محکومیت کے اِس نکتہ کو ائمہ اسلام خوب سمجھتے تھے' اِس لئے اُنہوں نے اہل الذمہ کو تشبّہ بالمسلمین سے منع کر کے اُن کی تذلیل وتحقیر نہیں کی بلکہ اُن کی قومی عزت وشرافت کو برقرار رکھا۔ ممکن ہے کہ اس قسم کے قوانین بعض لوگوں کی نگاہ میں موجبِ حقارت ہوں لیکن ہمارے نزدیک اس میں کوئی تحقیر نہیں ہے بلکہ ہم بہت خوش ہوتے اگر ہمارے انگریز حکمران بھی ہمیں یورپین لباس اور طرزِ معاشرت اختیار کرنے سے حکماً منع کر دیتے۔''

''بڑی غلط فہمی اُن احکام سے پیدا ہوئی ہے جن میں کہا گیا ہے کہ ذمّی زنار باندھیں' دوہرے تسمے کا جوتا پہنیں' اونچی باڑھ کی ٹوپی پہنیں اور اُن کی زین کے آگے گول لکڑی ہو۔ لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ یہ احکام ذمّیوں کے حق میں دائمی ہیں اور اُن کے لئے یہ وضع اسلام نے مخصوص کر دی ہے حالانکہ دراصل یہ احکام اُصولی نہیں بلکہ فروعی ہیں۔ اصل حکم تو یہ ہے کہ ''ذمّی'' اپنا قومی لباس پہنیں اور مسلمانوں کے ساتھ مشابہت اختیار نہ کریں۔ اب اِس اصل سے فقہائے عصر نے فروع نکال لئے اور اُسی لباس و وضع کو جو اُن کے زمانہ میں عموماً عجم کے مجوسیوں اور شام کے عیسائیوں میں رائج تھی' اُن کے لئے لازم کر دیا۔ اِس سے ہرگز یہ مقصود نہیں ہے کہ ہر زمانہ اور ہر ملک کے ذمّی زنار باندھیں اور دوہرے تسمہ کا جوتا پہنیں۔ یہ احکام تو اُسی عہد کے لئے تھے۔ آج کل کے فقہاء اصل حکم یعنی منع تشبُّہ بالمسلمین سے ایسے ہی دوسرے جزئی احکام مُستنبط کر سکتے ہیں۔'' (''الجہاد فی الاسلام'': ص ص ۲۹۸۔۳۰۱)

''**چند مستثنیات**: جہاد اور متعلقاتِ جہاد کے متعلق اسلام نے جو قواعد اور حدود و قیود مقرر کئے ہیں' اُنہیں صفحاتِ بالا میں تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔ مگر رسولِ اکرم ﷺ اور خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اَدوارِ مبارک میں بعض اوقات ایسے واقعات بھی پیش آئے ہیں جو بظاہر ان قوانین سے مختلف معلوم ہوتے ہیں اور اُن سے ایک ناواقف اِس شبہ میں پڑ سکتا ہے کہ شاید اسلام کے اصل احکام وہ نہیں ہیں جو بیان کئے گئے ہیں' یا اُس کے احکام میں اختلاف اور تضاد ہے' یا رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کا عمل (معاذ اللہ) اسلامی قوانین کے خلاف تھا' اس لئے اس باب کو ختم کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اِن مستثنیٰ واقعات کی تشریح بھی کر دی جائے۔''

بنو نضیر کا اِخراج: یہ یہودیوں کا ایک قبیلہ تھا جو صدیوں سے یثرب میں آباد تھا۔ ہجرت کے بعد آنحضرت ﷺ کا اُن سے معاہدہ ہوا اور جنگِ بدر کے بعد آپ علیہ السلام نے اُنہیں مدینہ سے نکال دیا۔ مخالفین

اِس واقعہ کو یہ معنی پہناتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے بنی نُضیر کے ساتھ (معاذ اللہ) مکر کیا یعنی جب وہ کمزور تھے تو اُن سے معاہدہ کرلیا اور جب طاقتور ہو گئے تو عہد توڑ کر اُنہیں جلاوطن کر دیا۔ لیکن یہ واقعہ کی محض ایک سادہ صورت فرض کر لینے کا نتیجہ ہے ورنہ اگر اس کی تمام تفصیلات پر نظر کی جائے تو صورتِ واقعہ بالکل برعکس نظر آئے گی۔ عہد شکنی کے مجرم رسول اللہ ﷺ ہرگز نہیں بلکہ خود بنی نُضیر تھے اور اُن کے خلاف آنحضرت ﷺ کی جنگی کارروائی ظلم نہیں بلکہ عین حق ثابت ہے۔''

''واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جب ہجرتِ مدینہ فرمائی تو آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہودیوں کے دوسرے قبائل کی طرح بنونُضیر سے بھی ایک معاہدہ کیا☆ جس کی بنیادی شرط یہ تھی کہ فریقین ایک دوسرے کے خلاف کسی قسم کی معاندانہ کارروائی نہ کریں گے اور نہ ایک دوسرے کے دشمنوں کی امداد کریں گے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی (شارح صحیح بخاری) رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ:

وَادَعَهُمْ عَلٰى اَنْ لَّا يُحَارِبُوْهُ وَلَا يُمَالِئُوْا عَلَيْهِ عَدُوَّهٗ' (فتح الباری' ج ۷' ص ۱۳۱)

''آپ نے اُن سے اِس بات پر مصالحت کی تھی کہ نہ وہ آپ سے جنگ کریں گے اور نہ آپ کے دشمنوں کی مدد کریں گے۔''

''اِس معاہدہ کے بعد آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام اُن کی طرف سے مطمئن ہو گئے تھے اور اُن سے دوستانہ میل جول شروع کر دیا تھا لیکن شرائطِ معاہدہ کے بالکل خلاف وہ کفارِ قریش سے ساز باز کرتے رہے اور چپکے چپکے اُنہیں مسلمانوں کے متعلق خفیہ اطلاعات فراہم کرنے لگے۔ موسیٰ بن عُقبہ نے مغازی میں لکھا ہے:

كَانَتْ نَضِيْرُ قَدْ دَسُّوْا اِلٰى قُرَيْشٍ وَحَضَرَهُمْ عَلٰى قِتَالِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَدَلُّوْهُمْ عَلَى الْعَوْرَةِ

''بنی نُضیر قریش سے سازشیں کرتے تھے' اُنہیں رسول اللہ ﷺ کے خلاف جنگ پر اُبھارتے تھے اور اُنہیں خفیہ خبریں دیتے تھے۔'' (فتح الباری' ج ۷' ص ۲۳۳)

''پھر اُنہوں نے اِسی پر بس نہ کی بلکہ آنحضرت ﷺ کو قتل کرنے کی بھی متعدد مرتبہ کوشش کی جس کی تفصیل ابو داوٗد' باب فی خبر النضیر' فتح الباری' ج ۷' ص ۲۳۳' طبری' ج ۳' ص ۳۷ اور فتوح البلدان کے صفحہ ۲۴ میں موجود ہے۔ اب پیمانہِ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ مسلسل بدعہدیوں اور سازشوں کے باعث اندیشہ تھا کہ کہیں یہ آستین کے سانپ کسی بیرونی حملہ کے وقت مدینہ کی سلامتی کو خطرہ میں نہ ڈال دیں۔ یہی نہیں بلکہ یہاں تک اندیشہ تھا کہ کہیں یہ لوگ خفیہ طور پر آنحضرت ﷺ کو شہید نہ کر دیں۔ مسلمان اُن سے ایسے خوف زدہ ہو گئے تھے کہ ایک مرتبہ جب ایک صحابی کا انتقال ہونے لگا تو اُنہوں نے اپنے عزیزوں کو وصیت کی کہ میرے مرنے کی اطلاع رسول اللہ ﷺ کو رات کے وقت نہ دینا' کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ جنازہ کی شرکت کے لئے نکلیں اور کوئی یہودی آپ کو شہید کر دے (اُسد الغابہ' ج ۳' ص ۵۷' ذکر طلحہ بن بَراء)۔ ایسی حالت میں اِن عہد شکن دشمنوں سے مزید چشم پوشی نہیں کی جا سکتی تھی مگر آنحضرت ﷺ نے پھر بھی اُن سے رعایت کی اور دفعتہً اُن پر حملہ کر دینے کی بجائے محمد بن مُسلمہ کے

☆ ابنِ ہشام نے ''سیرت الرسول ﷺ'' میں اس معاہدہ کو بہ تفصیل نقل کیا ہے۔

ذریعے اُنہیں یہ اُلٹی میٹم دے بھیجا کہ:

''تم نے میرے ساتھ دھوکہ کیا ہے' لہٰذا تم یا تو خود دس دن کے اندر مدینہ خالی کردو' ورنہ میں مجبوراً تم سے جنگ کروں گا۔''

''دوسری طرف سردارِ منافقین عبداللہ بن اُبی نے اُنہیں کہلا بھیجا کہ تم ہرگز نہ نکلنا' ہم تمہاری مدد کریں گے۔ چنانچہ اُنہوں نے آنحضرت ﷺ کے اُلٹی میٹم کا جواب یہ دیا کہ:

اِنَّا لَا نَتْرُكُ دَارَنَا فَاصْنَعْ مَابَدَا لَكَ (طبری' ج ۳' ص ۳۸؛ فتح الباری' ج ۷' ص ۲۳۳' فتوح البلدان' ص ۲۴)

''ہم اپنا وطن نہ چھوڑیں گے' تمہارا جو جی چاہے کرلو۔''

''اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اُن کے خلاف جنگ کرنے میں حق بجانب نہ تھے۔ آپ نے اِتمامِ حُجت کا پورا پورا حق ادا کر دیا تھا اور معاہدہ کی صریح خلاف ورزی کے مقابلہ میں جو زیادہ سے زیادہ نرمی کی جا سکتی تھی' وہ بھی کر چکے تھے۔ اب مجبوراً آپ جنگ کے لئے نکلے اور اُن کا محاصرہ کرلیا۔ قبل اِس کے کہ خونریزی کی نوبت آتی' صرف محاصرہ ہی کی شدّت نے بنی نُضیر کو بدحواس کر دیا۔ اُنہوں نے خود ہی تجویز پیش کی کہ آپ ہمارے خون معاف کر دیں' تو ہم مدینہ سے نکل کر اَذرِعات (ملکِ شام) چلے جائیں گے اور جو کچھ مال ہمارے اونٹ اُٹھا سکیں گے وہ تو ہم لے جائیں گے اور باقی سب کچھ یہیں چھوڑ جائیں گے۔ اِس شرط کو آنجناب ﷺ نے منظور فرمالیا اور بغیر کسی ادنیٰ ضرر کے بنونُضیر اسلامی علاقہ سے گزر کر شام کی طرف چلے گئے (طبری' ج ۳' ص ۳۸)۔ اس مصالحت کے متعلق بلاذری نے لکھا ہے:

ثُمَّ صَالَحُوْهُ عَلٰى اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْ بَلَدِهٖ وَلَهُمْ مَاحَمَلَتِ الْاِبِلُ اِلَّا الْحَلْقَةَ وَالْاٰلَةَ (فتوح البلدان' ص ۲۴)

''پھر اُنہوں نے اِس شرط پر آپ سے صلح کر لی کہ وہ آپ (علیہ السلام) کے شہر سے نکل جائیں گے اور سوائے اسلحہ اور زِرہوں کے باقی جو مال اُن کے اونٹ اُٹھا سکیں گے' وہ اُن کا ہوگا۔''

حافظ ابن حجر عسقلانی (شارح صحیح بخاری) رحمۃ اللہ علیہ نے ''فتح الباری'' کی جلد ۷' صفحہ ۲۳۲ میں لکھا:

وَاسْاَلُوْا اَنْ يَّحْمِلُوْا عَنْ اَرْضِهِمْ عَلٰى اَنَّ لَهُمْ مَا حَمَلَتِ الْاِبِلُ فَصُوْلِحُوْا عَلٰى ذٰلِكَ

''اُنہوں نے درخواست کی کہ ہمیں اپنے علاقہ سے نکل جانے دیا جائے اور جو کچھ ہمارے اونٹ اُٹھا سکیں وہ مال ہمارا ہو۔ چنانچہ اِسی پر اُن سے صلح ہوگئی۔''

اور قرآن مجید نے سورۃ الحشر کی ابتدائی آیات میں اُن کی رُسوا کن شکست کا نقشہ یوں باندھا ہے:

هُوَ الَّذِیْٓ اَخْرَجَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِیَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ یَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَیْثُ لَمْ یَحْتَسِبُوْا وَقَذَفَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ یُخْرِبُوْنَ بُیُوْتَهُمْ بِاَیْدِیْهِمْ وَاَیْدِی الْمُؤْمِنِیْنَ فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ ○

وَلَوْلَا اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَاءَ لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ O ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَاۗقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَاۗقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ O (اَلْحَشر: ۲-۴)

''وہ وہی ہے جس نے کفار اہلِ کتاب کو گھروں سے پہلی ہی بار ☆ اکٹھا کر کے نکال دیا۔ (اے مسلمانو!) تمہارا گمان بھی نہ تھا کہ وہ نکلیں گے اور خود اُن کا خیال یہ تھا کہ اُن کے قلعے اُنہیں اللہ (کی گرفت سے) بچالیں گے' سو اللہ (کا عذاب) اُنہیں ایسی جگہ سے پہنچا کہ اُنہیں خیال بھی نہ تھا اور اللہ نے اُن کے دلوں میں رُعب ڈال دیا تو وہ اپنے گھروں کو اپنے ہاتھوں سے اور مسلمانوں کے ہاتھوں سے بھی اجاڑ رہے تھے # سوائے اہلِ دانش! عبرت حاصل کرو۔ اور اگر اللہ نے اُن کے حق میں جلاوطنی نہ لکھ دی ہوتی تو وہ دنیا ہی میں اُنہیں (قتل کا) عذاب دیتا اور آخرت میں اُن کے لئے عذابِ دوزخ ہی ہے۔ یہ سب اِسی وجہ سے ہے کہ اُنہوں نے اللہ اور اُس کے رسول کی مخالفت کی اور جو کوئی اللہ کی مخالفت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ (اُسے) سزا دینے میں بہت سخت ہے۔'' (۲-۴ : ۵۹)

وَلَوْلَا اَنْ--- الخ میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اچھا ہوا کہ وہ جلاوطنی پر آمادہ ہو گئے۔ اگر وہ جنگ کرتے تو اُن کا انجام بڑا ہولناک ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کے شیروں کی تلواریں جب بے نیام ہوتیں تو اِن لومڑیوں میں سے کوئی بھی جان بچا کر نہ جا سکتا' سب تہ تیغ کر دئے جاتے' اُن کا ساز و سامان' زیورات و جواہرات سب اُن سے چھن جاتے۔ اُنہوں نے جلاوطنی قبول کر کے اپنے آپ کو بچالیا لیکن آخرت میں جہنم کا ایندھن تو اُنہیں بننا ہی پڑے گا۔''

رحمتِ مجسّم آقائے نامدار علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اسلام کے اِن ازلی دشمنوں پر بہ اِذنِ الٰہی یہ احسانِ عظیم تھا کہ اُنہیں بہ امن و امان اپنے ساز و سامان کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی اور مغلوب دشمن کی التجائے رحم کو آپ نے رد نہیں فرمایا۔ لیکن اس احسان کا بدلہ آنجناب ﷺ کو بہت ہی تلخ ملا۔ جن دشمنوں کو آپ نے قابو میں آ جانے کے بعد محض رحم کھا کر چھوڑ دیا تھا' اُنہوں نے مدینہ سے نکل کر تمام عرب میں آپ کے خلاف سازش کا جال پھیلا دیا اور دو ہی سال بعد وہ دس بارہ ہزار کا لشکر جرّار اکٹھا کر کے مدینہ پر حملہ آور ہوئے۔ آپ کو اُن کے جذبۂ عناد کا حال خوب معلوم تھا اور آپ (علیہ السلام) یہ بھی جانتے تھے کہ یہ فتنہ پرداز چین سے نہ بیٹھیں گے مگر اس کے باوجود جب اُنہوں نے جاں بخشی کی درخواست کی تو آپ نے اُسے قبول فرمالیا۔

بنو قُریظہ کا واقعہ: بنو قُریظہ کے قتلِ عام کو اس سے زیادہ اعتراضات کا مورد بنایا گیا ہے۔ یہ لوگ بھی

☆ یعنی اس سے پہلے یہ مصیبت اُنہیں پیش نہیں آئی تھی۔ لفظ میں ایک لطیف اشارہ یہ ہے کہ مدینہ سے اُن کی یہ پہلی جلاوطنی ہے اور یہ جلاوطنی اُنہیں دوبارہ بھی جھیلنی پڑے گی۔ چنانچہ سیدّنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں سارے جزیرۂ عرب کو یہود سے خالی کرالیا۔ اُن کا آخری حشر قیامت کے دن ہوگا۔

اُن کے مکانوں میں جو قیمتی لکڑی لگی ہوئی تھی' اُسے لے جانے کے لئے اُنہوں نے مکانوں کی چھتیں اُدھیڑ دیں' کواڑ' کھڑکیاں' الماریاں غرضیکہ جو چیز وہ اُکھیڑ کر لے جا سکتے تھے' وہ لے گئے۔ اس طرح اُنہوں نے اپنے ہاتھوں سے اپنے شیش محلوں کو برباد کر دیا۔ جب وہ اپنے آراستہ و پیراستہ شبستانوں کو خود کھنڈر بنا رہے ہوں گے تو اُن کے دلوں پر کیا بیت رہی ہوگی اور اُن کے چلے جانے کے بعد جب مسلمان وہاں پہنچے تو باقی ماندہ کھنڈرات کو اُنہوں نے منہدم کر دیا ہوگا تا کہ اپنے بسنے کے لئے نئے مکانات تعمیر کر سکیں۔

مذہبًا یہودی تھے اور بنونضیر کی طرح مدینہ میں آباد تھے۔ آنحضرت ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو آپ نے ان سے بھی دوسرے یہود قبائل کی طرح وہی معاہدہ کیا جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ پھر جب بنونضیر سے جنگ ہوئی تو آپ نے دوبارہ بنوقُریظہ کو معاہدہ کی دعوت دی اور قدیم معاہدہ کی تجدید کر لی (ابوداؤد: کتاب الخراج والفئی والامارۃ، باب: فی خبر النضیر)۔ مگر جب غزوہ احزاب میں اُنہوں نے کھلم کھلا دشمنوں کا ساتھ دیا تو آپ نے اُدھر سے فارغ ہو کر اُن پر حملہ کیا، اُن کے بالغ مَردوں کو قتل کر دیا، بچوں اور عورتوں کو غلام بنا لیا اور اُن کا مال مسلمانوں میں تقسیم کر دیا۔ اس واقعہ کی بناء پر مخالفین نے آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر بدعہدی اور سنگدلی کے شدید الزامات لگائے ہیں مگر جب تفصیلات پر نظر ڈالی جاتی ہے تو اس کی حقیقت بھی مخالفین کے زعم و بیان سے مختلف نظر آتی ہے۔

''جیسا کہ بیان ہوا کہ بنوقُریظہ سے دو مرتبہ معاہدہ ہوا تھا۔ ایک عام معاہدہ جو دوسرے یہودی قبائل کی معیت میں ہوا۔ دوسرا خاص معاہدہ جو بنی نضیر سے جنگ کے موقع پر ہوا۔ اِن دو معاہدات کے بعد بنوقریظہ کا فرض تھا کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے متبعین کے خلاف کسی قسم کی معاندانہ کارروائی میں حصہ نہ لیتے لیکن جب غزوہ احزاب میں بنونضیر کی تحریص پر عرب کے بڑے بڑے قبائل اسلام کو مٹانے کے لئے متفق ہو کر مدینہ پر حملہ آور ہوئے تو بنوقُریظہ نے حُیَی بن اخطب نضری کے بھڑکانے سے علانیہ معاہدہ توڑ دیا اور جنگ میں شامل ہو گئے (اُسد الغابہ، ج ۲، ص ۶۷؛ فتح الباری، ج ۷، ص ۲۸۰)۔ آنحضرت ﷺ کو اُن کے نقضِ عہد کی خبر ہوئی تو آپ نے سعد بن مُعاذ اور سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہما کو اُن کے پاس بھیجا اور وفائے عہد کی نصیحت کی مگر اُنہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ ہمارا تمہارا کوئی معاہدہ نہیں ہے۔''

''اُن کے اِس طرح عین وقت پر عہد توڑ دینے اور جنگ میں شریک ہو جانے سے مدینہ دو طرف سے محصور ہو گیا۔ ایک طرف قریش اور غطفان وغیرہ کی تو دوسری طرف بنوقریظہ کی فوجیں تھیں۔ سب سے زیادہ خطرہ یہ تھا کہ مسلمانوں نے جس قلعہ میں اپنی عورتوں کو حفاظت کے لئے بھیج دیا تھا، وہ بنوقُریظہ کی عین زد میں تھا اور یہ لوگ اُس کا محاصرہ کرنے کی دھمکی دے رہے تھے۔ اِس صورتِ حال نے مسلمانوں کو انتہائی دہشت و پریشانی میں مبتلا کر دیا حتی کہ آنحضرت ﷺ نے مجبور ہو کر یہ تہیہ کر لیا کہ مدینہ کی پیداوار کا تیسرا حصہ دے کر حملہ آوروں سے مصالحت کر لیں (اُسد الغابہ، ج ۲، ص ۶۸؛ فتح الباری، ج ۷، ص ۲۸۱)۔ قرآن مجید میں اِس پریشانی کی کیفیت سورۃ الاحزاب کی آیت دہم میں کی گئی ہے جس کی تشریح کرتے ہوئے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ یوں بیان کرتے ہیں:

''اُس رات ہماری پریشانی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ ایک طرف ابوسفیان اور اُس کے ساتھی زبردست فوجیں لئے ہوئے اوپر سے آئے اور دوسری طرف بنوقریظہ نیچے سے بڑھے اور اُن کے حملہ سے ہمارے بال بچوں کی سلامتی بھی خطرہ میں پڑ گئی۔'' (فتح الباری، ج ۲، ص ۲۸۱؛ ابن کثیر، ج ۸، ص ۵۲)

اس شدید اور خطرناک بدعہدی کے بعد اُن لوگوں کے ساتھ کسی قسم کی رعایت کرنا خودکشی کرنا تھا۔ چنانچہ جب بیرونی حملہ کا خوف جاتا رہا اور مصیبت کے بادل چھٹ گئے تو آنحضرت ﷺ نے فوراً بنوقریظہ کا محاصرہ کر لیا

پندرہ یا پچیس دن تک اسلامی فوجیں اُن کے قلعہ کے گرد محاصرہ کیے ہوئے پڑی رہیں۔ جب اُنہوں نے دیکھا کہ قضا کا پیغام ٹل نہیں سکتا تو آپ علیہ السلام کی خدمت میں کہلا بھیجا کہ سعد بن مُعاذ رضی اللہ عنہ ہمارے حق میں جو فیصلہ کریں وہ ہمیں منظور ہے☆ (صحیح مسلم: کتاب الجھاد' باب: جواز قتال من نقض العهد؛ فتوح البلدان بلاذری' ص ۲۹)۔ سعد بن مُعاذ بالاتفاق حَکم بنائے گئے اور اُنہوں نے یہ فیصلہ دیا کہ بنوقُریظہ کے بالغ مرد قتل کیے جائیں' عورتوں اور بچوں کو لونڈی غلام بنایا جائے اور اُن کا مال مسلمانوں میں بانٹ دیا جائے۔ چنانچہ یہی فیصلہ نافذ کیا گیا اور اس کے مطابق اُن کے مرد قتل کر دیے گئے۔

اب جہاں تک بدعہدی کے الزام کا تعلق ہے وہ تو صاف ہو چکا اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آنحضرت ﷺ نے اُن پر حملہ کر کے عہد شکنی کی۔ لیکن دوسرا الزام یہ باقی رہ جاتا ہے کہ اُن سے انتقام بہت سخت لیا گیا۔ مگر اُسے سختی اور سنگدلی سے تعبیر کرنے سے پہلے چند امور کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا ضروری ہے:

(۱) بنوقریظہ اور اُن کے ہم قوم بنونضیر کی بدعہدیوں کو دیکھ کر یہ ناممکن تھا کہ اُن سے از سرِ نو کوئی معاہدہ کیا جاتا اور یہ توقع قائم کی جا سکتی کہ پھر کسی نازک موقع پر وہ اُسے نہ توڑ دیں گے۔

(۲) اُن کے قلعے مدینہ سے بالکل متصل تھے اور ایسی صریح غداری کے بعد اُن کے اِتنے قریب رہنے سے ہر وقت خطرہ تھا کہ کب کسی دشمن کو عین مسلمانوں کے گھروں پر چڑھا لائیں۔

(۳) اُنہیں جلاوطن بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ اُن سے پہلے اُن کے بھائی بنونضیر کو جلاوطن کرنے کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ اُنہوں نے مسلمانوں سے دُور بیٹھ کر اطمینان کے ساتھ جنگ کی تیاریاں کیں اور فوجیں جمع کر کے مدینہ پر چڑھ آئے۔

(۴) اِن باتوں کے باوجود آنحضرت ﷺ نے خود اُن کے لئے کوئی سزا تجویز نہیں کی بلکہ اُن کی مرضی اور اتفاق سے ایک ایسے شخص کو حَکم بنایا جو خود اُن کا پشتینی حلیف تھا۔

(۵) ثالثی اور پنچایت کے متعلق یہ تمام دنیا کا مسلمہ قانون ہے کہ جب فریقین کے اتفاق سے کوئی شخص حَکم' ثالث یا پنچ بنایا جائے تو جو فیصلہ وہ کر دے' اُس کی پابندی فریقین پر لازم ہوتی ہے۔

(۶) ''سعد بن مُعاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو کچھ فیصلہ کیا وہ توراۃ کے احکام کے مطابق تھا (استثناء: باب: ۲' آیت ۱-۱۴)' اِسی لئے کسی یہودی نے اس کے خلاف ایک لفظ تک نہ کہا۔

(۷) اُن میں صرف وہ مرد قتل کیے گئے جو ہتھیار اُٹھانے کے قابل تھے کیونکہ اُنہی سے جنگ و غدر کا اندیشہ تھا۔ باقی رہیں عورتیں اور بچے تو اُن کے سردھروں کے قتل ہو جانے کے بعد اُن کی پرورش کا بجز اس کے اور کیا وسیلہ

☆زمانہ جاہلیت میں حضرت سعد کے قبیلہ اور بنی قُریظہ کے درمیان حِلف کا تعلق تھا اور قدیم عرب میں حِلف کا تعلق خونی رشتوں سے کچھ کم مضبوط نہ تھا۔

ہوسکتا تھا کہ مسلمان خود اُن کے کفیل بنتے۔''

''اِن وجوہ کو ذہن نشین کر لینے کے بعد یہ تسلیم کرنے میں کوئی روک باقی نہیں رہ جاتی کہ بنوقریظہ کے ساتھ جوسلوک کیا گیا' وہ عین انصاف کے مطابق تھا اوراس کے سوا اُن سے کوئی اور سلوک نہیں کیا جاسکتا تھا۔''

''**کعب بن اشرف کا قتل**: عہدِ رسالت کا ایک اور واقعہ جس پر سخت اعتراضات کئے جاتے ہیں' یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے ایک دشمن کعب بن اشرف کو خفیہ طریقہ سے قتل کرادیا۔مخالفین کا اعتراض یہ ہے کہ یہ وہی جاہلیت کا ''فتک'' تھا اور بزدلی کے علاوہ آدابِ جنگ کے بھی خلاف تھا۔لیکن اِس واقعہ کے بھی چند مخصوص اسباب تھے جنہیں معترضین نے نظرانداز کردیا ہے۔''

''یہ شخص یہود بنی نُضیر میں سے تھا اور اپنی قوم کے ساتھ اُس معاہدہ میں شریک تھا جو ہجرت کے بعد رسول اللہ ﷺ کے اور اُن کے درمیان ہوا تھا مگر اُسے اسلام اور خاص کر داعیِ اسلام سے سخت عداوت تھی۔آپ علیہ السلام کی شان میں وہ ہجو یہ اشعار کہتا۔☆ وہ مسلمان عورتوں کے متعلق نہایت گندے عشقیہ قصائد لکھتا اور کفارِ قریش کو آنحضرت ﷺ کے خلاف اشتعال دلاتا تھا#۔ جب جنگِ بدر میں آنحضرت ﷺ کو فتح ہوئی تو اِسے سخت رنج ہوا اور شدّتِ غضب میں پکار اٹھا کہ:

وَاللّٰہِ لَئِنْ کَانَ مُحَمَّدٌ" أَصَابَ ھٰؤُلَاءِ الْقَوْمِ لَبَطْنِ الْاَرْضِ خَیْرٌ" لَّنَا مِنْ ظَھْرِھَا

''خدا کی قسم! اگر محمد (ﷺ) نے قریش کو واقعی شکست دے دی ہے تو زمین کا پیٹ ہمارے لئے اُس کی پیٹھ سے زیادہ بہتر ہے۔''

پھر وہ مدینہ سے مکہ پہنچا اور وہاں نہایت دردانگیز طریقہ سے قریش کے مقتولوں کے مرثیے کہہ کہہ کر اُن کے عوام اور سرداروں کو انتقام کا جوش دلانے لگا۔اُس کی یہ سب حرکات اُس معاہدہ کے خلاف تھیں جو مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان ہوا تھا اور جس میں وہ بھی اپنی قوم کے ساتھ شریک تھا۔تاہم اُنہیں کسی نہ کسی طرح معاف کیا جاسکتا تھا۔لیکن ان سب سے گزر کر وہ اپنے جذبہ عناد میں یہاں تک پہنچا کہ آنحضرت ﷺ کی جان تک لینے کا تہیّہ کرلیا۔علامہ ابن کثیر نے ابومالک کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ اُس نے ایک جماعت کے ساتھ مل کر یہ انتظام کیا تھا کہ آنجناب ﷺ کو اپنے گھر بلائے اور چپکے سے شہید کرادے۔چنانچہ اِسی پر یہ آیت نازل ہوئی:

اِذْ ھَمَّ قَوْمٌ" اَنْ یَّبْسُطُوْا اِلَیْکُمْ اَیْدِیَھُمْ فَکَفَّ اَیْدِیَھُمْ عَنْکُمْ (المائدۃ: ۱۱)

''جب ایک جماعت نے تم پر دست درازی کا قصد کیا اور اللہ نے اُن کے ہاتھ تم تک بڑھنے سے روک دئے۔''

اِن تمام بیانات سے اِس واقعہ کی صداقت مسلّم ہوجاتی ہے کہ اُس کے جرائم کی فہرست کو اِس سازشِ قتل نے

☆ابن الاثیر کی جلد دوم' صفحہ ۵۳' فتح الباری کی جلد ہفتم' صفحہ ۲۳۶ میں ہے کہ: وَتَشَبَّبَ بِنِسَاءِ الْمُسْلِمِیْنَ حَتّٰی اَذَاھُمْ

ابوداؤد' کتاب الجہاد' باب: کیف کان اخراج الیھود میں ہے: وَیُحَرِّضُ عَلَیْهِ کُفَّارُ قُرَیْشٍ۔

مکمل کر دیا اور اس کے بعد اُس کے گشتنی ہونے میں کوئی کسر باقی نہ رہی۔ ایک شخص (۱) اپنے قومی معاہدہ کو توڑتا ہے، (۲) مسلمانوں کے دشمنوں سے ساز باز کرتا ہے، (۳) مسلمانوں کے خلاف جنگ کی آگ بھڑکاتا ہے اور (۴) اُن کے امام و راہبر کو قتل کرنے کی خفیہ سازش کرتا ہے۔ ایسے شخص کی سزا قتل کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے؟ اگر آج کی حکومتیں باغیانہ روش اور باغیانہ تقاریر کے جرم میں مجرم کو دھر سکتی ہیں تو اُس زمانے کے ماحول میں تو یہ بات زیادہ قابلِ فہم نظر آتی ہے۔''

''اُس کے اس بھیانک جرم کی بناء پر اُس کی قوم کے خلاف تو اعلانِ جنگ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کھلے میدان میں اُس سے مقابلہ ہوتا اور اُسے قتل کیا جاتا۔ خود اُس کی قوم سے بھی یہ امید رکھنی فضول تھی کہ وہ اُسے اِن حرکات سے روکے گی کیونکہ ساری یہود قوم کا رویّہ اُسی کی طرح عداوت و بغض سے بھرا ہوا تھا۔ پھر وہ دوسرے اعدائے اسلام کے ساتھ بھی مل کر کبھی کھلے میدان میں لڑنے کے لئے نہیں آیا بلکہ ہمیشہ پردہ کے پیچھے ہی رہ کر سازشیں کرتا رہا۔ اس لئے اُس کے شر کے استیصال کی صرف یہی ایک صورت باقی رہ گئی تھی کہ پردہ کے پیچھے ہی اُس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے مجبوراً اِسی آخری تدبیر کو اختیار کیا اور محمد بن مَسْلَمہ کو بھیج کر اُسے قتل کرا دیا۔''

''اِس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ خفیہ طریقہ سے دشمن کے سرداروں کو قتل کرا دینا اسلام کے قانونِ جنگ کی کوئی مستقل دفعہ ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو آنحضرت ﷺ سب سے پہلے ابوجہل اور ابوسفیان جیسے دشمنوں کو قتل کراتے اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں ایسے فدائیوں کی کمی نہ تھی جو اِس قسم کے تمام دشمنوں کو ایک ایک کر کے قتل کر سکتے تھے لیکن عہدِ رسالت مآب ﷺ اور عہدِ صحابہ کرام کی پوری تاریخ میں ہمیں کعب بن اشرف اور ابو رافع ☆ کے سوا کسی اور شخص کا نام نہیں ملتا جسے اِس طرح خفیہ طریقہ سے قتل کیا گیا ہو۔ حالانکہ آپ ﷺ کے دشمن صرف یہی دو شخص تھے۔ پس یہ واقعہ خود اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ خفیہ طریقوں سے دشمن کو قتل کرنا اسلام کی کوئی مستقل جنگی پالیسی نہیں ہے بلکہ ایسے مخصوص حالات میں اس کی اجازت ہے جبکہ دشمن خود سامنے نہ آیا ہو اور پردے کے پیچھے رہ کر خفیہ سازشیں کیا کرتا ہو۔'' (''الجہاد فی الاسلام''۔ سید مودودی، صفحات ۳۰۲۔۳۱۴)

''**یہودِ خیبر کا اِخراج**: عہدِ رسالتمآب ﷺ کے بعد عہدِ خلافت میں یہودِ خیبر کے اخراج کو خاص طور پر ہدفِ ملامت بنایا گیا ہے۔ مخالفین کہتے ہیں کہ جب رسول للہ ﷺ نے اہلِ خیبر سے پیداوار کے نصف حصّہ پر معاملہ کر لیا تھا اور وہ مستقل طور پر اسلام کی رعایا بن چکے تھے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اُنہیں جلاوطن کرنے کا کیا حق تھا؟ کیا اِس طرح اُنہوں نے عہد شکنی اور اہل الذمہ کی حق تلفی نہیں کی؟ یہ اعتراض بہ ظاہر بہت وزنی ہے مگر تاریخ نے وہ تمام حقائق محفوظ رکھے ہیں جن سے اِس اعتراض کا سارا تار و پود بکھر جاتا ہے۔''

''جب خیبر فتح ہوا تھا تو ابتدا میں آنحضرت ﷺ سے یہودیوں کی صلح اِس شرط پر ہوئی تھی کہ آپ اُن کی

☆ابورافع کے متعلق صحیح بخاری میں صرف اتنا بیان کیا گیا ہے کہ کَانَ اَبُوْرَافِع یُؤْذِیْ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ وَ یُعِیْنُ عَلَیْہِ (ابورافع آنحضرت ﷺ کو اذیّت پہنچاتا تھا اور آپ کے خلاف دشمنوں کی مدد کرتا تھا۔)

جان بخشی کر دیں گے اور وہ اس علاقہ کو چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں گے (فتوح البلدان لبلاذری، صفحات ۲۹ تا ۳۸؛ سیرت رسول اللہ ﷺ لابنِ ہشام، ص ۷۷۹ ؛ طبقات ابنِ سعد، ج ۲، صفحات ۷۹،۸۰)۔ لیکن صلح ہونے کے بعد جب زمین کے باقاعدہ بندوبست کا موقع آیا تو اہلِ خیبر نے آپ سے درخواست کی کہ :

''آپ ہمیں یہیں رہنے دیں اور ہم سے معاملہ کریں کیونکہ ہم زراعت اور نخلستان کے کام سے بخوبی واقف ہیں۔''

''آنحضرت ﷺ نے اُن کی یہ درخواست قبول کر لی اور اُن سے عارضی طور پر معاملہ کر لیا۔ لیکن معاملہ کی شرائط تحریر کرتے وقت صاف طور پر یہ تصریح کر دی کہ اَقِرُّکُمْ مَا اَقَرَّکُمُ اللّٰہُ (صحیح بخاری: کتاب الشروط باب: اذا اشترط فی المزارعۃ؛ فتوح البلدان: ص ۲۹) (میں تمہیں اُس وقت تک برقرار رکھوں گا جب تک اللہ تمہیں برقرار رکھے گا) جس کا مطلب یہ تھا کہ تمہیں مستقل طور پر نہیں رکھا جائے گا بلکہ جب تک احکامِ خداوندی کے مطابق ہمارے قومی مصالح تمہیں رکھنے کی اجازت دیں گے، اُس وقت تک تمہیں رہنے دیا جائے گا اور جب تمہارا طرزِ عمل نامناسب ہو گا تو ہمیں آزادی ہو گی کہ اِس صلح نامہ کی شرائط کو نافذ کر کے تمہیں جلاوطن کر دیں۔''

''ابوداؤد نے ایک روایت میں اس سے بھی زیادہ صاف تصریح کی ہے :

كَانَ عَامِلُ خَيْبَرَ عَلٰى اَنْ نُخْرِجَهُمْ اِذَا شِئْنَا (باب:ماجاء في حكم ارض خيبر)

"آنحضرت ﷺ نے اُن سے اِس شرط پر معاملہ کیا تھا کہ ہم جب چاہیں گے، اُنہیں نکال دیں گے۔''

''اِس سے یہ بات تو بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ اُن سے کوئی ایسا معاہدہ نہ تھا جس کی رُو سے اُن کے اخراج کو بدعہدی کہا جا سکتا ہو بلکہ اس کے برعکس اصل معاہدہ اُن کے اِخراج ہی کا مقتضی تھا۔ اب رہا یہ سوال کہ نصف خراج پر جو عارضی معاملہ اُن سے کیا گیا تھا، اُسے کن وجوہ کی بنا پر فسخ کیا گیا؟ تو اس کی تحقیق کے لئے ذیل کے واقعات پیشِ نظر رکھنے چاہئیں:۔

''صلح کو چند ہی روز گزرے تھے کہ اُن میں سے ایک عورت نے آنحضرت ﷺ کی دعوت کی اور آپ کو زہر کھلا دیا۔ بعد میں جب تحقیق کی گئی تو خود مجرمہ نے اعترافِ جرم کیا اور اس فعل میں دوسرے یہودیوں کی سازش بھی ثابت ہو گئی۔'' (صحیح بخاری میں یہ واقعہ کئی جگہ مذکور ہے)

''آنحضرت ﷺ ہی کے زمانہ میں اُنہوں نے عبداللہ بن سہل بن زید الانصاری کو قتل کر کے ایک نہر کے کنارے ڈال دیا۔'' (اُسد الغابہ، ج ۳، ص ۱۷۹)

''حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں وہ علانیہ برسرِ بغاوت ہو گئے اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو سوتے میں پکڑ کر کوٹھے سے نیچے پھینک دیا جس سے اُن کے ہاتھ ٹوٹ گئے۔ (فتوح البلدان، ص ۳۱ ؛ ابن ہشام، ص ۷۸۰)''

''ابتدائی واقعات خاص لوگوں کے ساتھ مخصوص تھے' اس لئے عامۃ الناس کو اُن کے جرم کا ذمہ دار نہ سمجھا گیا۔ مگر یہ آخری جرم کھلے بندوں کیا گیا تھا اور تمام قوم کا مُعاندانہ رویّہ ظاہر نظر آ رہا تھا اس لئے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس معاملہ کو صحابہ کرام کی مجلس میں پیش کیا اور اس پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا :

''رسول اللہ ﷺ نے یہودِ خیبر سے اُن کے اموال پر معاملہ کیا تھا اور یہ فرمایا تھا کہ ''ہم تمہیں اُس وقت تک برقرار رکھیں گے جب تک اللہ تمہیں برقرار رکھے گا۔'' اب عبداللہ بن عمر وہاں اپنی جائداد پر گئے تھے' رات کے وقت اُن پر حملہ کیا گیا اور اُن کے ہاتھ پاؤں توڑ دیئے گئے۔ اِس ملک میں اُن کے سوا ہمارا کوئی دشمن نہیں ہے' وہی ہمارے دشمن رہ گئے ہیں اور ہمیں اُنہی سے اندیشہ ہے۔ اس لئے میری رائے میں اُنہیں جلاوطن کر دینا چاہیے۔'' (صحیح بخاری' کتاب الشروط' باب: اذا اشترط فی المزارعۃ)

آپ کی اس تجویز سے تمام مجلس نے اتفاق کیا اور یہودیوں کے اِخراج کا فیصلہ ہو گیا۔ لیکن ان مجرموں کو بھی اس طرح جلاوطن نہیں کیا گیا کہ اُن کے اموال و اراضی پر قبضہ کر کے اُنہیں بہ یک بنی و دوگوش نکال دیا گیا ہو۔ جو کچھ وہ چھوڑ گئے اس کا پورا پورا معاوضہ اُنہیں بیت المال سے دیا گیا۔ سفر کی آسانی کے لئے اونٹ اور کجاوے دیئے گئے' یہاں تک کہ کجاوے باندھنے کی رسیاں تک حکومت کی طرف سے مہیا کی گئیں۔'' (صحیح بخاری' کتاب الشروط)

''بعض روایات میں اُن کے اِخراج کی یہ وجہ بھی بیان کی گئی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث سنی کہ لَا یَجْتَمِعُ دِیْنَانِ فِیْ جَزِیْرَۃِ الْعَرَبِ (جزیرہ عرب میں دو دین جمع نہ ہونے پائیں) تو آپ نے اس کی تحقیق کی اور صحیح ثابت ہو جانے کے بعد یہودیوں کے اخراج کا فیصلہ کر لیا۔ بلاذری نے اس روایت کو ابن شہاب کے طریق سے نقل کیا ہے (فتوح البلدان' ص ۳۴) اور امام زُہری نے عبداللہ بن عُتبہ کے طریق سے (فتح الباری' ج ۵' ص ۲۰۷)۔ لیکن اِس حدیث کا منشا ہرگز یہ نہ تھا کہ غیر مسلم قوموں کو بلاقصور عرب سے نکال دیا جائے۔ امام زُہری نے اپنی روایت میں خود یہ تصریح کی ہے کہ جب اِس حدیث کی صحت ثابت ہو گئی تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اعلان کرایا کہ :

مَنْ کَانَ لَہٗ مِنَ اَھْلِ الْکِتَابَیْنِ عَھْدٌ" فَلْیَاْتِ بِہٖ اَنْفَذْ لَہٗ (فتح الباری' ج ۵' ص ۲۰۷)

''دونوں کتابوں (انجیل و توراۃ) کے متّبعین میں سے جس کسی کے پاس کوئی معاہدہ ہو وہ لے آئے تاکہ میں اُسے نافذ کر دوں۔''

''ظاہر ہے کہ اگر اِس حدیث کا منشا یہ ہوتا کہ بلا امتیاز تمام غیر مسلم جزیرۃ العرب سے نکال دیئے جائیں تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ اعلان ہرگز نہ کرتے بلکہ تمام غیر مسلموں کو یک قلم خارج البلاد کر دیتے خواہ اُن سے معاہدہ ہوتا یا نہ ہوتا۔ مگر جب اُنہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ اہلِ معاہدہ سے اُن کے عہد نامے طلب کئے اور وعدہ کیا کہ ان عہد ناموں کو نافذ کیا جائے گا تو اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس حدیث سے مطلقاً اِخراج مقصود نہ تھا بلکہ ایک عام پالیسی کی تعیین مقصود تھی جس پر دوسرے واجبات کا لحاظ رکھتے ہوئے عمل درآمد کیا جانا چاہیے تھا۔ پس یہ

سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایک ذمّی قوم محض اس بنا پر ملک سے نکال دی گئی کہ عرب میں دو دینوں کا اجتماع مرغوب نہ تھا بلکہ زیادہ قرینِ قیاس یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب یہودِ خیبر کی مسلسل بدعنوانیوں سے تنگ آ کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اُنہیں جلاوطن کرنے کا خیال کیا ہوگا تو لازمی طور پر اُنہیں ایک ذمّی قوم کے ساتھ یہ معاملہ کرنے میں تامّل ہوا ہوگا اور وہ کسی شرعی حجت کی تلاش میں ہوں گے۔ اِسی دوران یہ حدیث اُنہیں پہنچی ہوگی اور اس کی اچھی طرح تحقیق کرنے کے بعد مطمئن ہو کر اُنہوں نے اپنی رائے کو عمل میں لانے کا فیصلہ کیا ہوگا۔ بعد میں راویوں نے اپنے رُجحانِ طبع کے موافق اِس ایک واقعہ کو دو الگ الگ واقعے بنا لئے اور دو مختلف راویوں کی صورت میں بیان کرنے لگے۔'' (''الجہاد فی الاسلام''۔۔۔سید مودودی' صفحات ۳۱۴۔۳۱۸)

''اہلِ نجران کا اِخراج: خلافتِ راشدہ کا دوسرا اہم واقعہ جو خیبر کے معاملہ سے بھی زیادہ طعن و ملامت کا ہدف بنا ہوا ہے' نجران کے عیسائیوں کا اِخراج ہے۔ خیبر کے یہودی بزورِ بازو فتح ہوئے تھے اور اُن سے ابتداء جلاوطنی کی شرط پر صُلح ہوئی تھی۔ اس لئے مخالفین کو اس میں اعتراض کی زیادہ گنجائش نہ مل سکی۔ لیکن اہلِ نجران نے تو بغیر جنگ کے خود بخود اطاعت قبول کر لی تھی اور جزیہ دے کر آنحضرت ﷺ سے باقاعدہ عہد نامہ لکھوایا تھا' اس لئے اُن کے اخراج کو مخالفینِ اسلام صریح عہد شکنی قرار دیتے ہیں۔ اُن کا سارا زور اِس پر ہے کہ معاہدہ میں غیر مشروط امان دی گئی تھی اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ناجائز طور پر اِس امان کو فسخ کیا۔ مگر واقعات کی تحقیق سے یہ دعویٰ غلط ثابت ہوتا ہے۔''

''اہلِ نجران سے رسولِ اللہ ﷺ کا جو معاہدہ ہوا تھا' اُس میں نصاریٰ کو اِس شرط کے ساتھ امان دی گئی تھی کہ جب تک وہ حکومتِ اسلامیہ کے وفادار رہیں گے اور اپنے واجبات کو ٹھیک ٹھیک ادا کرتے رہیں گے' اُس وقت تک اُنہیں اللہ کی پناہ اور رسول اللہ ﷺ کی حفاظت حاصل رہے گی۔''

''اس معاہدہ کی رُو سے جس طرح اسلامی حکومت نے اُن کی حفاظت کرنے اور اُن کی قدیم حالت کو برقرار رکھنے کا عہد کیا تھا' اُسی طرح اہلِ نجران سے بھی یہ عہد لے لیا تھا کہ وہ حکومتِ اسلامیہ کے وفادار رہیں گے اور یہ وہ عہد ہے جو دنیا کی ہر حکومت اپنی رعایا سے لیتی ہے۔ مگر اہلِ نجران نے اِس عہد کو کہاں تک پورا کیا؟ اُنہوں نے خیرخواہی اور وفاداری کا حق کہاں تک ادا کیا؟ تاریخ سے اِس کا جواب ہمیں یہ ملتا ہے کہ اُنہوں نے گھوڑے اور اسلحہ جمع کر کے بغاوت کا سامان کیا اور حکومتِ اسلامیہ کے قلب کو خطرے میں ڈال دیا۔ امام ابو یوسف نے اپنی ''کتاب الخراج'' میں صاف لکھا ہے کہ:

أَجْلَاهُمْ لِأَنَّه' خَافَهُمْ عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ وَقَدْ كَانُوْا اِتَّخَذُوْا الْخَيْلَ وَالسِّلَاحَ فِيْ بِلَادِهِمْ (ص ۴۲)

''حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اُنہیں اس لئے جلاوطن کیا کہ آپ کو اُن سے مسلمانوں کے خلاف بغاوت کا خوف ہو گیا تھا۔ اُنہوں نے اپنے ملک میں اسلحہ اور گھوڑے جمع کر لئے تھے۔''

''عرب کے نقشہ پر ایک نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہوگا کہ اہلِ نجران کی یہ تیاریاں کس قسم کے خطرات کا

پیش خیمہ تھیں۔ ایک طرف اُن کے عین شمال میں حکومتِ اسلامیہ کا مرکز حجاز واقع تھا اور دوسری طرف اُن کے سامنے بحرِ احمر کے دوسرے ساحل پر حبش کی عیسائی سلطنت موجود تھی۔ اگر وہ اپنی تیاریاں مکمل کر کے حجاز پر حملہ کر دیتے اور اپنے ہم مذہب اہلِ حبش کو اَبرہہ کا ناتمام منصوبہ پورا کرنے کے لئے اپنی مدد پر بلا لیتے تو ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ مسلمانوں کو کیسی شدید مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا۔''

''ابنِ اثیر اور بلاذری نے بیان کیا ہے کہ امن وامان کی برکات سے اُن کی تعداد بڑھتے بڑھتے چالیس ہزار تک پہنچ گئی تھی اور دولت کی زیادتی نے اُن میں خانہ جنگی کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا۔ اُن کے مختلف گروہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آکر ایک دوسرے کی شکایتیں کرتے تھے اور ہر پارٹی کے لوگ دوسری پارٹی کو نکال دینے کا مشورہ دیا کرتے تھے۔ اوّل اوّل حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اِس فتنہ سے درگزر کیا مگر جب اُن کی روزافزوں قوت سے خود اسلامی حکومت کا قلب خطرے میں پڑ گیا تو آپ نے موقع کو غنیمت سمجھ کر اُن کی جلاوطنی کا حکم صادر فرمادیا۔'' (فتوح البلدان' ص ۷۳ ؛ اُسد الغابہ' ج ۲' ص ۱۱۲)

''تاہم ایک ایسی قوم جس کے خلاف بغاوت کی تیاری کا ثبوت مل چکا تھا' حکومتِ اسلامیہ کی حدود سے خارج نہیں کی گئی بلکہ صرف عرب سے خارج کی گئی۔ اُس کو ''اللہ کی پناہ اور محمد نبی ﷺ کے ذمہ'' سے محروم نہیں کیا گیا بلکہ اسی پناہ اور ذمہ میں ایک نامناسب مقام سے دوسرے مناسب مقام کی طرف منتقل کر دیا گیا۔ نجران سے اُس کے اِخراج کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ حجاز اور حبش کے درمیان ایک نازک سیاسی وحربی پوزیشن پر قابض نہ رہے۔ اس سے زیادہ کوئی اور سزا دینی مقصود نہیں تھی۔ اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اُنہیں نجران میں سے منتقل کر کے عراق کی طرف بھیج دیا۔ اُن کی زمینوں کے بدلے زمینیں دے دیں' دوسال کا جزیہ معاف کیا' یمن سے عراق تک کے سفر کے لئے پوری آسانیاں بہم پہنچائیں اور اپنے عُمال کو حکم دیا کہ اُنہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے اِس فرمان کو لفظ بلفظ نقل کیا ہے جس کے چند فقرے یہ ہیں:

''شام وعراق کے افسروں میں سے جس کے پاس یہ جائیں وہ اُنہیں قابلِ کاشت زمین عطا کرے۔ جس زمین میں یہ کاشت کریں وہ اُن کے لئے خدا واسطے کا صدقہ ہے اور اُس زمین کا عوض ہے جو یمن میں اُن سے لی گئی ہے۔ اس زمین میں اُن پر کوئی دست درازی اور مداخلت نہ کی جائے۔۔۔ اگر کوئی شخص اُن پر ظلم کرتا ہو تو ہر مسلمان پر جو وہاں موجود ہو' لازم ہے کہ اُن کی مدد کرے کیونکہ وہ ایسی قوم ہے جو ہماری پناہ میں ہے۔ اُن کا جزیہ چوبیس مہینہ کے لئے معاف ہے۔'' (کتاب الخراج' ص ۴۱)

''معترضین نے اِن سب باتوں کو بھلا کر صرف اِتنا یاد رکھا ہے کہ اہلِ نجران سے عہد تھا۔ عمر ابن الخطاب نے اُسے توڑا اور اُنہیں جلاوطن کر دیا۔ مگر ان تمام حالات کو دیکھ کر کوئی بتائے کہ اگر آج اِس بیسویں صدی میں بھی کوئی قوم وہ روش اختیار کرے جو اہلِ نجران نے کی تھی اور اس کی سیاسی وجنگی پوزیشن وہی ہو جو اہلِ نجران کی تھی' تو ایک مُہذب حکومت جو اپنی مملکت کے امن کو محفوظ رکھنا چاہتی ہو' اُس کے ساتھ کیا سلوک کرے گی؟'' (''الجہاد فی الاسلام''۔۔ سید مودودی' صفحات ۳۱۸ تا ۳۲۱)

(۱۰۵) خوش طبعی (Jocularity)

سورۃ الحُجُرات میں ارشاد ہوتا ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَایَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْهُمْ وَلَانِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُنَّ خَیْرًا مِّنْهُنَّ وَلَاتَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَلَاتَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ (الحُجُرات: ۱۱)

''مومنو! نہ مردوں کو مردوں پر ہنسنا چاہئے کیا عجب کہ وہ اُن سے بہتر ہوں اور نہ عورتوں کو عورتوں پر ہنسنا چاہئے کیا عجب کہ وہ اُن سے بہتر ہوں اور ایک دوسرے کو طعنہ نہ دیا کرو اور نہ ایک دوسرے کو بُرے القاب سے پکارا کرو۔'' (۱۱ : ۴۹)

اسلامی معاشرے کا تقاضا ہے کہ اُس کے افراد آپس میں ایک دوسرے سے محبت ہی نہ کرتے ہوں بلکہ ایک دوسرے کی عزت بھی کرتے ہوں اور جب آدمی کسی کی عزت کرتا ہے تو اُس کا مذاق نہیں اُڑاتا اور جس کا وہ مذاق اڑاتا ہے تو ایک طرف تو وہ اُس کی دل آزاری کرتا ہے تو دوسری طرف اُسے لازمی طور پر اپنے آپ سے کمتر اور حقیر خیال کرتا ہے جبکہ یہ سوچ سراسر غیر اسلامی ہے۔

اسلام کوئی رُوکھا' پھیکا اور نرا سنجیدہ ومتین مذہب نہیں ہے جس کے دامن میں مزاح وخوش طبعی نام کی کوئی چیز نہ ہو۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اسلام نے مزاح کو جائز اور مذاق کو ناجائز قرار دیا ہے۔ مذاق میں کسی کا دل دُکھایا جاتا ہے اور اُس کی تذلیل وتحقیر کی جاتی ہے جسے اسلام نے اچھا فعل نہیں سمجھا۔ جبکہ مزاح میں یہ پُر لطف بات ہے کہ جس پر اُس کی زد پڑتی ہو وہ بھی اُس کا لطف محسوس کرے۔ اسلام ایک جامع صفت ضابطہ حیات ہے اور یہ ممکن ہی نہیں کہ اس پہلو میں اُس نے کوئی ہدایت نہ دی ہو۔ بالخصوص ایسی صورت میں کہ آدمی میں مزاح کی حِس اکتسابی نہیں بلکہ وہبی اور عطائے خداوندی ہے۔ خود محسنِ انسانیت اور انسانِ کامل واکمل حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیّبہ سے بھی اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ شگفتہ مزاجی اور خوش طبعی کوئی ناپسندیدہ چیز نہیں ہے۔

''حضرت اَنس بن مالک سے روایت ہے کہ ایک بوڑھی خاتون بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوئی اور آپ سے پوچھا: یارسول اللہ! کیا میں بھی جنت میں جاؤں گی؟ آپ نے اُس سے مزاحًا کہا: کوئی بڑھیا جنت میں نہیں جائے گی۔ بڑھیا نے حیرت سے عرض کیا کہ اُن (بوڑھیوں) میں ایسی کیا بات ہے جس کے سبب وہ جنت میں نہ جاسکیں گی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم نے قرآن میں یہ آیت نہیں پڑھتیں ہو؟ اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءًO فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْکَارًاO (سورۃ الواقعۃ: آیات: ۳۵' ۳۶) یعنی (جنّتی عورتوں کو) ہم خاص طور پر نئے سرے سے پیدا کریں گے اور اُنہیں نوخیز دوشیزائیں بنا دیں گے۔''

ایسا کہنے میں رسالتمآب ﷺ کا مقصد یہی تھا کہ اے خاتون! تم جنت میں جاؤ گی تو ضرور لیکن اِس

بڑھاپے کی حالت میں نہیں بلکہ دوشیزگی کی حالت میں جاؤ گی۔

شگفتہ مزاجی اور خوش طبعی کی ایسی ہی ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

''حضرت اُمِّ ایمن رضی اللہ عنہا نبی اکرم ﷺ کے والدِ گرامی حضرت عبداللہ کی کنیز تھیں۔ اُن کی وفات کے بعد سیّدہ آمنہ رضی اللہ عنہا کی خدمت کرتی رہیں اور جب اُن کا بھی انتقال ہو گیا تو خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت پر مامور ہوئیں۔ ایک دن بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوئیں۔ آپ علیہ السلام اُنہیں دیکھتے ہی ''اُمّی' اُمّی'' فرماتے ہوئے تعظیماً کھڑے ہو گئے' اُنہیں بڑی ہی عزت و احترام سے بٹھایا اور دریافت کیا: امی جان! آج کیسے تکلیف فرمائی؟

اُمِّ ایمن: مجھے اونٹ کی ضرورت ہے۔
رسالتمآب ﷺ: اونٹ آپ کیا کریں گی؟
اُمِّ ایمن: آج کل ہمارے پاس سواری کا کوئی جانور نہیں ہے۔ نہ گدھا' نہ اونٹ۔ کبھی دُور کا سفر پیش آجائے تو بڑی دشواری ہوتی ہے۔''
رسالتمآب ﷺ: (متبسم ہو کر) اچھا! تو اونٹ کا ایک بچہ آپ کی خدمت میں حاضر کیے دیتا ہوں۔''
اُمِّ ایمن: بھلا اونٹ کے بچے کو میں کیا کروں گی۔ مجھے تو اونٹ چاہئے' اونٹ۔
رسالتمآب ﷺ: میں تو آپ کو اونٹ کا بچہ ہی دوں گا۔
اُمِّ ایمن: اونٹ کا بچہ میرے کس کام کا؟ وہ تو میرا بوجھ بھی نہیں سہار سکے گا۔ مجھے تو کوئی اونٹ دیجئے۔
رسالتمآب ﷺ: آپ کو اونٹ کا بچہ ہی ملے گا اور میں اُسی پر آپ کو سوار کراؤں گا۔

یہ فرما کر ختمی مرتبت آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک خادم کو اشارہ فرمایا۔ وہ تھوڑی دیر میں ایک جوان اور فربہ اونٹ لے کر آئے اور اُس کی مہار حضرت اُمِّ ایمن کو تھما دی۔ اب وہ خاتون حضور علیہ السلام کے لطیف مزاح کی تہہ تک پہنچیں تو بے اختیار ہنس دیں اور دعائیں دینے لگیں۔ حاضرینِ مجلس بھی شگفتہ اور محظوظ ہوئے۔

ایسی ہی خوش طبعی کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

''ختمی مرتبت علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے صحابہ کرام کے ساتھ کھجوریں تناول فرما رہے ہیں اور کھانے کے بعد اُس کی گٹھلیاں ایک طرف کو رکھی جا رہی ہیں۔ اِتنے میں جناب علی کرّم اللہ وجہہٗ سامنے سے آتے دکھائی دیے۔ صحابہ کرام نے ایک تجویز بنائی کہ جب علی آکر ہمارے پاس بیٹھ جائیں تو یہ گٹھلیاں چپکے سے اُن کی ران کے نیچے رکھ دی جائیں۔ مجلس برخاست ہونے پر صحابہ نے آنحضرت ﷺ سے کہا کہ آج علی نے سب سے زیادہ کھجوریں کھائی ہیں۔ جناب علی کرّم اللہ وجہہٗ نے برجستہ کہا: یارسول اللہ! معلوم ہوتا ہے کہ اِن لوگوں نے گٹھلیاں سمیت کھجوریں کھائی ہیں۔

۲۷۶۰ (خوش طبعی -- Jocularity)

یہ تینوں واقعات یا لطائف مزاح نگاری کے لئے اُسوۂ حسنہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ اُن میں نہ تو کوئی بات خلافِ واقعہ ہے اور نہ خلافِ ادب و شائستگی۔ اُنہیں سن کر لب متبسم ہوتے ہیں' قہقہے بلند نہیں ہوتے۔ پھر اُنہیں مزاح کے جس اعلیٰ ترین معیار پر بھی پرکھنا چاہیں' پرکھ کر دیکھ لیں۔ یہ خود ہر لحاظ سے معیارِ مزاح ہیں۔

مزاح اگر مزاح و ظرافت کے دائرہ میں رہے اور معیاری ہو تو وہ ادب و شائستگی کا آئینہ دار ہوتا ہے' وگرنہ وہ ظرافت نہیں ستم ظریفی بن جاتا ہے۔ نہ وہ فنِ مزاح نگاری کے اصولوں پر پورا اترتا ہے اور نہ ہی اخلاق و شائستگی ہی کسی کو ایسے مزاح کی اجازت دیتے ہیں۔ قرآن و سنت میں ہمیں اس بارے میں جو ہدایات دی گئی ہیں وہ بہت واضح ہیں اور ضرورت اس بات کی ہے کہ جو بھی اعلیٰ درجے کی مزاح نگاری کرنا چاہتا ہے' وہ ان ہدایات پر پوری طرح کاربند ہو' تاکہ نہ صرف اپنے ابنائے جنس کے لئے مزاح و ظرافت کے ذریعے مسرت و انبساط کا باعث بنے بلکہ آخرت کی گرفت سے بھی محفوظ رہے۔

سورۃُ الحُجُرات کی مذکورہ آیت ۱۱ کے الفاظ لَاتَلۡمِزُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ (ایک دوسرے پر طعن نہ کیا کرو) کے حکم میں بھی یہی حکمت ہے۔ دوسروں پر طعن کرنے' پھبتی کسنے اور چوٹ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اُنہیں اپنے آپ پر چوٹ کرنے کی دعوت دے رہا ہے جس سے بات بڑھتی اور نوبت دنگا فساد' لڑائی جھگڑے اور دشمنی و عداوت تک جا پہنچتی ہے اور معاشرے میں انتشار اور اُبتری کا باعث بنتی ہے۔

''یہی صورتِ حال اُس وقت پیش آتی ہے جب کسی کو ایسے نام سے پکارا جائے یا کوئی ایسا لقب دیا جائے جو اُسے ناگوار گزرے اور جس سے اُس کی تحقیر و تنقیص ہوتی ہو جیسے کسی کو فاسق یا منافق کہنا' کسی کو لولا' لنگڑا' کانا' کسی کو اپنے یا اُس کے ماں باپ یا خاندان کے کسی عیب یا نقص سے ملقّب کرنا' کبھی کو اُس کے مسلمان ہو جانے کے بعد اُس کے سابق مذہب کے حوالے سے ہندو' سکھ' یہودی یا نصرانی کہنا' کسی خاندان' برادری یا گروہ کا کوئی ایسا نام رکھ دینا جس سے اُس کی مذمت کا پہلو نکلتا ہو۔''

''ایک دوسرے کو بُرے القاب سے یاد نہ کرنے کے حکم سے وہ القاب مستثنیٰ ہیں جو بہ ظاہر تو بدنما معلوم ہوتے ہوں لیکن اُن میں مذمت مقصود نہیں ہوتی بلکہ وہ پہچان کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ مثلاً عبداللہ نام کے کئی آدمی ہوں اور اُن میں سے ایک نابینا ہو تو پہچان کے لئے اُسے نابینا عبداللہ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔''

''اسی طرح محبت سے دئے ہوئے الفاظ یا القاب بھی اِس حکم سے مستثنیٰ ہیں جیسے آنحضرت ﷺ کی طرف سے اپنے ایک صحابی (عبدالرحمٰن بن صخر رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو ابوہریرہ (بلّی کا باپ) ☆ کا لقب عطا فرمایا جانا۔''

☆ واقعہ یوں ہے کہ ایک مرتبہ یہی صحابی (عبدالرحمٰن بن صخر) بارگاہِ نبوی میں بلّی کے ایک بچے کو سینے سے لگائے حاضر ہوئے۔ آقائے نامدار ﷺ نے اُنہیں دیکھ کر فرمایا: اَنۡتَ اَبُوۡهُرَيۡرَةَ (تو بلّی کے بچے کا باپ ہے)۔ آقا کا عطا کردہ یہ لقب اس قدر مشہور ہوا کہ اُن کے اصل نام سے آج بھی بہت کم لوگ واقف ہیں۔

(۱۰۶) صلہ رحمی (Joining of Womb Relations)

کسی بھی سماج کا امن وسکون اس بات پر منحصر ہوتا ہے کہ اُس کے افراد ایک دوسرے کے لئے اخوت وایثار کے جذبات کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگی اور خوشگوار موافقت کے ساتھ رہیں اور یہی اسلامی تعلیمات کی روح ہے۔افراد کی جانب سے بے غرضی‘ خود کو مٹانے اور کسرنفسی کے کردار کے بغیر کوئی بھی معاشرہ نہ تو خوشحال ہوسکتا ہے اور نہ پنپ سکتا ہے۔اسلام کے اعلیٰ اخلاقی ضابطے کا حصول اُس کے لئے ناممکن ہے۔سماج کے افراد کے باہمی تعلقات میں رِحم کے رشتے انتہائی اہمیت کے حامل ہیں جن کی بحالی اور بہتری کے لئے قرآنِ حکیم اور احادیثِ مبارکہ میں بہت ہی زیادہ زور دیا گیا ہے۔والدین یعنی ماں باپ دونوں کی طرف سے رِحم کے یہ رشتے بنتے ہیں۔ اِن رشتوں کو توڑنا کبیرہ گناہ ہے اور اس کے مرتکب لوگوں کو سورۃُ البقرۃ میں یوں تنبیہ کی گئی ہے :

وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ O (البقرۃ: ۲۷)

’’اور جس چیز کے جوڑے رکھنے کا اللہ نے حکم دیا تھا‘ وہ اُسے کاٹتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں‘ تو بس یہی لوگ نقصان اُٹھانے والے ہیں۔‘‘ (۲۷ : ۲)

اِس آیت کا مطلب یہ ہے کہ باہمی تعلقات کو منقطع کرنے والے لوگ اللہ کی اِس دھرتی پر غلط کاریوں میں مبتلا ہیں۔باہمی تعلقات کو جوڑے رکھنے سے مراد حقوق اللہ اور حقوق العباد کی کما حقہٗ ادائیگی ہے۔حقوق العباد میں والدین‘ اہل وعیال‘ ہمسائے‘ معاشرہ‘ ملک وملّت اور اَبنائے جنس شامل ہیں۔غلط کاری‘ اخلاقی بے راہروی اور ماڈی ابتری دونوں کو محیط ہے۔اَخلاقی بے راہروی اس لئے ہے کہ ان لوگوں نے عقیدۂ حقہ کا انکار کیا اور بدمذہبی اور بداخلاقی کے جھوٹے اصولوں کا پرچار کیا اور ماڈی ابتری اس لئے ہے کہ وہ زمین میں افراتفری اور انتشار کا موجب بنے اور بندگانِ خدا کی بے تحاشا خونریزی کی۔

حقیقت میں اُمّت کے نظامِ اجتماعی کا سنگِ بنیاد شریعت نے قرابت یا رحم ہی کو قرار دیا ہے جیسا کہ سورۃ النساء میں حکمِ ربانی ہوا:

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ (النّساء : ۱)

’’اور اللہ سے ڈرتے رہو جس کے واسطہ سے ایک دوسرے سے مانگتے ہو اور قرابتوں کے بارے میں بھی تقویٰ اختیار کرو۔‘‘ (۱ : ۴)

’’اَرحام‘‘ کا اطلاق وسیع ہے۔جملہ اعزہ واقرباء اس کے اندر آجاتے ہیں۔فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ قرابت کا لحاظ واجب ہے اور اُسے قطع کرنا جرم ہے۔اگر اِس کا استحضار رہے تو آج خانگی زندگیاں کس قدر خوشگوار اور رشکِ جناں ہوجائیں!

یہ بات قابلِ غور ہے کہ آیتِ بالا میں ''اَرحــــام'' کے لفظ کو لفظ ''اَللہ'' اور قرابت داری سے جوڑا گیا ہے جس سے معاشرتی روابط میں اس کی اہمیت کا جتلانا مقصود ہے۔ والدہ جس نے ہمیں جنم دیا' ہماری انتہائی تعظیم و توقیر کی مستحق ہے۔ بیوی جو عائلی زندگی کے استحکام کا موجب ہے' بھی ہماری تعظیم وتوقیر کی مستحق ہے۔ والدہ ہو یا بیوی' اِن دونوں کی رشتہ داریوں سے منسلک رہنا ان دونوں رشتوں کی تعظیم وتوقیر کے مترادف ہے۔

سورۃُ الــرَّعــد میں صلہ رحمی کے نیک عمل کو دانشمندی کا عمل کہا گیا ہے اور صلہ رحمی کرنے والوں کو اربابِ دانش کہا گیا ہے:

اِنَّمَا یَتَذَکَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ O الَّذِیْنَ یُوْفُوْنَ بِعَهْدِاللّٰهِ وَلَا یَنْقُضُوْنَ الْمِیْثَاقَ O وَالَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ مَآاَمَرَاللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ یُّوْصَلَ وَیَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَیَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ O (اَلرَّعْد : ۱۹ ۔ ۲۱)

''نصیحت تو بس اہلِ فہم ہی قبول کرتے ہیں' جو اللہ سے کئے گئے عہد کو پورا کرتے رہتے ہیں اور اُس پیمان کو توڑتے نہیں ہیں۔ اور جس کے جوڑے رکھنے کا اللہ نے حکم دیا ہے' جوڑے رکھتے ہیں اور اپنے پروردگار سے ڈرتے رہتے ہیں اور سخت حساب کا اندیشہ رکھتے ہیں۔'' (۱۹۔۲۱ : ۱۳)

یہ اُولُــوا الْاَلْبَــاب وہی لوگ ہیں جو اپنی عقل پر تعصّبات یا جذباتِ عناد وغیرہ کو غالب نہیں آنے دیتے اور یہی فرق ہے لُب اور مطلق عقل کے درمیان (''مفردات القرآن'' لاامام راغب اصفہانی)۔ عَهْدِاللّٰه سے مراد وہ عہدِ اطاعت ہے جو انسان روزِ اوّل اللہ سے کر چکا ہے (بحوالہ سورۃ الاعراف: آیت ۱۷۲)۔

سورۃُ الشُّوریٰ میں خالقِ کون ومکاں نے نبی اکرم ﷺ کی زبانِ مبارک سے صلہ رحمی پر زور دیا اور فرمایا:

قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى (اَلشُّوریٰ : ۲۳)

''(اے نبی مکرّم!) فرمادیجئے کہ میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں طلب کرتا سوائے رشتہ داری کی محبت کے۔'' (۴۲:۲۳)

آیت سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ساتھ بھی محبت کا حکم نکلتا ہے۔ قرابت داری سے محبت کے وسیع معنیٰ میں پوری نوعِ انسان سے محبت بھی شامل ہے کیونکہ تمام انسان ایک ہی جدِّ اعلیٰ یعنی آدم علیہ السلام کی اولاد ہونے کی حیثیت سے رشتۂ اخوت میں باہم جڑے ہوئے ہیں۔

اسلام میں قرابتداری کی تعظیم وتوقیر اِس قدر اہم ہے کہ ہمیں اپنے مشرک اور کافر والدین کے ساتھ بھی رواداری' اُن کا خیال رکھنے' مہربان و بااخلاق ہونے کا حکم دیا گیا ہے (بحوالہ سورہ لقمٰن : آیت ۱۵)۔ حضرت صدیقِ اکبر کی ایک بیوی قُتَیلہ نامی تھی جسے آپ نے قبل از اسلام طلاق دے دی تھی۔ اُس کے بطن سے آپ کی صاحبزادی حضرت اَسماء رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھیں۔ ہجرت کے بعد قُتَیلہ اپنی بیٹی کے لئے چند تحفے تحائف لے کر مدینہ آئی۔ حضرت اَسماء نے اُسے گھر آنے سے روک دیا اور تحائف قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اِس واقعہ کا ذکر اُنہوں

نے بارگاہِ رسالت میں کیا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسماء کو اجازت دی کہ وہ اپنی ماں کو گھر میں آنے دے، اُس کے تحائف قبول کرے اور اُس کے ساتھ احسان و مروت کا برتاؤ کرے (صحیح بخاری: کتاب الھبۃ، باب: الھدیۃ للمشرکین ؛ صحیح مسلم : کتاب الزکوٰۃ، باب: فضل النفقۃ والصدقۃ علی الاقربین)۔

صلہ رحمی سے متعلق احادیثِ نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام

(۱) عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: لَیْسَ الْوَاصِلُ بِالْمُکَافِیِٔ وَلٰکِنَّ الْوَاصِلُ الَّذِیْ اِذَا قُطِعَتْ رَحِمُہٗ وَصَلَھَا (صحیح بخاری: کتاب الادب، باب: لیس الواصل بالمکافی)

"حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: وہ شخص صلہ رحمی کرنے والا نہیں ہے جو (کسی رشتہ دار کے ساتھ) احسان کے بدلے میں احسان کرتا ہے بلکہ اصل صلہ رحمی کرنے والا وہ ہے کہ جب اُس سے قطع رحمی (بدسلوکی وغیرہ) کی جائے تو صلہ رحمی (حسنِ سلوک) کرے۔"

اس حدیثِ مبارکہ سے صلہ رحمی کے حقیقی تقاضے واضح ہوتے ہیں۔ جو رشتے دار ادب و احترام سے پیش آئیں اور آپ کے ساتھ اچھا سلوک کریں، ظاہر بات ہے کہ آپ بھی اُن کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کریں گے۔ لیکن یہ صلہ رحمی نہیں ہے بلکہ احسان کے بدلے میں احسان ہے۔ اس کے برعکس آپ کا ایک قریبی رشتہ دار بداخلاق ہے، آپ سے بدسلوکی کرتا ہے اور آپ سے تعلق توڑنے پر تُلا رہتا ہے (جیسا کہ جہالت کے یہ مظاہرے ہمارے معاشرہ میں عام ہیں) لیکن آپ صبر و تحمل اور عفو و درگزر سے کام لیتے ہیں، بدسلوکی کا جواب حسنِ سلوک سے دیتے ہیں، ترکِ تعلق کی کوششوں کے مقابلہ میں تعلق برقرار رکھتے ہیں۔ یہ ہے اصل صلہ رحمی جس کا تقاضا اسلام کرتا ہے۔ ظاہر بات یہ ہے کہ یہ جذبات، اَنا اور وقار کا مسئلہ ہے۔ اس جھوٹی اَنا کو شریعت کے تقاضوں پر قربان کر دینا بہت دل گردے کا کام ہے۔ لیکن کمالِ ایمان بھی یہی ہے کہ ایسا کیا جائے، ورنہ باہم مسکراہٹوں کے تبادلے میں تو کوئی کمال نہیں۔"
("ریاض الصالحین"۔ ابوزکریا یحییٰ بن شرف النووی، جلد اوّل، صفحات ۳۰۰، ۳۰۱ اُردو ترجمہ)

(۲) عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: تَعَلَّمُوْا مِنْ اَنْسَابِکُمْ مَا تَصِلُوْنَ بِہٖ اَرْحَامَکُمْ فِیْ صِلَۃِ الرَّحِمِ مَحَبَّۃٌ" فِی الْاَھْلِ مَثْرَاۃٌ" فِی الْمَالِ مَنْسَأَۃٌ" فِی الْعُمُرِ (ترمذی)

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اپنے حسب و نسب کو جانو، اپنے قرابتداروں سے حسنِ سلوک کرو۔ رشتہ داری کو جوڑنے (صلہ رحمی) اور تعلقات کو مضبوط کرنے ہی میں افرادِ کنبہ کی باہمی محبت، دولت کی فراوانی اور درازیِ عمر مضمر ہے۔"

(۳) عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ: مَنْ اَحَبَّ اَنْ یُّبْسَطَ لَہٗ فِیْ رِزْقِہٖ وَ

يُنْسَأَ لَهُ فِي أَثَرِهِ فَلْيَصِلْ رَحِمَهُ' (صحیح بخاری: کتاب الادب' باب: من بسط لہ فی الرزق ؛ صحیح مسلم: کتاب البرّ والصّلۃ' باب: صلۃ الرحم وتحریم قطیعتھا)

''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص کو یہ بات پسند ہو کہ اُس کی روزی میں فراخی کی جائے اور اُس کی عمر میں اضافہ کیا جائے تو اُسے صلہ رِحمی کرنی چاہیے۔''

(۴) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ رَجُلاً قَالَ : يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! إِنَّ لِي قَرَابَةً أَصِلُهُمْ وَ يَقْطَعُوْنَنِيْ وَأُحْسِنُ إِلَيْهِمْ وَيُسِيْئُوْنَ إِلَيَّ وَأَحْلُمُ عَنْهُمْ وَيَجْهَلُوْنَ عَلَيَّ فَقَالَ: لَئِنْ كُنْتَ كَمَا قُلْتَ فَكَأَنَّمَا تُسِفُّهُمُ الْمَلَّ وَلَا يَزَالُ مَعَكَ مِنَ اللّٰهِ ظَهِيْرٌ عَلَيْهِمْ مَا دُمْتَ عَلَى ذٰلِكَ (صحيح مسلم: كتاب البرّ والصّلة' باب: صلة الرحم وتحريم قطيعتها)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے کہا: اے اللہ کے رسول! میرے کچھ رشتہ دار ہیں' میں اُن سے صلہ رِحمی کرتا ہوں' وہ مجھ سے قطع تعلق کرتے ہیں۔ میں اُن سے اچھا سلوک کرتا ہوں' وہ مجھ سے بُرا سلوک کرتے ہیں۔ میں اُن سے تحمل اور بُردباری سے پیش آتا ہوں' وہ میرے ساتھ اُجڈ پن سے پیش آتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: اگر تو ایسا ہی ہے جیسا کہ تو نے کہا ہے' تو گویا تو اُن کے منہ میں گرم راکھ ڈال رہا ہے اور اُن کے مقابلہ میں تیرے ساتھ ہمیشہ اللہ کی طرف سے ایک مددگار رہے گا' جب تک تیرا رویہ یہی رہے گا۔''

''گرم راکھ کھلانے'' میں تشبیہ ہے کہ جس طرح گرم راکھ کھانے والے کو تکلیف ہوتی ہے' اُسی طرح اُن قطع رِحمی کرنے والوں کو گناہ جیسی تکلیف کا سامنا ہوگا۔ اس سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ ایک رشتے دار کی بدسلوکی یا قطع رِحمی' دوسرے رشتے دار کی بدسلوکی اور قطع رِحمی کے لئے وجہِ جواز نہیں۔ کیونکہ رشتے داروں کی بدسلوکی کے باوجود اُن سے حسنِ سلوک کی تاکید ہے۔ دوسرا یہ معلوم ہوا کہ ہر حال میں حسنِ سلوک کرنے والا اللہ تعالیٰ کے ہاں نہایت معزز و مکرم ہے اور اللہ تعالیٰ اُس کے لئے آسمانوں سے مددگار نازل فرماتا ہے۔ تیسرا یہ کہ قطع رِحمی کا انجام' گرم راکھ کے کھانے کے انجامِ بد کی طرح نہایت بُرا ہے۔

(۵) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : اَلرَّحِمُ مُعَلَّقَةٌ بِالْعَرْشِ تَقُوْلُ: مَنْ وَصَلَنِيْ وَصَلَهُ اللّٰهُ وَمَنْ قَطَعَنِيْ قَطَعَهُ اللّٰهُ' (صحیح بخاری: کتاب الادب' باب: من وصل وصلہ اللہ؛ صحیح مسلم : کتاب البرّ والصّلۃ' باب: صلۃ الرحم وتحریم قطیعتھا)

''سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: رحم (رشتے داری) عرش سے لٹکی ہوئی ہے اور کہتی ہے: جو مجھے ملائے' اللہ اُسے ملائے اور جو مجھے کاٹے' اُسے اللہ تعالیٰ کاٹے۔''

''رحم (رشتے داری) کا اس طرح بولنا اور اللہ تعالیٰ سے مکالمہ کرنا' اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی مشکل بات نہیں

وہ ہر ایک میں اِدراک وشعور اور گویائی کی قوت پیدا کرنے پر قادر ہے۔''

(۶) عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهُمَا عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: اَلْخَالَةُ بِمَنْزِلَةِ الْاُمِّ (سنن ترمذی: ابواب البرّ والصّلۃ' باب: ماجاء فی برّ الخالۃ)

''حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: خالہ ماں کے مرتبہ میں ہے۔''

(۷) عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهُمَا قَالَ: اَقْبَلَ رَجُلٌ اِلٰی نَبِیِّ اللّٰہِ ﷺ فَقَالَ: اُبَایِعُكَ عَلَی الْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ اَبْتَغِی الْاَجْرَ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی قَالَ: فَهَلْ مِنْ وَالِدَیْكَ اَحَدٌ حَیٌّ؟ قَالَ: نَعَمْ بَلْ كِلَاهُمَا قَالَ: فَتَبْتَغِی الْاَجْرَ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی؟ قَالَ: نَعَمْ قَالَ: فَارْجِعْ اِلٰی وَالِدَیْكَ فَاَحْسِنْ صُحْبَتَهُمَا (صحیح بخاری: کتاب الجھاد' باب: الجھاد باذن الوالدین؛ صحیح مسلم: کتاب البرّ والصّلۃ' باب: برّ الوالدین وأیّھما أحقّ بہ)

''حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک آدمی نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور عرض کیا: میں آپ سے ہجرت اور جہاد پر بیعت کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے اجر کا طالب ہوں آپ نے پوچھا: تیرے ماں باپ میں سے کوئی زندہ ہے؟ اُس نے کہا: ہاں بلکہ دونوں ہی زندہ ہیں آپ نے اُس سے پوچھا: کیا تو واقعی اللہ تعالیٰ سے اجر کا طالب ہے؟ اُس نے کہا: ہاں۔ آپ نے فرمایا: پھر تو اپنے والدین کے پاس لوٹ جا اور اُن کی اچھی طرح خدمت کر۔''

''جہاد عام حالات میں فرضِ کفایہ ہے۔ یعنی مسلمانوں کی پوری آبادی میں سے حسبِ ضرورت کچھ لوگ جہاد میں حصہ لیں تو سب کی طرف سے جہاد کا فرض ادا ہو جائے گا۔ اس صورت میں جہاد میں حصہ لینے کے لئے والدین کی اجازت ضروری ہے کیونکہ اُن کی خدمت فرضِ عین ہے۔ فرضِ کفایہ کی ادائیگی کے لئے فرضِ عین چھوڑنا جائز نہیں ہے۔ حدیث میں اسی صورت کا بیان ہے۔ البتہ بعض مخصوص حالات میں جہاد فرضِ عین ہو جاتا ہے۔ اُس وقت والدین کی اجازت ضروری نہیں کیونکہ اُس وقت ہر شخص کے لئے جہاد میں حصہ لینا ناگزیر ہوتا ہے' خصوصاً اُس وقت جب دشمن حد سے بڑھ جائے اور نظریاتی اور ملکی سرحدوں پر حملہ آور ہو۔'' (''ریاض الصالحین'' للنووی' ج ۱' ص ۲۹۹)

(۸) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهُ قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ فَقَالَ: یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! مَنْ اَحَقُّ النَّاسِ بِحُسْنِ صَحَابَتِیْ؟ قَالَ: اُمُّكَ قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: اُمُّكَ قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: اُمُّكَ قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: اَبُوْكَ (صحیح بخاری: کتاب الادب' باب: من احقّ بحسن الصحبۃ: صحیح مسلم: کتاب البرّ والصّلۃ' باب: برّ الوالدین وانھما احق بہ)

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میرے حسنِ سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ آپ نے فرمایا: تمہاری ماں ۔ اُس نے کہا: پھر کون؟ آپ نے فرمایا: تمہاری ماں ۔ اُس نے کہا: پھر کون؟ آپ نے فرمایا: تمہاری ماں ۔ اُس نے پھر پوچھا: پھر کون؟ آپ نے فرمایا: تمہارا باپ ۔“

اِس حدیثِ مبارکہ میں باپ کے مقابلہ میں ماں کا حق مقدم اور تین گنا زیادہ بتلایا گیا ہے ۔ اِس کی ایک وجہ تو مرد کے مقابلے میں عورت کا ضُعف اور اُس کا زیادہ ضرورتمند ہونا ہے ۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ تین تکلیفیں ایسی ہیں جو صرف ماں اولاد کے لئے برداشت کرتی ہے' باپ اُس میں شریک نہیں ہوتا ۔ (۱) نو ماہ تک حمل کی تکلیف' (۲) زچگی کی تکلیف جس میں عورت کو موت و حیات کی کشمکش کے جاں گداز مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے ۔ (۳) پھر دو سال تک رضاعت (دودھ پلانے) کی تکلیف جس میں اُس کی راتوں کی نیند بھی خراب ہوتی ہے' اُس کا حسن اور صحت بھی متاثر ہوتی ہے اور بچے کے آرام و راحت کے لئے بعض دفعہ خوراک میں بھی احتیاط اور پرہیز کی ضرورت پیش آتی ہے ۔

(۹) عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ رَجُلاً أَتَاهُ فَقَالَ: إِنَّ لِي امْرَأَةً وَإِنَّ أُمِّي تَأْمُرُنِي بِطَلَاقِهَا؟ فَقَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ: اَلْوَالِدُ أَوْسَطُ أَبْوَابِ الْجَنَّةِ فَإِنْ شِئْتَ فَأَضِعْ ذٰلِكَ الْبَابَ أَوِ احْفَظْهُ (سنن ترمذی: ابواب البرّ والصلۃ' باب: الفضل فی رضا الوالدین)

”حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اُن کے پاس ایک آدمی آیا اور عرض کیا: میری ایک بیوی ہے' میری ماں مجھے اُسے طلاق دینے کا حکم دیتی ہے' میں کیا کروں؟ حضرت ابو الدرداء نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ والد جنت کے دروازوں میں سے بہترین دروازہ ہے' پس اگر تو چاہے تو اس دروازے کو ضائع کر دے یا اُس کی حفاظت کرے ۔“

”وَالِد“ کے لغوی معنی ہیں ”جننے والا“ ۔ اس اعتبار سے اِس کا اطلاق ماں اور باپ دونوں پر ہوتا ہے اور جس طرح والدین (بہ صیغہ تثنیہ) سے مراد ماں باپ دونوں ہوتے ہیں' ”وَالِد“ کا اطلاق بھی دونوں پر ہو جاتا ہے ۔ اس حدیثِ مبارکہ میں بیوی کی محبت پر والدین کی اطاعت و رضامندی کو ترجیح دینے کی تاکید ہے ۔

(۱۰) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: رَغِمَ أَنْفُ، ثُمَّ رَغِمَ أَنْفُ، ثُمَّ رَغِمَ أَنْفُ، مَنْ أَدْرَكَ أَبَوَيْهِ عِنْدَ الْكِبَرِ أَحَدَهُمَا أَوْ كِلَيْهِمَا فَلَمْ يَدْخُلِ الْجَنَّةَ (صحیح مسلم: کتاب البرّ والصلۃ' باب: رغم انف من ادرک ابویہ او احدھما ۔۔۔)

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ناک خاک آلود ہو' پھر ناک خاک آلود ہو' پھر ناک خاک آلود ہو اُس شخص کی جس نے اپنے والدین کو (اُن کے) بڑھاپے میں اُن میں سے ایک کو یا دونوں کو پایا اور پھر بھی (اُن کی خدمت کر کے) جنت میں نہیں گیا ۔“

رَغَام مٹی کو کہتے ہیں ۔ ناک کا خاک آلودہ ہونا کنایہ ہے ذلّت سے ۔ گویا اُس کی ناک مٹی میں مل گئی ۔

اِس میں اپنے بدنصیب کے لئے بددعا یا اُس کے انجام بد کی خبر ہے جو اپنے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک اور اُن کی خدمت کر کے اپنے رب کو راضی نہیں کرتا۔ والدین کی خدمت تو ہر عمر میں ضروری ہے' وہ جوان ہوں تب بھی۔ حدیث میں بڑھاپے کا ذکر اس لئے ہے کہ کبرسنی (بڑھاپے) میں والدین خدمت اور نیکی کے زیادہ ضرورت مند ہوتے ہیں۔ احتیاج اور ضُعف کے اِس دور میں اُنہیں حالات کے رحم وکرم پر چھوڑ دینا' نہایت سنگ دلانہ جرم اور چند در چند قبیح فعل ہے اور اپنی اِس ذلیل حرکت کی وجہ سے وہ جنت سے محروم ہو جاتا ہے۔

(۱۱) عَنْ أَبِي أَيُّوبَ خَالِدِ بْنِ زَيْدِ الْأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ رَجُلًا قَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! أَخْبِرْنِي بِعَمَلٍ يُدْخِلُنِي الْجَنَّةَ وَيُبَاعِدُنِي مِنَ النَّارِ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: تَعْبُدُ اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا وَتُقِيمُ الصَّلَاةَ وَتُؤْتِي الزَّكٰوةَ وَتَصِلُ الرَّحِمَ (صحیح بخاری: کتاب الزکوٰۃ' باب: وجوب الزکوٰۃ ؛ صحیح مسلم: کتاب الایمان' باب: بیان الایمان الذی یدخل بہ الجنۃ)

''حضرت ابوایوب خالد بن زید انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے کہا: یارسول اللہ! مجھے ایسا عمل بتایئے جو مجھے جنت میں داخل کردے اور جہنم سے دُور کردے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تم (صرف) اللہ کی عبادت کرو' اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ' زکوٰۃ ادا کرو اور صلہ رحمی کرو۔''

ماں باپ کی نافرمانی کرنے اور رشتہ داری توڑنے سے متعلق احادیث

(۱) عَنْ أَبِي مُحَمَّدٍ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعَمٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَاطِعٌ'' (بخاری: کتاب الادب' باب: اثم القاطع ؛ صحیح مسلم: کتاب البر والصلۃ' باب: صلۃ الرحم وتحریم قطیعتھا)

''حضرت ابومحمد جُبیر بن مُطعم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قطع رحمی کرنے والا جنت میں داخل نہ ہوگا۔''

اس حدیثِ مبارکہ میں قطع رحمی پر کتنی سخت وعید ہے! اس کے باوجود ہمارے معاشرے میں یہ گناہِ کبیرہ عام ہے۔ اِس قسم کی سخت وعیدوں کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان اِن گناہوں سے بچ کر رہیں۔

(۲) عَنْ أَبِي عِيسَى الْمُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى حَرَّمَ عَلَيْكُمْ عُقُوقَ الْأُمَّهَاتِ وَمَنْعًا وَهَاتِ وَوَأْدَ الْبَنَاتِ وَكَرِهَ لَكُمْ قِيلَ وَقَالَ وَكَثْرَةَ السُّؤَالِ وَإِضَاعَةَ الْمَالِ (صحیح بخاری: کتاب الادب' باب: عقوق الوالدین من الکبائر ؛ صحیح مسلم: کتاب الاقضیۃ' باب: النھی عن کثرۃ المسائل من غیر حاجۃ)

''حضرت ابوعیسیٰ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: بے شک اللہ نے تم پر ماؤں کی نافرمانی کرنے کو' (بہ وقتِ ضرورت) خرچ نہ کرنے اور (بغیر ضرورت کے) سوال

سوال کرنے کو' لڑکیوں کے زندہ درگور کرنے کو حرام کیا ہے اور قیل وقال (فضول بحث وگفتگو) کو' کثرتِ سوال کو اور مال کے ضائع کرنے کو تمہارے لئے ناپسند کیا ہے۔''

مال کو سورۃ النساء کی آیت ۵ میں مایۂ زندگی (زندگی کا سہارا) کہا ہے' اس لئے اُس کا ضائع کرنا یا اُسے بے جا خرچ کرنا کبیرہ گناہ ہے۔

(۳) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: اَلْكَبَائِرُ اَلْاِشْرَاكُ بِاللّٰهِ وَعُقُوْقُ الْوَالِدَيْنِ وَقَتْلُ النَّفْسِ وَالْيَمِيْنُ الْغَمُوْسُ (صحیح بخاری: کتاب الایمان والنذور' باب الیمین الغموس)

''حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کبیرہ گناہ (یہ یہ) ہیں: اللہ کے ساتھ شریک کرنا' ماں باپ کی نافرمانی کرنا' قتلِ نفس (ناحق کسی کو ماردینا یا خودکشی کرنا اور جھوٹی قسم کھانا۔''

"یمینِ غموس'' (جھوٹی قسم) وہ ہے کہ جان بوجھ کر انسان جھوٹی قسم کھائے' اسے غموس اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ قسم کھانے والے کو گناہ میں ڈبو دیتی ہے۔''

(۴) وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: مِنَ الْكَبَائِرِ شَتْمُ الرَّجُلِ وَالِدَيْهِ ا قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَوَ هَلْ يَشْتِمُ الرَّجُلُ وَالِدَيْهِ؟ قَالَ: نَعَمْ يَسُبُّ الرَّجُلُ اَبَا الرَّجُلِ فَيَسُبُّ اَبَاهُ وَيَسُبُّ اُمَّهُ' (صحیح بخاری: کتاب الادب' باب: لایسب الرجل والدیہ ؛ صحیح مسلم: کتاب الایمان' باب: بیان الکبائر واکبرھا)

''اُنہی حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کبیرہ گناہوں میں سے ایک یہ (بھی) ہے کہ آدمی اپنے والدین کو گالی دے۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا آدمی اپنے ماں باپ کو (بھی) گالی دیتا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں' ایک شخص کسی کے باپ کو گالی دیتا ہے' وہ (پلٹ کر) اُس کے باپ کو گالی دیتا ہے۔ (اِسی طرح) وہ اُس کی ماں کو گالی دیتا ہے اور وہ (جواب میں) اُس کی ماں کو گالی دیتا ہے (یوں گویا وہ اپنے والدین کی گالی کا سبب بنا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ انسان کو کسی دوسرے کے والدین کو گالی نہیں دینی چاہئے' کیونکہ اس طرح وہ بھی جواب میں اُس کے والدین کو گالی دے گا کہ کوئی بھی شخص اپنے والدین کے لئے گالی اور گندی زبان سننا پسند نہیں کرسکتا۔ اور یوں یہ اپنے والدین کی ذلّت اور بے توقیری کا باعث بنے گا۔

(۱۰۷) صحافت (Journalism) اور اسلام

صحافت اور صحافی کے الفاظ عربی زبان کے لفظ ''صـحـیـفـہ'' سے نکلے ہیں اور انگریزی میں بالترتیب Journalism اور Journalist کے ترجمے کے طور پر ہمارے ہاں رائج ہوئے ہیں۔

''صَحِیفَہ'' کے معنی پھیلی ہوئی چیز کے ہیں جیسے صَحِیفَۃُ الْوَجْہ (چہرے کا پھیلاؤ) اور وہ چیز جس میں کچھ لکھا جاتا ہے اُسے بھی ''صَحِیفَہ'' کہتے ہیں۔ اس کی جمع صَحائِف اور صُحُف آتی ہے۔'' (''اسلام کا قانونِ صحافت''۔ ڈاکٹر لیاقت علی خان نیازی' صفحہ ۲۹' مطبوعہ معراج دین پرنٹرز لاہور' ۱۹۹۵ء)

شہرہ آفاق لغت نویس ابن منظور افریقی ''لسان العرب'' کے صفحات ۱۸۶' ۱۸۷ پر رقمطراز ہیں:

اَلْمُصْحَفُ اَلْجَامِعُ لِلصُّحُفِ الْمَکْتُوْبَۃِ بَیْنَ الدَّفَّتَیْنِ کَاَنَّمَا صُحُف''۔ قَالَ الزُّھْرِیُّ: وَاِنَّمَاسُمِّیَ الْمُصْحَفُ مُصْحَفًا لِاَنَّہٗ اُصْحَفُ اَیْ جُعِلَ جَامِعًا لِلصُّحُفِ الْمَکْتُوْبَۃِ بَیْنَ الدَّفَّتَیْنِ۔ قَالَ الْفَرَّاءُ: وَقَوْلُہٗ مُصْحَف'' مِنْ اُصْحَف اَیْ جُمِعَتْ فِیْہِ الصُّحُفُ

''اَلْمُصْحَف سے مراد وہ کتاب ہے جو دو اوراق کے درمیان تمام صحیفوں (تحریروں) کو جمع کرنے والی ہو گویا اُسے جمع کیا گیا ہے۔ امام زُہری کا قول ہے کہ مُصحف کو مُصحف اس لئے کہتے ہیں کیونکہ یہ دو اَوراق میں لکھی ہوئی تمام تحریروں کو جمع کرتا ہے۔ امام فرّاء کا قول ہے کہ مُصحف سے مراد وہ کتاب ہے جس میں صحائف جمع کئے گئے ہوں''

اُردو دائرۃ المعاف اسلام کی جلد ۱۲ (دانش گاہ پنجاب ۱۹۷۳ء ایڈیشن) میں مضمون ''صحیفۃ'' کا مقالہ نگار لکھتا ہے:

''صحیفہ کے لغوی معنی وہ چیز ہے جس پر کچھ لکھا جاسکے۔ اِسی مناسبت سے ورق کی ایک جانب' یعنی صفحہ کو صحیفہ کہتے ہیں اور جدید عربی میں صحیفہ بمعنی جریدہ اور اخبار بھی مستعمل ہے۔''

اس کے علاوہ قرآنِ کریم' حدیثِ نبوی ﷺ' اور عربی ادب میں یہ لفظ کئی ایک معنی میں استعمال ہوا ہے' مثلاً نامہ اعمال (عَبَس: ۱۳؛ اَلتَّکوِیر: ۱۰)' خط یا مکتوب (اَلْمُدَّثِّر: ۵۲)' حکم نامہ یا فرمان اور کتبِ ساویہ (طٰہٰ: ۱۳۳؛ اَلنَّجم: ۳۶؛ الاعلیٰ: ۱۸' ۱۹؛ اَلْبَیِّنَۃ: ۲)۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی جانب سے اُس کے سچے رسولوں پر نازل کی جانے کتابوں اور اَحکامِ ہدایت کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

علامہ وحید الزماں ''لغات الحدیث'' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی کے صفحات ۲۴' ۲۵ پر رقمطراز ہیں:

''اَلصَّحِیفَۃ لکھا ہوا کاغذ (اس کی جمع صَحائِف اور صُحُف ہے)''

قرآنِ کریم میں یہ لفظ آٹھ مرتبہ بصورتِ جمع (صُحُف) وارد ہوا ہے۔ لیکن مفرد یعنی صحیفہ کی شکل میں نہیں آیا۔ ایک مرتبہ مطلقاً تحریر یا خط و مکتوب کے معنی میں آیا جہاں کفارِ مکہ (ابوجہل وغیرہ) کے اس مطالبہ کے سلسلے میں (کہ ہم تو نبوّتِ محمد ﷺ پر تب ایمان لائیں گے کہ ہم میں سے ہر فرد کے نام اللہ کی جانب سے خصوصی خط لایا جائے اور ہمیں آپ کی پیروی کا حکم دیا گیا ہو) یہ آیت نازل ہوئی:

بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ○ (اَلْمُدَّثِّر : ۵۲)

"اُن میں سے ہر شخص یہی چاہتا ہے کہ اُس کے پاس کھلے خط یا تحریریں لائی جائیں۔" (۵۲ : ۷۴)

نیو انسائیکلو پیڈیا بریٹینیکا کی جلد ششم کے صفحہ ۶۲۷ پر فاضل مقالہ نگار رقمطراز ہے:

"پمفلٹوں' اخبارات' میگزین' ریڈیو کی حرکی تصاویر' ٹیلیویژن اور کتب جیسے ذرائع اِبلاغ کے ذریعے خبروں' (اُن پر) تبصرے اور نمایاں مواد کے اکٹھا کرنے' تیار کرنے اور تقسیم کرنے کا نام صحافت ہے۔ صحافت (جرنلزم) کے لفظ کا اطلاق ابتداء میں واقعاتِ حاضرہ کو بالخصوص اخبارات کی مطبوعہ شکل میں پیش کرنے پر ہوتا تھا لیکن بیسویں صدی میں ریڈیو اور ٹیلیویژن کی آمد سے "صحافت" کے لفظ کا استعمال وسیع ہو کر اُس تمام مطبوعہ اور برقیاتی ذریعہ اِبلاغ پر ہونے لگا جس کا تعلق حالاتِ حاضرہ سے ہو۔"

صحافت کی اقسام : دورِ جدید کی صحافت کو دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) **مطبوعہ صحافت** : اس قسم کی صحافت میں روزنامے' ہفت روزے' سائنسی اور ادبی جریدے' پیشہ ورانہ رسالے' سہ ماہی اور سالانہ جریدے' اشتہار' سٹکر اور دستی طور پر تقسیم کیے جانے والے اشتہار (ہینڈ بل) وغیرہ شامل ہیں۔

(۲) **برقیاتی (الیکٹرانک) صحافت** : اس قسم کی صحافت میں ریڈیو' ٹیلیویژن' وی سی آر' سلائیڈیں اور ہیڈ پروجیکٹر شامل ہیں۔" (''اسلام کا قانونِ صحافت''۔۔ ڈاکٹر لیاقت علی خان نیازی' صفحہ ۱۲۹)

صحافت کی اہمیت : ایک مشن ہونے کے علاوہ صحافت ایک صنعت بھی ہے۔ یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں حکومت اور عوام اپنے چہرے دیکھتے ہیں۔ صحافی اور کالم نگار اپنی قوم کا نمائندہ ہوتا ہے۔ وہ ایک نقاد' مصلح قائد' معلّم اور محتسب بھی ہوتا ہے۔ درحقیقت صحافت گھر کے دروازوں کی طرح ہے جن کے ذریعے روشنی اندر آتی ہے۔ جہاں صحافت مضبوط اور گہری جڑوں والی حکومتوں کو ہلا کر اور اُنہیں زیروزبر کر کے رکھ دیتی ہے' وہاں وہ کمزور و ناتواں حکومتوں کے لئے پناہ گاہ بھی ہے۔

مفتی محمد شفیع مرحوم' مولانا اشرف علی تھانوی کے رسالے ''اخبار بینی'' سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی ایک تحریر ''آداب الاخبار'' میں فرماتے ہیں:۔

''حضور سرورِ کائنات ﷺ اور صحابہ کرام اپنی اسلامی برادری کے اظہار واحوال پر مطلع ہونے' کرنے کا اہتمام اس لئے فرماتے تھے کہ مطلع ہو کر مظلوم کی دادرسی' بیمار کی عیادت' ضعفاء کی اعانت' محتاجوں کی امداد کرنے کے لئے ہر قسم کے مادّی اور روحانی ذرائع استعمال کئے جائیں اور اگر کسی مادّی امداد پر قدرت نہ ہو تو کم از کم دعا سے اُس کے شریکِ غم ہو جائیں۔''

دَورِ جدید میں صحافت کی اہمیت : جدید صحافت ہماری عائلی زندگی سے لے کر بین الاقوامی تعلقات تک کے ہر شعبہ پر محیط ہے۔ مسٹر محمد طاہر شیخ اپنے عالمانہ مضمون بہ عنوان ''رول آف میڈیا اِن اسلامک سوسائٹی'' میں لکھتے ہیں جو ۱۸ ستمبر ۱۹۹۰ء کے ''مشرق میگزین'' کے صفحہ ۸ پر چھپا :

''اپنے خیالات واحساسات کو دوسروں تک پہنچانا انسانی فطرت ہے اور اُس کے بدلہ میں اپنے ماحول اور آس پاس میں ہونے والے واقعات سے باخبر رہنا آدمی کی شدید خواہش ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابلاغِ عامہ نے اُسی وقت جنم لے لیا تھا جب انسان نے اس دھرتی پر قدم رکھا تھا۔''

مسٹر محمد علی جناح نے ۲۴ مئی ۱۹۴۴ء کو کشمیری صحافیوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

''صحافت اپنے (دوسرے) فائدوں کے ساتھ ساتھ ایک زبردست قوّت بھی ہے لیکن اس کے نقصانات بھی ہیں۔ اگر یہ صراطِ مستقیم پر چلے تو یہ راہنما ہے اور رائے عامہ کو ہموار کرتی ہے۔''

۱۴ اپریل ۱۹۴۸ء کو سرکاری افسروں کو خطاب کرتے ہوئے اُنہوں نے کہا تھا:

''کسی قوم کی ترقی اور فلاح وبہبود کے لئے صحافت ناگزیر ہے کیونکہ اِسی کے ذریعے قوم کی راہ نمائی ہوتی ہے اور تمام شعبہ ہائے حیات کی مختلف سرگرمیوں میں ترقی اِسی کے ذریعے ہوتی ہے۔''

معاشرے میں صحافت کی نمایاں اہمیت کو سمجھتے ہوئے مغربی ممالک نے اپنے دودھاری ناپاک مقاصد کے حصول کے لئے بے تحاشا روپیہ خرچ کیا۔ ایک طرف تو اُنہوں نے صحافت کو اپنی قوم کی ترقی' استحکام' راہنمائی' اتحاد اور تربیت کے لئے استعمال کیا تو دوسری طرف اُنہوں نے پسماندہ اقوام کا اِس حد تک استحصال کیا کہ اُن اقوام کی اپنی تہذیب وثقافت' قومی روایات' مقصدِ حیات اور اقدارِ حیات اُن کی اپنی نظروں میں ذہنی غلامی کی وجہ سے مضحکہ خیز بن کے رہ گئے۔ اس طرح اس خطرناک ہتھیار نے غالب قوموں کو اتنے مفادات دئے جو ایک بڑی بھاری اور زبردست عسکری قوت بھی نہ دے سکتی تھی۔ آج اس تمام عمل کو ''سرد جنگ'' کا نام دیا جاتا ہے جو بندوقوں اور گولیوں کی بجائے ابلاغِ عامہ اور شہرت واشاعت کے ذریعے لڑی جاتی ہے۔

اِس تباہ کن ذریعہ ابلاغ کے دُوررَس مہیب نتائج کا اندازہ اِس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ چالیس سے زائد خود مختار مسلم ممالک میں سے کوئی ایک ملک بھی قرآن وسنت کے وضع کردہ ضابطہ کے مطابق اپنی حکومت نہیں چلا رہا جس کی محض وجہ یہی ہے کہ اسلام کے متعلق مغربی ذرائع ابلاغ کی جانب سے مشتہر کئے گئے شکوک و شبہات کے زیرِ اثر یہ مسلم ممالک وحدتِ فکر سے محروم کر دئے گئے ہیں۔ مغربی میڈیا نے ان ممالک کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا ہے اور اُنہیں کہیں تو کمیونسٹ اور سرمایہ دارانہ حامیوں اور کہیں روایت پسند اور ''جدید روشنی'' کے گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ مسلم اُمّہ جسے قرآنی اصطلاح میں بُنیان مَرصُوص (سیسہ پلائی گئی عمارت) ہونا چاہئے تھا' اب شکلاً بگڑ کر مویشیوں کے منتشر گلے میں تبدیل ہوگئی ہے۔

عالمِ اسلام میں اِحیائے اسلام کی تحریکیں مغربی میڈیا کی شرارتوں کا خاص ہدف ہیں۔ یہودی ذریعہ ابلاغ نے مصر میں جمال عبدالناصر کے ذریعے ''اِخوان المسلمین'' کی تحریک کو دبانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ یہودی طبقہ کی نشر واشاعت کا عوامی نفسیات پر اتنا زبردست قبضہ تھا کہ پاکستان اور دوسرے ممالک کے بہت سے مخلص مسلمان بہت عرصے تک اس خام خیالی میں مبتلا رہے کہ اِخوان خطا کار تھے اور ناصر صحیح تھا۔

مغربی ذریعہ اطلاعات وابلاغ ہم ہی میں ایسے صحافی پیدا کرنے میں پیچھے نہیں رہا جو یہ لیبل لگانے میں ذرّہ بھر نہیں ہچکچاتے کہ اسلامی اقدار (معاذ اللہ) دیوانے کی بڑ ہیں اور اسلام ایک گھسا پٹا مذہب ہے۔ اسلام کے احیاء اور اُس کی سربلندی کے لئے کام کرنے والے کی ٹانگ کھینچنا اور اُن کی تخویف (Black-mailing) اِن ''نئی روشنی'' کے حاملین کا فرضِ منصبی بن کے رہ گیا ہے۔

قرآن حکیم کے مطابق مقصدِ صحافت : قرآنِ حکیم اور احادیثِ نبوی کی روشنی میں صحافت اور دیگر ذرائع ابلاغ کا فرض صرف رضائے الٰہی اور آخرت میں فوز وفلاح کی خاطر بنی نوعِ انسان کو نیکی' حق وصداقت کی ترغیب دینا اور برائی سے روکنا ہے۔ میڈیا کو حق وصداقت اور عدل وانصاف کو واضح طور پر ظاہر کرنے میں ذرا بھی جھجک نہیں ہونی چاہئے۔ مختصر اور جامع بات یہ ہے کہ قرآنِ حکیم نے اس طرح تعمیرِ کردار کا پروگرام تشکیل دیا ہے جو بالآخر صحیح خطوط پر تعمیرِ ملّت کی تشکیل کرتا ہے۔ مسلم اُمّت کو خطاب کرتے ہوئے قرآن فرماتا ہے :

کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ

''تم لوگ بہترین جماعت ہو جو لوگوں کے لئے پیدا کی گئی ہے' تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔'' (۳ : ۱۱۰)

''اِس آیت کی روشنی میں دو باتیں کھل کر سامنے آتی ہیں جو امتِ مسلمہ کا فریضہ ہیں: (۱) ایک تو معروف یعنی زندگی کی اُن اقدار کا ابلاغ جو عقیدہِ عالم کی نگاہ میں ہمیشہ سے انسانی معاشرہ کی بقاء اور ارتقاء کے لئے ضروری خیال کی جاتی رہی ہیں۔ (۲) اور دوسرے یہ کہ معاشرے کو ایسے افکار ونظریات سے روکنا جو عام طور پر انسانی معاشرے کی تباہی اور گراوٹ کا باعث بنتے ہیں۔''

"یہ ذمہ داری تمام امت کی ہے اور جو حکومت اللہ کی طرف سے نیابت وخلافت کا فریضہ انجام دیتی ہے تو اُس کی بھی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اپنے دستیاب وسائل کو استعمال کر کے ابلاغ کے اس قرآنی فریضہ کو بجالائے۔ قرآنِ حکیم نے اس دعوت وابلاغ کے بڑے زرّیں اصول عطا فرمائے ہیں۔ مثلاً فرمایا:

اُدعُ اِلٰی سَبِیلِ رَبِّكَ بِالحِکْمَةِ وَالمَوْعِظَةِ الحَسَنَةِ (اَلنَّحل: ۱۲۵)

"آپ اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعے دعوت دیجئے۔" (۱۶:۱۲۵)

"یعنی ابلاغ میں حکیمانہ طریقے اختیار کئے جائیں۔ یہ ایک ایسا لفظ ہے جس میں تمام فنی اور عقلی خوبیاں جمع کرنے کا حکم دیا جارہا ہے۔ ابلاغ میں یہ رعایت رکھی جائے کہ لوگ تنگ دل نہ ہوں' اُنہیں بارِ خاطر نہ ہو' وقت اور موقع کا خیال رکھا جائے اور سامعین کی نفسیات کو ملحوظ رکھا جائے۔" ("اسلام کا قانونِ صحافت"۔۔ ڈاکٹر لیاقت علی خان نیازی' صفحہ ۱۰۹)

اِس مقصد کو جامعہ پنجاب لاہور کے شعبہ صحافت کے سابق صدر ڈاکٹر مسکین علی حجازی نے ایک ہی فقرے میں بڑے جامع طور پر بیان کیا ہے:

"صحافت اور صحافی کا اصل مقصد لوگوں کو معلوماتِ جدیدہ فراہم کرنا' اُنہیں تعلیم دینا' اُن کی راہ نمائی کرنا اور اُنہیں تفریح مہیا کرنا ہے۔"

"صحافت کی تاریخ"

"قبل از اسلام: اِس دَور میں ذرائع ابلاغ مندرجہ ذیل تھے:

"(۱) شعروشاعری: شعراء اپنے قبائل کو جنگ کے لئے اکساتے' بہادر جوانوں کے حق میں قصائد لکھتے اور دشمن قبیلے کی ہجو کہتے۔ جنگ میں ساتھ ساتھ ہوتے تھے اور اپنی شاعری کے ذریعے قبائل کی مکمل رپورٹنگ کرتے۔ اِس زمانے کی شاعری میں فحش گوئی بہت ہے۔ دیوانِ حماسہ کا باب "مذمّة النساء" اِس ضمن میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔"

"(۲) میلے اور بازار: اِن میلوں میں قابلِ ذکر میلے عُکاظ' مجنّہ اور ذوالمجاز تھے۔ عکاظ کا میلہ ذیقعدہ کی پہلی تاریخ کو شروع ہوتا جس میں شعراء کلام سناتے اور طرح طرح کی خبریں مختلف جمع شدہ قبائل تک پہنچتیں۔"

"(۳) خطبات اور وصیتیں: خطبہ بھری محفلوں میں دیا جاتا تھا جس میں لوگوں کو نیکی کی ترغیب دی جاتی اور برائی سے روکا جاتا تھا۔ وصیت میں مخصوص جمع شدہ لوگوں کو پیغامات دئے جاتے۔ مقررین اور خطیبوں میں قس بن ساعدۃ الایادی بہت مشہور تھا۔ وہ نجران کا پادری اور عرب کا مشہور فلسفی تھا۔ وہ اپنے خطبوں میں لوگوں کو خدا کی

طرف بلاتا۔ اونچی جگہ پر کھڑا ہو کر خطبہ دیتا تھا اور خطبہ "اَمّا بَعْد" کہہ کر شروع کرتا اور تلوار کا سہارا لیتا۔ حضور اکرم ﷺ نے عکاظ کے میلے میں اُس کی تقریر سنی اور پسند فرمائی اور آپ نے بھی اپنے خطبے "اَمّا بَعْد" کہہ کر شروع کئے اور عصا مبارک کا سہارا لیتے تھے۔"

"(۴) معلقات: زمانہ جاہلیت میں شعراء عربوں کے پسندیدہ قصائد کو آبِ زر سے لکھوا کر اظہارِ مقبولیت اور مشہوری کے لئے کعبہ پر آویزاں کر دیتے تھے۔ سات قصیدوں کے کہنے والوں میں سے امراؤالقیس، عمرو بن کلثوم اور زُہیر بن ابی سُلمٰی وغیرہ ہیں۔ یہ طریقہ بھی ابلاغ اور تشہیر کا تھا۔"

"علاوہ ازیں قبل از اسلام کے دَور میں کاہن بھی مختلف قبیلوں کی خبریں سناتے۔ قصہ گو بھی مختلف علاقوں اور قبیلوں کے قصے سناتے تھے۔"

"تجارتی سفر: دُور دراز کے تجارتی سفیروں سے بھی تجار معلومات لاتے۔ یہ بھی اُس دور میں ابلاغ کا ایک ذریعہ تھا۔"

"عرب کے علاوہ ایران میں اسلام سے پہلے نامہ نگاروں کو وقائع نگار اور روزنامہ نویس کہا جاتا تھا۔ ایران کے ایک قدیم کتابچے (نامہ تسر) میں لکھا ہے کہ وقائع نگار شہنشاہ کے چشم گواہ ہوتے ہیں۔" ("اسلام کا قانونِ صحافت"۔۔۔ ڈاکٹر لیاقت علی خان نیازی، صفحات ۱۱۲، ۱۱۳)

دَورِ نبوی میں صحافت: اسلام نے بنی نوعِ انسان کے لئے بلند اخلاق معیار مقرر کیا۔ قرآن وحدیث تمام قوم کا دستور العمل بن گئے۔ صحافت کا شعبہ بھی اس سے زبردست متاثر ہوا۔

"آپ ﷺ کے دَورِ مبارک میں صحافت کی وہ صورتِ حال تو نہیں تھی جو آج کے دَور میں ہے لیکن ظاہر ہے کہ ذرائع ابلاغ تو موجود تھے۔ ایک مستشرق کہتا ہے کہ اُس دَور میں ٹیلیویژن اور ریڈیو نہ ہونے کے باوجود اتنے کم عرصے میں نبی اکرم ﷺ کا انقلاب لانا معجزے سے کم نہیں۔ عہدِ رسالتمآب ﷺ میں دائرۂ شاعری تنگ ہو گیا۔ خطابت کی وسعتیں سمٹ سمٹا کر قرآنِ حکیم کے جھنڈے تلے آ گئیں۔ بقول استاد احمد حسن زیات:

"اس عظیم الشان قرآنی دعوت کا ایک لازمی تقاضا خط وکتابت کے سلسلہ کا جاری کرنا تھا۔ چنانچہ یہ سلسلۂ جدید رونما ہو گیا۔ قرآنِ حکیم کی حفاظت وتعلیم کا سلسلہ عام کرنا شروع کر دیا۔" ("تاریخ ادبِ عربی" ص ۱۵۵)

"حضور علیہ السلام کے تبلیغی خطوط اور رسائل: آفاقی اور کل کائناتی پیغمبر ہونے کے لحاظ سے آپ ﷺ پر اللہ کی طرف سے عائد کردہ فریضہ تھا کہ آپ کل نوع انسانی کو اللہ کی طرف سے لائے ہوئے پیغام کی طرف

بلائیں۔ اس مقصد کے لئے آپ نے صلح حدیبیہ کے بعد مختلف قبائل کے سرداروں، دنیا کے مختلف بادشاہوں اور حکمرانوں کو اسلام کی دعوت دیتے ہوئے خطوط ارسال فرمائے جو اعلیٰ فصاحت و بلاغت کی عمدہ ترین مثال ہیں۔ مؤرخین کے نزدیک ایسے ناموں کی تعداد ۲۵۰ سے زائد ہے۔ بعض تبلیغی خطوط کی تفصیل درج ذیل ہے:۔

نام ملک	نام حکمران	قاصد نبوی کا اسم گرامی
(۱) حبشہ	نجاشی	جعفر طیار، حضرت عمر رضی اللہ عنہما
(۲) مصر	مقوقس	حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ
(۳) ایران	خسرو پرویز	حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ
(۴) روم	ہرقل	حضرت دحیہ بن خلیفہ کلبی رضی اللہ عنہ
(۵) یمامہ	ہوزہ بن علی	حضرت سلیط بن عمرو رضی اللہ عنہ
(۶) بحرین	منذر بن ساوی	حضرت علاء بن الحضرمی رضی اللہ عنہ
(۷) عمان	جیفر بن جلندی بن عامر	حضرت عمرو ابن العاص رضی اللہ عنہ
(۸) دمشق	حارث بن ابی شمر غسانی	حضرت شجاع بن وہب اسدی رضی اللہ عنہ

خواتین میں تبلیغ: نبی اکرم ﷺ نے اپنی تمام ازواجِ مطہرات کو قرآنِ حکیم، اپنی سنتِ مبارکہ اور فقہ کی گہری اور ٹھوس تعلیم دے رکھی تھی تاکہ وہ روزمرہ کے مسائل میں اپنی بنات ہائے جنس کی راہبری کر سکیں۔ اُن ازواجِ مطہرات کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

(۱) حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا
(۲) حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا
(۳) حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا
(۴) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا
(۵) حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا
(۶) حضرت اُمِّ سلمٰی رضی اللہ عنہا
(۷) حضرت زینب بن جحش رضی اللہ عنہا
(۸) حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا
(۹) حضرت اُمِّ حبیبہ رضی اللہ عنہا
(۱۰) حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا
(۱۱) حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا

''علاوہ ازیں آپ نے حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا سے بھی نکاح فرمایا جنہیں مقوقس فرمانروائے مصر نے آپ ﷺ کی خدمت میں بطور ہدیہ ارسال کیا تھا۔ حضرت ریحانہ بنت زید اور حضرت جمیلہ رضی اللہ عنہا بھی رشتہ ازدواجیت میں آئیں۔'' (''اسلام کا قانونِ صحافت'' صفحات ۱۰۷، ۱۰۸)

آپ ﷺ نے مختلف عمر اور لیاقت کی اتنی خواتین کو منتخب فرما لیا جو تبلیغ کے مقصد کے لئے کافی ہوں۔ پھر آپ نے اُنہیں تعلیم اور تربیت دی اور احکامِ شریعت سکھائے، اسلامی تہذیب وثقافت سے اِس طرح آراستہ کیا

کہ وہ دیہاتی اور شہری' بوڑھی اور جوان ہر طرح کی عورتوں کی تربیت کرسکیں اور اُنہیں مسائل شریعت سکھا سکیں اور اِس طرح عورتوں میں تبلیغ کی مہم کے لئے کافی ہوسکیں ۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کے مشن کا پیغام اُمت تک پہنچانے کا سہرا زیادہ تر ان اُمہات المؤمنین ہی کے سر ہے۔ اُن میں بھی بالخصوص وہ اُمہات المؤمنین ہیں جنہوں نے طویل عمر پائی ۔''

خطبہ حجۃ الوداع میں نبی اکرم ﷺ نے اپنے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو بہ تاکید فرمایا کہ وہ اُن کے پیغام کو اُن لوگوں تک پہنچا دیں جو وہاں اُس وقت موجود نہیں تھے اور آپ کی اس ترغیب نے بھی اسلامی صحافت کے شعبہ کو ترقی دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ اِسی طرح سالانہ حج اور مسلمانوں کا ایک مرکزی مقام پر اکٹھا ہونا بھی صحافت کو ترقی دینے کا ایک مؤثر اور کامیاب ذریعہ ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خطاب کرتے ہوئے قرآنِ حکیم سالانہ فریضۂ حج کے متعلق یوں بات کرتا ہے:

وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ ۝ لِّيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ (اَلْحَجّ : ۲۷، ۲۸)

" اور لوگوں میں حج کا اعلان کردو' لوگ تمہارے پاس پیدل بھی آئیں گے اور دُبلی اونٹنیوں پر بھی جو دُور دراز راستوں سے پہنچی ہوں گی تاکہ وہ اپنے فوائد کے لئے آموجود ہوں ۔'' (۲۲ : ۲۷، ۲۸)

يَأْتُوكَ میں كَ بول کر جگہ مراد لی گئی۔ معنًا یہ دراصل يَأْتُوا بَيْتَكَ یا مَقَامَكَ ہے۔ (تفسیر نعیمی' جلد ۱۷' صفحہ ۷۴۹' لاہور مطبوعہ اکتوبر ۱۹۹۹ء/ رجمادی الثانی ۱۴۲۰ھ)

حج میں ہماری مادّی اور روحانی دونوں طرح کی زندگی میں فوائد ہیں لیکن اصلاً تو منافع اُخروی ہیں مثلاً حج' عمرہ' رضائے الٰہی اور تبعًا دُنیوی بھی مثلاً تجارت' البتہ دُنیوی منافع کو مستقل مقصود بنا لینا ممنوع ہے۔ احکامِ الٰہی کی تعمیل بذاتِ خود سب سے بڑی روحانی لذت ہے۔ پھر اسلام کے مولد' سردارِ اسلام ﷺ کا وطن اور اُن تمام مقامات کی زیارت جن سے اسلام و سردارِ اسلام دونوں کی اوّلیں تاریخ وابستہ ہے' کس درجہ سبق آموز' ولولہ انگیز و مؤثر ہوسکتی ہے! دُنیوی و ملّی حیثیت کو لیجئے تو مسلمانانِ عالم کے درمیان تبادلۂ خیالات اور یک جہتی پیدا کرنے نیز بین الاقوامی تجارت و سیاست کے لئے اس سالانہ عالمگیر اجتماع سے بہتر ذریعہ اور کیا ہوسکتا ہے؟ مدینہ منوّرہ میں مسجدِ نبوی نے بالخصوص دُور دراز سے آنے والوں کے لئے ذریعۂ تبلیغ کا کام دیا۔ اور افراد کو اکثر بحری سفر کے جو لمبے تجربے ہو جاتے ہیں وہ ان سب کے علاوہ ہیں۔

''<u>خلفائے راشدین کے دَور میں صحافت اور ابلاغ</u>: ریاستِ اسلامی کے امیر المؤمنین ہونے کا منصب سنبھالنے کے دن ہی سے ہر خلیفۂ راشد نے ہر عام و خاص کو آزادیٔ رائے دے کر صحافت کے اصول وضع کردئے تھے۔ مثال کے طور پر پہلے خلیفۂ راشد سیّدنا ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ کے خطبۂ خلافت میں آج کے عوام' صحافیوں اور حکومت کے عہدہ داران کے لئے اصول موجود ہیں۔ آپ نے فرمایا:

''لوگو! میں تم پر حاکم بنایا گیا ہوں حالانکہ میں تمہاری جماعت میں سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں اچھا کام کروں تو میری اطاعت کرو اور اگر غلط راہ پر چلوں تو مجھے سیدھا کر دو۔ سچائی امانت اور جھوٹ خیانت ہے۔ تمہارا ضعیف فرد بھی میرے نزدیک قوی ہے جب تک کہ میں دوسروں سے اُس کا حق نہ دلا دوں۔ اور تم میں سے قوی ترین شخص میرے نزدیک کمزور ہے جب تک کہ میں اُس سے دوسروں کا حق نہ لے لوں۔''

اِسی طرح حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے پہلے خطبہِ خلافت میں ارشاد فرمایا:

''اے لوگو! اللہ نے مجھے تمہارے لئے اور تمہیں میرے لئے آزمائش بنا دیا ہے۔ جو کوئی نیک کام کرے گا' میں بھی اُس سے بھلائی کروں گا اور جو کوئی بُرائی کا مرتکب ہوگا تو میں اُسے عبرتناک سزا دوں گا۔ یاد رکھو کہ ظالموں کو میں حرفِ غلط کی طرح مٹا کر رکھ دوں گا۔''

حج کے موقع پر آپ ہر سال بڑے افسروں کو مکہ میں حاضر ہونے کا حکم دیتے اور وہاں اُن کے خلاف عوام کی طرف سے شکایات سنتے۔ آپ نے صحافت کے میدان میں جو چیدہ چیدہ کام سرانجام دئے' وہ حسبِ ذیل تھے:

(۱) ہجو کہنے والے شاعروں کو سزا دی۔
(۲) اشعار میں عورتوں کے ذکر جسے اصطلاح میں ''تشبیب'' کہتے ہیں' سے منع فرما دیا۔
(۳) مسجد بہترین ذریعہ اِبلاغ رہی۔ مساجد میں وعظ کا طریق کار جاری کیا۔

اِسی قسم کی روح بعد کے دو خلفاء (حضرت عثمانِ غنی اور حضرت علی کرّم اللہ وجھہ') کے خطبوں میں نظر آتی ہے جن میں اُنہوں نے اپنے آپ کو عام آدمی سے بہتر و افضل نہ ہونے کا برملا اعلان کیا۔

خلافتِ راشدہ کا خصوصی پہلو مجلسِ مشاورت (Privy-council) کے استحکام کا شریفانہ نظام ہے جس کی مشاورت سے تمام مسائل طے ہو جاتے تھے اور آخری شکل پا کر اُن کو عمل میں لایا جاتا تھا۔ خلفائے راشدین خود اپنے خالق و مالک اللہ اور اپنی رعایا دونوں کے آگے ذمہ دارانہ طور پر جوابدہ تھے اور اُنہوں نے ہر کہ و مہ کو اپنی ذات پر کھلی تنقید کرنے کا حق دے رکھا تھا اور اس آزادیِ رائے نے صحافت کے ادارے کو پنپنے اور مائل بہ اصلاح ہونے میں بڑی مدد دی۔

دَورِ جدید میں صحافت: ''سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے'' ایک جانی پہچانی کہاوت ہے اور مجھے بیچارہ ۔ پٹڑی سے اترے ہوئے مسلمان معاشرے کی دکھتی رگ پر تشخیصی ہاتھ رکھنے میں کوئی خوف نہیں ہے جس کی مذہب اا اخلاق سے محرومی ہماری موجودہ صحافت کو منفی سمت کو لے جانے میں بڑا کردار ادا کر رہی ہے۔

ہمارے ملک کے بعض جریدوں اور رسائل نے جنسی لٹریچر اور اخلاق باختہ غیر ملکی وڈیو کیسٹوں کے ذریعے

ہماری نوجوان نسل کے کردار کو بگاڑنے اور خراب کرنے کی ذمّہ داری لے رکھی ہے جو فحاشی اور بے حیائی کا مکمل مجسمہ ہوتی ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ گویا اِن صحافیوں کو جگہ بھرنے کے لئے کوئی اور عنوان ملتا ہی نہیں ۔اُن میں ''ضمیر کی چبھن'' نام کی کوئی چیز نہیں اور وہ اپنے قادرِ مطلق اللہ کے آگے جوابدہی کے احساس سے بالکل کورے ہیں ۔اِسی وجہ سے اُنہوں نے صحافت کو ایک منافع بخش کاروبار بنا رکھا ہے۔

امام ابنِ تیمیہ کا بیان ہے :

''بدی کو جڑ سے اُکھیڑنے اور نیکی کی تشہیر واشاعت میں عملی قدم اٹھانا مسلمانوں کا اوّلیں فریضہ ہے۔اور اگر وہ ایسا کرنے میں سست روی کا مظاہرہ کرتے ہیں تو سخت ترین عذابِ الٰہی اُن کا مقدّر بن جائے گا کیونکہ زبانِ رسول ﷺ اس سلسلہ میں بالکل غیر مبہم اور واضح ہے۔فرمایا:

(١) ''جب کبھی تم کسی بُرائی کو دیکھو اور اُسے نیکی اور خیر سے نہ بدلو تو اپنے پر عذابِ الٰہی کے انتظار میں رہو۔''

(٢) ''جب تم کسی برائی کو دیکھو تو اُسے بزورِ بازو روک دو۔اگر ایسا نہیں کر سکتے تو زبان سے اُسے روک دو اور اگر ایسا کرنے کی بھی تم میں ہمت نہیں' تو (کم از کم) دل میں تو اُسے بُرا سمجھو اور یہ (آخری درجہ) ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔''

آزادیِ صحافت کی حدود: اسلام میں آزادیِ صحافت کی حقیقت جاننے کے لئے ہمیں پہلے یہ معلوم کرنا ہوگا کہ اِس کارگاہِ عالم میں خود حضرتِ انسان کا مرتبہ و مقام کیا ہے؟ کیونکہ جب تک منصب کا تعیّن نہ ہو تو اختیارات کی تعیین بھی نہیں ہوسکتی ۔قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین میں اپنا خلیفہ یعنی نائب بنایا ہے:

وَهُوَالَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِیْ مَآ آتَاكُمْ (الانعام: ١٦٥)

''وہ وہی تو ہے جس نے تمہیں زمین کا خلیفہ بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلے میں زیادہ بلند درجے دیئے تاکہ جو کچھ تمہیں دیا ہے' اُس میں وہ تمہاری آزمائش کرے۔'' (٦:١٦٥)

اِس آیت میں لفظ ''خلیفہ'' نہیں بلکہ جمع کا صیغہ ''خَلَائِف'' استعمال ہوا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ نوعِ انسانی من حیث المجموع بھی اور اُس کا ہر فرد الگ الگ بھی اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے اور لفظ ''خلیفہ'' کا مطلب ہے:

''جو کسی کی مِلک میں اُس کے تفویض کردہ اختیارات اُس کے نائب کی حیثیت سے استعمال کرے۔ خلیفہ مالک نہیں ہوتا بلکہ اصل مالک کا نائب ہوتا ہے۔اُس کے اختیارات ذاتی نہیں ہوتے بلکہ مالک کے عطا کردہ ہوتے ہیں اور وہ اپنی منشا کے مطابق کام کرنے کا حق نہیں رکھتا بلکہ اُس کا کام مالک کے

منشاء کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ اگر وہ خود مالک بن بیٹھے اور تفویض کردہ اختیارات کو من مانے طریقے سے استعمال کرنے لگے یا اصل مالک کے سوا کسی اور کو مالک تسلیم کر کے اُس کے منشاء کی پیروی اور اُس کے احکام کی تعمیل کرنے لگے تو یہ سب غداری اور بغاوت کے افعال ہوں گے۔'' (''تفہیم القرآن'' ج ۱' ص ۶۲)

''اس تشریح سے معلوم ہوا کہ نوعِ انسانی کے ہر فرد کا منصب خلافت ہے اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے خلیفہ مقرر کرتے ہوئے بعض کو بعض پر فوقیت دی ہے' اس لئے لامحالہ اسی نسبت سے انسانوں کے اختیارات میں بھی کمی بیشی ہوگی اور اسی کے مطابق انہیں اپنے اپنے دائرے میں آزادیٔ عمل بھی حاصل ہوگی۔ آزادیٔ عمل کی یہ حدود کیا ہیں' اس کی بھی وضاحت فرما دی گئی ہے۔ ارشادِ ربانی ملاحظہ ہو:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ (البقرة : ۲۰۸)

''مؤمنو! پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو۔'' (۲:۲۰۸)

''یعنی زندگی کے ہر شعبے' ہر معاملے اور ہر قدم پر اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہ کر عمل کرو اور اُن حدود کو توڑ کر شیطان کی پیروی نہ کرو۔ یہ حکم جس طرح ملّتِ اسلامیہ کے کسی ایک فرد کے لئے ہے' اُسی طرح اُس کے گروہوں' طبقوں' شعبوں اور اداروں کے لئے بھی ہے جن میں اخبارات اور دوسرے ہر طرح کے ذرائع ابلاغ بھی شامل ہیں۔''

''معلوم ہوا کہ اسلام میں مطلق آزادی نہ فرد کو حاصل ہے اور نہ جماعت کو اور نہ ہی اس کی گنجائش ہے۔ سب کے سب اپنے خالق و مالک کی منشاء کے مطابق عمل کرنے کے پابند ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اسلام کے دائرے میں رہتے ہوئے اُنہیں جو آزادی حاصل ہے وہ اُن کا بنیادی حق ہے جسے اُن سے کوئی سلب نہیں کرسکتا۔ یہاں اسلامی معاشرے کے ہر فرد کو یہ آزادی دی گئی ہے کہ وہ سرِ عام عمرؓ سے یہ بازپرس کر سکے کہ یہ ایک چادر جو سب کے حصے میں آئی تھی' اُس سے تو کُرتا نہیں بن سکتا تھا' آپ نے یہ کُرتا کیسے بنا لیا؟ حتیٰ کہ ایک بُڑھیا بھی خلیفہ کو نہ صرف ٹوک سکتی ہے بلکہ اُس کا گریبان بھی تھام سکتی ہے۔ ایسا اس لئے ہے کہ یہاں سبھی لوگ اور ادارے ایک ہی مالک کے نائب اور بندے ہیں اور اُس کا منشاء پورا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ صحافت کو اگر اپنی جائز حدود سے تجاوز کرنے کی اجازت نہیں ہے تو حکمران بھی صحافت پر کوئی ناروا پابندی نہ لگانے کے پابند ہیں۔ حد سے تجاوز کرنے پر یہ دونوں اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کے مرتکب ہو کر اللہ کے غضب اور عذاب کے مستحق ٹھہریں گے۔''

''اللہ تعالیٰ نے اگر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو فرض قرار دیا ہے اور اُس کے رسول ﷺ نے ظالم حکمران کے سامنے کلمۂ حق کہنے کو افضل جہاد کہا ہے' تو اس کے لئے اُنہوں نے مطلوبہ آزادی بھی فراہم کر دی ہے اور اس آزادی کو اُمتِ مسلمہ کے ہر فرد کے بنیادی حقوق میں شامل کر دیا ہے۔''

ربِّ ذوالجلال والاکرام نے تنقید کی نہ صرف اجازت دی ہے بلکہ تنقید نہ کرنے کو نہایت بُرا طرزِ عمل قرار دیا ہے۔ سورۃ المائدہ میں ارشادِ ربّانی ہے :

لُعِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِ یْلَ عَلٰی لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ ذٰلِکَ بِمَا عَصَوْا وَّ کَانُوْا یَعْتَدُوْنَ O کَانُوْا لَا یَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْکَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا کَانُوْا یَفْعَلُوْنَ O (المائدۃ:۷۸،۷۹)

''بنی اسرائیل میں سے جنہوں نے کفر اختیار کیا اُن پر داوٗد اور عیسیٰ ابنِ مریم کی زبان سے لعنت ہوئی' یہ اس لئے کہ اُنہوں نے برابر نافرمانی کی اور حد سے آگے نکل گئے۔ جو برائی اُنہوں نے اختیار کر رکھی تھی وہ اُس سے باز نہ آتے۔ جو کچھ وہ کر رہے تھے' کیسا بے جا تھا!'' (۷۸،۷۹ : ۵)

اس آیت کی تفسیر میں جلال الدین السیوطی نے دو احادیثِ نبوی کا حوالہ دیا ہے جن میں نبی ﷺ نے فرمایا:

(۱) ''اُس ذاتِ اقدس کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں محمد کی جان ہے' تم لوگوں کو نیکی کا حکم دو گے اور بُرائی سے روکو گے اور تم غلط کار کے ہاتھوں سے برائی کرنے کی قوّت کو چھین لو گے اور نیک راہ پر چلنے میں اُس کی حوصلہ افزائی کرو گے۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو اللہ تمہارے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت ڈال دے گا اور تم پر اُسی طرح لعنت کرے گا جس طرح اُس نے یہود پر لعنت کی ہے۔''

(اَلدُّرُّ المنثور لجلال الدین السیوطی' ج ۲' ص ۳۰۵' طبع قاہرہ ۱۳۱۴ھ)

(۲) ''کسی معاشرے کی عام آبادی کو اللہ تعالیٰ اُس کے کسی مخصوص طبقے کی بدعملیوں کی وجہ سے سزا نہیں دیتا جب تک کہ وہ برائی کو اپنے درمیان بے مہار دیکھ کر طاقت و اختیار رکھنے کے باوجود معاملہ کو درست کرنے کی کوشش نہ کریں۔'' (ایضاً' ص ۳۰۲)

''جب کسی معاشرے میں بگاڑ شروع ہو اور اُسے برداشت کر لیا جائے اور اُس کے خلاف کوئی آواز بلند نہ ہو اور غلط کاروں کو معاشرے میں کسی ملامت کا سامنا نہ کرنا پڑے تو خرابی جڑ پکڑ لیتی ہے اور پھیلتی ہی چلی جاتی ہے لیکن اجتماعی ضمیر زندہ ہو تو رائے عامّہ کا دباؤ خرابی کو پھیلنے نہیں دیتا۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بُرے افعال پر نہ ٹوکنا بجائے خود بُرا طرزِ عمل ہے اور ایسا طرزِ عمل اختیار کرنے والے ملعون اور راندۂ درگاہ ہیں۔ وہ لوگ جو اللہ کی دی ہوئی تنقید کی اس آزادی کو سلب کریں تو اُن کا جرم تنقید نہ کرنے سے بھی زیادہ سخت ہے۔''

''اللہ تعالیٰ نے فریضۂ شہادتِ حق کے لئے اظہارِ رائے کی آزادی کو جہاں ایک مؤمن کا بنیادی حق قرار دیا ہے جسے کسی طرح بھی سلب نہیں کیا جا سکتا' وہاں یہ بھی ہدایت کی ہے کہ بات حکمت' متانت' وقار اور شائستگی سے کی جائے:

یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا O (الاحزاب : ۷۰)

''مؤمنو! اللہ سے ڈرو اور صاف' سیدھی بات کیا کرو۔'' (۷۰ : ۳۳)

''قولِ سدید'' تو خود بھی تقوٰی ہی کی ایک فرد ہے۔ خصوصیت کے ساتھ اس کے الگ بیان کرنے سے

مقصود زبان کی اہمیت کو ظاہر کرنا ہے۔ جہاں تک اعضاء و جوارح کا تعلق ہے' تو جو اہمیت و مرکزیت زبان کو حاصل ہے' کسی اور عضو کو نصیب نہیں۔ اگر زبان قابو میں آ گئی تو انسان گناہوں کی کتنی بڑی تعداد سے بچ سکتا ہے۔

''اسلامی نظام میں فرد' ریاست اور اخبارات سبھی احکام و حدود کے پابند ہوتے ہیں' سب کا مقصد خیر کا فروغ اور شر کا انسداد ہوتا ہے' سب کے حقوق و فرائض اور دائرہ ہائے کار متعین ہوتے ہیں۔ کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنی حد سے تجاوز کرے یا اللہ کی مقرر کردہ حد کو توڑے۔ اگر کوئی فریق ایسا کرتا ہے تو دوسرے پر اُس کی مزاحمت کرنا فرض ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تحدید و توازن (Check and Balance) کا یہ ایک ایسا نظام قائم کر دیا ہے جس کی پابندی سے معاشرے میں کبھی کوئی خرابی جڑ نہیں پکڑ سکتی۔''

''صحافت کی آزادی کو محدود یا سلب کرنے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ اخبار یا صحافی کے قلم پر خارجی طور پر قدغنیں لگائی جائیں مثلاً حکومتِ وقت سنسر کی پابندی روکنے کے لئے اُنہیں ستائے اور دھونس دھاندلی سے کام لے۔ صحافت کی آزادی کو محدود کرنے والی دوسری شکل یہ ہے کہ اخبار یا صحافی خود کسی لالچ کے تحت اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کریں۔ ظلم ہوتا دیکھیں لیکن مصلحت کے تحت مُہر بہ لب رہیں۔ رنگ و نسل' زبان یا علاقے کی عصبیت اُنہیں انصاف کی بات کہنے سے روک دے' اشتہارات کا لالچ دین و ملت کے مفادات کو نظرانداز کرنے پر مجبور کر دے اور مالی مفاد اور ملازمت کی خاطر اپنے ضمیر اور عقیدے کے خلاف لکھنا اور شائع کرنا قبول کر لیں۔''

''صحافت کی آزادی کو محدود کرنے کی پہلی صورت میں پیدا ہونے والے تنازعہ کو تو عدالت میں لے جایا جا سکتا ہے لیکن دوسری صورت میں صحافت کی آزادی پر پہرے بٹھانے والوں کا معاملہ مختلف ہے۔ مقدمہ اُن پر بھی چلے گا لیکن دنیا کی عدالت میں نہیں۔ اُن کی فردِ جرم اُن کے نامۂ اعمال کی صورت میں فرشتے تیار کر رہے ہیں اور ایک دن آئے گا جب اُنہیں داورِ محشر کی عدالت میں اپنے کئے کی جواب دہی کرنا ہوگی جہاں اُن کا قلم خود اُن کے خلاف فریادی ہوگا' اُن کا وجود اُن کے خلاف شہادت دے گا اور جہاں وہ اپنے کئے کی جزا اور سزا پا کر رہیں گے۔''

''اسلامی معاشرے میں صحافت مغربی معاشرے کی طرح مادر پدر آزاد نہیں ہوتی۔ یہاں وہ بھی اُسی ضابطۂ اخلاق کی پابند ہوتی ہے جس کی پابندی معاشرے کے افراد اور دوسرے اداروں پر لازم ہے لیکن جہاں تک خیال و رائے کے اظہار اور تنقید و احتساب کی آزادی کا تعلق ہے' اسلام نے اس کا جس طرح اہتمام اور حوصلہ افزائی کی ہے' اس کی مثال دنیا کا نہ کوئی اور مذہب پیش کر سکتا ہے اور نہ کوئی جدید نظام! اسلام واحد دین ہے جس نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ایک مسلمان کا دینی فرض ہی نہیں' بنیادی حق بھی قرار دیا ہے۔'' (''اسلامی صحافت''۔۔۔سیّد عبید السلام زینی' صفحات ۶۵۔۷۳ ملخص)

مغربی صحافت ہماری منزل نہیں: مغربی صحافت میں عریانی اور فحاشی کے مظاہرے اس لئے نظر آتے ہیں کہ مغرب کے مادہ پرست معاشرے میں اسے گوارا کیا جاتا ہے۔ اُن کے پاس یا تو اخلاقی اور روحانی قدریں باقی نہیں رہیں یا اگر ہیں تو اُنہیں پسِ پشت ڈال دیا گیا ہے۔ ضمیر زندہ ہو تو اُس کی چبھن محسوس ہوتی ہے۔ جب ضمیر ہی مردہ ہو جائے تو ہر بری چیز اچھی معلوم ہوتی ہے۔ بحمدہٖ تعالیٰ اسلام کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔

قرآنِ حکیم اور صحافت کا ضابطۂ اخلاق

(۱) سچی خبر اور منصفانہ شہادت کے چھپانے کی ممانعت: شہادت کا مطلب صرف یہی نہیں کہ کسی مقدمے کے سلسلے میں عدالت میں پیش ہو کر گواہی دی جائے بلکہ اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ آدمی جس حق سے آگاہ ہے، دوسروں کو بھی اُس سے آگاہ کرے اور چھپائے نہیں۔ چنانچہ فرمایا:

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ (البقرۃ: ۲۸۳)

''اور شہادت کو چھپایا نہ کرو، جو شخص شہادت چھپاتا ہے، اُس کا دل گناہ میں آلودہ ہے۔''

شہادت چھپانے کا سیدھا سادہ مطلب گو یہی ہے کہ آدمی نے ایک واقعے کو دیکھا ہے یا کسی بات کے حق یا باطل ہونے کو وہ جانتا ہے مگر خوف، دباؤ یا لالچ کے تحت اُس کے اظہار سے وہ گریز کرتا ہے۔ لیکن یہ حکم اُن تمام کوششوں پر حاوی ہے جو اس نیت سے کی جائیں کہ حق واضح اور آشکارا نہ ہونے پائے۔ اس قسم کی کوششوں میں یہ بھی شامل ہے کہ حق بات کو اس طرح مسخ کر کے پیش کیا جائے کہ وہ لوگوں کی نظر میں مشکوک و مشتبہ ہو کر رہ جائے۔ اس سلسلہ میں ارشادِ ربانی ہوا:

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ (البقرۃ: ۴۲)

''اور حق کو باطل کے ساتھ گڈمڈ نہ کرو اور نہ ہی جانتے بوجھتے ہوئے حق کو چھپانے کی کوشش کرو۔''

اور سورۃ الحج کی آیت ۳۰ میں فرمایا:

وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ ۝

''جھوٹی بات کہنے سے گریز کیا کرو۔'' (۲۲ : ۳۰)

حق گوئی اور حق پرستی کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی رات کو رات ہی کہے، دن نہ کہے خواہ دن کو رات اور رات کو دن کہنے کے لئے اُسے کیسا ہی لالچ دیا جائے یا دھونس اور دھاندلی سے کام لیا جائے۔ جھوٹی گواہی سے اجتناب کرنے والوں کی تعریف خود رب تعالیٰ نے فرمائی ہے:

وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ (اَلفُرقان: ۷۲)

''(اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں) جو جھوٹ کے گواہ نہیں بنتے۔'' (۲۶ : ۷۲)

اِس آیت کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ کسی مسلمان کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ مسلمان ہوتے ہوئے کسی غیر اسلامی اور باطل نظریے یا اِزم کی قولی یا عملی حمایت کرے یا اُس کے فروغ واشاعت کے لئے مضامین لکھے یا اپنے زورِ قلم سے جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بنانا شروع کر دے۔

سیّد سلمان ندوی ''سیرت النبی ﷺ'' کی جلد ششم کے صفحہ ۵۲۷ میں لکھتے ہیں:

''انسان کے سارے اخلاقِ ذمیمہ میں سب سے زیادہ بُری اور مذموم عادت جھوٹ کی ہے۔ یہ جھوٹ خواہ زبان سے بولا جائے یا عمل سے ظاہر کیا جائے کیونکہ ہمارے تمام اعمال کی بنیاد اس پر ہے کہ وہ واقعہ کے مطابق ہوں اور جھوٹ ٹھیک اس کی ضد ہے' اس لئے یہ بُرائی ہر قسم کی قولی اور عملی برائیوں کی جڑ ہے۔ انسان کے دل کے اندر کی بات سوائے خدا کے کوئی دوسرا نہیں جانتا۔ کوئی دوسرا کسی شخص کے متعلق اگر کچھ جان سکتا یا باور کر سکتا ہے تو اُس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ شخص خود اپنی زبان یا عمل سے اُسے ظاہر کرے۔ اب اگر وہ اپنی اندرونی بات صحیح اور واقعہ کے مطابق جان بوجھ کر نہیں ظاہر کرتا بلکہ اُس کے خلاف ظاہر کرتا ہے تو وہ ساری دنیا کو فریب دے رہا ہے۔ ایسے شخص میں دنیا کی جو برائیاں بھی نہ ہوں وہ کم ہے کیونکہ اُس نے تو اُس آئینہ ہی کو توڑ ڈالا ہے جس میں حقیقت کا چہرہ نظر آتا ہے۔''

(۲) فواحش اور اُن کی تشہیر کی روک تھام: اسلام اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ معاشرے میں کسی بھی عنوان سے برائیوں کا چرچا ہو' اِسی لئے اُس نے فحاشی کی ہر قسم کی اشاعت کو حرام قرار دیا ہے لیکن بدقسمتی سے ہمارے اخبارات میں جنس و جرائم سے متعلق خبروں' مضامین اور تصویروں کو پوری تفصیل و تزئین کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے اور بعض اخبارات تو یہ حرکت باقاعدہ طے شدہ پالیسی کے تحت اس لئے کرتے ہیں کہ لوگوں کے سفلی جذبات کو اپیل کر کے اپنی اشاعت میں اضافہ کریں۔ قرآنِ حکیم نے بتایا کہ بے شرمی کے یہ حرام کام کرنے اور اُنہیں عام کرنے کا انجام کیا ہے۔ سورۃ النور کی آیت ۱۹ میں ارشاد ہوا:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَهُمْ عَذَاب'' اَلِيم'' فِي الدُّنْيَاوَالْاٰخِرَةِ

''بے شک جو لوگ ایمان والوں میں بے حیائی کو پھیلانا پسند کرتے ہیں' اُن کے لئے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے۔'' (۱۹ : ۲۴)

یاد رہے کہ قوم کے اصلاح یافتہ ہونے کی برکات سے جس طرح ہر فرد مستفید ہوتا ہے' اُسی طرح اُس کے اخلاق باختہ ہونے سے بھی ہر فرد کو حصہ رسدی مل کر رہتا ہے۔

اس آیت کے الفاظ فحش پھیلانے کی تمام صورتوں پر حاوی ہیں۔ اُن کا اطلاق عملاً بدکاری کے اڈے قائم کرنے پر بھی ہوتا ہے اور بد اَخلاقی کی ترغیب دینے والے اور اس کے لئے جذبات کو اُکسانے والے قصّوں'

اشعار' گانوں' تصویروں اور کھیل تماشوں پر بھی۔ نیز وہ کلب' ہوٹل اور دوسرے ادارے بھی ان کی زد میں آجاتے ہیں جن میں مخلوط رقص اور مخلوط تفریحات کا انتظام کیا جاتا ہے۔

ان کے علاوہ فحاشی پھیلانے کا اطلاق بدکاری کی وارداتوں کی تفصیلات کو مزے لے لے کر خبر کی صورت میں شائع کرنے پر بھی ہوتا ہے اور جو صحافی محض خبر کو دلچسپ بنانے کے لئے اپنی طرف سے بھی کچھ رنگ آمیزی کرتا ہے' وہ فحاشی کی اشاعت کے ساتھ ساتھ تہمت طرازی کا ارتکاب بھی کرتا ہے جس سے سختی کے ساتھ روکا گیا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ وَلَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ'' O (النور: ۲۳)

''جولوگ پاک دامن' بے خبر مومن عورتوں پر تہمتیں لگاتے ہیں' اُن پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی گئی اور اُن کے لئے بڑا عذاب ہے۔'' (۲۳ : ۲۴)

نبی آخرالزماں ﷺ نے فرمایا:

''پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانا اُن سات کبیرہ گناہوں میں سے ہے جو مُوبقات (تباہ کن) ہیں۔''

اور طبرانی میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانا سو برس کے اعمال کو غارت کردینے کے لئے کافی ہے۔''

شریعت میں اِس فعل کی سزا اَسّی (۸۰) کوڑے مقرر ہے (بحوالہ سورۃ النور: آیت ۴)۔

بے حیائی' فحاشی اور منکرات کا فروغ اصلاحِ معاشرہ اور تعمیر سیرت و اخلاق کی اسلامی سکیم کے لئے زہرِ ہلاہل کا حکم رکھتا ہے کیونکہ اسلامی معاشرے کے افراد کی امتیازی شان اُن کا صالح اخلاق اور پاکیزہ زندگی ہوتی ہے' صاف ستھری اور ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک زندگی بسر کرنا اُن کے دین و ایمان کا بنیادی تقاضا ہے۔ اسلام کی اُساس پر قائم معاشرے کے افراد جس اللہ پر ایمان رکھتے ہیں' اُس اللہ کے بارے میں نبی آخرالزماں ﷺ کا ارشادِ پاک ہے:

''اللہ سب سے زیادہ غیرت مند ہے اور اسی لئے اُس نے بدکاریوں کو حرام کیا ہے۔'' (صحیح مسلم)

اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا:

''ایمان کی کچھ اوپر ساٹھ شاخیں ہیں اور حیاء بھی ایمان کی شاخ ہے۔'' (صحیح بخاری)

جس طرح ایمان کا تقاضا ہے کہ تمام فواحش اور منکرات سے پرہیز کیا جائے' اُسی طرح حیا بھی انسان کو بے شرمی کی باتوں سے روکتا ہے اور وہ ایمان ہی کا ایک جزء ہے۔

جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری ''ضیاء القرآن'' کی جلد سوم کے صفحات ۲۰۲' ۲۰۳ میں لکھتے ہیں:۔

''جو لوگ اپنی قوم کو راہِ حق سے بھٹکاتے ہیں' اپنے نوجوانوں کے شہوانی جذبات کو مشتعل کرنے کے اسباب فراہم کر کے اپنی تجوریاں بھرتے ہیں' زندگی کی تلخ حقیقتوں اور سنگین ذمہ داریوں سے غافل کر کے اُنہیں عیش و نشاط کا خوگر بناتے ہیں' اُن کی حیاء و عفت کی چادر کو لطائف الحیل سے تار تار کرتے ہیں اور اُنہیں فسق و فجور کے بازار میں لا کر ننگا کھڑا کر دیتے ہیں' وہ خوب جان لیں اور کان کھول کر سن لیں کہ یہ سودا اُنہیں مہنگا پڑے گا۔ اُنہیں یہاں بھی اور وہاں بھی رُسوا کن حالات سے دوچار کر دیا جائے گا۔''

''آج ہم اپنے معاشرہ میں عریانی اور بے حیائی کا اُمڈ کر آتا ہوا سیلاب دیکھ رہے ہیں جس کی چیختی' چنگھاڑتی موجوں کی ہیبت سے دین اور اخلاقِ حسنہ کے مضبوط قلعے تھرّا رہے ہیں۔ ہماری مخصوص اخلاقی' عمرانی عزیز قدریں ایک ایک کر کے تلف کی جا رہی ہیں۔ ہماری زندگی سراسر لہو و لعب بنتی جا رہی ہے' سنجیدگی اور متانت کا عنصر تیزی سے ناپید ہو رہا ہے۔ جاہ طلبی' لذّت کوشی اور زر و سیم کی ہوس کی قربان گاہ پر ملّی اور قومی مفادات کو بھینٹ چڑھا دینا ہمارے لئے کوئی مشکل نہیں۔ ہمارے اہلِ قلم کی عظیم اکثریت' ہماری فلم انڈسٹری' شبینہ کلبیں' ثقافتی تقریبیں اور مینا بازار قیامت برپا کر رہے ہیں۔ یہ سب کھلے بندوں بے روک ٹوک ہماری اسلامی مملکت کے مسلمان حکام کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے اور کوئی باز پُرس نہیں کرتا' بلکہ ان تباہ کن عوامل کو حکومت کی سرپرستی اور حکّام کی حمایت حاصل ہے۔ یہ سوچ کر دل کانپ جاتا ہے کہ کہیں ہم اپنے آپ کو عذابِ مہین کے لئے تو تیار نہیں کر رہے۔''

(۳) <u>بلا تحقیق قبول یا ردّ کرنے کی ممانعت</u>: ادیب اور صحافی کو نہ سنی سنائی باتوں پر اعتبار کر لینا چاہئے اور نہ سنتے ہی مسترد کر دینا چاہئے بلکہ جو بات بھی کسی کی طرف سے پیش کی جائے' اُسے اچھی طرح جانچ پرکھ کر قبول یا ردّ کرنا چاہئے۔ مؤمنین کو رب تعالیٰ نے خطاب کرتے ہوئے سورۃ الحُجرات میں فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا إِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوْا أَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ O (الحُجرات : ٦)

''اے ایمان والو! اگر کوئی فاسق آدمی تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو تحقیق کر لیا کرو' ایسا نہ ہو کہ کہیں تم نادانی سے کسی قوم کو نقصان پہنچا دو' پھر اپنے کئے پر پچھتاتے رہو۔'' (٦ : ٤٩)

اس آیت سے جہاں یہ اصول اخذ ہوتا ہے کہ کسی بات کو علمی تحقیق اور غور و فکر کے بغیر یونہی جھٹلا نہیں دینا چاہئے' وہاں اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ جب کوئی اہم خبر یا اطلاع اشاعت کے لئے موصول ہو تو اُسے خوب غور و فکر اور تحقیق و تجزیے کے بعد قبول کیا جائے۔

اُسی سورۃ الحُجرات میں قرآنِ حکیم نے یہ ہدایت بھی دی ہے:

اِجۡتَنِبُوۡا کَثِیۡرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعۡضَ الظَّنِّ اِثۡمٌ'' (اَلۡحُجُرَات : ۱۲)
''بہت سے گمانوں سے بچو کیونکہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔'' (۱۲ : ۴۹)

''بدگمانیوں کی عام عادت جو بطورِ وبا ہم لوگوں میں پھیلی ہوئی ہے' یہ آیت اُس پر کیسی ضرب لگا رہی ہے! بات بات پر بلاوجہ بھائیوں سے بدگمانی' بیوی بچوں سے بدگمانی' پڑوسیوں سے بدگمانی' نوکروں چاکروں سے بدگمانی' گویا بدگمانی کو ہم لوگوں نے اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے۔ بدگمانی کی خلش اگر دل سے دُور ہو جائے تو ہم میں سے ہر ایک کی زندگی کتنی راحت سے بسر ہونے لگے!''

''فقیہ مفسر علامہ تھانوی نے ظن کی حسب ذیل قسمیں اور احکام بیان کئے ہیں: (۱) ظنِّ واجب' مثلاً حق تعالیٰ کے ساتھ حُسنِ ظن۔ (۲) ظنِّ مباح: یعنی ایسی بدگمانیاں جن کے لئے کھلے ہوئے قرینہ اور قیاس موجود ہوں' مثلاً ایسے شخص سے فسق کا گمان رکھنا جو شراب خانوں یا قحبہ خانوں میں آمد و رفت رکھتا ہو مگر شرط یہ ہے کہ بدگمانی گمان میں رہے' حدِّ یقین تک نہ پہنچا دیا جائے۔ نیز ایسی بدگمانیاں جو غیر اختیاری ہوں' تو اُن میں بھی شرط یہ ہے کہ اُن کے مقتضا پر عمل نہ کرے بلکہ حتی الامکان اُنہیں دفع کرتا رہے۔ (۳) ظنِّ حرام: عقائدِ دین یا احکامِ مسائلِ شریعت' بلا دلیل محض اپنے گمان سے گھڑ لینا یا کسی شخص میں خفیف و ضعیف علاماتِ فسق دیکھ کر اُس کی طرف سے بدگمانی جما لینا۔'' (تفسیر ماجدی اُردو' صفحہ ۱۰۳۲' نوٹ: ۱۹)

(۴) تحفظِ مال و جان اور آبرو: انسانوں کے اعمال و اخلاق کو سب سے زیادہ نقصان جس بات سے پہنچا وہ یہ کہ معاشرے میں عفت و عصمت کے تحفظ کا کوئی استوار قانون نہ تھا۔ اسی وجہ سے اسلام نے اس شعبہ حیات کے قوانین میں کہیں سے کوئی رعایت نہیں کی۔ زِنا اور زِنا کار کے متعلق اسلام کا نقطہ نگاہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔

کسی پاکباز مسلمان کی آبرو ریزی کوئی معمولی جرم نہیں ہے۔ جتنی قیمت ایک مسلمان کے خون کی ہے' کم و بیش اُسی درجہ میں اُس کی عزت اور آبرو کی بھی ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت ﷺ نے جن چیزوں کی اہمیت جتائی ہے' اُس میں ایک عزت و آبرو بھی ہے کہ جو درجہ مکہ مکرمہ کے اندر ماہِ ذی الحجہ کو حاصل ہے' ایسا ہی درجہ مسلمان کی عزت و آبرو کو بھی حاصل ہے۔ آقائے نامدار ﷺ نے فرمایا:

کُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَی الْمُسْلِمِ حَرَام'' عِرْضُہ' وَمَالُہ' وَدَمُہ'
''مسلمان کا مسلمان پر عزت و آبرو اور اُس کا مال و خون حرام ہے۔''

(۵) دل آزاری سے پرہیز: لکھتے وقت اس بات کا خصوصیت سے خیال رہے کہ قلم سے کوئی ایسی بات نہ نکلنے پائے جس سے کسی کی دل آزاری ہو۔ میر اُنیس اس بات کو کس خوبصورتی سے کہتے ہیں:

خیالِ خاطرِ احباب چاہیے   اُنیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

اسلام اس امر کا روادار نہیں کہ مختلف مذہبی گروہ ایک دوسرے کے خلاف دریدہ دہنی سے کام لیں اور ایک دوسرے کے پیشواؤں پر کیچڑ اچھالیں ۔قرآن میں ہر شخص کے مذہبی معتقدات اور اُس کے پیشوایانِ مذہب کا احترام کرنا سکھایا گیا ہے ۔سورۃ الانعام میں توقیرِ مذاہبِ غیر کی تعلیم اس طرح دی گئی اور فرمایا گیا:۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ (الانعام : ۱۰۸)

''اور اُنہیں برا بھلا مت کہو جنہیں یہ لوگ اللہ کے سوا پکارتے رہتے ہیں' ورنہ یہ لوگ حد سے گزر کر براہِ جہل اللہ کو برا بھلا کہنے لگیں گے ۔'' (۶ : ۱۰۸)

انسان کے عقیدہ اور مذہب کا انحصار کئی باتوں پر ہوتا ہے مثلاً اُس کی ذاتی نفسیات' اُس کی زندگی کا پس منظر' اُس کے مخفی یا دبائے ہوئے احساسات' رُجحانات یا تاریخ (جسے نفسیاتی تجزیہ ہی سلجھا سکتا ہے)' اُس کا موروثی مزاج یا شدید نفرتیں اور اس کی تعلیم اور ماحول کے نازک تاثرات ۔عقیدہ اور مذہب کے معاملہ میں انسان جذباتی واقع ہوا ہے اور اس میں جبر و اکراہ کو قطعاً کوئی دخل نہیں ہوتا ۔مبلّغ اگر ان مذکورہ حقائق کو مدِّ نظر نہ رکھے تو وہ اپنے نظریات کی تبلیغ و اشاعت کے جوش میں اکثر حدِّ اعتدال سے تجاوز کر جاتا ہے اور اُس کے ہاتھ سے معقولیت کا دامن چھوٹ جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُس کے نظریات اور عقائد کے متعلق اُس کے سامعین کے دلوں میں نفرت اور تعصّب پیدا ہو جاتا ہے اور بسا اوقات نوبت گالی گلوچ تک جا پہنچتی ہے ۔اِس آیت سے مبلّغینِ اسلام کی تربیت مقصود ہے تاکہ وہ اسلام کو پوری شائستگی اور متانت سے پہنچانے کے لئے تیار ہو جائیں ۔ علمائے اصول نے اِس آیت سے سدِّ ذرائع کا قاعدہ اخذ کیا ہے جس کا مختصراً مطلب یہ ہے کہ ہر مباح کام جب کسی معصیت کا سبب بن جائے تو اُسے ترک کر دیا جائے گا۔ (''ضیاء القرآن'' ۔۔جسٹس کرم شاہ الازہری' ج اوّل' صفحہ ۵۹۰)

سورۃُ الهُمَزة کی پہلی آیت ہے :

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَة

''ہر اُس شخص کے لئے تباہی ہے جو (منہ در منہ) لوگوں پر طعن اور (پیٹھ پیچھے) برائیاں کرنے کا خوگر ہے۔''

اور سورۃُ الحُجرات میں صاف منع کر دیا گیا :

وَلَا تَلْمِزُوْا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ (الحُجرات : ۱۱)

''آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کرو۔''

لُمَزَة کے لفظ میں طعن و تشنیع کے علاوہ چوٹیں کرنا' پھبتیاں کسنا' الزام دھرنا' اعتراض جڑنا' عیب جوئی کرنا' کھلم کھلا یا زیرِ لب یا اشاروں سے کسی کو نشانہِ ملامت بنانے کے مفہومات شامل ہیں اور یہ وہ تمام حرکتیں ہیں جو دل آزاری' آپس کے تعلقات بگاڑنے اور معاشرے میں فساد برپا کرنے کا باعث بنتی ہیں ۔اس لئے اِنہیں حرام کر دیا گیا ہے۔

اسلامی صحافت کا یہ ایک بنیادی اصول ہے کہ صحافت کے ذریعے کسی کی دل آزاری نہ کی جائے ۔یہ حقوق العباد

میں سے بھی ہے اور حقوق العباد کا تحفظ ایک مسلمان صحافی کے لئے ضروری ہے۔ کسی کی ہتک کرنے اور جھوٹی خبر شائع کرنے سے بھی دل آزاری ہوسکتی ہے۔

سورۃ الحجرات میں ارشاد ہوتا ہے:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسَىٰٓ أَن يَكُونُوا۟ خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّن نِّسَآءٍ عَسَىٰٓ أَن يَكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوٓا۟ أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا۟ بِٱلْأَلْقَٰبِ (الحُجُرات : ۱۱)

''مومنو! نہ مردوں کو مردوں پر ہنسنا چاہیئے کیا عجب کہ وہ اُن سے بہتر ہوں اور نہ عورتوں کو عورتوں پر ہنسنا چاہیئے کیا عجب کہ وہ اُن سے بہتر ہوں اور ایک دوسرے کو طعنہ نہ دیا کرو اور نہ ایک دوسرے کو بُرے القاب سے پکارا کرو۔'' (۱۱ : ۴۹)

اِس آیت میں چند نِکات توجہ طلب ہیں :۔

(۱) آیت میں مَردوں اور عورتوں دونوں کا ذکر علیحدہ علیحدہ ہوا ہے جس کا صاف مطلب یہی ہے کہ غیر مرد کو غیر عورت اور غیر عورت کو غیر مرد کے ساتھ ملنے جلنے کی اسلام نے اجازت نہیں دی۔ (۲) باہمی تمسخر اُس وقت مزاح اور خوش طبعی نہیں رہتا جب اُس کے پس پردہ نخوت وغرور، خود غرضی اور کینہ چھپا ہو۔ زندگی کی مسرتوں میں شامل ہونے کے لئے ہم لوگوں کے ساتھ ہنسی میں شامل تو ہوسکتے ہیں لیکن ہمیں اُن پر ازراہِ نفرت یا تمسخر نہیں ہنسنا چاہیئے۔ (۳) ''ایک دوسرے کو طعنہ نہ دیا کرو اور نہ ایک دوسرے کو بُرے القاب سے پکارا کرو'' کا جملہ اس مفہوم میں اہم ہے کہ جس شخص کو تم بُرا کہہ رہے ہو، وہ دراصل تمہارے ہی معاشرے کا ایک حصّہ ہے اور اُسے بُرا کہنا صاف طور پر تمہارا اپنے آپ کو برا کہنا ہے جس کا نتیجہ اپنے اعضاء کو خود کمزور کرنے کے مترادف ہے۔ کسی کی شہرت کو خراب کرنا اور اُسے برا کہنا، لفظوں، فقرے کسنے، رویئے، نقالی، طنز وطعن یا براہِ راست یا بالواسطہ توہین کرنا سب کو شامل ہے۔ (۴) ظاہر ہے کہ کوئی آدمی کسی کے خلاف بدخواہی اُس وقت تک نہیں کرتا جب تک اُس کے اندرونی انتقامی جذبات پختہ ہوکر اُبل نہیں پڑتے۔ تو گویا اُس نے اپنی ذات کو بدخواہی کے پنپنے کا گھونسلہ بنالیا ہے اور جب وہ طنز وطعن کرتا ہے تو وہ دراصل دوسروں کو اپنے ساتھ اُسی رویّہ اور طرز میں سلوک کرنے کی دعوت دے رہا ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ مظلوم شخص اپنی فطری شرافت کے باعث جوابی کارروائی کرنے سے گریز کرے لیکن حملہ آور نے یقیناً خود انتقام اور بدلہ لینے کا دروازہ کھولا ہے جو معاشرے میں لازمی طور پر افتراق وانتشار کا موجب بنے گا۔ (۵) چڑانے والے ناموں (Nicknames) سے ایک دوسرے کی مذمت کرنا اور اس برا بھلا کہنے میں کسی حقیقی یا تصوراتی نقص کی طرف اشارہ کرنا بھی کسی کی شہرت کو داغ دار کرنے کے برابر ہے اور یہ بات مسلم سماج کی اعلیٰ اخلاقی قدروں کو تباہ اور مسخ کردیتی ہے۔

(۶) خبریں اور رپورٹیں غیر جانبدارانہ طور پر مشتہر کی جائیں: صحافت کے ضابطہ اخلاق کے تحت ایک صحافی اور رپورٹر اخلاقی طور پر خبروں کو غیر جانبدارانہ طور پر پیش کرنے کا پابند ہے اور وہ اُن میں تبصروں، حواشی اور توضیح وتشریح (Annotations) جیسے ذاتی رجحانات وذوق کو شامل نہ کرے اور اپنے حساس پیشہ کی ذمہ داری کو

ہمیشہ مدِّ نظر رکھے۔ پیغمبر رسول کے منصبی فرائض کا ذکر کرتے ہوئے قرآنِ حکیم نے یوں اعلان کیا:
وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُO(اَلنّور: ۵۴ ؛ العنكبوت : ۱۸)
''اور رسول کے ذمہ تو صاف صاف پہنچا دینا ہوتا ہے۔''(۵۴ :۲۴ ؛ ۱۸ : ۲۹)

جس کے بعد اُس کے اوپر اُمّت کے کسی قول و فعل کی ذمہ داری نہیں رہتی۔

(۷) ذاتی معاملات میں جاسوسی اور غیبت کی قطعی ممانعت: سورۃ الحُجرات میں حکم ہوا :
لَاتَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ (الحجرات : ۱۲)
''اور ٹوہ میں مت لگے رہو اور کوئی کسی کی غیبت نہ کیا کرے' کیا تم میں سے کوئی اِسے گوارا کرے گا کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے' اُس سے ضرور ہی تمہیں کراہت آتی ہے۔''(۱۲ : ۴۹)

یعنی اوروں کے عیبوں اور کمزوریوں کی تلاش و جستجو میں نہ پڑو تاوقتیکہ کوئی مصلحت یا ضرورت ہی اس کی نہ آ پڑے۔ چھپ کر باتیں سننا یا اپنے کو سوتا ہوا بنا کر باتیں سن لینا یہ سب تجسّس میں داخل ہے۔ البتہ اگر کسی سے نقصان اور تکلیف پہنچنے کا خطرہ ہو اور اپنی یا کسی مسلمان بھائی کی حفاظت کی غرض سے اُس۔ کے نقصان دہ ارادوں اور تدبیروں کا تجسس کیا جائے تو جائز ہے۔ قرآن فرماتا ہے :
لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ (النِّسآء :۱۴۸)
''اللہ منہ پھوڑ کر برائی کرنے کو (کسی کے لئے بھی) پسند نہیں کرتا سوائے مظلوم کے۔'' (۱۴۸ :۴)

بلا ضرورت اور بلا مصلحتِ شرعی کسی کی بدگوئی کسی حال میں بھی جائز نہیں۔ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ البتہ مظلوم اپنے دل کا بخار بک جھک کر بھی نکال سکتا ہے اور حاکم کے سامنے فریاد بھی لے جا سکتا ہے۔

جیسا کہ معلوم ہوا کہ کسی شخص کے ذاتی اور پرائیویٹ معاملات کی ٹوہ لگانا بالکل ناجائز اور ممنوع ہے کیونکہ اس کے پس پردہ مقصد اُس شخص کو معاشرے میں بدنام کرنا اور رُسوا کرنا ہوتا ہے جو تعلیماتِ اسلامی کے بالکل منافی ہے۔ لیکن سیاسی اور دشمنِ اسلام سے دفاعی معاملات میں جاسوسی کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ ناقابلِ فرار فرض بن جاتا ہے بالخصوص جبکہ مسلمانوں کو دشمن سے مستقل خطرہ ہو۔ نبی اکرم ﷺ نے دشمنِ اسلام کی حرکات کی ٹوہ لگانے اور اُس پر نظر رکھنے کے لئے خود مختلف مواقع پر چھوٹے چھوٹے فوجی دستے بھیجے کیونکہ تمام مذاہب کے ضابطہ اخلاق میں ہر فرد اور معاشرے کو اپنی مدافعت کا قدرتی اور بنیادی حق حاصل ہے اور تجسّس اس دفاع کے حق کے تحفظ کے لئے بہت ہی مؤثر ذریعہ ہے۔

علامہ بدر الدین عینی لکھتے ہیں کہ اگر کوئی مسلمان مسلمانوں کے خلاف جاسوسی کرے تو وہ ''تعزیر'' ☆ کا مستحق ہوگا اور اگر کوئی کافر مسلمانوں کے خلاف جاسوسی کا مرتکب ہو تو اُسے قتل کر دیا جائے گا۔ (''عمدۃ القاری'' جلد ۱۴' صفحہ ۲۵۶' مطبوعہ بیروت ۱۴۲۱ھ بحوالہ ''تبیان القرآن'' از علامہ غلام رسول سعیدی' جلد ۱۱' صفحہ ۳۰۰)

نجی احاطے میں داخلے کا جواز چند صورتوں میں نکلتا ہے مثلاً اُس جگہ شراب اور افیون جیسی نشہ آور چیزیں رکھی ہوں یا اُس جگہ ریاست کے تحفظ کے خلاف کوئی سامان رکھا ہو' یا وہاں باغیانہ سرگرمیوں کے لئے ناجائز اسلحہ رکھا ہو۔ اِن تمام صورتوں میں اربابِ اختیار کو وہاں داخل ہونا اور حقیقتِ حال کے متعلق تجسس کرنا بالکل جائز ہے۔ تو جاسوسی بالعموم ممنوع ہے اور اُس صورت میں جائز ہے اگر کوئی شخص کسی علاقے میں کسی خطرناک سرگرمی کی نشان دہی کرتا ہے۔

اس ضمن میں مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں :۔

''صحافیوں کی جانب سے افراد کی نجی زندگی میں عیب جوئی کرنا اور دخل اندازی کرنا اُنہیں اپنے فرضِ منصبی سے بری نہیں کر دیتا۔ صحافت کے پیشے کو کوئی خصوصی استحقاق حاصل نہیں۔ اُن کی جانب سے غیر منصفانہ' ناجائز' غلط' بے حرمت' باغیانہ اور فحش مواد کی اشاعت قرآنی احکام کی خلاف ورزی ہے۔ کسی رسوا کن مضمون یا کالم کے لکھنے میں پروپرائٹر' مدیر' طابع اور پبلشر سب کے سب ہتکِ عزت کے مرتکب ہیں' البتہ شریعت میں کچھ مستثنیات ضرور ہیں۔'' (''تدبّرِ قرآن'' جلد ششم' صفحہ ۵۱۰' مطبوعہ لاہور ۱۹۷۸)

(۸) <u>قول وفعل میں مطابقت</u>: اسلام ہر مسلمان کو عملی انسان' سیرت کا پختہ اور کردار کا مضبوط اور مجاہد بنانا چاہتا ہے اور نفاق اور شائبہ نفاق سے بھی دُور رکھنا چاہتا ہے۔ اِسی لئے وہ قول وفعل کی مطابقت پر شدّت سے مُصر رہا اور اُس نے قول وفعل میں عدمِ موافقت کو ''منافقت'' کا نام دیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت بری بات اور اُس کی ناراضی کا موجب ہے۔ سورۃ الصّف کی آیت ۲' ۳ میں ارشاد ہوا :

يَاۤ يُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ ۝ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَالَا تَفْعَلُوْنَ ۝

''اے ایمان والو! ایسی بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو' اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ بات بہت ناراضی کی ہے کہ ایسی بات کہو جو کرو نہیں۔'' (۲' ۳ : ۶۱)

(۹) <u>نرم دم گفتگو</u>: یہ بھی ممکن ہے کہ ایک صحافی اپنے کلام میں اُن تمام اخلاقی ہدایات کو تو ملحوظ رکھے لیکن اُس کا لہجہ سخت اور تیز ہو اور اُس کی اس ایک کوتاہی کی وجہ سے کلام میں وہ تاثیر پیدا نہ ہو سکے جو مخاطب کو متاثر کرنے کے

☆ اسلام کی مجوزہ سزاؤں میں ''حد'' اور ''تعزیر'' کی دو اصطلاحات آتی ہیں۔ ''حد'' کا اصطلاحی معنی وہ سزا ہے جسے شریعتِ مطہرہ نے مقرر کر دیا ہے اور اس میں قاضی یا منصف کو ردوبدل کا اختیار بالکل نہیں ہوتا۔ حدود میں زنا کے لئے رجم (سنگسار کرنا) چوری اور ڈکیتی کے لئے ہاتھ کاٹنا' شراب خوری اور بہتان طرازی (قذف) پر ایک سو یا اسی کوڑے لگانا' اور قتلِ ناحق پر قتل کرنا شامل ہیں۔ اِن کے علاوہ دیگر سزائیں تعزیرات میں شامل ہیں اور وہ قاضی کی صوابدید پر چھوڑ دی گئی ہیں کہ جرم کی نوعیت کے مطابق جیسے چاہے بہ نظرِ انصاف سزا دے۔

لئے ضروری ہے۔ اِسی لئے حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو فرعون کے پاس بھیجتے وقت یہ ہدایت دینی ضروری سمجھی گئی اور اُنہیں حکم دیا گیا:

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۝ (طٰہٰ : ۴۴)

''اُس سے تم دونوں نرم گفتگو کرنا' کیا عجب کہ وہ نصیحت قبول کرے یا ڈر ہی جائے۔'' (۴۴ : ۲۰)

صحیح مسلم کی ایک حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''کیا میں تمہیں بتاؤں کہ دوزخ والے کون لوگ ہیں؟ صحابہ کرام نے عرض کیا: ہاں یا رسول اللہ! فرمایا: ہر درشت مزاج' شیخی خور اور مغرور۔''

بھلے مانس لوگ بات چیت میں حفظ مراتب کا لحاظ رکھتے ہیں۔ وہ اختلاف کرتے ہیں تو سلیقے سے اور متفق ہوں تو بھی خوشامدانہ لہجہ اختیار کر کے اپنی عزتِ نفس کو مجروح نہیں ہونے دیتے۔ آدمی کی تحریر اور تقریر اُس کے اخلاق اور اُس کی سیرت وشخصیت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ زبان کی طرح صحافی اور ادیب کے قلم کو بھی بے قابو نہیں ہونا چاہئے۔ قرآنِ حکیم میں میٹھے بول کو رعونت اور نخوت سے کی جانے والی لاکھوں روپے کی خیرات سے بہتر قرار دیا گیا ہے:

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى (البقرۃ : ۲۶۳)

''میٹھا بول (اور کسی ناگوار بات پر ذرا سی) چشم پوشی اُس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے اذیّت ہو۔'' (۲۶۳ : ۲)

(۱۰) خود احتسابی: قرآنِ حکیم ہمیں یہ تصوّر دیتا ہے کہ ہم اس دنیا کو عارضی سمجھیں اور ہر شخص نے اپنے اعمال کا جواب دینا ہے۔ اگر کسی کی صحافت کے ذریعے بے عزتی کی جائے یا فحش لٹریچر شائع کیا جائے تو اس سے اُس کے کرنے والے پر گناہ عائد ہوتا ہے۔ ہر صحافی کل اللہ تعالیٰ کے ہاں اپنے اعمال کا جوابدہ ہوگا۔ ایک مسلمان معاشرے میں رہنے والے صحافی کو چاہئے کہ وہ خود احتسابی سے کام لے اور اپنے خالق و مالک کے اس اعلان کو ملحوظِ خاطر رکھے:

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ۝ (المؤمنون : ۱۱۵)

''تو کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تمہیں یونہی بلا مقصد پیدا کر دیا ہے اور یہ کہ تم ہمارے پاس لوٹا کر نہ لائے جاؤ گے۔'' (۱۱۵ : ۲۳)

(۱۱) فتنہ پردازی سے احتراز: اصولِ تعاون و تناصر کا ایک پہلو یہ ہے کہ ملک میں فتنہ پردازی سے اجتناب کیا جائے۔ یہ جرم کس قدر شدید ہے' قرآن کے اِس ارشاد سے ظاہر ہے:

وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ (البقرۃ : ۱۹۱)

''اور فتنہ تو قتل سے بھی سخت تر ہے۔'' (۲: ۱۹۱)

''فتنہ کیا ہے؟ جب سُنار میل نکالنے کے لئے سونے کو پگھلاتا ہے تو عرب کہتے ہیں: فَتَنَ الصَّانِعُ الذَّهَبَ اور کسوٹی کو فتانہ کہا جاتا ہے۔ یہ اُس کا لغوی معنی ہے۔ اب اِس کا استعمال سخت آزمائش کے لئے کیا جاتا ہے اور سب آزمائشوں سے سخت ترین آزمائش وہ ہے جو دین کے لئے یا دین سے برگشتہ کرنے کے لئے ہو۔ کفارِ مکہ غریب مسلمانوں کو دین سے برگشتہ کرنے کے لئے سخت ترین سزائیں دیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ قتل بھی بڑا بھیانک جرم ہے لیکن کسی کو اُس کے پسندیدہ عقائد سے باز رکھنا جن کی صداقت اور سچائی پر وہ صدقِ دل سے یقین رکھتا ہو، قتل سے بھی زیادہ خوفناک جرم ہے۔'' (''ضیاء القرآن''۔ جسٹس کرم شاہ الازہری، جلد اوّل، صفحہ ۱۳۳)

دینی عقائد میں فتنہ برپا کیا جائے تو مخلوقِ خدا بدراہ ہو جاتی ہے۔ دُنیوی معاملات میں فتنہ کھڑا کیا جائے تو نظم و نسق تہ و بالا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا عوام کو چاہئے کہ وہ ملک میں فتنہ پردازی سے خواہ وہ مذہبی معاملات میں ہو یا دُنیوی امور میں، گریز کریں اور ہر طرح متحدر ہیں۔

(۱۲) جھوٹی افواہ پھیلانے سے اجتناب: عوام پر یہ بھی فرض ہے کہ وہ امن و جنگ دونوں زمانوں میں خبروں کو متعلقہ حکام کے ملاحظہ میں لانے سے پہلے شہرت نہ دیں۔ اللہ تعالیٰ نے اِن الفاظ میں راہنمائی فرمائی ہے:

وَإِذَا جَآءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنبِطُونَهُ مِنْهُمْ (النسآء: ۸۳)

''اور جب اُنہیں امن یا خوف کی کوئی بات پہنچتی ہے تو وہ اُسے پھیلا دیتے ہیں اور اگر وہ لوگ اُسے رسول کے پاس یا اپنے میں سے صاحبانِ اختیار کے حوالے کر دیتے تو اُن میں سے جو لوگ استنباط کی صلاحیت رکھتے ہیں، اُس کی حقیقت جان لیتے۔'' (۸۳: م)

أُولِي الْأَمْرِ سے یہاں مراد سیّدنا صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ جیسے اکابر صحابہ کرام ہیں۔ امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اِس آیت سے چار اُمور ثابت ہوتے ہیں: (۱) جو نئے نئے مسائل پیش آئیں گے، اُن کی بابت اُحکام نص سے نہیں، استنباط سے حاصل ہوں گے۔ (۲) استنباط بھی حُجتِ شرعی ہے۔ (۳) احکام میں عامیوں پر اہلِ علم کی تقلید واجب ہے۔ (۴) رسول اللہ ﷺ اِس پر مامور تھے کہ استنباطِ احکام کرتے رہیں۔

''ہجرتِ مدینہ کے بعد کفار کے ساتھ جنگوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک جنگ کے بعد دوسری جنگ کی تیاری کا اندیشہ تھا۔ مسلمان مسلسل ایسے حالات میں زندگی بسر کر رہے تھے جنہیں بجا طور پر زمانۂ جنگ کہا جا سکتا ہے۔ ہر دن، ہر لحظہ حملہ ہو سکتا تھا۔ ایسے ہنگامی حالات میں غلط افواہوں اور بے بنیاد خبروں کا پھیلنا ایک قدرتی امر ہوا کرتا ہے۔ اگر اِن افواہوں کو روکا نہ جائے تو صورتِ حال بڑی ہی سنگین ہو سکتی ہے۔ مسلمان معاشرہ میں بھی کئی ایسے کمزور دِل اور بعض بیمار افراد تھے کہ کوئی بات کانوں تک پہنچی اور اُسے سارے شہر میں مشہور کر دیا جس سے طرح طرح کے نقصانات کا اندیشہ تھا۔ اِس لئے اس سے روک دیا گیا اور ہدایت کر دی گئی کہ اگر کوئی ایسی بات ہو تو بارگاہِ رسالت میں عرض کر دیا کرو۔ تم میں جو صاحبِ عقل و دانش ہیں وہ اُس کی جانچ پڑتال کرنے کے بعد اس کے متعلق مناسب

اِقدام کریں گے۔ جب عام دُنیوی اور سیاسی امور میں عوام کو اِن چیزوں میں دخل اندازی اور خودسری سے روک دیا گیا ہے تو آپ خود سوچیں کہ امورِ غیبیہ میں یہ بدنظمی کب برداشت کی جاسکتی ہے کہ ہر کہ و مہ مُفتی بنا پھرے اور قرآن وسنت کو اپنی رائے سے ہم آہنگ کرتا رہے۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ حرص و ہویٰ کے بندوں کی تقلید نہ شروع کردیا کریں اور دینی امور میں فقط اُن علماء کی طرف متوجہ ہوں جن کا علم و فضل، زُہد وتقویٰ اور دینی بصیرت مسلّمہ اور جن کی سیرت بے داغ ہو۔'' (''ضیاء القرآن'' ۔۔جسٹس کرم شاہ الازہری، جلد اوّل، صفحہ ا۳۷، ۳۷۲)

(۱۳) <u>ایمان وضمیر کا سودا کرنے کی ممانعت</u> : ہر صاحبِ ایمان نے اپنے خالق و مالک سے یہ عہد کر رکھا ہے کہ وہ وہی بات کہے گا اور کرے گا جو حق ہوگی۔ ایسی صورت میں اگر وہ کسی سے کوئی معاوضہ لے کر کوئی خلافِ حق بات کہتا اور لکھتا ہے تو یہ ایک طرح اللہ کے ساتھ کئے ہوئے عہد کو بیچنا ہوگا جو درحقیقت ایمان اور ضمیر کا سودا کرنے کے مترادف ہے جس کی ممانعت کردی گئی اور فرمایا گیا:

وَلَا تَشْتَرُوْابِعَهْدِاللهِ ثَمَنًا قَلِيْلاً اِنَّمَا عِنْدَاللهِ هُوَ خَيْر' لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ O (اَلنَّحل:۹۵)

''اللہ کے عہد کو حقیر فائدے کے بدلے میں نہ بیچ ڈالو، جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے اگر تم جانو۔'' (۱۶ : ۹۵)

یعنی آدمی جب کوئی عہد کرے تو اُس پر قائم رہے اور اس سے پھر جانے کے لئے کوئی کتنی ہی بڑی بولی دے تو اُسے ٹھکرا دے۔ کیونکہ عہد پر قائم رہنے کا جو اجر اللہ تعالیٰ دینے والا ہے، وہ دنیا کی بڑی سے بڑی متاع سے بھی زیادہ اور بہتر ہے۔ ایک صحافی یا ادیب کے لئے عہد کو بیچنا قلم کی عصمت کو بیچ دینے کے ہم معنی ہے۔

سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۵۶ کہ ''دین میں کوئی جبر نہیں ہے'' کی رُو سے اسلام نے ہر شخص کو اعتقاد اور ضمیر کی آزادی کا حق دیا ہے۔ اس لئے اگر کوئی مسلمان صحافی زور یا جبر کی وجہ سے اپنے ایمان وضمیر کے خلاف اپنا قلم استعمال کرتا ہے تو وہ نہ صرف اپنے ایمان بلکہ اپنے ضمیر کو بھی فروخت کرتا ہے جو قابلِ مذمت فعل ہے۔

(۱۴) <u>خودنمائی سے گریز</u>: جب بھی کوئی تحریر لکھی جائے تو خیر وصداقت کے فروغ اور خوشنودیِ رب کے سوا کوئی اور چیز پیشِ نظر نہ ہو حتیٰ کہ ذاتی شہرت اور نام آوری کے حصول کو بھی تحریر وتصنیف کا مقصد نہیں بننا چاہئے کیونکہ جس طرح خودنمائی کے لئے جہاد میں بہادری کے جوہر دکھانے اور لڑتے ہوئے جان دینے والے کو شہادت کا رُتبہ حاصل نہیں ہوتا، اُسی طرح ایسے صحافی اور ادیب کو بھی کوئی ثواب نہیں ملے گا جو لوجہ اللہ حق کی تبلیغ واشاعت کرنے کی بجائے ذاتی شہرت وناموری کے لئے مسجّع اور مقفّی عبارتیں لکھے اور بیان میں تصنّع سے کام لے۔ ابوداؤد، کی کتاب الادب میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :

''جو شخص اسلوبِ کلام میں اس لئے اَدل بدل کرتا ہے کہ اُس کے ذریعے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنائے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اُس کا فدیہ اور توبہ قبول نہیں فرمائے گا۔''

(۱۵) **فکر کی حرّیت**: جسم کو تو قید کیا جا سکتا ہے لیکن فکر حریت کو نہیں روکا جا سکتا۔ اسلام فکر کی حریت کا داعی ہے۔ فکر کی حریت اُس کا ایک امتیاز ہے۔ اسلامی صحافت میں فکر کی حریت ہے بشرطیکہ خیالات مُلحدانہ نہ ہوں یا ایسا پراپیگنڈہ ممنوع ہے جو اسلام کے خلاف ہو۔ اسلام جائز قید ضرور لگاتا ہے اور صحافی کو ایک مسلمان معاشرے میں بے لگام نہیں چھوڑتا۔

(۱۶) **زرد صحافت سے اجتناب**: زرد صحافت نے ہمارے معاشرے میں تباہی پیدا کر دی ہے۔ اس صحافت کے ذریعے بلیک میلنگ کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ شرفاء و نجباء کی کردار کشی کی جاتی ہے اور فواحش' بے حیائی اور مخربِ اخلاق لٹریچر کے فروغ میں بھی اس کا بڑا ہاتھ ہے جبکہ اسلام میں ایسی صحافت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

(۱۷) **حق و انصاف کی بات کہنے کا التزام**: نیکی اور خیر کے کاموں میں ہر ایک سے تعاون کرنے کے اصول کا تقاضا یہ بھی ہے کہ کسی حالت میں بھی انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے اور کسی کی محبت یا کسی کی دشمنی آدمی کو عدل و انصاف کی بات کہنے سے نہ روک دے۔ چنانچہ حکم ہوا:

وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ کَانَ ذَا قُرْبٰی (الانعام: ۱۵۲)

''اور جب بات کہو تو انصاف کی کہو خواہ معاملہ اپنے رشتہ داروں ہی کا کیوں نہ ہو۔'' (۶:۱۵۲)

اور سورۂ المائدۃ میں فرمایا:

وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا (المائدۃ: ۸)

''کسی گروہ کی دشمنی تمہیں اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔'' (۵: ۸)

اِسی بات کو حضور ﷺ نے اس طرح فرمایا ہے:

''میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ غضب اور رضا دونوں حالتوں میں انصاف کی بات کہوں۔ جو مجھ سے کٹے' میں اُس سے جڑوں' جو مجھے میرے حق سے محروم کرے' میں اُسے اُس کا حق دوں اور جو میرے ساتھ ظلم کرے' میں اُسے معاف کر دوں۔''

(۱۸) **قلم کا صحیح استعمال**: پہلی وحی جو رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی' یہ ہے:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ O ـــــ اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ O عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ O (اَلعَلَق: ۱' ۴' ۵)

''پڑھئے اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا ـــ جس نے قلم کے زور سے علم سکھایا' انسان کو وہ کچھ سکھا دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔'' (۱'۴'۵ : ۹۶)

اور سورۂ القلم میں قلم کے تقدس کے اظہار کے لئے اُس کی قسم اٹھائی گئی اور فرمایا:

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَO (القلم : ۱)
''نون، قسم ہے قلم کی اور جو کچھ وہ لکھتے ہیں۔'' (۶۸ : ۱)

''اِن آیاتِ مبارکہ سے جہاں خواندگی، لوح و قلم اور علم کی ہیئت، ضرورت اور افادیت کا ثبوت ملتا ہے، وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قلم کے استعمال کا فن خود خالقِ کائنات نے سکھایا ہے جو بڑے پیمانے پر علم کی اشاعت، ترقی اور نسلاً بعد نسلٍ اُس کی بقا اور تحفظ کا ذریعہ ہے۔ اگر انسان کو یہ ذریعہ میسر نہ ہوتا تو اُس کی علمی قابلیت ٹھٹھر کر رہ جاتی۔ اُسے بڑھنے، پھیلنے اور ایک نسل کے علوم دوسری نسل تک پہنچنے اور مزید ترقی کرتے چلے جانے کا موقع ہی نہ ملتا۔ قلم کے استعمال کا فن جب خود خالقِ کائنات نے سکھایا ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اُس نے اس فن کے صحیح استعمال کی ہدایت نہ دی ہو اور اُس کے غلط نتائج سے خبردار نہ کیا ہو۔''

''اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ جن چیزوں کی منفعت یا مضرّت فوری طور پر ظاہر ہو جاتی ہے اور آدمی کے اخلاق پر اُن کے اثرات مرتب نہیں ہوتے، اُن کے بارے میں وہ کوئی ہدایت نہیں دیتا لیکن جن باتوں کے فوائد اور نقصانات دیر سے ظاہر ہوتے ہیں اور اُن کا بُرا اثر انسان کے اخلاق پر پڑتا ہے تو وہ اُن کے بارے میں انسان کو ضرور خبردار کرتا ہے اور ضروری ہدایات دیتا ہے۔ مثلاً زہر کو اسلام نے مہلک ہونے کے باوجود حرام قرار نہیں دیا کیونکہ زہر انسان کے اخلاق پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ اس کے مقابلے میں خنزیر کے گوشت کو مہلک نہ ہونے کے باوجود حرام قرار دیا گیا ہے کیونکہ وہ انسان کے اخلاق پر اثر ڈالتا ہے اور آدمی اپنے طور پر اُس کے نقصان کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتا۔''

''یہی صورتِ حال قلم کے استعمال کے فن کی بھی ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ الفاظ کو کس طرح تحریر کی شکل دی جائے، رسم الخط کیا اور کیسا ہو، تو اس بارے میں اسلام نے ہمیں آزاد چھوڑ دیا ہے۔ لیکن جہاں تک تحریر اور مہارت کے اخلاقی حُسن و قبح کا تعلق ہے، اُس نے ہمیں ضروری ہدایات دی ہیں جن کی پابندی ہر مسلمان کے لئے لازم ہے۔ مثلاً یہ کہ قلم کو اس طرح استعمال کیا جائے کہ معاشرے میں محبت و مودّت اور یگانگت واتحاد پیدا ہو، خیر و صداقت فروغ پائیں، ظلم اور بدی کی قوّتیں کمزور اور بے نقاب ہوں تاکہ اُن کا سدّباب ہو۔ قلم کو اس طرح استعمال نہ کیا جائے کہ لوگوں کے اندر باہمی نفرت پیدا ہو، تعصّب پھیلے، کسی کی عزت اور شہرت مجروح ہو۔ جھوٹ، بدی، بدکاری اور ناانصافیوں کو فروغ ہو۔''

''جس طرح اسلامی زندگی بسر کرنے کے لئے قرآن و سنت کی تعلیمات پر عمل کرنا ضروری ہے اور اُسوۂ رسول ﷺ ہمارے لئے قابلِ تقلید ہے، اُسی طرح ایک مؤمن قلمکار کے لئے بھی قرآن و سنت کا اسلوبِ نگارش اور طرزِ بیان معیار و نمونہ ہے۔ قرآن مجید میں کلام کے محاسن اوجِ کمال کو پہنچے ہوئے ہیں اور اُس کا یہ چیلنج چودہ صدیاں گزرنے کے باوجود بھی قائم ہے کہ اگر کسی کو اس کے کلام اللہ ہونے میں شبہ ہو تو زیادہ نہیں، صرف ایک ہی سورت اِس جیسی لکھ کر لے آئے۔'' (''اسلامی صحافت'' ۔ سیّد عُبید اللہ زینی، صفحات ۹۱، ۹۲)

سورۂ القلم کی آیت اوّل جس کا اوپر ذکر ہوا، کی بابت پیر کرم شاہ الازہری لکھتے ہیں :

''اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ القلم سے مراد جنسِ قلم ہے اور اسی کی قسم کھائی جا رہی ہے۔ علوم وفنون، نظریات و افکار کی تعلیم و اشاعت میں بے شک زبان کی قوتِ بیانیہ کا بڑا حصہ ہے لیکن اُس کی افادیت زمان ومکان کی حد بندیوں میں محصور ہے۔ قلم ایک ایسا آلہ ہے جو زمان ومکان کی مسافتوں کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ گزشتہ صدیوں کے علوم وفنون سے حال و مستقبل کو روشن کرتا ہے اور دُور دراز علاقوں میں پیدا ہونے والے اولوالعزم حکماء و فضلاء کے افکار و نظریات کو دنیا کے گوشہ گوشہ تک پہنچاتا ہے۔''

''قرآنِ حکیم جو علم وحکمت کی برتری کا علمبردار ہے، جس نے آدم خاکی کی عظمت کا راز اِس بات کو قرار دیا ہے کہ اُس کا سینہ علوم وفنون کا گنجینہ تھا، کوئی مخلوق حتی کہ نوری فرشتے بھی اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ اس لئے قرآن کریم نے قلم کو جو علم کی نشر و اشاعت کا مؤثر اور بے مثال ذریعہ ہے، اُس کی جلالتِ شان کو ظاہر کرنے کے لئے اُس کی قسم کھائی تا کہ اِس قرآنِ کریم کے ماننے والے قیامت تک حکمت و دانش کے کارواں کی قیادت کرتے رہیں۔ اُس کے حصول کے لئے پیہم جدّ وجُہد سے اُکتا نہ جائیں اور دنیا کے گوشہ گوشہ کو اُس کی روشنی سے منوّر کرنے کے لئے اپنی ہر امکانی کوشش کریں۔ صرف قلم کی قسم کھا کر اُس کی عزت افزائی نہیں کی گئی بلکہ وَمَا يَسْطُرُونَ فرما کر علم کے اُن جواہر پاروں کی بھی قسم کھائی گئی ہے جو نوکِ قلم سے صفحۂ قرطاس کی زینت بنتے ہیں۔ اس طرح اُن کی شان کو بھی دوبالا کر دیا۔'' (''ضیاء القرآن'' جلد پنجم، صفحہ ۳۲۹، نوٹ:۱)

(۱۹) ظلم کے خلاف احتجاج کا حق : دینِ اسلام نے اپنے ماننے والوں کو یہ حق دیا ہے کہ اگر اُن پر ظلم ہو تو اُس کے خلاف آواز اٹھائیں، ظالم سے ہرگز نہ دبیں اور اُس کے ظلم وستم اور جور و جفا کو برداشت نہ کریں۔ چنانچہ فرمایا:

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ (النّسآء :۱۴۸)

''اللہ منہ پھوڑ کر برائی کرنے کو (کسی کے لئے بھی) پسند نہیں کرتا سوائے مظلوم کے۔'' (۱۴۸ : م)

یعنی بدگوئی بہت برا فعل اور نہایت قبیح عمل ہے لیکن جب ظلم حد سے بڑھ جائے، صبر اور برداشت کی طاقت نہ رہے، تحمل کا بند ٹوٹ جائے اور بالکل اضطراری حالت میں زبان سے ظلم کے سبب ظالم کے حق میں بُرے الفاظ نکلنے لگیں تو اعلیٰ ترین اخلاقی تعلیم کے باوجود اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ آخری حالت قابلِ معافی ہے۔ مظلوم کو حرفِ شکایت زبان پر لانے کا حق ہے اور شکایت کرتے ہوئے اگر اُس کی کیفیتِ جذبات شائستہ گفتگو کے آداب ملحوظ رکھنے سے قاصر ہو جائے تو اُس پر کوئی مواخذہ نہیں۔

ایک موقع پر امام الانبیاء ﷺ نے فرمایا:

''اپنے (مسلمان) بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔عرض کیا گیا: یا رسول اللہ! وہ مظلوم ہو تو ہم اُس کی مدد کریں گے' مگر ظالم ہو تو کیسے مدد کریں؟ فرمایا: اُسے ظلم سے روک دو (یہ اُس کی مدد ہوگی)۔''

(۲۰) امر بالمعروف و نہی عن المنکر: اِن کی بابت مختلف قرآنی مقامات پر یوں تاکیدی حکم ہوا:

(۱) وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ O (آلِ عمران: ۱۰۴)

''تم میں سے کچھ لوگ ایسے ضرور ہونے چاہئیں جو نیکی کی طرف بلائیں' بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکیں' جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔'' (۳ : ۱۰۴)

(۲) كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آلِ عمران: ۱۰۰)

''تم لوگ بہترین جماعت ہو جو لوگوں کے لئے پیدا کی گئی ہے' تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔'' (۳ : ۱۱۰)

(۳) وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ (لُقمٰن: ۱۷)

''نیکی (خیر) کا حکم دو اور بری بات سے روک دو۔'' (۱۷ : ۳۱)

(۴) مسلمانوں کی تصویر یہ ہے:

(i) وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ (اَلبلَد: ۱۷)

''وہ آپس میں ثابت قدم رہنے اور مہربانی کی ایک دوسرے کو نصیحت کرتے رہتے ہیں۔'' (۹۰:۱۷)

(ii) وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ O (اَلعَصر: ۳)

''اور وہ آپس میں حق و صداقت اور ثابت قدمی کی ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہیں۔'' (۳ : ۱۰۳)

سورۃ الاعراف کی آیات ۱۶۳ تا ۱۶۶ میں بنی اسرائیل کا ایک قصہ بیان ہوا ہے کہ بنی اسرائیل کے لئے سَبت (سنیچر) کے دن کسی قسم کا دنیاوی کام کرنا حرام تھا۔ بنی اسرائیل کی ایک آبادی سمندر کے کنارے آباد تھی۔ وہ حیلہ کر کے سَبت کے دن مچھلی پکڑ لیتی تھی۔ اس موقع پر اُس آبادی میں تین گروہ ہو گئے: ایک وہ جو اِس گناہ کا علانیہ مرتکب ہوتا تھا۔ دوسرا وہ جو اس فعل سے اُنہیں باز رکھنے کی کوشش کرتا تھا اور اُنہیں سمجھاتا تھا۔ تیسرا وہ جو اگرچہ اس فعل میں شریک نہ تھا لیکن اُنہیں سمجھانے اور باز رکھنے کی کوشش بھی نہیں کرتا تھا بلکہ سمجھانے والوں سے کہتا تھا کہ ایسے ناشنوا لوگوں کو سمجھانے سے کیا فائدہ جنہیں اللہ تعالیٰ اُن کے اس جرم کی پاداش میں ہلاک کرنے والا ہے۔ لیکن اُن پر جب عذابِ الٰہی آیا تو صرف دوسرا گروہ بچ گیا جو اپنے تبلیغ کے فرض کو ادا کر رہا تھا۔ بقیہ پہلا اور تیسرا گروہ برباد ہو گئے۔ پہلا تو اپنے گناہ کی بدولت اور تیسرا اپنے فرضِ تبلیغ کو ترک کرنے کے سبب سے۔

یہ قصہ بتاتا ہے کہ اسلام کی نظر میں اپنے دوسرے بھائیوں کو گرنے سے بچانا' گرتوں کو سنبھالنا اور سہارا دینا کتنا اہم ہے اور اس کے اخلاقی فرائض کا یہ کتنا ضروری حصہ ہے کہ اگر اُسے ادا نہ کیا جائے تو وہ بھی ایسا ہی گنہگار ہے جیسے وہ جو اس فعل کا مرتکب ہو۔ البتہ بھائی کا فرض اُسے سمجھا دینے اور بتا دینے کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ زبردستی منوانا اُس کا فرض نہیں۔

سیّدنا ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:
''اگر ظالم کو ظلم کرتے ہوئے لوگ دیکھیں اور پھر اُس کے دونوں ہاتھ نہ پکڑ لیں تو ہوسکتا ہے کہ وہ سب کے سب عذاب میں گرفتار ہو جائیں۔''

آپ ﷺ نے یہ بھی صاف طور پر ارشاد فرمایا:۔
''تم میں سے ہر شخص نگہبان ہے اور تم میں سے ہر شخص سے اُس کی رعایا کی نسبت باز پُرس ہوگی۔''

ابو ثعلبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ
''نیکی کا باہم حکم کیا کرو اور بدی سے ایک دوسرے کو روکتے رہو۔ لیکن جب دیکھو کہ حرص اور بخل کی اطاعت ہے اور خواہشِ نفسانی کی پیروی ہے اور دنیا کو دین پر ترجیح دی جارہی ہے اور ہر ایک اپنی رائے پر مغرور ہے تو اُس وقت عوام کو چھوڑ کر اپنی خبر لو کہ تمہارے بعد وہ زمانہ آنے والا ہے جس میں ثابت قدم رہنا شعلہ کو ہاتھ سے پکڑنا ہوگا۔''

نبیِ رحمت ﷺ نے اپنے ایک فرمان میں بہت واضح طور پر اس بات کا اشارہ فرمایا:
''ایک مؤمن جب کسی برائی کو دیکھتا ہے تو اُسے مٹانے کے لئے زورِ بازو (ہاتھ) سے جہاد کرتا ہے' اگر وہ ایسا کرنے کی قدرت نہ رکھتا ہو تو زبان سے اُس برائی کے خلاف حملہ کرتا ہے اور اگر اُس کی بھی قدرت نہ رکھتا ہو تو (کم از کم) بُرائی کو دل سے برا سمجھتا ہو اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔''

''علماء کا اس بات پر اختلاف ہے کہ آیا نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا صرف حکمرانوں اور علماء کا کام ہے' یا ہر مسلمان کے لئے حکم ہے۔ امام فخر الدین رازی کے مطابق ''یہ فرضِ کفایہ ہے۔'' یعنی اگر امت کے کچھ لوگ یہ فرض ادا کر دیں تو سب کی طرف سے یہ فرض ادا ہو جاتا ہے۔ جبکہ بعض دیگر علماء کا خیال ہے کہ ''یہ عورتوں' مریضوں اور معذوروں پر فرض نہیں ہے۔'' ایک اور مکتبِ فکر کا خیال ہے کہ یہ فرض علماء پر عائد ہوتا ہے کیونکہ قرآنی حکم میں تین چیزیں نیکی کی دعوت' بھلائی کا حکم اور برائی سے منع کرنا شامل ہیں۔ اور یہ بات تو واضح ہے کہ دوسروں کو بھلائی کی طرف وہی شخص دعوت دے سکتا ہے جو جانتا ہو کہ اچھا اور برا کیا ہے' کیونکہ جہاں رحم کی ضرورت ہوتی ہے ایک آدمی وہاں سختی کا مظاہرہ کرتا ہے اور جہاں سختی کا مظاہر کرنا چاہیے' وہاں وہ ترحم سے کام لیتا ہے۔'' (''اسلامی قانونِ صحافت'' ڈاکٹر لیاقت علی خان نیازی' صفحات ۸۱۔۸۳)

(۲۱) سچائی کا التزام: اہلِ ایمان کو حکمِ ربِّ ذی الجلال والاکرام ہے:

یٰاَیُّهَاالَّذِیْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ O (اَلتَّوبة : ۱۱۹)

''ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور راستبازوں کے ساتھ رہا کرو۔'' (۹:۱۱۹)

ایسے لوگوں کو جو ہر سنی سنائی بات پر یقین کر لیتے ہیں' رب تعالیٰ نے سورۃ المائدۃ کی آیت ۴۲ میں سَمّٰعُوْنَ لِلْکَذِبِ (جھوٹ کے بڑے سننے والوں) کا خطاب دیا ہے جو یہودیوں کا ایک گروہ تھا۔

جھوٹ کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ انسان جھوٹ سچ جو کچھ سنے' اُسے بلا تحقیق دوسروں سے کہتا پھرے۔ ایسا آدمی بے اعتبار اسمجھا جاتا ہے اور معاشرے میں اُس کی بات کی قدر نہیں ہوتی۔ اِسی لئے تاجدارِ انبیاء ﷺ نے فرمایا:

کَفٰی بِالْمَرْءِ کَذِبًا اَنْ یُّحَدِّثَ بِکُلِّ مَا سَمِعَ (صحیح مسلم)

''آدمی کو بس یہی جھوٹ کافی ہے کہ جو کچھ سنے' اُسے کہتا پھرے۔''

اسی طرح ایک موقع پر آپ ﷺ نے بروایت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ ارشاد فرمایا:

اِنَّ الصِّدْقَ یَهْدِیْ اِلَی الْبِرِّ وَاِنَّ الْبِرَّ یَهْدِیْ اِلَی الْجَنَّةِ وَاِنَّ الرَّجُلَ لَیَصْدُقُ حَتّٰی یُکْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ صِدِّیْقًا وَ اِنَّ الْکَذِبَ یَهْدِیْ اِلَی الْفُجُوْرِ وَاِنَّ الْفُجُوْرَ یَهْدِیْ اِلَی النَّارِ وَاِنَّ الرَّجُلَ لَیَکْذُبُ حَتّٰی یُکْتَبَ عِنْدَاللّٰهِ کَذَّابًا (صحیح بخاری: کتاب الادب' باب: قول اللہ تعالیٰ : یٰاَیُّهَاالَّذِیْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ؛ صحیح مسلم: کتاب البِرّ' باب: تحریم النَّمِیمة و باب: قُبحُ الکذب)

''یقیناً سچائی نیکی کی طرف راہ نمائی کرتی ہے اور نیکی جنت کی طرف لے جاتی ہے۔ آدمی سچ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ اُسے اللہ کے ہاں بہت سچا لکھ دیا جاتا ہے اور جھوٹ نافرمانی کی طرف راہ نمائی کرتا ہے اور نافرمانی جہنم کی طرف لے جاتی ہے اور آدمی جھوٹ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے ہاں اُسے بہت جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے۔''

(۲) اِنَّ الصِّدْقَ طَمَانِیْنَةٌ'' وَالْکَذِبُ رِیْبَةٌ'' (صحیح الترمذی' ابواب: صفة القیامة ؛ مسند احمد ؛ صحیح ابن حبّان ؛ المستدرک للحاکم)

''یقیناً سچ اطمینان کا باعث اور جھوٹ شک اور بے چینی ہے۔''

(۳) عَنْ اَبِیْ خَالِدٍ حَکِیْمِ بْنِ حِزَامٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : اَلْبَیِّعَانِ بِالْخِیَارِ مَا لَمْ یَتَفَرَّقَافَاِنْ صَدَقَا وَبَیَّنَا بُوْرِکَ لَهُمَا فِیْ بَیْعِهِمَا وَاِنْ کَتَمَا وَ کَذَبَا مُحِقَتْ بَرَکَةٌ'' فِیْ بَیْعِهِمَا (صحیح بخاری : کتاب البیوع' باب : اذا بیّن البیّعان ولم یکتما ونصحا ؛ صحیح مسلم : کتاب البیوع' باب : ثبوت خیار المجلس للمتبایعین)

''حضرت ابو خالد حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دونوں سودا کرنے والوں کو اُس وقت تک اختیار ہے جب تک وہ جدا نہ ہوں۔ پس اگر وہ دونوں سچ بولیں اور چیز کی حقیقت صحیح صحیح بیان کریں (یعنی اگر کوئی عیب وغیرہ ہو تو بتا دیں) تو اُن کے اس سودے میں برکت ڈال دی جاتی ہے اور اگر وہ چھپائیں اور جھوٹ بولیں تو اُن کے سودے سے برکت مٹا دی جاتی ہے۔''

(۲۲) ''تعمیر ملّت : فرد کی تعمیر میں اُس کی ملی تاریخ اہم حیثیت رکھتی ہے۔ قومی نشریات میں فرزندانِ اسلام کے کارناموں کو اِس انداز سے بیان کرنے کی ضرورت ہے جو اہلِ مغرب کے غلط پروپیگنڈے کا جواب بھی ہوں اور ہماری نسلوں کے لئے ذہنی اطمینان اور اخلاقی آسودگی بھی فراہم کر سکیں۔ ایسے پروگرام مرتب کرنے کی طرف خاص توجہ کی جائے اور اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ' سیرتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین وائمہ عظام رحمہم اللہ تعالیٰ' مجاہدینِ اسلام کے کارنامے اور تاریخِ اسلام کے سبق آموز واقعات دلکش و دلنشیں انداز میں پیش کئے جائیں۔ اس کے علاوہ نئی نسل کو شجاعت و بسالت' جفاکشی اور محنت کوشی کی تربیت کے لئے برّی' بحری اور فضائی افواج کی مشقوں کے مناظر دکھائے جائیں۔'' (بحوالہ رپورٹ ابلاغ عامہ' اسلامی نظریاتی کونسل' صفحہ ۲۰: ماخوذ از: ''اسلام کا قانونِ صحافت''۔ ڈاکٹر لیاقت علی خان نیازی' صفحہ ۷۹)

(۲۳) عالی ظرفی کا التزام : کسی شخص یا گروہ کے بارے میں یہ جاننے کے باوجود کہ وہ مخلص نہیں ہے یا منافق ہے اور جو کچھ وہ زبان سے ظاہر کر رہا ہے' وہ وہ نہیں جو اُس کے دل میں ہے' اُسے اُس کے نفاق کو جتانے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس طرح اُس شخص یا گروہ کو شرمندہ کر کے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا بلکہ وہ الٹا ضد اور ہٹ دھرمی پر اُتر آئے گا۔ عالی ظرفی کا تقاضا تو یہ ہے کہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اُسے پورے اخلاص کے ساتھ مثبت انداز میں نصیحت کی جائے۔ ارشادِ ربانی ہے:

أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًاۢ بَلِيْغًا O (النساء : ۶۳)

''اللہ جانتا ہے جو کچھ اُن کے دلوں میں ہے' اُن سے تعرض مت کرو' اُنہیں سمجھاؤ اور ایسی نصیحت کرو جو اُن کے دلوں میں اُتر جائے۔'' (۴ : ۶۳)

(۲۴) تحریف کی ممانعت : تحریف کا اطلاق اصل عبارت یا قول کے الفاظ میں ردّ و بدل کرنے' تاویلات کے ذریعے اُس کے معنی کچھ سے کچھ بنا دینے اور اُسے شرارت سے توڑ مروڑ کر پیش کرنے پر ہوتا ہے اور یہ تینوں قسم کی تحریف صریحاً بد دیانتی ہے۔ سورۃ النّساء میں یہود کی اس بیماری کی طرف یوں ارشاد ہوا :

مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ (النّساء : ۴۶)

''جو لوگ یہودی بن گئے ہیں' اُن میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو الفاظ کو اُن کے محل سے پھیر دیتے ہیں۔''

(۲۵) اکثریت کی پسند معیارِ حق نہیں ہے : عوام کی اکثریت جس بات کو پسند کرے' ضروری نہیں

کہ وہ حق بھی ہو اور اُن کے لئے فائدہ مند بھی۔ لہٰذا ادیب اور صحافی کو چاہیئے کہ وہی بات لکھے جسے وہ اپنے علم و یقین کی بناء پر درست سمجھتا ہو اور جو واقعی عام آدمی کے بھلے اور فائدہ کی ہو خواہ اکثریت اپنی کم فہمی کی بناء پر اُسے ناپسند ہی کیوں نہ کرے۔ اس بارے میں قرآنِ حکیم کا فرمودہ ملاحظہ ہو:

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ O (الانعام: ۱۱۶)

''اگر تم اُن لوگوں کی اکثریت کے کہنے پر چلو جو زمین میں بستے ہیں تو وہ تمہیں اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں گے، وہ تو محض گمان پر چلتے اور قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔'' (۶ : ۱۱۶)

یعنی یقینی اور بھروسے کے لائق علم تو وہی ہے جس کا سرچشمہ وحیِ الٰہی ہے۔ اس کے مقابلے میں کسی فلسفی یا دانشور کا گمان و قیاس آخر کیا معنی رکھتا ہے کہ اُس کی پیروی کی جائے!!

''<u>صحافت میں عدل و احسان</u>: کائنات کی ساخت اور نظم پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سارا کارخانہِ قدرت عدل و اعتدال کے اصول پر قائم ہے اور زمین، چاند، سورج، ستارے اور تمام ذی روح اور بے روح اشیاء سب ایک مشین کی طرح اُس خدمت کو بے چون و چرا انجام دئے جا رہے ہیں جو خالقِ کائنات نے اُن کے سپرد کر رکھی ہے۔ مگر اس کائنات کے روحِ رواں انسان کا معاملہ قدرے مختلف ہے۔ وہ اشرف المخلوقات ہے۔ ذی روح ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ذی عقل اور ذی شعور بھی ہے۔ اُسے ربِّ ذوالجلال والاکرام نے زمین پر اپنا خلیفہ بنا کر کچھ اختیارات بھی تفویض کئے ہیں جنہیں وہ اپنی مرضی سے استعمال کر سکتا ہے جبکہ دوسری جاندار اور غیر جاندار مخلوقات کو کوئی اختیار نہیں اور وہ سختی کے ساتھ اُس نظامِ عدل پر کاربند رہنے کی پابند ہیں جو روزِ اوّل سے اُن کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ انسان کو حاصل یہ اختیار اُس کا اعزاز بھی ہے اور ذمہ داری اور آزمائش بھی ہے جس میں کامیابی اور ناکامیابی پر ہی آخرت کی جزا و سزا کا انحصار ہے۔ اس اختیار کی بناء پر ایک انسان عدل کا رویّہ اختیار کر کے اللہ تعالیٰ کے انعام کا مستحق بنتا ہے اور دوسرا اعتدال کی روش اختیار نہ کرنے پر اُس کے غیظ و غضب کا سزاوار ٹھہرتا ہے۔ گویا انسان کی آزمائش اس میں ہے کہ رب تعالیٰ نے اُسے جس عدل پر قائم کیا ہے، آیا وہ اپنی تشریعی حیثیت میں بھی اُس عدل کا اہتمام کرتا ہے یا نہیں؟''

''اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری کلام یعنی قرآنِ حکیم اور اپنے آخری رسول ﷺ کی حدیث کی شکل میں قیامِ عدل کا ایسا جامع و مانع ضابطہِ اخلاق مہیا کر دیا ہے جو قیامت تک اللہ سے ڈرنے والوں کی راہ نمائی کرتا رہے گا۔ چنانچہ سورۃ النّحل کی آیت ۹۰ میں حکم ہوا:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ

''بے شک اللہ تعالیٰ عدل کا، حسنِ سلوک کا اور اہلِ قرابت کو دیتے رہنے کا حکم دیتا ہے، اور کھلی بُرائی سے اور مطلق برائی سے اور ظلم (و سرکشی) سے روکتا ہے۔'' (۱۶ : ۹۰)

اِس حکم کے تحت لازم ہے کہ انسان ہر معاملے میں یہ دیکھے کہ عدل و انصاف کا تقاضا کیا ہے کیونکہ عدل کرنا ہی ظلم ہے اور جب کوئی شخص عدل نہیں کرتا تو گویا وہ ظلم کرتا ہے۔

عدل کی دو قسمیں ہیں: ایک عدل وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے مقرر کیئے ہوئے حدود و قوانین کو توڑنے پر عدالت کرتی ہے۔ یہ قانونی عدل ہے اور اِس سلسلے میں حکم یہ ہے کہ جرم ثابت ہو جانے پر مجرم کو سزا دینے میں نرمی ہرگز نہ برتی جائے۔ کیونکہ ایسا کرنا معاشرے میں امن و امان برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہوا:

وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ" فِي دِينِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (اَلنُّور : ۲)

''اور اُن (زانی اور زانیہ) پر ترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملے میں تمہیں دامن گیر نہ ہو اگر تم اللہ تعالیٰ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔'' (۲ : ۲۴)

سزا دینے میں نرمی نہ کرنے کا یہ حکم اس لئے دیا جا رہا ہے کہ اِس جرم پر اللہ کے ہاں جو سزا ملے' وہ یقیناً دنیا کی سزا سے زیادہ سخت ہو گی۔ دنیا ہی میں سزا دے دینا دراصل اپنے گنہگار بھائی پر احسان کرنے کے مترادف ہے۔

عدل کی دوسری سم عدلِ اَخلاقی ہے جس کو ہمیں آپس کے تعلقات اور اپنی روزمرہ کی زندگی اور اُس کے معاملات میں برتنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اِس حکم کا مطلب یہ ہے کہ ہر آدمی اپنے دائرہ اختیار میں عدل کرے اور اُس کا ہر قول اور ہر فعل عادلانہ ہو۔ جو نعمتیں اور قوّتیں اللہ تعالیٰ نے دی ہیں' وہ بھی عدل کے ساتھ استعمال کی جائیں۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں عدل و قسط کو اِس طرح اپنایا جائے کہ عدل فرد اور معاشرے دونوں کی شناخت بن جائے۔ فرد معاشرے سے' معاشرہ فرد سے' عوام حکومت سے' حکومت عوام سے' رہنما پیروکاروں سے' پیروکار رہنما سے' استاد شاگرد سے' شاگرد استاد سے' والدین اولاد سے' اولاد والدین سے' شوہر بیوی سے' بیوی شوہر سے' تاجر خریدار سے' مزدور کارخانہ دار سے' کارخانہ دار مزدور سے' غرض سب لوگ ایک دوسرے سے بلکہ خود اپنے آپ سے بھی عدل و انصاف کا سلوک کریں۔

عدل زندگی کے دوسرے سب شعبوں کی طرح شعبہ صحافت کے لئے بھی ضروری ہے۔ ہر صحافی کا فرض ہے کہ وہ بحث و مباحثہ میں تنقید اور نکتہ چینی میں' کسی بارے میں رائے دینے اور رائے قائم کرنے میں' کسی بات کے حق ہونے یا نہ ہونے کی شہادت دینے میں' کسی مسئلے کی وکالت میں' حق کی حمایت اور باطل کی مخالفت میں' کسی زیردست کو تلقین کرنے میں اور بالادست کو مخاطب کرنے اور مشورہ دینے میں کبھی عدل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے۔

''مذکورہ بالا آیت میں عدل کے علاوہ جن دو باتوں کا حکم دیا گیا ہے' وہ احسان اور صلہ رِحمی ہے۔ احسان سے مراد نیک برتاؤ' فیّاضانہ معاملہ' ہمدردانہ رویّہ' رواداری' خوش خلقی' درگزر' باہمی مراعات' ایک دوسرے کا پاس و

لحاظ' دوسرے کو اُس کے حق سے کچھ زیادہ دینا اور خود اپنے حق سے کچھ کم پر راضی ہو جانا' یہ عدل سے زائد ایک چیز ہے جس کی اہمیت اجتماعی زندگی میں عدل سے بھی بڑھ کر ہے۔ عدل اگر معاشرے کی اساس ہے تو احسان اُس کا جمال و کمال ہے۔ عدل اگر معاشرے کو تلخیوں سے بچاتا ہے تو احسان اُس میں خوشگواریاں اور شیرینیاں پیدا کرتا ہے۔'' (''تفہیم القرآن'' جلد دوم' صفحہ ۵٦۵)

اِس آیت میں جس تیسری بات کا حکم دیا گیا ہے' وہ صلہ رحمی ہے جو خود غرضی اور مفاد پرستی کی ضد ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اسلامی معاشرے کے تمام افراد صرف اپنی ذات اور اپنے بال بچوں ہی کا بھلا نہ چاہتے رہیں بلکہ اپنے عزیز و اقارب کی بھی امداد کرتے رہا کریں۔ اگر اللہ نے مال و دولت دیا ہے تو اپنے غریب رشتہ داروں پر بھی اُسے خرچ کریں۔ یہ بات عدل و احسان اور صلہ رحمی کے منافی ہے کہ ایک شخص تو عیش کر رہا ہو اور اُس کے قریبی عزیز اور بھائی بند روٹی کپڑے تک کے محتاج ہوں۔ متعدد احادیثِ مبارکہ میں اس کی تصریح ہے کہ آدمی کے اوّلیں حقدار اُس کے والدین' اُس کے بیوی بچے' اور اُس کے بھائی بہن ہیں۔ پھر وہ جو اُن کے بعد قریب تر ہوں اور پھر وہ جو اُن کے بعد قریب تر ہوں۔ جس معاشرے میں اِس اصول پر عمل ہو رہا ہو' اُس میں نام نہاد طبقاتی شعور جسے ''طبقاتی منافرت'' کہنا زیادہ صحیح ہوگا' کیسے پیدا ہو سکتا ہے!''

ایک صحافی اِس سلسلے میں نہایت اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ اُسے چاہئے کہ اپنے زورِ قلم سے عدل و احسان اور صلہ رحمی کی خوبیوں کو لوگوں کے ذہنوں میں زیادہ سے زیادہ راسخ کرے تاکہ معاشرے میں محبت' اخوت اور بھائی چارے کی فضا پروان چڑھے۔

عدل اور احسان کی حقیقت کو سورۂ الشّوریٰ کی ذیل کی آیت ۴۰ میں کس خوبصورتی سے سمو دیا گیا ہے:

وَجَزَآءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللهِ

''بُرائی کا بدلہ ویسی ہی بُرائی ہے۔ پھر جو کوئی معاف کر دے اور اصلاح کرے تو اُس کا اجر اللہ کے ذمّہ ہے۔'' (۴۲ : ۴۰)

اِس آیت کی رُو سے اگر آدمی برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی کر کے لے لے' تو یہ عدل ہوگا اور اگر بدلہ نہ لے اور زیادتی کرنے والے کو اس لئے معاف کر دے کہ اِس سے اُس کی اصلاح ہو گی تو یہ احسان ہوگا جس کا اجر اللہ نے اپنے ذمّے لے رکھا ہے اِس لئے آدمی کو اِس بات کی پروا نہیں کرنی چاہئے کہ کوئی بدلہ نہ لینے کو اُس کی کمزوری اور بُزدلی پر محمول کرتا ہے' بلکہ پیشِ نظر یہ بات رہنی چاہئے کہ عفو و درگزر اللہ کے لئے ہو تو وہ کمزوری نہیں بلکہ ایک ایسی نیکی ہے جو اللہ کو سب سے زیادہ محبوب ہے اور اللہ تو ظاہر ہے کہ اچھا ہی بدلہ دے گا۔

اِس اصول کی پابندی صحافت میں بھی ضروری ہے۔ مخالف خواہ کیسی ہی غلیظ اور اشتعال انگیز زبان استعمال کرے' کیسے ہی غلیظ الزامات لگائے' ایک مؤمن صحافی کو بہرحال عدل و احسان سے ہی کام لینا چاہئے۔

اسلام اپنے معاشرے میں کس قسم کی صحافت چاہتا ہے اور اسلامی صحافت کے مقاصد کیا ہیں' یہ سب ایک صاف ستھرے آئینہ میں اوپر کے صفحات میں آپ کو دکھا دیا گیا ہے۔ اب اس آئینہ میں موجودہ دَور کی صحافت کو ہم نے دیکھنا ہے کہ وہ کس حد تک اِن اصولوں اور قواعد وضوابط کی پابندی کر رہی ہے اور آیا وہ ملک وملت اور بالخصوص اُس کی نوجوان نسل کی صحیح معنوں میں مثبت خطوط پر خدمت کر رہی ہے یا نہیں؟

(I) جمعۃ المبارک کے ضمیمے اور ہمارے اخبارات : ہمارے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ جمعہ کا دن اپنے تقدّس کے لحاظ سے تمام دنوں پر فوقیت رکھتا ہے۔ یہ دن اپنے خالق و مالک سے مغفرت طلب کرنے اور توبہ کرنے کا ہے کیونکہ اُس کریم ورحیم ذات کی جانب سے اِس دن فریادیں' دعائیں اور التجائیں بکثرت قبول ہوتی ہیں۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ اِس دن کے تقدّس کی اہمیت کو نہ سمجھتے ہوئے بالکل فراموش کیا جا رہا ہے۔ دوشیزگان اور مچلتی جوانیوں کو شہوانی انداز اور بھڑ کیلے لباس میں ظاہر کرنے میں ہماری اخباروں کے جمعہ کے ضمیمہ جات کا کردار کوئی ڈھکا چھپا راز نہیں ہے یہاں تک کہ ایک سیدھے سادے آدمی کو بھی بدی کی اس شراب سے کچھ چسکیاں مجبوراً لینا ہی پڑتی ہیں۔

اُمّتِ مسلمہ میں مادیّت زدہ مغربی ثقافت کی تشکیل میں اور اُسے ہر دلعزیز بنانے میں شہرہ آفاق ماہرِ نفسیات سگمنڈ فرائڈ (Segmund Freud) نے دوسرے فلسفیوں کے ساتھ ساتھ نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ فرائڈ کے نزدیک جنسی انگیخت انسانی عمل میں بہت ہی طاقتور محرک ہے۔ اُس کے فلسفہ نے تاجروں کی ذہنیت کو اپنی تیار کردہ اشیاء کی فوری فروخت میں جنسی انگیخت کے اشتہارات نے بدل کے رکھ دیا کیونکہ وہ بہت ہی مؤثر آلہِ کار تھے۔ آزادیِ افکار کی یہ بات غیر مسلم ممالک پر تو اُن کی بے حیا' قابلِ نفرت اور گھناؤنی ثقافت کے باعث صادق آتی ہے لیکن پاکستان جیسے مسلم ملک میں اس کی گنجائش ہرگز نہیں ہونی چاہیئے۔

(II) حُسن کے مقابلہ جات دراصل ننگے پن کے مقابلے ہیں : نام نہاد ''مقابلہ جاتِ حُسن'' میں حصّہ لینے والی لڑکیوں کو اِن مقابلہ جات میں لازمی طور پر اپنے جسم کا اَنگ اَنگ اور ہر ہر حصّہ دکھانا ہوتا ہے۔ لہٰذا اس لحاظ سے اِن مقابلہ جات کو ''ننگے پن کے مقابلہ جات'' کے نام سے موسوم کرنا مناسب ہے۔ فاتح دوشیزگان اپنے اعضائے بدن کے مکمل اظہار میں بڑی وسیع شہرت حاصل کرتی ہیں۔ یورپی ممالک میں اس فحاشی اور اخلاقی بے راہروی پر ہم رونا نہیں روتے کیونکہ برہنگی اور بے حیائی اُن کی ثقافت کا جزوِ لاینفک ہے۔ لیکن پاکستان جیسے ملک میں یہ بھیانک پن اور حکمِ الٰہی کی صریحاً نفی کیوں' جس کی اکثر آبادی مسلمانوں کی ہے اور جسے اسلام کے مقدّس نام پر حاصل کیا گیا! ہماری ماؤں' بہنوں اور بیٹیوں نے اپنے خالق و مالک کے پیغام کو کیوں فراموش کر دیا ہے کہ شرم وحیا اُن کا اصل سرمایہ اور رب تعالیٰ کا عطیہ ہے۔ قرآن میں شامل اپنی اسلامی تاریخ کو ذرا وہ جھانک کر تو دیکھیں کہ قرآن حکیم نسوانی شرم وحیا کی بابت کیا کہتا ہے :

فَجَآءَتْهُ اِحْدٰهُمَا تَمْشِیْ عَلَی اسْتِحْیَآءٍ (اَلْقَصَص : ۲۵)
"پھر اُن دو میں سے ایک لڑکی موسیٰ (علیہ السلام) کے پاس آئی کہ شرماتی ہوئی چلتی تھی۔" (۲۸:۲۵)

صحافیوں کو یہ بات نہیں بھولنی چاہئے کہ قرآنِ حکیم کا مقصدِ عظیم عفت و عصمت اور کردار کا اعلیٰ و ارفع نمونہ پیدا کرنا ہے اور قرآنِ حکیم نے شہوانی جاذبیّت کو اُبھارنے والے بعید ترین جذبات کو بھی حکماً روک دیا ہے۔ اس سلسلہ میں چند نکات کا ذہن نشین ہونا ضروری ہے :

جنسی کشش کے بارے میں چار خطرناک چور گڑھے (Pitfalls)

(۱) آنکھوں اور دیگر اعضائے جسمانی کا زنا: ختمی مرتبت آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا :

"آدمی اپنے تمام حواس سے زنا کرتا ہے۔ غیر محرم کو دیکھنا آنکھوں کا زنا ہے' اُس سے لگاوٹ کی بات کرنا زبان کا زنا ہے' اُس کی آواز سے لذّت لینا کانوں کا زنا ہے' اُسے ہاتھ لگانا اور ناجائز مقاصد کے لئے چلنا ہاتھ پاؤں کا زنا ہے۔ بدکاری کی یہ ساری تمہیدیں جب پوری ہوچکتی ہیں' تب شرمگاہیں یا تو اُس کی تکمیل کر دیتی ہیں یا تکمیل کرنے سے رہ جاتی ہیں۔" (بخاری' مسلم' ابوداؤد)

قرآنِ حکیم اپنے مرد مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ اگر وہ کسی غیر محرم عورت کے بناؤ سنگھار کو اچانک دیکھ لیں تو وہ اپنی نظروں کو اُس سے پھیر لیں۔ لیکن ہمارے صحافی اور اخبارات صنفِ نازک کو انتہائی بھڑکیلے لباس اور جنسی کشش کے انداز میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ایسے مسلمان کے لئے جو خلوص کے ساتھ احکامِ الٰہی پر کامل دیانتداری سے عمل پیرا ہونا چاہتا ہے' ممکن ہی نہیں کہ وہ اُن پر نظر ڈالے بغیر اخبار کا مطالعہ کر لے۔ یہ کسی بھی صورت میں کوئی خوشگوار رُجحان نہیں ہے اور اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ ہم اپنی معاشرتی اقدار سے رُوگردانی کر رہے ہیں اور اس طرح گویا اپنے مذہب اسلام کے خلاف "عدمِ اعتماد" کی تحریک پاس کر رہے ہیں۔ (العیاذ باللہ)

(۲) صنفِ نازک کا اپنے اعضائے جسمانی کا اظہار: اس میں وہ تمام طریقے اور راہیں شامل ہیں جو لوگوں کی نظروں اور توجہ کی جاذبیت کا سامان رکھتے ہیں خواہ وہ عطریات اور خوشبویات کی شکل میں ہوں یا پازیب اور کڑوں کے زیور کے جھنکار کی شکل میں ہوں۔ کیونکہ یہ راہیں بھی جنسی انگیخت کا سامان رکھتی ہیں۔ چنانچہ عورتوں کو حکم ہوا :

وَلَا یَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِیُعْلَمَ مَا یُخْفِیْنَ مِنْ زِیْنَتِهِنَّ (اَلنُّور : ۳۱)
"اور عورتیں اپنے پاؤں زور سے نہ رکھیں کہ اُن کا مخفی زیور معلوم ہو جائے۔" (۲۴ : ۳۱)

گویا اِن پازیبوں اور کڑوں کا پہننا فی نفسہٖ درست ہے لیکن اُن کی آواز یا جھنکار فتنہ کے اندیشہ کی وجہ سے

درست نہیں ۔اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب زیور کی آواز کے چھپانے کا اتنا اہتمام ہے تو اُس کے پہننے والیوں کی آواز جو اکثر فتنہ و میلانٔ کا سبب بنتی ہے' کا چھپانا کیوں نہ قابلِ اہتمام ہوگا☆ ۔یہ بھی معلوم ہوا کہ جب صَوت (آواز) کو چھپانے کا اتنا اہتمام ہے تو صورت کا چھپانا کس قدر اہم ہوگا!

(۳) ہوسنا کی اور بے حیائی سے اجتناب : قدرتی اصول یہ ہے کہ جنسی کشش جتنی زیادہ ہو' چور گڑھے (Pitfall) سے بچنے کے لئے اُتنی ہی احتیاطی تدابیر زیادہ ہونی چاہئیں ۔اس قرآنی فلسفے کی تفصیل یہ ہے کہ ''بہت زیادہ عمر کی عورتوں کو لباس کے قواعد وضوابط میں ازراہِ تخفیف کچھ رعایت دی گئی ہے بشرطیکہ اُن میں اپنی مستی بھری نسوانیت کا اظہار مقصود نہ ہو'' (تفسیر ماجدی انگریزی' صفحہ 346-A نوٹ : 366) ۔قرآن مجید اس تخفیف کو یوں بیان کرتا ہے :۔

وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِیْ لَا یَرْجُوْنَ نِكَاحًا فَلَیْسَ عَلَیْهِنَّ جُنَاح '' اَنْ یَّضَعْنَ ثِیَابَهُنَّ غَیْرَ مُتَبَرِّجٰتٍ بِزِیْنَةٍ وَاَنْ یَّسْتَعْفِفْنَ خَیْر '' لَّهُنَّ (اَلنور : ۶۰)

''اور بڑی بوڑھیاں جنہیں نکاح کی امید نہ رہی ہو' اُنہیں کوئی گناہ نہیں (اِس بات میں) کہ وہ اپنے زائد کپڑے اُتار رکھیں (بشرطیکہ) زینت کو دکھلانے والیاں نہ ہوں' اور اگر اس سے بھی احتیاط رکھیں تو اُن کے حق میں اور بہتر ہے ۔'' (۶۰ : ۲۴)

قدرتی یا مصنوعی سنگھار کے موقعوں کو نامحرموں کے سامنے بے پردہ لانا اُن بوڑھیوں کے لئے بھی جائز نہیں جو حدِّ نکاح سے گزر چکی ہوں ۔اس سے ظاہر ہے کہ جوان جہان عورتوں کو اپنے جسم کے چھپانے کے بارے میں کتنا اہتمام چاہئے یہاں تک کہ چہرہ اور ہتھیلیاں جو بالذات داخلِ ستر نہیں' بہ قول فقہاء کے احتمالِ فتنہ سے وہ بھی داخلِ ستر ہو جاتی ہیں ۔ وَاَنْ یَّسْتَعْفِفْنَ خَیْر '' لَّهُنَّ کے پیشِ نظر خوب خیال میں رہے کہ حجاب وسُتر کی جو پابندیاں بوڑھیوں پر واجب نہیں' وہ بھی اُن کے حق میں بہتر ہیں ۔

(۴) نسوانی آواز جنسی کشش کے لئے چور گڑھا ثابت ہوسکتی ہے : نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ازواجِ مطہرات کو خطاب کرتے ہوئے قرآن نے فرمایا :

یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَیْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَیَطْمَعَ الَّذِیْ فِیْ قَلْبِهٖ مَرَض '' وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًاO (الاحزاب :

''اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو # جبکہ تم تقویٰ اختیار رکھو تو تم بات کرنے میں نزاکت

☆ آواز کے اِسی متوقع فتنہ کے مدِّ نظر قرآنِ کریم نے سورۃ الاحزاب میں نبی علیہ السلام کی ازواجِ مطہرات جیسی مقدس اور پاکدامن ہستیوں کو حکم دیا جس کا ذکر آگے نمبر (۴) کے تحت ہو رہا ہے۔

#☆ اس سے معلوم ہوا کہ جب نبی کی بیویاں عام عورتوں کی طرح نہیں ہیں تو اُن کے شوہر نامدار نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام عام لوگوں کی طرح کیسے ہوگئے! اللہ تعالیٰ صحیح فہم عطا فرمائے اور عظمتِ رسالت کو ہمارے انگ انگ میں داخل کر دے!

اختیار مت کرو کہ (اس سے) ایسے شخص کو خیال فاسد پیدا ہونے لگتا ہے جس کے دل میں خرابی ہے اور قاعدے کے مطابق بات کہا کرو۔'' (۳۲ : ۳۳)

عورت کی آواز میں جو قدرتی نرمی اور لوچ ہوتی ہے' اُسے مرد کی خواہشِ نفسانی کے اُبھارنے میں بڑا دخل ہے۔ اور اِسی لئے عورتوں کو نماز کے لئے اذان کہنے کی اجازت نہیں۔ اسلام کے ہمہ داں' ہمہ بیں شارع عزّ وجلّ نے نفس کے اِس محرک کو بھی اجراءِ احکام میں پوری طرح پیشِ نظر رکھا ہے۔ اس کی ہدایت اُمّت کی ہر عورت کے لئے ہے کہ اپنی آواز کی نزاکت سے کسی نامحرم کو ناجائز فائدہ اُٹھانے کا موقع نہ دے اور ازواجِ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے اُن کے شرف واحترام کی مناسبت سے اس کا اور زیادہ اہتمام ہے۔ نسوانی آواز کے محرک ہونے کا جدید ماہرینِ نفسیات نے بھی اعتراف کیا ہے مثلاً ایک مغربی ماہرِ نفسیات کا کہنا ہے کہ :

''ہمیں آواز اور موسیقی کو جنسی کشش کے حوالے سے بالعموم خاصی اہمیت دینی چاہئے۔ اس نکتے پر ہم مول (Moll) سے متفق ہیں جس نے کہا تھا کہ: ''کانوں کے ذریعے جنسی اشتعال اس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے جتنا کہ کہا جاتا ہے۔'' ("Psychology of Sex"... Havelock Ellis, p. 61)

مسلمان ہوتے ہوئے اور ایک اللہ اور ایک رسول کے ماننے والے ہم مسلمانوں کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں ریڈیو اور ٹیلیویژن پر دوسرے پروگراموں کے علاوہ خبریں بھی خواتین سے پڑھوائی جاتی ہیں جس کی وجہ یہ نہیں کہ خبریں پڑھنے والے مرد دستیاب نہیں بلکہ اس کا سبب مغربی تہذیب کی نقالی ہے اور صنفِ مخالف کے لئے جاذبیت اور کشش کا سامان کرنا ہے۔ ٹیلیویژن کے ڈائریکٹر نیوز نے ۶ مارچ ۱۹۸۵ء کو ایک چٹھی کے ذریعے تمام نیوز کاسٹروں کو یہ ہدایت کی :۔

''دیکھنے میں آیا ہے کہ ہمارے بعض نیوز کاسٹر جب خبریں پڑھتے ہیں تو اُن کا چہرہ بہت سنجیدہ اور تاثرات سے عاری ہوتا ہے۔ اُن کے خبریں پڑھنے کے انداز میں ضرورت سے زیادہ ثقاہت اور ضابطہ پسندی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ چیز ٹیلیویژن پر خبروں کی پیشکش کے بنیادی اصولوں کے منافی ہے۔ ہمارے ناظرین بالخصوص بہت اہم ناظرین نے بارہا اس طرف توجہ دلائی ہے کہ ٹیلی ویژن کے نیوز کاسٹروں کو چاہئے کہ (اسکرین پر) پُرسکون اور شگفتہ نظر آئیں اور اُن کے لہجے میں قدرے بے ساختگی ہو۔ بعض بڑے اخبارات نے بھی ہمارے نیوز کاسٹروں کے پژمردہ چہرے کے ساتھ رسمی اور سپاٹ انداز میں خبریں پڑھنے پر نکتہ چینی کی ہے۔''

''اس کے پیشِ نظر میں اپنے نیوز کاسٹروں کو بتانا چاہتا ہوں کہ وہ اپنے بلیٹن کا آغاز ایک دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ کریں اور پُرسکون اور بے ساختہ انداز میں خبریں پڑھا کریں۔ میں آئندہ اِس بات کا خاص خیال رکھوں گا کہ اس ہدایت پر کہاں تک عمل ہو رہا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ صورتِ حال جلد بہتر ہو جائے گی۔''

''اِس ہدایت کے باوجود بعض خواتین نیوز کاسٹر اپنی فطری حیا کے باعث اپنے چہرے پر دلآویز مسکراہٹ سجا کر بلیٹن کا آغاز نہ کرسکیں تو ڈائریکٹر نیوز نے ۲ مارچ ۱۹۸۵ء کو یعنی ٹھیک چودہ دن بعد اُنہیں یہ انتباہ کیا:

''میں اُن پر یہ واضح کردینا چاہتا ہوں کہ ۶ مارچ کی چھٹی میں جو ہدایت دی گئی تھی اُسے سرسری نہ لیں۔ ہماری نیوز کاسٹروں کو چاہئے کہ وہ خبریں پڑھنے کے اپنے طرز کو نئے سانچے میں ڈھالنے کی سنجیدہ کوشش کریں۔ جو نیوز کاسٹرا اپنے اندر یہ تبدیلی نہیں لاسکیں گی وہ ٹیلی ویژن پر زیادہ دیر تک خبریں نہیں پڑھ سکیں گی۔''

''ٹیلی ویژن کے ڈائریکٹر نیوز صاحب نے ''بعض بہت اہم ناظرین'' کی فرمائش پر خاتون نیوز کاسٹروں کو جو ہدایت فرمائی ہے' اُس کا سبب دراصل وہ ذہنیت ہے جو مغرب کی مادّہ پرستانہ تہذیب سے مرعوبیّت کا نتیجہ ہے ورنہ اسلامی تہذیب تو کبھی اس بات کو پسند نہیں کرسکتی کہ ایک عورت اجنبی یا نامحرم لوگوں کے سامنے مسکرا مسکرا کر اُن کی تفریحِ طبع اور آوارہ ذہنیت کا سامان فراہم کرے۔'' اُنہیں سورۃ الاحزاب کی محوّلہ بالا آیت ۳۲ میں مذکور حکمِ خداوندی کا خیال ہونا چاہئے۔

''مغربی تہذیب و ثقافت کے دلدادہ مسلمانوں کی مشکل یہ ہے کہ وہ مسلمان رہتے ہوئے وہ سب کچھ کرنا چاہتے ہیں جو مغرب کی مادّہ پرستانہ تہذیب میں حلال ہے لیکن جسے اسلام نے حرام قرار دے رکھا ہے' ورنہ دیکھا جائے تو اسلامی تہذیب کی بنیاد عقیدہ توحید و رسالت اور آخرت ہے۔ اِس بنیاد پر قائم ہونے والی تہذیب کو یقینی طور پر اُس تہذیب سے مختلف ہونا چاہئے جس کی بنیاد شرک یا انکارِ آخرت یا خالص مادّہ پرستی پر رکھی گئی ہے۔ خدا پرست معاشرے کے لوگوں کو قدم قدم پر اِس بات کا خیال رکھنا ہوتا ہے کہ اُن سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہونے پائے جس سے اُن کی عاقبت خراب ہوجائے۔ اس کے برعکس مادّہ پرستوں کا نظریہ ہی یہ ہوتا ہے کہ حیاتِ مستعار میں شہواتِ نفس کی تسکین کا جتنا زیادہ سے زیادہ سامان فراہم ہوسکتا ہے' کیا جائے۔''

قرآنِ مجید کے احکام کی روشنی میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر عورتوں کے خبریں پڑھنے کا معاملہ بجائے خود محلِ نظر ہے لیکن اگر کسی حقیقی مجبوری کے تحت کسی عورت کو خبریں پڑھنا پڑ ہی جائے تو اُسے صاف اور سیدھے انداز میں پڑھنا چاہئے۔ مسکرانا اور لوچدار لب و لہجہ اختیار کرنا یا ایسا کرنے پر مجبور کرنا اللہ اور اُس کے رسول ﷺ پر ایمان رکھنے والے کسی شخص کے لئے جائز نہیں ہے۔ البتہ اگر مرد خبریں پڑھنے سے پہلے مسکرا دے تو اُس میں نہ صرف کوئی حرج نہیں ہے بلکہ یہ ایک مستحسن بات ہوگی۔ کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشادِ گرامی ہے:

''تمہارے اپنے (مسلمان) بھائی کے سامنے مسکرانا بھی صدقہ (نیکی) ہے۔''

''ٹیلی ویژن کے سلسلے میں جو سمعی کے ساتھ ساتھ بصری (Audio visual) بھی ہے' ایک سوال تصویر کا بھی سامنے آتا ہے۔ عام لوگوں میں یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ ٹیلی ویژن پر جو تصویر نظر آتی ہے وہ شرعاً جائز نہیں لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ ٹیلی ویژن اور پردۂ سیمیں پر نظر آنے والی تصویر فی الحقیقت تصویر نہیں' پرچھائیں ہے جو اُسی قسم کا

عکس ہوتی ہے جیسا کہ عکس ہمیں پانی اور آئینے میں نظر آتا ہے۔ آئینہ بھی ایک ایجاد ہے۔ ایسی ہی ایجاد ٹیلیویژن اور فلم بھی ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی عمارت میں اس غرض کے لئے ایسے زاوئے اور تکنیک سے آئینے نصب کرے کہ اس عمارت میں آنے والی پردہ دار خواتین کو نامحرم مَردوں کو دکھا کر اُن کی تفریحِ طبع کا سامان کرے تو یہ درحقیقت آئینے کی ایجاد کا ناجائز استعمال ہوگا جس سے خود آئینے میں کوئی خرابی لازم نہیں آئے گی۔ یہی حال ٹیلیویژن اور سینماٹوگراف کا ہے۔ اگر ان ایجادات کا بھی جائز اور بامقصد استعمال ہو تو یہ بہت مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔''

مولانا محمد شفیع مرحوم اپنے رسالے ''تصویر کے شرعی احکام'' کے صفحہ ۴۷ پر آئینہ اور پانی وغیرہ میں نظر آنے والے عکس اور فوٹو کے فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''لیکن یہ بات کچھ زیادہ غور و فکر کی محتاج نہیں کہ آئینہ اور پانی وغیرہ کے اندر آئے ہوئے عکس اور فوٹو سے حاصل کی ہوئی تصویر میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایک کو دوسرے پر قیاس کرنا محض ایک فریب ہے واقعہ یہ ہے کہ ظل اور سایہ قائم اور پائیدار نہیں ہوتا بلکہ صاحبِ ظل کے تابع ہوتا ہے۔ جب تک وہ آئینے کے مقابل کھڑا ہے، تو یہ ظل بھی کھڑا ہے۔ جب وہ یہاں سے الگ ہوا تو یہ ظل بھی غائب ہوگیا۔ فوٹو (یعنی کیمرے) کے آئینے پر جو کسی انسان کا عکس آیا، اُسے عکس اُسی وقت کہا جاتا ہے جب تک اُس کو رنگ و روغن اور مسالے کے ذریعے قائم اور پائیدار نہ بنا دیا جائے اور جس وقت اُس عکس کو قائم اور پائیدار بنا دیا، اُسی وقت یہ عکس تصویر بن گیا۔''

''اس سے معلوم ہوا کہ تصویر وہ ہوتی ہے جو قائم اور پائیدار ہو اور جو قائم اور پائیدار نہ ہو، وہ عکس ہوتا ہے۔ ٹیلی ویژن اور سینما کے پردے پر دکھائے جانے والے مناظر بھی قائم اور پائیدار نہ ہونے کی وجہ سے ظل اور عکس ہی ہوتے ہیں۔ اس لئے اُن پر بھی تصویر کا اطلاق نہیں ہوتا لہٰذا وہ حرام بھی نہیں ہیں۔ اب رہی یہ بات کہ اِس ظل یا عکس کا دکھانا بھی جائز ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح ابھی آئینے کے ناجائز استعمال کی مثال دے کر واضح کیا جا چکا ہے کہ ناجائز استعمال سے آئینہ حرام قرار نہیں پاتا بلکہ اُس کا ناجائز استعمال کرنے والا گنہگار ٹھہرتا ہے، اسی طرح ٹیلیویژن کے صحیح اور غلط استعمال کا بھی معاملہ ہے۔ اگر اُسے اسلامی احکام اور حدود کے اندر رہتے ہوئے خیر و صداقت کے فروغ اور شر اور منکرات کے انسداد کے لئے استعمال کیا جائے تو ایسا کرنا محمود اور پسندیدہ ہوگا اور اگر ٹیلیویژن کے استعمال کا مقصد اور انداز اس کے برعکس ہو تو ظاہر ہے کہ اُس پر اللہ کے ہاں گرفت یقینی ہے۔'' (''اسلامی صحافت''۔۔ سیّد عبید السلام زینی، صفحات ۲۴۳۔۲۴۵، ۲۴۷۔۲۴۹)

''آج کل ٹیلیویژن اور ریڈیو پر جو رنگارنگ پروگرام اور ڈرامے پیش کئے جا رہے ہیں، اسلامی نقطہ نظر میں وہ لَهْوَ الحدیث میں شامل ہیں جس کے بارے میں ارشادِ ربانی ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِىْ لَهْوَالْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا
اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ O (لقمٰن: ۶)

”اور لوگوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو کلامِ دلفریب خرید کر لاتا ہے تاکہ لوگوں کو اللہ کے راستے سے ازراہِ نادانی بھٹکا دے اور اس راستے کی دعوت کا مذاق اُڑا دے۔ ایسے لوگوں کے لئے سخت ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔“ (۳۱ : ۶)

(III) ریڈیائی صحافت : ریڈیائی صحافت کے بھی مقاصد و آداب وہی ہیں جو اخباری صحافت کے ہیں۔ دونوں میں اگر کوئی فرق ہے تو وہ تحریر و تقریر کے جداگانہ تقاضوں کا فرق ہے۔ بہ الفاظِ دیگر اخباری صحافت کے برعکس ریڈیو اور ٹیلیویژن کا پیرایہ تحریر کی بجائے تقریر و تکلم کا ہوتا ہے۔

پاکستان میں ریڈیائی صحافت کی عمر پچھتر سال کے لگ بھگ ہے۔ اس عرصے میں اُس نے نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دنوں میں ریڈیو پاکستان کے شعبہ خبر نے قوم کا حوصلہ بلند رکھنے میں جو اہم کردار ادا کیا وہ اب ہماری قومی تاریخ کا ایک تابناک باب ہے اور اس امر کا ثبوت ہے کہ اُس کے ذریعے شہادت اور سرفروشی کا بے مثال جذبہ پیدا کر کے قوم کو دشمن کے مقابلے میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنایا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کسی ملک میں انقلاب برپا ہوتا ہے تو سب سے پہلے ریڈیو سٹیشن پر قبضہ کیا جاتا ہے تاکہ ریڈیو جیسے مؤثر ذریعے کے ساتھ لوگوں کی رائے کو انقلاب کے حق میں ہموار کیا جا سکے اور مطلوبہ مقاصد حاصل کئے جا سکیں۔

(IV) ٹیلیویژن : آج کے دَور میں ٹیلیویژن انسانی معاشرے کی ناگزیر ضرورت بنتا جا رہا ہے۔ بچوں سے لے کر بڑوں تک اس کی زلف کے اسیر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

ٹیلیویژن نے جہاں لوگوں کی عمومی معلومات میں غیر معمولی اضافہ کیا ہے، وہاں اُن کی زندگیوں میں مغربی تہذیب و ثقافت کو بھی بہت زیادہ فروغ اور رواج دیا ہے جس کے نتیجہ میں غیر ترقی یافتہ ممالک کی معاشرتی زندگی میں شدید تضادات نے جنم لیا ہے اور ان تضادات نے عام لوگوں کی زندگیوں میں نفسیاتی الجھنوں اور پریشانیوں میں خطرناک حد تک اضافہ کر دیا ہے۔

نئی نسل اپنی تعلیم سے غافل ہو کر ٹی وی پروگراموں کی اِس قدر رَسیا ہو چکی ہے کہ تعلیم ثانوی حیثیت اختیار کرتی چلی جا رہی ہے۔ معیارِ تعلیم کا گراف تیزی سے گرتا چلا جا رہا ہے۔ اخلاقی اقدار اور روایات دم توڑتی جا رہی ہیں۔ مگر اس مایوس کن صورتِ حال کے باوجود یہ بات پیشِ نظر ہے کہ ٹیلی ویژن بذاتِ خود کوئی بُری ایجاد نہیں بلکہ اس کے ذریعے نئی نسل کے لئے تعلیم و تربیت کا کام لیا جا سکتا ہے اور اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ٹی وی دیگر ذرائع ابلاغ میں سب سے مؤثر ذریعہ ابلاغ ہے۔

(V) اشتہاریات : افراد کے تعارف، تصورات یا منصوبوں کی تشہیر، مصنوعات کو رُوشناس کرانے اور خدمات کے اشتہار کی ضرورت ہر دَور میں محسوس کی گئی ہے۔ پہلے یہ مقصد کو چہ و بازار میں ڈگی پیٹ کر عام

اعلان اور منادی کے ذریعے حاصل کیا جاتا تھا۔ چھاپے خانے اور قلم کی ایجاد اور اخبارات اور دوسرے ذرائع ابلاغ کی ترقی کے بعد یہ کام اشتہار بازی سے لیا جانے لگا جو رفتہ رفتہ باقاعدہ ایک فن بن گیا اور اشتہاریات کو ذرائع ابلاغ خصوصاً اخبارات، رسائل، ریڈیو اور ٹیلیویژن کی معیشت میں شہ رگ کا درجہ حاصل ہو گیا۔ اشتہاریات کے بغیر کسی اخبار کے چھپنے اور پنپنے کا کوئی تصور باقی نہ رہا۔

اشتہار بازی کا مقصد لوگوں کو ترغیب دلا کر مصنوعات کے خریدنے اور خدمات کے حصول پر آمادہ کرنا ہے۔ ایسی صورت میں اشتہار بازی کا عمل کسی فرد، گروہ یا چیز کی سفارش کی حیثیت رکھتا ہے اور سفارش کے لئے قرآن مجید کا دوٹوک فیصلہ ہے:

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا (اَلنِّسَآء : ۸۵)

''جو بھلائی کی سفارش کرے گا وہ اس میں سے حصہ پائے گا اور جو برائی کی سفارش کرے گا وہ اس میں سے حصہ پائے گا۔'' (۸۵ : ۴)

یہ درست ہے کہ اشتہار کی اشاعت کا اصل ذمہ دار اشتہار دینے والا ہوتا ہے لیکن اخبارات اور دوسرے ذرائع ابلاغ بھی چونکہ اُس کی اشاعت کا ذریعہ بنتے ہیں اور معاوضہ وصول کرتے ہیں، اس لئے وہ بھی اِس ذمہ داری میں شریک ہوتے ہیں۔ اُن کے تعاون کے بغیر اشتہار کی اشاعت ممکن نہیں ہے اور تعاون کے بارے میں قرآنی اصول یہ ہے:

تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (المائدة : ۲)

''جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں، اُن میں سب سے تعاون کرو اور جو گناہ اور زیادتی کے کام ہیں، اُن میں کسی سے تعاون نہ کرو۔'' (۲ : ۵)

اسلام نے اس بات کو پسند نہیں کیا ہے کہ مالِ تجارت کی مبالغہ آمیز تعریف کی جائے اور اُس میں وہ خوبیاں بیان کی جائیں جو اُس میں نہ ہوں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ جھوٹی قسمیں کھا کر اپنی تجارت بڑھانے والوں سے قیامت کے دن نہ کلام کرے گا، نہ اُن کی طرف رحمت کی نظر سے دیکھے گا اور نہ اُنہیں گناہوں سے پاک کرے گا۔''

اشتہاریات کا منفی پہلو : اشتہار بازی کا یہ فائدہ تو یقینی ہے کہ اس سے مصنوعات کی فروخت بڑھتی ہے مگر اس کے ساتھ ہی کچھ نقصانات بھی ہیں اور وہ یہ کہ فروخت بڑھنے سے مال سستا ہونا چاہئے جو نہیں ہوتا بلکہ اُلٹا اُس کی قیمت میں اشتہار بازی کے اخراجات بھی شامل ہو جاتے ہیں اور صارفین کو کمتر درجے کی اشیاء کی زیادہ قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔

''اشتہارات کے عوام کی خریداری کی عادتوں پر اثر انداز ہونے کی وجہ سے اُن میں نت نئی مصنوعات کے حصول کی خواہش اور گھر میں پہلے سے موجود اشیاء سے بددلی پیدا ہوتی ہے جو فضول خرچی کی محرک بنتی ہے اور جب قوّتِ خرید ساتھ نہیں دیتی تو آدمی میں مایوسی اور دوسری نفسیاتی خرابیاں پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ناجائز ذرائع سے دولت کمانے کا غیر صحتمند رُجحان بھی پیدا ہوتا ہے۔''

''بعض اشتہارات میں صارفین کو مصنوعات کی خریداری پر انعام کا لالچ بھی دیا جاتا ہے۔ یہ دراصل ایسی رشوت ہے جو چیز کی قیمت میں شامل کر کے خود خریدار سے وصول کی جاتی ہے اور اگر اُسے رشوت کی بجائے انعام بھی مان لیا جائے تو یہ ایسا انعام ہے جو اِس بات پر دیا جاتا ہے کہ تم نے اس ناچیز کو خریدنے کا کارنامہ انجام دیا ہے جسے اور کوئی خریدنا پسند نہیں کرتا۔''

''بعض اوقات مصنوعات کی پیکنگ تبدیل کر کے یہ اشتہار دیا جاتا ہے کہ اس میں اور بہت سی خوبیوں کا اضافہ کیا گیا ہے جس کے مقابلے میں بہت کم قیمت بڑھائی گئی ہے۔ حالانکہ اصل چیز میں پیکنگ کے سوا کوئی تبدیلی نہیں کی گئی ہوتی۔ اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ خالص سونا بیچنے والوں کو اپنے مال کی فروخت بڑھانے کے لئے کبھی اشتہار دینے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔'' (''اسلامی صحافت''۔۔سیّد عبید السلام زینی' صفحات ۲۵۷'۲۶۵)
کیونکہ
''نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی''

(VI) ''فلم: موجودہ دَور کے ذرائع اِبلاغ میں فلم بھی ایک مؤثر ذریعہ اِبلاغ ہے اور اس ذریعہ اِبلاغ نے اپنی وسعت اور اثر انگیزی کے نتیجہ میں انسانی معاشرے پر وسیع اثرات مرتب کئے ہیں۔ فلم کے ذریعے انسانی معاشرے کے اخلاق و کردار کو سنوارا بھی جا سکتا ہے اور سنوارنے کے مقابلے میں بگاڑنا اس سے کہیں سہل اور آسان کام ہے۔''

''فلم کی بالادستی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جن اقدار و روایات کو عوام کے اندر رواج دینا ہوں' ان کے متعلق ایک تسلسل کے ساتھ فلموں کے اندر ایسے کردار داخل کر دئے جاتے ہیں جو غیر محسوس طور پر ذہنوں کو مسخر کرتے چلے جاتے ہیں۔''

''ٹیلیویژن کی ایجاد سے قبل یہ دیگر ذرائع اِبلاغ میں سب سے مؤثر ذریعہ اِبلاغ تھا مگر ٹیلیویژن کی ایجاد اور گھر گھر میں اس کی موجودگی نے فلم کی اثر انگیزی میں بڑی حد تک کمی کر دی ہے۔ فلم' جسے محض ناچ گانوں' بے ہنگم اچھل کود اور بے تکی بڑکوں کا رنگ دے دیا گیا ہے' اگر اُسے اصلاحِ معاشرہ کے لئے استعمال کیا جائے اور صاف ستھری اصلاحی فلمیں بنائی جائیں تو آج ٹیلی ویژن اور وی سی آر کے دَور میں بھی فلمی صنعت از سرِ نو عوام میں مقبولیت حاصل کر سکتی ہے۔ فلمیں ثقافتی یلغار میں نمایاں کردار ادا کرنے والا ذریعہ ابلاغ ہے۔ کسی ملک کے خلاف ثقافتی یلغار کے لئے فلم بہترین اور مؤثر ذریعہ ہے۔''

(VII) ''وی' سی' آر: دورِ حاضر کی نئی ایجاد' وڈیو کیسٹ ریکارڈز نے دنیائے ابلاغیات میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔ ٹیلیویژن اور فلم سے کہیں زیادہ موثر ذریعہ ابلاغ آج پوری دنیا میں وبائی شکل میں پھیل چکا ہے۔ اس کے انتہائی سرعت کے ساتھ پھیلتے ہوئے اثرات نے دنیا بھر کی اقوام کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ وی' سی' آر ایک چلتا پھرتا سینما ہے۔ کسی بھی چھوٹے یا بڑے کمرے میں ٹی وی سیٹ کے ذریعے دنیا جہاں کی اچھی یا بری فلم چلا کر دیکھی جا سکتی ہے۔''

''کسی دور میں ٹیپ ریکارڈ کو قبولِ عام حاصل تھا۔ گلی گلی اور محلے محلے ٹیپ ریکارڈ کی تیز اور سماعت پر گراں گزرنے والی آوازیں سنائی دیا کرتی تھیں۔ ابھی ٹیپ ریکارڈ اپنے عروج پر تھا کہ وی' سی' آر نے آ کر اُس کی اہمیت کو بڑی حد تک کم کر دیا ہے۔ ٹیپ ریکارڈ سے صرف سننے کا کام لیا جا سکتا ہے جبکہ وی' سی' آر کے ذریعے تصویر اور آواز کو ایک وقت میں دیکھا اور سنا جا سکتا ہے جس کے نتیجہ میں اس کی افادیت و اہمیت ٹیپ ریکارڈ سے کہیں زیادہ ہے۔''

''وی' سی' آر درحقیقت تعلیم و تربیت اور انسانی اخلاق و کردار کی تعمیر کا بہترین ذریعہ بن سکتا ہے۔ لیکن اب وہ فحش اور عریاں فلموں کے ذریعے انسانی اخلاق و کردار کو تباہ کرنے میں مصروف ہے۔ آج کے دور میں بلکہ ہر دور میں نیکی کے مقابلے میں برائی کے ہمنوا اور اُسے فروغ دینے والے ہمیشہ زیادہ رہے ہیں۔ اس لئے ہر نئی ایجاد ہونے والی چیز کو بھلائی کے مقابلے میں برائی کا آلہ کار بنا لیا جاتا ہے۔ یہی حال وی' سی' آر کا بھی ہمارے سامنے ہے۔''
(''اسلام کا قانونِ صحافت'' ۔۔ ڈاکٹر لیاقت علی خان نیازی' صفحات ۱۴۳' ۱۴۴)

(VIII) ''تصویری صحافت: فنِ صحافت کے اساتذہ نے تصویری صحافت کے جو فوائد بیان کئے ہیں اُن کا خلاصہ یہ ہے:

''تصویر سے خبر کا اہم حصہ فوراً بے نقاب ہو جاتا ہے اور ذہن پر اُس کا صحیح نقش واضح ہو جاتا ہے۔ واقعات تسلسل کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ تفریح کا سامان فراہم ہوتا ہے اور اخبار کے حسن میں اضافہ ہو جاتا ہے۔''

''پاکستان میں کراچی' لاہور' راولپنڈی' اسلام آباد' کوئٹہ اور پشاور سے کئی انگریزی اخبارات نکلتے ہیں' اُن میں بہت کم بلکہ برائے نام تصویریں چھپتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں ہمارے اردو اخبارات کو زیادہ سے زیادہ رنگین بنانے اور ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تصویریں چھاپنے کی دوڑ جاری ہے۔''

''جب فلمی اداکاراؤں اور رقاصاؤں کی تصویروں کی اشاعت پر پابندی لگی تو کالجوں میں فیشن شو اور دوسری ثقافتی تقریبات کے نام پر مغرب زدہ گھرانوں کی خواتین اور طالبات کی تصویریں اس انداز میں شائع کی جانے لگیں جنہیں دیکھ کر طوائفوں کی آنکھیں بھی شرم سے جھک جائیں۔ خوبصورت جوڑوں کی تصاویر اور اُن کے کئی کئی پوز میاں بیوی کے نام پر شائع ہوتے ہیں۔ کبھی انٹرویو کا اور کبھی سماجی خدمات کا سہارا لے کر خوبصورت خواتین کو منظر عام پر لایا جاتا ہے۔ کبھی اخبارات سب سے زیادہ توجہ اس بات پر دیتے تھے کہ وہ تازہ سے تازہ خبر ڈھونڈ کر شائع کریں۔ لیکن اب ساری کارکردگی اِس بات پر مرتکز ہو کر رہ گئی ہے کہ کہاں سے خوبصورت لڑکوں اور لڑکیوں

کی کوئی ایسی تصویر لا کر شائع کریں جسے دیکھ کر نوجوان تو کیا' بوڑھے مرد اور عورتیں بھی دل تھام کر رہ جائیں۔''

''تصویروں کی یہ بے تحاشا اشاعت ایک ایسی شرمناک عیاشی ہے جس کا نہ کوئی فنی جواز ہے اور نہ اَخلاقی۔ فنِ صحافت اس بے راہروی اور اخلاق باختگی کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ آج جو اخبارات اس دوڑ میں شریک ہیں' اُن کا مقصد اور محرّک یقینی طور پر کوئی غیر پیشہ ورانہ خواہش اور جذبہ ہے۔''

''جو اخبارات قوم کی اعلیٰ اخلاقی قدروں کے خلاف جنگ کر رہے ہیں اور اُس کی بیٹیوں کو بے راہ کر دینے کا مشن لے کر نکلے ہیں' اُن کے بارے میں کچھ کہنا لا حاصل ہے۔ شکایت تو اُن اخبارات کی روش سے ہے جن کی کچھ اخلاقی روایات ہیں' جن کے سامنے کچھ اعلیٰ مقاصد ہیں اور جو جابر سلطان کے سامنے کلمہِ حق کہنے کی شہرت رکھتے ہیں' وہ بھی اشاعت بڑھانے یا برقرار رکھنے کے لئے تصویریں چھاپنے کی اِس افسوسناک دَوڑ میں شریک ہو گئے ہیں۔''

''حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا کوئی بھی صحت مند معاشرہ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ اُس کے اخبارات میں ایسی تصویریں چھپیں جن سے عام آدمی کے جذبات بھڑکیں اور طبائع جنسی بے راہروی کی طرف مائل ہوں۔ فحاشی پھیلانے میں فحش تصویریں' فحش تحریروں سے ہزار گنا زیادہ مضر کردار ادا کرتی ہیں۔ تصویر کے یہی وہ مفاسد ہیں جن کے پیشِ نظر خالقِ کائنات نے مصوّری اور مجسمہ سازی کو ممنوع قرار دیا ہے۔''

''تفریح اور اخبار کی تزئین کے لئے قدرتی مناظر' خوبصورت عمارات اور ہر قسم کی بے جان اشیاء کی تصویروں سے کام لیا جا سکتا ہے بشرطیکہ آدمی کے دل میں اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا جذبہ ہو اور وہ یہ چاہے کہ میں کوئی ایسا کام نہ کروں جس کی بناء پر قیامت کے دن میری گرفت ہو۔''

''یہاں یہ بات بھی واضح ہو جانی چاہئے کہ جس اصول کے تحت کسی حقیقی ضرورت (مثلاً پاسپورٹ' قومی شناختی کارڈ اور امتحان میں شمولیت کے لئے طالب علم کی تصویر وغیرہ) کے لئے تصویر کا استعمال جائز قرار دیا گیا ہے' اُس سے تصویر کشی کو مستثنیٰ نہیں رکھا جا سکتا۔ عدل و عقل کا تقاضا ہے کہ حقیقی تمدنی اور انسانی ضرورت کی حد تک تصویر کشی کو بھی جائز تسلیم کیا جائے۔''

(IX) ''کارٹون: تصاویر کی طرح کارٹون بھی ابلاغ کا نہایت اہم پیرایہ ہیں۔ بعض اوقات جو بات پورا ایک فکاہی کالم لکھ کر بھی ادا نہیں ہوتی' وہ کارٹون کے ذریعے محض ایک اشارے سے واضح ہو کر اپنا اثر دکھا جاتی ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے کارٹون کی اشاعت میں قباحت کے دو پہلو ایسے ہیں جن کا اگر خیال رکھا جائے تو اس پیرایہِ اظہار سے بھی مفید کام لیا جا سکتا ہے۔''

''کارٹون کی اشاعت میں قباحت کا ایک پہلو یہ ہے کہ کارٹون سے مذمت کا کوئی ایسا پہلو نکلتا ہو جس سے افراد یا اُن کی جماعت کی تضحیک اور دلآزاری ہوتی ہو۔ اس بارے میں قرآن وسنت کے اُن تمام احکامات اور ہدایات کو پیش نظر رکھنا ہوگا جن کا ذکر قبل ازیں ہو چکا ہے۔''

''اسلامی نقطہ نظر سے اگر چہ تمام مسلمانوں کے حقوق یکساں ہیں لیکن اس کے باوجود بعض شخصیات زیادہ احترام کی مستحق ہوتی ہیں۔ اس امتیاز کا باعث کبھی اُن کا تقویٰ اور کریمانہ اخلاق ہوتے ہیں' کبھی اُن کا علم وفضل ہوتا ہے اور کبھی اُن کا وہ منصب ہوتا ہے جو اُنہیں کسی ملک کے عوام کی اکثریت کی تائید وحمایت سے حاصل ہوتا ہے۔ اساتذہ صحافت نے اِسی خیال سے سربراہِ مملکت' دینی اور روحانی شخصیات کو کارٹون کا موضوع بنانے سے منع کیا ہے جو اچھی بات ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر کوئی شخصیت اپنے کردار وعمل سے یہ ثابت کردے کہ وہ اپنی ذات سے اس استثناء اور تحفظ کی مستحق نہیں ہے تو اُسے بھی کارٹون کا موضوع بنایا جاسکتا ہے۔ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرنے والے کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں سے اپنی فرمانبرداری کی امید رکھے۔''

''کارٹون شائع کرنے میں قباحت کا دوسرا پہلو خود ذی روح کے کارٹون بنانا ہے۔ شریعت نے تصویر سازی کو حرام قرار دیا ہے☆ اور کارٹون بھی تصویر سے ملتی جلتی چیز ہے۔''

''اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ کارٹون میں ذی روح کے خاکوں سے پرہیز کیا جائے اور بات کو ایسے انداز میں پیش کیا جائے کہ کسی ذی روح کا نقش ابھارنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ ایسے کارٹونوں کی ایک بہتر اور اچھی مثال وہ کارٹون تھا جو ''نوائے وقت'' نے ساڑھے آٹھ سال پرانا مارشل لاء اُٹھائے جانے کے موقع پر صدر جنرل محمد ضیاء الحق کے اِس اعلان کے حوالے سے کیا تھا کہ ''مارشل لاء کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا گیا ہے۔'' اس کارٹون میں ایک قبر بنا کر اُس پر یہ کتبہ لکھا ہوا دکھایا گیا تھا کہ ''مارشل لاء کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا گیا۔'' اسلامی نقطہ نظر سے یہ ایک معیاری کارٹون تھا۔''

''دوسری بات یہ ہے کہ کارٹون میں کسی ذی روح کا دکھایا جانا اگر ناگزیر ہو تو اُس کا خاکہ اِس طرح بنایا جائے کہ اُس پر تصویر کا اِطلاق نہ ہو سکے۔ شریعت نے لڑکیوں کے لئے گڑیاں بنانے کی جو اجازت دی ہے' وہ اس شرط کے ساتھ دی ہے کہ بت یا مورتی کی طرح تمام وکمال انسانی اعضاء کے ساتھ گڑیا نہ بنائی جائے۔ کارٹون سازی میں بھی اس اصول واحتیاط کو ملحوظ رکھا جانا چاہیے۔ کارٹون کے لئے یوں بھی یہ ضروری نہیں کہ وہ متعلقہ شخصیت کا ہو بہو نقش ہو بلکہ اس میں اُس شخصیت کی صرف اتنی مشابہت کا آجانا ہی بہت کافی ہے کہ دیکھنے والوں کا ذہن متعلقہ شخص کی طرف منتقل ہو جائے۔ ایسی ''ناقص تصویر'' یا خاکہ اگر کسی برائی پر گرفت یا اُس کی مضحکہ خیزی واضح کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہو تو اس اعلیٰ مقصد کے حصول کے لئے اُسے ناجائز قرار نہیں دینا چاہیے۔'' (''اسلامی صحافت'' ۔۔۔۔۔ سیّد عبد السلام زینی' صفحات ۲۳۳ تا ۲۳۵)

☆ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہوں انسائیکلوپیڈیا ہٰذا کی جلد چہارم کے صفحات ۱۹۰۱ تا ۱۹۰۷۔

(X) ''وقائع نگاری (Reporting) کے آداب: صحافت میں وقائع نگاری کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔خبروں کی فراہمی کے اخبارات ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے شعبہ ہائے خبر میں کئی کئی وقائع نگار اور علاقائی نامہ نگار مقرر ہوتے ہیں جو مختلف ذرائع سے خبریں اکٹھی کر کے اپنے اپنے اداروں کو مہیا کرتے ہیں۔خبر رساں ایجنسیاں جو خبریں مہیا کرتی ہیں وہ بھی نامہ نگاروں ہی کی جمع کی ہوئی ہوتی ہیں۔''

''وقائع نگاری کے جہاں کچھ تکنیکی اصول ہیں وہاں کچھ اخلاقی ضابطے بھی ہیں۔نامہ نگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ حالات و واقعات اور مسائل و معاملات کی سوجھ بوجھ کے علاوہ خوش اخلاق' نیک نام' خدا ترس' خیر خواہ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ صادق اور امانتدار ہو۔راز کو راز رکھنا جانتا ہو تا کہ باخبر حلقے اور ذرائع اپنا نام ظاہر ہو جانے کے اندیشے کے بغیر اُسے بے تکلف رازہائے دُرون پردہ سے آگاہ کر سکیں۔''

''فنی اعتبار سے وقائع نگار میں خبر کی پہچان کے علاوہ موزوں سوال کرنے کی اہلیت کا ہونا بھی ضروری ہے۔کوئی خبر یا اطلاع کسی سے سوال کر کے ہی معلوم کی جا سکتی ہے۔مختلف شعبوں سے متعلق لوگوں کے پاس اپنے اپنے شعبے کے بارے میں بے شمار معلومات ہوتی ہیں۔وقائع نگار کا کام یہ ہے کہ وہ پہلے یہ دیکھے کہ کونسی ایسی بات ہے جس سے عوام کو دلچسپی ہو سکتی ہے یا جسے لوگ جاننا پسند کریں گے۔پھر وہ متعلقہ لوگوں سے سوال کر کے اُس کے بارے میں مفید معلومات حاصل کرے۔اصولِ حدیث میں یہ اِس طرح بیان ہوا ہے:

''علم خزانے ہیں اور اُن کی کُنجی سوال ہے۔''

''وقائع نگار چونکہ خبر کی فراہمی میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے' اس لئے اُس کو خبر کی صحت کا خصوصیت کے ساتھ خیال رکھنا چاہئے بصورتِ دیگر جو کیفیت پیدا ہو گی' وہ اِس شعر سے مختلف نہ ہو گی۔

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج   تا ثریا می رَوَد دیوار کج

''وقائع نگار کو چاہئے کہ جب اُس پر یہ بات واضح ہو جائے کہ اُس تک پہنچنے یا پہنچائی جانے والی اطلاع دروغ پر مبنی ہے تو پھر خواہ وہ کیسی ہی دلچسپ اور سنسنی خیز کیوں نہ ہو' اُسے آگے نہ بڑھائے اور جو بھی جھوٹی یا لغو بات علم میں آئے' اُسے نظر انداز کر دے۔''

''امانت پسندی اور دیانت داری کا تقاضا یہ ہے کہ کسی شخص یا رہنما کے بیان میں اس طرح کتر بیونت یا ترمیم و تحریف نہ کی جائے جس سے بیان یا عبارت کا مطلب ہی بدل کر رہ جائے یا اُس کی تقریر اور خطاب کے سیاق و سباق کو نظر انداز کر کے کوئی ایک فقرہ لے لیا جائے جس سے ایسا مطلب نکلتا ہو جو مقرر کا منشا نہ ہو۔''

''وقائع نگار یا اخباری نمائندے کا کام یہ ہے کہ وہ اطلاع یا پیغام کو کسی رنگ آمیزی کے بغیر معروضی انداز میں پیش کرے اور اُس میں اپنی طرف سے کوئی تبصرہ یا حاشیہ آرائی نہ کرے کیونکہ اُس پر صاف صاف پیغام

پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔''

''معروضی وقائع نگاری (Objective Reporting) کا مطلب محض اِتنا ہی نہیں کہ بات کو جوں کا توں بیان کر دیا جائے بلکہ یہ بھی ہے کہ ایسا کرتے ہوئے پورے احساسِ ذمہ داری سے کام لیا جائے۔ خبر کی صحت کے سلسلے میں وقائع نگار کی ذمہ داری دوچند ہے۔ وہ اپنے اخبار کو جو خبر مہیا کرتا ہے' اخبار عموماً اُسے مصدّقہ خیال کرتا ہے۔ اُس کے ذرا سے تساہل اور غفلت سے غلط خبر کی اشاعت خود اُسی کے لئے نہیں' اخبار کے لئے بھی شرمندگی کا باعث بن سکتی ہے اور اُس کی ساکھ اور نیک نامی کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔''

''وقائع نگار کو اپنے پیشہ ورانہ فرائض انجام دیتے ہوئے اس بات کو بھی اصول کے طور پر پیشِ نظر رکھنا چاہئے کہ خبر میں منکرات اور معصیت کی باتوں کا ذکر اس طرح نہ آئے جس سے لوگوں کو برائی کی ترغیب ہو یا وہ کسی برے فعل کے مرتکب شخص کو ہیرو سمجھ بیٹھیں۔ ہمارے اخبارات میں اکثر اس قسم کی خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں کہ غیرتمند شوہر یا بھائی یا باپ نے اپنی بیوی' بہن یا بیٹی کو کسی کے ساتھ قابلِ اعتراض حالت میں دیکھ کر قتل کر ڈالا حالانکہ ازروئے اسلام کسی کا یہ فعل کسی حالت میں بھی قابلِ تعریف نہیں ہوسکتا۔''

یہاں چند باتیں قابلِ توجہ ہیں: (۱) شرک کے بعد قتلِ ناحق سب سے بڑا گناہ ہے جسے اللہ تعالیٰ معاف نہیں کرے گا۔ (۲) قانون کو ہاتھ میں لینا بجائے خود جرم ہے۔ (۳) ''قابلِ اعتراض حالت'' سے مراد واقعی زنا کرتے ہوئے دیکھ لینا ہو جب بھی شرع کہتی ہے کہ کسی پر زنا کا الزام لگانے کے لئے محض دیکھ لینا کافی نہیں۔ چار گواہوں کے بغیر جو شخص الزام لگائے گا وہ خود حدِّ قذف کا مجرم ٹھہرے گا اور اَسّی کوڑوں کی سزا کا مستحق ہوگا۔ (۴) غصّے میں بے قابو ہو جانا کوئی اچھی صفت نہیں ہے۔ اسلام نے اسی لئے غصہ کرنے سے روکا ہے کہ غصّے میں آکر آدمی ایسی حرکت کر جاتا ہے جس پر بعد میں اُسے پشیمان ہونا پڑتا ہے۔ (۵) اللہ اور اُس کے رسول ﷺ نے لوگوں کے عیبوں پر پردہ ڈالنے کا حکم دیا ہے اور یہاں تک فرمایا ہے کہ جو آدمی کسی کے عیب کی پردہ پوشی کرے گا' اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اُسے رُسوائی سے بچائے گا۔''

''مختصر یہ کہ جس شخص نے اپنی بیوی' بہن یا بیٹی کو بدچلنی کے شبہ میں قتل کیا' اُس نے ہرگز کوئی اچھا کام نہیں کیا کہ اُسے غیرتمند کا سرٹیفیکیٹ جاری کیا جائے۔''

''حقیقت یہ ہے کہ ان شرعی احکام کی روشنی میں ایک مسلم وقائع نگار کے لئے اپنے فرائض کی ادائیگی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اُسے اپنے قلم کو استعمال کرتے ہوئے بہت احتیاط سے کام لینا ہوتا ہے اور ایک ایک لفظ اس بات کو ذہن میں رکھ کر لکھنا ہوتا ہے کہ قیامت کے دن مجھے اپنے قلم سے نکلی ہوئی ایک ایک بات کا حساب دینا ہوگا۔''

(XI) ''ادار یہ نگاری کے آداب : اخبار میں خبر کے بعد اُس کا سب سے اہم جزو اداریہ ہوتا ہے جس سے اُس کی انفرادیت قائم ہوتی ہے اور جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اخبار کا اپنا عقیدہ اور نظریہ حیات اور مسائل کے بارے میں طرزِ فکر کیا ہے۔

''صحافت کا اصول یہ ہے کہ اخبار میں خبروں کو معروضی انداز میں پیش کیا جائے۔ اُن میں اپنی رائے اور خیالات کو شامل کرنے سے پرہیز کیا جائے اور جس خبر یا واقعے کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کرنا مقصود ہو' اداریے میں ظاہر کی جائے۔ خبروں سے قارئین کو گرد و پیش کے حالات کا علم ہوتا ہے لیکن پھر بھی بہت سی اطلاعات' مسائل اور واقعات ایسے ہوتے ہیں جنہیں سمجھنے یا جن کے بارے میں رائے قائم کرنے میں عام قارئین کو دشواری پیش آتی ہے مگر جب اداریہ نگار اُن کی تشریح کر کے اپنی جچی تلی رائے کا اظہار کرتا ہے تو اس سے قارئین کی رہنمائی ہوتی ہے اور حالات و واقعات کے بارے میں رائے قائم کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اس طرح صحافت کا ایک بنیادی مقصد جسے ''رائے عامہ کی تشکیل'' کہتے ہیں' پورا ہو جاتا ہے۔''

''غور سے اگر دیکھا جائے تو اداریہ نگاری کا ایک ہی مقصد ہے اور وہ ہے ''رائے عامہ کی رہنمائی اور تربیت''۔ اداریہ نگار کو حالات و واقعات اور مسائل پر ملک کے لوگوں کی اس طرح رہنمائی کرنی چاہئے کہ جن لوگوں کو اُس کے اخذ کردہ نتائج سے اختلاف ہو وہ بھی اُس کی انصاف پسندی اور خلوصِ نیت پر اعتراض نہ کر سکیں۔ جب اداریہ نگار کسی خبر یا واقعے کی تشریح یا وضاحت کرتا ہے یا کسی خیال اور نظریے سے اختلافِ رائے رکھتا ہے یا کسی کارروائی کی حمایت اور مخالفت کرتا ہے تو اُس کے پیشِ نظر اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ نیک اور تعمیری مقاصد کے فروغ اور حصول کے حق میں اور برائی اور غیر صحت مند باتوں کے خلاف رائے عامہ کو ہم نوا بنائے اور یہی وہ عمل ہے جسے قرآن کی زبان میں ''امر بالمعروف و نہی عن المنکر'' کہا گیا ہے۔

''خدا پرست' موحد اور پابندِ اسلام رائے عامہ کی تشکیل کے لئے صحافت کا وہ معیار و انداز کسی طور مفید نہیں ہو سکتا جو سیکولر' مُلحد' اشتراکی اور خدا بیزار رائے عامہ کی تشکیل و تنظیم کے لئے موزوں خیال کیا گیا ہو۔ اِس نقطہ نظر سے اسلامی صحافت کے تحت اداریہ نگاری کے بھی وہی اخلاقی اصول ہیں جو قرآن و سنت میں معاشرے کی اصلاح و فلاح کے لئے بیان ہوئے ہیں۔''

''رائے عامہ کی تشکیل اور راہنمائی کے لئے ضروری ہے کہ اداریہ نگار میں کسی اطمینان بخش یا خوفناک خبر کا تجزیہ کر کے اُس سے صحیح نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت بلکہ ملکہ موجود ہو کیونکہ اُس کے بغیر کسی معاملے میں رہنمائی کا فریضہ انجام دینا ممکن نہیں ہے۔''

''تحریر و تقریر کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کی احادیث میں بھی ایسی بہت سی ہدایات ملتی ہیں جنہیں صرف اداریہ نگار ہی کو نہیں بلکہ ہر لکھنے والے کے ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہئے تا کہ اُس کا قلم خیر کا ترجمان اور

معاشرے کی صلاح وفلاح کا ذریعہ بنے۔اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل احادیثِ نبوی ملاحظہ ہوں:

(۱) ''جس نے کسی صاحبِ اقتدار کو راضی کرنے کے لئے وہ بات کہی جو اُس کے رب کو ناراض کردے' وہ اللہ کے دین سے نکل گیا۔''

(۲) ''سب سے افضل جہاد ظالم حکمران کے سامنے انصاف اور حق کی بات کہنا ہے۔'' (ابوداؤد)

(۳) ''اگر تمہارے ذریعے ایک ہی شخص نے ہدایت پالی تو یہ تمہارے لئے دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔''

(۴) ''جو شخص کسی ظالم کا ساتھ دے کر اُس کو قوت پہنچائے گا درآنحالیکہ وہ جانتا ہے کہ وہ ظالم ہے تو وہ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔''

(۵) ''جب فاسق کی تعریف کی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ غصے میں آجاتا ہے اور اُس کی وجہ سے عرش ہلنے لگتا ہے۔'' (مشکوٰۃ)

(۶) ''آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نہ تو بے حیائی کی بات منہ سے نکالتے اور نہ بے حیائی کا کام کرتے اور نہ دوسروں کو برا بھلا کہتے۔''

(۷) ''وہ شخص ہم میں سے نہیں جو عصبیت کی دعوت دے اور عصبیت کی بنیاد پر جنگ کرے۔''

(۸) ''عصبیت یہ ہے کہ آدمی ظلم کے معاملے میں اپنی قوم کا ساتھ دے۔''

(۹) ''جب غصہ آجائے تو خاموش ہو جایا کرو۔''

(۱۰) ''سچی بات کہو اگرچہ کڑوی ہو۔''

(۱۱) ''غیبت زنا سے سخت تر گناہ ہے۔'' (مشکوٰۃ)

(۱۲) ''بہترین عالم وہ ہے جو لوگوں کو اپنی تقریر سے اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں کرتا اور نہ اللہ کی نافرمانی کے لئے اُنہیں رخصتیں دیتا ہے اور نہ اللہ کے عذاب سے اُنہیں بے خوف بناتا ہے۔''

(۱۳) ''سب سے بڑی خیانت یہ ہے کہ تم اپنے بھائی سے کوئی بات کہو اور وہ تمہاری بات کو سچ سمجھے حالانکہ تم نے جو بات کہی وہ جھوٹی تھی۔'' (ابوداؤد)

(۱۴) ''مسلمان کو گالی دینا گناہ کی بات ہے اور اُس سے جنگ کرنا کفر ہے۔'' (بخاری' کتاب الایمان)

(۱۵) ''ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کی جان' مال اور عزت حرام ہے۔'' (صحیح مسلم' ترمذی)

(۱۶) ''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے' وہ نہ اُس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اُس کی مدد سے باز رہتا ہے۔ جو شخص اپنے بھائی کی حاجت کو پورا کرنے میں لگ جائے گا' اللہ تعالیٰ اُس کی حاجت براری کرے گا اور جو شخص کسی مسلمان کو کسی مصیبت سے نکالے گا تو اللہ تعالیٰ اُسے روزِ قیامت کی مصیبتوں میں سے نکال دے گا اور جو شخص کسی مسلمان کی عیب پوشی کرے گا' اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اُس کی عیب پوشی کرے گا۔'' (صحیح بخاری: کتاب الایمان)

ماخوذ از: (''اسلامی صحافت''۔۔سید عبید السلام زینی' صفحات ۱۶۳' ۱۶۴' ۱۶۶' ۱۷۸' ۱۷۹)۔

(۱۰۸) عدلیہ (Judiciary)

عربی زبان میں عدل و انصاف کے لئے ''قضاء'' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جس کے کئی معنی ہیں۔ لیکن جھگڑنے والے فریقین کے درمیان فیصلہ کرنے کے لئے اس لفظ کا استعمال جانا پہچانا ہے۔ جیسا کہ ابن القیم الجوزیہ نے اِسے بیان کیا ہے :

قَضٰی بَیۡنَ الۡخَصۡمَیۡنِ وَعَلَیۡهَا أَیۡ حَکَمَ بَیۡنَهُمَا وَعَلَیۡهَا (اَلطُّرُقُ الۡحُکۡمِیَّة صفحه ۱۷)

اور David Robertson نے ''ڈکشنری آف پولیٹکس'' میں عدلیہ کی تعریف یوں بیان کی ہے :

''یہ آئینی نظام کے تحت منصفین کی ایک جماعت ہوتی ہے۔ عدلیہ کے اختیارات اور اُس کا کردار مختلف ممالک میں مختلف ہوتا ہے۔'' (صفحہ ۱۶۹)

''قضاء (عدل و انصاف) کی شرعی حیثیت: اللہ ربّ العزت نے اپنے آخری نبی ﷺ کو لوگوں کے درمیان وحیِ الٰہی کے مطابق فیصلہ کرنے کا حکم فرمایا :

فَاحۡکُمۡ بَیۡنَهُمۡ بِمَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَ هُمۡ عَمَّا جَآءَ كَ مِنَ الۡحَقِّ (المائدة : ۴۸)

''(اے نبی!) آپ اُن لوگوں کے درمیان اللہ کے اتارے ہوئے (احکام) کے مطابق فیصلہ کیا کیجئے اور اُن لوگوں کی خواہشوں پر عمل نہ کیجئے اُس سچائی سے الگ ہو کر جو آپ کے پاس آچکی ہے۔'' (۵:۴۸)

اور آپ ﷺ کی اُمت کو اللہ کی خاطر عدل و انصاف کے قائم کرنے اور سچی گواہی دینے کا حکم دیا گیا:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُوۡنُوۡا قَوّٰمِیۡنَ بِالۡقِسۡطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ (النِّساء: ۱۳۵)

''مومنو! انصاف پر خوب قائم رہنے والے اور اللہ کے لئے گواہی دینے والے رہو۔'' (۴:۱۳۵)

اسی طرح داؤد علیہ السلام کو لوگوں کے درمیان عدل و انصاف سے فیصلہ کرنے کا حکم ہوا (صٓ:۲۶)

یہ قرآنی آیات اس بات کے اظہار کے لئے کافی ہیں کہ مسلمان معاشرے کو متوازن اور خوش آئند طریقے سے چلانے کے لئے عدل و انصاف کا قیام بہت ضروری ہے اور ظاہر ہے کہ اس عظیم فرض کا حصول شعبہ قضاء کے تقرر کے بغیر ممکن نہیں۔ پس اس مقصد کی تکمیل کے لئے عدلیہ کا قیام اور ججوں / مجسٹریٹوں کا تقرر نا قابلِ فرار ضرورت ہے۔

عدل و انصاف قانون کی بنیاد ہے : بنی نوع انسان کے درمیان عدل و مساوات کا قیام رسالت کا مقصدِ عظیم رہا ہے جس کے بغیر قانون بے اثر، ناقص، غیر معتبر اور بے جان جسم کی طرح ہو جاتا ہے۔ سورۃ الشّوریٰ میں نبی اکرم ﷺ کو یہ اعلان کرنے کا حکم دیا گیا کہ مجھے تمہارے درمیان عدل و انصاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے :

وَاُمِرۡتُ لِاَعۡدِلَ بَیۡنَکُمۡ (اَلشُّوریٰ : ۱۵)

''عدل وانصاف کا معیار: اسلام میں عدل وانصاف توازن کا شناختی نشان اور اُس کی علامت ہے جو تمام معاملات میں کامل عمدگی کا قائم مقام ہے۔ قرآنِ حکیم کی راہ نمائی کے تحت ہمیں عدل وانصاف کا معیار معلوم ہوتا ہے جس میں فرمایا گیا :

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ O (اَلرَّحْمٰن : ۷)

''اور اُسی نے آسمان کو اونچا کیا اور اُسی نے ترازو وضع کردی۔'' (۷ : ۵۵)

جس کا صاف اور واضح مطلب یہی ہے کہ اجرامِ فلکی یعنی تمام ستاروں، سیارگان اور کہکشاؤں کی تخلیق کے بعد اللہ تعالیٰ نے نظامِ کائنات میں ضروری توازن اور اعتدال قائم رکھنے کے لئے اُنہیں ایک خاص نظم وترتیب میں پرو دیا۔ یہ اسی خوش آئند اور ہم آہنگ توازن کا نتیجہ ہے کہ نظامِ کائنات بڑے مترنم طور پر چل رہا ہے اور اسی ہم آہنگی کے باعث وہ اَرب ہا سالوں سے قائم ودائم ہے۔

سورہ اَلرَّحمٰن کی مندرجہ بالا آیت ۵۵ میں ''عدل وانصاف کے توازن'' کا سلسلہ اُس سے اگلی دو آیتوں کے ساتھ مربوط ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ عدل وانصاف سے پیش آئیں اور اپنے تمام اعمال و افعال میں سنہری راہ کو اپناتے ہوئے اور کسی بھی چیز میں حدود سے تجاوز نہ کرتے ہوئے مناسب توازن قائم رکھیں :

اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ O وَاَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ O (اَلرَّحْمٰن:۸،۹)

''کہ تم تولنے میں گڑبڑ نہ کرو۔ اور وزن کو انصاف کے ساتھ ٹھیک رکھو اور تول کو مت گھٹاؤ۔'' (۸،۹:۵۵)

اَلْمِيزَان کے معنی عدل کے بھی کئے گئے ہیں۔ تجارت اور تجارتی معاملات میں تقویٰ اور دیانت کی اہمیت اسی ایک حکم سے ظاہر ہے اور عالم کی فلاح وبہبود کا مدار بڑی حد تک اِسی ایک حکم سے ظاہر ہے۔

عدل وانصاف کی تقسیم کاری اُس وقت خصوصی اہمیت اختیار کرلیتی ہے جب وہ دوسروں کے حقوق و فرائض یا بےگناہی یا جرم سے متعلق ہو۔ اِن معاملات سے متعلق عدل وانصاف کا بڑا تقاضا یہ ہے کہ اِن معاملات سے متعلق فیصلہ صادر کرنے والا ممکنہ حد تک توازن کے معیار کو برقرار رکھتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جیسی بھی صورتِ حال ہو، وہ ہر پارٹی کو اپنی وکالت کرنے اور اپنے دعووں اور موقف کا تحفظ کرنے کے مساوی موقعے دیتا ہے۔ وہ پیش کردہ شہادت اور دیئے گئے دلائل کے باوزن ہونے کو یکساں پیمانے کے ساتھ دیکھتا ہے۔ وہ اٹھائے گئے تنازعات کو اور فریقین کی جانب سے عرض داشت اور التماس کو مناسب توجہ دیتا ہے اور پھر وہ فیصلہ خصوصیتِ خاصہ (Merit) کی بنیاد پر دیتا ہے۔

خصوصیت خاصہ کی بنیاد پر فیصلہ دینے کا مطلب یہ ہے کہ فیصلہ صادر کرنے والا غیر متعصب ہے اور فریقین کی جانب سے دی گئی شہادت خصوصیت خاصہ (Merit) یا نقص وعیب (Demerit) سے قطع نظر وہ کسی بات سے متاثر نہیں ہوتا۔ اس سلسلہ میں قرآنِ حکیم مسلمانوں کو یہ حکم دیتا ہے :۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَوِالْوَالِدَیْنِ وَ الْاَقْرَبِیْنَ اِنْ یَّکُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰہُ اَوْلٰی بِھِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْھَوٰٓی اَنْ تَعْدِلُوْا وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًاO (اَلنِّسآء : ۱۳۵)

''اے ایمان والو! انصاف پر خوب قائم رہنے والے اور اللہ کے لئے گواہی دینے والے رہو' چاہے وہ تمہارے یا (تمہارے) والدین اور قرابت داروں کے خلاف ہی ہو' وہ امیر ہو یا مفلس اللہ (بہر حال) دونوں سے زیادہ حق دار ہے' تو خواہشِ نفس کی پیروی نہ کرنا کہ حق سے ہٹ جاؤ اگر تم کجی کرو گے یا پہلو تہی کرو گے تو جو کچھ تم کر رہے ہو' اللہ اُس سے خوب باخبر ہے۔'' (۴ : ۱۳۵)

ایک یتیم لڑکے اور اُس کے سرپرست کے مابین کھجور کے ایک درخت کی ملکیت کے بارے میں جھگڑا تھا۔ اُس کے متعلق نبی آخر الزماں ﷺ نے جو فیصلہ فرمایا وہ اعلیٰ انسانی اقدار کا مثالی نمونہ ہے۔ پیش کی گئی شہادت کی رُو سے اُس درخت کا مالک لڑکے کا سرپرست ثابت ہو گیا اور اس لئے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُس کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ لیکن آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام اُس یتیم لڑکے کی اُداسی اور دل گرفتگی سے اِس قدر متاثر ہوئے کہ آپ نے وہ درخت کسی کی وساطت سے لڑکے کے سرپرست سے خرید کر اُس یتیم لڑکے کو بطور تحفہ دے دیا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ رحم دلی یا ہمدردی کا کوئی پہلو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو میرٹ کی بنیاد پر فیصلہ کرنے سے نہ روک سکا۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی برابر کی اہمیت کی حامل ہے کہ ایک اپیل کو خارج کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

''تم سے پہلے لوگ اس لئے تباہ و برباد ہوئے کہ جب اُن کا کوئی بارسوخ آدمی کوئی جرم کرتا تو سزا سے اُسے کھلی چھٹی مل جاتی جبکہ ایک کمزور و بے بس مجرم سزا پایا جاتا۔''

قرآنِ حکیم نے مختلف معاملات میں کچھ خاص اصول اور عدل و انصاف کے کچھ معیار مقرر کئے ہیں۔ مثلاً:

(۱) لَا یُؤَاخِذُکُمُ اللّٰہُ بِاللَّغْوِ فِیْٓ اَیْمَانِکُمْ وَلٰکِنْ یُّؤَاخِذُکُمْ بِمَا کَسَبَتْ قُلُوْبُکُمْ (البقرۃ)

''اللہ تمہاری قسموں میں سے لایعنی (قسم) پر گرفت نہیں کرے گا' اَلبتہ تم سے اُس (قسم) پر گرفت کرے گا جس پر تمہارے دلوں نے قصد کیا ہے۔'' (۲ : ۲۲۵)

(۲) وَلَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ فِیْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِہٖ وَلٰکِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُکُمْ (الاحزاب : ۵)

''تم پر اس کا کوئی گناہ نہیں جو تم سے بھول چوک ہو جائے' ہاں (گناہ تو اس پر ہے) جو تم دل سے ارادہ کر کے کرو۔'' (۳۳ : ۵)

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ فرمودہ بھی مندرجہ بالا آیاتِ قرآنی کے موافق ہے جس میں آپ نے فرمایا:

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ (یعنی اعمال کا انحصار نیتوں پر ہے)۔

یہ قرآنی آیات اور احادیثِ مبارکہ اس حقیقت کی وضاحت میں ہیں کہ نیت اور ارادے کے بغیر نہ تو کوئی گناہ اور نہ ہی کوئی جرم یا جارحیت شمار ہوتی ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ نیت اور ارادہ جارحیت کا خلاصہ ہوتا ہے۔ اس اصول کو اب آفاقی طور پر تسلیم کرلیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ صدیوں پہلے جو کچھ قرآنِ حکیم میں نازل ہوا' اب اُسے ساری دنیا نے تسلیم کرلیا ہے۔

اسی طرح قرآنِ حکیم سزا کے متعلق فرماتا ہے :

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللّٰهِ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ O وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَأُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ O (الشّوریٰ : ۴۰'۴۱)

"اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے لیکن جو کوئی معاف کردے اور اصلاح کرلے تو اُس کا اجر اللہ کے ذمہ رہا' بے شک اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ اور جو اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد بدلہ (برابر کا) لے لے تو ایسے لوگوں پر کوئی الزام نہیں۔" (۴۰'۴۱ :۴۲)

یعنی سزائے جرم بھی درجہِ جرم کی مناسبت ہی سے دی جائے اور اُس سے تجاوز نہ کیا جائے۔ یہاں دو اصول ارشاد ہوئے ہیں: (۱) ایک قانونِ عدل کہ جو جیسا کرے گا' ویسا پائے گا مثلاً دانت کا بدلہ دانت اور آنکھ کا بدلہ آنکھ۔ لیکن یہاں یہ بھی شرط ہے کہ وہ شے فی نفسہٖ ممنوع وحرام نہ ہو مثلاً لُوٹ کا بدلہ لُوٹ اور زِنا کے عوض زِنا کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ (۲) دوسرا قانونِ فضل یعنی رحم ورعایت کا قانون۔ آیت سے انتقام کا صرف جواز نکلتا ہے نہ کہ اُس کی ماموریت۔" (تفسیر ماجدی اردو' صفحہ ۹۷۴' نوٹ:۴۶)

اِس کے ساتھ ساتھ قرآنِ حکیم ذاتی تحفظ کے حق کو بھی تسلیم کرتا ہے۔ چنانچہ فرمایا :

وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَأُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ O إِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ أُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ O (الشّوریٰ : ۴۱'۴۲)

"اور جو اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد بدلہ (برابر کا) لے لے تو ایسے لوگوں پر کوئی الزام نہیں۔ الزام تو اُن لوگوں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین پر ناحق سرکشی کرتے پھرتے ہیں' ایسوں کے لئے دردناک عذاب ہے۔" (۴۱' ۴۲ : ۴۲)

عوام کے ذریعے عدل وانصاف کا نفاذ : کسی بھی عدالتی نظام کی اخلاقی بلندی اور دیانتداری کی کامیابی اُس کے عوام کی اخلاقی بلندی اور ایمانداری کی رہینِ منت ہوتی ہے۔ جب تک عوام اسلامی روح سے سرشار نہ ہوں تو وہ نظام اسلامی نہیں بن سکتا۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ کے خلفائے راشدین کے ادوارِ مبارکہ میں لوگ اتنی اعلیٰ منزلت کی اخلاقی اقدار سے سرشار تھے کہ اگر کوئی شخص کسی خطا کا مرتکب ہوتا تو وہ جرم کو تسلیم کرتے ہوئے آخرت کے عذاب سے بچنے کے لئے سزا کا خواستگار رہتا۔ لہٰذا اسلام میں عدل وانصاف صرف عدالتی ایوانوں ہی کا کام نہیں بلکہ اسلامی ریاست کے ہر فرد کو لازمی طور پر نہ صرف اپنے اَبنائے جنس کے ساتھ

ایمان دار اور راست رَو ہونا چاہئے بلکہ اپنی ذات کے ساتھ بھی۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک مرتبہ حکم دیا:
''کسی کو اذیت نہ دو' تاکہ کوئی تمہیں اذیت نہ پہنچائے'' (اربعین نووی)

سچی بات تو یہ ہے کہ یہ ایسی ہی شاندار اور انسانیت دوست تعلیمات کا نتیجہ تھا کہ اُس دَور میں راست روی اور عدل و انصاف نے مسلمانوں کے دلوں میں ایسا راسخ گھر کر لیا تھا کہ کوئی بھی آدمی دوسرے کی ملکیت کو ہتھیانے کی جرأت نہ کر سکتا تھا اور نہ ہی اپنے ابنائے جنس کی جسمانی یا جذباتی طور پر اذیت رسانی کر سکتا تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ سیّدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے دَورِ خلافت میں سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو قاضی مقرر کیا لیکن عجیب بات ہے کہ آپ کے اِس منصب کے دوران کوئی ایک مقدمہ بھی سماعت کے لئے آپ کے پاس نہیں آیا۔

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ جہاں لوگ جائز و ناجائز طریقوں سے امیر بننے کے لئے مالی اور مادّی محرکات سے تحریک پاتے ہوں' تو مقدمہ بازی اُس معاشرہ کا المیہ بن جاتی ہے۔ اسلام لوگوں کے تنازعات اور جھگڑوں کو نہ صرف صحیح طور پر حل کرنا چاہتا ہے بلکہ وہ مقدمہ بازی کو ختم کرنے کی بھی کوشش کرتا ہے۔ ہمارے سماج میں غیر ضروری مقدمہ بازی کو کم کرنے اور اس کی روک تھام کے لئے ہمیں لوگوں کے ذہنوں کو تعلیم اور اداراتی انتظامات کے ذریعے اسلامی کردار کی مطابقت میں بدلنا ہوگا۔ معمولی معمولی باتوں پر آئے دن کے جھگڑوں اور غیر ضروری مقدمہ بازی نے بھی ہماری اقتصادی یک جہتی کو پارہ پارہ کرنے میں بہت بُرا کردار ادا کیا ہے۔

<u>عدل و انصاف کا نفاذ اور ملک کا آئین</u> : کسی ملک کا عدالتی نظام چونکہ اُس کے آئین کے تحت ہی منظم اور بااثر ہوتا ہے اس لئے خود آئین کو اسلامی سانچے میں ڈھالا جانا از حد ضروری ہے۔

یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ ملکِ پاکستان کا آئین جسے اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا' شریعتِ اسلامی کو اپنے ملک کا قانونِ اعلیٰ تسلیم نہیں کرتا اور جب تک آئین میں شریعتِ اسلامی کو بنیادی قانون تسلیم کرتے ہوئے کوئی مخصوص شِق فراہم نہیں ہوتی' اُس وقت تک عدالتی نظام اسلامی نہیں ہوسکتا۔

عدالتِ عظمیٰ اور عدالتِ عالیہ سے قطع نظر آئین میں فیڈرل شریعت کورٹ کی تاسیس موجود ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فیڈرل شریعت کورٹ تو شریعت سے متعلق معاملات و مقدمات نمٹائے گی جبکہ دیگر عدالتیں غیر مذہبی یا لادینی کے مقدمات کی سماعت کریں گی۔ یہ دونوعی تقسیم بندی (Dichotomy) درج ذیل قرآنی حکم کے خلاف ہے:

(۱) فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ (المائدۃ: ۴۸)
''(اے نبی!) آپ اُن لوگوں کے درمیان اللہ کے اتارے ہوئے (احکام) کے مطابق فیصلہ کیا کیجئے اور اُن لوگوں کی خواہشوں پر عمل نہ کیجئے اُس سچائی سے الگ ہو کر جو آپ کے پاس آچکی ہے۔'' (۵:۴۸)

(۲) وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًاO (الاحزاب : ۳۶)
''اور کسی مؤمن اور مؤمنہ کے لئے یہ درست نہیں کہ جب اللہ اور اُس کا رسول کسی امر کا حکم دیں تو پھر اُنہیں اپنے (اُس) امر میں کوئی اختیار باقی رہ جائے اور جو کوئی اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو وہ صریح گمراہی میں جا پڑا۔'' (۳۶ :۳۳)

''ایک اسلامی ریاست کے لئے یہ ضروری ہے کہ اُس کی تمام عدالتیں قوانین کو شریعتِ اسلامی کے مطابق ڈھالیں اور کوئی بھی عدالت لامذہبیت کے قانون کا سہارا نہ لے۔'' ("Reconstruction of Political Thought in Islam" ... Prof. Masudul Hasan, pp. 209-210)

قاضیوں اور ججوں کی اقسام : احادیثِ مبارکہ میں قاضیوں کی تین اقسام بیان ہوئی ہیں : اُن میں سے ایک قسم جنت میں جائے گی جبکہ دوسری دو اقسام جہنم کا ایندھن بنیں گی۔ اوّل الذکر قسم اُن لوگوں کی ہے جو صحیح حقیقت تک پہنچتے ہوئے عدل و انصاف سے فیصلہ کرتے ہیں۔ وہ قاضی جو اپنے دنیاوی اور ذاتی مفاد کی خاطر مقدمہ کی حقیقی حیثیت جانتے ہوئے بھی بے انصافی کا فیصلہ کرتا ہے' جہنم میں جائے گا۔ اور وہ قاضی بھی دوزخ میں جائے گا جو قرآنِ حکیم' حدیثِ نبوی اور فقہ کی تفسیر و توضیح سے لاعلم اور ناواقف ہوتے ہوئے قضاۃ کے منصب کو سنبھالنے کی ذمہ داری لیتا ہے اور اپنے لادینی رجحانات کے مطابق فیصلے صادر کرتا ہے۔

بے انصاف اور ظالم قاضی کے لئے وعید : دوست ہوں یا دشمن' امیر ہوں یا غریب' کالے ہوں یا گورے' سب کے ساتھ انصاف سے پیش آنے کی ترغیب میں قرآنی اقتباسات کے علاوہ دو احادیث نبویہ یہاں بیان کی جاتی ہیں جن میں ظالم اور بے انصاف قاضی (جج) کو تنبیہ کی گئی ہے:

(۱) ''حضرت عبداللہ بن عوفیؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قاضی کے ساتھ اُس وقت تک اللہ کی ہمراہی ہوتی ہے جب تک وہ اپنے فیصلوں میں عدل و انصاف اور راستی کو قائم رکھتا ہے اور صراطِ مستقیم پر رہتا ہے۔ اور جب قاضی بے انصاف اور ظالم بن جائے اور صراطِ مستقیم سے ہٹ جائے تو اللہ کی نصرت اور راہنمائی اُسے چھوڑ دیتے ہیں اور وہ شیطان کے چنگل میں پھنس جاتا ہے۔''

(۲) ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو کوئی منصبِ قضاء حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اُسے حاصل کر لیتا ہے' پھر اُس کی راستی اور عدل و انصاف کی حس اُس کے نفسِ امارہ پر غالب آ جاتی ہے تو اُس کے لئے جنت ہے۔ جبکہ اُس شخص کے لئے جس کا نفسِ امارہ اُس کی فطرتِ سلیمہ پر غالب آ جائے (یعنی اُس کے فیصلے ظالمانہ اور غیر انصافی کے ہوں) تو اُس کے لئے دوزخ ہے۔'' (''الاحکام السلطانیہ''۔۔۔الماوردی' باب ششم: القضاء)

منصبِ قضا ملنے کی خواہش رکھنا : مندرجہ بالا حوالہ جات سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ منصبِ قضاء کی آرزو رکھنے کی قطعی طور پر ممانعت ہے اور حرام ہے۔ یہ خواہش درجِ ذیل شرائط کے تحت حرام ہو جاتی ہے:

(۱) اگر یہ خواہش مال ومنال اکٹھا کرنے، شہرت اور قوتِ اقتدار حاصل کرنے کی ہو۔
(۲) اگر یہ خواہش لوگوں کو مطیع کر کے اُن پر ظلم وتشدد ڈھانا اور اُن سے بے انصافی کر کے اُن کے جائز حقوق سے اُنہیں محروم کرنا ہو۔

حدیثِ مبارکہ کے الفاظ غَلَبَ عَدْلُہ، جَوْرَہ، (اُس کا عدل اُس کے ظلم وجور پر غالب آگیا) اس لئے استعمال ہوئے کہ مکمل وکامل عدل وانصاف کرنا کسی بھی انسان کے بس کی بات نہیں۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کا خاصہ ہے۔

قاضی اور رشوت : ابو حُمید الساعدی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
ھَدَایَا الْاُمَرَاءِ غَلُوْل" (''الاحکام السلطانیۃ'' لماوردی، باب القضاء)
''اربابِ اقتدار کو تحفے پیش کرنا رشوت ہے۔''

حدیثِ بالا کے لفظ ''غَلُول'' کا مطلب دھوکہ دہی، چالبازی کے ذریعے اور دوسرے کی آنکھوں میں مرچیں چھڑک کر دولت کمانا ہے۔ لوگوں کی جانب سے افسروں اور اربابِ اختیار کو پیشکشیں اگرچہ تحفوں اور عطیات جیسے معصوم ناموں سے دئے جاتے ہیں لیکن درحقیقت وہ رشوت اور غیر قانونی جلبِ زر ہے۔ تو اگر کوئی تحفہ کسی اِن سروس افسر کو کسی معاملہ میں اُس کی ناجائز طرفداری اور غلط فیصلہ حاصل کرنے کے لئے دیا جائے تو وہ بلا شک وشبہ رشوت ہوگا اور حرام ہوگا۔ تاہم اگر تحفہ کسی ایسے شخص کو دیا جائے جس کے عہدے اور منصب کا تحفہ دینے والے کے مفاد کے ساتھ کوئی تعلق نہیں (جس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اُس سے تحفہ وصول کرنے والا اپنے عہدے پر ہونے سے پہلے بھی تحفہ لیتا رہا ہے) تو ایسے تحفوں اور عطیات کا قبول کرنا حلال اور جائز ہے۔

مندرجہ بالا حقیقت کی تائید میں یہاں ایک مشہور حدیثِ نبوی کا حوالہ دیا جاتا ہے:
''نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک مرتبہ اپنے ایک صحابی کو ایک بہت ہی قیمتی شال میں ملبوس دیکھا جسے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جانب سے یمن کا عامل (گورنر) مقرر کیا گیا تھا۔ آپ ﷺ نے اُس سے پوچھا: تمہارے پاس یہ شال کیسے اور کہاں سے آئی؟ اُس نے جواب دیا کہ ایک آدمی نے یہ مجھے تحفۃً دی ہے۔ نبی مکرّم ﷺ نے فرمایا: گورنری کے منصب کو چھوڑ کر اپنے گھر میں بیٹھ جاؤ، پھر میں دیکھوں کہ تمہارے پاس تحفے اور عطیات کیسے کھچ کر لائے جاتے ہیں۔ تمہارا اس شال کو قبول کرنا صریحاً رشوت لینے کا فعل ہے۔''

قاضیوں اور اربابِ اختیار سے ناجائز طرفداری کے حصول کے لئے اپنی دولت کو بطور رشوت استعمال کرنے کی ممانعت سورۃ البقرۃ کی درج ذیل آیت میں کی گئی ہے:
وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ O (اَلْبَقَرۃ: ۱۸۸)

''اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طور پر مت کھاؤ اُڑاؤ اور نہ اُسے حُکّام تک پہنچاؤ کہ جس سے لوگوں کے مال کا ایک حصہ تم گناہ سے کھا جاؤ درآنحالیکہ تم جان رہے ہو (کہ تم ناحق اور زیادتی پر ہو)۔''

''دُنیا کی کوئی عدالت بہتر سے بہتر ہو اور کوئی حاکم عادل سے عادل سہی' بہر حال دُنیوی فیصلے علمِ غیب کی بناء پر نہیں' روئیدادِ مقدمہ کی بناء پر ہی صادر ہوتے ہیں اور اُن میں غلطی' لغزش' ناانصافی اور دھوکے کا احتمال ہر وقت ہے۔آیت اِسی حقیقت کی طرف توجہ دلا رہی ہے کہ جو حق ہے وہ عنداللہ حق ہی ہے اور جو ناحق ہے وہ اللہ کے ہاں ناحق ہی شمار ہوگا۔اگرچہ حُکّام کا فیصلہ اس کے برعکس ہی ہو' قاضی کے فیصلے حق کو ناحق اور ناحق کو حق نہیں بنا سکتے۔اصل شے انسان کی توجہ و لحاظ کے قابل خود اُس کا ضمیر اور تقویٰ ہے۔'' (تفسیر ماجدی اردو' صفحہ ۷۳' نوٹ: ۶۸۸)

<u>قاضیوں کے ساتھ لوگوں کا رویّہ</u> :حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث کے مطابق نبیِ مکرّم ﷺ نے فرمایا کہ قاضیوں اور اربابِ اختیار کے فیصلوں کو تسلیم کرنا ایک مسلمان پر ضروری ہے اگرچہ وہ اُن فیصلوں کو پسند کرے یا نہ کرے بشرطیکہ وہ فیصلے اسلام کی روح کے خلاف نہ ہوں۔اگر اُن کے فیصلے گناہ کے ہوں اور اللہ کی ناراضی کا موجب ہوں تو اُس کو اُنہیں خاطر میں نہیں لانا چاہئے اور نہ ہی تسلیم کرنا چاہئے۔

اِس کا صاف مطلب یہی ہے کہ شریعتِ اسلامی میں کوئی عدالت' حکومت' قاضی یا افسر لوگوں کو کسی غیر اسلامی قانون اور فیصلے کے تابع بنانے کے مجاز نہیں۔ہر غیر اسلامی قانون اور فیصلہ مسترد کر دیا جائے گا اور تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ہر مسلمان پر صرف اُنہی قوانین اور فیصلوں کو تسلیم کرنا لازم ہوگا جو شریعت کی موافقت میں ہوں اور جن کی عدمِ تعمیل اس دنیا اور آخرت میں غضبِ الٰہی کا موجب بنے۔

<u>قاضی کی اہلیت کی شرائط</u> :منصبِ قضاء کی اہلیت کے لئے قاضی میں ذیل کی شرائط کا ہونا ضروری ہے:

(۱) قاضی بالغ مرد ہونا چاہئے۔چونکہ شرعی قوانین کا نفاذ ایک نابالغ پر نہیں ہوتا' اس لئے ایک نابالغ بھی کوئی قانون دوسروں پر نافذ نہیں کر سکتا۔امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک عورت صرف اُن معاملات میں قاضی بن سکتی ہے جن میں شریعت اُس کی گواہی کو قبول کرتی ہے۔امام ابن جریر کے نزدیک عورت تمام معاملات میں قاضی بننے کی اہل ہے۔لیکن اجماعِ اُمّت اور سورۃ النساء کی آیت ۳۴ (جس میں مرد کو قوّام کہا گیا ہے) کی رُو سے یہ رائے قابلِ ترجیح نہیں ہے۔

(۲) قاضی کو اپنے روّیے میں محتاط' سمجھدار و دانا' معقول و متوازن' دُور اندیش اور غفلت و نسیان سے بلند و بالا ہونا چاہئے تاکہ وہ انتہائی پیچیدہ مسائل اور انتہائی اُلجھن کے معاملات کو کم سے کم ممکنہ وقت میں حل کر سکے۔

(۳) اُسے آزاد اور خود مختار ہونا چاہئے اور کسی کی تابعداری اور زیردستی میں نہیں ہونا چاہئے کیونکہ ایک

غلام اور زیردست شخص کی اپنی کوئی صوابدید نہیں ہوتی تو دوسروں پر کیسے اُس کی صوابدید ہوگی! علاوہ ازیں چونکہ ایک غلام کی گواہی معتبر نہیں ہے' لہٰذا اُس کے فیصلوں کا نفاذ بھی غیر معتبر ہوگا۔

(۴) قاضی کا مسلمان ہونا ضروری ہے کیونکہ جب گواہ کے لئے اسلام کا ہونا شرطِ اوّل ہے تو قاضی کے لئے مسلمان ہونا تو بہ طریق اولیٰ ضروری ہے۔ایک اسلامی ریاست میں کسی غیر مسلم کو قاضی (جج) نہیں مقرر کیا جا سکتا۔سورۃ النساء میں ارشادِ باری تعالیٰ ہوا :

وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا O (النساء : ۱۴۱)

''اللہ کافروں کا مؤمنوں پر غلبہ ہرگز نہ ہونے دے گا (حجتِ شرعی و عقلی کے لحاظ سے)۔'' (۴ : ۱۴۱)

تاہم امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ایک غیر مسلم اپنے ہم مذہبوں کے لئے قاضی ہوسکتا ہے۔لیکن وہ مسلمانوں کے مقدمات کی سماعت کے لئے قاضی نہیں ہوسکتا۔

(۵) قاضی کو نیک طینت' پارسا اور خدا خوف ہونا چاہئے۔شریعتِ اسلامی میں پارسا شخص میں ذیل کی خصوصیات ہونی چاہئیں:

(i) اُسے مکمل طور پر راست رَو' سچا اور صاف گو ہونا چاہئے۔
(ii) اُسے امین و قابلِ اعتماد ہونا چاہئے نہ کہ پُر فریب اور دھوکے باز۔
(iii) اُسے متین و سنجیدہ اور پرہیزگار ہونا چاہئے۔
(iv) اُس کی فطرت بے داغ اور اُس کا کردار ظاہر و باہر میں روشن ہونا چاہئے۔
(v) اپنی خوشی و مسرت اور غم و اندوہ کے لمحات میں وہ ڈگمگا نہ جائے بلکہ اپنے جذبات کو قابو میں رکھے۔
(vi) مذہب اور دُنیوی تمام معاملات میں اُسے مشفق' مہذّب اور حلیم الطبع ہونا چاہئے۔

(۶) وہ مکمل طور پر سمعی و بصری صلاحیتوں کا حامل ہو تاکہ وہ حقائق کی صداقت کو اُن کے صحیح تناظر میں ثابت کرسکے' اُسے مدّعی اور مدّعا علیہ کے موقف میں اور اعتراف کرنے والے اور اس سے انکار کرنے والے میں تمیز کرنے کی صلاحیت حاصل ہو اور حقدار کا اُس کا جائز دلانے کی قابلیت حاصل ہو۔اس لئے منصب قضاء کسی نابینا شخص کے لائق نہیں۔امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ایک نابینا کی گواہی معتبر ہے' لہٰذا بطورِ قاضی اُس کے فیصلے بھی معتبر ہیں۔ایک بہرے آدمی کے لئے بھی یہی اختلافِ رائے ہے۔تمام اعضائے جسمانی کا صحیح اور صحتمند ہونا امامت کے لئے تو شرطِ اوّل ہے لیکن قاضی کے منصب کے لئے نہیں۔تو ایک معذور اور ناکارہ شخص قاضی ہوسکتا ہے لیکن قضاء کے عہدے کے وقار اور عظمت کے مدّنظر یہ بات زیادہ مناسب ہے کہ تمام اعضائے جسمانی کے صحتمند آدمی کو منصب قضاء دیا جائے۔

(۷) اُسے شریعت کے بنیادی اور تشریحی اصولوں کا پورا واقف ہونا چاہئے اور قرآن مجید' سنتِ نبوی

اور فقہ کے ہر گوشہ کا ماہر کامل ہونا چاہیے۔

شہادت (گواہی) : چونکہ عدالتی فیصلے علمِ غیب کی بناء پر نہیں بلکہ روئیدادِ مقدمہ کی بنیاد پر ہی صادر ہوتے ہیں اور قاضی یا جج نے اپنے سامنے پیش کردہ گواہیوں کی روشنی ہی میں خواہ وہ سچی ہوں یا جھوٹی' فیصلہ صادر کرنا ہوتا ہے۔ اگر گواہی سچی ہو تو فیصلہ مبنی بر انصاف ہوگا ورنہ قاضی کے انتہائی ایماندار اور متقی ہونے کے باوجود ظلم اور زیادتی کا فیصلہ ہوگا اور گناہ کا تمام تر بوجھ جھوٹے گواہ یا گواہوں کے سر ہوگا۔ گواہی کا بالکل چھپا دینا یا اُسے توڑ مروڑ کر پیش کرنا دونوں ہی عدالتی فیصلے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ گواہی کی اِسی اہمیت کے پیشِ نظر قرآنِ حکیم سچی گواہی دینے پر خصوصی زور دیتا ہے اور حکم فرماتا ہے :

(۱) وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ O (البقرۃ : ۴۲)
''اور حق کو باطل کے ساتھ گڈمڈ نہ کیا کرو اور نہ ہی جانتے بوجھتے ہوئے حق کو چھپایا کرو۔''

(۲) وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ (البقرۃ : ۲۸۳)
''اور (ادائے شہادت کے وقت) گواہی کو چھپایا نہ کرو اور جو کوئی اُسے چھپاتا ہے' اُس کا دل گنہگار رہتا ہے۔'' (۲:۲۸۳)

(۳) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى وَاتَّقُوا اللَّهَ (المائدۃ : ۸)
''مومنو! اللہ کے لئے پوری پابندی کرنے والے (اور) عدل کے ساتھ گواہی دینے والے رہو اور کسی جماعت کی دشمنی تمہیں اس پر نہ آمادہ کرے کہ تم اُس کے ساتھ انصاف ہی نہ کرو' انصاف کیا کرو کہ وہ تقویٰ سے بہت قریب ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو۔'' (۵:۸)

اللہ اللہ دنیا کا کیا کوئی قانون ایسا ملے گا جس نے اپنے باغیوں اور دشمنوں تک کے حقوق کی یہ رعایت رکھی ہو۔ فقہاء نے آیت ۸ بالا سے یہ حکم نکالا ہے کہ کافر کا کفر اُسے اس سے محروم نہیں کر دیتا کہ اُس کے حق میں عدل کیا جائے یا اُس کے حقوق ادا کئے جائیں۔

گواہی بالکل صاف' واضح' غیر مبہم اور واقعاتی حقائق کے مطابق ہونی چاہیے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:
إِذَا عَلِمْتَ مِثْلَ الشَّمْسِ فَاشْهَدْ وَإِلَّا فَدَعْ (السنن الکبریٰ للبیہقی' کتاب الشہادات' باب: التحفظ فی الشہادۃ والعلم بہا)

(۱) **گواہی کے چھپانے کی ممانعت** : مختلف مقامات پر قرآن نے گواہی نہ چھپانے کی بڑی تاکید کی:

(۱)(ا) وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ O (البقرۃ : ۴۲)
''اور حق کو باطل کے ساتھ گڈمڈ نہ کیا کرو اور نہ ہی جانتے بوجھتے ہوئے حق کو چھپایا کرو۔''

(۲) وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ (البقرۃ : ۲۸۳)
''اور (ادائے شہادت کے وقت) گواہی کو چھپایا نہ کرو اور جو کوئی اُسے چھپاتا ہے' اُس کا دل گنہگار رہے۔''

(۳) وَالَّذِیْنَ لَا یَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ (الفرقان : ۷۲)
''(اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں) جو جھوٹ کے گواہ نہیں بنتے۔'' (۷۲ :۲۶)

''حدود'' ☆ کے جرائم میں شہادت کی حیثیت : ''حدود'' کے جرائم میں شہادت کی شرعی حیثیت دوسرے جرائم کی شہادت سے مختلف ہے۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ گواہی دینا فرضِ کفایہ ہے لیکن حدود کے جرائم میں شہادت کا چھپانا اُس کے ظاہر کرنے سے بہتر ہے۔ تاہم حدود جرائم میں گواہی دینا اِن صورتوں میں لازم ہوجاتا ہے: (i) جب گواہی کے نہ ہونے کی وجہ سے ایک بے گناہ شخص کو سزا پانے کا اندیشہ ہو۔ (ii) عادی مجرم کو سزا دئے جانے کے لئے اُس کے خلاف گواہی دینا کیونکہ اُس کے جرم کا چھپانا انسانیت کی تذلیل ہے اور اُسے اپنے گناہ بھرے جرم میں بڑھنے کا موقع دینا ہے۔ اس لئے معاشرے کے مفاد کے لئے اُس کے خلاف گواہی دینا لازم ہوجاتا ہے۔

''حدود'' جرائم میں گواہی کے چھپانے کی ترغیب مختلف احادیث میں دی گئی ہے۔ مثلاً فرمایا:
مَنْ سَتَرَ عَلٰی مُسْلِمٍ سَتَرَاللّٰہُ عَلَیْہِ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ (مؤطا امام مالک' سنن ابی داؤد' کتاب الحدود)
''جس نے مسلمان کی پردہ پوشی کی' اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اُس (کے عیوب) کی پردہ پوشی کرے گا۔''

ایک صحابی نے حدود کے ایک جرم میں کسی کے خلاف گواہی دی تو نبی علیہ السلام نے اُسے نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:
لَوْ سَتَرْتَہٗ بِثَوْبِکَ لَکَانَ خَیْرًا لَّکَ (صحیح بخاری: کتاب الحدود' باب المظالم)
''اگر تو اپنے کپڑے سے اُس کی پردہ پوشی کر لیتا تو تیرے لئے بہتر ہوتا۔''

اِسی لئے چوری کے سوا حدود کے تمام جرائم میں احناف کے نزدیک گواہی کا چھپانا قابلِ ترجیح ہے۔
(''فقہ القرآن'' ایم اے اسلامک سٹڈیز کورس' علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد)

(II) گواہوں کا نصاب : ''نصاب الشہادۃ'' کا مطلب گواہوں کی وہ تعداد ہے جن کی گواہی کی بنیاد پر فیصلہ کیا جاتا ہے۔ بعض صورتوں اور معاملوں میں صرف ایک گواہ کافی ہوتا ہے' بعض مقدمات میں ایک مرد + دو عورتوں کی گواہی درکار ہوتی ہے' بعض مقدمات کا دو مَردوں کی گواہی سے فیصلہ کیا جاتا ہے جبکہ کچھ مقدمات کا چار مَردوں کی گواہی سے فیصلہ ہوتا ہے۔ نصاب کی تفصیل ملاحظہ ہو :

(۱) ایک گواہ کی بنیاد پر فیصلہ : احناف اور حنابلہ کے نزدیک نسوانی معاملات میں ایک عورت کی گواہی

☆☆ اسلام کی مجوزہ سزاؤں میں ''حد'' اور ''تعزیر'' کی دو اصطلاحات آتی ہیں۔ ''حد'' کا اصطلاحی معنی وہ سزا ہے جسے شریعتِ مطہرہ نے مقرر کردیا ہے اور اس میں قاضی یا منصف کو رد و بدل کا اختیار بالکل نہیں ہوتا۔ حدود میں زنا کے لئے رجم (سنگسار کرنا)' چوری اور ڈکیتی کے لئے ہاتھ کا ٹنا' شراب خوری اور بہتان طرازی (قذف) پر ایک سو یا اسی کوڑے لگانا' اور قتلِ ناحق پر قتل کرنا شامل ہیں۔ اِن کے علاوہ دیگر سزائیں تعزیرات میں شامل ہیں اور وہ قاضی کی صوابدید پر چھوڑ دی گئی ہیں کہ جرم کی نوعیت کے مطابق جیسے چاہے بہ نظرِ انصاف سزا دے۔

معتبر ہے مثلاً ایک لڑکی کا سنِ بلوغت کو پہنچنا' بچے کی پیدائش' اندرونی نسوانی اَمراض اور اِسی طرح کے دوسرے معاملات میں فیصلہ صرف ایک عورت کی گواہی پر صادر کیا جائے گا کیونکہ فرمودہِ رسالت ﷺ ہے:

(i) شَهَادَةُ النِّسَاءِ جَائِزَة" فِيمَا لاَ يَسْتَطِيعُ الرِّجَالُ النَّظَرَ إِلَيْهِ (اعلاء السنن: کتاب الشھادات--ظفر احمد عثمانی)

"جن معاملات میں مَردوں کی مداخلت ممنوع ہے' اُن میں ایک عورت کی گواہی معتبر ہے۔"

(ii) أَجَازَ النَّبِيُّ ﷺ شَهَادَةَ الْقَابِلَةِ وَحْدَهَا (ایضاً)

"نبیِ مکرّم ﷺ نے صرف ایک عورت کی گواہی کو معتبر قرار دیا۔"

کچھ مقدمات میں نبیِ اکرم ﷺ نے صرف ایک گواہ کی بنیاد پر فیصلے صادر فرمائے جس کی تفصیل ابن القیم الجوزیہ کی کتاب "اَلطُّرُقُ الحُکمیّة" میں موجود ہے۔ امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر ایک مکمل باب مخصوص کیا ہے۔

(۲) ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی کی بنیاد پر فیصلہ: تمام مالی معاملات اور خرید و فروخت' ہبہ' وصیت' رہن' ضمانتی بانڈ وغیرہ جیسے معاملات میں ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی تمام فقہاء کے نزدیک متفقہ طور پر معتبر ہے جس کا ثبوت سورۃ البقرۃ کی ذیل کی آیت ۲۸۲ ہے:-

وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَإِنْ لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَأَتَانِ

"اور اپنے مَردوں میں سے دو کو گواہ کر لیا کرو' تو اگر دونوں مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں۔"

"گواہ لازمی طور پر مسلمان' بالغ' پختہ ذہن کے' آزاد (نہ کہ غلام) اور اچھے کردار کے ہونے چاہئیں۔ تنازعات کا فیصلہ اِن گواہوں کی شہادت پر ہونا ہے' نہ کہ تحریری دستاویزات پر جن کی حیثیت محض ثانوی ہوتی ہے۔" (تفسیر ماجدی انگریزی' جلد اوّل' صفحہ ۴۶-اے' نوٹ: ۱۷۵)

"احناف کے نزدیک مالی معاملات کے علاوہ نکاح' طلاق' عدّت' رضاعت' حضانت وغیرہ جیسے معاشرتی حقوق کا بھی ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی پر فیصلہ ہوگا کیونکہ ایسے تمام معاشرتی معاملات میں عورتیں بھی بالعموم شریک ہوتی ہیں۔" ("احکام القرآن"--جصّاص)

(۳) دو مَردوں کی گواہی کی بنیاد پر فیصلہ: تمام مالی اور غیر مالی معاملات میں دو مَردوں کی گواہی معتبر ہے۔ زنا کے جرم کے علاوہ باقی تمام حدود کے جرائم میں دو مَردوں کی گواہی پر فیصلہ دیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۸۲ کا اوپر حوالہ دیا جا چکا ہے۔

تمام فقہائے کرام کا اِس بات پر اتفاق ہے کہ تمام حقوق کو دو مرد گواہوں کی گواہی سے ثابت کیا جا سکتا ہے اور زِنا کے علاوہ چوری' مے نوشی' ڈاکہ' قتل' قصاص' دیت وغیرہ جیسے حدود جرائم کو دو مَردوں کی گواہی سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اِسی طرح طلاق' رجوع' نکاح' غلام کا آزاد کرنا (عِتق)' ایلاء' ظہار' حسب ونسب' وکالت اور ولایت (Guardianship) وغیرہ جیسے تمام معاملات کو دو مرد گواہوں کی گواہی کی بنیاد پر ثابت کیا جا سکتا ہے اور یہ گواہی دوسری تمام گواہیوں سے زیادہ اکمل و مکمل ہے۔ (تفسیر ابن کثیر: سورۃ البقرۃ کی آیت: ۲۸۲ کے تحت)۔

(۴) <u>چار گواہوں کی گواہی کی بنیاد پر فیصلہ</u> : زِنا کے جرم میں فیصلہ چار گواہوں کی گواہی کی بنیاد پر ہوگا جیسا کہ سورۃُ النساء کی آیت ۱۵ میں حکم ہوا :

وَالّٰتِیْ یَأْتِیْنَ الْفَاحِشَۃَ مِنْ نِّسَآءِ کُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَۃً مِّنْکُمْ

''اور تمہاری عورتوں میں سے جو بے حیائی کا کام کریں تو اُن پر اپنے میں سے چار آدمی گواہ کرلو۔''

درجِ ذیل دو آیات بھی زنا کے جرم میں چار گواہوں کے ثبوت میں ہیں :

(۱) --- ثُمَّ لَمْ یَأْتُوْا بِاَرْبَعَۃِ شُھَدَآءَ (اَلنّور : ۴)

--- ''پھر اگر وہ چار گواہ نہ لاسکیں۔'' (۲۴ : ۴)

(۲) لَوْلَا جَآءُوْ عَلَیْهِ بِاَرْبَعَۃِ شُھَدَآءَ (اَلنّور : ۱۳)

''یہ لوگ اپنے قول پر چار گواہ کیوں نہ لائے؟'' (۲۴ : ۱۳)

علاوہ ازیں نبی اکرم ﷺ نے اپنے ایک صحابی ہلال بن اُمیہ کو فرمایا جو آپ کے پاس اپنی بیوی کو زنا کی مرتکب ہونے کے باعث سزا دلوانے آئے تھے :

اَرْبَعَۃَ شُھُوْدٍ اَوْحَدٌ'' فِیْ ظَھْرِکَ (تفسیر ابن کثیر: سورۃ النور آیت: ۱۱)

''اپنے الزام کے ثبوت میں چار گواہ لاؤ ورنہ تمہاری پیٹھ پر اَسّی کوڑے لگائے جائیں گے۔''

لونڈے بازی اور جانوروں کے ساتھ بدفعلی کے جرائم میں فقہائے کرام چار گواہوں کے لانے کی شرط عائد کرتے ہیں کیونکہ زنا کی طرح یہ فعل بھی بے حیائی اور بے شرمی کا ہے۔ اَحناف کے نزدیک جانوروں کے ساتھ غیر قدرتی فعل کرنے پر دو گواہ کافی ہیں۔

<u>چار گواہوں کی موجودگی میں نسوانی گواہی کی حیثیت</u> : بہت سے فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ حدود جرائم میں عورتوں کی گواہی بالکل قابلِ قبول نہیں کیونکہ وہ عقل کی ناقص ہوتی ہیں۔ اور نقص کا دوسرا نام شک وشبہ ہے اور اِسی شک وشبہ کی بنیاد پر حدود خود بخود ساقط ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا زنا اور دوسرے حدود جرائم میں نسوانی گواہی معتبر نہیں سمجھی گئی۔ علاوہ ازیں نبی علیہ السلام اور آپ کے خلفائے راشدین کے اَدوارِ مبارک میں بھی اُس کی گواہی حدود جرائم میں معتبر نہیں سمجھی جاتی تھی۔ (''احکام القرآن''۔۔جصّاص بحوالہ ''فقہ القرآن'' صفحہ ۳۱۷)

(III) اسلام میں دوعورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر کیوں؟ اس مسئلہ کے فلسفہ اور اس کی سپیّت پر قرآن مجید دُور نہیں گیا سوائے اس کے کہ عورت خطا کرنے کی عادی ہے اور مرد کی نسبت اُس میں نسیان کا مرض زیادہ ہوتا ہے۔ بعض غیر مسلم مفکرین اور ماہرینِ نفسیات نے مختلف زمانوں میں اس حقیقت کی تائید کی ہے اور یہاں ہم نسوانی شہادت کے مقام کی جدید سائنس کی تحقیقات کے ساتھ موازنہ کرتے ہیں:

(۱) ''خواتین میں فریب کاری اور جعل سازی تقریباً عضویاتی (Physiological) ہوتی ہے۔ یہی حقیقت بے ہنگم اور درشت طور پر بہت سی اقوام کی ضرب الامثال میں بیان ہوئی ہے اور بعض ممالک میں اِس حقیقت کے تحت یہ کہا گیا ہے کہ خواتین کی قانونی گواہی کو مَردوں کی نسبت سب سے نچلے درجے میں رکھا جائے۔'' ("Man and Woman"... Havelock Ellis, p. 196)

(۲) ''یہ حقیقت کہ جرح کے دوران خواتین سے نمٹنا مشکل ہوتا ہے' وکلاء کے مابین ایک جانی پہچانی بات ہے۔ اور اُن کے خلاف کسی بھی تفتیشی راہ میں بہکانے والے اشاروں میں اُن کی مہارت اُنہیں ضدّی اور تمام اوقات میں گواہی سے منحرف ہونے والا بنا دیتی ہے۔'' (ایضاً)

(۳) ''اپنی کتاب بہ عنوان ("Psycology of Suggestion") کے صفحات ۲۶۲' ۳۶۳ پر سدیس بھی خواتین کی گواہی دینے پر متفق نہیں ہیں جس کی کچھ جزوی وجہ نفسیاتی اور کچھ جزوی وجہ فعلیاتی ہے۔''

(۴) ''ہم ایک بار پھر یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ عورت اپنے جذبات سے متاثر ہوئے بغیر معروضی اور غیر جانبدارانہ طور پر فیصلہ کرنے کی حیثیت میں نہیں ہوتی۔'' (Bauer)

(۵) ''عدل وانصاف کی عدالت میں مَردوں کی نسبت خواتین جھوٹی گواہی دینے کے جرم میں زیادہ ملوّث پائی گئی ہیں۔ دراصل یہ سوال بالعموم کیا جاتا ہے کہ آیا اُنہیں قسم اٹھانے کی اجازت دی جانی چاہیے یا نہیں۔'' (Schopenhauer)

(۶) ''Lombrooso اور Ferrero خواتین میں فریب کاری کو عضویاتی سمجھتے ہیں۔''

نوٹ: مزید تفصیل انسائیکلو پیڈیا ہذا کی جلد ۲۳ میں Feminism کے عنوان کے تحت ملاحظہ کی جائے۔

(IV) جھوٹے اور فاسق کی گواہی قابلِ قبول نہیں: کیونکہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔
وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ O (النور: ۴)

''اور جولوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں اور پھر چار گواہ نہ لاسکیں تو اُنہیں اَسّی دِرّے لگاؤ اور کبھی اُن کی کوئی گواہی قبول نہ کرو اور یہی لوگ تو فاسق ہیں۔'' (۴ : ۲۴)

(V) دشمن کے لئے بھی سچی گواہی : اسلام کے قائم کردہ اعلیٰ ترین اخلاقی ضابطے پر سردُھننے کو جی چاہتا ہے:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا (المائدة : ۸)

''کسی گروہ کی دشمنی تمہیں اتنا مشتعل نہ کردے کہ انصاف سے پھر جاؤ' انصاف کیا کرو۔'' (۸ : ۵)

(VI) کسی بھی فریق کی امارت یا غربت گواہی کی صداقت پر اثر انداز نہ ہونے پائے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِالْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا○ (النسآء : ۱۳۵)

''اے ایمان والو! انصاف پر خوب قائم رہنے والے اور اللہ کے لئے گواہی دینے والے رہو' چاہے وہ تمہارے یا (تمہارے) والدین اور قرابت داروں کے خلاف ہی ہو' وہ امیر ہو یا مفلس اللہ (بہرحال) دونوں سے زیادہ حق دار ہے' تو خواہشِ نفس کی پیروی نہ کرنا کہ حق سے ہٹ جاؤ اگر تم کجی کروگے یا پہلو تہی کروگے تو جو کچھ تم کر رہے ہو' اللہ اُس سے خوب باخبر ہے۔'' (۱۳۵ : ۴)

(VII) کاتب اور گواہ کو نقصان پہنچانا ناجائز ہے: اس سلسلہ میں سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۸۲ میں حکم ہوا :

وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ

''اور کسی کاتب اور گواہ کو نقصان نہ پہنچایا جائے اور اگر تم نے (ایسا) کیا تو یہ تمہارے حق میں گناہ شمار ہوگا اور اللہ سے ڈرتے رہو۔'' (۲۸۲ : ۲)

وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ'' (کاتب کو نقصان پہنچانا) مثلاً یہ کہ اُسے بلا اُجرت کتابت پر مجبور کیا جائے یا یہ کہ اُسے معاہدہ میں کمی بیشی کرنے پر مجبور کیا جائے وغیرہ۔ وَلَا شَهِيْدٌ'' (گواہ کو تکلیف میں ڈالنا) مثلاً یہ کہ باوجود احتیاج اُسے آمدورفت کا خرچ بھی نہ دیا جائے وغیرہ۔

(VIII) گواہی سے انکار کرنا : بعض اوقات گواہ عدالت میں گواہی دینے کے بعد اپنی گواہی سے منحرف ہو جاتا ہے یا تو اِس وجہ سے کہ اُس نے گواہی میں کوئی غلطی کی ہے' یا یہ کہ اُس نے ارادتاً جھوٹی گواہی دی ہے اور اُس کے بعد وہ اپنی غلطی اور جھوٹ کو محسوس کرتا ہے۔ ایسی صورت میں فقہائے کرام نے اُس کے لئے سچی گواہی دینے کی راہ کھول دی ہے کہ وہ عدالت میں اپنی سابقہ گواہی کے فسخ کرنے کا بیان دے دے۔

ایسا ہی ایک واقعہ سیدنا علی کرّم اللہ وجہہٗ کے دَورِ خلافت میں واقع ہوا جب ایک چور آپ کے پاس لایا

گیا اور دو گواہوں نے یہ گواہی دی کہ اُنہوں نے اُسے چوری کرتے دیکھا ہے۔ لہٰذا ملزم کا ہاتھ قانون کے مطابق بطورِ سزا کاٹ دیا گیا۔ کچھ دنوں بعد اُنہی دو آدمیوں نے جنابِ علی کرّم اللہ وجھہ' کے پاس ایک اور آدمی کو اُس پر چوری کا الزام لگاتے ہوئے پیش کیا اور اُن کے ساتھ وہی سابقہ دو گواہ تھے۔ اُنہوں نے جنابِ علی کرّم اللہ وجھہ' سے کہا کہ اصل چور یہ ہے' ہم نے پہلے سزا دیئے گئے شخص کو اُس کی شکل کی مشابہت کی وجہ سے چور سمجھا تھا جبکہ وہ چور نہیں تھا۔ لہٰذا براہِ کرم اب اِس آدمی کو سزا دیجئے۔ جنابِ علی کرّم اللہ وجھہ' نے اُن دونوں گواہوں کو گرفتار کرلیا اور فرمایا کہ اب میں تمہاری شہادت کو قبول نہیں کرتا' اب تمہیں اُس بے گناہ آدمی کا ہاتھ کاٹے جانے پر دیت ادا کرنا ہوگی۔ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ تم نے ایسا قصداً اور ارادتاً کیا ہے تو میں تمہارے ہاتھ کٹوا دیتا۔ (''المبسوط'' ــ ــ شمس الائمہ سرخسی ؛ ''المُغنی'' لابن قدامہ)

جھوٹ بولنا مسلمان کی شان کے لائق نہیں ہے۔ اگر کسی وجہ سے اُس سے ایسی خطا ہوگئی ہو تو اُسے پہلی (جھوٹی) گواہی کو بدل کر سچی گواہی دے دینی چاہئے اور فوری طور پر توبہ کر کے رب تعالیٰ سے بخشش کی دعا کرنی چاہئے۔ (''المبسوط'')

سچی گواہی کی طرف رجوع کرنا اُسی صورت میں معتبر ہوگا کہ گواہی وہاں دی جائے جہاں فیصلے صادر ہوتے ہیں (یعنی عدالت میں)۔ سچی گواہی کی طرف رجوع کرنے کے وقت کے بارے میں فقہاء کی رائے یہ ہے کہ (۱) اگر تو رجوع فیصلہ کے اعلان ہونے سے پہلے ہوا تو قاضی اُس کی گواہی کو منسوخ کردے گا اور اُس کی نئی گواہی قبول نہیں کرے گا۔ (۲) اگر رجوع فیصلہ کے اعلان اور اُس کے نفاذ کے بعد ہوا تو اس میں دو ممکنہ صورتیں ہیں: (الف) اگر فیصلہ حدود جرم اور قصاص کا ہے تو سزا ساقط ہوجائے گی کیونکہ حدود کے جرم شک وشبہ کی وجہ سے اِس فرمانِ نبوی کی رُو سے زائل ہوجاتے ہیں:۔

اِدرَأُ الْحُدُوْدَ بِالشُّبُهَاتِ (''فتح الباری'' لحافظ ابنِ حجر عسقلانی' مکتبۃ الازہر قاہرہ)

''شک وشبہ کی صورت میں حدود جرائم کو حذف کردو۔''

اور اس سلسلہ میں قرآنِ حکیم کا یہ فرمان ہے :

یٰاَیُّھَاالَّذِیْنَ آمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَتَبَیَّنُوا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰی اِلَیْکُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا (اَلنِّسَاء : ۹۴)

''مؤمنو! جب تم اللہ کی راہ میں سفر کرو تو خوب تحقیق کرلیا کرو اور جو تمہیں سلام کرے' اُسے یہ مت کہہ دیا کرو کہ تو مسلمان نہیں ہے۔'' (۴: ۹۴)

مندرجہ بالا آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک صحابی نے ایک کافر کو قتل کرنے کے لئے اُس کا تعاقب کیا۔ بھاگنے والے شخص نے کوئی اور راہ نہ پاتے ہوئے کلمہ طیّبہ پڑھ کر اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیا۔ لیکن تعاقب کرنے والے نے جلدی سے اُسے قتل کردیا یہ سمجھتے ہوئے کہ مقتول نے موت سے بچنے کے لئے کلمہ پڑھا ہے۔ اُس

موقع پر آیتِ بالا کا نزول ہوا کہ شک کا فائدہ (Benefit of Doubt) مقتول کو ملنا چاہئے تھا تا کہ وہ موت کی سزا سے بچ جاتا۔

ڈاکٹر لیاقت علی خان اِس شک کے فائدہ (Benefit of Doubt) کے متعلق لکھتے ہیں:

''حد کے جرم کو استعمال کرنے میں قاضی کو بہت محتاط رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ مروّجہ قانون کے خلاف اگر کوئی کمزور سا نکتہ بھی موجود ہو جو کسی مخصوص عمل کو حد کی سزا دیے جانے کا اعلان کرتا ہو تو اُسے شک وشبہ کے طور پر لیا جائے جو ایسی (موت کی) سزا سے بچانے کے لئے کافی ہو' اس کے باوجود کہ ملزم خود اُس نکتے میں کسی شک وشبہ کو نہیں لا رہا۔'' ("Islamic Law of Tort", p. 9).

(ب) اگر فیصلہ نکاح و طلاق اور مالی معاملات سے متعلق ہو تو فیصلہ کو برقرار رکھا جائے گا اور گواہ کو سچی گواہی کی طرف رجوع کرنے میں تاخیر پر جرمانہ ادا کرنا ہوگا (ایضاً)۔ (ج) اگر سچی گواہی کی طرف رجوع فیصلہ کے نفاذ کے بعد ہو تو یہ بے اثر ہوگا کیونکہ ممکن ہے کہ اُس کا رجوع درست ہو اور اُس کی گواہی غلط ہو یا یہ کہ اُس کا رجوع غلط ہو اور گواہی سچی ہو اور اِن دونوں صورتوں کا صادر شدہ فیصلے پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ تاہم گواہ کو عدالت کی طرف سے سزا دی جائے گی۔

(IX) اعترافِ جرم مجرم کو سزا سے بَری نہیں کرے گا: تقاضائے انصاف (Poetic Justice) کے قدرتی قانون کے تحت جرم کا اعتراف کرنے والے مجرم کو قانون کے تحت سزا دی جائے گی اور وہ سزا سے بچ نہیں سکے گا جیسا کہ سورۃ المُلك میں ارشادِ باری تعالیٰ ہوا:

فَاعۡتَرَفُوۡا بِذَنۡبِهِمۡ فَسُحۡقًا لِّاَصۡحٰبِ السَّعِیۡرِO (اَلْمُلك: ۱۱)

''وہ اپنے جرم کا اقرار کریں گے' تو لعنت ہے اہلِ دوزخ پر۔'' (۱۱: ۶۷)

یہی مضمون سورۃ المؤمن (۴۰) کی آیات ۴۹' ۵۰ میں بھی بیان ہوا۔

قَسم (OATH): اسلامی قانون میں کسی جرم یا حق کے ثابت کرنے کا ایک ذریعہ قاضی (جج) یا بااختیار شخص کے روبرو قسم اُٹھانا یا اُس کا انکار کرنا ہے۔ قسم کے لئے ''قسم' یمین'' اور ''حلف'' کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں جس کا مطلب اللہ کے نام یا اُس کی صفات پر یہ سنجیدہ اور باوقار اعلان کرنا ہے کہ حلف اُٹھانے والے کا بیان حق وصداقت کا ہے۔ (Encyclopedia of Islam ... E. Von Donzel, Lewis B. Pellat, I, 687, quoted by Anwarullah in his "Islamic Law of Evidence", p. 74)

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشادِ گرامی ہے:

اَلْبَیِّنَۃُ عَلَی الْمُدَّعِیْ وَالْیَمِیْنُ عَلٰی مَا اَنْکَرَ (سنن ابن ماجہ اردو ترجمہ، جلد اوّل، صفحہ ۴۳)
''ثبوت کا مہیا کرنا مدّعی کے ذمّے ہے اور قسم اُٹھانا انکار کرنے والے پر ہے۔''

''اگر مدّعی کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکا تو مدّعا علیہ قسم اٹھائے گا اور اگر وہ قسم اٹھالے تو فیصلہ اُس (مدّعا علیہ) کے حق میں کر دیا جائے گا۔ اگر وہ قسم اٹھانے سے انکار کرے تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مدّعی کو قسم اٹھانے کا کہا جائے گا۔ اگر وہ قسم اٹھالے تو ''حد'' اور ''قصاص'' کے علاوہ مدّعا علیہ کے خلاف دعویٰ ثابت ہو جائے گا۔'' (''اسلامک لاء آف ایوی ڈینس''۔ ڈاکٹر انوار اللہ، صفحہ ۴۷)

قسم اٹھانے کا بیان سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۲۵، سورۃ المائدۃ کی آیات ۸۹، ۱۰۶، ۱۰۷ اور سورۃ النور کی آیات ۶ تا ۹ میں ہے۔

کچھ فقہاء کے نزدیک قسم درج ذیل لوگ اُٹھائیں گے:۔
(۱) مدّعی یا مدّعا علیہ (۲) ملزم (مدّعا علیہ) (۳) گواہ۔

مدّعی مندرجہ ذیل صورتوں میں قسم اٹھائے گا:

(۱) جب کسی شخص نے کسی دوسرے شخص پر اپنی جائداد کے چوری کرنے کا الزام لگایا اور ملزم نے اُس الزام کا انکار کر دیا اور قسم اٹھالی کہ اُس نے اُس کی چوری نہیں کی۔ لیکن بعد میں مسروقہ جائداد ملزم کے ہاں مل گئی تو مدّعی کو حلف اٹھانے کو کہا جائے گا اور اگر وہ حلف اٹھالے تو جائداد اُسے بحال کر دی جائے گی۔

(۲) جب ملزم حلف اٹھانے سے انکار کر دے اور معاملہ چوری، قذف (کسی پر تہمت لگانے) وغیرہ جیسے حقوق العباد سے متعلق ہو تو مدّعی کو اپنے حق کی بازیابی کے لئے حلف اٹھانے کو کہا جائے گا۔

(۳) جب حدود اور قصاص کے مقدمات کے علاوہ مدّعی کے دعویٰ کی تائید میں ایک گواہ ہو تو اُسے حلف اٹھانے کو کہا جائے گا۔ یہ بات ایک حدیثِ نبوی کی بنیاد پر ہے کہ آپ ﷺ نے ایک گواہی کی بنیاد پر اور مدّعی کی گواہی پر فیصلہ صادر فرمایا۔

(۴) جب خاوند اپنی بیوی پر بدکاری کا الزام لگائے تو دونوں کو چار مرتبہ حلف اٹھانے کا کہا جائے گا (بحوالہ سورۃ النور: آیت ۶)۔

(۵) ''حدود'' کے مقدمہ میں حلف اٹھانے کی ضرورت نہیں سوائے چوری کے مقدمہ کے جس میں مسروقہ

جائداد سے متعلق فیصلہ کرنے میں ملزم کی جانب سے انکار کی صورت میں حلف اٹھانے کی ضرورت ہوگی۔ (احمد فتحی بہناسی' صفحہ ۲۱۳-۲۱۹ بحوالہ ڈاکٹر انوار اللہ' صفحات ۷۴' ۷۵)

جہاں تک ملزم یا مدعا علیہ کی جانب سے حلف اٹھانے کا تعلق ہے تو اُس کی بنیاد وہ حدیثِ نبوی ہے جس کا حوالہ گزشتہ صفحہ کے آغاز میں دیا جاچکا ہے۔

''سب فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر ملزم حدود کے مقدمہ میں حلف اٹھانے سے انکار کرے تو فیصلہ اُس کے خلاف نہیں کیا جائے گا' سوائے چوری کے مقدمہ کے جس میں اگر ملزم حلف اٹھانے سے انکار کرے اور کوئی گواہی بھی موجود نہ ہو تو مسروقہ جائداد کا اُسے ذمہ دار ٹھہرایا جائے گا اور اُس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ تاہم فقہاء قصاص' دیت اور تعزیر کے مقدمات میں مختلف الرائے ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اگر ملزم زخمی کرنے کے مقدمہ میں حلف اٹھانے سے انکاری ہو تو اُسے قصاص یا تعزیر کی سزا دی جائے گی۔'' (المغنی لابنِ قدامہ بحوالہ ڈاکٹر انوار اللہ' صفحات ۷۵'۷۶)

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حدود اور قصاص کے مقدمات کے علاوہ فیصلے کی بنیاد مدّعا علیہ یا ملزم کی جانب سے حلف اٹھانے سے انکار کی بنیاد پر ہوگا نہ کہ مدّعی کی جانب سے انکار کی صورت میں۔ مدّعی سے کسی بھی صورت میں حلف نہیں لیا جائے گا۔

''اللہ تعالیٰ نے غیر مسلم گواہ سے حلف اٹھانے کا کہا ہے جب وہ سفر کے دوران کسی مسلمان کی وصیت کی تصدیق کرے۔ لہٰذا مسلمان کسی دیوانی یا فوجداری مقدمہ میں حلف اٹھانے کے بہ طریقِ اَولیٰ مکلّف ہیں۔''

''ایک غیر مسلم کو اپنے مذہب اور عقیدے کے مطابق حلف اُٹھانے کی اجازت ہے۔'' (ڈاکٹر انوار اللہ)

عدل وانصاف کا آفاقی راہنما اصول ---دو انتہائی خوبصورت احکام

تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (المائدة : ۲)
''نیکی اور خدا خوفی کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کیا کرو اور گناہ اور زیادتی کے کاموں میں تعاون نہ کیا کرو۔'' (۲ : ۵)

قرآنِ حکیم نے دیوانی معاملات میں عدل وانصاف کی تقسیم کاری کے لئے بنیادی اہمیت کے کچھ مخصوص اصول بتائے ہیں جو درج ذیل ہیں :

(۱) وَلَا تَاْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (البقرة : ۱۸۸)
''اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طور پر مت کھاؤ اُڑاؤ۔'' (۱۸۸ : ۲)

(۲) وَلَا تَکْتُمُوا الشَّهَادَةَ (البقرۃ: ۲۸۳)
''اور گواہی کو چھپایا نہیں کرو۔'' (۲۸۳ : ۲)

(۳) وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ (النّساء: ۳۲)
''اور ایسے امر کی تمنا مت کیا کرو جس میں اللہ نے تم میں سے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی ہے۔''

(۴) وَلَا تَعْتَدُوْا (المائدۃ: ۸۷)
''اور حد سے آگے نہ نکلا کرو۔'' (۸۷ : ۵)

(۵) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (الانفال)
''مومنو! اللہ اور اُس کے رسول کی خیانت نہ کرو اور نہ اپنی امانتوں میں خیانت کرو حالانکہ تم جانتے ہو۔''

(۶) وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ (هود: ۸۵)
''اور لوگوں کا اُن کی چیزوں میں نقصان مت کرو۔'' (۸۵ : ۱۱)

(۷) وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا ۝ (بنی اسرائیل: ۳۴)
''اور عہد کی پابندی رکھو' بے شک عہد کی باز پرس ہوگی۔'' (۳۴ : ۱۷)

(۸) وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ (بنی اسرائیل: ۳۵)
''اور جب ناپو تو ناپ پوری پوری رکھا کرو اور وزن بھی صحیح ترازو سے کیا کرو۔'' (۳۵ : ۱۷)

(۹) وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝ (المطففین: ۱)
''(ناپ تول میں) کمی کرنے والوں کے لئے بڑی خرابی ہے۔'' (۱ : ۸۳)

دنیا کے تقریباً تمام ممالک میں اِن اصولوں کی متعلقہ قوانین میں تشکیل کی گئی ہے یا یہ کہ یہ اصول متعلقہ مقدمات میں فیصلوں کی بنیاد کا کام دیتے ہیں۔

اُن معاہدوں کی بابت جن کا تعلق مستقبل کی فرضیت سے ہو' قرآنِ حکیم بالخصوص یہ حکم دیتا ہے کہ اِن معاہدوں کو کم از کم دو گواہوں کی موجودگی میں ضبطِ تحریر میں لایا جائے۔ ایسی تحریر میں احتیاط کا پہلو یہ ہے کہ فریقین کے جائز مفادات بالخصوص اُس شخص کے مفادات کو جس پر معاہدہ کے تحت ذمہ داری بنتی ہو' مکمل تحفظ دیا گیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ۚ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۚ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْــــًٔا ۭ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ ھُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ۭ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاۗءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىھُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ۭ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَاۗءُ اِذَا مَا دُعُوْا ۭ وَلَا تَسْــَٔـــمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ۭ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا (البقرۃ: ۲۸۲)

''اے ایمان والو! جب تم اُدھار کا معاملہ کسی مقررہ مدت تک کرنے لگو تو اُسے لکھ لیا کرو اور لازم ہے کہ تمہارے درمیان لکھنے والا ٹھیک ٹھیک لکھے اور لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ کرے جیسا کہ اللہ نے اُسے سکھایا ہے پس چاہئے کہ وہ لکھ دے۔ اور چاہئے کہ وہ شخص لکھوائے جس کے ذمہ حق واجب ہے اور چاہئے کہ وہ اپنے پروردگار سے ڈرتا رہے اور اس میں سے کچھ بھی کم نہ کرے۔ پھر اگر جس کے ذمہ حق واجب ہے' عقل کا کوتاہ ہو یا یہ کہ کمزور ہو تو لازم ہے کہ اُس کا کارکن ٹھیک ٹھیک لکھوا دے۔ اور اپنے مَردوں میں دو کو گواہ کرلیا کرو' پھر اگر دونوں مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں اُن گواہوں میں سے ہوں جنہیں تم پسند کرتے ہو تاکہ اُن دو عورتوں میں سے ایک دوسری کو یاد دلا دے اگر کوئی اُن دو میں سے بھول جائے۔ اور جب گواہ بلائے جائیں تو انکار نہ کریں۔ اور اُس (معاملت) کو خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی' اُس کی میعاد تک لکھنے سے اُکتا نہ جاؤ۔ یہ کتابت اللہ کے نزدیک زیادہ سے زیادہ قرینِ عدل ہے اور شہادت کو درست تر رکھنے والی ہے اور اس کی زیادہ سزاوار ہے کہ تم شک میں نہ پڑو۔'' (۲:۲۸۲)

<u>وکلاء صاحبان</u>: وکلاء صاحبان کا بنیادی کام انصاف کے استحکام میں عدالت کی معاونت کرنا اور اس بات کی یقین دہانی ہونا ہے کہ کوئی بھی مجرم سزا سے بچنے نہ پائے اور کوئی بے گناہ سزا نہ پائے۔ ایک اسلامی ریاست میں وکیل کسی بھی شخص کی خواہ وہ بے گناہ ہو یا مجرم ہو' وکالت کرنے کے لئے آزاد ہوتا ہے۔ حکمِ الٰہی کی نافرمانی میں وہ اپنی پیشہ ورانہ مہارت کو اپنے مؤکل کو بچانے میں انتہائی حد تک استعمال میں لاتا ہے اگرچہ مؤکل مجرم ہی کیوں نہ ہو۔ یہ بات صریحًا انصاف سے متصادم ہے جبکہ اُسے یہ معلوم ہو کہ اُس کا مؤکل یقینًا قصوروار ہے تو پھر بھی وہ اُسے سزا سے بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ مجرم کی معاونت اور وکالت کرنے کی قرآنی تنبیہ وتہدید درج ذیل ہے:

(۱) مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا وَ مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا (اَلنِّسَآء: ۸۵)

''جو بھلائی کی سفارش کرے گا وہ اس میں سے حصّہ پائے گا اور جو برائی کی سفارش کرے گا وہ اس میں سے حصّہ پائے گا۔'' (۴ : ۸۵)

(۲) وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا ○ (اَلنِّساء: ۱۰۵)

''اور اِن خیانت کاروں کے طرفدار نہ ہو جایئے۔'' (۴ : ۱۰۵)

(۳) وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا ○ (اَلنِّساء)

''اور اُن لوگوں کی طرف سے وکالت نہ کیجئے جو اپنے حق میں خیانت کرتے رہے ہیں' اللہ کسی ایسے شخص کو نہیں چاہتا جو بڑا خیانت کار' گنہگار ہو۔'' (۴:۱۰۷)

(۴) تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (المائدۃ: ۲)

''نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کیا کرو اور گناہ اور زیادتی کے کاموں میں تعاون نہ کیا کرو''

(۵) وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ (هُود: ۱۱۳)

''اور اُن لوگوں کی طرف مت جھکو جو (اپنے حق میں) ظالم ہیں ورنہ تمہیں بھی دوزخ کی آگ چھو جائے گی۔''

(۱۰۹) جمعۃ المبارک ۔ فضائل و مسائل

لفظ "جمعہ" کا مادہ ج' م' ع (جمع) ہے جس کا معنیٰ ایک جگہ جمع ہونا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے:
تَجَمَّعَ الْقَوْمُ (قوم اِدھر اُدھر سے آ کر ایک جگہ جمع ہو گئی)۔ سورۃ النور میں ہے:
وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰۤى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ (آیت : ۶۱)
"اور جب رسول کے پاس (کسی ایسے) کام پر ہوتے ہیں جس کے لئے مجمع کیا گیا ہے
تو جب تک رسول سے اجازت نہیں لے لیتے' جاتے نہیں۔ (۶۱ : ۲۴)

اَمْرٍ جَامِعٍ کے معنیٰ اہم مشورت کے بھی ہیں جس میں اہتمام و اجتماع کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ معنیٰ بھی کئے گئے ہیں کہ جس معاملہ میں خطاب عام (پبلک اسپیچ) کی ضرورت پڑے (تفسیر کبیر)۔

امام سہیلی نے اَلرَّوْضُ الانف میں فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کے جدّ اعلیٰ کعب بن لوی رضی اللہ عنہ پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے یوم عروبہ (جمعہ) میں لوگوں کو جمع کیا۔ "عروبہ" کو "جمعہ" کا نام اسلام نے دیا۔ سیدنا کعب بن لوی قریش کو خطاب فرماتے اور انہیں رسول اللہ ﷺ کی آمد و بعثت کے تذکرے سناتے اور انہیں بتاتے کہ حضور علیہ السلام میری اولاد میں سے ہوں گے اور لوگوں کو آپ ﷺ کی اتباع اور آپ پر ایمان لانے کا حکم دیتے اور اس محفل میں اشعار پڑھتے جن میں ایک یہ بھی ہے:

يَا لَيْتَنِىْ شَاهِدٌ فَحْوَاءَ دَعْوَتِه   اِذَا قُرَيْشٌ تَبْغِى الْحَقَّ خِذْلَانًا

("الروض الانف" لامام الفقیہ المحدث ابوالقاسم عبدالرحمٰن بن عبداللہ السہیلی (۵۰۸۔۵۸۱)؛ شرح سیرۃ ابن ہشام' جلد اوّل' صفحہ ۶ طبع لاہور)

"کاش میں (محمد ﷺ) کی دعوت کے وقت موجود ہوتا جب قریش حق کو ذلیل کرنے کے درپے ہوں گے۔"

ثعلب سے یہ بھی مروی ہے کہ جمعہ کا نام جمعہ اس لئے پڑ گیا کہ قریش جناب سیّدنا قصی کے پاس دارالندوۃ میں جمع ہوتے تھے۔ بعض نے کہا جمعہ کا نام اس لئے رکھا گیا ہے کہ لوگ مسجد میں جمع ہوتے ہیں۔

قرآن حکیم کی روشنی میں فضائل جمعہ : سورۃ الجمعہ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِىَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِى الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○ (الجُمُعة : ۹' ۱۰)

"اے ایمان والو! جمعہ کے دن جب نماز کی اذان ہو تو اللہ کے ذکر کی طرف چل پڑا کرو اور خرید و فروخت چھوڑ دیا کرو وہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم کچھ سمجھ رکھتے ہو۔ پھر جب نماز ہو چکے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل (رزق) تلاش کرو اور اللہ کو بہت یاد کرو اس امید پر کہ فلاح پا جاؤ۔" (۹' ۱۰ : ۶۲)

فقہاء نے لکھا ہے کہ اصل مقصود وقتِ نماز کا آجانا ہے ۔ جب وقت آجائے تو ہر مسلمان جس پر نمازِ جمعہ واجب ہے' اُس کے لئے تیاری واجب ہو جاتی ہے ۔ یہ ضروری نہیں کہ اذان کی آواز ہی کان میں پڑنے پر تیاری شروع ہو ۔ نُوْدِیَ سے مراد جمعہ کی اذان ہے اور احناف کے نزدیک یہ پہلی اذان ہے جو خطبہ سے کچھ دیر پہلے دی جاتی ہے ۔ اِسْعَوْا کا معنیٰ دوڑنا بھاگنا نہیں ہے کیونکہ ختمی مرتبت آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھاگ کر نماز میں شرکت کرنے سے منع فرمایا ہے اور سکون و وقار کی تعلیم دی ہے ۔ اس لئے علماء نے سَعِیْ کا معنی یہ کیا ہے کہ ارادہ کرلو اور وہاں جانے کی تیاری شروع کردو ۔

صرف خرید و فروخت کو ختم کرنے یا بند کرنے کا حکم نہیں بلکہ تمام وہ مشاغل جو جمعہ کی حاضری میں رکاوٹ بنیں' تمام کو ترک کرنا ضروری ہے اور خرید و فروخت کا خصوصی ذکر اس لئے ہوا کہ جمعہ کے دن لوگ باہر سے آتے اور بیچنے کے لئے اپنا سامان بھی لاتے اور شہر سے اپنی ضروریات خرید کر بھی لے جاتے ۔ ملحقہ بستیوں کے لوگوں کے آنے کی وجہ سے جمعہ کے دن بڑی چہل پہل ہو جاتی اور خرید و فروخت کا بازار خوب گرم ہو جاتا ۔ اس لئے خصوصیت سے خرید و فروخت کی بندش کا حکم فرمایا گیا ۔

ارشاد ہے کہ جب نمازِ جمعہ سے فارغ ہو جاؤ تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو ۔ یہ حکم وجوب کے لئے نہیں بلکہ اباحت کے لئے ہے کیونکہ جمعہ کی اذان کے بعد کاروبار سے منع کیا گیا تھا ۔ اب اس کی اجازت دی جا رہی ہے اور کئی سلفِ صالحین کا یہ معمول تھا کہ وہ نمازِ جمعہ سے فارغ ہونے کے بعد اِس حکم کی تعمیل میں بازار کا چکر لگاتے تا کہ اِس حکم کی تعمیل ہو جائے ۔

<u>چند مسائل</u> : نمازِ جمعہ فرضِ عین ہے ۔ اس کی فرضیت کتاب و سنت اور اجماعِ امت سے ثابت ہے اور اس کا انکار کفر ہے ۔ قرآن کریم کی محولہ بالا آیات جمعہ کی فرضیت کی محکم دلیل ہے ۔ سعی کا حکم اور خرید و فروخت کو چھوڑ دینے کا حکم اُس کی فرضیت پر واضح دلالت کرتے ہیں ۔

جن لوگوں پر جمعہ فرض نہیں ہے وہ اگر ادا کریں گے تو ہو جائے گا ۔ نابینا شخص جسے پکڑ کر مسجد تک لے جانے والا کوئی نہ ہو' اُس کا شمار بھی بیماروں میں ہے اور اُس پر جمعہ فرض نہیں ۔ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ صحرا میں جمعہ جائز نہیں اور جمعہ کے لئے جماعت شرط ہے ۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مصر جامع کے بغیر جمعہ صحیح نہیں اور مصر جامع کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ وہ شہر ہے جس میں گلی کوچے ہوں' بازار ہوں' اُس کے ساتھ چھوٹی چھوٹی آبادیاں ہوں ۔ وہاں ایک والی ہو جو ظالم سے مظلوم کی دادرسی کرے یا وہاں ایسا عالم ہو جو ضرورت کے وقت اس کی طرف رجوع کیا جاسکے ۔ بعضوں نے مصر کی یہ تعریف کی ہے کہ وہاں کی ساری آبادی وہاں کی مسجد میں نہ سما سکے ۔

انعقادِ جمعہ کے لئے خطبہ شرط ہے جس کے بغیر جمعہ نہیں ہو سکتا ۔ خطبہ میں پانچ چیزوں کا ہونا ضروری ہے: حمدِ باری تعالیٰ' درود و سلام' تقویٰ کی وصیت' قرأتِ قرآن اور اہلِ ایمان کے لئے دعا ۔ خطبہ میں نبی کریم ﷺ

کا ذکر' خلفائے راشدین کا ذکر سب ذکرِ الٰہی میں داخل ہیں لیکن اس میں ظالم بادشاہوں یا اُمراء کا ذکر' اُن کے القاب' اُن کی ثنا اور اُن کی مدح کا اللہ کے ذکر کے ساتھ دُور کا بھی واسطہ نہیں۔

فضائل جمعہ احادیث مبارکہ کی روشنی میں: (۱) حضرت ابو عمر اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ہم نے نبی کریم ﷺ کو منبر پر بیٹھے ہوئے یہ فرماتے سنا کہ جو لوگ جمعہ ترک کرتے ہیں وہ اس سے ضرور باز آجائیں ورنہ اللہ تعالیٰ اُن کے دلوں پر مہر لگا دے گا اور وہ غافل ہو جائیں گے۔

(۲) حضور ﷺ نے فرمایا: جس نے نمازِ جمعہ کو معمولی اور حقیر سمجھتے ہوئے تین جمعے ترک کر دئے' اللہ تعالیٰ اُس کے دل پر مہر لگا دے گا۔

(۳) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سب سے بہتر دن جس پر سورج چمکا' جمعہ کا دن ہے۔ اِسی دن آدم علیہ السلام کی پیدائش ہوئی' اِسی دن میں وہ جنت میں داخل ہوئے اور اِسی دن وہ وہاں سے نکالے گئے اور قیامت جمعہ کے دن ہی قائم ہوگی۔ (صحیح مسلم)

(۴) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جمعہ کے دن ایک لمحہ ایسا ہے کہ جو مسلمان اُس لمحہ اللہ تعالیٰ سے جو اچھی چیز مانگے' اللہ اُسے وہی دے دیتا ہے۔'' (بخاری' مسلم)

(۵) عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو بھی مسلمان جمعہ کے دن یا جمعہ کی رات فوت ہو' اللہ تعالیٰ اُسے قبر کے فتنہ (عذاب) سے محفوظ رکھتا ہے۔ (احمد' ترمذی)

(۶) حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھ پر جمعہ کے دن بہت زیادہ درود و سلام پڑھا کرو۔ بے شک اس میں شمولیت کے لئے فرشتے حاضر ہوتے ہیں اور کوئی بھی آدمی جب مجھ پر درود و سلام پڑھتا رہتا ہے' اُس کا درود و سلام مجھ پر پیش کیا جاتا ہے یہاں تک کہ اس سے فارغ ہو۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے عرض کی: کیا آپ کی وفات کے بعد بھی؟ فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ نے زمین پر نبیوں کے جسم حرام کر دئے۔ سو اللہ کے نبی زندہ ہیں' اُنہیں رزق دیا جاتا ہے۔'' (ابنِ ماجہ)

(۷) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جمعہ کے دن فرشتے مسجد کے دروازے پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ آنے والوں کے نام نمبر وار لکھتے ہیں۔ دن ڈھلے جو پہلے آئے' اُس کی مثال اُس شخص کی سی ہے جس نے اونٹ کی قربانی دی' پھر جو آئے' اُس کی مثال گائے کی قربانی دینے کی سی ہے' پھر مینڈھا' پھر مرغی' پھر انڈا۔ جب امام مسجد میں آجائے تو فرشتے اپنے صحیفے لپیٹ لیتے ہیں اور ذکر (خطبہ و خطاب) سنتے ہیں۔ (بخاری' مسلم)

(۸) حضرت معاذ بن اَنس جُہنی رضی اللہ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے جمعہ کے دن لوگوں کی گردنیں پھلانگیں' اُس نے جہنم کی طرف پُل بنایا۔'' (ترمذی)

(۹) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جمعہ کے وقت تین قسم کے بندے حاضر ہوتے ہیں: ایک وہ جو حاضر ہو کر بھی بیہودہ باتیں کرتا ہے۔ اُس کے لئے جمعہ کی یہی حصّہ ہے۔ دوسرا وہ بندہ جو دعا کے ساتھ حاضر ہوتا ہے۔ یہ شخص اللہ سے دعا کرتا ہے' وہ چاہے عطا فرمائے' چاہے تو نہ دے۔ تیسرا بندہ وہ ہے جو جمعہ کی نماز میں خاموشی وسکون سے حاضر ہوا۔ کسی مسلمان کی گردن نہ پھلانگی اور نہ کسی کو تکلیف دی۔ یہ حاضری اُس کے لئے آئندہ جمعہ تک اور اُس کے بعد تین دن تک (کُل دس دن) گناہوں کا کفارہ ہوگی۔ فرمانِ خداوندی ہے: مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا (سورۃ الانعام: ۱۶۰) ''جو ایک نیکی کرے' اُسے اُس جیسی دس نیکیاں ملیں گی۔'' (ابوداؤد)

(۱۰) ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے امام کے خطبہ کے وقت بات کی' اُس کی مثال اُس گدھے کی سی ہے جو کتابیں اٹھائے ہوئے ہو اور جو اُسے کہے: خاموش ہو جا' اُس کا جمعہ نہیں۔ (احمد)

(۱۱) ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے بغیر عذرِ شرعی نمازِ جمعہ ادا نہ کی' اُسے اُس کتاب میں منافق لکھا جائے گا' جسے نہ مٹایا جا سکے اور نہ بدلا جا سکے۔ (مشکوٰۃ)

(۱۲) حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اللہ اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتا ہے' اُس پر نمازِ جمعہ فرض ہے ماسوائے مریض' مسافر' عورت' بچہ اور غلام (مملوک) کے۔ جو کھیل یا تجارت کی وجہ سے لاپروائی برتے' اللہ تعالیٰ اُس سے بے پروائی برتے گا اور اللہ بے پروا ستودہ صفات ہے۔ (دارقطنی)

<u>جمعہ روزِ عید ہے</u>: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے سورہ مائدہ کی آیتِ کریمہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ ۔۔۔ الخ پڑھی۔ اُن کے پاس ایک یہودی تھا جو بولا: اگر یہ آیت ہم پر نازل ہوتی تو ہم اُس دن کو عید بنا لیتے۔ جناب عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ آیت جس دن نازل ہوئی' ہمارے اسلام میں اُس دن دو عیدیں تھیں: ایک جمعہ کا دن اور دوسرا نو ذی الحجہ (حج کا دن) (ترمذی)۔

(۱۱۰) فقہِ اسلامی (Jurisprudence)

Jurisprudence ایک لاطینی لفظ ہے جو لفظ Juris (بمعنیٰ قانون) اور Prudence (بمعنیٰ علم) کا مرکب ہے۔ ("A-One Comprehensive General Knowledge" Mirza Muhammad Yusuf, p. 99)

''فقہ'' عربی زبان کا لفظ ہے جو انگریزی کے لفظ Jurisprudence کا مترادف ہے۔ فقہ کا لفظی معنیٰ سمجھ بوجھ اور فہمیدگی کا ہے۔ اردو میں ہم اس لفظ کا ترجمہ ''فہم'' میں کرتے ہیں۔

قرآنی اصطلاح میں ''فقہ'' کا معنیٰ عمومی طریق سے اسلام کی فہم اور سمجھ بوجھ حاصل کرنا ہے۔ اس کا ایک معنیٰ ذو عقل' معقول انسان کے ظاہر و باہر شواہد سے نتیجہ اخذ کرنے کا بھی ہو سکتا ہے۔ قرآنِ مجید نے اس لفظ کو متعدد مقامات پر مؤخر الذکر معنیٰ میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً:

(۱) فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ○ (النِّساء : ۷۸)
''سو اِن لوگوں کو کیا ہوا ہے کہ گویا وہ بات ہی نہیں سمجھتے۔'' (۴: ۷۸)

(۲) لَهُمْ قُلُوْبٌ ''لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا (الاعراف : ۱۷۹)
''اُن کے دل ہیں مگر وہ اُن سے سوچتے سمجھتے نہیں۔'' (۱۷۹ : ۷)

(۳) فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ ''لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ (التوبۃ : ۱۲۲)
''یہ کیوں نہ ہو کہ ہر گروہ میں سے ایک حصہ نکل کھڑا ہوا کرے تاکہ (یہ باقی لوگ) دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرتے رہا کریں۔'' (۱۲۲ : ۹)

یہی معنیٰ درجِ ذیل حدیثِ نبوی کے ہیں:

مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ
''اللہ تعالیٰ جس سے بھلائی کرنا چاہتا ہے' اُسے دین کی سمجھ بوجھ عطا فرما دیتا ہے۔''

قرآنِ حکیم اور سنتِ نبوی اسلامی علم کے دو بنیادی ماخذ ہیں جبکہ دوسرے دو ماخذ اجماعِ امت (جس کے لئے قرآنِ حکیم نے سورۃ النساء کی آیت ۱۱۵ میں سَبِيْلُ الْمُؤْمِنِيْنَ کا لفظ استعمال کیا ہے) اور قیاس ہیں۔

سورۃ النساء کی آیت ۸۳ میں قیاس کا واضح بیان اور اُس کا ثبوت ہے:

وَإِذَا جَآءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوْا بِهٖ وَلَوْ رَدُّوْهُ إِلَى الرَّسُوْلِ وَإِلٰٓى أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ (النِّسآء : ۸۳)
''اور جب اُنہیں امن یا خوف کی کوئی بات پہنچتی ہے تو وہ اُسے پھیلا دیتے ہیں اور اگر وہ لوگ اُسے رسول

کے پاس یا اپنے میں سے صاحبانِ اختیار کے حوالے کر دیتے تو اُن میں سے جو لوگ استنباط کی صلاحیت رکھتے ہیں' اُس کی حقیقت جان لیتے ۔'' (۸۳ : ۴)

مذہبِ اسلام کا براہِ راست علم حاصل کرنے کے لئے قرآنِ حکیم اور سنتِ نبوی کا مطالعہ از بس ضروری ہے ۔ عظیم مسلم علماء وفقہاء نے آئے دن کے پیش آنے والے پیچیدہ مسائل کے اصولوں کا استنباط اِنہی دو ذرائع سے کیا ہے ۔ اِن اصولوں کے مجموعہ کو ''فقہِ اسلامی'' کا نام دیا جاتا ہے اور ایسے اصولوں کے مؤلفین کو ''فقہاء'' کہا جاتا ہے ۔ اسلام کو سمجھنے کے لئے نبیِ اکرم ﷺ نے مسلمانوں کو علمِ حدیث حاصل کرنے کی بھی ترغیب دی ہے اور آپ نے علمِ حدیث حاصل کرنے والے کو تبرک کے الفاظ کے ساتھ اِس طرح دعا بھی دی ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس شخص کا چہرہ روشن کرے جو آپ ﷺ سے کوئی چیز سن کر اُسے دوسروں تک پہنچاتا ہے ۔ قرآنِ حکیم میں کئی مقامات پر علمِ فقہ کے بارے میں واضح اشارات موجود ہیں ۔ مثلاً فرمایا :۔

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّفْقَهُوْنَ○ (الانعام : ۹۸)

''ہم نے دلائل خوب کھول کر اُن لوگوں کے لئے بیان کر دئے ہیں جو سمجھ رکھتے ہیں ۔'' (۹۸ : ۶)

اسلام نے مسلم اُمّت کے لئے جہاد کو لازم قرار دیا ہے لیکن اس صورت میں بھی کچھ مسلمانوں کو مذہبی تعلیم کے حصول کے لئے مجاہدین سے پیچھے رہنے کا حکم دیا گیا جیسا کہ درجِ ذیل آیات سے ثابت ہے :

(۱) فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ ''لِّیَتَفَقَّهُوْا فِی الدِّیْنِ (التوبة : ۱۲۲)
''یہ کیوں نہ ہو کہ ہر گروہ میں سے ایک حصہ نکل کھڑا ہوا کرے تا کہ (یہ باقی لوگ) دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرتے رہا کریں ۔'' (۱۲۲ : ۹)

(۲) ثُمَّ انْصَرَفُوْا صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ ''لَّا یَفْقَهُوْنَ○ (التوبة:۱۲۷)
''پھر وہ چل دیتے ہیں' اللہ نے اُن کا دل ہی پھیر دیا ہے اِس وجہ سے کہ وہ سمجھ سے کام نہ لینے والے لوگ ہیں ۔'' (۱۲۷ : ۹)

معلوم ہوا کہ ''فقہ'' سمجھ بوجھ اور فہم کا علم ہے یا یوں کہئے کہ شریعت کو سمجھنے کا نام ''فقہ'' ہے ۔ مختلف زمانوں میں پیش نہادہ مسائل جن کا اشارہ نہ تو قرآن مجید میں ہے اور نہ ہی حدیث میں' کا استنباط قرآن مجید اور سنتِ نبوی کی روشنی میں کیا جاتا ہے☆ ۔ فقہِ اسلامی کے مندرجہ ذیل چار مکاتبِ فکر ہیں ۔ قرآن اور سنتِ نبوی کو سمجھنے سمجھانے اور واضح کرنے میں اُن کے بانیوں کی خدمات مستحسن ہیں :۔

(۱) حنفی مکتبِ فکر : جس کے بانی نعمان بن ثابت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ (۸۰۔۱۵۰ھ) ہیں ۔
(۲) مالکی مکتبِ فکر : جس کے بانی مالک بن اَنس بن مالک بن ابی عامر رحمۃ اللہ علیہ (۸۳۔۱۷۹ھ) ہیں ۔
(۳) شافعی مکتبِ فکر : اس کے بانی ابوعبداللہ محمد بن ادریس شافعی رحمۃ اللہ علیہ (۱۵۰۔۲۰۴ھ) ہیں ۔
(۴) حنبلی مکتبِ فکر : اس کے بانی احمد بن حنبل الشیبانی المروزی رحمۃ اللہ علیہ (۱۶۴۔۲۴۱ھ) ہیں ۔

☆ مثلاً سگریٹ نوشی کے بارے میں شرع کا حکم ۔ بس' ٹرین یا ہوائی جہاز کے سفر کے دوران نماز کیسے پڑھی جائے وغیرہ ۔

''شریعت اور فقہ کے مابین فرق : شریعت اور فقہ کے مابین نمایاں فرق ہے۔ شریعت قرآن مجید میں چودہ صدیوں سے خالصتاً اور تحریف سے بالکل محفوظ ہے لیکن فقہ انسانی دل و دماغ اور حسیات کی پیداوار ہے جو زمان و مکان کی ناقابلِ تجزیہ غیر حقیقی دنیا میں محصور ہے جس کی خیالی فطرت سے مکمل آگہی ہمیں روزِ آخرت کو حاصل ہوگی۔'' ("Islamic Jurisprudence" ... Kemal A. Faruki, p. 18) 1962 Karachi

فقہِ اسلامی کی اہمیت : آئے دن میں پیش آنے والے اُن گنجلک اور پیچیدہ مسائل و معاملات کی گتھیاں سلجھانے میں فقہ نے نمایاں کردار ادا کیا ہے جن کا اشارہ تک نہ تو قرآنِ مجید میں ہے اور نہ ہی سنتِ نبوی میں۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ اِن پیش آمدہ مسائل کا حل ذاتی رائے یا کسی دنیاوی مفاد کے تحت نہیں دیا جاتا بلکہ قرآن و حدیثِ نبوی (سنت) کی روشنی میں کیا جاتا ہے۔ اس لئے فقیہ کے لئے قرآن و حدیث کے علوم کا ماہرِ کامل ہونا اَزبس ضروری ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ (م ۵۰۵ ھ) لکھتے ہیں :

''صحابہ کرام کا اس پر اجماع ہے کہ عام آدمی احکامِ شرعیہ کا مکلّف ہے اور اگر ہر آدمی درجہ اجتہاد کا علم حاصل کرنے کا مکلّف ہو تو زراعت، صنعت و حرفت اور تجارت بلکہ دنیا کے تمام کاروبار معطل ہو جائیں گے کیونکہ ہر شخص مجتہد بننے کے لئے دن رات علم کے حصول میں لگا رہے گا اور نہ کسی کے لئے کچھ کھانے کو ہوگا نہ پہننے کو اور دنیا کا نظام برباد ہو جائے گا اور حرجِ عظیم واقع ہوگا جو بداہتاً باطل ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ عام آدمی درجہ اجتہاد کا مکلّف نہیں ہے۔'' (''المستصفٰی'' جلد ۲، ص ۳۸۹، مطبوعہ مصر بحوالہ ''تبیان القرآن''۔۔۔ علامہ غلام رسول سعیدی، جلد ۵، صفحہ ۲۹۵)

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی اِس تقریر سے واضح ہوا کہ سورہ توبہ:۱۲۲ میں اللہ تعالیٰ نے تفقّہ فی الدّین صرف ایک جماعت پر لازم کیا ہے اور تمام مسلمانوں پر تفقّہ فی الدّین حاصل کرنا لازم نہیں ورنہ وہی حرج لازم آئے گا جس کا امام غزالی نے ذکر کیا ہے۔ تفقّہ فی الدّین میں وسعت اور گہرائی اور گیرائی حاصل کرنا مجتہدین کی ذمہ داری ہے، باقی عام لوگوں پر صرف اُن کی تقلید واجب ہے۔

فقہ کی اہمیت و ضرورت اس واقعہ میں بھی ملتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جب معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا گورنر اور قاضی بن کر بھیجا تو اُن سے پوچھا کہ تم فیصلے کس طرح کرو گے؟ تو اُنہوں نے جواب دیا: کتاب اللہ سے۔ آپ نے پوچھا کہ اگر کتاب اللہ میں نہ پاؤ تو پھر کیا کرو گے؟ عرض کیا: پھر اللہ کے رسول ﷺ کی سنت سے فیصلے کروں گا۔ فرمایا: اگر تمہیں وہ چیز حدیث میں بھی نہ ملے تو پھر کیا کرو گے؟ عرض کیا: میں قرآن و سنت کی روشنی میں اپنی رائے اور اجتہاد سے استنباط کروں گا اور اس میں کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑوں گا یعنی محنت و کوشش سے اس واقعہ کا فیصلہ کتاب و سنت کے اصول و قوانین کے ماتحت کروں گا۔ آنحضرت ﷺ اس جواب پر بہت خوش ہوئے اور فرطِ مسرّت سے جنابِ معاذ کے سینے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا: ''اللہ کا شکر ہے کہ اُس نے اپنے رسول ﷺ کے قاصد کو ایسی بات کی توفیق دی جسے اللہ اور اُس کا رسول پسند کرتا ہے۔''

اجتہاد: ''اجتہاد'' کا مصدر ج۔ہ۔د (جہد) ہے جس کا لفظی معنیٰ ''کوشش'' کا ہے یعنی کسی کام کی تکمیل کے لئے زیادہ سے زیادہ کوشش کرنے کا نام ''جہد'' ہے۔ اصطلاح میں اس کا معنیٰ وہ کوشش ہے جو ایک ''مجتہد'' تاویل کے ذریعے احکامِ الٰہی کو معلوم کرنے میں کرتا ہے۔

''اجتہاد'' اور ''جہاد'' دونوں ہی مصدر ''ج۔ہ۔د'' سے ماخوذ ہیں اور دونوں کا مقصد ایک ہی ہے یعنی تمام مخلوق کو دنیاوی بندھنوں سے آزاد کر کے ایک ہی خالق کا بندہ بنانے' سماج کی تمام بے انصافیوں اور توہمات سے نکال کر اسلام کے قائم کردہ عدل وانصاف کی طرف لانے اور محدود سوچ اور اس مادّی دنیا کی بندشوں سے آزاد کر کے اسلام اور قرآنِ حکیم کے وسیع تر خطِ اُفق کی طرف لانے کی کوشش کا نام ''اجتہاد'' اور ''جہاد'' ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''اجتہاد'' کو اُسی طرح اسلام کے ستونوں میں شمار کیا جاتا ہے جس طرح ''جہاد'' کو۔ ''جہاد'' کے بغیر اُمّت کا وجود نہیں اور ''اجتہاد'' کے بغیر اُمّت کی گرم خیزی اور جان داری (Vitality) نہیں ہے۔ اس طرح ''اجتہاد'' اور ''جہاد'' دونوں اسلامی ضابطہ میں ناگزیر اور مسلسل ذمہ داریوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔'' (The American Journal of Islamic Social Sciences, Vol. X, Summer 1993 : Islamabad)

اجتہاد کی اہمیت وافادیت: دنیا میں حالات بدلتے رہتے ہیں۔ ہر قوم کا مزاج مختلف ہوتا ہے۔ نئی نئی ضرورتیں اور جدید تقاضے بھی پیش آتے رہتے ہیں۔ ہر ہر واقعہ اور پیش آنے والی حاجتوں اور ضرورتوں کی صراحت کر کے قانونی دفعات کا مرتب کرنا نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی مصلحت کے مطابق ہوسکتا ہے۔ اسی وجہ سے کتاب اللہ اور سنتِ رسول ﷺ کے ذریعے امت کو ایسے جامع اصول اور ضوابط مل گئے جن کے ذریعے ہر جدید ضرورت کا حکم اور ہر قوم کی حاجت اور ہر خطہ میں پیش آنے والے مسائل کا حل ہوسکتا ہے۔ بالفرض اگر یہ ہوتا کہ حالات کی تبدیلی اور پیش آنے والے تقاضوں پر ہر قوم یا جماعت اپنی رائے اور غور وفکر کے ذریعے احکام اور قوانین مرتب کرنے لگتی تو دینِ اسلام کی نہ جامعیت باقی رہتی اور نہ اللہ رب العزت کی اس اعلان کی کوئی حقیقت باقی رہتی:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدۃ:۳)

''آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کا اِتمام کر دیا ☆ اور تمہارے لئے اسلام کو دین کے طور پر پسند کر لیا۔'' (۵ : ۳)

بلکہ دینِ اسلام مدّعیانِ عقل وفکر اور اغراض وخواہشات کی ایک جولان گاہ بن جاتا۔ اس وجہ سے یہ تو ممکن ہی نہ تھا کہ ہر دَور میں پیش آنے والے مسائل اور جدید تقاضوں کے لئے جدید سے جدید شریعتیں مرتب کی جاتی رہیں۔ پس طے یہ ہوا کہ شریعت وہی رہے گی جو سرورِ کائنات محمد رّسول اللہ ﷺ لائے ہیں' قرآن وہی رہے گا اور سنتِ رسول

☆ ''دین'' عقائد اور اصول وقواعد کو اور ''مذہب'' فروعی مسائل کو کہا جاتا ہے۔ حنفی' شافعی' مالکی' حنبلی مختلف مذہب ہیں مختلف دین نہیں۔ اسلام' یہودیت اور عیسائیت مختلف دین ہیں۔ دین کی نسبت اللہ کی طرف بھی' نبی کی طرف بھی اور بندوں کی طرف بھی کی جاتی ہے۔ اِکمال اور اِتمام دونوں کا لغوی لحاظ سے معنیٰ ایک ہی ہے یعنی مکمل اور پورا کرنا۔ لیکن اِکمال اس طرح پورا کرنا ہوتا ہے کہ اس میں نہ زیادتی ہوسکتی ہے اور نہ کمی اور اِتمام اس طرح پورا کرنا کہ اس میں زیادتی تو ہوسکے مگر کمی نہ ہوسکے (تفسیراتِ احمدیہ' بحوالہ تفسیر نعیمی' جزءِ ششم' صفحہ ۱۸۷)۔

اُسوۂ رسول کی شکل میں وہی رہے گی۔ اسی سے اور اسی کے اصول سے ہر پیش آنے والے مسئلہ کا حل اور ہر قوم اور خطہ کے دینی تقاضوں کو پورا کیا جائے گا۔ فقہائے اسلام کی اصطلاح میں اسی کا نام ''اجتہاد'' ہے کہ نئے نئے پیش آنے والے مسائل کا حل کتاب وسنت کے قائم کردہ اصولوں سے نکالا جائے۔

''اجتہاد'' شریعت کا ایک اصطلاحی لفظ ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ عقلِ سلیم اور فہمِ صحیح کے ذریعے احکام شرعیہ اُن دلائل و اصول سے معلوم کئے جائیں جو قرآن و حدیث میں مقرر کر دئے گئے ہیں۔ تو گویا کتاب اللہ اور سنتِ رسول کی نصوص کی گہرائیوں میں سے احکامِ شرعیہ نکال لانے کا نام اجتہاد و استنباط ہوا جیسے زمین کھود کر اُس کی تہوں میں سے پانی نکال لیا جائے۔ قرآنِ حکیم اور ارشاداتِ رسول ﷺ کی تہوں میں علوم و معارف کے ذخیرے چھپے ہوئے ہیں۔ آلاتِ فکر یہ سے ان علوم و معارف کو نکالنا اجتہاد کا عمل ہوتا ہے۔ اسی حقیقت کو حق تعالیٰ جلّ شانہ' نے سورۃ النّساء کی اس آیت ۵۹ میں بیان فرمایا ہے:

يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا أَطِيْعُوا اللهَ وَأَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ إِلَى اللهِ وَالرَّسُوْلِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّأَحْسَنُ تَأْوِيْلًا O

''مؤمنو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے اہلِ اختیار کی اطاعت کرو' پھر اگر کسی چیز میں تم میں باہم اختلاف ہو جائے تو اُسے اللہ اور اُس کے رسول کی طرف لوٹا دیا کرو اگر تم اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے بھی خوش تر ہے۔'' (۴ : ۵۹)

''امام رازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں شریعت کے ادلّہ اربعہ کی طرف اشارہ ہے یعنی کتاب وسنت' اجماعِ امت اور قیاس۔ أَطِيْعُوا اللهَ میں کتاب اللہ کا ذکر ہے۔ أَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ میں سنتِ رسول کی طرف اشارہ ہے اور أُولُو الْأَمْرِ سے اجماعِ امت مراد ہے۔ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ میں قیاس کا ذکر ہے یعنی جس چیز کا حکم کتاب وسنت میں نہ ہو اور نہ اجماعِ امت سے اس کا حکم ثابت ہو تو اس صورت میں اس غیر منصوص حکم کو معلوم کرنے کے لئے کتاب وسنت کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ ''رجوع'' کا مطلب یہ ہے کہ کتاب وسنت میں اس کے نظائر تلاش کئے جائیں اور اس کی علت میں غور وفکر کیا جائے۔ جب اس درپیش مسئلہ کی نظیر کتاب وسنت میں مل جائے اور علت میں شرکت اور مماثلت بھی پائی جاتی ہو تو اس غیر منصوص میں وہی حکم جاری کر دیا جائے جو منصوص میں ہے۔''

''فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ میں تنازع سے مراد باہمی خصومت واختلاف نہیں کیونکہ اگر ایسی چیز ہو تو اس کے لئے سہل علاج یہ تھا کہ یہ فرما دیا جاتا کہ اس نزاع کو ترک کر دو۔ بلکہ یہاں تنازع سے مراد اصولِ شریعت اور دلائل کا باہمی اختلاف ہے۔ یعنی درپیش مسئلہ میں ایک دلیل اپنی طرف مسئلہ کو کھینچ رہی ہے اور اس پر مرتب ہونے والا حکم کوئی اور ہے اور دوسری دلیل مسئلہ کو اپنی طرف کھینچتی ہے جس پر حکم اس کے برعکس مرتب ہوتا ہے تو اس طرح دلائل کا اختلاف ہی تنازع ہے جسے آیت میں بیان فرمایا گیا ہے تو ایسی صورت میں مسئلہ کو کتاب اللہ اور سنتِ رسول ﷺ کی طرف لوٹایا جائے گا کہ جو دلائل کتاب وسنت سے زیادہ قریب ہیں' اُنہی کو مجتہد اختیار کرتے ہوئے فیصلہ کرے گا۔''

''یہ بات ظاہر ہے کہ عقل ایک بینا آنکھ کی طرح ہے اور ہر بینا آنکھ اپنے نورِ بصیرت اور قوتِ بینائی کے ساتھ باہر کے نور کی بھی محتاج ہے۔ اگر باہر کا نور نہ ہو تو بینا آنکھ کچھ نہیں کر سکتی۔ بالکل اسی طرح یہ حقیقت ہے کہ انسانی عقل اجتہاد و استنباط کے میدان میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کے دلائل اور اصول کی راہنمائی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتی۔'' (ماہنامہ ''مؤمن'' لاہور' جون ۲۰۰۳ء' صفحات ۱۹'۲۱)

''اجتہاد و سنتِ رسول ﷺ ہے: فقہ کے چاروں اماموں (حنفی' شافعی' مالکی' حنبلی) کا اُن نئے پیش آنے والے مسائل کو جن کا ذکر قرآن و حدیث میں نہیں' اجتہاد کے ذریعے حل کرنے پر اتفاق ہے۔ اجتہاد کی بنیادیں وہ ہدایات ہیں جو نبی کریم ﷺ نے حضرات عبداللہ بن مسعود اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما کو دی تھیں۔ علاوہ ازیں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام' صحابہ کرام اور ائمہ فقہاء کی مثالیں اجتہاد کی ضرورت کا واضح اور روشن ثبوت ہیں جو ایک باضابطہ تنظیم کا نام ہے نہ کہ کسی ظریفانہ جذبے کا اظہار۔

اجتہاد کا دائرۂ عمل (Scope): اِسے مندرجہ ذیل تین اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) شریعت کے متن (Text) کی تاویل و تشریح میں قرآن مجید اور حدیثِ مبارکہ کے متن کی تحقیق کیا جانا ضروری ہے تا کہ اُن کے الفاظ کے صحیح معانی کا یقین ہو جائے کیونکہ اُن کے کئی لفظی معانی ہو سکتے ہیں۔ ایسی صورتوں میں یہ فیصلہ کرنا ضروری ہوتا ہے کہ کون سا معنیٰ قابلِ ترجیح ہے۔ مثلاً سورۃ البَقَرۃ کی آیت ۲۲۸ کے لفظ ''قُــرُوْء'' کے لفظی معنیٰ حیض کی ابتدا کے بھی ہو سکتے ہیں اور طہر یعنی حیض کے اختتام کے بھی ہو سکتے ہیں جب عورت پاک وصاف ہو جاتی ہے اور نماز پڑھ سکتی ہے۔ حدیثِ رسول ﷺ کی صداقت (Authenticity) کا چیک کرنا بھی یہ یقین پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ راوی قابلِ اعتماد ہیں' اُن کے درمیان سلسلۂ پیوستگی میں کوئی گم شدہ کڑی نہیں ہے اور یہ کہ اُس کا متن قرآنی احکام سے متصادم نہیں ہے۔

(۲) دوسری بات شریعت کے احکام کے اِطلاق کی ہے۔ کچھ باتوں میں شریعت مفصل اور مخصوص قانونی احکام دیتی ہے۔ اِن احکام کا نفاذ اسلامی ریاست کی زور آور قوت سے ہونا چاہئے۔ اس مقصد کے لئے اِن احکام کی تدوین قوانین کی شکل میں ہوتا کہ اُن کا نفاذ ہو سکے۔ مثلاً پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے معاشرے میں نظام زکوٰۃ کو عملی طور پر نافذ کیا اور اُس کی تفاصیل دیں۔ تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کاروبار اور تجارت میں بالخصوص بڑی تبدیلی آئی ہے۔ اُس نظام کو جدید مسلم معاشرے میں مستحکم کرنے کے لئے اجتہاد میں مفصل قوانین کی تشکیل کرنا ضروری ہے کیونکہ یہ چیز شرعی احکامات کے نفاذ کے لئے بھی ضروری ہے۔

(۳) تیسری بات یہ کہ جہاں شریعت کا کوئی واضح یا غیر واضح (مبہم) متن موجود نہیں۔ اِسے ''مباحات'' کا نام دیا گیا ہے جو بڑا وسیع میدان ہے اور جہاں قانون سازی شرعی احکام کے خلاف نہیں ہونا چاہئے اور صرف اُن طریقوں اور ذرائع کو استعمال کیا جائے جن کی شریعت نے اجازت دی ہے (یعنی اجماع

قیاس وغیرہ)۔ علاوہ ازیں ایسی قانون سازی شریعت کے عمومی مقاصد اور وسیع النظر اصولوں کی روشنی میں کی جائے ورنہ وہ مسترد کئے جانے کے لائق ہوگی۔ ("Islamisation of Laws in Pakistan"... Dr. Mohammad Amin, pp. 19, 20) 1989, Lahore.

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مشہور تبصرہ بھی اجتہاد کے دائرہ عمل اور اس کی حدود پر روشنی ڈالتا ہے:

''ایک نا اہل آدمی جو اجتہاد کرنے کی کوشش کرتا ہے' اُس نابینا شخص کی طرح ہے جو صحیح راستے کو نہیں پا سکتا۔ حکومت کا فرض ہے کہ ایسے آدمی کو اجتہاد کرنے سے زبردستی روک دے۔'' (شافعی رسالہ' صفحہ ۵۰۹)

اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''ایک عام آدمی (جو ماہر نہیں) اجتہاد کرنے کا اہل نہیں ہے کیونکہ اُسے اجتہاد کرنے کی صلاحیت ہی حاصل نہیں ہے۔ وہ ایک فاتر العقل یا بچے کی طرح نا اہل ہے۔'' (''المصطفٰے''۔ غزالی' ج ا' ص ۱۸۲)

فقہِ اسلامی کی اہمیت کے سیاق وسباق میں قرآنِ حکیم کی ایک ٹھوس مثال ہماری روزمرّہ زندگی میں فقہ کی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے چنانچہ سورہ آلِ عمران کی آیت ۶ میں فرمایا گیا:

هُوَالَّذِیْ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ آیَات'' مُحْكَمَات'' هُنَّ اُمُّ الْكِتَاب وَاُخَرُ مُتَشَابِهَات''

''وہ وہی (خدا) ہے جس نے آپ پر کتاب اتاری ہے' اس میں محکم آیتیں ہیں' وہی کتاب کا اصل مدار ہیں اور دوسری آیتیں متشابہ ہیں۔'' (۳: ۶)

محکم ومتشابہ آیات کی یقین وتفہیم کا مسئلہ قرآنِ حکیم کے اہم اور مشکل مسائل میں سے ہے اور اُن میں باہمی فرق کو مدِّنظر رکھے بغیر نہ صرف یہ کہ قرآنی آیات کا فہم و اِدراک ممکن نہیں بلکہ قرآنِ حکیم اُن لوگوں کو گمراہ قرار دیتا ہے جو اِن آیات میں موجود فرق کو نظر انداز کرتے ہیں۔ اس لئے قرآنی آیات کے طالب علم کے لئے اِس موضوع سے واقفیت انتہائی ضروری ہے۔ اس بحث کا دارومدار سورہ آلِ عمران کی محولہ بالا آیت سے ہے۔

محکم ومتشابہ کا اصطلاحی مفہوم: اصطلاح میں مُحکم سے مراد کتاب وسنت کی وہ نصوص ہیں جو دلالت و معنی کے لحاظ سے اس قدر واضح ہوں کہ اُن کے مفہوم میں کسی قسم کا اخفاء (پوشیدگی) نہ پایا جاتا ہو اور جو بلا تاویل اور دقّتِ نظر کے آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہو۔ قرآنِ حکیم نے محکمات کو اُمُّ الْکِتَاب قرار دیا ہے یعنی اُن میں اصولِ دین واحکامِ شریعت' فرائض' اوامر ونواہی' عبادات اور اَخلاقی اقدار کا ذکر ہے۔

متشابہ آیات وہ ہیں (۱) جن کا مفہوم مخفی ہو اور جس تک رسائی نہ عقلاً اور نہ نقلاً ممکن ہو۔ (۲) جن میں کئی

تاویلوں کا احتمال ہو۔ (۳) جو مستقل بالذات نہ ہو بلکہ معانی کی تعیین کے لئے اس کی توضیح کی ضرورت ہو۔ اُس کی تاویل میں اختلاف کی بناء پر کبھی اُس کا ایک مفہوم بیان کیا جائے اور کبھی دوسرا۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ سورہ آلِ عمران کی مذکورہ آیت (جس میں آیات کی دو اقسام محکم اور متشابہ کا ذکر ہے) کے علاوہ ایک آیت میں پورے قرآنِ حکیم کو محکم اور دوسری آیت میں پورے قرآن کو متشابہ کہا گیا ہے۔ سورہ ھُود کی اوّل آیت میں ہے :

کِتَاب" اُحْکِمَتْ آیَاتُه' (یہ وہ کتاب ہے جس کی آیات محکم ہیں)

اور سورۃ الزُّمَر (۳۹) کی آیت ۲۳ میں ہے :

اَللّٰہُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ کِتَابًا مُّتَشَابِهًا (اللہ نے بہترین کلام متشابہ کی صورت میں اتارا)

اِن دو آیات اور سورہ آلِ عمران کی آیت میں بظاہر تضاد نظر آتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ سورہ ھُود کی پہلی آیت میں پورے قرآن کے محکم ہونے سے مراد یہ ہے کہ اُس کی آیات میں حد درجہ ضبط و اِتقان (پختہ پن) پایا جاتا ہے۔ یہ کلام ہر قسم کے نقص و اختلاف اور تضاد سے مبرّا ہے اور اس میں کسی قسم کی کمی بیشی کی کوئی گنجائش نہیں جبکہ سورۃ الزمر کی آیت میں قرآن کے متشابہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ قرآنی آیات حق و صداقت اور اعجاز و بلاغت میں ایک دوسرے کے مشابہ ہیں۔ گویا مذکورہ ہر دو آیات میں محکم و متشابہ کا لغوی مفہوم مراد ہے نہ کہ اصطلاحی جبکہ سورہ آلِ عمران کی آیت میں محکم اور متشابہ اصطلاحی کا ذکر کرتے ہوئے قرآنی آیات کی دو اقسام بیان کی گئی ہیں۔

ایک مقام پر قرآن مجید ہماری راہ نمائی اس طرح کرتا ہے:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ تَنْزِيْلًا ○ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ آثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ○ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ○ وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَه' وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا ○ (الدّھر:۲۳۔

"ہم ہی نے آپ پر قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا ہے' سو آپ اپنے پروردگار کے حکم پر مستقل رہئے اور اُن میں سے کسی فاسق یا کہنے میں نہ آیئے اور اپنے پروردگار کا نام صبح و شام لیتے رہئے اور رات کے کسی بھی حصہ میں اُسے سجدہ کیا کیجئے اور اُس کی تسبیح رات کے بڑے حصہ میں کیا کیجئے۔" (۲۳۔۲۶ : ۷۶)

پس زندگی کی پریشانیاں تمہیں بے دل نہ کر دیں اور جب کسی آیت کے معانی کے سمجھنے یا کسی مسئلے کے حل میں آپ پریشان ہو جائیں تو نماز پڑھئے' اُس قادر و قدیر سے دعا کیجئے' اور جس قدر بہ آسانی قرآن کی تلاوت کر سکتے ہیں' تلاوت کیجئے۔ اور اگر معانی کے واضح ہونے سے پہلے کسی ایک یا دوسری توضیح کی قطعی ضرورت ہو تو اُس آیت پر متضاد نظریات کے حامل معصیت پیشہ اور ناقدر شناس کی پیروی نہ کیجئے تو اِس درمیانی وقت میں اُس مبہم آیت کا معنیٰ واضح تر ہو جائے گا۔

مجتہد اور فقیہ کے درمیان فرق : اگر چہ فقیہ اپنے منصب کا اہل اور موزوں ہوتا ہے لیکن وہ کسی نہ کسی ایسے مجتہد کی پیروی کرتا ہے جس نے قانون کو براہِ راست خصوصی شہادتوں سے اخذ کیا ہو۔ مجتہد کی جانب سے اخذ شدہ قوائین و اصول فقیہ کے لئے قانون کا ماخذ بن جاتے ہیں۔ ...("Islamic Jurisprudence" Imran Ahsan Khan Nyazee, p. 24)

اجتہاد اور تقلید میں فرق : اجتہاد مجتہد کی کارکردگی کا نام ہے جو قانون کے اخذ کرنے میں تمام ذرائع کو استعمال میں لاتا ہے۔ ایک پختہ کار مجتہد تاویل کے اصولوں کے ساتھ ساتھ مستقل اور عملیاتی قانون کے عمومی اصولوں کو بھی وضع کرتا ہے۔ (ایضاً)

قانونی لحاظ سے تقلید کا مطلب کسی دوسرے کی رائے کی پیروی کرنا ہے۔ تقلید ایک عام آدمی کی کارگزاری کا نام ہے۔ کسی قانونی جواز کے معلوم ہونے پر تقلید کی اجازت ہوتی ہے۔ یہ اجازت دی گئی تقلید اپنی منطق میں بالکل اُسی طرح ہے جس طرح کہ ایک ڈاکٹر طبی نسخہ تجویز کرتا ہے' یا ایک وکیل کوئی قانونی شق نکالتا ہے وغیرہ' وغیرہ۔ (ایضاً)

مسلمان فقہاء کا کہنا ہے کہ ایک اہل فقیہ کی رائے پر عمل کرنے کی شریعت نے اجازت دی ہے کہ یہ تقلید نہیں ہے۔ تقلید کی دو قسمیں ہیں : ممنوع تقلید اور غیر ممنوع تقلید۔ ممنوع تقلید کا مطلب دوسرے کی رائے کا تتبع کرنا ہے جبکہ شریعت نے ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی (ایضاً' صفحہ ۳۳۰)۔

اسلامی قانون کے ماخذ : تعداد میں چار ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے :

(A) قرآن مجید : یہ کلام الٰہی ہے جو اللہ کے آخری رسول حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا اور اسلامی قانون کا یہ پہلا اہم ماخذ ہے۔ یہ صرف آخری الٰہی سند ہی نہیں ہے بلکہ قانون کا بنیادی ذریعہ ماخذ بھی ہے۔ اس کے اصول شیرازہ بند (Binding)' ناقابلِ تغیر و تبدل ہیں اور اُن کا قبول کرنا اور اُن پر عمل کرنا انسان پر فرض ہے۔ جیسا کہ ایسا نہ کرنے پر قرآنِ حکیم میں وعید آئی ہے :

(۱) وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ O (اَلمائدۃ : ۴۴)
"اور جو کوئی اللہ کے نازل کئے ہوئے (احکام) کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو یہی لوگ تو کافر ہیں۔" (۵:۴۴)

(۲) وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ O (اَلمائدۃ : ۴۵)
"اور جو کوئی اللہ کے نازل کئے ہوئے (احکام) کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو یہی لوگ تو ظالم ہیں۔" (۵:۴۵)

(۳) وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ O (اَلمائدۃ : ۴۶)
"اور جو کوئی اللہ کے نازل شدہ (احکام) کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو یہی لوگ تو نافرمان ہیں۔" (۵: ۴۶)

لہٰذا فقیہ پر قانون کے استنباط اور پیش نہادہ مسائل کے حل کے لئے قرآن مجید کی طرف رجوع کرنا ازبس لازمی ہے۔ فقیہ کو قرآن مجید میں ہر صورت بلاکم و کاست اور قطعی طور پر عمل جائے گی۔ اُس پر قرآن مجید کی تفسیر و توضیح کی طرف رجوع کرنا بھی لازم ہے جو نبی علی الصلوٰۃ والسلام کی سنتِ مبارکہ کا نام ہے۔

قرآن مجید کو اسلامی قانون کا بنیادی اور اہم ماخذ ماننے کا مطلب یہ ہے کہ باقی تمام ماخذ اس کے مقابلے میں ثانوی حیثیت کے حامل ہیں اور اُن کی قانونی معقولیت اور جواز قرآنِ مجید سے اخذ شدہ ہے۔

(B) سنتِ نبوی ﷺ : نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اقوال و افعال یہاں تک کہ آپ کی خاموشی بھی سنتِ نبوی کہلاتے ہیں۔

سنتِ نبوی کا قانون کے بنیادی ماخذ کے طور پر تسلیم کئے جانے پر سب کا اتفاق ہے اور کسی دیگر ذریعہ کی مدد کے بغیر خودمختار طور پر اِس سے احکامات اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ سنتِ نبوی کو بطور ماخذِ قانون درج ذیل قرآنی آیات سے سمجھا جاسکتا ہے۔

(۱) یٰأَیُّھَاالَّذِیْنَ آمَنُوْا أَطِیْعُوا اللّٰہَ وَأَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَأُولِی الْأَمْرِ مِنْکُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ إِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ إِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِکَ خَیْرٌ وَّأَحْسَنُ تَأْوِیْلًاO

''مؤمنو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے اہلِ اختیار کی اطاعت کرو، پھر اگر کسی چیز میں تم میں باہم اختلاف ہو جائے تو اُسے اللہ اور اُس کے رسول کی طرف لوٹا دیا کرو اگر تم اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے بھی خوش تر ہے۔'' (۴ : ۵۹)

(۲) فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْ أَنْفُسِھِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًاO (ألنّساء : ٦۵)

''(اے پیغمبر!) آپ کے رب کی قسم! یہ کبھی مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں آپ کو اپنا فیصل نہ بنالیں، پھر آپ جو بھی فیصلہ کریں اُس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں (بلکہ اُسے بسر و چشم تسلیم کرلیں)''

(۳) مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰہَ (اَلنّساء : ۸۰)

''جس نے رسول (علیہ السلام) کی اطاعت کی، اُس نے دراصل اللہ کی اطاعت کی۔'' (۴ : ۸۰)

(۴) وَأَنْزَلْنَا إِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَیْھِمْ (اَلنّحل : ۴۴)

''اور ہم نے آپ پر یہ نصیحت نامہ اتارا ہے تاکہ آپ لوگوں پر ظاہر کریں جو کچھ اُن کے پاس بھیجا گیا ہے۔''

(۵) وَمَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَی اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ أَمْرًا أَنْ یَّکُوْنَ لَھُمُ الْخِیَرَةُ مِنْ أَمْرِ

هِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًاO (الاحزاب : ۳۶)
''اور کسی مومن اور مومنہ کے لئے یہ درست نہیں کہ جب اللہ اور اُس کا رسول کسی امر کا حکم دیں تو پھر اُنہیں اپنے (اُس) امر میں کوئی اختیار باقی رہ جائے اور جو کوئی اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کرے تو وہ صریح گمراہی میں جا پڑا۔'' (۳۳: ۳۶)

(۶) وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰىOاِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰىO (اَلنَّجم : ۳' ۴)
''پیغمبر (علیہ السلام) تو اپنی خواہش سے بات کرتے ہی نہیں' اُن کا کلام تو تمام تر وحی ہے۔'' (۵۳:۴'۳)

(۷) مَا آتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (اَلْحَشر : ۷)
''رسول (علیہ السلام) جو کچھ تمہیں دے دیں' لے لیا کرو اور جس سے وہ تمہیں روک دیں' رک جایا کرو۔''

استنباطِ احکام میں سنت نبوی کی حیثیت :سنتِ نبوی کی اہمیت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی اُس مشہور و معروف حدیث سے ثابت ہے جب اُنہیں نبی علیہ السلام نے یمن کا عامل (گورنر) بھیجا تو آپ ﷺ نے اُن سے پوچھا:

''تم کسی پیش نہادہ مقدمے کا فیصلہ کیسے کرو گے؟ اُنہوں نے جواب دیا: میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ پیغمبر علیہ السلام نے پوچھا: اگر تم کتاب اللہ میں راہ نمائی نہ پاؤ تو کیا کرو گے؟ حضرت معاذ نے جواب دیا: تب میں اللہ کے رسول کی سنت کے مطابق عمل کروں گا۔ پیغمبر علیہ السلام نے پھر پوچھا: اگر تم میری سنت اور کتاب اللہ میں بھی راہنمائی نہ پاؤ تو کیا کرو گے؟ جواب دیا کہ میں اپنی رائے قائم کرنے میں بھرپور کوشش کروں گا اور کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کروں گا۔ اس پر نبی علیہ السلام نے اُنہیں سینے پر تھپتھپایا اور فرمایا: سبحان اللہ! وہ اللہ جس نے اپنے رسول کی ایسی چیز معلوم کرنے میں مدد کی جو اُس کے رسول کو پسند ہے۔'' (سنن ابی داؤد حدیث نمبر: ۳۵۸۵ جلد ۳' ص ۱۰۱۹)

معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی درجِ بالا حدیث اُس ترتیب کا تعین کرتی ہے جس میں ذرائع کو استعمال کیا جاتا ہے اور یہ کہ فقیہ کو اُس وقت تک کسی دوسرے ماخذ کی طرف رجوع نہیں کرنا چاہئے جب تک وہ اوّل ماخذ یعنی قرآن مجید میں کامل تحقیق نہ کر لے۔ اس سے یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ قیاس کی طرف بھی اُس وقت رجوع کیا جائے گا جب قرآنِ مجید اور حدیثِ نبوی میں مکمل تلاش وجستجو کی جا چکی ہو۔

علاوہ ازیں سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے قاضی شُریح کو یہ ہدایت کرتے ہوئے خط لکھا کہ سب سے پہلے قرآن کی اتباع کرو اور اُس کے بعد سنتِ رسول ﷺ کی۔

سنتِ رسول ﷺ قرآنِ حکیم کی تفسیر وتوضیح ہے تو اُس وقت تک اس کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت

نہیں جب تک قرآن کا متن اس کی وضاحت کا تقاضا نہ کرے۔ اگر قرآن کا متن اپنے معانی میں نصِ قطعی ہے تو اُس پر عمل کیا جائے لیکن اگر یہ ظاہر ہو کہ متن کثیر المعانی ہے تو پھر سنتِ رسول ﷺ کی طرف رجوع کرنا لازم ہے۔'' ("Islamic Jurisprudence" ... Imran Ahsan Khan Nyazee, p. 177)

سنتِ نبوی کس طرح قانون وضع کرتی ہے؟: سنتِ نبوی ثانوی حیثیت کی حامل ہے لیکن قوانین کے اخذ کرنے میں وہ قرآنِ حکیم کا تتمہ (Complementary) ہے۔ اس کی وضاحت ذیل میں دی جاتی ہے :۔

(i) سنتِ نبوی قرآن مجید کی توضیح وتفسیر ہے: قرآن مجید میں اکثر اور بالعموم قوانین واحکام مبہم اور غیر واضح ہوتے ہیں۔ سنتِ نبوی اُن کی تحدید اور توضیح کرتی ہے۔ مثلاً (۱) اوقاتِ نماز' نمازوں کی تعداد اور ہر نماز کی رکعتوں کی تعداد سنتِ نبوی سے معلوم ہوگی (۲) اُس دولت و جائداد کی اقسام جن میں زکوٰۃ دینا واجب ہے اور نصابِ زکوٰۃ اور زکوٰۃ کی ادائی کا وقت بھی سنتِ نبوی سے معلوم ہوگا۔ (۳) ربٰو (سود) اور اُس کے تفصیلی احکام بھی سنتِ نبوی کی مدد کے بغیر معلوم نہیں ہو سکتے۔

عمومی معنیٰ کی تحدید کی مثال قانونِ وراثت کے اِس حکم سے معلوم ہوتی ہے جس میں مرد کا حصہ عورت کے حصہ سے دوگنا بتایا گیا (سورۃ النسآء:۱۱)۔ سنتِ نبوی نے واضح کیا کہ قاتل اپنے مقتول کی وراثت سے محروم ہے۔ اور توضیح کی مثال چوری (سرقہ) کے بارے میں ہے جس میں سنتِ نبوی یہ واضح کرتی ہے کہ چور کا دایاں ہاتھ کاٹا جائے۔ توضیح کی ایک اور مثال ماہِ رمضان المبارک میں سفید دھاگے کو کالے دھاگے سے متمیز کرنے کی ہے (سورۃ البقرۃ: ۱۸۷)۔ سنتِ نبوی نے واضح کیا کہ سفید دھاگے سے مراد صبح کی سفیدی اور کالے دھاگے سے مراد رات کی سیاہی ہے۔ (ایضاً' صفحات ۱۷۷' ۱۷۸)

(ii) سنتِ رسول ﷺ پُر تامل' مرتعش صورت کو ایک معلوم اصول سے جوڑتی ہے: بعض اوقات سنتِ نبوی ایسے اصول بیان کرتی ہے جن کا ذکر قرآنِ حکیم میں کہیں نہیں ہوتا اور اکثر اوقات ایک صورتِ حال دو اصولوں کے درمیان مرتعش اور ڈگمگا رہی ہوتی ہے لیکن سنتِ رسول (علیہ الصلوٰۃ والسلام) اُس صورت کو کسی ایک اصول سے جوڑ دیتی ہے۔

مثال کے طور پر قرآنِ حکیم نے عمومی طریق سے تمام طیّبات اور پاکیزہ' اچھی چیزوں کے کھانے اور استعمال کرنے کی اجازت دی ہے اور خبائث یعنی گندی چیزوں سے پرہیز کرنے کا حکم دیا ہے۔ سنتِ نبوی نے خبائث کے ساتھ ڈاڑھوں والے جانوروں اور پنجوں والے پرندوں کے کھانے کی ممانعت کے ساتھ جوڑا ہے۔

قرآنِ حکیم نے سمندری جانوروں کے کھانے کی اجازت دی ہے اور گلے سڑے گوشت سے روکا ہے۔ سمندر میں پائی گئی مردہ مچھلی کا استعمال اِن دو اصولوں کے درمیان متذبذب تھا۔ سنتِ نبوی نے اِسے جائز

خوراک کے ساتھ جوڑ دیا اور فرمایا: پانی پاک ہوتا ہے اور اُس میں مرا ہوا جانور (مَیتة) حلال ہے۔

قرآن مجید نے مذبوح جانور کا کھانا جائز اور حلال قرار دیا اور مُردہ جانور (مَیتة) سے روکا ہے۔ جانور کے ذبح ہونے کے بعد اُس کے علیحدہ کیے ہوئے جنین (کچا بچہ) کا کھانا اُن دو اصولوں کے درمیان متذبذب تھا۔ سنتِ نبوی نے اُسے مذبوح جانور کے ساتھ ملا دیا: ''جنین کا ذبح کرنا اُس کی ماں کو ذبح کرنا ہے۔''

(iii) سنتِ رسول ﷺ ایک قرآنی اصول کی بنیاد پر قیاس کا کام کرتی ہے: بعض اوقات قرآن مجید ایک اصول اس کی اقسام کی وضاحت کئے بغیر وضع کرتا ہے۔ سنتِ نبوی ایک ملتی جلتی صورت کو اُس اصول سے جوڑ دیتی ہے اور یہ عمل قیاس جیسا معلوم ہوتا ہے۔

قرآنِ حکیم دو بہنوں کو ایک آدمی کے نکاح میں یکجا ہونے سے روکتا ہے (سورۃُ النساء: ۲۳)۔ مشترک سبب کے ہونے کے باعث ایک عورت کی اپنی چچی یا ممانی کے ساتھ کسی آدمی کے نکاح میں جانے کی صورتِ حال بھی ویسی ہے۔ اس لئے سنتِ نبوی نے ایسے نکاح کرنے سے بھی روک دیا ہے۔

قرآنِ حکیم نے بیان کیا کہ پاک و صاف پانی آسمان سے نازل ہوتا ہے اور زمین میں محفوظ ہو جاتا ہے (سورۃ المؤمنون: ۱۸؛ سورہ قٓ: ۹)۔ لیکن سمندری پانی کا مسئلہ طے نہیں تھا۔ سنتِ نبوی نے اعلان کیا کہ سمندری پانی پاک اور اس کا مردار جانور حلال ہے۔

(C) اجماع: یہ اسلامی قانون کا تیسرا ماخذ ہے جس کے لئے قرآن حکیم نے سورۃ النِّساء کی آیت ۱۱۵ میں سَبِیْلُ الْمُؤْمِنِیْن کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔

''اِجماع'' کا لفظی معنیٰ عزمِ صمیم (پکا ارادہ) ہے جیسا کہ قرآنِ حکیم اور حدیثِ نبوی نے بالترتیب اِس لفظ کو اِسی مفہوم میں استعمال کیا ہے اور فرمایا:

(۱) فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَکُمْ وَشُرَکَآءَکُمْ (یونس: ۷۱)
''تم اپنی تدبیر مع اپنے شرکاء کے پختہ کرلو۔'' (۷۱ : ۱۰)

(۲) مَنْ لَّمْ یَجْمَعِ الصِّیَامَ قَبْلَ الْفَجْرِ فَلَا صِیَامَ لَہٗ (الحدیث)
''جس نے سپیدۂ سحر سے پہلے روزہ رکھنے کی پختہ نیت نہیں کی' اُس کا روزہ نہیں ہوتا۔''

اصطلاح میں ''اجماع'' کی یہ تعریف کی گئی ہے:

اِتِّفَاقُ الْمُجْتَھِدِیْنَ مِنْ اُمَّۃِ مُحَمَّدٍ ﷺ بَعْدَ وَفَاتِہٖ فِیْ عَصْرٍ مِّنَ الْعُصُوْرِ عَلٰی حُکْمٍ شَرْعِیٍّ
''محمد ﷺ کی وفات کے بعد آپ کی اُمّت کے مجتہدین کا اس بات پر اتفاق کہ ہر زمانے میں تمام معاملات کا حل شریعتِ اسلامی کے مطابق ہوگا۔''

اجماع کے معتبر اور صحیح ہونے کی شرطیں: ۔مجتہد میں کچھ شرائط کا ہونا لازم ہے جو حسبِ ذیل ہیں:۔

(۱) عربی زبان سے واقفیت: فقہائے اسلام نے شرائطِ اجتہاد میں سب سے اوّل شرط یہ بیان کی ہے کہ صاحبِ اجتہاد علومِ عربیہ یعنی لغت' صَرف ونحو اور فنِ بلاغت کا ماہر ہو کیونکہ قرآن وحدیث عربی ہے اور جب تک آدمی عربی زبان سے واقف نہ ہو' اسلوبِ زبان اور اصولِ صرف ونحو کا ماہر نہ ہو' وہ اصل کلام کی مراد ہی سمجھنے سے قاصر رہے گا چہ جائیکہ وہ اجتہاد واستنباط کے مراحل طے کرنے لگے۔ فنِ طب اور ڈاکٹری میں وہی شخص دخل دے سکتا ہے جو طب کے اصولوں اور اس کے تمام متعلقات کی پوری بصیرت رکھتا ہو۔ یہ بات ناقابلِ تصوّر ہے کہ اس فن کو باقاعدہ حاصل کیئے بغیر کوئی شخص کسی ترجمہ میں چند دواؤں کا ذکر اور اُن کے خواص دیکھ کر مریضوں کا علاج اور اُن کے طبی مسائل کا حل اور فیصلے کرنے لگے۔ ظاہر ہے کہ ان تمام علوم میں مہارت کے بغیر کلامِ عربی کی دلالت نہیں سمجھی جا سکتی۔

(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ کتاب اللہ' سنت رسول اللہ ﷺ اور اقوالِ صحابہ وتابعین پر وہ پوری طرح مطلع ہو حتی کہ آیاتِ قرآنیہ کی قراءتِ متواترہ اور روایات واحادیث کی سندوں کی صحت وضعف کو بھی جانتا ہو کیونکہ احکام استنباط آیات کلام اللہ کی قراءتِ متواترہ اور احادیثِ صحیحہ سے ہی ہوا کرتا ہے تو وہ شخص جو حدیث کی قوت و ضعف اور صحت وعدمِ صحت کا علم نہ رکھتا ہو وہ کیونکر احکام کا استنباط کر سکے گا۔ اسی کے ساتھ اُسے راویانِ حدیث کے ثقہ ہونے کا علم ہو اس لئے کہ احادیث کی سندوں کا دار ومدار راویانِ حدیث کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے پر ہے۔ پھر صحابہ اور تابعین کے اقوال پر عبور ہو۔ وہ اس لئے کہ یہی حضرات کتاب وسنت کے سب سے پہلے مخاطب ہیں تو اُن کا فہم اور اُن کا بیانِ تشریح اور اُن کا تعامل احکام شریعت میں بنیاد کا درجہ رکھتا ہے۔ ان کی تشریحات وتحقیقات سے کتاب کی مراد واضح ہو سکے گی۔ اُن کے تعامل ہی کو منہاج یعنی طریقہِ عمل اور شارع کی غرض سمجھا جائے گا۔ اس وجہ سے درپیش مسائل کا حل اور ان کا شرعی فیصلہ ان چیزوں میں مہارت کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتا۔

(۳) تیسری شرط فہم وفراست اور علوم قرآن وحدیث میں ذہانت وذکاوت کا حاصل ہونا ہے۔ کیونکہ بسا اوقات انسان باوجود اہلِ زبان ہونے کے بھی کلام کے اسرار ونکات اور اغراض ومقاصد پر قرآنی فہم اور علومِ الٰہیہ میں بصیرت کے بغیر مطلع نہیں ہو سکتا۔ ہم دن رات اس بات کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ ہمارے کلام کی اصل مراد ہمارے وہ بہت سے مخاطب نہیں سمجھ سکتے جو ذکاوت اور تدبر کا وصف نہ رکھتے ہوں تو ظاہر ہے کہ اس وصف کے بغیر اصول اور سنتِ رسول ﷺ کے دلائل سے کوئی شخص مسائل کا حل اور فیصلے کیسے کر سکتا ہے۔

(۴) چوتھی شرط یہ ہے کہ وہ شخص صاحبِ تقویٰ ہو اور اس کا نفس کے تقاضوں اور اغراض وخواہشات سے متاثر ہونے کا احتمال نہ ہو۔ کیونکہ تقویٰ اور قلب کی طہارت کے بغیر وہ مسائل کے حل میں اپنی فکری صلاحیتوں کو صحیح رُخ کی طرف متوجہ نہیں کر سکے گا۔ اسی طرح صاحبِ غرض اور خواہشاتِ نفس میں پڑنے والا انسان ہر بات میں اپنی اغراض و خواہشات اور اپنے خیالات ہی کی تکمیل کا ارادہ کرے گا۔ اِس عیب کے باعث تو انسان اصل شریعت ہی کو مسخ کر ڈالے گا جس کی مثال بنی اسرائیل کی وہ تمام ملحدانہ اور تحریفِ دین کی حرکتیں ہیں جنہیں قرآن کریم نے بڑی وضاحت اور

تفصیل کے ساتھ بیان فرما دیا۔ مسائل کا حل وہی شخص ہی صحیح کر سکے گا جو ایمان وتقویٰ سے متصف ذاتی اغراض اور نفس کی خواہشات سے پاک ہو ورنہ تو وہ اصل احکام کو اپنی خواہشات کے لئے آلہ کار بنانے لگے گا۔

(۵) پانچویں شرط یہ ہے کہ مجتہد اجتہاد و استنباط کے طریقوں اور ان کی اقسام وشرائط' استنباط اور اس کی صحت و فساد سے بھی واقف ہو۔ چونکہ اجتہاد و استنباطِ احکام کتاب وسنت سے ہوتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن وحدیث کے عبارتی انواع واقسام کا ماہر ہو اور سمجھ سکتا ہو کہ اس میں کون سی آیت نص ہے' کون سی ظاہر ہے' کون سی مجمل' کون سی مفسر' کون سی محکم اور کون سی متشابہ ہے۔ ان سب تعبیرات کے انداز اور طرز کو وہ جانتا ہو۔ اس لئے ضروری ہے کہ در پیش مسائل کے حل کے لئے ان تمام امور کو وہ ملحوظ رکھے۔ اس کے بغیر کوئی فقیہ یقیناً صحیح شرعی فیصلہ نہیں کر سکتا۔

(۶) چھٹی شرط یہ ہے کہ مجتہد کو مقاصدِ شریعت کا علم ہو اگرچہ اس شرط کا اضافہ بعد کے فقہاء نے کیا ہے۔ چونکہ مقاصدِ شریعت بنیادی اقدار کی حامل ہیں' اس لئے انہیں سمجھنے اور اُنہیں عمل میں لانے کے لئے عربی زبان کا علم ہونا لازمی نہیں ہے۔

(۷) ''اجتہاد کی صلاحیت : کچھ فقہاء کے نزدیک مجتہد میں قانون اور اجتہاد کی فطری صلاحیت کا ہونا ضروری ہے۔ یہ صفت اکتسابی نہیں بلکہ خداداد ہوتی ہے۔ جس طرح عربی زبان کا اچھا خاصا علم ہونا کسی کو شاعر نہیں بنا دیتا' اسی طرح مندرجہ بالا شرائط کی تکمیل سے کوئی شخص مجتہد نہیں بن جاتا۔'' ...("Islamic Jurisprudence"
Imran Ahsan Khan Nyazee, pp. 271, 272)

(D) قیاس : اسلامی قانون کا یہ چوتھا منبع وماخذ ہے۔ ''قیاس'' کا لفظی معنیٰ پیمائش وناپ کرنا اور ایک چیز کا دوسری چیز کے ساتھ اندازہ کرنا ہے۔ اس طرح کپڑے کو میٹر راڈ کے ساتھ ماپنا قیاس ہے۔ دو چیزوں کو مساوی بنانے (یعنی موازنہ کرنے پر) بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس طرح ایک جوتے کو دوسرے جوتے پر رکھ کر اُن کا برابر ہونے کو دیکھنا قیاس ہے۔

فقہاء کی تعریف کے مطابق اصطلاح میں قیاس کا معنیٰ قرآنِ حکیم' حدیثِ نبوی کے متن یا اجماع میں کسی حکم کے معدوم ہونے پر اِن تینوں ذرائع (قرآن' حدیث اور اجماع) کی روشنی میں نئے پیش نہادہ مسئلے کا حل تلاش کرنا ہے۔

قیاس کی مثالیں :(۱) انگوروں سے تیار شدہ شراب (''خَمر'') کے استعمال کی ممانعت سورۃ المائدہ کی آیات ۹۰' ۹۱ میں آئی ہے۔ قرآنی متن خَمر کے نقصانات (لوگوں کی باہمی دشمنی) بیان کرتے ہوئے اُس سے روکتا ہے۔ فقہائے احناف کے نزدیک خَمرُ انگوروں کے رس سے تیار ہونے والی نشہ آور شے کا نام ہے جسے انگریزی میں Wine کہا جاتا ہے۔

فقہاء پہلے تو اس بات کا فیصلہ کرتے ہیں کہ خَمر کے پس پردہ اُس کے حرام ہونے کی علت نشہ ہے۔ دوسرے

الکحلی مشروبات کا معائنہ کرنے پر اُنہوں نے یہ معلوم کیا کہ بے ہوش کرنے کی بات اُن میں بھی ہے۔ جب اس بات کی تحقیق ہوگئی کہ مدہوش کرنے کی خاصیت اُن میں موجود ہے تو اُنہوں نے خَمر کے حکم کو وسعت دے کر دوسرے الکحلی مشروبات کو بھی ناجائز اور حرام قرار دے دیا۔ اِس طرح خَمر کی ممانعت حکم الاصل ہے جبکہ وہسکی کی ممانعت حکم الفرع ہے جس کا استنباط قیاس کی رُو سے کیا گیا ہے اور اُن کی حرمت کا سبب نشہ ہے۔

(۲) ایک حدیثِ نبوی ہے کہ ''قاتل اپنے مقتول کے مال کا وارث نہیں ہوسکتا'' یہ حدیث اُس وارث کو حقِ وراثت دینے سے روکتی ہے جو اپنے اُس مورث کو قتل کر دیتا ہے جس کے متروکہ مال کا اُس نے وارث ہونا ہے۔ اپنے جرم کی مقررہ سزا کے علاوہ ایسے مجرم کی مستزاد سزا اُس کا حقِ وراثت سے محروم ہونا ہے۔

(۳) ایک حدیثِ نبوی میں یہ مضمون آیا ہے:

''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ لہٰذا مسلمان کو اس بات کی اجازت نہیں کہ وہ نکاح کا پیغام وہاں بھیجے جہاں اُس کے بھائی کا پیغام گیا ہوا ہے اور معاملہ ابھی طے نہیں ہوا یا خرید و فروخت کی وہاں پیشکش کرے جہاں اُس کے بھائی کی پیشکش گئی ہوئی ہے۔''

اِس حدیث میں ممانعت کا سبب دوسرے کے مفادات کو نقصان پہنچانا ہے۔ یہ حدیث کسی کی خدمات لینے یا جائداد کو کرایہ پر دینے کا ذکر نہیں کرتی لیکن ممانعت کو قیاس کے ذریعے کرائے تک وسعت دی جاسکتی ہے۔

(۴) نمازِ جمعہ کی اذان ہونے پر خرید و فروخت میں مشغول ہونے کی قرآنی متن کی رُو سے ممانعت ہے جس کے پسِ پردہ سبب نمازِ جمعہ کے شوق کا کم ہونا ہے۔ اس حکم کی توسیع رہن یا نکاح تک کی جاسکتی ہے جن کا منصوبہ ایک خاص وقت میں کیا جاچکا ہو۔

اسلامی قانون کی حیثیت سے قیاس کا جواز: ظاہری فرقہ، کچھ معتزلہ نے اور جعفریہ فرقہ (اہلِ تشیع) نے قیاس کو قانونی استدلال کے ذریعہ کی حیثیت سے ماننے سے مسترد کر دیا۔ فریقین (ماننے والوں اور نہ ماننے والوں) کی جانب سے اپنے موقف کی تائید میں کچھ دلائل دی جاتی ہیں جن میں سے کچھ کا ذکر حسبِ ذیل ہے:

قیاس کے حامیوں کے دلائل: یہ دلائل قرآن مجید، سنت نبوی اور صحابہ کرام کے عمل سے ماخوذ ہیں اور معقولیت کی حد تک صحیح ہیں:۔

(۱) قرآنِ حکیم فرماتا ہے: فَاعْتَبِرُوْا يَا أُولِي الْأَبْصَار (سورۃ الحَشر: ۲)
''اے اہلِ بصیرت! سبق حاصل کرو۔'' (۲ : ۵۹)

یہ آیت اہلِ بصیرت اور اربابِ عقل و دانش سے سوال کر رہی ہے کہ وہ کائنات کی اشیاء پر غور و فکر کر کے حقیقتِ حیات اور مقصدِ حیات تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ لفظ ''اعتبار'' کا معنیٰ ہے ایک جگہ سے دوسری جگہ کو منتقل ہونا۔ موجودہ سیاق و سباق میں اس کا معنیٰ اشیاء کا موازنہ کرنے کے لئے ایک خیال سے دوسرے خیال کی طرف منتقل ہونا ہے۔ چونکہ ''قیاس'' قانونی استدلال کا ایک طریقہ ہے جو دو چیزوں کے باہم موازنہ کرنے اور ایک حکم سے دوسرے حکم کی طرف منتقل ہونے کا متقاضی ہوتا ہے، تو وہ بھی آیتِ بالا کے مفہوم میں آتا ہے۔

(۲) گزشتہ صفحہ (۲۸۵۵) میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی مشہور حدیث کا حوالہ دیا گیا ہے جب اُنہیں یمن کا عامل بنا کر بھیجا گیا تھا۔ اُنہوں نے نبی ﷺ کے سامنے یہ بیان دیا تھا کہ اگر وہ قرآنِ مجید اور سنتِ رسول میں بلا واسطہ کوئی شہادت نہ پا سکے تو وہ اپنی جچی تلی رائے کو استعمال کریں گے۔ اُن کے اِس بیان کو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بہ نظرِ تحسین دیکھا۔ چونکہ قانون کے سیاق و سباق میں جچی تلی رائے ایک مخصوص قانونی استدلال سے بڑھ کر نہیں ہوتی اور ''قیاس'' قانونی استدلال کا مضبوط ترین طریقہ ہے لہٰذا بہرصورت قیاس کا قانونی جواز ہے۔

(۳) ایک آدمی نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس حاضر ہوا اور کہا کہ اُس کی والدہ نے اپنے حینِ حیات میں حج کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن وہ حج کرنے سے پہلے ہی وفات پا گئیں، تو کیا وہ اب اپنی والدہ کی جانب سے حج ادا کر سکتا ہے؟ نبیِ اکرم ﷺ نے پوچھا: یہ بتاؤ کہ اگر وہ مقروض ہوتیں تو کیا تم اُن کی جانب سے اُن کا قرض ادا نہ کرتے؟ آدمی نے مثبت میں جواب دیا۔ اس پر نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: پھر اللہ کا قرض ادا کرو، کیونکہ حقوق اللہ اولیٰ ترین ترجیح کے حامل ہیں۔

اس حدیث میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اُس آدمی کو قانونی سوچ بچار کی تعلیم دے رہے ہیں اور کوئی شک نہیں کہ یہ طریقہ ''قیاس'' ہی کے مشابہ ہے۔

(۴) سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی جانب سے ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو تحریر شدہ مشہور مکتوب قیاس کو عمل میں لانے کی بہترین مثال ہے۔ جناب عمر رضی اللہ عنہ نے اُنہیں یہ ہدایت کرتے ہوئے لکھ بھیجا:

''معاملات کا موازنہ طے شدہ اوّلیات (Precedents) کے ساتھ کرو اور پھر تمہارے خیال میں جو نیز رضائے الٰہی کا موجب ہو اور حق و صداقت کے قریب ہو، اُسے اختیار کرو۔''

(۵) قیاس کے بارے میں قرآنِ حکیم میں صاف اور واضح بیان ہے جس میں فرمایا گیا:۔

وَإِذَا جَآءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهٖ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُوْلِ وَإِلٰىٓ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ (النسآء : ۸۳)

''اور جب اُنہیں امن یا خوف کی کوئی بات پہنچتی ہے تو وہ اُسے پھیلا دیتے ہیں اور اگر وہ لوگ اُسے رسول کے پاس یا اپنے میں سے صاحبانِ اختیار کے حوالے کر دیتے تو اُن میں سے جو لوگ استنباط کی صلاحیت رکھتے ہیں' اُس کی حقیقت جان لیتے۔'' (۴ : ۸۳)

مخالفینِ قیاس کے دلائل :اپنے موقف کی تائید میں مخالفینِ قیاس یہ قرآنی آیات بھی پیش کرتے ہیں:

(۱) یَاأَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا لَاتُقَدِّمُوا بَیْنَ یَدَیِ اللہِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللہَ (الحُجُرات : ۱)

''اے ایمان والو! اللہ اور اُس کے رسولؐ سے آگے نہ بڑھو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔'' (۴۹:۱)

وہ کہتے ہیں کہ قیاس پر عمل کرنے والے کا عمل درجِ بالا حکم کے خلاف ہے کیونکہ جب کسی معاملے میں قرآنِ حکیم اور سنتِ نبوی خاموش ہوں تو قیاس سے کام لینا بھی تو اللہ اور اُس کے رسول ﷺ سے آگے بڑھنا ہے۔

(۲) وَلَاتَقْفُ مَالَیْسَ لَکَ بِهٖ عِلْمٌ'' (بنی اسرائیل : ۳۶)

''اور اُس بات کے پیچھے نہ پڑو جس کا تمہیں علم نہ ہو۔'' (۱۷:۳۶)

اُن کا کہنا ہے کہ قیاس کوئی حتمی اور قطعی چیز نہیں ہوتی بلکہ وہ مشکوک ہوتا ہے اور اُس میں اغلبیت کا احتمال ہوتا ہے۔ قیاس پر عمل کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم ایک ایسی چیز کو عمل میں لا رہے ہیں جس کا ہمیں علم ہی نہیں ہے۔ مخالفینِ قیاس کہتے ہیں کہ جب قرآن مجید نے یہ اعلان فرما دیا ہے :

وَنَزَّلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ وَّهُدًی وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰی لِلْمُسْلِمِیْنَ O (اَلنّحل:۸۹)

''اور ہم نے یہ قرآن آپ پر اتارا ہے جو ہر چیز کا روشن بیان ہے اور مسلمانوں کے لئے ہدایت اور رحمت ہے۔''

تو جب قرآنِ حکیم ہر چیز کو کھول کر بیان کرتا ہے تو قیاس کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

(۳) مخالفینِ قیاس کا کہنا ہے کہ شریعت کے قوانین مساوات اور مشابہت کی بنیاد پر نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر چور کا ہاتھ چوری کرنے کی سزا میں کاٹ دیا جاتا ہے جبکہ خائن اور غبن کرنے والے کو اس طرح کی سزا نہیں دی جاتی حالانکہ چوری اور خیانت میں کوئی فرق نہیں ہے۔

لیکن یہ دلائل اپنی ماہیت میں کمزور اور بودے ہیں۔ یہاں نکتہ قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ قاضی نے اپنے پیش نہادہ قانونی مقدمے کے فریق (Litigant) کو سہولت بہم پہنچانی ہے۔ وہ اُنہیں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس مقدمہ کو طے کرنے کے لئے مجھے قرآنِ حکیم اور سنتِ رسول ﷺ میں کوئی چیز نہیں ملی' لہٰذا میں تمہاری مدد کرنے سے قاصر ہوں۔ قرینہ یہی ہے کہ شریعت میں حل موجود ہے اور قاضی کو متن کی محدود تعداد سے وسعت دے کر قانون کو آگے بڑھانے کے لئے قانونی استدلال کو اختیار کرنا ہے۔ یہ خیال کہ قیاس کی بنیاد علم کی قطعیت پر نہیں بلکہ ظن

ہے' بھی بے بنیاد ہے کیونکہ بہت سی آیاتِ قرآنی ظنی الدّلالہ ہیں یعنی اُن کے معانی کو سمجھنے کے لئے ایک سے زیادہ تاویلات ہیں۔("Islamic Jurisprudence"... Imran Ahsan Khan Nyazee, pp. 228-231)

نص میں علّت (سبب) کو معلوم کرنے کے طریقے : قیاس کی بنیاد پر فقہی استدلال کا اوّلیں کام علت کا معلوم کرنا ہے جس کے بغیر قیاس ممکن نہیں ہوتا۔ فقہائے کرام نے متون میں احکام کی علّت معلوم کرنے کے مفصّل طریقے وضع کئے ہیں جنہیں ''مسالک العلّۃ'' کہا جاتا ہے۔ اُن کا خلاصہ درج ذیل ہے :

(۱) **متن (نص)** : بعض اوقات حکم میں موجود علّت کو خود نص ہی بیان کر دیتی ہے اور یہ علّت کی مضبوط ترین قسم ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ متن میں اشارہ واضح نہ ہو بلکہ وہ کسی ایماء یا کسی دیگر اشارے سے واضح ہو۔ بالعموم ظاہر الفاظ لِاَجلِ ذٰلِكَ (اس وجہ سے) اور بعض اوقات اس مقصد کے لئے کَیۡ (تا کہ) کا لفظ بھی استعمال کیا جاتا ہے جیسا کہ اِس آیتِ قرآنی میں: کَیۡ لَا یَکُوۡنَ دُوۡلَۃًۢ بَیۡنَ الۡاَغۡنِیَآءِ مِنۡکُمۡ (الحشر:۷)

''ایماء'' کی ایک صورت ف کے حرف کو لانے سے بھی بنتی ہے جیسے سورۃ المائدۃ کی اِس آیت میں :

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَۃُ فَاقۡطَعُوۡۤا اَیۡدِیَہُمَا (المائدۃ : ۳۸)

''چور مرد اور چور عورت کے ہاتھ کاٹ دو۔'' (۵:۳۸)

اس سے معلوم ہوا کہ ہاتھ کٹنے کا سبب چوری (سرقہ) ہے۔

(۲) **اجماع** : علّت کو اجماع کے ذریعے بھی معلوم کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً کسی یتیم کی جائداد کے نگراں کا رکا معاملہ جس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔

(۳) **تخریج المناط** : جب کسی معاملے کی علّت براہِ راست نہ تو متن اور نہ ہی اجماع سے معلوم ہو سکے تو فقیہ اجتہاد کے ذریعے علّت کی تخریج کرتا ہے۔ اِس طریقے کو علّت کا اخذ کرنا یا ''تخریج المناط'' کہا جاتا ہے۔ مناط کا معنی وہ چیز ہے جس پر دوسری کسی چیز کو لٹکایا جائے۔ اس کے کئی طریقے ہیں جو کتبِ فقہ میں محفوظ ہیں۔

احکام معلوم کرنے کے چار ابتدائی طریقے

(1) مجتہد کا ابتدائی کام متن سے احکام کا معلوم کرنا ہوتا ہے جو متن کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے۔ متن پر انحصار کرتے ہوئے مجتہد کئی ایسے طریقے اختیار کرتا ہے جن کے ذریعے احکام کا استحکام ثابت ہوتا ہے۔ امام سرخسی کے مطابق مندرجہ ذیل چار وسیع طریقوں کا نام ''دلالت'' ہے جن کے ذریعے متن کی تعبیر و مفہوم معلوم کی جاتی ہے :۔

(1) عبارۃ النص : یہ اصل معانی کو جو متن کا مقصدِ حقیقی ہے، متن کے مطالعہ کے بعد معلوم کرنا ہے۔ عبارۃ النص کے ذریعے اصل حکم کسی گہری سوچ کے بغیر معلوم ہو جاتا ہے جو متن میں بذاتِ خود موجود ہوتا ہے۔ بیشتر قانونی متون ابن اصول کے تابع ہوتے ہیں۔ مندرجہ ذیل امثلہ عبارۃ النص کی ہیں:

(i) لَاتَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ (الانعام: ۱۵۱) (جس جان کو اللہ نے محفوظ کر رکھا ہے، اسے قتل مت کرو بجز حق شرعی کے)۔ اس آیت کا صاف اور واضح مطلب یہی ہے کہ قتلِ انسان کی ممانعت ہے۔ یہی اس کے اصل معنیٰ ہیں اور اس میں کوئی دوسرے معنیٰ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

(ii) اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَآتُوا الزَّکٰوۃَ (نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو) کا صاف اور واضح معنیٰ یہی ہے کہ نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیتے رہو۔ یہی اس کے اصل معنیٰ ہیں اور اس میں کوئی دوسرے معنیٰ کرنے کی ضرورت نہیں۔

(iii) بعض اوقات متن میں ایک سے زیادہ بھی معنیٰ ہو سکتے ہیں جن میں سے ایک اصل اور دوسرا ثانوی ہوتا ہے مثلاً سورۃُ البقرۃ کی یہ آیت ۲۷۵: ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰو (یہ سزا اس لئے ہوگی کہ وہ کہتے ہیں کہ بیع بھی تو سود ہی کی طرح ہے حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام کیا ہے)

عبارۃ النص کی رُو سے دو معانی کو شامل ہے۔ ایک معنیٰ تو بیع اور ربٰو میں عدم مشابہت کا ہے جبکہ اس میں دوسرا معنیٰ بیع (خرید و فروخت) کے جواز اور ربٰو (سود) کی ممانعت کا ہے۔ پہلا معنیٰ اصل ہے جبکہ دوسرا ثانوی ہے۔

(iv) فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً (النساء: ۳) (تو جو عورتیں تمہیں پسند ہوں، اُن سے نکاح کر لو دو دو سے، خواہ تین تین سے، خواہ چار چار سے لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی پر بس کرو) (۳ : ۴) یہ آیت تین معانی پر مشتمل ہے: (۱) نکاح کی اجازت (۲) چار سے زیادہ شادیاں کرنے کی ممانعت اور (۳) عدمِ انصاف کے اندیشہ کی صورت میں صرف ایک عورت پر اکتفا۔ یہ تینوں معانی عبارۃ النص ہی سے معلوم ہوئے۔ تاہم ان میں پہلا معنیٰ ثانوی ہے جبکہ آخری دو معانی اصل ہیں۔

(2) ''اشارۃ النص : اس طریقے میں حکم کو متن کے کسی اشارے سے معلوم کیا جاتا ہے اس طرح کہ اصل معانی کو جو متن کا مقصودِ اصلی ہے، مدِّ نظر رکھا جاتا ہے۔ اس طرح ایسے معلوم شدہ حکم کا اثبات متن کا حقیقی مقصد نہیں ہوتا بلکہ وہ تھوڑے سے سوچ بچار کے بعد اپنی مکمل شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔''

''امام سرخسی نے واضح کیا ہے کہ سڑک پر چلتا ہوا کوئی شخص دوسرے شخص کو سڑک کے بیچ میں چلتا ہوا سیدھا اُس کی طرف آتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اُسی نظر میں وہ اپنے گوشہ ہائے نظر سے سڑک پر چلتے ہوئے دوسرے لوگوں کو

بھی دائیں بائیں چلتا ہوا دیکھتا ہے اگر چہ اُس کا مقصد صرف اُس آدمی کو دیکھنا ہے جو سڑک کے بیچ میں چل رہا ہے۔اسی طرح اگر کوئی شخص کسی جانور پر تیر چلائے تو ممکن ہے کہ تیر اپنے صحیح نشانے پر لگ کر پاس کھڑے ہوئے کسی دوسرے کو جا لگے۔ پس عبارۃ النص اور اشارۃ النص سے معلوم شدہ احکام ایک ہی متن سے ثابت ہوتے ہیں۔''

(i) سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۳۳: وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَه' رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (اور جس کا بچہ ہے' اُس کے ذمہ اُن ماؤں کا کھانا اور کپڑا دستور کے موافق ہے) میں عبارۃ النص کے ذریعے اس بات کا اشارہ ہے کہ دودھ پلانے والی ماں کا نان ونفقہ اُس کے خاوند کے ذمہ ہے۔متن میں موجود اشارات میں کئی احکام ثابت ہوتے ہیں جن میں سے یہاں دو کا ذکر کیا جاتا ہے:

(۱) بچہ باپ کا ہوتا ہے کہ اُس سے نسب چلتا ہے نہ کہ ماں سے کیونکہ یہاں باپ کو مَولُود لہ' فرمایا گیا۔ لہٰذا جس کا باپ سید ہو اور ماں غیر سید ہو وہ بچہ سید ہے اور جس کی ماں سیدہ اور باپ غیر سید ہو تو بچہ سیّد نہیں ہوتا۔

(۲) باپ اپنی اولاد کے مال کا مالک ہے کہ اُسے اس کا خرچ کرنا جائز ہے کیونکہ یہاں باپ کو مَولُود لہ' فرمایا گیا۔ جب وہ بچے کا مالک ہوا تو اُس کے مال کا بدرجہ اولیٰ مالک ہوا۔اس کا ثبوت اس حدیثِ پاک میں بھی ملتا ہے جس میں نبی علیہ السلام نے فرمایا :أَنْتَ وَمَالُكَ لِأَبِيْكَ (تو بھی اور تیرا مال بھی تیرے والد کا ہے)۔

(ii) سورۃ النّحل کی آیت ۴۳: فَسْئَلُوْا أَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَاتَعْلَمُوْنَ (اگر تم لوگوں کو علم نہیں تو اہلِ علم سے پوچھ دیکھو) میں عبارۃ النص سے معلوم ہوتا ہے کہ اَھلُ الذِّکر سے معلوم کرنا لازم ہے کیونکہ آیت کا مقصودِ اصلی یہی ہے۔لیکن اشارۃ النص سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اَھلُ الذِّکر کی جماعت کا موجود ہونا ضروری ہے تا کہ اُن سے معلوم کیا جا سکے۔

(iii) سورہ آلِ عمران کی آیت ۱۵۹ : وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (اور ان سے معاملات میں مشورہ لیتے رہئے) میں عبارۃ النص سے معلوم ہوتا ہے کہ معاملات کے سلسلہ میں اسلام کا اصل اُصول مشورہ ہے لیکن اشارۃ النص سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی مجلس مشاورت کا ہونا ضروری ہے کیونکہ ملک کی تمام آبادی سے مشورہ لینا ناممکن ہے۔

(iv) سورۃ الاحقاف کی آیت ۱۵ : وَحَمْلُه' وَفِصَالُه' ثَلَاثُوْنَ شَهْرًا (اور اُس کا حمل اور اُس کی دودھ چھڑائی تیس مہینوں میں ہو پاتی ہے) اور سورہ لُقمان کی آیت ۱۴: وَفِصَالُه' فِيْ عَامَيْنِ (اور دو برس میں اُس کا دودھ چھوٹتا ہے)۔دونوں آیتوں کو ملا کر پڑھنے سے اشارۃ النص کے ذریعے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم زمانہ حمل 24-30= چھ ماہ ہے۔

مندرجہ بالا مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اشارۃ النص کے ذریعے معلوم شدہ احکام بلا دقت مہیا نہیں ہوتے۔ اُن کے لئے متن میں کچھ غور وخوض کی ضرورت ہوتی ہے جس کے لئے فقہ میں مہارت کا ہونا لازمی امر ہے۔

(3) دلالۃ النص: اس طریقے میں کسی چیز کا حکم متن کے الفاظ کے باہمی ربط کو پڑھ کر معلوم کیا جاتا ہے اور اس میں قیاس کے اصولوں کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔ مثالیں درج ذیل ہیں:

(i) سورۃ الاسراء کی آیت ۲۳ : فَلَا تَقُلْ لَّهُمَا أُفٍّ (اُن والدین سے اُف تک نہ کہنا) میں عبارۃ النص سے معلوم ہوتا ہے کہ والدین سے ''اُف'' تک کہنے کی بھی ممانعت ہے جس کی وجہ اُنہیں اذیت دینے سے بچنا ہے۔ متن کی عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُنہیں گالی دینے اور زدوکوب کرنے وغیرہ جیسی پُر آزار اذیتیں دینے کی بھی بہ طریقِ اولیٰ ممانعت ہے کیونکہ وہ ''اُف'' کہنے کی نسبت زیادہ اذیت ناک ہیں۔

(ii) سورۃ النساء کی آیت ۱۰ : إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا (بے شک جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھا لیتے ہیں وہ بس اپنے پیٹوں میں آگ ہی بھرتے ہیں) میں عبارۃ النص سے یتیم کے مال کو ناحق کھانے کی ممانعت معلوم ہوتی ہے۔ تاہم ''دلالۃ النص'' سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یتیم کے مال کو آگ لگانا یا کسی اور طرح اسے ظلماً برباد کرنے کی بھی ممانعت ہے کیونکہ ایسے اعمال بھی تو یتیم کا مال کھانے کے مرادف ہیں۔ ان تمام صورتوں میں وجہِ اصلی ازراہِ ظلم بربادی ہے۔

(4) اقتضاء النص: لفظ ''اقتضاء'' کا معنیٰ ضرورت اور طلب ہے۔ اس سیاق میں اقتضاء النص کا مفہوم متن میں بیان شدہ الفاظ سے نہیں لیا جاتا بلکہ وہ متن کا تقاضا ہوتا ہے۔ یہ ضرورت متن کے معنیٰ کو معلوم کرنے کے لئے اس لئے ضروری ہے کہ اس کے بغیر متن میں بیان شدہ حکم پر عمل کرنا مشکل ہوتا ہے۔ دلالۃ النص کے برعکس اقتضاء النص کو الفاظ کی ترتیب اور باہمی جوڑ کے ذریعے معلوم نہیں کیا جاتا بلکہ قانون کی رُو سے حکمِ اصلی کو معلوم کیا جاتا ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

(i) حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ وَعَمَّاتُكُمْ وَخَالَاتُكُمْ ۔۔ الخ (النساء: ۲۳)
''تم پر حرام کی گئیں تمہاری مائیں، تمہاری بیٹیاں، تمہاری بہنیں، تمہاری پھوپھیاں۔ وغیرہ وغیرہ''

یہاں ماؤں، بیٹیوں وغیرہ کی حرمت اُن سے شادی کرنے میں ہے یعنی اِن رشتوں سے شادی کرنا حرام ہے۔ متن، نکاح (شادی) کے معنیٰ کا متقاضی ہے اگرچہ متن میں اس کا ذکر نہیں ہے۔

(ii) حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ ۔۔۔ الخ (المائدۃ: ۳)
''تم پر حرام کئے گئے ہیں مُردار اور خون اور سؤر کا گوشت ۔۔۔ وغیرہ وغیرہ'' (۵ : ۳)

آیت کے متن میں اقتضاء النص کی رُو سے جو معانی بنتے ہیں وہ ان مذکورہ چیزوں کے کھانے اور اُن استعمال کی ممانعت سے متعلق ہیں۔

''چاروں طریقوں کے مابین تضاد اور اُن سے احکام کا ماخوذ ہونا: اِن مذکورہ بالا چاروں طریقوں سے احکام کا ماخوذ ہونا ترتیب وار ہے۔ اس طرح عبارۃ النص کے ذریعے ثابت شدہ حکم قوی ترین اور مضبوط ترین ہوتا ہے۔ اس کے بعد اشارۃ النص کے ذریعے اخذ شدہ حکم کا درجہ ہے اور پھر دلالۃ النص کا درجہ ہے۔ اقتضاء النص کی رُو سے ثابت شدہ حکم نسبتاً کمزور ترین ہوتا ہے۔ ان طریقوں کو قوت و مضبوطی کے درجات دینے کی اہمیت یہ ہے کہ تضاد کی صورت میں مضبوط تر طریقے کو کمزور تر طریقے پر ترجیح حاصل ہوگی۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں:

(1) عبارۃ النص اور اشارۃ النص کے مابین تضاد : سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۳۳: وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَه' رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْف (اور جس کا بچہ ہے اُس کے ذمہ اُن ماؤں کا کھانا اور کپڑا دستور کے موافق ہے) میں اشارۃ النص کی رُو سے باپ کے بچے پر حقوق کے حوالے سے باپ کو اہمیت دی گئی ہے (جیسا کہ اوپر بیان ہوا)۔ اس کے مقابل جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے دریافت کیا گیا کہ رشتہ داروں میں حسنِ سلوک کا کون زیادہ مستحق ہے؟ تو آپ نے فرمایا: تمہاری ماں۔ پوچھا گیا: اس کے بعد کون؟ جواب دیا: تمہاری ماں۔ پوچھا گیا: اس کے بعد کون؟ جواب دیا: تمہاری ماں۔ پوچھا گیا: اس کے بعد کون؟ جواب دیا: تمہارا باپ۔ عبارۃ النص کی رُو سے یہ حدیثِ مبارکہ ماں کو باپ سے تین درجے زیادہ عطا کرتی ہے۔ جب اِن دو اخذ شدہ اصولوں کا باہم موازنہ کیا جائے تو اشارۃ النص کی رُو سے باپ کو اپنے بچے کی دولت و جائداد پر بڑا حق حاصل ہے جبکہ حدیثِ مبارکہ ماں کو بڑے حقوق عطا کرتی ہے۔

(ii) سورۃ النساء کی آیت ۹۳ :وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءُه' جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا (اور جو کوئی کسی مؤمن کو قصداً قتل کر دے تو اُس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ پڑا رہے گا) میں عبارۃ النص کی رُو سے معلوم ہوتا ہے کہ قاتل کے لئے آخرت میں بہت سزائیں ہیں۔ تاہم اشارۃ النص کی رُو سے قاتل کے لئے اس دنیا میں کوئی قصاص نہیں ہے۔ اور سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۸ : كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى (تم پر مقتولوں کے بارے میں قصاص فرض کر دیا گیا ہے) میں عبارۃ النص کی رُو سے معلوم ہوتا ہے کہ قتلِ انسانی کا قصاص ہے۔ اور اسی آیت ۱۷۸ کے حکم کو عبارۃ النص کی رُو سے سورۃ النساء کی آیت ۹۳ کے حکم پر جو اشارۃ النص سے معلوم ہوا تھا' ترجیح دی جائے گی۔

(2) ''اشارۃ النص اور دلالۃ النص کے مابین تضاد :سورۃ النساء کی آیت ۹۳ :وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءُه' جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا (اور جو کوئی کسی مؤمن کو قصداً قتل کر دے تو اُس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ پڑا رہے گا) میں عبارۃ النص کی رُو سے معلوم ہوتا ہے کہ قتلِ عمد میں کوئی کفّارہ نہیں ہے۔ اور اسی سورۃ النساء کی آیت ۹۲ : وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰى أَهْلِهِ (اور جو کوئی کسی مؤمن کو غلطی سے قتل کر دے تو ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا (واجب ہے) اور خوں بہا بھی جو اس کے عزیزوں کے حوالے کیا جائے گا) میں دلالۃ النص کے ذریعے معلوم ہوتا ہے کہ قتلِ عمد میں بھی کفّارہ ہونا چاہئے۔ فقہائے احناف اشارۃ النص کو دلالۃ النص پر ترجیح دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ قتل خطأ میں کفارہ نہیں ہے۔''

(3) ''عبارۃ النص اور اقتضاء النص کے مابین تضاد: سورۃ النساء کی آیت ۹۲ : وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ (اور جو کوئی کسی مؤمن کو غلطی سے قتل کر دے تو ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا (واجب ہے) اور خوں بہا بھی جو اس کے عزیزوں کے حوالے کیا جائے گا) میں عبارۃ النص کی رُو سے معلوم ہوتا ہے کہ قتلِ خطا میں سزا ہے۔ لیکن حدیثِ مبارکہ: إِنَّ اللهَ رَفَعَ عَنْ أُمَّتِي الْخَطَا وَالنِّسْيَانَ وَمَا اسْتُكْرِهُوا عَلَيْهِ (اللہ تعالیٰ نے میری امت سے خطا' بھول چوک سے کئے گئے کام اور وہ کام جو اُن سے جبراً کرائے جائیں' معاف کر دئے ہیں) میں اقتضاء النص سے معلوم ہوتا ہے کہ خطا میں کوئی سزا نہیں ہے۔ پہلے معنیٰ کو جو عبارۃ النص کی رُو سے حاصل ہوا' دوسرے معنیٰ پر جو اقتضاء النص سے معلوم ہوا' ترجیح دی جائے گی۔

اب یہاں قرآن مجید سے اخذ شدہ احکام کی کچھ مثالیں بیان کی جاتی ہیں جن میں کچھ عبارۃ النص کی رُو سے' کچھ اشارۃ النص کی رُو سے' کچھ دلالۃ النص کی رُو سے اور کچھ اقتضاء النص کی رُو سے اخذ کی گئی ہیں :۔

(1) نبی اکرم ﷺ کے آخری رسول ہونے کے حتمی ثبوت: درج ذیل آیات سے ظاہر ہیں:

(۱) متقین کی متعدد صفات میں سے قرآن حکیم کی رُو سے دو صفات یہ ہیں :

وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ (البقرة : ۴)

''اور جو لوگ اُس پر ایمان رکھتے ہیں جو آپ پر اتارا گیا ہے اور جو آپ سے قبل اتارا گیا ہے۔''

اِس آیت کی عبارۃ النص سے معلوم ہوتا ہے کہ متقین کے لئے قرآنِ حکیم اور اس سے پہلے نازل شدہ کتابوں پر ایمان لانا شرطِ اوّل ہے لیکن ہمارے رسول ﷺ کے بعد آنے والے کسی رسول یا نبی کا ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے ورنہ اللہ کی جانب سے اُس پر ایمان لانے کا اُسی طرح حکم ہوتا جس طرح کہ قرآنِ حکیم اور اس سے پہلی نازل شدہ کتابوں پر ایمان لانے کا حکم ہے۔ اشارۃ النص سے معلوم ہوا کہ نبی اکرم ﷺ اللہ کے آخری رسول ہیں اور رسالت کا منصبِ اعلیٰ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ اقدس پر ختم ہو گیا۔

(۲) وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللهُ نَفْسًا إِذَا جَآءَ أَجَلُهَا وَاللهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ O (المنافقون : ۱۱)

''اور اللہ ہرگز کسی کو مہلت نہیں دیتا جب اُس کی میعادِ مقررہ آجاتی ہے اور اللہ کو تمہارے کاموں کی پوری خبر ہے۔''

کچھ مفسرین کا خیال ہے کہ آیتِ بالا ہمارے نبی اکرم ﷺ کے بارے میں براہِ راست اشارہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ نبی مکرّم (علیہ السلام) کا مشن جونہی تکمیل پذیر ہو' ہم اُنہیں دارِ فانی سے دار البقاء کی طرف بلا لیں گے۔ اب قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ دار البقاء کو سدھارنے کے وقت آپ کی عمرِ مبارک تریسٹھ برس تھی اور سورۃ المنافقون جس میں آیتِ بالا وارد ہوئی' کا نمبر بھی تریسٹھ ہے جس میں آپ کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کا

ذکر ہے۔اس سے اگلی سورۃ التغابن کا تعلق یوم حشر اور روزِ جزا و سزا سے ہے۔اِس منطقی مناسبت کو پڑھنے کے بعد بظاہر نتیجہ یہ نکلا کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وصال شریف اور یوم حشر کے درمیان کوئی رسول اور اللہ کا کوئی پیغمبر نہیں آئے گا اور رسالت کا منصبِ عظیم آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس پر ختم ہو گیا ہے۔

(2) ادب سے گرے ہوئے مطالبے پر خاموش رہنا اُس کا جواب دینے سے بہتر ۔ قرآنی اخلاقیات کا ایک سبق جس میں نوعِ انسانی کو یہ تعلیم دی گئی:۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ۭ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ۭ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ۭ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ O (البقرۃ: ۱۱۸)

''اور جنہیں علم سے بہرہ نہیں وہ کہتے ہیں کہ اللہ ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشانِ (عظیم) کیوں نہیں آجاتا۔ اِسی طرح وہ لوگ اِنہی کا سا کہنا کہہ چکے ہیں جو اُن سے پہلے ہو چکے ہیں۔ اُن کے دل متشابہ ہو گئے' ہم نے اپنے نشان اُن لوگوں کے لئے کھول کھول دیئے ہیں جو یقین رکھتے ہیں۔''

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے مشرکینِ مکّہ نے دو سوال کئے جن میں سے اُن کے دوسرے سوال (کہ ہمارے پاس کوئی نشان کیوں نہیں آجاتا؟) کا جواب ''ہم نے اپنے نشان اُن لوگوں کے لئے کھول کھول دیئے ہیں جو یقین رکھتے ہیں'' کے الفاظ میں دے دیا گیا ہے جبکہ اُن کے پہلے سوال (کہ اللہ ہم سے براہِ راست کیوں نہیں کرتا؟) کا جواب پورے قرآنِ پاک میں کہیں بھی نہیں ہے۔اس کی وجہ میں یہ بتانا مقصود ہے کہ اِن کوتاہ اندیشوں کا یہ سوال حدِّ ادب سے اِس قدر گرا ہوا ہے کہ اُس کا جواب دینے کی نسبت اُس پر خاموش رہنا بہتر ہے۔

(3) مسلمان قاتل کو قتل کا جرم مسلم برادری سے خارج نہیں کر دیتا: سورۃ البقرۃ میں ارشاد ہوا

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰي ۭ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ۭ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَاۗءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ

''مومنو! تم پر مقتولوں کے بارے میں قصاص فرض کر دیا گیا ہے۔آزاد کے بدلہ میں آزاد' غلام کے بدلہ میں غلام اور عورت کے بدلہ میں عورت۔ہاں جس کسی کو اُس کے فریق مقابل بھائی کی طرف سے کچھ معافی حاصل ہو جائے تو مطالبۂ مقتول اور نرم طریق پر کرنا چاہئے اور مطالبہ کو اُس (فریق) کے پاس خوبی سے پہنچا دینا چاہئے۔'' (۱۷۸ : ۲)

اس آیت میں خوارج کی تردید ہے جو کہتے ہیں کہ قتل کے گناہِ کبیرہ کے ارتکاب کی وجہ سے قاتل مسلمان نہیں رہتا اور مسلم اخوّت سے خارج ہو جاتا ہے۔یہ بات شدّت پسندی پر مبنی ہے اور قرآنی تعلیمات' فرامینِ نبوی اور آپ علیہ السلام کے صحابہ کرام کے عمل کے خلاف ہے۔اگر قاتل اپنے اِس فعلِ قبیح سے مسلم برادری سے خارج ہو جاتا تو مِنْ اَخِيْهِ (اُس کے بھائی کی جانب سے) کی عبارت نہ لائی جاتی۔عبارت کی بلاغت و معنویت سر دُھننے کے لائق ہے اور بڑی شان کی حامل ہے۔ایسی حالت میں جبکہ قاتل قتل کا ارتکاب کر چکا ہے۔محبّت' پیار' رحم اور

شفقت کے تمام رشتے ٹوٹ چکے ہیں' عداوت اور انتقام کی آگ بھڑ کنے لگی ہے۔ قرآن مقتول کے غضبناک وارثوں کو یاد دلاتا ہے کہ قاتل بے شک قصوروار ہے' مجرم ہے اور تمہارا غصہ بے جا بھی نہیں۔ تاہم وہ تمہارا اسلامی بھائی تو ہے۔ اگر اُسے بخش دو اور معاف کر دو تو کوئی بڑی بات نہیں۔ مقصد یہ ہے کہ ٹوٹے ہوئے دل پھر جُڑ جائیں اور اسلامی معاشرے کے دامن میں جو چاک پڑ گیا ہے' اُسے پھر سے سی دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کے پاک کلام کی یہی لطافتیں تو تھیں جنہوں نے عربوں کے بے لگام' مادر پدر آزاد سرکشوں کو مطیع بنا دیا تھا۔

غرض اِس انتہائی موقع پر بھی مذکورہ عبارت لا کر یہ بتا دیا کہ قاتل باوجود اتنے سنگین جرم کے کافر نہیں ہو گیا اور اخوتِ اسلامی کے دائرہ سے خارج نہیں ہوا۔ مقتول کا ولی اور وارث قاتل کا دینی بھائی اُس وقت بھی رہتا ہے۔

(4) رمضان المبارک کے رؤیتِ ہلال معتبر کہاں کی ہوگی؟ سورۃ البقرۃ کی یہ آیت ملاحظہ ہو:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ أُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْآنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَالْفُرْقَانِ فَمَنْ شَهِدَ مِنْکُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ (البقرۃ : ۱۸۵)

''ماہِ رمضان وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا۔ اُس میں لوگوں کے لئے ہدایت ہے اور (اس میں) کھلے ہوئے ہدایت اور حق و باطل میں امتیاز کرنے کے دلائل ہیں' سو تم میں سے جو کوئی اس مہینہ کو پائے تو لازم ہے کہ وہ (مہینہ بھر) روزہ رکھے۔'' (۱۸۵ : ۲)

''شہود'' سے دیکھنا اور جاننا دونوں مراد ہیں یعنی خواہ وہ خود دیکھے یا صحیح طریقہ سے اُس کا دیکھا جانا معلوم ہو جائے تو روزہ رکھنا فرض ہو جاتا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر جب ماہِ رمضان کے شروع ہونے کا علم ہو جائے خواہ چاند کو براہِ راست دیکھ کر یا دوسروں سے رؤیت (دیکھنے) کی خبر سن کر' تو بیماروں' مسافروں اور معذوروں کو چھوڑ کر سب مسلمان روزہ رکھنا شروع کر دیں۔

اختلافِ مطالع ایک مسلمہ امر ہے۔ اس لئے فقہاء نے تصریح کی ہے کہ اگر دُور دراز علاقہ میں چاند دیکھا جائے تو اُس کا اعتبار نہ ہوگا:

اِنَّ الْبِلَادَ اِذَا تَبَاعَدَتْ کَتَبَاعُدِ الشَّامِ مِنَ الْحِجَازِ فَالْوَاجِبُ عَلٰی اَهْلِ کُلِّ بَلَدٍ اَنْ تَعْمَلَ عَلٰی رُؤْیَتِهٖ دُوْنَ رُؤْیَةِ غَیْرِهٖ (تفسیر قرطبی بحوالہ ضیاء القرآن' ج ۱' ص ۱۲۵)

''جب ملک دُور دراز کے فاصلے پر ہوں جیسے ملکِ شام سے ملکِ حجاز دُور ہے' تو ہر ملک کے باشندوں پر چاند کے دیکھے جانے پر عمل کرنا (روزہ رکھنا) واجب ہو جاتا ہے' دوسروں کے دیکھنے کا اعتبار نہ ہوگا۔''

امام مسلم کا شمار فقہاء محدثین میں ہوتا ہے۔ اُنہوں نے اپنی صحیح کی کتاب الصیام کے ایک باب کا عنوان یہی قرار دیا ہے: بابُ بیان اَنَّ لِکُلِّ بَلَدٍ رُؤْیَتَهُمْ وَاَنَّهُمْ اِذَا رَاَوُا الْهِلَالَ بِبَلَدٍ لَا یُثْبُتُ حُکْمُهٗ لِمَا بَعُدَ عَنْهُمْ (یعنی اس بیان میں باب کہ ہر شہر کے لئے رؤیت وہیں کی معتبر ہے اور اس میں کہ جس بستی میں چاند دکھائی

دے' وہاں سے دُور کی بستیوں پر وہاں کا حکم عائد نہ ہوگا۔

تفسیر قرطبی میں صحیح مسلم کے حوالہ سے ایک روایت اس مضمون کی درج ہے کہ ایک بار رمضان کے سلسلہ میں رؤیتِ ہلال کی خبر بدینہ پہنچی۔ دونوں جگہوں کی تاریخوں میں فرق نکلا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ صحابی نے حدیثِ نبوی کا حوالہ دے کر فتویٰ دیا کہ ہم تو یہیں کی رؤیت کا اعتبار کریں گے۔ اور پھر اُس کے آگے امام قرطبی نے یہ لکھا ہے کہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے غیر رؤیت پر بے اعتباری نہیں کی بلکہ:

اِنَّمَا رَدَّہ' لِاَنَّ الرُّؤْیَۃَ لَا یَثْبُتُ حُکْمُھَا فِیْ حَقِّ الْبَعِیْدِ (الجامع لاحکام القرآن)

''اُنہوں نے اس پر عمل کرنے سے اس لئے انکار کیا کہ رؤیت کا حکم دُور دراز مقامات پر صادق نہیں آتا۔''

فقیہ قاضی ابن رُشد مالکی نے اِس حدیث سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ہر بستی کے لئے وہیں کی رؤیت معتبر ہے' چاہے بستیاں آس پاس کی ہوں یا دُور کی:

فَظَاھِرُ ھٰذَا الْاَثَرِ یَقْتَضِیْ اَنَّ لِکُلِّ بَلَدٍ رُؤْیَتَہ' قَرُبَ اَوْبَعُدَ (بد ایۃ المجتھد)

ابن عبدالبرؒ نے یہ اجماع نقل کیا ہے کہ خراسان اور اسپین جیسے دُور دراز ممالک میں سے ایک کے ہاں کا اعتبار دوسری جگہ نہیں کیا جائے گا۔ (تفسیر ماجدی اردو' صفحہ ۷۰' نوٹ : ۶۶۴)

''اس دنیا کے پردہ پر اگر کوئی ملک ایسا آباد ہے کہ وہاں انسانی آبادی عاقلوں' بالغوں اور شریعت کے مکلفوں کی ہے اور وہاں کئی کئی مہینے آفتاب طلوع نہیں ہوتا یا جب طلوع ہوتا ہے تو کئی کئی مہینے غروب نہیں ہوتا' تو ظاہر ہے کہ وہاں رؤیتِ ہلال کے اُنتیسویں دن یا تیسویں دن کے واقع ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں اور جب یہ نہیں تو وہاں شُھُوْدُ الشَّھْر یعنی طلوعِ ماہِ رمضان کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔۔۔۔ قرآن مجید کے اِس اعجازِ بلاغت پر قربان جایئے کہ صرف ایک لفظ شَھِدَ الشَّھْرَ کے لے آنے سے کتنے سوالات اور شبہات کی جڑ کاٹ دی۔۔ بطور تطوع یا بہ خیالِ تقویٰ کوئی وہاں بھی روزہ رکھنا چاہے تو سونے' جاگنے' کھانے' پینے غرض دنیا کے اور سارے کاروبار کے لئے وہاں اوقات کا جو معیار ہو' کسی اندازہ اور حساب سے روزہ بھی رکھ سکتا ہے۔'' (ایضاً)

(5) تحدیدِ نسل (Birth-control) کا قرآنی اشارہ: سورۃ النساء میں ارشادِ باری تعالیٰ ہوا:

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً اَوْمَامَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ ذٰلِکَ اَدْنٰی اَلَّا تَعُوْلُوْاO

''اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم عدل نہ کرسکو گے تو پھر ایک ہی (بیوی) پر بس کرو' یا جو کنیز تمہاری مِلک میں ہو' یہ اس کے زیادہ قریب ہے کہ تم ایک ہی طرف نہ جھک جاؤ۔'' (۴ : ۳)

عَالَ کا ایک معنیٰ تو ظلم کرنے یا ایک طرف جھک جانے کے ہیں۔ لیکن اس کا ایک اور معنیٰ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے: اَلَّا تَعُوْلُوْا اَیْ لَا تُکْثِرُوْا عَیَالَکُمْ (تمہارے بال بچے زیادہ نہ ہو جائیں) یعنی اگر تم

ایک بیوی پر اکتفا کرو گے تو کثرتِ اولاد تمہیں پریشان نہیں کرے گی۔'' (''ضیاء القرآن'' جلد اوّل صفحہ ۳۱۸)

(6) اخلاقی قدریں اور اخلاقی زندگی جسمانی زندگی سے زیادہ قابلِ قدر ہیں: سورۃ البقرہ کی آیت ۱۷۳ اور سورۃ المائدہ کی آیت ۳ میں خنزیر کو حرام قرار دیا گیا ہے اس حقیقت کے باوجود کہ وہ حیاتِ انسانی کے لئے مہلک نہیں ہے۔ اس کے برعکس زہر کو باوجود اس حقیقت کے کہ وہ انسانی زندگی کے لئے مہلک ہے' حرام قرار نہیں دیا گیا۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ کسی بھی قسم کے زہر کا اثر انسانی اخلاقیات پر نہیں پڑتا اور جدید سائنسی تحقیق کا بھی یہی نظریہ ہے' لہٰذا اُسے حرام نہیں کیا گیا۔

نوٹ: مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہوں انسائیکلوپیڈیا ہذا کی جلد چہارم کے صفحات ۱۵۳۹' ۱۵۴۰۔

(7) کعبۃ اللہ کا تقدّس اور حرمت: سورہ آل عمران میں اُرشاد ہوا:

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ O فِیْہِ اٰیٰتٌ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰھِیْمَ وَمَنْ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا (آل عمران: ۹۶' ۹۷)

''سب سے پہلا مکان جو لوگوں کے لئے وضع کیا گیا' وہ وہ ہے جو مکّہ میں ہے' (سب کے لئے) برکت والا اور سارے جہان کے لئے راہنما ہے۔ اُس میں کھلے ہوئے نشانات ہیں (اُن میں سے ایک) مقامِ ابراہیم ہے اور جو کوئی اُس میں داخل ہو جاتا ہے وہ امن سے ہو جاتا ہے۔''

آیتِ بالا کا خط کشیدہ حصّہ ہماری توجہ چاہتا ہے۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ کعبۃ اللہ (معاذ اللہ) اس مفہوم میں عادی مجرموں کی پناہ گاہ ہے کہ دنیا کے کسی حصّے میں بھی کوئی شخص کوئی جرم کرے تو پناہ لینے کے لئے وہ کعبۃ اللہ کا رخ کرے کیونکہ اُسے معلوم ہے کہ وہ ہر ایک کے لئے محفوظ جگہ ہے؟ نہیں' اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں اور ایسی سوچ غلط سوچ ہے۔ فقہاء کا کہنا ہے کہ کعبۃ اللہ کے تقدّس کے پیشِ نظر کعبۃ اللہ کی حدود میں پناہ لینے والے مفرور مجرم کو نہ تو جسمانی اذیت دی جائے اور نہ ہی وہاں اُسے سزا دی جائے بلکہ اس کی بجائے اُس کی خوراک اور رزق کے تمام ذرائع اُس کے لئے ایسے محدود اور تنگ کر دئے جائیں جس سے وہ حدودِ کعبہ سے باہر آنے پر مجبور ہو جائے اور کعبۃ اللہ اور مسجدِ حرام سے باہر آنے پر اُسے جرم کے مطابق سزا دی جائے۔

(8) شریعت میں مشکل کی بجائے آسانی کو اختیار کیا گیا ہے

وَاِنْ کُنْتُمْ مَّرْضٰی اَوْ عَلٰی سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْکُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْدًا طَیِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْھِکُمْ وَاَیْدِیْکُمْ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا

''اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی استنجا سے آیا ہو یا تم نے اپنی بیویوں سے قربت کی ہو' پھر تمہیں پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے تیمم کر لیا کرو یعنی اپنے چہروں اور ہاتھوں پر ہاتھ پھیر لیا کرو' بیشک اللہ بڑا معاف کرنے والا ہے' بڑا بخشنے والا ہے۔'' (۴ : ۴۳)

فقہ القرآن کا بنیادی اصول جس پر شریعتِ اسلامی کی شاندار عمارت اُستوار ہے' یہ ہے کہ قرآن مجید اپنے ماننے والوں کے لئے پریشان کن اور چکر دار بھول بھلیّوں کی بجائے ایسے ذرائع اور راستے اختیار کرتا ہے جن پر عمل کرنا آسان ہے۔ یہاں بھی ملاحظہ ہو کہ حدثِ اصغر یعنی وضو نہ ہونے کی صورت میں غسل کرنا لازم قرار نہیں دیا گیا کیونکہ وضو اکثر جاتا رہتا ہے اور وضو نہ ہونے کی صورت میں ہر دفعہ نیا غسل کرنے میں جو مشکل درپیش ہوتی ہے وہ ظاہر ہے۔ اس کے برعکس بیوی سے قربت کی صورت میں جو کثیر الوقوع نہیں ہوتی اور معقول وقفوں سے ہوتی ہے' غسل کرنا واجب ہوتا ہے جو ظاہری طہارت و پاکیزگی' اعصابی کسلمندی اور مزاج دارستی کے لئے بہترین علاج ہے۔ اس آیت سے فقہائے کرام نے متعدد نفیس اور باریک نکات اخذ کئے ہیں۔

(9) ظالم و جابرین کی تباہی و بربادی پر خوشی منانا اور اللہ کا شکر ادا کرنا خود الٰہی سبق ہے

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ O (الانعام : ۴۵)

''تو اُس قوم کی جڑ کاٹ کے رکھ دی گئی جس نے ظلم کیا تھا اور سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جو سارے جہانوں کا پالنہار ہے۔'' (۶ : ۴۵)

ظالم قومیں جن کی چیرہ دستیوں سے اللہ کی مخلوق تنگ آ چکی ہوتی ہے' جب تباہ و برباد کر دی جاتی ہیں تو ہر طرف اطمینان اور آرام کا سانس لیا جاتا ہے اور واقعی وہ لمحہ اِس قابل ہوتا ہے کہ مظلوم اور ستم رسیدہ لوگ اپنے ربِّ کریم کی حمد و ثنا کے گیت گائیں جس نے اُن کی بے کسی اور بے بسی پر ترس کھا کر اُنہیں اُن جابر ظالموں کی قیدِ غلامی سے نجات بخشی۔

(10) اللہ کے رسول کی تعظیم و توقیر کرنا ایمان و ایقان کا دروازہ ہے: جب فرعونِ مصر نے اپنے ملک کے جادوگروں اور ساحروں کو اللہ کے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ کے لئے اکٹھا کیا تو اُن جادوگروں نے جنابِ موسیٰ علیہ السلام سے یہ اجازت طلب کرتے ہوئے آپ کی تعظیم و توقیر کی کہ اُنہیں بتلایا جائے کہ شروع کون کرے گا؟ کرکٹ کی اصطلاح میں پہلی اننگز (Innings) کس کی ہوگی؟ قرآن حکیم کے اُلفاظ ملاحظہ ہوں:

قَالُوْا يٰمُوْسٰى اِمَّا اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّا اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ O (الاعراف : ۱۱۵)

''وہ (ساحر) بولے: اے موسیٰ! یا تو تم پہلے ڈالو یا ہم ہی ڈال چلیں۔'' (۷:۱۱۵)

مفسرینِ کرام فرماتے ہیں کہ اللہ کے پیغمبر موسیٰ علیہ السلام کی تعظیم و توقیر کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اُنہیں دولتِ ایمان سے سرفراز فرمایا جیسا کہ اسی سورۃ الانعام کی آیات ۱۲۰ تا ۱۲۲ میں بیان ہو رہا ہے۔

(11) کچھ آیاتِ قرآنی کے مابین تضاد کا ازالہ: درج ذیل آیت میں طلبِ علم کا شوق دلایا گیا:

فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ O (النحل :۴۳)

''سو اگر تم لوگوں کو علم نہیں تو اہلِ علم سے پوچھ لیا کرو۔'' (۱۶ : ۴۳)

جبکہ درجِ ذیل آیت کا مضمون سورۃ النّحل کی مذکورہ بالا آیت سے متصادم ہے:

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْم" (بنی اسرائیل : ۳۶)

''اور اُس چیز کے پیچھے مت ہولیا کرو جس کی بابت تمہیں (صحیح) علم نہ ہو۔'' (۱۷ : ۳۶)

اِن دونوں آیات کے مابین ظاہری تضاد کو مسلمان فقہائے کرام نے اس طرح دُور کیا ہے کہ اوّل الذکر آیت میں رضائے الٰہی کا سبب بننے والے مثبت علم کی تلاش و جستجو کی ترغیب دی گئی ہے جبکہ مؤخر الذکر آیت فضول اور بے ثمر جستجو کی مذمت میں ہے کہ بلاتحقیق ہر سنی سنائی بات کے پیچھے نہ ہولیا کرو۔ فضول تجسس ہماری جہالت اور لاعلمی کی وجہ سے ہمیں بدی کی طرف لے جا سکتا ہے جبکہ ہمیں ہر ایسے خطرے سے اپنا تحفظ کرنا ہے۔

اس ظاہری تضاد کی ایک اور مثال سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۷۰ ہے جس میں بنی نوعِ انسان کو دوسری مخلوقات پر اعزاز و اِکرام بخشا گیا جبکہ سورۃ التوبۃ کی آیت ۲۸ میں مشرکین کو' جو بہرحال انسان ہیں' پلید اور نجس کہا گیا کہ وہ مسجدِ حرام میں داخل نہ ہوں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ مشرک ٹٹی' پیشاب کی طرح نجس اور پلید نہیں۔ اُن کی پلیدی اور ناپا کی بطورِ استعارہ ہے اور یہی استعارہ اُس ظاہری تضاد کو دُور کرتا ہے۔

(12) رؤیتِ باری تعالٰی (دیدارِ الٰہی) قرآن سے ثابت ہے

(۱) وُجُوْه" يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَة"O اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَة"O (اَلقیمة : ۲۳' ۲۴)

''اُس دن (کتنے ہی) چہرے بشاش ہوں گے اور اپنے پروردگار کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔'' (۷۵ : ۲۳' ۲۴)

اِلٰی سے بعض عارفین نے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ کمالِ قرب و کثرتِ انوار کے باوجود نظارہ کرنے والے میں احساسِ تشخص و درک باقی رہے گا۔ تلذّذ و تکیف پوری طرح ہوسکے گا' فنائے محض کی کیفیت طاری نہ ہوگی۔ اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَة" فعل نَظَرَ کا صلہ جب اِلٰی کے ساتھ آتا ہے تو اُس کے معنی رؤیت ہی کے ہوتے ہیں۔ (ماجدی' ص ۱۱۶۰)

(۲) كَلَّا اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَO (اَلْمُطَفِّفِیْن : ۱۵)

''ہرگز (ایسا) نہیں (کہ جزا و سزا نہ ہو) اُس روز یہ (کافر) لوگ (پروردگار کے دیدار سے) روک دئے جائیں گے۔'' (۸۳:۱۵)

اس سے معلوم ہوا کہ کفار کی سزا دیدارِ الٰہی سے محرومی ہے (جبکہ دوزخ اُس کا نتیجہ ہے) تو دلالۃ النص سے ثابت ہوا کہ اللہ کے مطیع و فرمانبردار بندے دیدارِ الٰہی کی نعمتِ عظمٰی سے سرفراز کئے جائیں گے۔

دیدارِ الٰہی کے منکرین اپنے موقف کی تائید میں قرآن پاک کی یہ آیت پیش کرتے ہیں :
لَاتُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ یُدْرِکُ الْاَبْصَارَ وَهُوَاللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ O (الانعام : ۱۰۳)
''اُسے نگاہیں نہیں گھیر سکتیں بلکہ وہ نگاہوں کو گھیرے ہوئے ہے' اور وہ بڑا باریک بین' بڑا باخبر ہے۔'' (۱۰۳ : ۶)

اِدراک کا معنیٰ ہے کسی چیز کو گھیر لینا اور اُس کا احاطہ کر لینا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ احاطہ صرف اُس چیز کا کیا جا سکتا ہے جو محدود ہو اور کسی خاص سمت میں پائی جاتی ہو۔ رب تعالیٰ کی ذات نہ تو محدود ہے اور نہ کسی جہت میں موجود۔ اس لئے اُس کا احاطہ کرنا ناممکن ہے۔ معتزلہ اور خوارج نے اس آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار اِس دنیا میں اور آخرت میں ناممکن ہے لیکن اُن کا یہ استنباط مذکولہ بالا آیات کی رُو سے غلط ہے۔ اور اگر یہ محال عقلی ہوتو حضرت موسیٰ علیہ السلام کبھی دیدار کا سوال نہ کرتے کیونکہ نبی کی شان سے یہ بعید ہے کہ ایسی بات کا سوال کرے جو محال ہو۔ نیز احادیثِ صحیحہ اور جلیل القدر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور علمائے اُمّت کے اقوال سے ثابت ہے کہ شبِ معراج اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کریم ﷺ کو اپنے دیدار سے مشرّف فرمایا۔ مروان نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا: هَلْ رَاٰی مُحَمَّدٌ رَبَّهٗ؟ کیا مصطفٰی علیہ السلام نے اپنے رب کو دیکھا؟ تو اُنہوں نے جواب دیا: ہاں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا بھی یہی قول ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے اس کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا :اَنَا اَقُوْلُ بِحَدِیْثِ ابْنِ عَبَّاس: بِعَیْنِهٖ رَآهُ رَآهُ حتّٰی انْقَطَعَ نَفَسه ' (میرا تو وہی قول ہے جو ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ (علیہ السلام) نے اپنی آنکھوں سے اپنے رب کو دیکھا' اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ یہ لفظ امام احمد نے اِتنی بار دہرایا کہ آپ کا سانس ٹوٹ گیا)۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے ربّ کا دیدار کیا ہے۔ اگر کوئی شخص مُصر ہو کہ آیت میں ادراک کا معنیٰ دیکھنا ہی ہے تو اِس کا جواب بھی علمائے کرام نے دیا ہے کہ عام نگاہیں اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتیں۔ ہاں جب اللہ تعالیٰ کسی کو اپنے شرفِ دیدار سے مشرّف کرنا چاہتا ہے تو اُس میں ایسی قوت پیدا کر دیتا ہے جس سے وہ دیدار کر سکتا ہے جیسے حضور کریم محمد رّسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم

مُوسیٰ زہوش رفت زیک جلوۂ صفات   تُو عینِ ذات می نگری در تبسّمی

(''ضیاء القرآن'' ج ا' ص ص ۵۸۸' ۵۸۹ ۔۔۔ پیر کرم شاہ الازہری)

(13) سرکاری اور مالیاتی منصبوں کے حصول کی آرزو رکھنا : اسلام میں سرکاری عہدوں اور مالیاتی منصب پر براجمان ہونے کی خواہش کرنا کوئی قابلِ ستائش اور حوصلہ افزا بات نہیں ہے کیونکہ سورۂ القَصَص کی آیت ۸۳ میں فرمانِ الٰہی ہے:

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِیْنَ لَایُرِیْدُوْنَ عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ وَلَافَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ O
''یہ عالَمِ آخرت تو ہم اُنہی لوگوں کے لئے خاص کر دیتے ہیں جو زمین پر نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا اور انجامِ (نیک) تو متقیوں ہی کا (حصہ) ہے۔'' (۸۳ : ۲۸)

اِس واضح خدائی اعلان کے پیشِ نظر یہ بات نا قابلِ فہم ہے کہ سیّدنا یوسف علیہ السلام نے مصر کے مالیاتی اور سرکاری معاملات کا انتظام سنبھالنے کے لئے اپنے آپ کو کیوں پیش کیا جیسا کہ سورہ یوسف کی آیت ۵۵ میں اُن کی اس پیشکش کا بیان ہوا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام کسی شخص کے سرکاری معاملات کو سنبھالنے اور کسی باعزت منصب پر تعیناتی کے ہرگز خلاف نہیں ہے اور یہ سمجھنا کہ آخرت کی کامیابی کے لئے اس دنیا کی محرومیاں شرطِ اوّل ہیں' انتہائی غلط تصوّر ہے۔ درحقیقت اسلام کی آمد تو ہوئی ہی اس لئے ہے کہ وہ اپنے ماننے والوں کو اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ (غلبہ تم ہی کو حاصل ہوگا) کا تاج پہنائے۔ قرآنی متن کا لفظ ''غــلــو'' کا معنیٰ بالا دستی ہے جو اپنے اَبنائے جنس کو ذلیل کرنے اور اُن کے قانونی حقوق کے غصب کرنے کا نتیجہ ہوتی ہے۔

فقہائے کرام کا موقف یہ ہے کہ جب سرکاری عہدوں اور منصبوں کے لئے موزوں اور باصلاحیت افراد جود ہوں تو ایک صالح اور پارسا آدمی کی شان کے لائق نہیں کہ وہ اُن عہدوں کی آرزو کرے یا اُن کے لئے کوشش کرے۔ لیکن اگر ایسے لوگوں کا ملنا قحط الرجال کے ضمن میں آتا ہو تو صالحین کا پردے کے پیچھے چھپے رہنا قرینِ مصلحت نہیں ہوتا بالخصوص جبکہ اُنہیں یقین ہو کہ حالات تباہی کے کنارے پر ہیں اور اُن کا کارِ منصب کو نہ سنبھالنے کی صورت میں بدنصیبی اور پریشان کن ہنگامے پوری قوم کا مقدّر بن جائیں گے۔ اِس تمام صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد بھی اگر وہ پیچھے رہنے ہی کو ترجیح دیں اور آگے نہ بڑھیں تو وہ اپنی کاہلی کی وجہ سے اپنے خالق کے حضور جوابدہ ہوں گے۔ سیّدنا یوسف علیہ السلام کا اپنے آپ کو عہدۂ مالیات کے لئے پیش کرنے کے پسِ پردہ مقصد صرف مصری قوم کی فلاح و بہبود تھا کہ آپ کو معلوم ہو گیا تھا کہ کوئی اور موزوں شخص اس ذمّہ داری کو اٹھانے کا اہل نہیں۔ کسی برائی یا قوّت و منصب کی خواہش کو کسی بھی پیغمبر کی طرف منسوب کرنا افترا پردازوں کی جانب سے دُور از کار' بعید از فہم اور ایک پلید و ناپاک عمل ہے۔ قرآن مجید نے تو سورہ یــوسُف کی آیت ۲۴ میں یوسف علیہ السلام کی پاکبازی اور عظمتِ کردار کی گواہی دی ہے۔

(14) <u>نیکیاں صغیرہ گناہوں کا کفارہ ہیں</u>: سورہ ھود میں ارشادِ باری تعالیٰ ہوا:

اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (ھُود : ۱۱۴)

''بے شک نیکیاں بدیوں کو مٹا دیتی ہیں۔'' (۱۱۴ : ۱۱)

آیت سے معلوم ہوا کہ نیکیاں صغیرہ گناہوں کے لئے کفّارہ ہوتی ہیں' خواہ وہ نیکیاں نماز ہوں یا صدقہ یا ذکر و استغفار یا کچھ اور۔ صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ پانچوں نمازیں اور جمعہ سے دوسرے جمعہ تک اور ایک روایت میں ہے کہ رمضان دوسرے رمضان تک یہ سب اُن گناہوں کے لئے کفّارہ ہیں جو اُن کے درمیان واقع ہوں جبکہ آدمی کبیرہ گناہوں سے بچ کر رہے۔ (''کنز الایمان''۔۔ سید محمد نعیم الدین مراد آبادی' ص ۳۰۳)

(15) **قرآن مجید کی رحمت کی نسبت نبی ﷺ کی رحمت زیادہ وسیع ہے**: اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک (قرآنِ حکیم) کو مؤمنین کے لئے رحمت وغیرہ فرمایا ہے۔آیت ملاحظہ ہو:

(i) يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ○ (يُونُس: ۵۷)

''لوگو! بالیقین تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آ گئی ہے اور شِفاء بھی اُن بیماریوں کے لئے جو سینہ میں ہوتی ہیں اور ایمان والوں کے حق میں ہدایت اور رحمت ہے۔'' (۵۷ : ۱۰)

یہاں قرآن مجید کے چار اوصاف بیان ہوئے: موعظة' شِفاء' هُدًى' رَحمة'' یہ سب تنوین کے ساتھ بصیغہ نکرہ میں ہیں۔ یہ تنکیر اُن کی عظمت کے اظہار کے لئے ہے۔ اِن چار اوصاف کی تشریح میں صاحب روح المعانی (علامہ سید محمود آلوسی) نے بعض محققین کے حوالہ سے لکھا ہے کہ نفسِ انسانی کے لئے حصولِ کمال میں چار مراتب اور منزلیں ہیں اور ان میں سے ہر لفظ ایک ایک مرتبہ یا منزل کی طرف اشارہ کر رہا ہے:۔

(۱) پہلا مرتبہ تہذیبِ ظاہر کا یعنی گناہوں اور اعمالِ بد سے بچنے کا ہے۔ موعِظت اسی مقصد کے لئے آیا ہے۔ (۲) دوسرا مرتبہ تہذیبِ باطن کا یعنی اخلاقِ ذمیمہ وعقائدِ فاسدہ سے بچنے کا ہے۔ اِسے شِفاء'' لِّمَا فِي الصُّدُورِ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (۳) تیسرا مرتبہ عقائدِ حقّہ و اخلاقِ فاضلہ سے آراستہ ہونے کا ہے یہ منزل هُدًى کی ہے۔ (۴) چوتھا مرتبہ انوارِ الٰہی سے جگمگا اُٹھنے کا ہے اور یہ مقامِ رحمة کا حاصل ہے۔

(ii) وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِينَ ○ (اَلنّحل)

''اور ہم نے آپ پر ہر بات کو کھول دینے والی کتاب اتاری ہے جو مسلمانوں کے حق میں ہدایت اور رحمت اور بشارت ہے۔'' (۸۹ : ۱۶)

(iii) وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ'' وَّرَحْمَةٌ'' لِّلْمُؤْمِنِينَ (بنی اسرائیل: ۸۲)

''اور ہم قرآن میں ایسی چیزیں نازل کرتے ہیں جو ایمان والوں کے حق میں شِفاء اور رحمت ہیں۔'' (۸۲ : ۱۷)

(iv) قُلْ هُوَ لِلَّذِينَ آمَنُوا هُدًى وَّشِفَاءٌ'' (حٰم السجدة: ۴۴)

''(اے نبی مکرم!) فرما دیجئے کہ یہ (قرآن) ایمان والوں کے لئے ہدایت و شِفاء ہے۔'' (۴۴ : ۴۱)

لیکن ہمارے نبی معظم ﷺ کو ربُّ العالمین نے تمام جہانوں کے لئے رحمت یعنی رَحمة'' لِّلعالَمین کا تابندہ اور درخشاں سہرا پہنا کر بھیجا (سورۃ الانبیاء: ۱۰۷)۔

رَحمۃ'' لّلعالَمین ہونے کا مطلب یہ ہے کہ رَبُّ العالَمین کی ربوبیت جہاں جہاں پہنچ رہی ہے' وہاں وہاں رَحمۃ'' لّلعالَمین (ﷺ) کی رحمت کا گزر ہے۔

(16) تمام نیکیوں کی شرطِ اوّل یعنی صحیح عقیدہ کا عملِ صالح سے پہلے ہونا لازم ہے

(۱) مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ" فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ O (اَلنَّحل : ۹۷)

''جو کوئی بھی نیک عمل کرے گا مرد ہو یا عورت بشرطیکہ صاحبِ ایمان ہو تو ہم اُسے ضرور ایک پاکیزہ زندگی عطا کریں گے اور ہم اُنہیں اُن کے اچھے کاموں کے عوض میں ضرور اجر دیں گے۔'' (۱۶ : ۹۷)

(۲) وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ" فَلَا يَخَافُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا O (طٰهٰ: ۱۱۲)

''اور جس کسی نے نیک کام کئے ہوں گے اور وہ ایمان والا بھی ہوگا تو اُسے نہ اندیشہ زیادتی کا ہوگا اور نہ کمی کا۔'' (۲۰ : ۱۱۲)

ملاحظہ ہو کہ ہر دو آیاتِ بالا میں عملِ صالح کے ساتھ مؤمن ہونے (وَهُوَ مُؤْمِن") کی قید و شرط ساتھ لگی ہوئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ غیر مسلموں کے اعمالِ صالحہ صورۃً تو ہیں حقیقۃً نہیں۔ اُن کا یتیموں' بیوگان اور حرماں نصیبوں کی سرپرستی کرنے' راہگیروں کے لئے کنویں کھدوانے' ہسپتالوں' سکولوں اور کالجوں کے قائم کرنے' والدین کے لئے دستِ تعاون دراز کرنے وغیرہ کے کام اللہ تبارک وتعالیٰ کے نزدیک لایعنی اور بے ثمر ہیں کیونکہ اُن کی بنیاد ایمان پر نہیں۔ اُن کے اِن خیر و فلاح کے کاموں کا ذرّہ برابر بھی وزن نہ ہوگا۔ وہ ضائع جائیں گے اور اپنے کرنے والوں کے لئے عجب یاس و حسرت کا سامان بن کے رہ جائیں گے۔ صحیح عقیدے کے ساتھ تھوڑی سی نیکی ایک دیو ہیکل پہاڑ کی طرح ہے جبکہ بد عقیدگی پر مبنی اعلیٰ ترین اور عظیم ترین نیکی مکھی کے پَر کی طرح بے وزن اور لاحاصل ہے۔ نیکی کی جزا اور اُس کا ثواب دینے والا اللہ تبارک وتعالیٰ ہے۔ اُسے اگر اپنے اعمال و افعال میں نظر انداز کر دیا جائے کسی کی زندگی پر اللہ پر عدمِ ایمان اور کفر حاکم ہو جائیں تو ایسے لوگوں کو اپنی رحمت و عنایات سے کون نوازے گا؟

(17) ایک غلط فہمی کا ازالہ

ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ ذیل کی آیتِ قرآنی سے شراب کے حلال ہونے کا ثبوت مہیا کریں:

وَمِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا (اَلنَّحل : ۶۷)

''اور کھجوروں اور انگوروں کے پھلوں میں (بھی تمہارے لئے سبق ہے)۔ تم اُس سے نشہ کی چیزیں اور کھانے کی عمدہ چیزیں بناتے ہو۔'' (۱۶: ۶۷)

لیکن شراب اور مسکرات بہرحال حرام ہیں اور مندرجہ بالا آیت کو اُن کے جواز کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا

دراصل آیت مکی ہے اور نشہ کی حرمت اُس وقت تک نازل ہوئی نہیں تھی۔ اس پر بھی قرآن مجید نے سَکَر کو رزق حَسَن سے علیحدہ و ممتاز کر کے ظاہر کر دیا کہ یہ دو مختلف قسم کے کام اِنہی پھلوں سے لئے جا سکتے ہیں۔

(18) تمباکو نوشی اور سگریٹ نوشی کے حلال یا حرام ہونے کا کوئی اشارہ قرآن مجید یا احادیثِ مبارکہ میں نہیں ملتا۔ تو شریعت میں اُن کا حکم معلوم کرنے کے لئے ہمیں فقہِ اسلامی کے دو بڑے ماخذوں یعنی قرآن و حدیثِ نبوی کی طرف رجوع کرنا ہوگا اور یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ ایسی چیزوں کے بارے میں کیا کہتے ہیں اگرچہ اشارۃً ہی کیوں نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ سگریٹ نوشی پیسے اور دولت کو دھوئیں کی راہ میں ضائع کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ حفظانِ صحت کے صحت کے اصول پر اگر دیکھا جائے تو اگرچہ تمباکو نوشی اور سگریٹ نوشی وقتی طور پر محرّک اور چستی پیدا کرنے والے ہیں لیکن اُن کی ذیلی تاثیرات (Side-effects) انسانی زندگی کے لئے زیادہ ضرر رساں ہیں۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ سگریٹ نوشی یا تمباکو نوشی محض فضول خرچی ہے اور فضول خرچوں کے بارے قرآن کا حتمی فیصلہ ہے:

اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا O (بنی اسرائیل: ۲۷)

''بے شک فضولیات میں اُڑا دینے والے شیطانوں کے بھائی بند ہوتے ہیں اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ہی ناشکرا ہے۔'' (۱۷ : ۲۷)

(19) علمی مشاغل کی کوئی حد و انتہا نہیں ہوتی۔ طالب علم کو اپنے استاد کے آگے تواضع اور اطاعت کا مجسمہ ہونا چاہیئے: اس سلسلہ میں موسیٰ اور خضر علیہما السلام کی باہم ملاقات کا واقعہ دلچسپ ہے:

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا O قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا O (الکہف: ۶۵، ۶۶)

''سو اُن دونوں (موسیٰ اور یوشع علیہما السلام) نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو پایا جسے ہم نے ایک خاص فضل مرحمت کیا تھا اور ہم نے اُسے اپنے پاس سے (خاص) علم سکھایا تھا۔ موسیٰ نے اُن سے کہا: کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں کہ جو علم آپ کو سکھایا گیا ہے' اُس میں سے آپ مجھے بھی سکھا دیں۔''

حدیثِ بخاری اور دیگر احادیث میں اُن عبدِ مقرب و مقبول کا نام خضر آیا ہے۔ اس خصوصی رحمت سے مراد مقبولیت کا ہونا تو ظاہر ہی ہے۔ البتہ یہ لازمی نہیں کہ نبوّت ہی کی شکل میں ہو۔ چنانچہ حضرت خضر کی نبوت ایک اختلافی مسئلہ ہے۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو آئندہ آنے والا مضمون ''خضر علیہ السلام'' کے عنوان کے تحت)

اِس واقعہ پر اظہارِ حیرت کیا گیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام تو خود ایک جلیل القدر پیغمبر تھے اور اس لئے لازمی طور پر اپنے وقت کے اَعلمُ الناس تھے۔ اُنہیں کسی اور کے پاس کیسے تعلّم کے لئے بھیجا گیا لیکن جیسا کہ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ بہ آسانی ممکن ہے کہ ایک شخص بہت سے علوم میں عالم ترین ہو اور پھر بھی بہت سے یا بعض علوم سے ناواقف ہو۔ اور اُس کے سیکھنے کے لئے وہ کہیں اور بھیج دیا جائے (تفسیر کبیر)۔ پیغمبر موسیٰ علیہ السلام کا اپنے استاد جنابِ خضر کے حضور سراپا عجز و نیاز اور مطیع و منقاد ہونا آیتِ بالا سے صاف عیاں ہے۔

(20) یحییٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کی پیدائش میں ایک عجیب نکتہ : یحییٰ علیہ السلام جنابِ عیسیٰ علیہ السلام کے پیش رَو' اُن کی آمد کی خبر دینے والے اور اُن کی راہ ہموار کرنے والے ہیں۔ اور مندرجہ ذیل آیت بھی قاری کو عیسیٰ علیہ السلام کی حیران کن پیدائش پر جو عام قانونِ قدرت سے ہٹ کر ہے' تیار کرنے والی ہے:

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّاO قَالَ كَذٰلِكَ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْـًٔاO (مریم : ۸'۹)

''زکریا بولے: اے میرے پروردگار! میرا لڑکا کیسے پیدا ہوگا جبکہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں بڑھاپے کی انتہا کو پہنچا ہوا ہوں۔ اللہ نے فرمایا: نہیں' ایسے ہی ہوگا۔ (اے زکریا!) تمہارے پروردگار کا قول ہے کہ یہ میرے لئے آسان ہے اور میں نے ہی تو تمہیں پیدا کیا درآنحالیکہ تم کچھ بھی نہ تھے۔'' (۸'۹:۱۹)

(21) رب کی قدرتِ کاملہ کا اظہارِ کامل : تاریخ شاہد ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش موسمِ سرما میں ۲۵ دسمبر کو ہوئی۔ کھجوروں کے پکنے کا موسم گرمیوں کے مہینہ جولائی' اگست میں ہوتا ہے۔ ذرا رب کی قدرتِ کاملہ پر غور تو کیجئے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے وقت رب تعالیٰ اُن کی والدہ محترمہ سیّدہ مریم سلام اللہ علیہا کو فرما رہا ہے:

وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّاO (مریم : ۲۵)

''اس کھجور کے تنے کو اپنی طرف ہلاؤ' اُس سے تم پر تروتازہ خرمے گریں گے۔'' (۲۵ : ۱۹)

(22) رب تعالیٰ اپنے آخری نبی ﷺ کی عصمت کے تحفظ میں خود گواہ بنا جس کی مثال پہلے کہیں نہیں ملتی :

(i) ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بہت پہلے سیّدنا یوسف علیہ السلام پر (معاذ اللہ) زنا کا الزام لگایا گیا تھا (سورہ یوسف : ۲۵)۔ واقعاتی شہادت سے یوسف علیہ السلام کی بے گناہی ثابت ہوگئی لیکن جنابِ یوسف کی بے گناہی کے ثبوت میں اللہ نے خود گواہی نہیں دی بلکہ ایک شیرخوار بچے سے شہادت دلوائی گئی (سورہ یوسف: ۲۶)۔

(ii) اس سے کچھ صدیوں بعد عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ سیّدہ مریم سلام اللہ علیہا پر بھی یہودیوں نے اُسی قسم کا الزام لگایا (سورہ مریم : ۲۷)۔ اُن کی پاکدامنی کے ثبوت میں اللہ گواہ نہیں بنا بلکہ نوزائیدہ بچے عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے جائز بچہ ہونے اور اپنی والدہ کی پاکدامنی کی شہادت دی (سورہ مریم: ۳۰ تا ۳۳)۔

(iii) لیکن یہ حیران کن بلکہ وجد آفریں بات ہے کہ جب ہمارے رسولِ معظم ﷺ کی رفیقۂ حیات سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر منافقینِ مدینہ نے اُسی قسم کا الزام لگایا تو سیّدہ کی پاکدامنی کی وکالت کرنے کے لئے رب تعالیٰ نے اپنی کسی مخلوق کو گواہ نہیں بنایا۔ حتیٰ کہ نبی علیہ السلام کو بھی اس معاملے میں خاموش رہنے کا حکم دیا گیا کیونکہ آپ کا قول حدیث بن جاتا اور حدیث کی صحت کا انکار کفر نہیں ہے جبکہ قرآنِ مجید کی کسی بھی شِق کا انکار صریحاً کفر ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ سے نہ رہا گیا اور وہ اپنے محبوب کی محبوبہ رفیقۂ حیات کے بے داغ اور روشن کردار کے ثبوت میں خود بول پڑا! اور اس طرح اُن کی عصمت و پاکدامنی کی حقیقت کو جزوِ قرآن بنا دیا اور فرمایا :

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ وَالطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبَاتِ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ O (اَلنّور : ۲۶)
"گندی عورتیں گندے مردوں کے لائق ہوتی ہیں اور گندے مرد گندی عورتوں کے لائق ہوتے ہیں اور پاکدامن عورتیں پاکباز مردوں کے اور پاکباز مرد پاکدامن عورتوں کے لائق ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اس بات سے پاک ہیں جو یہ (منافق) بکتے پھرتے ہیں۔ اُن کے لئے مغفرت اور عزت کی روزی ہے۔"

(23) ایک گناہ کا ارتکاب دوسرے گناہ کی طرف لے جاتا ہے: سورہ یوسف میں فرمایا:
وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ وَّاَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَى الْبَابِ قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ O (یوسف: ۲۵)
"اور وہ دونوں آگے پیچھے دروازے کی طرف دوڑے اور اُس (عورت) نے اُن کا کرتہ پیچھے سے پھاڑ ڈالا اور دونوں نے اُس کے آقا (یعنی شوہر) کو دروازے کے پاس (کھڑا ہوا) پایا۔ وہ بول اٹھی: اُس کی کیا سزا ہے جو تیری بیوی کے ساتھ بدکاری کا ارادہ کرے بجز اِس کے کہ وہ قید میں ڈالا جائے یا (اور کوئی) دردناک عذاب (اُسے ملے)۔" (۱۲ : ۲۵)

زلیخا نے اپنے آپ کو سچا ثابت کرنے کے لئے نہ صرف جھوٹ کا سہارا لیا بلکہ ایسے آدمی سے انتقام لینے کا بھی جس نے پائے حقارت سے اُس کی پیشکش کو ٹھکرا دیا تھا اور جس نے اُس کی ناجائز محبت کا جواب نفرت سے دیا تھا۔ مصر کی ملکہ ہونے کے زعم میں وہ غصے سے بے قابو ہوگئی اور اُس میں حق و باطل کی تمیز ختم ہوگئی۔

عارفین نے لکھا ہے کہ کشادِ قفل میں اشارہ اِسی طرف ہے کہ جو دنیائے حرام سے بھاگنے کی ہمت کرتا ہے' اُس کے لئے نجات کی راہیں غیب سے کھل جاتی ہیں۔ اور یہ بات اقتضاء النص سے معلوم ہوئی۔

(24) بہ غرضِ اصلاحِ حقائق کے خلاف بات کہنا کوئی جھوٹ نہیں ہوتا: حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں سبق آموزی ہے جب اُنہوں نے اپنی قوم کو بت پرستی چھوڑنے اور صرف خدائے واحد کی عبادت کی طرف بلایا۔ ضد اور ہٹ دھرمی کے باعث اُنہوں نے آپ کو جھٹلایا اور آپ کے پیغامِ توحید کو قبول نہیں کیا۔ ایک دن جب وہ لوگ اپنا کوئی تہوار منانے کے لئے شہر سے باہر گئے ہوئے تھے' ابراہیم علیہ السلام اُن کے مندر میں گئے اور اُن کے بتوں کو پاش پاش کر ڈالا۔ آپ نے اُن کے بڑے بت کا کچھ نہیں کیا اور اُسے ویسے کا ویسا ہی رہنے دیا' اور اُس کے کندھے پر سے کلہاڑا لٹکا دیا تا کہ یہ معلوم ہو کہ اسی بڑے بُت نے باقی بتوں کو ریزہ ریزہ کیا ہے۔ تہوار سے واپسی پر وہ یہ منظر دیکھ کر محوِ حیرت رہ گئے۔ اُنہوں نے ابراہیم علیہ السلام سے رابطہ کیا اور اُن سے کہا کہ وہ صورتِ حال کی وضاحت کریں۔ آپ نے فرمایا:
"توڑنے کا یہ کام اِسی بڑے بت نے کیا ہے' سو اِنہی سے پوچھ دیکھو اگر وہ بولتے ہوں۔ اس پر وہ لوگ اپنے جی میں سوچنے لگے۔ پھر بول اٹھے: بیشک تم ہی (سرتاسر) ناحق پر ہو۔ پھر اُنہوں نے اپنے سروں

کو جھکا لیا اور کہنے لگے: (اے ابراہیم!) تمہیں تو خوب معلوم ہے کہ یہ کچھ بولتے نہیں۔ آپ نے کہا: تو کیا تم اللہ کے سوا ایسوں کو پوجتے ہو جو نہ تمہیں نفع پہنچا سکیں اور نہ ہی نقصان پہنچا سکیں۔ تُف ہے تم پر بھی اور اُن پر بھی جنہیں تم پوجتے ہو' تو کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے؟'' (۶۳ تا ۶۷ : ۲۱)

''حدیثِ صحیح میں ابراہیم علیہ السلام کے اِس قول کو کذب سے تعبیر کیا گیا ہے جس سے منکرینِ حدیث کو بخاری' مسلم اور ترمذی کے خلاف ایک طومارِ کذب باندھنے کا موقع مل گیا ہے۔ حالانکہ بالکل صاف ظاہر ہے کہ یہ کذب صرف **صورۃً** تھا۔ نہ حضرت کی نیت کسی غلط بات کے کہنے کی تھی اور نہ اِس کلام سے اُس بڑے مجمع میں کسی ایک شخص کو بھی دھوکہ یا مغالطہ ہوا۔ تمام تر مقصود مشرکین پر حجتِ الزامی قائم کرنا تھی اور اس کے لئے آپ اعلان پیشتر سے کر چکے تھے کہ ''بخدا! میں تمہارے بتوں کی گت بناؤں گا جب تم پیٹھ پھیر کر چلے جاؤ گے۔'' (سورۃ الانبیاء: ۵۷)۔ یہ تو صرف ایک بلیغ' مؤثر خطیبانہ پیرایۂ گفتگو تھا۔ موقع کے مناسبِ حال' ایسا کِذب (اور کِذب عربی میں ہرگز اردو کے جھوٹ کے مترادف نہیں بلکہ اُس سے کہیں وسیع معنیٰ رکھتا ہے) ہرگز عصمتِ انبیاء کے منافی نہیں۔ کسی مصلحتِ دینی کے سبب سے بعض بزرگوں سے جو کلام بطورِ توریہ منقول ہے' اُس کی اصل یہی آیت ہے۔'' (تفسیر ماجدی اردو' ص ۶۶۷' نوٹ : ۸۰)

مندرجہ بالا حقیقت کی تائید میں نبیِ مکرّم ﷺ نے فرمایا:

لَيْسَ الْكَذَّابُ الَّذِيْ يُصْلِحُ بَيْنَ النَّاسِ

''وہ شخص جھوٹا نہیں ہوتا جو لوگوں کے درمیان صلح کرانے کے لئے کوئی خلافِ حقیقت بات کہہ دے۔''

(25) نسوانی پردہ کے بارے میں اسلام اس قدر حساس ہے کہ سورۃ النور میں فرمایا:

وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ (النور: ۳۱)

''اور عورتیں اپنے پاؤں زور سے نہ رکھیں کہ اُن کا مخفی زیور معلوم ہو جائے۔'' (۳۱ : ۲۴)

عورتوں کا نہ صرف پاؤں کا زور سے رکھنے کی بلکہ اُن تمام طریقوں کی ممانعت اسی حکم میں شامل ہے جو غیر مردوں کو اُن کی طرف راغب اور متوجہ کرے۔ مثلاً تیز عطریات اور خوشبویات کا استعمال' چوڑیوں کا کھنکھٹانا' غیر ضروری اور ارادی طور پر کھانسنا یا خراٹوں جیسی آواز کا نکالنا وغیرہ سب اسی زمرے میں آتے ہیں۔

(26) نسوانی پردے کی پابندی جنسی تحریص و ترغیب کے تناسب سے ہو: سورہ النور میں حکم ہوا:

وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا يَرْجُوْنَ نِكَاحًا فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِيْنَةٍ وَاَنْ يَّسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ (النور: ۶۰)

''اور بڑی بوڑھیاں جنہیں نکاح کی اُمید ہی نہ رہی ہو' اُن پر کوئی گناہ نہیں (اس بات میں) کہ وہ اپنے (زائد) کپڑے اتار رکھیں (بشرطیکہ) زینت کو دکھلانے والی نہ ہوں اور اگر (اس سے بھی)

احتیاط رکھیں تو اُن کے حق میں اور بہتر ہے۔" (۲۴ : ۶۰)

قدرتی یا مصنوعی سنگار کے موقعوں کو نامحرموں کے سامنے بے پردہ لانا اُس سن کی بوڑھیوں کے لئے بھی جائز نہیں جو حدِّ نکاح سے گزر چکی ہوں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جوان جہان عورتوں کو اپنے جسم کے چھپانے کے بارے میں کتنا اہتمام چاہئے۔ یہاں تک کہ چہرہ اور ہتھیلیاں جو بالذات داخلِ ستر نہیں' بقولِ فقہاء کے احتمالِ فتنہ سے' وہ بھی داخلِ ستر ہو جاتی ہیں۔ اور یہ خوب خیال میں رہے کہ حجاب و ستر کی جو پابندیاں بوڑھیوں پر واجب نہیں' بہتر وہ بھی اُن کے حق میں ہیں۔

(27) نبی علیہ السلام کی ازواجِ مطہرات کے مقامِ اعلیٰ کے بیان سے خود نبی علیہ السلام کی عظمت کا اظہار: سورۃ الاحزاب میں رب تعالیٰ خود نبی علیہ السلام کی ازواجِ مطہرات سے مخاطب ہوا اور فرمایا:

يَا نِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ (الاحزاب : ۳۲)

"اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو۔" (۳۳ : ۳۲)

اِس عدمِ مساوات کے اظہار سے بطور دلالۃ النص یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ جب نبی علیہ السلام کی ازواج عام عورتوں کی طرح نہیں تو اُن کے شوہرِ نامدار حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ جن کی وجہ سے اِن ازواج کو مقامِ ارفع و اعلیٰ سے نوازا جا رہا ہے' عام مردوں کی طرح کیسے ہو گئے؟

جہاں تک قرآنی حکم کے مطابق نبی علیہ السلام کا اپنے آپ کو "تمہارے جیسا بشر ہوں" کہنا ازراہِ تواضع ہے اور بعد کے جملہ يُوْحٰى اِلَيَّ (مجھ پر وحی آتی ہے) نے نبی اور عام بشر کے مابین فرق کو واضح کر دیا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ (۱) ہندوستان کے شہرہ آفاق مذہبی سکالر حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک آیت اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ازقبیلِ متشابہات ہے۔ (۲) نبی علیہ السلام کو یہ حکم ازراہِ تواضع دیا جا رہا ہے اور کسی دوسرے شخص کے لئے اُن کے بارے میں ایسا کہنا مناسب نہیں کیونکہ نبی یا رسول کو اپنے جیسا کہنا ہمیشہ کفار کا شیوہ رہا ہے (بحوالہ سورہ ابراہیم : ۱۰) جس وجہ سے یہ رسول کے حق میں بڑی بے ادبی اور گستاخی ہوگی۔ (۳) قرآن میں جہاں کہیں بھی اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ آیا تو اُس سے متصل ہی يُوْحٰى اِلَيَّ کے الفاظ لائے گئے۔ تو گویا نزولِ وحی اور عدمِ نزولِ وحی نے بشر اور رسول کے مابین فرق کو طشت از بام کر دیا۔ يُوْحٰى اِلَيَّ کا مطلب ہی یہی ہے کہ میرا اپنے خالق و مالک کے ساتھ تعلق بذریعہ وحی براہِ راست ہے جبکہ دیگر لوگوں کا اُس کے ساتھ تعلق بالواسطہ اور بواسطہِ رسول ہے تو چہ نسبت خاک را بہ عالمِ پاک! ☆

(28) مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ (الاحزاب : ۴۰)

☆ عظمتِ رسالت کو معلوم کرنے کے لئے سورۃ النور کی آیت ۶۳ اور سورۃ الحجرات کی آیات ۲' ۳ کا مطالعہ کر لیا جائے۔

''محمد (ﷺ) تمہارے مَردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں البتہ وہ اللہ کے رسول ہیں۔'' (۳۳:۴۰)

لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ اُمّت کے کسی فرد کی مطلّقہ بیوی سے آپ ﷺ کے نکاح کی ممانعت ہو۔ اسی میں آپ کے متبنیٰ کی مطلّقہ بیوی سیدہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے ساتھ آپ ﷺ کے نکاح کا جواز بھی نکل آیا۔ کیونکہ اُمّت کے کسی فرد کے باپ نہ ہونے کی وجہ سے زینب آپ کی بہو نہیں تھیں کہ اُن کی طلاق کے بعد اُن کا نکاح آپ سے نہ ہو سکے۔ یہ دونوں نِکات آیتِ مذکورہ کی اقتضاء النص سے معلوم ہوئے۔

(29) وَ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللهِ وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَه' مِنْ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَاللهِ عَظِيْمًا O (الاحزاب : ۵۳)

''اور تمہیں جائز نہیں کہ تم رسول اللہ کو (کسی بھی طرح) تکلیف پہنچاؤ اور نہ یہ کہ آپ کے بعد آپ کی بیویوں سے کبھی بھی نکاح کرو۔'' (۳۳ : ۵۳)

اذیّتِ نبی سے مراد نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو پریشان کرنا' آپ کے جذبات کو یا جسم مجروح کرنا' آپ کی توہین کرنا' آپ سے بدسلوکی کرنا' آپ پر کوئی الزام لگانا یا کسی ناموافق صورتِ حال سے آپ کو دوچار کرنا ہے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام انسانیت کو خدائی پیغام پہنچانے اور اُنہیں صراطِ مستقیم پر لگانے کے لئے آئے اور آپ کی تعظیم وتوقیر کرنا اپنوں کے علاوہ اُن لوگوں پر بھی فرض ہے جنہوں نے آپ کی رسالت کو تسلیم نہیں کیا۔ آیت کے دوسرے حصّہ (کہ آپ کے بعد آپ کی بیویوں سے کبھی بھی نکاح نہ کرو) سے کچھ مفسرین نے حیات النبی ﷺ کو ثابت کیا ہے کیونکہ کسی زندہ آدمی کی منکوحہ اُس کے عقد میں ہوتے ہوئے کسی اور کے نکاح میں نہیں جا سکتی لہٰذا اس عقیدے کی رُو سے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام دارالبقاء کو منتقل ہونے کے بعد بھی حیات ہیں اور اسی وجہ سے لوگوں کو آپ کی ازواجِ مطہرات کے ساتھ نکاح کرنے سے روک دیا گیا ہے۔

(30) <u>خلفائے راشدین اور قرآنِ حکیم</u> : سورۃ الاحزاب میں ارشادِ باری تعالیٰ ہوا:

لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا O مَلْعُوْنِيْنَ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا O

''اور اگر منافقین اور وہ لوگ باز نہ آئے جن کے دلوں میں روگ ہے اور جو مدینہ میں افواہیں اُڑایا کرتے ہیں تو ہم آپ کو اُن پر ضرور مسلط کر دیں گے پھر یہ لوگ آپ کے پاس مدینہ میں بس قدرے قلیل رہنے پائیں گے (اور وہ بھی) پھٹکار پڑے ہوئے' جہاں کہیں بھی وہ مل گئے پکڑ لئے گئے اور اُن کے ٹکڑے اُڑا دئے گئے۔'' (۳۳ : ۶۰' ۶۱)

اگر نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اوّل تین خلفائے راشدین (معاذ اللہ) غاصب اور منافق ہوتے تو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام مندرجہ بالا حکم الٰہی کے مطابق اُن کے خلاف سخت کارروائی کرتے یا کم از کم سیّدنا صدیق اکبر

رضی اللہ عنہ کو اپنے جانشین ہونے کا اشارہ نہ فرماتے ۔ آپ کی غیر مختتم نوازشات، مہربانیاں اور عنایات تو اُن کے ہمیشہ شاملِ حال رہیں ۔ تاریخ اور قرآنِ حکیم کے صفحات اُن کی کماحقہٗ ستائش سے بھرے پڑے ہیں ۔ تو اِن حقائق سے نتیجہ یہ نکلا کہ اُن حضرات کو ایسے غیر حقیقی الزامات سے متہم کرنا غیر ملکی سازش ہے اور اُن کے بے داغ، روشن نام کو مذموم مقاصد کے حصول کے لئے داغ دار کرنا ہے ۔ سچی بات ہے کہ چاروں خلفائے راشدین کی خلافت جائز اور اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی رضا کے مطابق تھی ۔

ٹی ۔ ڈبلیو آرنلڈ اپنی کتاب Preaching of Islam میں لکھتے ہیں :

'' یہ لوگ پیغمبر (علیہ السلام) کے سچے اخلاقی وارث تھے ۔۔۔ محمد (ﷺ) نے بندگانِ خدا کو جو پیغام دینا تھا، اُس کے یہ لوگ باوفا امین تھے ۔۔۔ اُنہوں نے فی الحقیقت ہر نقطہ نگاہ سے حالات کو بہتر سے بہتر بنا دیا تھا اور بعد میں بطور سیاستدان اور جرنیلوں کے فتوحات کی جنگوں کے مشکل ترین لمحات میں اُنہوں نے عظیم الشان اور ناقابلِ انکار ثبوت مہیا کر دیا کہ محمد (ﷺ) کے دئے ہوئے نظریات اور اصول ایک زرخیز زمین میں بوئے گئے ہیں جس سے اعلیٰ ترین اقدار کی جماعت پیدا ہوئی ۔ وہ لوگ قرآن مجید کے مقدس متن کی امانت کے تحویل دار تھے جس کی حقیقتوں کو وہ نہاں خانہ دل سے جانتے تھے ۔ وہ لوگ محمد (ﷺ) کے ہر لفظ اور ہر حکم کے حساس نگہبان تھے اور محمد (ﷺ) کے اخلاقی ورثہ کے امین تھے ۔'' (صفحات ۴۱، ۴۲)

(31) ''شکست و ریخت'' کے قدرتی قانون کا اطلاق انبیاء علیہم السلام کے اجسام پر نہیں ہوتا:

جیسا کہ سلیمان علیہ السلام کے واقعہ میں سورہ سَبا کی اِس آیت سے ظاہر ہے :

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖٓ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ O

'' پھر جب ہم نے اُن (سلیمان علیہ السلام) کا حکم جاری کر دیا تو کسی چیز نے اُن کی موت کا پتہ نہ بتایا سوائے ایک زمینی کیڑے کے کہ وہ سلیمان (علیہ السلام) کے عصا کو کھاتا تھا، سو جب سلیمان گر پڑے تب جنّات پر حقیقت ظاہر ہوئی کہ اگر وہ غیب جانتے ہوتے تو اس ذلت کی مصیبت میں نہ پڑتے ۔'' (۳۴ : ۱۴)

آثارِ روایت میں آتا ہے کہ جب سلیمان علیہ السلام کو اپنی وفات کا قرب محسوس ہوا تو آپ تخت پر عصا کی ٹیک لگا کر بیٹھ گئے اور اسی ہیئت میں روح پرواز کر گئی اور ایک طویل مدت تک اسی وضع پر بیٹھے رہے ۔ جنّات آپ کو بیٹھا ہوا دیکھ کر آپ کو زندہ سمجھے اور قریب آنے کی کسی کو ہمت نہ ہوئی ۔ وہ بدستور اپنے کام میں لگے رہے ۔ جب عصا میں گھن لگ گیا تو عصا گرا اور آپ کا جسمِ اطہر بھی اس وضع پر قائم نہ رہ سکا اور جنات کو اپنی غیب دانی کی حقیقت خوب روشن ہو کر رہی ۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مندرجہ ذیل فرمودہ بھی اس حقیقت کے بیان میں ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے اجسامِ مبارکہ بعداز وفات ہر قسم کے تغیر و تبدّل سے محفوظ رہتے ہیں :

اِنَّ اللّٰہَ حَرَّمَ عَلَی الْاَرْضِ اَنْ تَاْکُلَ اَجْسَادَ الْاَنْبِیَاءِ (صحیح بخاری)

''بے شک اللہ تعالیٰ نے زمین پر انبیاء علیہم السلام کے جسموں کے کھانے کو حرام کر دیا ہے۔''

(32) مَردوں، عورتوں کے باہمی اختلاط اور مخلوط تعلیم کا اسلام میں کوئی جواز نہیں

یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْالَا یَسْخَرْ قَوْمٌ'' مِّنْ قَوْمٍ عَسٰی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْھُمْ وَلَانِسَآء'' مِنْ نِّسَآءٍ عَسٰی اَنْ یَّکُنَّ خَیْرًا مِّنْھُنَّ (الحُجُرات : ۱۱)

''مؤمنو! نہ مَردوں کو مَردوں پر ہنسنا چاہئے، کیا عجب کہ وہ اُن سے بہتر ہوں اور نہ عورتوں کو عورتوں پر ہنسنا چاہئے، کیا عجب کہ وہ اُن سے بہتر ہوں۔'' (۴۹ : ۱۱)

یہاں زن و مرد کی دونوں جنسوں کو جدا جدا بیان کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام جنس مخالف کے باہمی اختلاط اور میل جول کی اجازت نہیں دیتا۔ اور اِسی سے ازروئے اشارۃ النص یہ نکتہ بھی برآمد ہوا کہ زن و مرد کی مخلوط تعلیم کی اسلامی نظامِ اخلاق میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

''بہت سے سطحی طرزِ فکر رکھنے والے اسلام کو محض اس لئے رجعت پسند مذہب سمجھتے ہیں کہ وہ مَردوں اور عورتوں کے خلا ملا پر قیود عائد کرتا ہے۔ یہ لوگ تہذیب فرانس کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں جس میں عاشق و محبوب شاہراہِ عام پر دوسروں کی موجودگی سے بے خبر باہم بوس و کنار کر سکتے ہیں۔ کوئی شخص ایسے جوڑے کو کچھ نہیں کہہ سکتا بلکہ اگر پولیس کا سپاہی اُنہیں یوں محبت و عشق کے نشے میں مدہوش پاتا ہے تو وہ راہگیروں سے اُنہیں بچانے کے لئے باقاعدہ پہرہ دیتا ہے تاکہ کوئی اُن کے اِس کیف و سرور میں مخل نہ ہونے پائے۔ باقی رہے وہ تاریک خیال لوگ جو ایسے مناظر کو دیکھ کر چیں بجبیں ہوتے ہیں، تو وہاں اُنہیں منہ ہی کون لگاتا ہے۔''

''کچھ اور لوگ ہیں جو امریکی طرزِ زندگی پر فریفتہ ہیں کیونکہ وہاں کے لوگ اپنے آپ کو دھوکا نہیں دیتے۔ وہ جنس کو انسان کی حیاتی ضرورت سمجھتے ہیں۔ چنانچہ وہاں پر انسان کی اِس حیاتی ضرورت کو پورا کرنے کا اہتمام بھی ہے۔ ہر لڑکی کا بوائے فرینڈ اور ہر لڑکے کی گرل فرینڈ ہوتی ہے۔ یہ لوگ اپنے وقت کا بیشتر حصّہ ایک دوسرے کے ساتھ گزارتے ہیں، آبادی سے باہر پکنکیں مناتے ہیں جہاں وہ فطرت کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے اپنا جنسی سکون بحال کرتے ہیں۔ اِن پکنکوں سے جب وہ لوٹتے ہیں تو اتنے آسودہ خاطر اور مطمئن ہوتے ہیں کہ اس کے بعد وہ پوری دلجمعی سے اپنی پڑھائی میں لگ جاتے ہیں یا دوسرے فرائض انجام دیتے ہیں اور یوں ملکی خوشحالی در پیداوار میں اضافے کا باعث بنتے ہیں اور پوری قوم ترقی کرتی جاتی ہے۔''

''لیکن یہ سطحی اور ظاہر بین حضرات جو مغرب کے اخلاقی دیوالیہ پن کے اِس قدر شیدائی ہیں، یہ فراموش

کر جاتے ہیں کہ دوسری جنگِ عظیم میں فرانس جرمنی کے پہلے حملہ کی بھی تاب نہیں لا سکا تھا اور اُس نے جرمنوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دئے تھے۔ فرانس کی اِس ذلّت آمیز شکست کی وجہ فرانسیسی فوج کی ناقص فوجی تربیت یا سامانِ جنگ کی کمی نہیں تھی بلکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ فرانسیسی قوم مادّی لذّات کی پرستار اور اخلاقی بے راہروی کی شکار ہو کر قومی جذبے سے بالکل محروم اور اندر سے بالکل کھوکھلی ہو چکی تھی۔ اُنہیں یہ خدشہ تھا کہ جنگ جاری رہی تو پیرس کی بلند و بالا عمارتیں اور عشرت کدے بموں کی نذر ہو جائیں گے۔ کیا تہذیبِ مغرب کے شیدائی دانشور اپنے یہاں بھی یہی ڈرامہ دہرانا چاہتے ہیں؟

ع ہوئے تم دوست جس کے دشمن آسماں کیوں ہو؟

''جہاں تک امریکہ کا تعلق ہے' تو اُس کی پُرفریب زندگی کا پردہ چاک کرنے کے لئے خود امریکی حکومت کے فراہم کردہ اعداد و شمار کافی ہیں جن کے مطابق امریکہ کے ثانوی اسکولوں کی ۳۸ فیصد لڑکیاں حاملہ پائی گئی ہیں۔ یونیورسٹی کی نچلے درجات کی طالبات میں یہ تناسب نسبتاً بہت کم ہے کیونکہ مانعِ حمل تدابیر اختیار کرنے میں وہ اسکولوں کی لڑکیوں سے کہیں زیادہ تجربہ کار ہوتی ہیں۔''

''جن غلط بین حضرات کا خیال ہے کہ امریکہ کی یہ تمام حیرت انگیز پیداوار جنسی بے راہ روی کا نتیجہ ہے' اُنہیں معلوم ہونا چاہئے کہ امریکہ نے دنیا کو اب تک جو پیداوار دی ہے' وہ محض مادّی پیداوار ہے۔ جس کی اگر یہی رفتار رہی تو انسانوں کی جگہ تھوڑے ہی دنوں میں ہر جگہ بے جان مشینیں کام کرتی نظر آئیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی مادی ترقی کے باوجود امریکہ ذہنی اور روحانی لحاظ سے اِتنا پست ہے کہ وہاں آج بھی حبشیوں کی حیثیت غلاموں سے زیادہ نہیں اور وہ آئے دن بدترین مظالم کا تختۂ مشق بنتے رہتے ہیں۔ یہ تو اُس کے گھر کا حال ہے۔ جہاں تک بیرونی دنیا کا تعلق ہے' امریکہ آج دنیا میں ہر جگہ نوآبادیاتی نظام کا حامی اور پشتیبان بنا ہوا ہے۔ امریکی زندگی میں حیوانی خواہشات کی یہ ہمہ گیر کارفرمائی' اُس کا نوآبادیاتی سامراجی مزاج اور اُس کے گھر میں غلامی کا یہ رواج دراصل امریکی قوم کے ایک ایسے روحانی انحطاط کا اظہار ہے جس کی مثال کسی مہذّب قوم کی تاریخ میں ملنی محال ہے۔''

''آج کل کے مرد بالعموم خوب رُو اور بنی ٹھنی عورتوں سے خلا ملا اور میل جول کے دلدادہ ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنے جائز حق پر قناعت کرنے کی بجائے ہر کھیت میں منہ مارنے کے عادی ہو چکے ہیں جو ہمیشہ سے انسان کی ایک بنیادی کمزوری رہی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا زندگی میں انسان کا مقصد صرف اپنی تسکین اور لذّت و مسرت کی تلاش ہی رہ گیا ہے؟ خواہشاتِ نفس کی تسکین سے حاصل ہونے والی لذت کا کون انکار کرسکتا ہے مگر یہ بیسویں صدی کی کوئی نئی دریافت ہرگز نہیں ہے۔ آج سے ہزاروں برس پیشتر یونانی' رومی اور ایرانی بھی اس سے واقف تھے اور سرتاپا اس میں ڈوبے ہوئے تھے مگر اِسی حد سے بڑی ہوئی لذت پرستی نے اُن اقوام کو اُن کے فرائضِ منصبی سے غافل کردیا تھا اور وہ رفتہ رفتہ اپنی حکومت واقتدار اور عظمت سب کچھ کھو بیٹھیں۔''

اسلام کا جنس کے بارے میں نظریہ : بلاشبہ جنسی تسکین کا حصول ایک قابلِ قدر مقصد ہے۔ اسلام اس

مسئلہ پر بڑی توجہ دیتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر انسان جنسی لحاظ سے ناآسودہ ہو' تو وہ اسی دلدل میں پھنس کر رہ جاتا ہے اور کسی اور معاملے پر توجہ دینے کے قابل نہیں رہتا جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قومی پیداوار میں کمی ہونے لگتی ہے۔ لیکن اچھے مقاصد' اچھے ذرائع ہی سے حاصل کئے جانے چاہئیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے پورے معاشرے کو اخلاقی روگ لگا دینا یا نوجوانوں کو جانوروں کی طرح ایک دوسرے پر پل پڑنے کے لئے آزاد چھوڑ دینا یقیناً کوئی پاکیزہ طریقہ نہیں ہے۔'' [''اسلام اور جدید ذہن کے شبہات''۔ محمد قطب (اردو ترجمہ) صفحات ۲۵۲۔۲۵۶]

(33) کافروں اور معصیت پیشہ افراد کے لئے عذاب قبر یقینی ہے: ضروری نہیں کہ قبر اتنا گہرا' تاریک' سینکڑوں ٹن مٹی سے بھرا ہوا گڑھا ہو جہاں میت کو لٹایا جاتا ہے۔ درحقیقت قبر روزِ حشر اور موت کے درمیانی عرصے کا نام ہے جسے اسلامی شریعت میں ''عالمِ برزخ'' کا نام دیا گیا ہے۔ یہ حقیقت کہ قبر میں مُردوں کو اپنے گناہوں اور الٰہی نافرمانی کے باعث عذاب ہوتا ہے' بالکل قابلِ فہم ہے۔ لیکن اُن جسموں کی کیا کیفیت ہوتی ہے جو جل کر راکھ ہو جاتے ہیں' یا ایسے مہیب حوادث کا شکار ہو جاتے ہیں کہ اُنہیں تدفین نصیب ہی نہیں ہوتی یا جو لوگ سمندری سفر کے دوران مر جاتے ہیں اور آبِ سمندر کی نذر ہو کر آبی جانوروں کی خوراک بن جاتے ہیں؟ کیا اُن کا قبر میں دفن نہ ہونا اُنہیں عذاب سے نجات دے دیتا ہے؟ اگر اس مسئلہ کو قادرِ مطلق کی ذات پر خرد بینی عقیدہ وایمان سے دیکھا جائے تو مسئلہ ناقابلِ فہم نہیں رہتا۔ وہ ذات جس کے نزدیک زمان ومکان بے معنیٰ ہیں (جس کا ذکر اگلی کسی جلد میں ''فزکس'' کے عنوان کے تحت انشاء اللہ آئے گا) اس پر قادر ہے کہ وہ جلے ہوئے' ریزہ ریزہ ہوئے ہوئے اور گلے سڑے اعضاء کو مختلف مقامات سے اور مختلف پیٹوں سے اکٹھا کر کے اُنہیں عذاب دے۔ اِسی مفہوم میں اِسے ''عذابِ قبر'' کہا جاتا ہے۔

کچھ مقامات پر قرآنِ حکیم نے اس معمہ کا جواب دیا ہے جو روشن دماغوں میں بھی ابھرتا رہتا ہے۔ یہ یقینی بات ہے کہ فرعونِ مصر کی لاش قبر میں دفن نہیں کی گئی اور یہ الٰہی فیصلہ ہے کہ اُس کی لاش تا ابد محفوظ رہے گی تاکہ وہ بعد میں آنے والوں کے لئے نشانِ عبرت بن جائے (سورہ یونس: ۹۲)۔ اُس کی برزخی زندگی (یعنی قبر) کی سزا کے متعلق قرآنِ مجید نے سورۃ المؤمن کی آیت ۴۶ میں اس طرح اشارہ فرمایا ہے:۔

اَلنَّارُ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْا آلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ O

''وہ لوگ صبح وشام آگ پر پیش کئے جاتے ہیں اور جس دن قیامت قائم ہوگی (یہ کہا جائے گا) آلِ فرعون کو شدید ترین عذاب میں داخل کرو۔'' (۴۶ : ۴۰)

آیت کا پہلا حصّہ اَلنَّارُ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا عذابِ برزخ (قبر) سے متعلق ہے جبکہ بقایا دوسرا حصّہ روزِ محشر کے عذاب سے متعلق ہے۔ بہرحال یہ آیت اثباتِ عذابِ قبر و وجودِ برزخ میں ایک نصِ صریح ہے (جصاص)۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ آیت اگرچہ فرعون کے عذاب سے متعلق ہے لیکن اس کا اطلاق فرعون کے علاوہ دوسرے نافرمانوں پر بھی ہو سکتا ہے (تفسیر کبیر)۔ مفسّر ابنِ کثیر نے یہ بھی لکھا ہے کہ آیت

سے برزخ میں صرف ارواح پر عذاب ثابت ہوتا ہے۔ باقی رہا ان روحوں کے سبب سے قبور میں جسموں کا بھی معذّب ہونا' تو اس کا ثبوت احادیثِ نبوی میں ملتا ہے اور اس باب میں احادیث بکثرت ہیں۔

غُدُوًّا وَّعَشِيًّا کے ایک معنیٰ تو یہی صبح وشام کے ہیں یعنی ایسے اوقات میں جو ہمارے عالمِ ناسوت کے صبح وشام کے مقابل ہیں (تفسیر قرطبی)۔ دوسرا مفہوم ''ہمیشہ'' کا بھی ہوسکتا ہے (روح المعانی)۔

عذابِ قبر کی تائید میں قرآن مجید کی کچھ اور آیات حسبِ ذیل ہیں :

(۱) سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ O (التوبۃ : ۱۰۱)

''ہم اُنہیں دوہری سزا دیں گے' پھر وہ عذابِ عظیم کے طرف لوٹائے جائیں گے۔'' (۹:۱۰۱)

یہ دوہری سزا قبل آخرت ہوگی۔ ایک سزا نفاق کی اور دوسری سزا مسجدِ نبوی سے اُن کا ذلت کے ساتھ نکالا جانا۔ قبل آخرت کے عموم میں دنیا اور برزخ دونوں داخل ہیں۔ ظاہر ہے کہ عَذَابٍ عَظِيْمٍ عذابِ آخرت ہے۔

(۲) وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِىْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ O (الانعام : ۹۳)

''کاش آپ اُس وقت دیکھیں جب (یہ) ظالم موت کی سختیوں میں ہوں گے اور فرشتے اپنے ہاتھ اُن کی طرف بڑھا رہے ہوں گے کہ اپنی جانیں جلدی نکالو' آج تمہیں ذلت کا عذاب ہوگا بہ سبب اس کے کہ تم اللہ پر جھوٹ اور اللہ کے ذمے ناحق باتیں جوڑا کرتے تھے اور تم اللہ کی نشانیوں کے مقابلہ میں تکبر کیا کرتے تھے۔'' (۹۳ : ٦)

اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ عذاب موت کے فوراً ہی بعد شروع ہو جاتا ہے اور اِسی کا نام ''عذابِ قبر'' ہے جو موت اور روزِ محشر کا درمیانی عرصہ ہے جسے ''عالمِ برزخ'' کہا جاتا ہے۔ لہٰذا غیر مدفون لاشوں' یا آگ میں جلے ہوئے جسموں' یا درندوں اور آبی جانوروں سے کھائے گئے جسموں کو بھی عذاب ہوگا اگرچہ زندہ انسانوں کو وہ محسوس نہ ہو۔ ہم اس عذاب کو ''برزخی عالَم کا عذاب'' بھی کہہ سکتے ہیں جو عذابِ قبر کا دوسرا نام ہے۔

(34) انسان کی تخلیق اور نزولِ قرآن : سورۃ الرّحمٰن میں فرمایا گیا:

اَلرَّحْمٰنُ O عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ O خَلَقَ الْاِنْسَانَ O عَلَّمَهُ الْبَيَانَ O (الرّحمٰن : ۱۔۴)

''خدائے رحمان ہی نے قرآن کی تعلیم دی' اُسی نے انسان کو پیدا کیا' اُس کو گویائی سکھائی۔''

ترتیب زمانی (Chronologically) کے لحاظ سے انسان کی تخلیق قرآن مجید کے نزول سے پہلے ہوئی ۔یعنی انسان پہلے آیا اور اُس کے بعد قرآن آیا۔لیکن مندرجہ بالا قرآنی بیان میں ترتیب بدل دی گئی ہے یعنی قرآن کا ذکر پہلے اور انسان کی تخلیق کا ذکر بعد میں ہوا ہے۔اس کی وجہ ظاہر ہے اور جس نکتے پر زور دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اگر انسان احکامِ قرآن پر مکمل طور پر بہ دل و جان عمل کرے تو اُسے صحیح معنوں میں ''انسان'' کہا جا سکتا ہے ۔قرآن مجید کا علم اور اُس کا فہم ہی انسان کو انسان بنا تا ہے ورنہ تو وہ بقولِ قرآن جانوروں سے بھی بدتر ہے (بحوالہ سورۃ الاعراف :۱۷۹؛ سورۃ الانفال :۲۲)۔

(35) لفظ فَخَّار (اَلرَّحمٰن:۱۴) اور انسان کی قوّتِ گویائی میں مناسبت :

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِO (اَلرَّحمٰن : ۱۴)

''اُسی نے انسان کو پیدا کیا (ایسی مٹّی سے) جو ٹھیکرے کی طرح بجتی تھی۔'' (۵۵:۱۴)

لفظ ''فَخَّار'' سے اشارۃ النص کی رُو سے معلوم ہوا کہ تخلیق شدہ انسان' انسانِ ناطق (بولنے والا) ہوگا۔

(36) مسلمانوں کی نیکیاں اُن کے کم نیک رشتہ داروں کو فائدہ دیں گی : جیسا کہ سورۃ الطُّور (۵۲) کی اِس آیت سے ظاہر ہے :

وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَا اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ (اَلطُّور : ۲۱)

''اور جو لوگ ایمان لائے اور اُن کی اولاد نے بھی ایمان میں اُن کا ساتھ دیا' ہم اُن کے ساتھ اُن کی اولاد کو بھی شامل کر دیں گے اور ہم اُن کے عمل سے کوئی بھی چیز کم نہ ہونے دیں گے۔''

اہلِ جنت اپنے مسلمان نیک قرابتداروں کو جنت میں اپنے ساتھ نہ پا کر رب تعالیٰ سے اپنے رشتہ داروں سے اُنہیں ملا دینے کی درخواست کریں گے۔اِس صورت میں دو اختیار (Options) باقی رہ جاتے ہیں: یا تو اِن نیک لوگوں کا درجہ کم کر کے اِنہیں کم درجہ کی جگہ میں وہاں بھیج دیا جائے جہاں ان کے کم نیک رشتہ دار رہ رہے ہیں لیکن یہ بات اللہ تعالیٰ کی شانِ کریمی کے خلاف اور ان لوگوں کی دل آزاری کے مترادف ہے کہ جو لوگ زندگی بھر اپنے رب کو راضی رکھنے میں کوشاں رہے' اُنہیں اُن کا قدردان رب اُن کے درجے اور مرتبہ کو کم کر دے' یہ نہ ہوگا۔ دوسری صورت یہ کہ اُن کم نیک رشتہ دار جنتیوں کا درجہ بلند کر کے اُنہیں اِن درخواست دہندگان کے ساتھ اونچے درجے میں اُن کے ساتھ ملا دیا جائے اور رب ذی الجلال والاکرام ایسا ہی کریں گے جو مسلمانوں پر اُس کا مزید احسان وتلطف ہوگا۔اِسی قسم کا مضمون سورۃ الرّعد (۱۳) کی آیت ۲۳ میں بھی آیا ہے۔

(37) یومِ پیدائش خوشی منانے کا نہیں' اظہارِ غم واندوہ کا دن ہے : ہماری زندگی کا ہر

ہر گزرنے والا لمحہ ہمیں اپنی قبر کے قریب کر رہا ہے تو یہ کتنی بڑی نادانی اور کوتاہ اندیشی کی بات ہے کہ ربّ العالمین کے حضور اپنے ہر لمحہ کی سخت جوابدہی کی فکر کرنے کی بجائے ہم اُس پر خوشی منائیں جس نے ہمیں اپنی قبر سے قریب تر کر دیا ہے۔ کیا ہم نے کبھی یہ سوچا کہ برتھ ڈے کی خوشی منانا اُس قوم کی اندھی تقلید ہے جس کی تہذیب وثقافت اس عقیدے پر مبنی ہے کہ اُن کے پیغمبر عیسیٰ علیہ السلام نے صلیب پر چڑھ کر اُن کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا ہے اور یہ کہ اب اُنہیں اپنے خالق کے حضور کسی قسم کے عمل کی باز پرس نہیں ہونی۔ لیکن ہم مسلمانوں کا عقیدہ اس سے بالکل مختلف ہے جو اپنے خالق و مالک کے حضور جوابدہی اور اپنے اعمال کی ذمہ دارگی کی اَن مٹ حقیقت پر مبنی ہے۔ ذرا غور تو کیجئے کہ قرآنِ مجید نے ہمیں کیسے ہمیں خوابِ خرگوش سے جگایا ہے:

وَ الۡعَصۡرِ O اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ O (اَلۡعَصۡر : ۱ - ۳)

''قسم ہے زمانہ کی کہ انسان بڑے خسارہ میں ہے۔'' (۱-۳ : ۱۰۳)

''یہ خسارہ بہ سبب اپنی فرصتِ عمر کے تلف وضائع کرڈالنے کے ہے۔ زمانہ جو ہر لمحہ انتہائی سرعت کے ساتھ گزرتا چلا جاتا ہے، وہی تو ظرف ہے جس کے اندر انسان سبھی کچھ کرتا رہتا ہے اور سبھی کچھ اُس پر گزرتی رہتی ہے۔ اُسی میں وہ کھوتا بھی ہے اور اُسی میں وہ پاتا بھی ہے۔ رنج وحرمان، نقصان وخسران بھی اسی میں اُس پر واقع ہو کر رہتا ہے۔ عمرِ انسانی کے لمحات دیکھتے دیکھتے کس تیزی سے گزر جاتے ہیں اور انسان خالی ہاتھ رہ جاتا ہے۔ اِسی کو گواہ کر کے قرآن مجید کہتا ہے کہ نافرمان انسان بھی کیسا بدقسمت اور حرماں نصیب ہے! وقت کی پوری قدر کرنا اور عمر کے ایک ایک لحظہ اور پل کا حساب رکھنا کہ اس سب کا سوال ہوگا، اسلام کی اہم تعلیمات میں سے ہے۔'' (تفسیر ماجدی، ص ۱۲۰۹)

مَنۡ تَشَبَّہَ بِقَوۡمٍ فَھُوَ مِنۡھُمۡ (جس کسی نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی تو اُس کا شمار اُنہی میں سے ہوگا)

(38) تکبر اور توہینِ رسالت ابلیس کو راندۂ درگاہ کر گئے: سورۃ البقرۃ میں ارشاد ہوا:

وَاِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوۡٓا اِلَّآ اِبۡلِیۡسَ اَبٰی وَاسۡتَکۡبَرَ وَ کَانَ مِنَ الۡکٰفِرِیۡنَ O

''اور (وہ وقت یاد کیجئے) جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کے آگے جُھک جاؤ تو (وہ سب) جھکے مگر ابلیس (نہ جھکا)، اُس نے انکار کیا، تکبّر کیا اور کافروں میں سے ہوگیا۔'' (۳۴ : ۲)

ابلیس پر کفر کا اطلاق حکم کے انکار کی بناء پر ہوا، محض ترکِ عمل (سجدہ کے انکار) کی بناء پر نہیں ہوا۔ ترکِ عمل کو خواہ گناہ کیسا ہی ہو، ایمان سے خارج کر دینے اور کفر تک پہنچا دینے کے لئے اہلِ سنت کے مذہب میں کافی نہیں (مدارک بحوالہ تفسیر ماجدی، صفحہ ۱۷، نوٹ: ۱۲۸)

ابلیس کا متکبرانہ انکار اس بناء پر تھا کہ ''میں آدم سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور آدم کو مٹی سے'' (سورۃ الاعراف: ۱۲)۔ یہ شیطان کی خود اختراعی منطق تھی جو قیاس پر مبنی تھی اور اسی وجہ سے اُسے مردود اور راندۂ درگاہِ الٰہی کر دیا گیا۔ اشارۃ النص کی رُو سے معلوم ہوا کہ قیاس کفر کا دوسرا نام ہے اگر اُسے الٰہی حکم کے مقابل استعمال کیا

جائے۔ آیتِ مذکورہ سے جو اور ایک سبق ہمیں ملتا ہے وہ یہ ہے کہ شیطان کے معلّم الملکوت ہونے اور رب تعالیٰ کو لا تعداد صدیوں تک سجدے کرنے کے باوجود آدم علیہ السلام جیسے پیغمبر کے آگے نہ جھکنا اور اس طرح اُن سے اپنے آپ کو بہتر کہنا جو نبوّت کی سراسر توہین ہے' اُسے راندہِ درگاہِ الٰہی کر گیا۔

(39) باجماعت نماز کے رکوع میں ملنے والا اُس کی رکعت کو پالیتا ہے:

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَآتُوالزَّکٰوۃَ وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ O (البقرۃ: ۴۳)

''نماز قائم کرو' زکوٰۃ دیتے رہو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرتے رہو۔'' (۲:۴۳)

اس سے معلوم ہوا کہ باجماعت نماز کے رکوع میں شامل ہونے والا شخص اُس رکعت کو پالیتا ہے کیونکہ وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ O سے یہ بات معلوم ہو رہی ہے۔ وضاحت کتبِ فقہ میں موجود ہے۔

(40) دیدارِ الٰہی کا ایک اور ثبوت: سورۃ البقرۃ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہوا:

وَاِنَّھَا لَکَبِیْرَۃٌ اِلَّا عَلَی الْخٰشِعِیْنَ O الَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّھُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّھِمْ وَاَنَّھُمْ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ O (البقرۃ: ۴۶)

''اور بے شک نماز گراں ہے مگر خشوع رکھنے والے لوگوں پر نہیں جنہیں اس کا پختہ یقین ہے کہ اُنہیں اپنے پروردگار سے ملنا (بھی) ہے اور اس کا کہ اُنہیں اُس کی طرف واپس ہونا ہے۔''

رب کو اپنی اِنہی ظاہری آنکھوں سے نہ دیکھنا آیت کو بے معنیٰ کر دے گا۔ لہٰذا آیت کا صاف مطلب یہ ہے کہ اہلِ جنت بفضلہٖ تعالیٰ یقیناً اپنے رب کا دیدار کریں گے۔ (مزید تفصیل اِسی جلد کے صفحات ۲۸۷۴' ۲۸۷۵ پر موجود ہے۔)

(41) اللہ تعالیٰ تاریخ نگاری اور اپنے ماضی کو یاد رکھنے کو پسند کرتا ہے: چنانچہ فرمایا:

یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ (البقرۃ: ۴۷' ۱۲۲)

''اے اولادِ اسرائیل! میری اُن نعمتوں کو یاد تو کرو جو میں نے تم پر کیں۔'' (۴۷' ۱۲۲ : ۲)

اس آیت کا صاف اور صریح مطلب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تاریخ نگاری پسند ہے اور وہ چاہتا ہے کہ حضرتِ انسان اپنے ماضی کا علم رکھے تاکہ وہ اپنے آباء و اَجداد پر منعمِ حقیقی کی طرف سے کیے گئے احسانات و انعامات اور نوازشات کو یاد رکھے اور اس طرح اپنے خالق و مالک کے مطیع و فرمانبردار بنا رہے۔

(42) خالص زرد رنگ خوشی و مسرت کا باعث ہے اور رنج و اندوہ کو ختم کرتا ہے: موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے اُن سے کہا کہ اپنے رب سے درخواست کیجیے کہ اُس (گائے) کا رنگ کیسا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ گائے خوب گہرے زرد رنگ کی ہو' دیکھنے والوں کو اچھی معلوم ہوتی ہو۔'' (۲:۶۹)

تفسیر عزیزی اور تفسیر روح البیان نے اِس جگہ حضرت عبداللہ بن عباس اور علی رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ جو شخص پیلے رنگ کے جوتے پہنے' انشاء اللہ اُس کے غم دور ہوں گے اور وہ خوش و خرم رہے گا۔ خیال رہے کہ سرخی اور زردی' سیاہی وسفیدی اور سبزی اِن پانچ رنگوں کے جدا جدا خاصے ہیں: سرخی میں جمال ہے' زردی میں خوشی۔ سبزی میں بزرگی اور سفیدی میں افضلیت اور سیاہی میں وحشت و رنج و غم۔'' (تفسیر نعیمی' ج ا' صفحہ ۵۲۷)

(43) معاشرے کے استحکام اور فلاح و بہبود کا ایک بنیادی قرآنی نکتہ:

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَ كُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَ اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ○ (البقرۃ :۸۴)

''اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا کہ اپنوں کا خون نہ بہانا اور اپنے لوگوں کو اپنے وطن سے مت نکالنا پھر تم نے اس کا اقرار کر لیا اور تم اس کے گواہ ہو۔'' (۲:۸۴)

آپس کی جنگ اور خونریزی کسی سماج کے استحکام کی بنیادوں میں دراڑ ڈال دیتی ہے جس کا انجام تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا کیونکہ یہ اپنے ہی آپ کو کمزور کرنے اور بزدل بننے کا سبب بنتی ہے۔ اس سے قومی وقار کو بھی دھچکا لگتا ہے۔ اگر اُمّتِ مسلمہ اِس قرآنی منطق کو سمجھ لے تو دنیا کی کوئی بھی طاقت اُنہیں نقصان نہیں پہنچا سکتی اور ذلیل نہیں کر سکتی۔ یہ نکتہ انتہائی لمحہ فکریہ کا متقاضی ہے!

(44) سحر (جادو) کا اثر محض حکمِ الٰہی سے ہوتا ہے: جیسا کہ سورۃ البقرۃ کی اس آیت سے ثابت ہے:

وَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ وَمَاهُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (البقرۃ : ۱۰۲)

''لوگ اُن دونوں (ہاروت و ماروت) سے وہ (جادو سیکھ لیتے) جس سے وہ مرد اور اُس کی زوجہ کے درمیان جدائی ڈال دیتے حالانکہ وہ (فی الواقع) کسی کو بھی اس کے ذریعہ سے نقصان نہ پہنچا سکتے مگر ہاں ارادۂ الٰہی سے۔'' (۲ : ۱۰۲)

مندرجہ بالا آیت کی عبارۃ النص کی رُو سے سحر (جادو) کا اثر ہونا ثابت ہے۔ لیکن یہ اثر ارادۂ الٰہی پر موقوف ہے کیونکہ جادو بہر حال اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہے اور کوئی بھی تخلیق اللہ کے ارادہ اور اُس کی منشا کے خلاف نہیں جا سکتی۔

(45) جادو سے تائب کی توبہ اللہ تعالیٰ کو قبول ہے: اُسی سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۰۳ میں ہے :

وَلَوْ اَنَّهُمْ آمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ○

''اور اگر وہ ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو اُس کا ثواب اللہ کے ہاں کہیں بہتر ہوتا' کاش وہ (اتنا) جانتے ہوتے۔'' (۲ : ۱۰۳)

یعنی وہ اگر اپنی موجودہ روشِ کفر و فسق سے تائب ہو جاتے۔ گنہگار بلکہ سرکش' نافرمان و غدّار بندوں کے

حق میں اِس قدر تاسّف اُسی مالکِ حقیقی ہی کا حصّہ ہے! کیا حد ہے اِس شفقت و کرمِ بے حساب کی!

(46) مسجدوں کے برباد کرنے والے اور اُنہیں آباد کرنے والے کی سزا و جزا:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسَاجِدَاللهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَااسْمُه' وَسَعٰى فِىْ خَرَابِهَا اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَا اِلَّا خَآئِفِيْنَ لَهُمْ فِى الدُّنْيَا خِزْىٌ" وَّلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَاب" عَظِيْمٌ"O (البقرۃ : ۱۱۴)

''اور اُس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ کی مسجدوں کو اس سے روک دے کہ اُن میں اللہ کا نام لیا جائے اور اُن کی بربادی کی کوشش کرے' یہ لوگ اس لائق ہی نہیں کہ اُن میں داخل ہوں مگر ہاں یہ کہ ڈرتے ہوئے' اُن کے لئے دنیا میں میں (بھی بڑی) رسوائی ہے اور آخرت میں (بھی) بڑا عذاب ہے۔'' (۲:۱۱۴)

آیتِ بالا کی عبارۃ النص سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی مساجد سے روکنے والے اور اُن کی ویرانی کی کوشش کرنے والے (یعنی نمازیوں کی تعداد کم کرنے والے) کی سزا بہرحال ثابت ہے۔لیکن اس کے برعکس آیت کی اشارۃ النص اُس شخص کے ثواب کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو مساجد کو آباد کرتا ہے اور نمازیوں کی تعداد میں اضافے کی کوشش کرتا ہے۔ مساجد کی تزئین' روشنی' اُن میں قالینوں کا بچھانا' بہترین اور اہل امام کا انتظام کرنا' یہ سب چیزیں اللہ کے نزدیک قابلِ تحسین و ستائش ہیں۔

(47) ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ربِ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (البقرۃ : ۱۲۴)

''میں تجھے لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔'' (۱۲۴ : ۲)

اور ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں ارشاد ہوا :

لِيَكُوْنَ لِلْعَالَمِيْنَ نَذِيْرًا (الفرقان : ۱)

''تاکہ آپ تمام جہانوں کے لئے ڈرانے والے ہوں۔'' (۱ : ۲۵)

اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام بنی نوعِ انسان کے پیشوا اور قائد (نہ کہ اُن کی طرف پیغمبر) بنا کر بھیجے گئے جبکہ امام الانبیاء حضرت محمد رّسول اللہ ﷺ کو تمام مخلوقات (بہ شمول انسان و حیوانات' ملائکہ' جنّات' مرئی اور مرئی (نظر آنے اور نظر نہ آنے والی) چیزوں' جاندار اور بے جان ہستیوں کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا گیا۔علاوہ ازیں ایک قائد (پیشوا) اور رسول کے مابین یہی فرق ہے کہ منصبِ رسالت میں جامعیت کا فہم ہے جبکہ امامت میں یہ بات نہیں ہوتی۔ اگر ہم کسی کو نمازوں کی امامت کے لئے مقرر کریں تو اُس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اُس کی نماز کی ہم اقتداء (پیروی) کریں' یہ نہیں کہ ہم اُس کی اُمّت کہلائیں۔

(48) تبرکات کی شریعت میں حیثیت : سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۲۵ میں ارشادِ گرامی ہوا :

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى (اور مقامِ ابراہیم کو جائے نماز بنالو۔)

''مقامِ ابراہیم'' صرف اس وجہ سے مقدس نہیں ہے کہ وہ جنت سے اتارا ہوا ہے بلکہ اس وجہ سے بھی مقدس ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے قدم مبارک اُس سے چھوئے ہیں کہ اُس پر کھڑے ہو کر آپ نے خانہ کعبہ کی تعمیر کی تھی۔ ''مقامِ ابراھیم'' کے قرآنی الفاظ اِس حقیقت کو آشکار کر رہے ہیں کہ اُس پتھر کو تقدس اس لئے حاصل نہیں کہ وہ جنت سے آیا ہے بلکہ اس لئے ہے کہ وہ جدّ الانبیاء ابراہیم علیہ السلام کے کھڑے ہونے کی جگہ رہی ہے' ورنہ قرآن کی عبارت ''جنتی پتھر'' ہوتی نہ کہ مقامِ ابراہیم۔

مقدس لوگوں کے تبرکات کا احترام قرآن مجید کی متعدد آیات اور کئی احادیث نبوی سے ثابت ہے۔ قادرِ مطلق اللہ نے اُس کے محبوب و مقرب بندوں کے ساتھ اُن تبرکات کی نسبت ہونے کی وجہ سے اُن میں شِفاء کی خاصیت بھی رکھ دی ہے اور اسی وجہ سے اُس کی رحمت کا بحرِ مواج جوش میں آجاتا ہے۔ ذیل کی چند مثالیں کچھ ذہنوں میں ابھرنے والے شکوک وشبہات کی جڑ کاٹنے کے لئے کافی ہیں بشرطیکہ تلاشِ حق کی جستجو صادق اور مخلصانہ ہو:

(۱) ربّ ذوالجلال والاکرام نے یعقوب علیہ السلام کی بینائی اُن کے پسر حضرت یوسف علیہ السلام کے پیرہن کے وسیلہ سے بحال کر دی حالانکہ وہ قادرِ مطلق اس دنیا کے ''علت ومعلول'' کے قانون کا ہرگز پابند نہیں۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر حضرت ایوّب علیہ السلام کو اُن کی طول طویل بیماری سے اُن سے یہ کہہ کر شفا دے دی کہ وہ اپنا پاؤں زمین پر ماریں' جس کے نتیجہ میں پانی زمین سے ابل پڑا جس سے آپ نے غسل کیا اور آپ کے جسم میں کیڑوں کی وجہ سے پیدا ہونے والا خلا پُر ہو گیا اور اس طرح آپ رُو بہ صحت ہو گئے (سورہ ص: ۴۲)۔ سوال یہ ہے کہ آیا پانی میں اذن اللہ کے بغیر شِفا یابی کی کوئی خاصیت تھی یا یہ کہ ایوب علیہ السلام کے قدم مبارک نے اُسے چھوا تھا؟

(۳) فرموداتِ نبوی علی صاحبھا الصلوٰۃ والسلام سے ثابت ہے کہ مدت ہا مدیدہ سے آبِ زمزم میں متعدد بیماریوں کے لئے شِفاء اور کئی مقاصد کے حصول کا اثر ہے۔ یہاں بھی وجہ وہی ہے کہ اسماعیل علیہ السلام کے قدم مبارک اُس پانی سے چھوئے تھے۔

(۴) اسرائیلی بادشاہ طالوت نے جالوت پر اسی لئے فتح پائی کہ موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے تبرکات صدیوں بعد اُن کی طرف واپس آ گئے تھے (سورۃ البقرۃ: ۲۴۸)۔

(۵) نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کئی صحابہ کرام نے آپ ﷺ کے تبرکات کو محفوظ کر لیا تھا تاکہ بہ وقتِ ضرورت اور بیماری' اور دشمن پر فتح پانے جیسے ہنگامی حالات میں وہ اُن سے مستفید ہوں۔

لہٰذا ''شرک'' اور توسّل الی اللہ کے مابین صاف اور واضح فرق ہے۔ اُنہیں آپس میں گڈمڈ اور خلط ملط نہیں کرنا چاہئے۔ توسل الی اللہ کے پسِ پردہ رضائے الٰہی شامل ہوتی ہے جبکہ شرک اللہ کے حق میں بے ادبی اور گستاخی ہے اور مشرکین کے لئے غضبِ الٰہی لانے کا موجب ہے۔

(49) بلا استثناء تمام کے تمام نبیوں اور رسولوں کے تمام آباء و اَجداد موحّد اور ایک ہی اللہ کے پرستار رہے ہیں : ملاحظہ ہو سورۃ البقرۃ کی یہ آیت جس میں ابراہیم علیہ السلام اور اُن کے فرزندِ ارجمند حضرت اسماعیل علیہ السلام اپنے رب سے التجا کرر ہے ہیں :

رَبَّنَا وَاجۡعَلۡنَا مُسۡلِمَيۡنِ لَكَ وَمِنۡ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسۡلِمَةً لَّكَ (البقرۃ : ۱۲۸)

''اے ہمارے پالنہار! ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار بنادے اور ہماری نسل سے ایک فرمانبردار اُمّت پیدا فرمادے۔'' (۱۲۸ : ۲)

ایک مستشرق کی زبان سے بھی جو اسلام دشمنی میں یکتائے زمانہ ہے' بڑے پتے کی بات نکل گئی ہے' وہ کہتا ہے : ''اسلام کی بنیاد تو حقیقۃً اسمٰعیل کے ہاتھوں پڑی جو اہلِ عرب کے مورثِ اعلیٰ ہیں۔'' (ماجدی اردو ص ۵۱ بحوالہ جیوش فاؤنڈیشن آف اسلام صفحہ ۶ دیباچہ)

مِنۡ ذُرِّيَّتِنَا یعنی ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کی مشترک نسل سے ۔ یہ دعا دونوں بزرگ مل کر کر رہے تھے' اس لئے ذُریّت سے مراد بنی اسمٰعیل ہی ہو سکتے تھے ۔ چنانچہ آیتِ بالا سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ دونوں بزرگ پکے اور خالص موحّد تو تھے ہی' اس لئے ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے والدین کریمین اور آپ کے آباء و اجداد جو بنو اسمٰعیل میں سے تھے' بھی یقیناً موحّد تھے اور شرک سے کوسوں دُور تھے☆ ۔ معاذ اللہ اگر اُن میں سے کسی کا شرک ایک لحہ کے لئے بھی تسلیم کرلیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ (معاذ اللہ) اِن دونوں ارفع و اعلیٰ ہستیوں کی دعا اور التجا مقبول نہ ہوئی ۔ اُن کی دعا کے مستجاب ہونے کو تسلیم کرنے کا مطلب لازمی طور پر یہی ہے کہ نبی علیہ السلام کے والدین کریمین پکے اور خالص موحّد تھے ورنہ یہ قرآن کی صداقت کے خلاف بات ہوگی#۔

(50) معرفتِ الٰہی رسول کے ذریعے ہی ممکن ہے : اس حقیقت کا اظہار یعقوب علیہ السلام کے فرزندان اپنے اس بیان میں کر رہے ہیں جو سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۳۳ میں ہے :

نَعۡبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبۡرٰهٖمَ وَ اِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ وَّنَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ ۝

''ہم عبادت کریں گے آپ کے اور آپ کے باپ دادوں ابراہیم' اسمٰعیل اور اسحٰق کے معبود کی (اُس) معبودِ واحد کی اور ہم تو اُسی کے حکم بردار ہیں۔'' (۱۳۳ : ۲)

اس کا مطلب یہی ہے کہ معرفتِ الٰہی انبیائے کرام ہی کے ذریعہ سے ممکن ہے ۔ یعقوب علیہ السلام کے

☆ تفصیل کے لئے دیکھئے اسی انسائیکلوپیڈیا کی جلد پنجم کے صفحات ۲۱۸۷ تا ۲۱۸۹۔

ابراہیم علیہ السلام کے بت پرست چچا آزر کو اُن کا باپ ثابت کرنا بھی بدعقیدگی ہے' کیونکہ ازروئے تحقیق ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام تارخ تھا نہ کہ آزر ۔ آزر کے لئے قرآن کا ''آب'' کے لفظ کے استعمال سے ان لوگوں کو اُن کے باپ ہونے کا دھوکہ ہوا ہے ۔ حالانکہ ''آب'' کا ایک معنیٰ چچا کا بھی ہے ۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو اسی انسائیکلوپیڈیا کی جلد پنجم کے صفحات ۲۱۸۵' ۲۱۸۶' ۲۱۹۰۔

فرزندان نے یہ نہیں کہا کہ ہم اُس اللہ کی عبادت اس طرح کریں گے جیسے ہماری عقل و دانش ہماری راہنمائی کرے گی بلکہ اُنہوں نے یہ کہا کہ وہ اُس خدائے واحد کی پرستش کریں گے جو یعقوب علیہ السلام اور اُن کے آباء واَجداد کا معبودِ برحق ہے۔ مزید برآں آیت میں نبوّت کے اعلیٰ وارفع منصب کو بھی اجاگر کیا جارہا ہے۔

(51) نبی علیہ السلام کے شمائل وخصائص کا چھپانا یہود کا کام ہے: یہ حقیقت قرآن سے ثابت ہے

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ الْکِتٰبِ وَیَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا اُولٰٓئِكَ مَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا یُکَلِّمُهُمُ اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَلَا یُزَکِّیْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ O اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰی وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَی النَّارِ O

''بے شک جو لوگ اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب کو چھپاتے ہیں اور اُس کے معاوضہ میں حقیر قیمت حاصل کرتے ہیں، تو ایسے لوگ تو اپنے پیٹوں میں آگ ہی آگ بھرتے ہیں' اللہ قیامت کے دن نہ تو اُن سے کلام کرے گا' نہ اُنہیں پاک کرے گا اور اُن کے لئے دردناک عذاب ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کے بدلہ میں گمراہی کو اور عذاب کو نجات کے بدلہ میں خرید لیا ہے اور یہ لوگ دوزخ پر کیسا صبر کئے ہوئے ہیں!'' (۱۷۴' ۱۷۵ : ۲)

علمائے یہود اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لئے خاتم الانبیاء والمرسلین ﷺ کے اُن خصائص وفضائل کو چھپانے کے عادی تھے جن کا ذکر تورات شریف میں ہوا تھا۔ اس لئے اُنہیں غضبِ الٰہی کی اُن چھ قسموں کا مُورد بننا پڑا جن کا ذکر آیتِ بالا میں ہوا۔ یہ حقیقت اُن لوگوں کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہے جو اُسوہِ رسول کو اجاگر کرنے کی بجائے اُسے چھپانے کی مذموم کوشش کے مرتکب ہیں اور اس طرح وہ یہود کے طریقے پر گامزن ہیں۔

(52) قربِ الٰہی کے حصول کا انحصار کوشش اور تجسس پر ہے: چنانچہ فرمایا :

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ'' (البقرة : ۱۸۶)

''اور جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں پوچھیں تو میں تو قریب ہی ہوں۔'' (۲:۱۸۶)

آیتِ مذکورہ میں جو پہلا نفیس وباریک نکتہ بیان ہوا ہے وہ یہ ہے کہ قرب ورضائے الٰہی کا انحصار تجسس اور کوشش پر ہے۔ گمراہ قوموں نے باری تعالیٰ کے وجود کا اقرار تو بارہا کیا ہے لیکن ذاتِ باری کو انسان سے اس قدر پرے' مادّی ومعنوی دونوں حیثیتوں سے فرض کیا ہے کہ وہاں تک بندوں کی رسائی گویا ممکن ہی نہیں۔ دوسرا لطیف نکتہ یہ بیان ہوا ہے کہ قربِ الٰہی صرف خاتم الانبیاء ﷺ ہی کے توسل ہی سے ممکن ہے کیونکہ آیتِ مذکورہ میں خطاب نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہوا ہے۔

(53) کسی نبی پر الزام لگانا ازروئے قرآن اللہ پر الزام لگانا ہے: یہودِ مدینہ نے مسلمانوں' کو اُن کھانوں کے کھانے کا الزام دیا جن کا کھانا یعقوب علیہ السلام نے اپنے آپ پر ممنوع کر دیا تھا۔ حالانکہ یعقوب

علیہ السلام نے طبی ضرورت کے تحت اپنے آپ پر دودھ اور اونٹ کے گوشت کو ممنوع کر لیا تھا نہ کہ الٰہی حکم کے تحت۔ قرآن مجید نے اُن کے اس الزام کو مسترد کیا اور یہود کو اُن کی اپنی کتاب تورات کا حوالہ دیتے ہوئے خاموش کرایا اور پھر فرمایا:

فَمَنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ مِنْ بَعْدِ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ (آلِ عمران: ۹۴)
''تو جو شخص اللہ پر اس کے بعد جھوٹ گھڑے تو بس ایسے ہی لوگ ظالم ہیں۔'' (۳ : ۹۴)

یہاں غور طلب نکتہ یہ ہے کہ یہود نے اللہ کے پیغمبر یعقوب علیہ السلام پر جھوٹا الزام لگایا تھا نہ کہ اللہ پر۔ لیکن رب تعالیٰ نے اُن کے افترا و اختراع کو اپنی طرف منسوب کیا جس کا صاف مطلب یہی ہے کہ کسی نبی پر الزام لگانا گویا کہ خود اللہ تعالیٰ پر الزام لگانا ہے۔ سبحان اللہ! کس سنہرے انداز سے وہ اپنے مقرّبین کی عصمت کی حفاظت فرماتا ہے!

(54) اللہ کے محبوبین کا ہر عمل اللہ کا عمل ہوا کرتا ہے: آیاتِ قرآنی ملاحظہ ہوں:۔

تِلْکَ آیَاتُ اللّٰہِ نَتْلُوْھَا عَلَیْکَ بِالْحَقِّ (آلِ عمران: ۱۰۸)
''یہ اللہ کی آیتیں ہیں جنہیں ہم آپ کو ٹھیک ٹھیک پڑھ کر سناتے ہیں۔'' (۳ : ۱۰۸)

ربّ ذوالجلال والاکرام نے خود تو کبھی بھی قرآن کی کوئی ایک آیت تک اپنے رسولِ معظم ﷺ کو پڑھ کر نہیں سنائی بلکہ آپ علیہ السلام کی طرف جبریلِ امین قرآن لائے اور اُنہیں تلاوت کر کے سنایا۔ لیکن اللہ تعالیٰ جبریلِ امین کی تلاوت کو اپنی طرف منسوب کر رہا ہے اور فرما رہا ہے کہ ہم اُسے پڑھ کر آپ کو سناتے ہیں۔ یہ رب تعالیٰ کا عمومی انداز ہے کہ وہ اپنے محبوبین و مقرّبین کے عمل کو اپنا عمل اور اپنے عمل کو اُن کا فعل بتاتا ہے۔ کچھ مزید مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) جب جبریلِ امین نے سیّدہ مریم سلام اللہ علیہا کو عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کی خبر دی تو اُنہوں نے یہی کہا تھا کہ ''میں آپ کو ایک صاف ستھرا بچہ دینے آیا ہوں'' (سورہ مریم: ۱۹)۔ حالانکہ دینے والا رب تعالیٰ تھا۔

(۲) صلح حدیبیہ کے موقع پر نبی اکرم ﷺ نے اپنے صحابہ کرام سے بیعت لی لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کے اس عملِ بیعت کو اپنی طرف منسوب کرتے ہوئے فرمایا کہ ''جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ دراصل اللہ سے بیعت کرتے ہیں'' (سورۃ الفتح: ۱۰)۔

(۳) جنگِ بدر میں نبی اکرم ﷺ نے متحارب کفارِ مکہ کی طرف کچھ کنکریاں پھینکیں جس سے اُن کی آنکھیں اندھی ہو گئیں۔ یہاں بھی رب تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کے اس عمل کو اپنی طرف منسوب کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ کنکریاں آپ نے نہیں بلکہ اللہ نے پھینکی تھیں (سورۃ الانفال: ۱۷)۔

(۴) سیّدنا عیسیٰ علیہ السلام نے کچھ خدائی قوّتوں اور خصائص کو اپنی طرف منسوب کرتے ہوئے فرمایا کہ

میں مادر زاد اندھے کو بینا کر دیتا ہوں' کوڑھی کو شفا دیتا ہوں اور مُردوں کو زندہ کرتا ہوں (اگرچہ اذن اللہ کی شرط ساتھ لگائی' بحوالہ سورہ آلِ عمران: ۴۹) حالانکہ یہ سب کام خدا اور صرف خدا کی قدرت سے متعلق ہیں۔

(۵) انسانی اعمال و افعال کا ریکارڈ رکھنا اللہ کی طرف سے مقرر کئے گئے فرشتوں کا کام ہے لیکن اللہ تعالیٰ اُن کے ریکارڈ کرنے کے عمل کو اپنی طرف منسوب کرتے ہوئے فرماتا ہے: ''جو کچھ یہود نے کہا ہے' یقینی طور پر اُس کا ہم اندراج کر کے رہیں گے۔'' (آلِ عمران: ۱۸۱)۔ [یہود نے کہا تھا کہ اللہ فقیر اور ہم غنی ہیں۔]

(۶) رب تعالیٰ بذاتِ خود بہترین نگران ہے (بحوالہ سورہ یوسف: ۶۴؛ سورۃ المؤمنون: ۴۲) لیکن سورۃ الانعام کی آیت ۶۱ یوں ہے: ''وہ تمہارے اوپر نگران (فرشتے) بھیجتا ہے جو اُس کی مخلوقات کی روح قبض کرتے ہیں۔'' سورۃ الانعام کی آیت ۶۰ میں فرشتوں کی طرف سے روح قبض کرنے کے عمل کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ حالانکہ قبضِ روح کا عمل خالصتاً اللہ تعالیٰ کا ہے۔

ایک اور قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ سورہ آلِ عمران کی آیت ۱۰۸ میں فرمایا: ''ہم اِن آیات کو آپ کو پڑھ کر سناتے ہیں'' اور سورہ آلِ عمران کی آیات ۱۰۸' ۱۶۴' اور سورۃ الجُمُعہ کی آیت ۲ میں فرمایا: ''اللہ کا رسول اُس کی آیات پڑھ کر اُنہیں سناتا ہے۔'' اِن دونوں آیات کو اکٹھا پڑھنے سے اقتضاء النص کی رُو سے نتیجہ یہ نکلا کہ رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ اور اُس کی مخلوق کے درمیان وسیلہ جلیلہ ہیں۔

(55) صاحبِ ایمان ہونے کے لئے اللہ اور یوم آخرت پر ایمان ہونے کے ساتھ ساتھ رسالت پر ایمان ہونا بھی ناگزیر شرط ہے: چنانچہ سورہ آلِ عمران کی آیت ۱۱۰ میں فرمایا:

وَلَوْ آمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ

''اور اگر اہلِ کتاب ایمان لے آتے تو اُن کے حق میں کہیں بہتر ہوتا۔'' (۳ : ۱۱۰)

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کہ اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) کا ایمان اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور یومِ آخرت وغیرہ پر تھا لیکن اُنہوں نے نبی آخر الزماں ﷺ کی رسالت کا انکار کر دیا جس کے نتیجہ میں اللہ اور یومِ آخرت وغیرہ پر اُن کے ایمان کے بے ثمر ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔ لہٰذا یہ نتیجہ نکالنا کچھ مشکل نہیں کہ نبی علیہ السلام کی رسالت کا انکار اللہ اور ایمان کی تمام جزئیات سے انکار کے برابر ہے جیسا کہ قرآنی عبارت وَلَوْ آمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ (اگر اہلِ کتاب ایمان لے آتے) سے ظاہر ہے۔

(56) باہمی مشاورت میں جمہوری عنصر پنہاں ہے اور یہ کہ باہمی مشاورت توکل علی اللہ کے خلاف نہیں: اس حقیقت کو سورہ آلِ عمران کی آیت ۱۵۹ میں بیان کیا گیا:۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ O
''اور اُن سے معاملات میں مشورہ لیتے رہیے لیکن جب آپ پختہ ارادہ کرلیں تو اللہ پر بھروسہ رکھیں' بے شک اللہ اُن سے محبت کرتا ہے جو اُس پر بھروسہ کرتے ہیں۔'' (۱۵۹ : ۳)

''مشورہ کی بڑی فضیلتیں احادیثِ مبارکہ میں آئی ہیں اور ظاہر ہے کہ مشورہ کا حکم جب رسول صاحب وحی کو مل رہا ہے تو دوسروں کے لئے اُس کی ضرورت واحتیاج کتنی زائد رہے گی۔ حکم ہوا کہ جب کسی امر میں مشورہ ہولے تو بس اب تذبذب وتامّل کو دخل نہ دیجئے اور بلا تکلف وتوقف اللہ کے بھروسہ پر عمل اسی پختہ عزم پر کرنے لگئے۔ شخصیت واجتماعیت' فردیت وشوریت کا یہ کیسا حکیمانہ امتزاج ہے! اس میں اشارہ اس طرف بھی ہوگیا کہ اعتماد کی چیز اللہ کی ذات ہے نہ کہ انسانی مشورے۔'' (تفسیر ماجدی اردو۔ عبدالماجد دریا آبادی' صفحہ ۱۶۳' نوٹ: ۳۲۵)

(57) عظمت ورفعتِ شانِ رسالت کے چند مزید تابندہ وروشن ثبوت :

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ (آلِ عمران : ۱۶۱)
''کسی نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ خیانت کرے۔'' (۱۶۱ : ۳)

اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات پر اُس کے دشمنوں کی طرف سے لگائے گئے الزامات کا جواب اپنے محبوب کو لفظِ 'قُل' کہہ کر دیا۔ مثلاً جب نصاریٰ نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر اعتراض کیا تو اس کا جواب اس طرح دیا گیا:

قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَد'' فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ O (الزُّخرف: ۸۱)
''(اے نبی مکرّم!) فرمادیجئے کہ اگر خدائے رحمان کے کوئی اولاد ہوتی تو سب سے اوّل میں عبادت کرنے والا ہوتا۔'' (۸۱ : ۴۳)

یا یہ آیت : قُلْ هُوَاللّٰهُ اَحَد''O (الاخلاص: ۱ ''(اے نبی مکرّم!) فرمادیجئے کہ وہ اللہ ایک ہے۔''

لیکن جب دشمنوں نے اُس کے محبوب ﷺ پر کوئی الزام لگایا تو رب تعالیٰ نے اپنے رسول علیہ السلام کو لفظِ قُل کہہ کر اُس کا جواب نہیں دیا بلکہ نبی کے توسط کے بغیر خود براہِ راست اس کا جواب دیا۔ مثلاً محولہ بالا آیت ۱۶۱ جس میں مخالفین نے نبی علیہ السلام پر خیانت کا الزام لگایا تو اُس کا جواب رب تعالیٰ نے خود دیا کہ خائن ہونا نبی کی شان کے لائق نہیں ہے۔ اسی طرح ابولہب کی نبی علیہ السلام کے خلاف ریشہ دوانیوں کا جواب اللہ تعالیٰ نے خود دیا اور پوری سورۃ اللّھب اُس کے خلاف اُتاردی جس میں اُس کی سزا کا یوں اعلان کیا گیا :

تَبَّتْ يَدَا اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ O مَا اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ' وَمَا كَسَبَ O (اَللَّھب : ۱' ۲)
''ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ برباد ہوگیا' نہ اُس کا مال اُس کے کام آیا اور نہ ہی اُس کی کمائی۔''

ابولہب کے دونوں ہاتھوں کے ٹوٹ جانے سے مراد اُس کی اِس دنیا اور اُس دنیا میں امید کے ٹوٹ جانے

سے ہے۔جنگِ بدر میں مسلمانوں کی فتح وکامرانی نے اُسے ایسا غضبناک کر دیا کہ اُس نے اس خبر کے مخبر کے خلاف شدید ترین اقدام کرنا چاہا۔ ابن ہشام کے مطابق اس واقعہ سے سات روز بعد وہ چیچک کے مرض میں مبتلا ہو کر مر گیا۔اُس کی لاش کے گل سڑ جانے کی وجہ سے اُس کے اپنے بیٹوں نے اُسے چھوا تک نہیں اور جب اُنہوں نے اُسے دفن کرنا چاہا تو اُس کی تدفین بڑے ہی ذلت آمیز طریقے سے ہوئی۔ (Houtsma and Wensink's "Encyclopaedia of Islam" Vol. 1, p. 97

یہ تاریخی حقائق اُس مقامِ اعلیٰ کے ثبوت کے لئے کافی ہیں جو ہمارے نبی مکرّم کو اپنے خالق و مالک کے ہاں حاصل ہے۔

(58) بیوی کا حق مہر ایک متبرک چیز ہے : جیسا کہ سورۃ النسآء میں ارشاد ہوا :۔

وَآتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْئًا مَّرِيْئًا

''اور تم بیویوں کو اُن کے مہر خوش دلی سے دے دیا کرو لیکن اگر وہ خوش دلی سے تمہارے لئے اُس کا کوئی حصّہ چھوڑ دیں تو اُسے مزیدار اور خوشگوار سمجھ کر کھاؤ۔'' (۴ : ۴)

عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ یعنی چاہے وہ جزء چھوٹا ہو یا بڑا' یہاں تک کہ کُل کا کُل بھی۔ فَكُلُوْهُ هَنِيْئًا مَّرِيْئًا محاورہِ زبان میں مراد اس کے لفظی معنیٰ نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ بیوی کی اجازت کے بعد اُس مال کو بے تکلف اپنے تصرف و استعمال میں لا سکتے ہو۔ بیوی اگر شوہر سے مہر وصول کر کے پھر اُسے واپس کر دے تو اُسے ''ہبہ'' کہتے ہیں اور اگر لئے بغیر پہلے ہی معاف کر دے تو اُس کا نام اصطلاحِ فقہ میں ''اِبراء'' ہے اور شرعاً دونوں صورتیں درست ہیں۔

جیسا کہ آیتِ بالا کی اشارۃ النص سے معلوم ہوا کہ بیوی کا مہر ایک متبرک چیز ہے۔سورہ قٓ کی آیت ۹ میں قرآن مجید نے بارش کے پانی کو مبارک کہا ہے اور سورۃُ النّحل کی آیت ۶۹ میں شہد کو شِفاء کہا گیا ہے۔

حضرت علی کرّم اللہ وجھہٗ نے فرمایا کہ بیمار آدمی اپنی بیوی کے مہر میں سے تین درہم کے برابر رقم لے' اُس سے شہد خریدے اور اُس میں بارش کا پانی ملا کر پی لے تو اِن تینوں بابرکت چیزوں کے اکٹھا لینے کی وجہ سے رب تعالیٰ انشاء اللہ ضرور اُسے شِفایاب کر دے گا (تفسیر روح المعانی)۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے علمائے کرام کا کہنا ہے کہ درود شریف میں بھی شِفاء کی تاثیر ہے کیونکہ وہ حضرتِ انسان کی مادرِ اوّل سیّدہ حوّا اسلام اللہ علیھا کا مہر ہے۔

(59) مرد کو رشتہ ازدواج کا پیغام بھیجنا چاہئے نہ کہ عورت کو : سورۃُ النساء میں ہے:

اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ (النسآء : ۴)

''تم اُن عورتوں کو اپنے مال کے ذریعے تلاش کرو۔'' (۴ : ۴)

تَبْتَغُوْا اور کُمْ دونوں مذکر کے صیغے ہیں جس سے معلوم ہوا کہ پیغامِ نکاح مرد کی طرف سے ہوگا۔

(60) نبی اکرم ﷺ کا درِ دولت رحمتِ الٰہی کا دَر ہے : ذیل کی آیت ملاحظہ ہو :

وَ اِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهٖ وَ اَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ O (الانعام : ۵۴)

''اور جب آپ کے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری نشانیوں پر ایمان رکھتے ہیں تو آپ کہہ دیجئے کہ تم پر سلامتی ہو' تمہارے پروردگار نے اپنے اوپر رحمت لازم کر رکھی ہے' بے شک تم میں سے جو کوئی نادانی سے برائی کر بیٹھے پھر وہ اُس کے بعد توبہ کر لے اور اپنی حالت درست کر لے تو اللہ بڑا ہی بخشنے والا' بڑا ہی رحم کرنے والا ہے۔'' (۶: ۵۴)

مسلمان کا بارگاہِ نبوی میں حاضر ہونا رحمت وعنایاتِ الٰہی اور اُس کی مغفرت کا مورد ہونا ہے۔ یہاں توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ بارگاہِ نبوی میں حاضر ہونے والوں کے لئے تین چیزوں کا وعدہ کیا گیا ہے: سلامتی' رحمت اور بخشش۔ اور اس کا صاف اور غیر مبہم مطلب یہی ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا درِ دولت رحمت اور نوازشاتِ الٰہی کا سرچشمہ ہے اگرچہ حاضر ہونے والا التجا و دعا کا کوئی لفظ بھی نہ کہے' تو بھی اُسے خالی لوٹایا نہ جائے گا۔

اس کے علاوہ اس میں ایک اور توجہ طلب نکتہ یہ بھی ہے کہ نیکی اور خیر کے تمام کاموں میں سے بہترین کام بارگاہِ نبوی میں حاضر ہونا ہے۔ کیونکہ کسی بھی نیکی پر ایسا وعدہ نہیں کیا گیا جیسا کہ اِن الفاظ میں کیا گیا ہے: ''تمہارے پروردگار نے اپنے اوپر رحمت لازم کر رکھی ہے'' اگرچہ اُس پر کوئی چیز لازم نہیں ہے۔ لہٰذا اُس کی یہ خاص مہربانی اور رحمت وشفقت اُن لوگوں کے لئے مخصوص ہے جو بارگاہِ نبوی میں کمال ادب واحترام اور تواضع وانکساری کے ساتھ حاضر ہوتے ہیں۔

(61) وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰٓى اَجَلٌ مُّسَمًّى ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ O (الانعام : ۶۰)

''وہ وہی تو ہے جو رات میں تمہیں وفات دے دیتا ہے اور جو کچھ تم دن میں کرتے رہتے ہو' وہ اُسے جانتا ہے' پھر تمہیں اُس سے جگا دیتا ہے کہ میعادِ معیّن تمام کر دی جائے' پھر اُسی کی طرف تمہاری واپسی ہے' پھر جو کچھ تم کرتے رہتے تھے' وہ تمہیں بتا دے گا۔'' (۶ : ۶۰)

اِس آیت سے یہ نکات اخذ ہوئے: (۱) رات نیند اور آرام کے لئے جبکہ دن تلاشِ معاش کے لئے ہے۔ لہٰذا رات گئے تک جاگنا غیر قدرتی فعل ہے اور انسانی صحت پر برا اثر ڈالتا ہے۔ (۲) جب ہمیں بخوبی معلوم ہے کہ وہ ہمہ بین ذات ہمارے ہر عمل اور ہر فعل سے واقف ہے تو ہمیں اُس کی نافرمانی کی جرأت نہیں کرنی چاہئے۔ (۳) کسی کو اُس کے بُرے خیالات کی سزا اُس وقت تک نہیں دے جائے گی جب تک کہ اُن خیالات پر عمل نہ ہو جیسا کہ قرآنی لفظ مَا جَرَحْتُمْ سے ظاہر ہے یعنی وہ کام جو بیہوشی میں اور غیر ارادی طور پر کئے جائیں۔ اگر یہاں

ارادی کام مراد ہوتے تو مَاجَرَحتُم کی بجائے مَاعَمِلتُم کا لفظ آتا۔

(62) کچھ انبیاء علیہم السلام کے قرآنی بیان میں ایک خوبصورت غیر زمانی ترتیب ہے: مثلاً

وَ وَهَبْنَا لَهٗ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ كُلًّا هَدَيْنَا وَ نُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وهٰرُوْنَ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ O وَ زَكَرِيَّا وَ يَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ O وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا وَ كُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ O (الانعام: ۸۴ـ۸۶)

''اور ہم نے ابراہیم کو اسحٰق اور یعقوب عطا کئے' ہر ایک کو ہم نے ہدایت عطا کی اور نوح کو ہم زمانہِ قبل میں ہدایت دے چکے تھے اور اُن کی نسل میں سے داؤد' سلیمان' ایوب' یوسف اور موسیٰ اور ہارون کو۔ اور ہم نیکو کاروں کو اسی طرح جزا دیا کرتے ہیں۔ اور ہم نے ہدایت دی زکریا' عیسٰی اور الیاس کو (یہ) سب صالحین میں سے تھے۔ اور ہم نے ہدایت دی اسمٰعیل' یسع' یونس اور لوط کو اور اُن میں سے ہر ایک کو ہم نے جہان والوں پر فضیلت دی تھی۔'' (۸۴ـ۸۶:۶)

مندرجہ بالا بیان میں ایک خوبصورت غیر زمانی ترتیب ہے: (۱) پہلی قسم میں اُن انبیاء علیہم السلام کا تذکرہ ہے جن سے انبیاء علیہم السلام کا سلسلہِ نسب چلا۔ لہٰذا حضرات ابراہیم' اسحٰق' یعقوب اور نوح علیہم السلام انبیاء علیہم السلام کے آبائی اصل ہیں۔ (۲) دوسری قسم میں اُن انبیاء کا ذکر ہے جن پر منصبِ نبوّت کے علاوہ عظیم الشان نوازشات نچھاور کی گئیں چنانچہ داؤد اور سلیمان علیہما السلام کو معجزاتی بادشاہت عطا کی گئی' ایوب علیہ السلام کو قابلِ رشک صبر کی دولت دی گئی' یوسف علیہ السلام کو حکمرانی دی گئی جبکہ موسیٰ اور ہارون علیہما السلام انقلابی پیغمبر تھے جن کے ذریعے فرعون جیسے جابروں کا غرور توڑ دیا گیا۔ (۳) زکریا' یحییٰ' عیسٰی اور الیاس علیہم السلام کو تیسری قسم میں بیان کیا گیا ہے جنہیں زُہد' نفس کشی اور خود کفالتی کے عطیات سے نوازا گیا۔ (۴) آخری اور چوتھی قسم میں اُن انبیاء (اسمٰعیل' یسع' یونس اور لوط) علیہم السلام کا بیان ہے جن کے پیروکار اُن کے بعد نہیں رہے اور اُن کی شریعت منسوخ ہو گئی ہے۔ (تفسیر کبیر)

(63) نبی اکرم ﷺ تمام انبیاء علیہم السلام کے خصائل وشیم کا مجموعہ ہیں:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا (الانعام: ۹۰)

''یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت دی تھی' سو آپ بھی اُن کے طریقہ پر چلئے' آپ کہہ دیجئے کہ میں تم سے اس پر کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔'' (۹۰ : ۶)

آیت بالا کا خط کشیدہ حصہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ (۱) نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ مقدسہ تمام انبیاء علیہم السلام کے خصائص وخصائلِ حمیدہ کا مجموعہ ہے۔ (۲) کسی بھی نبی نے منصبِ رسالت کو بطور پیشہ کے نہیں اپنایا بلکہ تمام نے انسان کی بے لوث اور بے غرض خدمت کی۔ (۳) یہی بے غرضی اور بے لوث خدمت خاتم الانبیاء ﷺ

کے کردار میں نظر آتی ہے کہ آپ نے کبھی بھی کسی سے کچھ نہیں لیا بلکہ آپ تو اپنے خالق و رحمت کی رحمتیں اور عنایات اُس کی مخلوق میں بانٹنے کے لئے تشریف لائے ہیں۔

(64) اللہ کے رسول کو جھٹلانا غضبِ الٰہی کو للکارنا ہے: سورۃ الاعراف میں فرمایا:

وَمَا اَرۡسَلۡنَا فِیۡ قَرۡیَۃٍ مِّنۡ نَّبِیٍّ اِلَّاۤ اَخَذۡنَاۤ اَهۡلَهَا بِالۡبَاۡسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمۡ یَضَّرَّعُوۡنَ O ثُمَّ بَدَّلۡنَا مَکَانَ السَّیِّئَۃِ الۡحَسَنَۃَ حَتّٰی عَفَوۡا وَّقَالُوۡا قَدۡ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ فَاَخَذۡنٰهُمۡ بَغۡتَۃً وَّهُمۡ لَا یَشۡعُرُوۡنَ O (الاعراف : ۹۴، ۹۵)

''اور ہم نے جس کسی بستی میں بھی کوئی نبی بھیجا، اُس کے باشندوں کو ہم نے تنگدستی اور بیماری میں مبتلا کیا تاکہ وہ ڈھیلے پڑ جائیں۔ اُس کے بعد ہم نے بدحالی کو بدل کے خوشحالی پھیلا دی چنانچہ اُنہیں خوب ترقی ہوئی اور وہ کہنے لگے کہ تنگی اور راحت تو ہمارے باپ دادوں کو بھی پیش آتی رہی تھی تو ہم نے اُنہیں یکایک پکڑ لیا اور وہ (اس کا) گمان بھی نہ رکھتے تھے۔''

سبق آموز نکات : (۱) اللہ کے رسول کو جھٹلانے کا انجام غضبِ الٰہی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ (بحوالہ سورۃ النّحل: ۱۱۳؛ بنی اسرائیل: ۱۵؛ المؤمنون: ۴۷، ۴۸) (۲) جہاں رسولِ خدا کو جھٹلانا غضبِ الٰہی کا موجب ہے، وہاں اُسے بطور پیغمبر تسلیم کرنا رحمت وعنایتِ الٰہی کا موجب ہے۔ (۳) وہ مصیبت اور تکلیف جو انسان کو صراطِ مستقیم پر لگا دے، اللہ کی رحمت ہے۔ یہ ایک کڑوی گولی ہے جو تمام بیماریوں اور اَمراض کے تریاق کے طور پر کام کرتی ہے۔ (۴) وہ راحت و آرام جو انسان کو اپنے خالق و مالک سے غافل کر دے، سزائے الٰہی کی بدترین شکل ہے۔ (۵) متکبر اور نافرمان لوگ خوشحالی اور مصیبت دونوں کو اتفاقی معاملہ سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''ہاں ہاں، ایسی چیزیں ہر زمانہ میں وقوع پذیر ہوتی رہی ہیں۔ ہم سے پہلے ہمارے آباء و اجداد کو بھی اس قسم کا تجربہ ہوا تھا اور ہمارے بعد ہماری اولاد کو بھی ایسے تجربات ہوتے رہیں گے۔ دنیا کا پہیہ ہر زمانہ میں یوں ہی گھومتا رہا ہے۔'' ایک سچا مسلمان مصیبت اور مرفہ الحالی کے فلسفہ کو ہمیشہ اپنے پیشِ نظر رکھتا ہے اور اُن دونوں کو اپنے خالق کی جانب سے دی گئی آزمائش سمجھتا ہے۔ (۶) گنہگار اور نافرمان زندگی کے باوجود رب کی نعمتوں کا ملنا فی الحقیقت غضبِ الٰہی ہے۔ اسی طرح پارسائی اور فرمانبرداری کی زندگی گزارنے کے باوجود مصیبتوں اور تکلیفوں سے دوچار ہونا رحمتِ الٰہی ہے بشرطیکہ آدمی صابر اور مستقل مزاج ہو۔ میدانِ کرب و بلا میں امام حسین رضی اللہ عنہ پر ناگفتہ بہ مصائب کا ڈھایا جانا گویا کہ اُن پر اللہ کی رحمتیں تھیں جبکہ یزید کی راحت و آرام خالق کا غضب تھا۔ (۷) یہ آیات شکستہ حال، بیچاری اُمّتِ مسلمہ کی آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہیں جس نے تلافیٔ مافات کرنے کی بجائے اپنے خالق کی نافرمانی میں گم اور مگن ہیں اور وہ ہر مصیبت اور اُفتاد کو اتفاقی اور آئے دن کا معمول بنا کر اصلاح کا ہر دروازہ بند کئے ہوئے ہیں۔

(65) ہر بچہ اپنے باپ کی طرف منسوب ہوتا ہے نہ کہ ماں کی طرف:

هُوَ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَۃٍ (الاعراف : ۱۸۹)

''وہ وہی پروردگار ہے جس نے تمہیں ایک جانِ واحد سے پیدا کیا۔''

"نفسِ واحدہ" سے مراد والد ہے جو کنبے کی اصل ہوتا ہے۔ اس لئے ہر آنے والا بچہ اپنے باپ کی طرف منسوب ہوتا ہے نہ کہ ماں کی طرف۔ اگر باپ سیّد اور ماں غیر سیّد ہو تو بچہ سیّد ہی ہوگا۔

(66) اسلام مادّی و اقتصادی ترقی اور جدید جنگی ٹیکنالوجی کی راہ میں رکاوٹ نہیں

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَ آخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ O (الانفال : ۶۰)

''اور اُن سے مقابلہ کے لئے جس قدر بھی تم سے ہو سکے قوت سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے سامان تیار رکھو جس کے ذریعہ سے تم اللہ کے دشمنوں پر اور اپنے دشمنوں پر اور اُن کے علاوہ دوسروں پر بھی اپنا رُعب رکھتے ہو کہ تم اُنہیں نہیں جانتے' اللہ اُنہیں جانتا ہے اور جو کچھ بھی تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے' وہ تمہیں پورا پورا دے دیا جائے گا اور تمہارے لئے (ذرا بھی) کمی نہ ہوگی۔'' (۸ : ۶۰)

(67) __ہر رونے والی آنکھ کے آنسو حقیقی نہیں ہوتے__: جیسا کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے متعلق سورہ یوسف میں آیا:

وَجَآءُوْا اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ O قَالُوْا يٰاَبَانَا اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ وَمَا اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ O وَجَآءُوْا عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ (یوسف : ۱۶۔۱۸)

''اور (برادرانِ یوسف) اپنے باپ کے پاس شروع رات میں روتے ہوئے آئے۔ وہ بولے: اے ہمارے باپ! ہم سب تو دوڑنے میں لگ گئے اور ہم نے یوسف کو اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا تو بھیڑیا اُنہیں کھا گیا اور آپ تو ہمارا یقین نہ کریں گے گو ہم (کیسے ہی) سچے ہوں۔ اور اُن کے کرتے پر وہ جھوٹ موٹ کا خون بھی لگا لائے۔'' (۱۲:۱۸۔۱۶)

یوسف علیہ السلام کے کرتے پر جنابِ یوسف کے خون کا دھبہ نہیں بلکہ بکری کے خون کا جھوٹا دھبہ تھا جسے برادرانِ یوسف نے اس مقصد کے لئے ذبح کیا تھا۔ لہٰذا نام نہاد ''یوسف کے ضیاع'' پر اُن کا آنسو بہانا مگر مچھ کے آنسو بہانے کے سوا کچھ نہ تھا۔ اِسی وجہ سے یہ کہنا درست ہے کہ ضروری نہیں کہ ہر رونے والا اپنی اشک ریزی اور واویلا کرنے میں سچا ہو۔

حضرت اعمش رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ برادرانِ یوسف کا اپنے بھائی یوسف پر غیر حقیقی طور پر رونے کے بعد کسی بھی رونے والے کو اُس کے رونے میں سچا نہیں کہا جا سکتا۔ ابنِ منذر نے شعبی سے روایت کیا کہ ایک عورت مدّعیہ کے طور پر قاضی شُریح کے پاس روتی ہوئی آئی۔ موقع پر موجود لوگوں نے قاضی کی توجہ اُس کے رونے کی طرف دلائی تا کہ اُس کی کچھ ڈھارس بندھے۔ قاضی نے کہا: برادرانِ یوسف بھی اپنے والد کے پاس

شروع رات میں روتے ہوئے آئے تھے اگرچہ وہ جھوٹے اور تجاوز عن الحد کرنے والے تھے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فیصلہ اصل معاملہ کی تحقیق کئے بغیر ظاہری حالات کو دیکھ کر نہیں کرنا چاہئے۔ (تفسیر کبیر، تفسیر روح المعانی)

(68) دورانِ سفر زادِ راہ ساتھ رکھنا توکل علی اللہ کے خلاف نہیں: اصحابِ کہف نے ایک لمبی اونگھ (نیند) کے بعد فرمایا:

فَابْعَثُوْا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖۤ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَاۤ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا۝ (الکہف : ۱۹)

''تو اپنے میں سے کسی کو یہ رقم دے کر شہر کی طرف بھیجو، سو وہ تحقیق کرے کہ کون سا کھانا پاکیزہ ہے پھر اُس میں سے کچھ کھانا تمہارے پاس لے آئے اور وہ خوش تدبیری سے کام کرے اور کسی کو تمہاری خبر نہ ہونے دے۔'' (۱۹ : ۱۸)

چند مفید نکات: (۱) جس طرح اصحابِ کہف نے کسی سے سوال کرنے کی بجائے کھانا قیمتاً خریدنا پسند کیا، طالبوں اور سالکوں کو بھی چاہئے کہ ہمت بلند رکھیں اور خلق سے سوال ترک کر دیں۔ (۲) بعض نے اَزْکٰی طَعَامًا کی تفسیر لذیذ ونفیس کھانے سے بھی کی ہے (تفسیر کبیر) اور یہیں سے ہے کہ بعض صوفیاء نے بعض دینی مصلحتوں سے لذیذ ونفیس کھانوں ہی کو پسند کیا ہے۔ (۳) جیسا کہ عبارۃ النص سے معلوم ہوا کہ سفر کے دوران زادِ راہ ساتھ رکھنا توکل علی اللہ کے خلاف نہیں ہے۔ انگریزی میں بھی ایک مشہور ضرب المثل ہے: Tie your camel and trust in God. یعنی اپنے اونٹ کو باندھ رکھو اور اللہ پر بھروسہ کرو۔ (۴) فقہاء نے آیتِ مذکورہ سے اس صورت کا جواز نکالا ہے کہ کئی انسان (مثلاً سفر میں) اپنے مشترکہ سرمایہ سے طعام خریدیں اور سب اُس میں سے کھائیں خواہ ایک کے کھانے کی مقدار دوسرے سے زیادہ ہو۔ آیت کا آخری (خط کشیدہ) حصّہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھنے کے باوجود صالحین کو اپنے سروں پر منڈلاتے ہوئے خطرات سے چوکنا رہنا چاہئے۔

(69) اولیائے کرام کے روضوں کے قریب مساجد کی تعمیر: سورۃ الکہف میں بیان ہوا:

اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰۤى اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا۝ (الکہف: ۲۱)

"(اور وہ وقت بھی قابلِ ذکر ہے) جب لوگ اُن کے معاملہ میں باہم جھگڑ رہے تھے سو اُنہوں نے کہا کہ اُن کے پاس کوئی عمارت بنوا دو۔ اُن کا رب ہی اُن کے (احوال کو) خوب جانتا تھا جو لوگ اپنے کام پر قادر تھے، اُنہوں نے کہا کہ ہم تو اُن کے پاس ایک عبادت گاہ بنائیں گے۔"

جب اصحابِ کہف تین سو نو برس کے بعد نیند سے بیدار ہوئے اور بعد میں طبعی طور پر وفات پا گئے تو لوگوں میں اختلافِ رائے ہوا۔ اُن میں سے کچھ کی رائے یہ تھی کہ غار کا داخلہ اُس کے گرد دیوار کھڑی کر کے بند کر دیا جائے اور اُن میں سے بااثر و بارسوخ لوگوں نے کہا کہ اس کے نزدیک ایک مسجد تعمیر کر دی جائے تاکہ موحدین و

مسلمین وہاں عبادت کرسکیں اور وہاں کے قرب سے تبرک حاصل کرسکیں۔ اس طرح اصحابِ کہف کی یاد بھی تازہ ہوتی رہے گی۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے تفسیر مظہری میں آیت کی تفسیر ان الفاظ میں کی ہے:

هٰذِهِ الْاٰيَةُ تَدُلُّ عَلٰى جَوَازِ بِنَاءِ الْمَسْجِدِ لِيُصَلّٰى فِيْهِ عِنْدَ مَقَابِرِ اَوْلِيَاءِ اللّٰهِ قَصْدًا لِلتَّبَرُّكِ بِهِمْ

''یہ قرآنی آیت اولیاء اللہ کے مقبروں کے نزدیک مسجد بنانے کے جائز ہونے پر دلیل ہے تاکہ اُن سے تبرک اور فیض حاصل کیا جائے۔'' (تفسیر مظہری ۲۳ :۶)

آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا قرآنی بیان کے مطابق اولیائے کرام کے مقابر کے نزدیک مساجد اور اللہ کی عبادت کے لئے معبد بنانا مدّت ہا مدید سے مسلمانوں کا عمل رہا ہے۔ اس عمل کو رضائے الٰہی کی طرف منسوب کرنا ایک نا قابلِ انکار حقیقت ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صالحین اور اولیائے کرام کی ہمسائیگی مسلمانوں کی روحانی آسودگی اور بالیدگی کا منبع ہے اور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک مرتبہ فرمایا:

''مؤمن کی قبر جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے اور کافر کی قبر جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔''

''اولیائے کرام کے مزارات جہاں دن رات قرآنِ مجید کی تلاوت ہوتی رہتی ہے' جہاں ذکرِ الٰہی کی یاد میں روح پرور آوازیں بلند ہوتی ہیں۔ جب ایک بندۂ خدا نماز میں مست اور دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی حاجت کو ربّ ذوالجلال والاکرام کے حضور اُس کے کسی ولی کے توسّل سے پیش کرتا ہے تو رب تعالیٰ اپنی رحمت کے ساتھ اُس کی دعا و فریاد کو قبول کرتا ہے۔'' (پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری' صفحات ۳۳۹ تا ۳۴۲' ۳۴۶ تا ۳۴۹)

کچھ لوگ اس آیت کی غلط تعبیر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اُن لوگوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو عبادت گاہوں میں بدل لیا تھا اور اِن قبروں کی پرستش شروع کر دی تھی اور اِسی قسم کا معنیٰ اُس حدیث کا ہے جس میں حضرت مرشد غنوی رضی اللہ عنہ نے نبی علیہ السلام کی اُس حدیث کا حوالہ دیا ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ قبروں پر نہ بیٹھا کرو اور نہ ہی نماز کے وقت اُن کی طرف رخ کیا کرو۔ (صحیح مسلم: کتاب الجنائز)

''<u>قبور پر عمارات کی تعمیر</u>: ابن تیمیہ اور وہابیہ نے قبور پر عمارات تعمیر کرنے سے منع کیا ہے اور اس ممانعت کی بنیاد وہ احادیث ہیں جن میں نبی علیہ السلام نے مزارات کو پلستر کرنے' اُن پر بیٹھنے اور اُن پر کوئی عمارت کھڑی کرنے سے منع فرمایا ہے (صحیح مسلم: ۴۵۹)۔ لیکن ابن تیمیہ سے سات صدی قبل کے شیخ محمد ذکی کی دلیل اِن کے جواز سے متعلق مسلمانوں کا اجماع ہے۔ بت پرستی کے خاتمہ کی ضرورت کے لئے شروع کی ممانعت کو بعد میں خود نبی علیہ السلام نے بدل دیا۔ محمد ذکی کا کہنا ہے کہ مقبرہ ایک مضبوط چھت کا نام ہے۔ پیغمبر علیہ السلام اور اُن کے دو اوّل خلفاء سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ میں دفن ہوئے جس کی چھت تھی اور کسی نے اس پر اعتراض نہیں کیا۔''

(Encyclopedia of the Qur'an, Vol. 2, p. 554 ... Leden: USA.

(70) <u>اولیائے کرام کے مسکن مُردوں کے لئے سرچشمہ حیات ہیں</u>: خدائی حکم کے تحت موسیٰ

علیہ السلام اپنے ساتھی یوشع بن نون کے ہمراہ اُس بندہِ خدا کی تلاش میں نکلے جو اُنہیں ایسا علم سکھائے جس سے وہ اب تک نابلد تھے۔ آپ نے اپنے ساتھ ایک مچھلی لی۔ اُس جگہ کی نشان دہی جہاں آپ نے اپنے پُر اَسرار استاد سے ملاقات کرنا تھی' یوں ہوئی کہ وہاں پہنچنے پر مچھلی غائب ہوگئی۔ اس سلسلہ میں قرآن فرماتا ہے:

فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا O (الکہف: ٦١)

''پھر جب دونوں دو دریاؤں کے سنگم پر پہنچے تو اپنی مچھلی کو دونوں بھول گئے' تو سرنگ بناتی ہوئی اُس نے دریا میں اپنی راہ پکڑی۔'' (٦١ : ١٨)

روایات میں آتا ہے کہ وہ مچھلی تلی ہوئی تھی اور ایک محفوظ توشہ دان میں بند تھی۔ لیکن جب وہ اللہ کے ایک محبّ اور محبوب بندے (یعنی خضر علیہ السلام) کے مسکن کے قریب پہنچی تو اُسے زندگی مل گئی اور اُس نے دریائی پانی کی طرف راہ پکڑی۔ اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ اولیاء اللہ کے مسکن مُردوں کے لئے جسمانی اور روحانی دونوں طور پر سرچشمہِ حیات ہیں۔ جب وہ روحانی طور پر زندگی پاتے ہیں تو اُن کی روح اپنے اُس منبع و مصدر کی طرف آسان راہ پاتی ہوئی چلی جاتی ہے جہاں سے وہ آئی تھی (یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف) جیسا کہ اس مچھلی کے ساتھ ہوا۔

(71) ابراہیم علیہ السلام کا حج کے لئے خدائی اعلان: جس کے متعلق سورۃ الحج میں فرمایا گیا:

وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَى كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ

''اور (اے ابراہیم!) لوگوں میں حج کا اعلان کر دو' لوگ تمہارے پاس پیدل بھی آئیں گے اور دُبلی پتلی اونٹنیوں پر بھی جو دُور دراز راہوں سے پہنچی ہوں گی۔'' (٢٧ : ٢٢)

''تمہارے پاس آئیں گے'' کا مطلب یہ ہے کہ لوگ تمہارے اعلان پر جوق در جوق کعبہ کو بہ غرض حج کھچے چلے آئیں گے۔ جو آنے والے ہیں' ہر حال میں آئیں گے خواہ سواری نصیب نہ ہو' پیدل ہی آنا پڑے۔ سواری کے جانور ملیں مگر مشقتِ سفر سے وہ ہلکان ہو جائیں' یا مسافت بہت دُور دراز کی طے کرنا پڑے۔ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَى كُلِّ ضَامِرٍ کا مطلب یہ ہوا کہ سفرِ حج پیدل بھی اور سواری پر بھی دونوں طرح جائز ہے۔

''ابراہیم علیہ السلام کو اس اعلان کا حکم اُس وقت ملا تھا جب دنیا نہ تار سے واقف تھی' نہ ٹیلیفون سے' نہ مائیکروفون سے اور نہ لاؤڈ سپیکر سے۔ لیکن ابراہیم علیہ السلام نے خدا معلوم کس لاہوتی اسٹیشن سے اور کس ملکوتی میٹر پر اس پیام کو نشر کیا کہ روئے زمین کے ہر برِّ اعظم کے ایک ایک گوشہ میں' سمندر کے ایک ایک جزیرہ میں یہ آواز پہنچ گئی اور ہزاروں برس گزر چکے کہ خلقت آج تک اس بے آب و گیاہ سرزمین کی طرف کھنچی چلی آتی ہے۔ مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ جب آپ کو یہ حکم ملا تو عرض کیا کہ اے پروردگار! میری آواز کو سب کے کانوں تک کون پہنچائے گا؟ فرمایا کہ آواز دینا تمہارا کام ہے اور اُس کا ہر کہ و مہ تک پہنچا دینا ہمارا کام ہے۔ اِتنا مؤثر' بلیغ' سچا جواب مخلوق کی زبان سے نکل ہی نہیں سکتا تھا' خالق ہی کے لئے ممکن تھا۔'' (تفسیر ماجدی اردو' صفحہ ٦٨٢' نوٹ: ٣٨)

روایات میں آتا ہے کہ اہلِ یمن نے سب سے پہلے ابراہیم علیہ السلام کے اعلان پر ''لبیک'' کہا اور یہی وجہ ہے کہ اب بھی یمنیوں کو حج کرتے ہوئے اکثریت میں دیکھا گیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے بھی یمنیوں کو اُن کے مضبوط اور اعلیٰ درجہ کے ایمان پر اَلایمانُ یَمنِیّون کے الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ (تفسیر نعیمی، ج ۱۷، ص ۴۵۷)

(71) السلام علیکم کہنا ہی اسلامی شعار ہے نہ کہ اللہ حافظ یا ٹاٹا کہنا: سلام کی بجائے ''خدا حافظ'' یا ''اللہ حافظ'' کہنا نئی۔ وی کلچر ہے جبکہ ٹاٹا یا بائی بائی کہنا انگریزی طریقہ ہے۔ قرآنی حکم ملاحظہ ہو:

فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُیُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ تَحِیَّةً مِّنْ عِنْدِاللّٰہِ مُبٰرَکَةً طَیِّبَةً (اَلنّور: ۶۱)

''جب تم گھروں میں داخل ہونے لگو تو اپنے لوگوں کو سلام کرلیا کرو (جو) دعا کے طور پر اللہ کی طرف سے (مقرر) ہے بابرکت اور عمدہ چیز۔'' (۲۴ : ۶۱)

بابرکت اِس اعتبار سے کہ سلام پر ثواب ملتا ہے۔ عمدہ اِس اعتبار سے کہ مخاطبین کا دل اس سے خوش ہو جاتا ہے۔ سورۃ النّور کی اِسی آیت ۶۱ ہی میں اس سے پہلے معاشری و خانگی زندگی کے احکام بتائے گئے ہیں۔ یہاں ایک بار پھر اس کی تاکید کی جا رہی ہے کہ یہ جزئی احکام حد درجہ اہم اور واجب الاعتناء ہیں۔ اس حکم سے ہٹ کر اغیار کے طریقے کو اپنانے سے اللہ کی ناراضی کے سوا کچھ حاصل ہونے کا نہیں۔ رب تعالیٰ ہمارے حال پر کرم فرمائے!

(72) اللہ تعالیٰ کو جمع کے صیغے سے خطاب کرنا کفار کا طریقہ ہے: سورۃ المؤمنون میں فرمایا:

حَتّٰٓی اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِO لَعَلِّیْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا (آیات ۹۹، ۱۰۰)

''یہاں تک کہ جب اُن (کافروں) میں سے کسی کی موت آکھڑی ہوتی ہے (اُس وقت) وہ کہتا ہے کہ اے میرے پروردگار! مجھے پھر واپس بھیج دے تاکہ نیک کام کروں۔'' (۲۳:۱۰۰،۹۹)

کافر نے اپنی موت کے وقت اللہ تعالیٰ سے خطاب کرتے ہوئے جمع کا صیغہ اِرْجِعُوْن استعمال کیا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اُسے جمع کے صیغے سے خطاب کرنا کفار اور مشرکین کا طریقہ ہے نہ کہ مسلمانوں کا۔ اُس کے تمام انبیاء اور رسولوں نے ہمیشہ اُسے واحد کے صیغے ہی سے پکارا (بحوالہ پکار زکریا علیہ السلام: سورہ آلِ عمران کی آیات ۳۸، ۴۰، ۴۱ ؛ سورہ مریم کی آیات ۴، ۸، ۱۰۔ پکار سیّدہ مریم: سورہ آلِ عمران کی آیت ۴۷۔ ابراہیم علیہ السلام کی پکار: سورہ ابراہیم کی آیت ۴۰ ؛ سوۃ الشعراء کی آیت ۸۳۔ یوسف علیہ السلام کی پکار: سورہ یوسف کی آیت ۱۰۱۔ یونس علیہ السلام کی پکار: سورۃ الانبیاء کی آیت ۸۳۔ موسیٰ علیہ السلام کی التجا: سورہ طٰہٰ کی آیات ۲۵ تا ۲۷؛ ۲۹ تا ۳۵؛ سورۃ القصص کی آیات ۱۶، ۱۷۔ ہمارے نبی اکرم کی دعا و التجا: سورۃ المؤمنون کی آیات ۹۷، ۹۸، ۱۱۸)

یہ بات اور ہے کہ قادرِ مطلق اللہ نے قرآنِ حکیم کے کچھ مقامات پر اپنے لئے جمع کا صیغہ بھی استعمال کیا ہے لیکن پوری کائنات کا خالق و مالک اور احکم الحاکمین ہونے کے ناطے سے یہ استحقاق صرف اُسی کو حاصل ہے کہ

وہ اپنی لاشریک شہنشاہیت کو اُجاگر کرنے کے لئے جمع کا صیغہ استعمال کرتا ہے۔ اس دنیا کے چند روز کے بادشاہ تو اپنے لئے ''ما بدولت'' اور ''ہم'' جیسے فاخرانہ لفظ استعمال کریں تو اُس شہنشاہوں کے شہنشاہ کو تو 'بہ طریقِ اَولیٰ ایسا کہنا زیب دیتا ہے۔ بعض جگہ اللہ کے لئے واحد کا صیغہ بھی استعمال ہوا ہے لیکن اُس کا اپنے لئے جمع کے صیغے کے استعمال کی مثالیں قرآنِ مجید میں جگہ جگہ بکھری پڑی ہیں مثلاً سورۃ البقرۃ کی آیات ۳۵، ۳۶، ۴۹ تا ۵۳، ۵۶ تا ۶۰، ۶۳، ۶۶، ۷۳، ۸۳، ۸۴، ۸۷، ۹۳، ۹۹، ۱۰۶، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۱، ۱۲۵، ۱۳۰، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۶، ۱۵۱، ۱۵۹، ۱۷۲، ۲۵۲ تا ۲۵۴، ۲۶۷؛ سورۃ الانعام کی آیات ۱۱۰ تا ۱۱۲، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۹، ۱۵۲، ۱۵۴؛ سورہ طٰہٰ کی آیات ۵۵، ۵۶، ۶۸، ۷۷، ۸۱؛ سورۃ الفرقان کی آیات ۳۱ تا ۳۳، ۳۵ تا ۳۷، ۳۹، ۴۵، ۴۹، ۵۶؛ سورۃ القصص کی آیات ۳، ۵ تا ۷، ۱۲ تا ۱۴، ۳۵، ۳۹ تا ۴۶، ۵۱، ۵۲، ۵۴، ۵۷ تا ۵۹، ۶۱، ۷۵، ۷۶، ۸۱، ۸۳ وغیرہ۔

اپنی زندگی کے آخری لمحات میں انبیاء علیہم السلام کے علاوہ ہر شخص اپنے اُس نقصان پر متاسف ہوتا ہے جو وہ زندگی بھر کرتا رہا۔ کافر کو دنیا کے چھوڑنے کا، فاسق کو صالح زندگی سے گریز کرنے کا افسوس ہوتا ہے جبکہ ایک متقی اور خدا خوف انسان کو عبادت، نیکی اور خیرات کے زیادہ سے زیادہ کاموں کے نہ کرنے کا غم ہوتا ہے اور اُسے اس کہاوت کا خیال ستاتا ہے: ''جو دَم غافل، سو دَم کافر''۔ یہ تمام نکات آیت کے آخری الفاظ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا (یہ ایک ہی بات ہے جسے وہ کہے جا رہا ہے) سے ماخوذ ہیں۔

فضول اور بے مقصد گفتگو دونوں جہانوں میں ذلت و رسوائی کا سبب بنتی ہے۔ لہٰذا ہر مسلمان کو تمام بے فائدہ مشاغل، غیر معقول استدلال اور بسیار گوئی (باتونی ہونے Loquacity) سے گریز کرنا چاہئے۔

(73) صحرائے عرب کو مرغزار اور چمنستان میں بدلنے کا مطالبہ کفار کیوں پورا نہیں کیا گیا؟

کفارِ مکہ نے ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ سے یہ مطالبہ پیش کیا تھا:

وَقَالُوا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْبُوْعًاO اَوْتَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًاO ---- (بنی اسرائیل: ۹۱، ۹۲)

''اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم تم پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک تم ہمارے لئے زمین سے کوئی چشمہ جاری نہ کر دو گے' یا خود تمہارے لئے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ (پیدا ہو جائے)' پھر اُس کے بیچ بیچ میں جگہ جگہ نہریں جاری کر دو ۔۔۔۔۔'' (۹۰، ۹۱ : ۱۷)

کفارِ مکہ نے نبی اکرم ﷺ سے مندرجہ بالا بے جوڑ (ill-assorted) اور خام و بے ڈھنگے اور الٹ پلٹ قسم کے معجزات کا مطالبہ کیا جنہیں پورا نہیں کیا گیا۔ سوال یہ ہے کہ ان مطلوبہ معجزات کی تکمیل قادرِ مطلق کے لئے کوئی ناممکن بات نہ تھی جو اپنی شہنشاہیت میں یکتا ہے اور تمام کائنات اُس کے حکم کی مطیع ہے۔ اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ جدّ الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک مرتبہ اس سرزمین کو وَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ (سورہ ابراھیم: ۳۷)

یعنی بے آب و گیاہ اور بے زراعت میدان فرمایا تھا۔ اگر کفار کا مطالبہ پورا کر دیا جاتا تو وہ اللہ کے پیارے پیغمبر ابراہیم علیہ السلام کے بیان کے خلاف ہو جاتا۔ تمام حمد و ثنا اُس اللہ کے لئے ہے جو اپنے پیغمبروں اور اولیاء کی ہمیشہ لاج رکھتا ہے اور اُن کی عصمت و عزت پر کبھی آنچ نہیں دیتا!!

(74) وَإِذَآ أُلْقُوا۟ مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِينَ دَعَوْا۟ هُنَالِكَ ثُبُورًا O (الفرقان : ۱۳)

''اور جب وہ اُس میں کسی تنگ جگہ ہاتھ پاؤں جکڑ کر ڈال دیے جائیں گے تو وہ وہاں موت کو پکاریں گے۔'' (۲۵ : ۱۳)

اس آیت سے چند فقہی نکات کا استنباط ہوتا ہے: (۱) تمام فقہائے کرام کا اس فیصلے پر اتفاق ہے کہ آیت کی رُو سے کسی مجرم کو جرم کا ثبوت مل جانے کے بعد سزا دیتے وقت اُس کے ہاتھ باندھ دیے جائیں۔ (۲) مشکلات و مصائب سے تنگ آ کر موت کی دعا کرنا کافروں کا طریقہ ہے' مسلمانوں کا نہیں۔ لہٰذا زندگی کے نشیب و فراز یا بیماری کی مصیبتوں سے تنگ آ کر موت کی دعا یا خواہش کرنا بالکل حرام ہے جس کی قانونِ شریعت اجازت نہیں دیتا۔

(75) <u>اسلام کافروں کی اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ شادی کو تسلیم کرتا ہے</u> : اگرچہ شریعتِ اسلامی کی طرح اُن جوڑوں میں ایجاب و قبول نہیں ہوتا۔ اس ضمن میں دشمنِ اسلام ابولہب کی بیوی اُمّ جمیل بنتِ حرب (ہمشیر ابوسفیان) کی مثال کافی اور ٹھوس ثبوت ہے کیونکہ قرآنِ حکیم نے سورۃ الـلّھب کی آیت ۴ میں اُسے ابولہب کی بیوی (وَامْرَأَتُہ') کہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے مشن سے اُس کی مخالفت بھی حدِ غلو تک پہنچی ہوئی تھی۔ اِسی طرح سورۃ القصص کی آیت ۹ اور سورۃ التحریم کی آیت ۱۱ میں فرعون کی بیوی (سیّدہ آسیہ رضی اللہ عنہا) کا ذکر اس سلسلے کی ایک اور مثال ہے۔

<u>کیا اسلام کا قانونی نظام اس قدر بے لچک ہے کہ اُس میں کسی تغیر و تبدّل کی گنجائش نہیں؟</u> : کچھ مستشرقین کا استدلال یہ ہے کہ اسلام کا قانونی نظام خدائی کلمہ ہونے کے ناطے سے بالکل حتمی اور آخری ہے اور اس وجہ سے وہ حالاتِ جدیدہ کی موافقت میں انسان کی جانب سے کسی تغیر و تبدّل کو قبول نہیں کرتا جس طرح کہ اُس میں انسان کی طرف سے کسی قانون سازی کی گنجائش نہیں۔ ایسا کہنے میں اُن کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کا قانونی نظام فرسودہ' گھسا پٹا اور متروک (Out-dated) ہے اور اِسی وجہ سے اِس میں تبدیلی کا عمل وقت کی اہم ضرورت ہے۔

اس کے برعکس روایت پسند مسلمان کا اس بات پر زور ہے کہ چونکہ اسلام اِس مفہوم میں ایک مکمل ضابطہ حیات ہے کہ اُسے کسی تبدیلی یا اضافے (Supplementation) کی ضرورت نہیں۔ دراصل ایسے مسلمان ''مکمل دین'' کی اصطلاح کا مطلب غلط لیتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام میں مستقبل میں پیش آنے والے مسائل کا

کا حل ہمیشہ کے لئے فراہم کر دیا ہے۔ یہ غلط فہمی کہ خدائی قانون سازی اپنی مختلف شکلوں اور تفصیلات میں ہر چیز کو شامل ہے' اسلامی قانون کے موجودہ بے لچک ہونے کی ذمہ دار ہے۔

درجِ بالا دونوں نظریات غیر حقیقی ہیں۔ مستشرقین کا اصرار تعصب اور ہٹ دھرمی پر مبنی ہے جبکہ مسلمانوں کا نظریہ سطحی علم کا نتیجہ ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلامی قانون رضائے الٰہی پر مبنی ہے جو آخری وحتمی ہے اور اسی وجہ سے وہ نا قابلِ تغیر وتبدّل ہے۔ اس کے باوجود وہ بے لچک نہیں کیونکہ وہ عمل کا مذہب ہے اور صرف اعتقاد وعقیدے کا مذہب نہیں۔'' ("Theology and Law in Islam" ... Schacht, p. 10)

لہٰذا بے خوف وخطر کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کا قانونی نظام اُپنی اصل کے لحاظ سے الٰہی اور اپنی پہنچ کے لحاظ سے انسانی ہے یعنی وہ اخلاقی روح کے امتزاج کے ساتھ ایک مثبت نظامِ قانون ہے جسے انسان کی تلوّن مزاجی' اُس کے توہّمات اور تعصّبات سے محفوظ کیا جا سکے۔

اس تمام بحث کا نا قابلِ انکار نتیجہ یہی ہے کہ اسلامی قانون بے لچک اور لچکدار ہونے کا بے مثل امتزاج ہے جو اپنی جڑ کے لحاظ سے بے لچک اور اپنی شاخوں کے لحاظ سے لچکدار ہے۔ یہ اس مفہوم میں بے لچک ہے کہ مذہبی اصول کو توڑ کر اُس کی مامونیت (Impunity) کو برقرار نہیں رکھا جا سکتا اور اس مفہوم میں لچکدار ہے کہ وہ بدلتے ہوئے حالات اور آئے دن کے تقاضوں کو بہ احسن طریق قبول کرتا ہے۔ ایک ذی حیات نامی وجود ہونے کے لحاظ سے اس میں حرکت' نشوونما' یگانگت اور جمالیاتی نظم وتناسب کا فطری میکانزم (طریقِ عمل) ہے۔ وہ اعلیٰ وارفع' عملی اور قابلِ عمل مثالی نمونہ ہے۔ وہ حیران کن کامیابیوں اور عظیم افزائش کا ریکارڈ ہے اور اُس میں اب تک اپنی کارگزاریوں کو دہرانے کی صلاحیت ہے۔'' ("Islamic Legal Theory and the Orientalists"... Syed Abul Hasan Najmee, p. 140)

<u>تقلیبِ اُقدار (Commutation) کے عمومی اصول</u> : اسلام بے لچک مذہب نہیں ہے جس نے عمل پیرائی کو اللہ نے آسان بنا دیا ہے۔ حالات اور ضروریات کے مطابق قانون کے نا قابلِ عمل ہونے اور اُس کی شدت کو کم کرنے کے لئے کچھ مدّات موجود ہیں۔ فقہِ اسلامی کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ:

''جب شریعتِ اسلامی کی تکمیل پر عمل پیرائی سخت ہو تو ضرورت کی مجبوری کے تحت قانون کو نرم کر دیا جاتا ہے۔''

اِس عمومی اصول کا اشارہ قرآن مجید میں کئی مقامات پر کیا گیا ہے۔ مثلاً فرمایا:

(۱) يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (البقرة : ۱۸۵)

''اللہ تمہارے لئے سہولت چاہتا ہے اور تمہارے لئے دشواری نہیں چاہتا۔'' (۲ : ۱۸۵)

(۲) لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (البقرة : ۲۸۶)
''اللہ تعالیٰ کسی جان کو ذمہ دار نہیں بناتا مگر اُس کی بساط کے مطابق۔'' (۲ : ۲۸۶)

(۳) مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ (المائدة : ۶)
''اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر کوئی تنگی نہیں ڈالنا چاہتا۔'' (۵ : ۶)

(۴) هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (الحج : ۷۸)
''اُس نے تمہیں برگزیدہ کیا اور اُس نے تم پر دین کے بارہ میں کوئی تنگی نہیں کی۔'' (۲۲:۷۸)

اگر بغور دیکھا جائے تو شریعت کا ایک حکم بھی ایسا نہیں ملے گا جس میں عامل کے حالات' عمر' صحت' جثہ' موسم اور دوسری مشکلات کا لحاظ نہ کرلیا گیا ہو اور جو احکام بظاہر سخت معلوم ہوتے ہیں' اُن کی تہ میں بھی ہمیشہ یہی حقیقت پائی جائے گی کہ فرد یا اُمّت کی راہ میں کچھ آسانیاں ہی پیدا ہوں۔ اُمتِ اسلامی کے فخر و مسرت کے لئے یہ کافی ہے کہ جو احکام غیروں کو سخت معلوم ہوتے ہیں' اُن کی تکمیل میں وہ آج چودہ صدیاں گزر جانے کے بعد ساری مخالفانہ فضا و ماحول کے باوجود اس خوشدلی اور بے تکلفی کے ساتھ لگی ہوئی ہے کہ اغیار دیکھ کر حیرت میں رہ جاتے ہیں۔ سر ولیم میور جیسا متعصب اور دشمنِ اسلام مستشرق لکھتا ہے:

''روزہ کی سختیاں بدستور قائم ہیں' خواہ کسی موسم میں پڑیں اور آج تک مشرق کے میدانوں میں چلچلاتی دھوپ اور جھلساتی ہوئی سموم میں گرمیوں کے لمبے لمبے دنوں میں محمد کے پیرو صبح سے شام تک پانی کا ایک قطرہ تک حلق کے نیچے نہیں اتارتے۔ اس میں اتنی سخت ریاضت' قوّتِ ایمانی اور ضبطِ نفس کا پورا امتحان ہے۔'' ("Life of Muhammad"... p. 192)

تو احکامِ شریعت کو سخت سمجھ لینا ایسا ہی ہے جیسے کوئی بچہ اپنے شفیق اور تجربہ کار باپ کی ہدایتوں کو یا کوئی مریض اپنے دل سوز اور حاذق طبیب کے احکام کو ظلم و جبر سے تعبیر کرنے لگے بلکہ اِن دونوں مثالوں سے بھی بڑھ کر احمقانہ۔

کچھ حالات کے تحت قانون کی سختی کو نرمی میں بدلنے کے لئے چند قواعد و ضوابط ہیں جو درج ذیل ہیں:

(۱) سختی اور تنگی کے فی الواقع ضرر رساں ہونے کا یقین کر لینا ضروری ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ تنگی کی ہر صورت میں شریعت کے قانون کو نرم نہیں کیا جا سکتا ورنہ تو قانون ایک دکھاوا ہو کے رہ جائے گا اور اپنی معقولیت اور جواز کھو بیٹھے گا۔ شرعی قانون نے بیماری کی شدت' کسی جابر کے ظلم و ستم' خانہ جنگی وغیرہ میں تقلیبِ اقدار کیا ہے۔

(۲) ہر صورت میں اجازت اور تقلیب کو تنگی اور ضرورت کے مطابق دیکھا جائے گا۔ مثال کے طور پر کسی ایسے مریض کو جو نماز بیٹھ کر پڑھ سکتا ہے' لیٹ کر پڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔ اسی طرح ایک معالج کو اپنے مریض کے ننگے ممنوعہ اعضاء کو حتمی اور جائز ضرورت سے بڑھ کر دیکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ بہ الفاظِ دیگر تقلیب اور رعایت' تنگی اور مجبوری کے تناسب کے موافق ہونی چاہئے۔

(۳) کسی مشکل کو دُور کرنے کے لئے صرف اُن طریقوں کو اپنانا چاہئے جن کی ضرر رسانی نسبتاً کم تر ہو۔ کسی برائی سے کنارہ کشی کرنے کی کوشش میں کسی بڑی بُرائی یا اُس جیسی مقدار کی برائی میں ملوث ہونا جائز نہیں ہے۔ جب آدمی دو برائیوں کے مابین پھنس جائے اور بچ نکلنے کا کوئی اختیار اُسے حاصل نہ ہو تو بڑی برائی سے بچنے کے لئے اُسے اُس سے کم تر برائی کو اختیار کر لینا چاہئے۔ مثال کے طور پر کوئی جابر و ظالم کسی کو اسلام کے خلاف کلمہ کفر بکنے اور گستاخی کرنے پر مجبور کرے اور اُسے یقین ہو کہ اُس کا حکم نہ ماننے سے اُسے اپنی زندگی سے ہاتھ دھونے پڑیں گے تو اُسے اپنی زندگی کو بچانے کے لئے اُس ظالم و جابر کی بات مان لینی چاہئے بشرطیکہ اُس کا دل ایمان کی دولت سے معمور ہو (بحوالہ سورۃ النّحل' آیت ۱۰۶)۔

(۴) شدت اور تنگی کے دُور ہو جانے کے بعد تقلیب کی رعایت ختم ہو جائے گی اور عام حالات میں جس قانون کا اطلاق ہوتا ہے' اُس پر عمل پیرائی ہو گی۔ مثلاً شریعت کی نظر میں جب کوئی حقیقی بیمار رُو بہ صحت ہو جائے تو تیمم کی رعایت برقرار نہیں رہے گی۔ اسی طرح اگر کوئی شخص حج کے اخراجات برداشت کرنے کے لئے مفلس سے دولتمند ہو جائے اور اُس بیماری سے بھی صحتمند ہو جائے جو اُسے حج پر جانے میں ضرر رساں ہو' تو وہ حج کرنے کا پابند ہو گا جیسا کہ سورہ آل عمران کی آیت ۹۷ میں حکم ہوا۔

فقہائے اسلام نے حج کی فرضیت کو دو شرطوں کے ساتھ مشروط کیا ہے: زادِ راہ کافی ہو اور صحتمند ہو۔ اگر ان دو شرطوں میں سے کوئی ایک شرط نہ پائی جائے تو حج کرنے کی اجازت نہیں ہے اور جب بھی اِن دو شرطوں کا وجود پایا جائے تو حج کی عدم ادائیگی کی آسانی اور رعایت ختم ہو جائے گی اور حج کی ادائیگی فرض ہو جائے گی۔

(۵) برائیوں کا دور کرنا بہتر مقاصد کے حصول پر فوقیت رکھتا ہے۔ شریعت کی نگاہ میں خیر و فلاح کے کام کرنے اور اپنے فرائض و واجبات کو ادا کرنے سے زیادہ اہم بُرائی کو روکنا اور ناجائز کاموں سے رکنا ہے۔ اِسی وجہ سے شریعتِ اسلامی ممنوعات میں رعایتیں دینے کی نسبت فرائض کی شدت کو نرم کرنے میں زیادہ کشادہ دل ہے۔ فرض نمازوں یا رمضان کے (فرض) روزوں اور دوسرے فرائض میں مسافر اور مریض کو شریعت نے رعایتیں دی ہیں لیکن غیر خالص اور ناجائز چیزوں میں شریعت نے کوئی نرمی اور رعایت نہیں دی۔ (تلخیص: ''اکنامک سسٹم آف اسلام'' ـ ـ سیّد ابوالاعلیٰ مودودی' صفحات ۳۰۶' ۳۰۷)

<u>قوانین کی مزید توضیح و تشریح</u>: مغربی نظامِ قانون کے برعکس قوانینِ اسلام کا منبع و مصدر وحیِ الٰہی ہے۔

اب ہمارے سامنے سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چودہ صدیاں قبل ہمیں شریعت اور اُس کا قانون قرآنِ حکیم اور سنتِ رسول کی شکل میں عطا فرما دیا۔ اتنا طول طویل عرصہ گزرنے پر معاشرتی و سماجی، ثقافتی و تہذیبی، سیاسی و اقتصادی حالات یکسر بدل چکے ہیں اور نت نئے مسائل سامنے آ رہے ہیں تو چودہ صدیاں قدیم ضابطہ حیات کا اطلاق آج کے اِس دَور پر کیسے ہوسکتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ وحیِ الٰہی کی شکل میں قوانین کی وضاحت اللہ تعالیٰ نے اُن بنیادی اصولوں کے پیشِ نظر کی ہے جن کا تعلق انسانی روابط، باہمی معاہدوں اور اہم کاروباری معاملات سے ہے۔ چنانچہ فرمایا:

(۱) فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ
''اگر کسی چیز کے بارے میں تم میں باہم اختلاف ہو جائے تو اُسے اللہ اور اُس کے رسول کی طرف لوٹا لیا کرو اگر تم اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔'' (۴ : ۵۹)

''اللہ کے احکام یعنی کتاب اللہ کی طرف رجوع کرنا تو ظاہر ہے کہ ہر وقت ممکن ہے۔ لیکن اِلَی الرَّسُوْلِ کی تعمیل کی کوئی صورت رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد سوائے اس کے ممکن نہیں کہ دفترِ احادیث وسنن کی طرف رجوع کیا جائے۔ اس طرح حدیث وسنت کی حجیت قرآن مجید سے ثابت ہے۔ اِنْ تَنَازَعْتُمْ ضمیر جمع مخاطب ہے جس سے مراد اولوالامر اور عام افرادِ امت ہیں۔ اس تصریح نے یہ حقیقت اور کھول دی کہ حکام وعلماء سے عوام کا اختلاف بالکل جائز ہے۔ آخری اپیل کتاب وسنت ہی کی عدالت میں ہونی چاہئے اور وہی ساری شریعت کا ماخذ ہے۔'' (تفسیر ماجدی اردو، صفحہ ۱۹۸، نوٹ: ۵۹۸)

(۲) اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ (المائدۃ : ۳)
''آج میں نے تمہارے لئے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی۔'' (۵ : ۳)

ظاہر ہے کہ اِس اکمالِ دین اور اتمامِ نعمت ☆ کے بعد اب دین میں کسی قسم کی ترمیم، اضافہ یا تصرّف کی گنجائش نہ رہی اور نہ ہی کسی نبی کی بعثت کی ضرورت، کیونکہ ختمِ نبوّت ہو چکی۔ البتہ ہر دَور میں نئے نئے مسائل کا انکشاف اہل

☆ اِکمال کا معنیٰ اس طرح پورا کرنا کہ اب اُس میں نہ زیادتی ہو سکے اور نہ کمی۔ اکمال کے ساتھ دین کا ذکر ہوا اور اکمالِ دین سے مراد یہی ہے کہ اسلام کے اصول وقوانین میں زیادتی یا کمی ناممکن ہے۔ نمازیں نہ چھ ہو سکیں گی اور نہ چار۔ روزے نہ ڈیڑھ ماہ کے فرض ہوں گے نہ پون مہینہ کے۔
اِتمام کا معنیٰ کسی چیز کو اس طرح پورا کرنا کہ اس میں زیادتی تو ہو سکے لیکن کمی نہ ہو سکے۔ اِتمام کے ساتھ نعمت کا ذکر ہوا اور اتمامِ نعمت سے مراد دین کے فروعی مسائل ہیں جن کی کوئی حد نہیں۔ وہ ہمیشہ بڑھتے رہیں گے، نئی نئی ضرورتیں پیش آتی رہیں گی اور مسائل کا استنباط ہوتا رہے گا۔ ریڈیو، لاؤڈ سپیکر سے آیت سجدہ سنی جائے تو سننے والے پر سجدۂ تلاوت واجب ہے کہ نہیں؟۔ یہ وہ مسئلہ ہے جو اِن سائنسی آلات کی ایجاد سے پہلے پیش نہیں آیا تھا مگر شرعی قاعدے ایسے مقرر ہیں کہ یہ احکام اُن سے نکل سکتے ہیں۔ اسی طرح ہوائی سفر میں، چلتی ریل گاڑی میں نماز کا حکم شرعی قواعد سے نکالا جاتا ہے۔

علم و اجتہاد اپنی بصیرت سے کتاب و سنت کے اصول و قواعد کے مطابق قیامت تک کرتے رہیں گے۔

(۳) وَنَزَّلۡنَا عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ تِبۡيَانًا لِّكُلِّ شَىۡءٍ (اَلنَّحل : ۸۹)
''اور ہم نے آپ پر کتاب اتاری ہے جو ہر بات کو کھول دینے والی ہے۔'' (۱۶ : ۸۹)

کُلِّ شَیۡءٍ سے مراد وہ تمام چیزیں ہیں جن کا تعلق اعتقاد و عمل سے ہے یعنی دین و شریعت کے سارے اجزاء اجمالاً یا تفصیلاً اُس کے اندر آ گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے جن دقائقِ احکام کی تشریح کی ہے' وہ سب کتاب اللہ ہی سے ماخوذ ہیں اور اسی لئے نبی کا حکم بھی اللہ ہی کا حکم سمجھا گیا ہے۔

یہ آیات اس حقیقت کے ثبوت کے لئے کافی ہیں کہ وحیِ الٰہی راہ نما اصولوں کا کامل اور مکمل جوڑ (Set) ہے اور تمام تنازعات و مسائل سے نمٹنے کے لئے کافی ہے۔ تاہم اگر نئے قوانین وضع کرنے کی گنجائش نہ ہو تو پہلے سے موجود قوانین کی جدّت و اختراع' وسعت اور اُن کی مزید توضیح و تشریح کی ممانعت نہیں ہے۔ اس عمل کے ذریعے جس کی اللہ اور اُس کے رسول ﷺ نے بہت حوصلہ افزائی کی ہے' قرآنِ حکیم اور احادیثِ نبویہ میں مذکور احکام کی مدد سے نت پیش آنے والے مسائل کے استنباط کا نام اجتہاد ہے۔ یہ اجتہاد ہی کا طریقہ ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے مسلمان فقہاء کو اس قابل بنایا ہے کہ وہ نئے پیدا ہونے والے مسائل کا حل فراہم کریں اور اس طرح اسلام کو ہمہ وقتی اور ہمہ آفاقی نظامِ حیات ثابت کریں۔

جب صرف ایک اکیلا فقیہ اجتہاد کرتا ہے تو اُسے ''قیاس'' کہا جاتا ہے اور جب فقہاء کی جماعت اجتہاد کرے تو اُسے ''اِجماع'' کہا جاتا ہے۔ اور اگر کسی ایک ہی چیز کے بارے میں قیاس اور اجماع دونوں بہ یک وقت اکٹھے ہو جائیں اور ایک دوسرے سے متصادم ہوں تو اجماع کو قیاس پر ترجیح دی جاتی ہے۔ یہ اس وجہ سے کہ فقہاء کی جماعت کے اجماع میں غلطی اور خطا کا احتمال اکیلے فقیہ کے قیاس میں خطا سے نسبتاً کم ہوتا ہے۔

اب ہم کچھ اُن مثالوں کو لیتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ اجتہاد کے ذریعے قانون میں کیسے جدّت و اختراع کی جاتی ہے۔ مثلاً قرآنِ حکیم نے شراب پینے سے منع کیا ہے (سورۃ المائدۃ : ۹۰' ۹۱) اور یہ ممانعت اُس کے نشہ آور ہونے کی وجہ سے ہے۔ اب اجتہاد کی رُو سے شراب کے غیر طبّی استعمال کا اطلاق اُن تمام نشہ آور چیزوں پر ہوگا جو بعد کی پیداوار ہیں اور جن میں نشہ پیدا کرنے کی صلاحیت ہے۔ مثلاً ہیروئن جدید دریافت ہے اور اُس کی ممانعت بھی اُسی اصول کی رُو سے ہے جو دیگر نشہ آور چیزوں میں کارفرما ہے۔

قرآنِ حکیم معاہدوں کا احترام کرنے اور کاروبار میں دیانت و ایمانداری کا حکم دیتا ہے۔ اِن صدیوں قدیم احکام کا اطلاق آج کے زیرِ عمل (On line) معاہدوں اور کاروبار پر بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص روایتی طریقوں کے ذریعے رقم چُراتا ہے یا مسروقہ کریڈٹ کارڈ پر رقم نکلواتا ہے یا کسی بینک کے کمپیوٹرائی نظام کو ہنر

مندی اور چالاکی سے رقم اپنے نام منتقل کرتا ہے تو وہ بھی چوری ہوگا اور قرآن و حدیث میں بیان کردہ احکام کے مطابق وہ سزا کا مستحق ہوگا۔

اجتہاد کے ذریعے حاصل شدہ قانون تمام اوقات کے لئے مفید اور اچھا ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی کیونکہ تمام کائنات تغیر و تبدّل کی حالت میں ہے۔ یہ حقیقت اجتہادِ مسلسل کی ضرورت کو جنم دیتی ہے۔ اسے یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ جو قانون وحیِ الٰہی کے ذریعے حاصل ہو' اُس میں تبدیلی' اصلاح یا تنسیخ ممکن نہیں جبکہ اجتہاد کے ذریعے حاصل شدہ قانون میں حالات کے تقاضا کے مطابق تغیر و تبدّل' اصلاح' تنسیخ یا اُس کی جگہ کسی اور قانون کے رکھنے کی گنجائش ہوتی ہے۔

"حضور علیہ السلام کے اختیارِ تشریعی کی حقیقت: درج ذیل حدیث کو امام بخاری علیہ الرحمۃ نے صحیح البخاری میں متعدد مقامات پر ذکر کیا ہے:۔

عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِیْ بَکْرَۃَ عَنْ اَبِیْهِ ذَکَرَالنَّبِیَّ ﷺ قَعَدَ عَلٰی بَعِیْرِہٖ وَاَمْسَکَ اِنْسَانَهٗ بِخِطَامِہٖ اَوْبِزِ مَامِہٖ قَالَ: اَیُّ یَوْمٍ ھٰذَا؟ فَسَکَتْنَا حَتّٰی ظَنَنَّا اَنَّهٗ سَیُسَمِّیْهِ سِوٰی اِسْمِہٖ قَالَ: اَلَیْسَ ھٰذَا یَوْمُ النَّحْرِ؟ قُلْنَا: بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ: فَاَیُّ شَھْرٍ ھٰذَا؟ فَسَکَتْنَا حَتّٰی ظَنَنَّا اَنَّهٗ سَیُسَمِّیْهِ سِوٰی اِسْمِہٖ قَالَ: اَلَیْسَ بِذِی الْحِجَّۃِ قُلْنَا: بَلٰی --- لِیُبَلِّغَ الشَّاھِدُ الْغَائِبَ فَاِنَّ الشَّاھِدَ عَسٰی اَنْ یُّبَلِّغَ مَنْ ھُوَ اَوْعٰی لَهٗ مِنْهُ

اِس حدیثِ مبارکہ سے عقیدہ کے باب میں جو چیز معلوم ہو رہی ہے وہ یہ ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ نے تقریباً سوا لاکھ صحابہ کرام سے خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے یہ پوچھا کہ اَیُّ یَوْمٍ ھٰذَا؟ (آج کونسا دن ہے؟) یہ جاننے کے باوجود کہ یہ قربانی کا دن ہے' صحابہ کرام عرض کرتے ہیں کہ ہم خاموش رہے۔ دوسری روایت میں ہے کہ صحابہ نے کہا اَللّٰہُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ (اللہ اور اُس کا رسول ہی بہتر جانتا ہے)۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا سب کو معلوم نہ تھا کہ یہ یومُ النَّحر (قربانی کا دن) ہے مگر اس کے باوجود جواب نہ دیا۔ جواب نہ دینے کا سبب صحابہ کرام نے یہ بیان کیا کہ حَتّٰی ظَنَنَّا اَنَّهٗ سَیُسَمِّیْهِ سِوٰی اِسْمِہٖ (ہمیں یہ خیال گزرا کہ شاید حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام آج یعنی یومُ النحر کا دن بدلنا چاہتے ہیں)۔

اس سے حضور علیہ السلام کے اختیار کے بارے میں معلوم ہوا کہ صحابہ کرام کے عقیدے میں حضور علیہ السلام کے اختیارِ تشریعی کی حقیقت کیا تھی۔ صحابہ کرام یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اگر آج حضور ﷺ یہ فرما دیں کہ یہ یوم النحر نہیں بلکہ کوئی اور دن ہے تو آج قربانیاں نہیں ہوں گی اور دن بدل جائے گا۔ گویا اگر حضور علیہ السلام چاہیں تو وہ دن جو شریعت نے قربانی کے لئے مقرر کر رکھا ہے' اُسے بھی بدل سکتے ہیں یعنی جس دن کو بھی چاہیں' بدل دیں۔ وہی شریعت بن جائے گی۔

حضور علیہ السلام کے سوال پر جواب نہ دینا ادبِ صحابہ کو بھی ظاہر کرتا ہے کیونکہ صحابہ فرماتے ہیں کہ ہمیں معلوم نہ

تھا کہ حضور علیہ السلام کا منشاء کیا ہے؟ ممکن ہے ہم جواب میں یومُ النَّحر کہہ دیں لیکن حضور علیہ السلام کا منشاء کوئی اور ہو۔ لہٰذا اس خوف سے کہ کہیں ہمارا جواب منشائے رسول ﷺ کے خلاف نہ ہو جائے' ادب کے تقاضے کی بناء پر خاموش رہے۔ صحابہ کرام کی خاموشی پر آپ نے فرمایا: اَلَیْسَ ھٰذا یَوْمُ النَّحْرِ؟ (کیا یہ قربانی کا دن نہیں ہے؟) صحابہ نے عرض کیا: بَلٰی (جی ہاں' یہ قربانی کا دن ہے)۔

اسی طرح حضور علیہ السلام نے یہ جاننے کے باوجود کہ یہ ذوالحجہ کا مہینہ ہے' صحابہ کرام سے پوچھا کہ یہ کون سا مہینہ ہے؟ دوسری روایت کے مطابق صحابہ کرام نے اسی طرح پیکرِ ادب بنتے ہوئے یہی عرض کیا کہ اَللّٰہُ وَ رَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ (اللہ اور اُس کا رسول ہی بہتر جانتا ہے)۔ صحابہ کہتے ہیں کہ ہم نے یہ گمان کیا کہ حضور علیہ السلام شاید ماہِ ذوالحجہ کو بدلنا چاہتے ہیں' اس لئے کہ اُن کا عقیدہ تھا کہ زبانِ مصطفٰے ﷺ سے جو نکل جائے گا' وہی چیز مقرر ہو جائے گی۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا: اَلَیْسَ بِذِی الْحِجَّۃِ قُلْنَا: بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ (کیا یہ ذوالحجہ نہیں ہے؟) صحابہ نے عرض کیا: جی ہاں! یہ ذوالحجہ ہے۔

صحیح بخاری کی دیگر روایتوں میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے اس کے بعد کعبۃ اللہ مکہ معظمہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: اَیُّ بَلَدٍ ھٰذَا؟ (یہ کونسا شہر ہے؟)۔ سب کو اس کا علم تھا مگر صحابہ کرام اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ کے سوا کچھ نہ بولے۔ صحابہ کہتے ہیں کہ ہم یہ سمجھے کہ حضور علیہ السلام آج مکہ کا نام بدلنا چاہتے ہیں۔ یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ مکہ کا نام کسی مؤرخ نے نہیں رکھا بلکہ متعدد مقامات پر ہے کہ یہ نام اللہ نے رکھا ہے۔ اس کے باوجود صحابہ کا عقیدہ ہے کہ اگر حضور ﷺ چاہیں تو اللہ کے رکھے ہوئے نام کو بھی بدل سکتے ہیں اور آپ کی زبانِ اقدس سے جو نکل جائے گا وہ شریعت بن جائے گی۔ صحابہ کرام کی خاموشی پر حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ ''کیا یہ مکہ نہیں ہے؟'' اب صحابہ نے عرض کیا: ''جی ہاں' یا رسول اللہ! یہ مکہ شہر ہے۔''

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اِس کثرت کے ساتھ اِس حدیث کو صحیح البخاری میں ذکر کیا ہے کہ بار بار پڑھ کر مجھے (پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری کو) یہ گمان ہوا کہ امام بخاری کو صحابہ کرام کے اِس ادب کے تصوّر میں لذّت اور حلاوت نصیب ہوتی ہے۔ بارگاہِ رسالت ﷺ میں سکوت' علامتِ کمالِ ادب تھی اور اس پر امام بخاری کو وہ حلاوت نصیب ہوئی ہے کہ کئی مقامات پر جہاں تھوڑی سی مناسبت ملی' پھر یہ حدیث وارد کر دی۔ نیز بار بار وارد کرنے کی حکمت یہ تھی کہ صحابہ کرام کے جواب: ''حضور! آپ ہی کو معلوم ہے'' میں ایک لذّت ہے اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا حضور ﷺ کے اختیارِ تشریعی کے حوالے سے عقیدہ بھی واضح ہو رہا ہے۔

اثباتِ فقہ : ختمی مرتبت آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

مَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ بِہٖ خَیْرًا یُّفَقِّھْہُ فِی الدِّیْنِ

''اللہ جس شخص سے خیر کا ارادہ فرماتا ہے' اُسے دین میں سمجھ عطا کر دیتا ہے۔''

''اِس حدیثِ مبارکہ میں اثباتِ فقہ کے حوالے سے اشارہ موجود ہے۔ بعض ذہنوں میں ناروا اور ناجائز طور پر کم فہمی کی وجہ سے یہ خیال آتا ہے کہ شریعت صرف قرآن وسنت کا نام ہے لہٰذا فقہ کا وجود میں آنا قرآن وسنت پر اضافہ ہے اور بدعت ہے۔ درج بالا حدیثِ مبارکہ سے اس مغالطہ کا ازالہ ہو رہا ہے اور یہ ثابت ہو رہا ہے کہ فقہ بدعت نہیں بلکہ سنت ہے کیونکہ حدیث کی درایت کا نام ''فقہ'' ہے۔ پس حدیثِ مبارکہ کی روشنی میں یہ ثابت ہوا کہ جسے فقہ نصیب ہو جائے وہ خوش نصیب ہے اس لئے کہ اُس کے ساتھ اللہ نے خیر اور بھلائی کا ارادہ فرمایا ہے۔ پس جس امر کو صاحبِ شرع حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارادۂ الٰہی اور ارادۂ خیر کے ساتھ تعبیر کیا ہو' اُسے بدعت یا دین میں اضافہ تصوّر کرنا' اللہ کے ارادے کے خلاف بغاوت کے مترادف ہے۔''

حضور علیہ السلام اور اجتہاد: حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اجتہاد کی ضرورت نہ تھی کیونکہ آپ تو وہ مقدس ہستی ہیں جو مہبطِ وحیِ الٰہی ہیں۔ بات یہ ہے کہ بارگاہِ نبوت کی اداؤں کے بغیر دین مکمل نہیں ہوتا۔ چنانچہ اگر حضور ﷺ اجتہاد نہ فرماتے تو اجتہاد کے جواز کی دلیل کہاں سے آتی؟ معلوم ہوا کہ مجتہدین کے اجتہاد کے لئے دلیل فراہم کرنے کے لئے سرکارِ دوعالم ﷺ نہ صرف خود اجتہاد فرمایا بلکہ صحابہ کو بھی اجتہاد کے مواقع فراہم کئے۔

صحیح بخاری کی جلد دوم' صفحہ ۵۹۱ میں ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے صحابہ کی ایک جماعت کو بنی قریظہ کی طرف بھیجتے ہوئے ارشاد فرمایا: لَا يُصَلِّيَنَّ أَحَد" اَلْعَصْرَ إِلَّا فِي بَنِيْ قُرَيْظَةَ یعنی تم میں سے کوئی بھی عصر کی نماز نہ پڑھے مگر بنو قریظہ جا کر۔

اب ہوا یہ کہ جب حضور ﷺ نے اُس جماعت کو بھیجتے ہوئے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص عصر کی نماز بنو قریظہ پہنچے بغیر نہ پڑھے لیکن بنو قریظہ پہنچنے سے پہلے ہی وقت اِتنا تھوڑا رہ گیا تھا کہ اگر بنو قریظہ پہنچتے ہیں تو عصر کی نماز قضاء ہو جاتی ہے۔ اب مسئلہ یہ پیدا ہو گیا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا تو یہ حکم ہے کہ ''تم میں سے کوئی شخص عصر کی نماز بنو قریظہ پہنچے بغیر نہ پڑھے''۔ لیکن اس صورت میں تو نماز قضاء ہو جاتی ہے اور اگر نماز پہلے ادا کرتے ہیں تو بارگاہِ رسالت کی حکم عدولی ہوتی ہے۔ اِس اختلاف کی صورت میں بعض صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کہا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتَابًا مَّوْقُوْتًاO (سورة النسآء : ۱۰۳)

''بے شک نماز ایمان والوں پر وقتِ مقرر کیا ہوا فریضہ ہے۔'' (۴ : ۱۰۳)

نماز فرضِ موَقت ہے لہٰذا وقت سے پہلے ادا نہ ہوگی اور ہم ابھی نمازِ عصر ادا کر دیں گے ۔ تا کہ نماز وقت پر ادا ہو جائے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فرمان کا مطلب یہ تھا کہ تم اِتنا جلدی چلنا کہ نمازِ عصر بنو قریظہ پہنچ کر ادا کرو ۔ اب ہم اتنی جلدی نہیں چلے تو یہ ہماری غلطی ہے چنانچہ ہم نماز ادا کر لیتے ہیں ۔ اس لئے ایک جماعت نے بنو قریظہ پہنچنے سے پہلے نمازِ عصر ادا کی مگر کچھ صحابہ نے کہا کہ قضا اور ادا تو ہم جانتے نہیں' ہم تو حضور علیہ السلام کے فرمان پر عمل کریں گے کہ نمازِ عصر بنو قریظہ پہنچے بغیر نہیں پڑھیں گے ۔ اب صحابہ کی دونوں جماعتوں میں اختلاف ہو گیا کیونکہ دونوں نے اپنے اجتہاد سے کام لیا اور جب یہ اپنے اجتہاد سے کام لینے والی دونوں جماعتیں بارگاہِ نبوی میں پہنچیں تو حدیث میں آتا ہے کہ فَلَمْ یُعَنِّفْ وَاحِداً مِّنْهُمْ (صحیح بخاری' جلداول' صفحہ۱۲۹) یعنی حضور علیہ السلام نے کسی بھی جماعت سے اظہارِ ناراضگی نہیں فرمایا۔

یہاں سوال یہ ہے کہ از روئے حدیث حضور علیہ السلام نے کسی بھی جماعت سے اظہارِ ناراضگی نہیں فرمایا۔ لیکن آپ نے یہ کیوں نہیں فرمایا کہ فلاں جماعت صواب پر تھی اور فلاں خطا پر؟

اِس کا جواب یہ ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو معلوم تھا کہ میری اُمّت میں قیامت تک اجتہاد کا سلسلہ جاری رہے گا اور لوگ مجتہدین کے اجتہاد پر عمل کرتے رہیں گے اور اُن کے اس اجتہاد کی خطا ظاہر نہیں ہوگی ۔ اس لئے آپ نے پردہ پوشی فرمائی تاکہ دونوں جماعتوں کو اُن کا ثواب ملتا رہے ۔ اب اللہ بھی اجتہاد کرنے پر اُن سے ناراض نہیں اور نہ ہی رسول ﷺ اُن سے ناراض ہیں' اگر کوئی ناراض ہوتا پھرے تو ہوا کرے ۔ (ماخوذ از: تقریر علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ' درموضوع : ''مقامِ امامِ اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ'' بمقام: خانیوال شہر۔) ترتیب : محمد اسلم اَلوری ۔ حواشی : محمد صدّیق فانی)

''حضور علیہ السلام کی شانِ قاسمیت : حدیثِ مبارکہ مَنْ یُّرِدِاللّٰهُ بِهٖ خَیْرًا یُفَقِّهْهُ فِی الدِّیْن میں جو دوسری چیز عقیدہ کے باب میں واضح ہو رہی ہے' وہ یہ ہے کہ بہت سے لوگ جو بغور کتبِ حدیث کو نہیں پڑھتے اور ٹکڑے ٹکڑے کہیں سے پڑھ کر یاد کر لیتے ہیں ۔ اصل کتاب چونکہ نہیں پڑھی ہوتی اس لئے سیاق وسباق اور کامل مضمون ذہن میں نہیں ہوتا ۔ اِس حدیث کا کامل مضمون یہ ہے کہ فرمانِ رسول ﷺ صرف اس قدر نہیں ہے کہ ''جس سے اللہ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے' اُسے دین میں فقہ (سمجھ بوجھ) عطا کر دیتا ہے ۔'' اس سے تو صرف ارادۂ الٰہی کا پتہ چل رہا ہے ۔ اللہ یہ ارادہ کرتا کس کے ساتھ ہے؟ اور کیوں کرتا ہے؟ اِسے جاننے کے لئے حدیث کے کامل مضمون کو دیکھنا ہوگا ۔

حدیثِ مبارکہ کا اگلا حصّہ یہ ہے : وَاِنَّمَا اَنَاقَاسِمٌ'' وَاللّٰهُ یُعْطِیْ (بے شک تقسیم کرنے والا میں ہوں

اور عطا کرنے والا اللہ ہے)۔ اس حصہ کو حضور علیہ السلام نے معًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّيْن کے بعد وارد فرمایا ہے۔ اللہ کا ارادۂ خیر یہ ہے کہ جس کی طرف اللہ ارادۂ خیر سے متوجہ ہو جائے' اُسے دین کا فقیہ بنا دیتا ہے۔ اور فقہ فی الدین ملتی کیسے ہے؟ اللہ کا ارادۂ خیر ہوتا کیسے ہے؟ اس کے لئے فرمایا: اِنَّمَا اَنَا قَاسِم'' وَاللّٰهُ يُعْطِي یعنی خیرات تو اللہ کی ہے مگر یہ تقسیم صرف درِ مصطفٰی سے ہوتی ہے۔ حدیث کے سیاق و سباق کو ملائیں تو واضح ہوتا ہے کہ تفقہ فی الدین تقسیم ہو رہی ہے۔ دین کی فقہ' علم' فہمِ کامل' معرفتِ تامہ' قوتِ استنباط و استدلال' قوتِ انطباق و استخراج جو بندے کو دین کے اندر فقیہ بناتی ہے' یہ خیرات صرف اُنہی کو ملتی ہے جو حضور ﷺ کے دربارِ گہر بار سے خیرات طلب کرتے ہیں اور اُس کا عقیدہ بھی رکھتے ہیں۔ اِنَّمَا کلمہ حصر ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ ارادہ تو اللہ کا تھا مگر اللہ کے ارادۂ خیر کو تقسیم کرنے والا صرف میں ہوں۔ پس جو لوگ درِ مصطفٰی ﷺ سے سائل بن کر جتنا زیادہ متمسک ہوتے ہیں' مضبوطی کا تعلق رکھتے ہیں' اُنہی کو اللہ کے ارادۂ خیر کی خیرات ملتی ہے۔ گویا فقیہ وہی ہوتا ہے جو حضور ﷺ کی بارگاہِ قاسمیت کے ساتھ منسلک ہوتا ہے۔''

''توسل کی ضرورت کیوں؟ عقیدہ کے باب میں حدیث مذکور سے تیسرا نکتہ جو ظاہر ہو رہا ہے' وہ یہ ہے کہ بعض لوگوں کو کثرت کے ساتھ یہ مغالطہ پیدا ہوا ہے کہ تمہیں توسل کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے؟ جب دینا اللہ نے ہے تو توسل اور وسیلہ کی ضرورت کیوں ہے؟ اس سوال کا جواب اور اس مغالطہ کا ازالہ یہ ہے کہ ہم نے صرف یہ سنا ہے کہ اللہ دیتا ہے لیکن کبھی اس پر غور نہیں کیا کہ وہ دیتا کیسے ہے؟ کوئی شک نہیں کہ اللہ دیتا ہے مگر آیئے صاحبِ شریعت سے پوچھیں کہ آقا! دینے والا تو اللہ ہے مگر یہ تو بتائیں کہ وہ دیتا کیسے ہے؟ چنانچہ فرمایا: وَاللّٰهُ يُعْطِي ''وہ مجھے عطا کرتا ہے اور پھر میں آگے تقسیم کرتا ہوں۔'' گویا عطا کا موردِ بارگاہِ الٰہی ہے اور تقسیم کا منبع حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ ستودہ صفات ہے۔ ہمارا تعلق عطا سے نہیں' تقسیم سے ہے۔ عطائے الٰہی بہ واسطہ رسالت تقسیم ہو رہی ہے اور اسی کو ''وسیلہ'' کہتے ہیں۔ اس لئے اللہ پاک نے فرمایا:

اِنَّا اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ O (سورۃ الکوثر: ۱)

''بے شک ہم نے آپ کو (ہر خیر و فضیلت میں) بے انتہا کثرت بخشی ہے۔'' (۱ : ۱۰۸)

اَعْطَيْنٰكَ صیغہِ ماضی ہے اور صیغہِ ماضی میں فعل بسا اوقات یقین اور تعین کے لئے آتا ہے۔ اَعْطَيْنٰكَ میں تیقن ہے کہ بالیقین اور اِنَّا کے ذریعے تیقن پر تکرار آ گیا۔ فرمایا کہ یقیناً ہم نے آپ کو خیرِ کثیر عطا فرما دی۔ کہا جا سکتا ہے کہ کوثر تو جنت کی ایک نہر ہے تو آپ نے خیرِ کثیر کا ترجمہ کہاں سے کر دیا! جواب یہ ہے کہ کوثر کا ایک معنیٰ نہر کا بھی ہے۔ امام بخاری نے صحیح البخاری میں ''کوثر'' کی تشریح کی ہے کہ اس سے مراد ''خیرِ کثیر'' ہے۔ گویا امام بخاری کی تفسیر پر مدار کرتے ہوئے معنیٰ یہ ہوا کہ ''اے محبوبِ مکرّم! یقیناً ساری خیر ہم نے آپ کو عطا کر دی۔'' جب سب خیر کی نہریں حضور ﷺ کو عطا کر دی ہیں تو پھر جس نے جو لینا ہے' وہ درِ مصطفٰی کا رُخ کرے۔''

(ماہنامہ ''منہاج القرآن'' لاہور' جنوری ۲۰۰۷ء' صفحات ۱۹ تا ۲۲)

(۱۱۱) کعبۃ اللہ (KA'BAH)

لفظ ''کعبہ'' کا مصدر ک۔ع۔ب (کعب) بمعنیٰ بلندی اور اونچائی ہے۔ٹخنوں کو ''کعب'' کہا جاتا ہے کیونکہ وہ قدم میں اُبھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ایک بالغ و پختہ نوخاستہ (خوب اُبھری ہوئی چھاتیوں والی) لڑکی کو ''کاعبہ'' کہا جاتا ہے جس کی جمع ''کواعِب'' (سورۃ النّبا : ۳۳) آتی ہے۔

کعبہ کی وجہ تسمیہ : چونکہ (۱) کعبہ سطحِ سمندر سے بہت اونچائی پر ہے' اس لئے یہ نام پڑا۔یا اس لئے کہ (۲) یہ شہرہ آفاقی کا حامل ہے اور چونکہ اس کا چرچا دنیا میں بہت بلند ہے' اس لئے اسے کعبہ کہا جاتا ہے۔یا (۳) کعبہ بمعنیٰ مربع ہے یعنی چوکور چیز' چونکہ اس کی چوڑائی' لمبائی برابر ہے لٰہذا وہ کعبہ ہے۔یا (۴) کعبہ بمعنیٰ مکعب ہے یعنی جس کی لمبائی' چوڑائی اور اونچائی سب برابر ہوں۔۔چونکہ اس کی تینوں سطحیں برابر ہیں لٰہذا اُسے کعبہ کہا جاتا ہے۔(تفسیر نعیمی' جلد ہفتم' صفحہ ۸۳ ؛ القاموس المحیط۔۔مجدالدین فیروز آبادی' جلد ۱' صفحہ ۱۲۴)۔بیت اللہ یعنی کعبہ کو ''البیت العتیق'' بھی کہتے ہیں جیسا کہ سورۃ الحج کی آیت ۲۹ میں ہے۔

کعبہ کے چاروں طرف مکعب شکل کی ایک کافی وسیع مسجد ''مسجد الحرام'' کے نام سے ہے (بحوالہ سورۃ البقرۃ :۱۴۴' ۱۴۹' ۱۵۰ ؛ سورۃ التوبۃ :۲۸ ؛ سورۃ الفتح :۲۷)۔تمام مسجدیں مقدس ہیں لیکن مسجد الحرام مقدس ترین ہے۔روئے زمین پر یہ پہلی مسجد ہے جسے خدائے واحد لاشریک لہٗ کی عبادت کے لئے مخصوص کیا گیا۔
سورہ آلِ عمران میں اس کے متعلق فرمایا گیا :

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ O (آلِ عمران : ۹۶)

''سب سے پہلا مکان جو لوگوں کے لئے بنایا گیا' وہ وہ ہے جو مکّہ میں ہے' برکت والا اور سارے جہانوں کے لئے راہ نما ہے۔'' (۹۶ : ۳)

''مبارک'' برک سے ہے بمعنیٰ بیٹھ جانا' لازم ہو جانا۔اصطلاح میں اس کے معنیٰ بڑھنا اور زیادہ ہونا بھی ہیں اور بقائے دوام بھی۔کعبہ اس لئے برکت والا ہے کہ اُس میں ایک نماز کا ثواب دوسری مساجد کی نسبت ایک لاکھ درجہ زیادہ ہے۔دوسرے معنیٰ یعنی بقائے دوام کے لحاظ سے چونکہ روئے زمین پر ہر وقت کسی نہ کسی جگہ نماز کا وقت ہوتا ہے اس لئے ہر وقت کعبہ کی طرف توجہ کر کے عبادت کی جاتی ہے اور خود کعبہ میں بھی ہر وقت نماز پڑھی جاتی ہے اس لئے وہاں دائما عباد کی وجہ سے اسے مبارک کہا گیا۔

کعبہ تمام عالمین کے لئے ہدایت ہے۔اس کی حسب ذیل وجوہ ہیں :

(۱) کعبہ تمام روئے زمین کے نماز پڑھنے والوں کے لئے قبلہ ہے اور وہ اُس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے ہیں اس لئے کعبہ تمام جہان والوں کے لئے سمتِ قبلہ کی ہدایت ہے۔

(۲) کعبہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اُس کی الوہیت پر دلالت کرتا ہے اور کعبہ میں جو عجائب وغرائب ہیں وہ سیّدنا محمد ﷺ کے صدق اور آپ کی نبوّت پر دلالت کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے کعبہ تمام جہان والوں کے لئے ہدایت ہے۔

(۳) کعبہ تمام جہان والوں کو جنت کی ہدایت دیتا ہے۔ جو خلوصِ نیت سے کعبہ کی زیارت کرے، کعبہ کا طواف کرے اور اُس میں نمازیں پڑھے، کعبہ اُسے جنت کی ہدایت دیتا ہے۔

ہدایت کی اقسام : (۱) ہدایتِ الہامی : جو کسی کے بتائے بغیر خود بخود حاصل ہو جیسا کہ بچے کا پستان چوسنا اور رو رو کر ماں کو اپنی طرف مائل کرنا۔ (۲) ہدایتِ احساسی : جو حواس درست ہونے کے بعد حاصل ہو جیسے بچہ ہوش سنبھالنے کے بعد اچھی بری چیزوں میں فرق کرتا ہے۔ (۳) ہدایتِ عقلی (نظری) : جو عقل کی مدد سے حاصل ہو۔ یہ دلائل سے حاصل ہوتی ہے یعنی انسان اپنی عقل کی مدد سے دلائل قائم کرے اور پھر اُس سے نتیجہ نکالے (۴) ہدایتِ الٰہیہ : جو پیغمبروں کی مدد اور حق تعالیٰ کے خاص کرم سے حاصل ہو یعنی جن چیزوں کو ہم عقل اور دلائل سے معلوم نہیں کر سکتے، اُس کی رہبری کے لئے حق تعالیٰ نے انبیائے کرام کو بھیجا۔ خیال رہے کہ ہدایتِ الٰہیہ ہم لوگوں کے لئے آخری ہدایت ہے مگر حضور ﷺ کے لئے یہ پہلی ہدایت ہے یعنی الہامیہ خاص بندے پیدائشی عارف باللہ ہوتے ہیں جیسے عیسیٰ علیہ السلام نے پیدا ہوتے ہی فرمایا: اِنِّیْ عَبْدُاللّٰہِ (میں اللہ کا بندہ ہوں) یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا : وَ آتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا (اور ہم نے یحییٰ کو لڑکپن میں ہی سمجھ دے دی تھی)۔ ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پیدا ہوتے ہی سجدہ کیا اور قرآن کی پہلی آیت کے نزول کے وقت آپ اعتکاف اور ذکرِ الٰہی میں تھے۔ امام الاولیاء سیّد عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے رمضان کے دن ماں کا دودھ نہیں چوسا۔

ہدایت کی ایک اور قسم ہدایتِ عامّہ (ہدایتِ توفیقی یا تبیانی) اور ہدایتِ خاصّہ پر مشتمل ہے۔ ہدایتِ عامّہ شرعی احکام کی ہدایت ہے جو نبی کے ذریعے عام مخلوق کو ہوتی ہے جیسے عقائدِ اسلامیہ اور ظاہری اعمال۔ ہدایتِ خاصّہ وہ ہے جو نورِ نبوّت یا نورِ ولایت سے خاص خاص لوگوں کو حاصل ہو (تفسیر عزیزی بحوالہ تفسیرِ نعیمی، ج ۱)۔

کعبہ اُمّتِ مسلمہ کی وحدت کی علامت ہے۔ ہر مسلمان خواہ وہ مشرق و مغرب میں ہو یا شمال و جنوب میں، نماز کی ادائیگی کے لئے اپنا رخ کعبہ کی طرف کرتا ہے۔ اسلامی اخوّت اور بھائی چارہ ہمیشہ اس مقدس مرکز کے گرد گھومتا رہتا ہے۔ چنانچہ سورۃُ المائدہ کی آیت ۹۷ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہوا :

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَامًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَائِدَ ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ" O (المائدۃ : ۹۷)

''اللہ نے کعبہ کے مقدس گھر کو انسانوں کے باقی رہنے کا مدار ٹھہرایا ہے (نیز) حرمت والے مہینہ کو اور حرم میں قربانی کو اور گلے میں پٹہ پڑے ہوئے جانوروں کو۔ یہ اس لئے کہ تم یقین کر لو کہ جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے، اللہ اُس سب کا علم رکھتا ہے اور یہ کہ اللہ ہر چیز کا پورا علم رکھتا ہے۔'' (۵:۹۷)

قِیٰام بمعنیٰ قیام وبقا کا ذریعہ جس سے مراد یا دنیاوی بقا ہے یا دینی بقا' یا دونوں مراد ہیں ۔ اَلنَّاس سے مراد یا اہلِ عرب ہیں یا تمام جہان کے اہلِ اسلام یا تمام دنیا کے لوگ مؤمن ہوں یا کافر ۔ اگر (۱) اہلِ عرب مراد ہوں تو اُن کی بقا کعبہ معظّمہ سے ہے کہ لوگ حج وعمرہ کے لئے وہاں پہنچیں تو اہلِ عرب کو روزی ملے ۔ نیز عرب میں لوٹ مار' چوری' ڈکیتی اور قتل عام تھے مگر کعبہ معظّمہ اور حدودِ حرم میں بالکل امن رہتا تھا جس سے اُن لوگوں کی جان ومال محفوظ تھے نیز کعبہ معظّمہ کی وجہ سے تمام دنیا میں اہلِ عرب کی عزت وعظمت تھی ۔ اِن وجوہ سے کعبہ اُن کی بقا کا ذریعہ ہے ۔ (۲) اگر تمام جہان کے اہلِ اسلام مراد ہوں تو ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے صدہا کام کعبہ معظّمہ سے وابستہ ہیں ۔ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز اور تلاوتِ قرآنِ حکیم ہوتی ہے ۔ کعبہ جا کر ہی حج وعمرہ ہوتا ہے ۔ کعبہ ہی کا طواف ہوتا ہے ۔ اُسے دیکھنا عبادت ہے ۔ کعبہ معظّمہ پہنچ کر حجاج کو دنیا بھر کے پھل فروٹ ملتے ہیں ۔ کعبہ معظّمہ میں ہی تمام جہان کے مسلمان آپس میں ملتے ہیں جس سے اُن کا قوی دینی نظام قائم رہتا ہے' ہر سال اُن کی عالمی کانفرنس وہاں منعقد ہوتی ہے ۔ لہٰذا کعبہ مسلمانانِ عالم کے لئے دینی ودنیاوی بقا کا ذریعہ ہے ۔ کعبہ معظّمہ ہی وہ جگہ ہے جہاں ایک نیکی کا ثواب ایک لاکھ ہے ۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں حاضری دینے سے تمام عمر کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں کہ گویا آج ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ۔ (۳) اگر اَلنَّاس سے مراد سارے انسان ہوں تو اُن کے لئے کعبہ معظّمہ بقا کا ذریعہ اس لئے ہے کہ جب تک کعبہ آباد ہے' وہاں حج وعمرہ ہو رہا ہے' تب تک دنیا آباد ہے ۔ اگر کعبہ ویران ہو جائے اور وہاں کا حج وعمرہ وطواف بند ہو جائے تو دنیا بھی فنا کر دی جائے اور جہان میں کوئی باقی نہ رہے ۔ حضرت عطا کا یہی قول ہے (تفسیر روح المعانی) ۔ تفسیر مدارک نے فرمایا کہ اگر ایک سال لوگ کعبہ کو خالی کر دیں تو کعبہ غائب ہو جائے اور دنیا برباد ہو جائے ۔ کعبہ معظّمہ' قرآن مجید اور علمائے دین کے ذریعے دنیا کی بقا ہے جیسا کہ بہت سی احادیث سے ثابت ہے ۔

اَلشَّھۡرَ الۡحَرَامَ سے مراد بقر عید کا مہینہ ہے جس میں حج ہوتا ہے ۔ حرام بمعنیٰ محترم ومعظم ہے یعنی اللہ نے ماہِ ذی الحجہ کو بھی لوگوں کی بقاء کا ذریعہ بنایا کہ اس مہینہ میں حج ہوتا ہے اور حج سے مسلمانوں خصوصًا اہلِ عرب کی دین ودنیا وابستہ ہے ۔ خیال رہے کہ ماہِ ذی الحجہ کا پہلا عشرہ بہت ہی عظمتوں والا ہے ۔ امام نیشا پوری فرماتے ہیں کہ اِسی عشرہ ہی میں موسیٰ علیہ السلام نے رب سے پہلا کلام کیا' اِسی عشرہ میں حج ہوتا ہے' اِسی عشرہ میں حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول ہوئی ۔ اِسی عشرہ میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ذبح اور فدیہ کا واقعہ پیش آیا ۔ اِسی عشرہ میں حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم سے اور حضرت نوح علیہ السلام نے طوفان سے نجات پائی ۔ اِسی عشرہ میں بیعت الرضوان' صلح حدیبیہ اور بشارتِ خیبر ہوئی ۔ اِسی لئے اس عشرہ میں خصوصًا عرفہ کے دن یعنی نویں بقر عید کا روزہ بہت افضل ہے (تفسیر روح البیان) ۔

ھَدۡی وہ جانور ہے جو بیرونِ حرم سے حرم شریف میں لے جا کر ذبح کر دیا جائے ۔ قلائد جمع ہے قِلادہ کی بمعنیٰ ہار ۔ یہاں ہار سے مراد وہ ہار ہے جو ھدی کے گلے میں ڈالا جاتا ہے جس سے وہ پہچانا جاتا ہے کہ وہ نامِ خدا پر ذبح ہونے کے لئے جا رہا ہے ۔ عرب کے ڈاکو' چور دن رات ڈکیتی کرتے تھے مگر ان ہاروں کو دیکھ کر نہ اُن جانوروں کی طرف رخ کرتے تھے اور نہ اُن قافلہ والوں کی طرف اور یہ جانور بڑی امن وحفاظت اور عزت و

عظمت کے ساتھ خانہ کعبہ پہنچ جاتے تھے۔ واپسی میں یہ لوگ وہی ہار اپنے گلوں میں ڈال لیتے تو بہ خیریت اپنے وطن پہنچ جاتے تھے (تفسیر کبیر)۔ بہر حال یہ چاروں چیزیں (کعبۃ اللہ شریف' ماہِ ذی الحجہ' ہدی اور ہدی کے ہار) بہت وجھوں سے بقا کا ذریعہ ہیں۔

ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَافِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْض یہ گزشتہ مضمون کا نتیجہ ہے یعنی کعبہ معظمہ کی اِن حرمتوں کی وجہ سے یہ نتیجہ نکالنا چاہئے کہ رب تعالیٰ نے کعبہ' ماہِ حرام' ہدی اور قلادوں کو قیام اس لئے بنایا تاکہ تم آنکھوں دیکھے یہ جان لو کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کے ذرّہ ذرّہ کو جانتا ہے۔ دیکھو اُس نے سارے جہان میں خانہ کعبہ' ماہِ حرام کو اِن خوبیوں کے لئے منتخب فرمایا۔ کعبہ معظمہ کے سوا اور کسی گھر کے لئے یہ دعویٰ نہیں کیا گیا نہ بیت المقدس کے لئے اور نہ کسی اور جگہ کے لئے اور اِس دعویٰ کا ظہور تا قیامت تک ہوتا رہے گا۔ بڑی بڑی طاقتوں نے کعبہ معظمہ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی حتی کہ ابرہہ نے ہاتھیوں سے اس پر چڑھائی کی مگر کوئی بھی اپنے ناپاک ارادوں میں کامیاب نہ ہو سکا اور کعبہ معظمہ کی عظمت ویسی ہی رہی۔ یہ ہے رب تعالیٰ کے علم و حکمت کا ظہور کہ اب بھی کعبہ کی عظمت دیکھو اور ربِّ کعبہ کی علم و حکمت اور قدرت و قوّت کا آنکھوں سے مشاہدہ کرلو۔

وَاَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْم" اِس عبارت میں تخصیص کے بعد تعمیم ہے یعنی پہلے ارشاد ہوا کہ رب تعالیٰ آسمان و زمین کی تمام چیزوں کو جانتا ہے۔ اب فرمایا کہ ہر چیز کو جانتا ہے' خواہ آسمان کی ہو یا زمین کی ہو یا ان کے علاوہ۔ اس جملہ میں اِس طرف اشارہ ہے کہ چونکہ رب تعالیٰ نے کعبہ معظمہ کو ان خوبیوں کے لئے منتخب فرمایا' لہٰذا اس کے لئے سامان بھی ایسے ہی کردیئے۔

نوٹ ضروری : جس چیز اور جس جانور کو اللہ کے مقبولوں سے نسبت ہو جائے' وہ بھی عظمت والا بلکہ بقائے عالم کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ دیکھئے ربّ ذوالجلال والاکرام نے یہاں تو اِن قربانی کے جانوروں کو جو بیت اللہ لائے جائیں' باعثِ بقائے عالم اور سورۃ الحج کی آیت ۳۶ میں اُنہیں شعائر اللہ فرمایا۔ ان جانوروں کو یہ عظمت کعبہ معظمہ کی نسبت سے ملی۔ جب جانور کعبہ کی نسبت سے قیاماً للنّاس بن جاتے ہیں تو حضرات اولیاء اللہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نسبت سے کیا کچھ نہیں بنیں گے!

تاریخ ابن عساکر اور تاریخ ارزقی سے تفسیر عزیزی وغیرہ نے نقل کیا ہے کہ خانہ کعبہ کے اوّل معمار حضرت آدم علیہ السلام تھے اور آج سے تقریباً چار ہزار سال قبل اس کی تعمیرِ ثانی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں ہوئی جس کے دوران آپ کے فرزندِ ارجمند حضرت اسمٰعیل علیہ السلام آپ کو مٹی اور گارا اُٹھا اُٹھا کر دیتے رہے۔ ہمارے نبی مکرّم ﷺ کی بعثت سے قبل کفار اور مشرکین عرب نے کعبۃ اللہ میں تین سو ساٹھ بُت رکھے ہوئے تھے اور وہ اُن کی پوجا کرتے تھے۔ لیکن ۸ ہجری میں نبی علیہ السلام نے مکہ میں اپنے فاتحانہ داخلے پر اس مقدّس گھر کو بتوں سے پاک و صاف کر کے اُسے خالصتاً اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کے لئے مخصوص کر دیا اور صرف اُسی ایک معبود ہی کی عبادت کے لئے ابراہیم علیہ السلام نے بحکمِ الٰہی اُسے تعمیر کیا تھا۔ قرآن فرماتا ہے :

۲۹۲۶ (کعبۃ اللہ ـ ـ ـ KA'BAH)

وَاِذْ بَوَّأْنَا لِاِبْرَاهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِيْنَ وَالْقَائِمِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِO (الحج : ۲۶)

''اور (وہ وقت قابلِ ذکر ہے) جب ہم نے ابراہیم کو بیت اللہ کی جگہ بتا دی (اور حکم دیا کہ) میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام و رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے پاک و صاف رکھنا۔'' (۲۶ : ۲۲)

مسلمان صرف ایک خدائے واحد کی عبادت کرتے ہیں۔ اُن کا ایمان پتھروں' جانوروں اور انسانوں کی عبادت کرنے کا نہیں ہے۔ کعبہ اگرچہ پتھروں سے بنائی گئی عمارت ہے لیکن وہ سمت اور جہت کی علامت ہے جس کی طرف مسلمان نماز کے دوران اپنا رُخ کرتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان اُس دائرے کے محیط کی طرح ہیں جس کا صرف ایک اور ایک مرکز ہے۔ کعبہ ایک نشان اور علامت ہے نہ کہ عبادت کئے جانے کی چیز۔ نماز کے دوران کعبہ کی طرف رخ کرنے کے پس پردہ حکمِ الٰہی کارفرما ہے اور مسلمانوں کے پاس یہ قوی' ٹھوس' مضبوط اور مُسکت دلیل ہے کہ وہ اللہ کے بندے ہیں اور ہر وقت اُس کے حکم پر لبیک کہنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔

کعبہ کے قرب ہی میں ''زمزم'' نام کا وہ مشہور' تاریخی چشمہ ہے جو اُس وقت پھوٹ پڑا جب شیرخوار اسماعیل علیہ السلام اور اُن کی والدہ ماجدہ حضرت ہاجرہ سلام اللہ علیہا صحرائے عرب کی جھلسا دینے والی گرمی میں پانی کے لئے مضطرب اور پریشان حال تھے۔ اسی چشمۂ زمزم پر مکّہ مکرّمہ کی خوشحالی کا انحصار ہے۔ اور اس سے زیادہ خوش کن' حیران کن بات یہ ہے کہ اس مقدّس چشمے کا پانی تمام دنیا کو بھیجے جانے کے علاوہ سال کے پورے بارہ مہینے اہالیانِ مکّہ اور حجاج کرام کے استعمال میں رہنے کے باوجود ختم ہونے میں نہیں آتا۔

کعبہ کی حکمت : یہ صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی مشرق و مغرب' شمال اور جنوب کی جہتوں سے آزاد اور بلند و بالا ہے اور کسی خاص جگہ میں وہ محدود نہیں ہے۔ اگر ہر عبادت گزار اپنی پسند کی سمت یا جگہ کی طرف رخ کرے اور وہ عبادت کے مختلف اوقات میں مختلف سمتوں کو ترجیح دے تو یہ بات انتشار کا سبب بنے گی۔ اس لئے حکمتِ خداوندی اس بات کی مقتضی ہوئی کہ تمام عبادت گزار نماز کے دوران ایک ہی سمت کی طرف اپنا رخ کریں۔ اب عبادت کی مختلف صورتیں ہیں: اُن میں سے کچھ انفرادی اور ذاتی اور کچھ معاشرتی اور اجتماعی ہیں۔ ذکرِ الٰہی اور روزے انفرادی اور ذاتی طور پر (عوام کی نگاہ سے بچ کر) ادا کئے جا سکتے ہیں جبکہ اس کے برعکس نمازِ پنجگانہ اور حج عبادت کی اجتماعی شکل ہیں جنہیں علانیہ طور پر اجتماع میں ادا کیا جاتا ہے۔

عبادت کی ان مؤخرالذکر صورتوں میں والہانہ وابستگی کے ساتھ ساتھ یہ بات پسندیدہ بلکہ ضروری ہے کہ اُن میں مسلمان معاشرتی زندگی کے آداب و قرائن کا خیال رکھیں۔ یہ بات بھی ظاہر ہے کہ معاشرتی نظم و ضبط کا بنیادی اصول لوگوں کا باہمی اتحاد اور استحکام ہے۔ یہ وحدت و اتحاد جس قدر مضبوط تر ہوگا' اُسی قدر معاشرتی نظام مستحکم اور مضبوط ہوگا جبکہ انفرادیت اور معاشرتی عدم اتحاد زہرِ ہلاہل اور معاشرتی نظم و ضبط کے لئے تباہ کن ہیں۔ تاہم معاشرتی

۲۹۲۷ (کعبۃ اللہ ۔۔۔ KA'BAH)

نظم وضبط کے نشان کے تعین میں مختلف لوگوں نے مختلف طریقے اختیار کیے ہیں۔ کچھ لوگوں نے اپنے سلسلہ نسب اور خاندانی روابط کو اتحاد کا نشان بنایا جبکہ کچھ لوگوں نے اپنی مادرِ وطن، رنگ اور زبان کو ترجیح دی اور کچھ لوگوں نے جغرافیائی عوامل کو اپنی معاشرتی وحدت کی بنیاد بنایا۔

لیکن خدائی دین اور پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عطا کردہ نظامِ حیات نے ان ترجیحات کو اتحاد و وحدت کے نشان کے طور پر قابلِ اعتنا نہیں سمجھا بلکہ حقیقت یہی ہے کہ ان چیزوں میں تمام نوعِ انسانی کو ایک وحدت میں پرونے کی صلاحیت ہے ہی نہیں۔ بلکہ اتحاد و یگانگت کے یہ نام نہاد نکات نوعِ انسانی کو مختلف گروہوں اور طبقوں میں تقسیم کرنے کے عوامل ہیں اور اُنہوں نے اُن کے مابین تصادم، تنازعات اور اختلافات کو جنم دیا ہے۔

اسلام نے جو دراصل مذہب نہیں بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام کا ''دین'' (ضابطۂ حیات) ہے، نوعِ انسان کو سینکڑوں دیوتاؤں اور دیویوں (بہ شمول اپنی نفس پرستی سے لے کر حجری بتوں کی پرستش تک) کی غلامی اور زیردستی کے جُوا سے آزاد ہونے کی طرف دعوت دی ہے کہ وہ سب مل کر ایک خالق و مالک اور اُس شہنشاہ کی اطاعت اور فرمانبرداری کریں جو مشرق و مغرب، شمال و جنوب کا بلاشرکتِ غیرے مالک ہے۔ اتحاد و یگانگت کا یہ واحد نکتہ ہے جس پر تمام نوعِ انسانی بغیر کسی طبقاتی اختلاف کے بہ آسانی متفق ہو سکتی ہے۔

کعبہ کی سمت اور جہت کا اتحاد اہمیت کا حامل ہے۔ اگرچہ رب تعالیٰ کی ذاتِ اقدس مشرق و مغرب، شمال اور جنوب کی مادّی حدبندیوں سے کہیں بلند و بالا اور ماوراء ہے کہ اُس کے نزدیک تمام سمتیں برابر ہیں اور اس لحاظ سے وہ کسی مخصوص عبادت گاہ کی چاردیواری میں بند نہیں ہے کہ آدمی عبادت میں اُسے کسی اور جگہ کی بجائے صرف وہاں پائے۔ لیکن تمام جہان کے لوگوں میں نماز کے دوران سماجی شکل اور اتحاد پیدا کرنے کے لئے اُن کا رخ ایک ہی سمت میں کر دینا ضروری تھا۔ کیونکہ اتحاد اور یک جہتی کے لئے یہ سہل اور آسان طریقہ تھا۔

سورۃ البقرۃ کی یہ آیت :

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ (البقرۃ : ۱۴۸)

''اور ہر ایک کے لئے توجہ کی ایک سمت (مقرر) ہے، وہ اُسی کی طرف رُخ کرتا ہے پس تم نیکیوں کی طرف پیش قدمی کیا کرو۔'' (۱۴۸ : ۲)

اپنے اندر کچھ واضح مطالب رکھتی ہے: (۱) اوّل تو یہ کہ مختلف واقعات اور مختلف حالات میں نماز کے دوران آدمی کی اللہ کو پانے کی آرزو کی مختلف شکلیں ہیں مثلاً ابراہیم علیہ السلام کا کعبہ کو بطور قبلہ اختیار کرنا، یہودیوں کا یروشلم پر مرتکز ہونا، ابتدا کے عیسائی کلیساؤں کا شرقی سمت کو منتخب کرنا اور قرآنِ حکیم کا کعبہ کو بنانے کا حکم۔ (۲) دوم یہ کہ نماز کی جہت اور سمت، خواہ اس کی تمثیلی اہمیت کتنی زیادہ کیوں نہ ہو، ایمان و عقیدے کے جوہر کی اس طرح نمائندگی نہیں کرتی کیونکہ قرآن کہتا ہے:

۲۹۲۸ (کعبۃ اللہ ۔۔۔KA'BAH)

(۱) لَيۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ (البقرۃ: ۱۷۷)
''نیکی صرف یہی نہیں کہ تم اپنے منہ مشرق اور مغرب کی طرف پھیرلو۔'' (۱۷۷ : ۲)
(۲) وَلِلّٰهِ الۡمَشۡرِقُ وَالۡمَغۡرِبُ فَاَيۡنَمَا تُوَلُّوۡا فَثَمَّ وَجۡهُ اللّٰهِ (البقرۃ: ۱۱۵)
''اور مشرق ومغرب (سب) اللہ ہی کا ہے' پس تم جدھر بھی رخ کرو' اُدھر ہی اللہ کی توجہ ہے (یعنی ہر سمت ہی اللہ کی ذات جلوہ گر ہے)۔'' (۱۱۵ : ۲)

"The Message of the Qur'an"... Dr. Muhammad Asad, pp. 30, 31, Notes:118, 123)

ابوالکلام آزاد نے بڑی خوبصورتی سے اسلام کے اس اصول کو اپنی تفسیر میں یوں بیان کیا ہے:

''قرآن کہتا ہے کہ صداقتِ الٰہی بس ایک ہے جو سب کے لئے ہے اور دراصل وہ ہر سماج کو دی گئی ہے۔ قرآنِ حکیم ہر ایک کو آفاقی اور مشترک صداقت کی طرف واپس لانا چاہتا ہے اور یہ آفاقی اور مشترک صداقت کیا ہے؟ یہ زندگی کی وہ کامیابی اور کامرانی ہے جو صرف اللہ کی خالص بندگی اور صالح زندگی کے ذریعے حاصل کی جاتی ہے نہ کہ کسی مخصوص قسم کے گروہ سے وابستہ ہونے میں۔ زندگی کا یہی اصول ہے جسے اللہ نے مذہب اسلام میں مقرر کیا ہے اور اسی کو قرآن نے ''اسلام'' کا نام دیا ہے۔'' (ترجمان القرآن)

قرآنِ حکیم کے الفاظ وَلِلّٰهِ الۡمَشۡرِقُ وَالۡمَغۡرِبُ قبلہ کی حکمت اور فلسفہ کو واضح کرتے ہیں اور اس بات پر زور دیتے ہیں کہ کعبہ اور یروشلم (بیت المقدس) کے مابین عبادت گاہ کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں امتیاز عطا کیا ہے اور اُنہیں قبلہ بنایا ہے۔ اگر وہ چاہتا تو وہ کسی اور جگہ کو قبلہ بنا دیتا۔ پس مقرر شدہ قبلہ کی طرف رُخ کرنا اور اُس کی طرف رُخ کرنے کی فضیلت اور اُس کا ثواب اپنی صحیح روح اور حکمت میں حکمِ الٰہی کی اطاعت ہے جو کعبہ کے معمار حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت کا بنیادی اصول ہے۔ (''معارف القرآن'' مفتی محمد شفیع' جلد اوّل' صفحہ ۳۶۴)

تحویلِ قبلہ: اس کی تفصیل یوں ہے کہ امام الانبیاء ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہجرتِ مدینہ کے بعد ساڑھے سولہ ماہ تک قبلہ (یروشلم کے بیت المقدس) کی طرف رُخ کر کے نمازیں پڑھتے رہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قدرتی طور پر یہ خواہش تھی کہ اُن کے قبلہ کو مکہ کے کعبہ میں بدل دیا جائے جسے اُن کے جدِ اعلیٰ سیّدنا ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا۔ ایک مرتبہ جب آپ مدینہ کے مضافات میں نمازِ ظہر کی امامت فرما رہے تھے تو آپ کا چہرہ انور تحویلِ قبلہ کی امید میں وحی کے انتظار میں آسمان کو پھر گیا۔ آپ ﷺ کا یہ من موہنا انداز آپ کے خالق و مالک کو ایسا پیارا اور محبوب لگا کہ اس انداز کا ذکر کرنے کے بعد آپ کی آرزو کو بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ یہ کہتے ہوئے پورا کر دیا گیا:

قَدۡ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجۡهِكَ فِى السَّمَآءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبۡلَةً تَرۡضٰٮهَا فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ (البقرۃ: ۱۴۴)

''(اے حبیب!) ہم بار بار آپ کے رُخِ انور کا آسمان کی طرف پلٹنا دیکھ رہے ہیں، سو ہم ضرور بالضرور آپ کو اُسی قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جس پر آپ راضی ہیں۔ پس آپ اپنا رخ ابھی مسجدِ حرام کی طرف پھیر لیجئے۔'' (۲ : ۱۴۴)

قبلہ سے کعبہ کو تبدیلی لوگوں کی اس لحاظ سے سخت آزمائش ہے کہ کون نبی علیہ السلام کی بے مثال عظمت و توقیر کو تسلیم کرتا ہے: سورۃ البقرۃ کی ذیل کی آیت (۱۴۳) زیرِ نظر مسئلہ پر روشنی ڈالتی ہے:

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَى عَقِبَيْهِ

''اور آپ پہلے جس قبلہ پر تھے ہم نے اُسے صرف اس لئے مقرر کیا تھا کہ ہم (پرکھ کر) ظاہر کر دیں کہ کون (ہمارے) رسول ﷺ کی پیروی کرتا ہے (اور) کون اپنے اُلٹے پاؤں پھر جاتا ہے۔'' (۲:۱۴۳)

مذکورہ بالا آیت میں رسالت کے منصبِ ارفع و اعلیٰ کو سمجھایا جا رہا ہے کہ اگر ہم چاہتے تو یروشلم (بیت المقدس) کے قبلہ کو حبیب علیہ السلام کی مدینہ کو ہجرت کے ساڑھے سولہ مہینے بعد تک بھی قبلہ رکھتے لیکن ہم پرکھنا چاہتے تھے کہ کون کعبۃ اللہ کی طرف رُخ کرتا ہے اور کون رُخِ مصطفیٰ کی طرف پھرتا ہے۔ کون اپنی نسبتِ ایمان کو آپ ﷺ کی نسبت سے قائم رکھتا ہے اور کون پیچھے پھر کر اُدھر منہ کرتا ہے۔ دیکھنا یہ چاہتے تھے کہ لوگوں نے ایمان کا مرکز آیا فقط کعبے کو بنایا ہوا ہے یا آپ ﷺ کی ذاتِ مقدسہ کو بنایا ہوا ہے۔ اگر مرکز و محورِ ایمان ذاتِ مصطفیٰ ہو تو کعبہ بھی اس میں آ گیا اور ایمان بچ گیا لیکن اگر مرکز و محورِ ایمان ذاتِ مصطفیٰ کی بجائے کعبہ ہو تو کعبہ کی طرف رخ کرنے کے باوجود بھی ایمان گنوا دیا۔ اگر نسبتِ ایمان غلامیِ مصطفیٰ ہو تو کعبہ سے منہ پھیر کر بھی ایمان باقی رہا اور اگر نسبتِ ایمان کی شناخت کعبۃ اللہ ہو، رسول نہ ہو تو کعبے کی طرف منہ کر کے بھی بے ایمان رہے۔

ایمان کی پہچان کرائی جا رہی ہے کہ بے شک کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھیں مگر کعبے کو اس لئے قبول کریں کہ رُخِ مصطفیٰ اُدھر ہے۔ ایک ہے رسول کو اس لئے قبول کرنا کہ وہ اس کعبے کا رسول ہے کہ اُس کا طواف کرتا ہے اور بہ وقتِ نماز اُدھر کو رُخ کرتا ہے۔ دوم یہ کہ کعبے کو اس لئے قبول کرنا کہ رسول اُس کا اشارہ کرتا ہے۔ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ پہلی صورت میں کعبے کی وجہ سے رسول کو ماننے سے کوئی بھی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا۔ وہ کلمہ گو ہو کے بھی کافر ہی رہا اور جو یہ کہے کہ میں کعبہ کو اس لئے مانتا ہوں کہ مصطفیٰ نے یہ کعبہ دکھایا، وہ سچا، سُچا اور پکا مسلمان ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے ''مکتوبات'' میں ذکر فرمایا کہ میں رب کو ربِّ محمد کی وجہ سے مانتا ہوں اور اُسے اس لئے رب مانتا ہوں کہ رسول ﷺ نے اُس کی پہچان کرائی ہے۔ چنانچہ آیتِ مذکورہ میں بھی یہی نکتہ سمجھایا جا رہا ہے کہ حبیب! جس نے آپ کو کعبے کی وجہ سے مان رکھا ہے، اُس کی مسلمانی ہمیں منظور نہیں ہے۔ مسلمان وہ ہے جو کعبہ کو آپ کی وجہ سے مانتا ہے۔ چنانچہ کعبہ کی نسبت بھی نسبتِ مصطفیٰ کے بغیر قبول نہ کی تو باقی نسبتیں کیا رہیں؟ کعبے کا تعین بھی رضائے رسول سے ہوا۔ تعینِ کعبہ سے بڑھ کر اسلام میں کوئی اور آزمائش کا رکن نہیں تو گویا سارا دین حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رضا پر استوار ہو گیا۔

رکوع کے آغاز میں فرمایا کہ بے وقوف وہ جو عملِ پیغمبر پر اعتراض کرے' خواہ وہ کتنا پڑھا لکھا اور دانشور کیوں نہ ہو اور عقلمند وہ جو درِ مصطفیٰ پر اپنی عقل کو جھکا دے!

اِس مقام کی خاص بات جو قرآنِ حکیم میں کسی اور جگہ نظر نہیں آتی' یہ ہے کہ اپنے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اللہ کو کتنی محبت ہے اور اُس کا کتنا اِکرام ہے۔ تحویلِ قبلہ کی آرزو میں حضور علیہ السلام کے رُخِ انور کا بار بار آسمان کو پلٹنے کا ذکر فرمایا تو ایک دفعہ ہی اُس کا ذکر کرنا کافی ہو جاتا کہ محبوب! ہم نے قبلہ کو کعبہ سے بدل دیا مگر ایک نہیں' پورے آٹھ مرتبہ ایک ہی رکوع میں قبلہ بدلنے کا ذکر فرمایا کہ جتنی بار ذکر کروں' میرا حبیب خوش ہوگا اور اُس کے سینے میں ٹھنڈک محسوس ہوگی کہ میرا خالق و مالک میرا کتنا اِکرام فرما رہا ہے۔ اُدھر مسلمانوں سے فرمایا جا رہا ہے: وَحَیْثُ مَا کُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوْهَکُمْ شَطْرَه' (یعنی اے میرے حبیب کے غلامو! جہاں کہیں بھی تم ہو' میرے محبوب علیہ السلام کی رضا کی خاطر اپنی نمازوں میں رُخ اُدھر پھیر لیا کرو)

خدا کی رضا چاہتے ہیں دو عالم　　　　خدا چاہتا ہے رضائے محمد

معلوم ہوا کہ سارا اسلام' سارا ایمان' مسلمانی کا کمال اور ساری عبادات کی قبولیت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رضا میں ہے۔ اور یہ نکتہ بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ کعبہ یا قبلہ سے حضور علیہ السلام کی عظمت نہیں بلکہ حضور علیہ السلام سے قبلہ و کعبہ کی عزت بنی۔ مرضیِ مولا یہی تھی کہ دونوں قبلوں کو اپنے حبیب کے سجدوں سے عزت دی جائے۔ یہ بھی نکتہ ہے کہ رضائے مصطفیٰ ﷺ نے کعبہ کو پورے عالم کا مسجود الیہ بنا دیا۔

صحیح بخاری شریف میں حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آنجناب ﷺ کی آخری علالت کے ایام میں اِنَّ اَبَا بَکْرٍ کَانَ یُصَلِّیْ یعنی جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نماز کی امامت کراتے تھے۔ ایک دن آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے رب کے حضور غلاموں کا اجتماع دیکھنا چاہا۔ مشتاقانِ دید تین دن سے دیدارِ مصطفیٰ کو ترس گئے تھے۔ ختمی مرتبت آقا نے حجرۂ مبارکہ کا پردہ اٹھایا تو نگاہیں بہ حالتِ نماز بے ساختہ رُخِ انور کی طرف اٹھ گئیں۔ اس موقع پر عقل نے کہا ہوگا کہ نگاہیں اُدھر نہ کرنا۔ عشق نے کہا ہوگا اِدھر کعبہ ہے تو اُدھر کعبے کا بھی کعبہ ہے۔ عقل نے کہا ہوگا کہ اگر چہرے پھر گئے تو نمازیں قضا ہو جائیں گی۔ عشق نے کہا ہوگا

نمازیں جو قضا ہوں پھر ادا ہوں　　　　نگاہوں کی قضائیں کب ادا ہوں

نمازیں بھول گئیں' کعبے کی سمتیں بھول گئیں۔ یہ وہی صحابہ تھے جن کے سامنے وحیِ الٰہی کا نزول ہوا تھا: قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِی السَّمَآءِ کہ کعبے تو بنتے ہی مصطفیٰ کی ادا سے ہیں۔ اُن کی رضا مل گئی تو کعبہ بھی مل گیا اور کعبے والا بھی مل گیا اور اگر وہ رضا نہ ملی تو کچھ بھی نہ ملا' چاہے کعبہ کے غلاف کے نیچے اُس سے چمٹ کر اپنے رب کو کیوں نہ منا رہے ہوں۔ تو دیدارِ مصطفیٰ سے کئی صحابہ کرام وجد میں آ گئے۔ یہ تو مقتدیوں کا حال تھا۔ سیّدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مصلّےٰ چھوڑ دیا اور پچھلی صف میں آنا چاہا۔ عبادت کبریاء کی ہو رہی ہے' ادب مصطفیٰ کا ہو رہا ہے۔ وہ مصطفیٰ جن پر عبادتِ الٰہی کے دوران سلام نہ بھیجیں تو نماز نہ ہو اور کئی عارفین آگے چلتے جب ہیں جب درِ مصطفیٰ

سے سلام کا جواب پا لیتے ہیں۔

''کعبہ محبوبِ حقیقی کے حسن و جمال کا مظہر ہے: محبوب کے لئے انسان کے جذبات یہ ہیں کہ وہ اُسے دیکھنا' چومنا' گلے سے لگانا اور اُس کا زیادہ سے زیادہ قرب حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس ثابت شدہ حقیقت سے یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے کہ کعبہ کیوں بنایا گیا؟ وہ اس طرح کہ فانی محبوب کے برعکس اللہ تعالیٰ محبوبِ حقیقی ہے۔ اہلِ ایمان اُس سے زبردست اور بہت زیادہ محبت کرتے ہیں۔ قرآنِ پاک نے بھی اُن کی محبت کی لازوال کیفیت اور شدید ترین صورت کو بڑے واضح انداز میں بیان فرمایا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (البقرة: ۱۶۵)

''اور جو لوگ ایمان والے ہیں وہ (ہر ایک سے بڑھ کر) اللہ سے بہت ہی زیادہ محبت کرتے ہیں۔''

''جب ثابت ہو گیا کہ وہ محبت کرتے ہیں تو پھر محبت کے تقاضوں کا پیدا ہونا بھی ضروری ہوا۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ محبت تو ہو اور اس کے اظہار کے لئے عاشق کے دل میں وہ جذبات پیدا نہ ہوں جو اُس کی بے قرار محبت کا نشان اور نمائندہ ہوتے ہیں اور دیکھنے والوں پر اِس حقیقت کو واضح کر دیتے ہیں کہ اُسے اپنے محبوب سے والہانہ محبت ہے۔''

''اللہ کے ساتھ شدید محبت کے نتیجے میں اہلِ ایمان کے اندر بھی یہ جذبات پیدا ہو سکتے تھے کہ وہ اپنے محبوبِ حقیقی کا دیدار کریں' اُسے چومیں' اُس کے ساتھ چمٹیں' اُس کے آگے لوٹ پوٹ ہوں اور اپنی بے قرار محبت کا اظہار کریں۔ لیکن یہ تقاضے وہاں پورے ہو سکتے ہیں جہاں محبوب مادّی گوشت پوست کا بنا ہوا ہو' اُس کے سڈول اعضاء اور حسین ہاتھ پاؤں ہوں اور وہ نظر آنے والا ایک محسوس پیکر ہو جسے چھوا جا سکے اور جس کے ہاتھ پاؤں کو چوما جا سکے' تسکینِ جسم و جان کے لئے گلے لگایا جا سکے۔ مگر محبوبِ حقیقی تو ان تمام چیزوں سے پاک ہے۔ اُس کا مادّی جسم نہیں کہ عاشق اُسے چھولے' اُس کے ہاتھ پاؤں نہیں کہ اُنہیں آگے بڑھ کر وارفتگی کے عالم میں چوم لے' مجسم نہیں کہ ٹکٹکی باندھ کر اُسے پیار و محبت سے دیکھ لے۔''

''لہٰذا دریں حالات عاشقوں کے جذبات کی تسکین کے لئے محبوبِ حقیقی نے کعبہ معظّمہ کا محسوس پیکر عطا کر دیا اور اپنی محبت کا نمائندہ بنا کر کھڑا کر دیا کہ جو کچھ محبوبِ حقیقی کے ساتھ کرنا چاہتے ہو' جو راز و نیاز اور پیار و محبت کی باتیں اُس کے ساتھ کرنے کے متمنی ہو' وہ اُس کے ساتھ کر لو۔ ہاتھ چومنا چاہتے ہو تو حجرِ اسود کو بوسہ دے لو' گلے سے لگنا چاہتے ہو تو ملتزم کے ساتھ چمٹ جاؤ' دیدار کرنا چاہتے ہو تو کعبہ کے سامنے بیٹھ جاؤ اور اُسے محبت سے دیکھ لو۔ تمہیں تسکین نصیب ہو گی اور وہی قرار ملے گا جو محبوب کو دیکھ کر حاصل ہوتا ہے۔''

''گویا کعبہ معظّمہ محبوبِ حقیقی کے حسن و جمال' غلبہ و اقتدار اور رعب و جلال کا مظہرِ کامل ہے تاکہ وہ جسم و اعضاء سے پاک محبوب کی نمائندگی کرے اور عاشقوں کو سکون و قرار بخشے اور اُن جذبات کی تسکین کا سامان کرے جو سچے عاشقوں کے دل میں محبوب کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔ کعبہ شریف کی اِسی نمائندہ حیثیت کی وجہ سے اُس کی تکریم

ضروری قرار دی گئی ہے اور عزت وتکریم کے آداب دوسرے مقامات سے مختلف اور بہت زیادہ رکھے گئے ہیں تاکہ واضح ہو کہ کعبہ محبوبِ حقیقی کے جمال وکمال کا نمائندہ ہونے کی وجہ سے بڑے اعزاز وشرف والا ہے اور عام مادّی عمارات کی طرح نہیں۔'' (ماہنامہ ''منہاج القرآن'' لاہور' دسمبر ۲۰۰۷ء' صفحہ ۱۹).

''حرمتِ کعبہ معظّمہ کے تقاضے: حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ راوی ہیں:

لَاتَسۡتَقۡبِلُوا الۡقِبۡلَةَ وَلَا تَسۡتَدۡبِرُوۡهَا لِغَائِطٍ اَوۡ بَوۡلٍ (نسائی: ۲۱)

''بول وبراز کے وقت قبلہ کی طرف پیٹھ یا منہ نہ کیا کرو۔''

''اللہ پاک کے حکم سے جس شے کی طرف رخ کرکے اللہ کی عبادت کی جائے' اُسے ''قبلہ'' کہتے ہیں۔ کعبہ کی یہ شان وفضیلت ہے کہ اللہ پاک نے اُس کی طرف رخ کرکے اپنی عبادت کرنے اور نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ اس لحاظ سے کعبہ شریف' اللہ کو ماننے والوں کا ''قبلہ'' ہے اور بڑی فضیلت واہمیت کا مالک ہے۔ قبلۂ عالم ہونے کے حوالے سے اُس کی سب سے بڑی اور اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں عبادت کا اجر وثواب بے حد وحساب عطا کیا جاتا ہے۔''

''(۱) حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما ارشاد فرماتے ہیں کہ سرکارِ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

مَنۡ اَدۡرَكَ رَمَضَانَ بِمَكَّةَ فَصَامَه' وَقَامَ مِنۡهُ مَا تَيَسَّرَ لَه' كَتَبَ اللّٰهُ لَه' مِائَةَ اَلۡفِ شَهۡرِ رَمَضَانَ

''جس شخص کو مکّہ مکرّمہ میں رمضان نصیب ہوا' اُس نے وہاں روزے رکھے اور جتنا ممکن ہو سکا' اُس کا قیام کیا تو اللہ تعالیٰ اُسے ایک مہینے کے بدلے میں ایک لاکھ مہینوں کا ثواب عطا فرماتا ہے۔'' (ابنِ ماجہ: ۲۲۵)

''(۲) طوافِ کعبہ کے وقت ہر چکر پورا ہونے پر حجرِ اسود کو بھی چومنا ہوتا ہے۔ زبردست ہجوم کے باعث بعض اوقات یہ عمل بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسے میں نادان مگر پہلوان قسم کے لوگ کمزور لوگوں کی پروا نہیں کرتے اور لوگوں کو روندتے ہوئے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ رحمتِ عالم ﷺ نے ایسے نادانوں کو ہدایت دیتے ہوئے کعبہ کی عظمت کو یوں آشکار کیا ہے:

''جس شخص نے شدید گرمی میں ننگے سر طواف کیا اور کسی کو اذیّت دئے بغیر حجرِ اسود کو بوسہ دیا' اِس دوران وہ ذکر ودعاء میں بھی مصروف رہا' اللہ تعالیٰ اُسے ہر قدم پر ستر ہزار نیکیاں عطا فرماتا ہے' اُس کے ستر ہزار گناہ مٹاتا ہے اور ستر ہزار درجات بلند کرتا ہے۔''

''(۳) سرزمینِ حرمِ کعبہ ہی کی یہ شان ہے کہ اللہ تعالیٰ یہاں ایک نیکی کا ثواب ایک لاکھ گنا زیادہ دیتا ہے۔ چنانچہ ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ نماز' ایک روزے کا ثواب ایک لاکھ روزہ' ایک صدقے کا ثواب ایک لاکھ صدقات' ایک تسبیح کا ثواب ایک لاکھ تسبیحات اور ایک ختمِ قرآن کا ثواب ایک لاکھ ختمِ قرآن کے برابر عطا فرماتا ہے۔

''عام حالات میں اور عام مقامات پر انسان خواہ کتنا زور لگالے' وہ نیکیوں کے اِتنے انبار نہیں لگا سکتا اور نہ

ہی عبادات کے اتنے ذخائر جمع کر سکتا ہے جو سرزمینِ حرم کعبہ میں ایک ایک نیکی سے جمع کر لیتا ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے ہے تاکہ انسان کو حرمتِ کعبہ سے آگاہی ہو اور وہ دل و جان سے اُس کا احترام کرنے لگ جائے اور اُس کے بے مثال مقام و مرتبے کو سمجھے اور ہر موقع پر اُس کی حرمت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھے اور کوئی ایسی مذموم حرکت نہ کرے جو اُس کی حرمت و عظمت کے منافی ہو۔''

''اسی وجہ سے گزشتہ ادوار میں جن افراد نے اُس کی حرمت کو پامال کیا یا اُس کی کوشش کی، قدرت کے نظر نہ آنے والے ہاتھوں نے اُنہیں مروڑ کر رکھ دیا اور اس طرح شکنجے میں کسا کہ وہ عبرت کا نشان بن کر رہ گئے۔ ابرہہ اور اُس کے گرانڈیل ہاتھیوں اور ساتھیوں کا حشر قرآنِ پاک میں بھی مذکور ہے اور کتب احادیث و تاریخ میں بھی ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے حرمتِ کعبہ کی پروانہ کرنے والوں کے عبرتناک انجام کا پتہ چلتا ہے۔'' (ماہنامہ ''منہاج القرآن''، لاہور، جنوری ۲۰۰۸ء، صفحات ۱۳، ۱۴)

کعبہ معظّمہ کا طول و عرض اور ارتفاع وغیرہ : سلطان بشیر محمود کہتے ہیں کہ سیّد اشرف اللہ حسینی مرحوم نے اپنی کتاب ''ہینڈ بک آن حج، عمرہ و زیارۃ'' کے صفحات ۱۹۷ تا ۲۰۲ میں کعبہ معظّمہ کی درجِ ذیل انجینئرنگ کی تفاصیل دی ہیں:

''کعبہ معظّمہ 15.25 میٹر بلند، 11.58 میٹر شرقی جانب، 11.93 میٹر غربی جانب، 10.22 میٹر شمالی جانب اور 10.13 میٹر جنوبی جانب ہے۔ اُس کا نمایاں امتیازی مقام ''مقامِ ابراہیم'' ہے جو شرقی جانب سے 11.10 میٹر ہے۔ چاہِ زمزم مطاف کے فرش کے نیچے واقع ہے۔ چاہِ زمزم کے وسط سے حجرِ اسود تک کا فاصلہ 20.60 میٹر ہے جبکہ مقامِ ابراہیم سے 12.45 میٹر کا فاصلہ ہے۔ حجرِ اسود جنوب مشرقی کونے میں 1.5 میٹر کی اونچائی پر لگایا گیا ہے۔ کعبہ معظّمہ مکمل مستطیل شکل میں نہیں ہے بلکہ وہ غیر منظم اخبار چہ (tabloid) کی شکل کا ہے۔ مکعبی شکل میں ہونے کی وجہ سے اُسے ''کعبہ'' کا نام دیا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی واضح علامت ہے۔ کعبہ معظّمہ کے چاروں طرف عظیم مسجد الحرام ہے جس میں 1990ء میں آخری توسیع کے بعد 605000 حجاج کرام سما سکتے ہیں اور اس کا رقبہ 309000 مربع میٹر ہے۔''

کعبہ معظّمہ کے مادّی و روحانی فوائد : جب کعبہ معظّمہ کی تعمیر مکمل ہو چکی تو ابراہیم علیہ السلام نے اُس پتھر پر کھڑے ہو کر بہ حکمِ الٰہی تمام جہانوں کے لوگوں کو اس گھر کے حج اور طواف کرنے کی دعوت دیتے ہوئے اعلان کیا جو صرف عبادتِ الٰہی کے لئے مخصوص کیا گیا تھا۔ اس دعوت و اعلان کا ذکر قرآن مجید یوں کرتا ہے:

وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ O

''اور (اے ابراہیم!) لوگوں میں حج کا اعلان کر دو، لوگ تمہارے پاس پیدل بھی آئیں گے اور دُبلی پتلی اونٹنیوں پر بھی جو دُور دراز راہوں سے پہنچی ہوں گی۔'' (۲۷ : ۲۲)

'' تمہارے پاس آئیں گے '' کا مطلب یہ ہے کہ لوگ تمہارے اعلان پر جوق در جوق کعبہ کو بہ غرض حج کھچے چلے آئیں گے۔ جو آنے والے ہیں' ہر حال میں آئیں گے خواہ سواری نصیب نہ ہو' پیدل ہی آنا پڑے۔ سواری کے جانور ملیں مگر مشقتِ سفر سے وہ ہلکان ہو ہو جائیں' یا مسافت بہت دُور دراز کی طے کرنا پڑے۔ یَاْتُوْكَ رِجَالًا وَعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ کا مطلب یہ ہوا کہ سفرِ حج پیدل بھی اور سواری پر بھی دونوں طرح جائز ہے۔

'' ابراہیم علیہ السلام کو اس اعلان کا حکم اُس وقت ملا تھا جب دنیا نہ تار سے واقف تھی' نہ ٹیلیفون سے' نہ مائیکروفون سے اور نہ لاؤڈ سپیکر سے۔ لیکن ابراہیم علیہ السلام نے خدا معلوم کس لاہوتی اسٹیشن سے اور کس ملکوتی میٹر پر اس پیام کو نشر کیا کہ روئے زمین کے ہر برِّ اعظم کے ایک ایک گوشہ میں' سمندر کے ایک ایک جزیرہ میں یہ آواز پہنچ گئی اور ہزاروں برس گزر چکے کہ خلقت آج تک اس بے آب و گیاہ سرزمین کی طرف کھنچی چلی آتی ہے۔ مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ جب آپ کو یہ حکم ملا تو عرض کیا کہ اے پروردگار! میری آواز کو سب کے کانوں تک کون پہنچائے گا؟ فرمایا کہ آواز دینا تمہارا کام ہے اور اُس کا ہر کہ و مہ تک پہنچا دینا ہمارا کام ہے۔ اِتنا مؤثر' بلیغ' سچا جواب مخلوق کی زبان سے نکل ہی نہیں سکتا تھا' خالق ہی کے لئے ممکن تھا۔'' (تفسیر ماجدی اردو' صفحہ ۶۸۲' نوٹ : ۳۸)

سورۃ الحج کی آیت ۲۸ میں اُن فوائد کا اجمالی طور پر اشارہ کیا گیا جن سے حجاج کرام مستفید ہوتے ہیں:

لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَارَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ○

'' تاکہ وہ اپنے فوائد (بھی) پائیں اور (قربانی کے) مقررہ دنوں کے اندر اللہ نے جو مویشی چوپائے اُنہیں بخشے ہیں' اُن پر (بہ وقتِ ذبح) اللہ کے نام کا ذکر بھی کریں' پس تم اس میں سے خود (بھی) کھاؤ اور خستہ حال محتاج کو (بھی) کھلاؤ۔'' (۲۲ : ۲۸)

فوائد سے مراد اصلاً تو منافعِ اُخروی ہیں مثلاً حج' عمرہ اور رضائے الٰہی۔ اور تبعاً دنیاوی بھی مثلاً تجارت' البتہ دنیاوی منافع کو مستقل مقصود بنا لینا ممنوع ہے۔ اسلام کے ہر رکن اور عبادت کی طرح حج کے فوائد و مصالح بھی بیشمار ہیں۔ انفرادی و شخصی بھی' ملی و اجتماعی بھی اور مادّی و روحانی بھی۔ احکامِ الٰہی کی تعمیل بجائے خود سب سے بڑی روحانی لذت ہے۔ پھر اسلام کے مولد' سردارِ اسلام کے وطن اور اُن تمام مقامات کی زیارت جس سے اسلام و سردارِ اسلام دونوں کی اوّلین تاریخ وابستہ ہے' کس درجہ سبق آموز' ولولہ انگیز و مؤثر ہو سکتی ہے! دنیاوی و ملّی حیثیت کو لیجئے تو مسلمانانِ عالم کے درمیان تبادلۂ خیالات اور یک جہتی پیدا کرنے کے لئے' نیز بین الاقوامی تجارت و سیاست کے لئے اس سالانہ عالمگیر اجتماع سے بہتر ذریعہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ اور افراد کو جو تجربے اس سفر کے دوران ہو جاتے ہیں وہ سب اس کے علاوہ ہیں۔ غرض بین الاقوامی اخوّت کے استحکام اور اس کی نشو و نما کے لئے حج ایک بہترین ذریعہ ہے جسے اُس حکیمِ مطلق نے اپنے بندوں کے بے حد و بے حساب فوائد کے لئے فرض کیا ہے۔

۲۹۳۵ (کعبۃ اللہ ۔۔۔ KA'BAH)

سلطان بشیر محمود لکھتے ہیں کہ اگر کسی وقت کسی وجہ سے طواف کعبہ رک جائے تو فضا میں پرندے کعبہ کا طواف کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

''کعبہ معظمہ کا ایک اور قابلِ توجہ پہلو یہ ہے کہ کعبہ کے گرد گھڑی کی سوئی کے مخالف (Anticlockwise) طواف اجرامِ فلکی کا اپنے مرکزی نقطوں کے گرد گردش یا طواف کرنے سے مشابہ ہے۔ نہ صرف اجرامِ فلکی بلکہ ایٹم کے برقیے (Electrons) بھی اُسی طرح طواف کرتے ہیں۔ یہ بات واقعی حیران کن ہے کہ جیسے حجاج کرام کعبہ کے گرد طواف کرتے ہیں' اُسی طرح ایٹم کے برقیے بھی اپنے مرکزی نقطے (Nucleus) کے گرد' سیارگان اپنے سورجوں کے گرد' ستارے اپنے سیاراتی مراکز کے گرد اور کہکشائیں اپنے ہی مراکز کے گرد طواف کرتی ہیں۔ اس طرح کعبہ وحدتِ انسانی کا اُسی طرح آفاقی نشان اور علامت ہے جس طرح ستارے اپنے سیارگان کے لئے ہیں۔ روحانی لوگ کعبہ کو چار دانگ عالم کو اُسی طرح منوّر کرتا ہوا دیکھتے ہیں جس طرح ایک روشن ستارے سے روشنی اپنے ارد گرد کو جگمگاتی ہے۔ یہ روشنی اُن لوگوں کے دلوں تک پہنچتی ہے جو اللہ پر ایمان رکھتے ہوئے نماز میں کعبہ کو اپنا رُخ کرتے ہیں۔'' (''کتابِ زندگی'' ۔۔ سلطان بشیر محمود' صفحات ۴۲۸'۴۲۹)

کعبہ کے گرد چند اہم مقامات اور اصطلاحات

(۱) باب السلام: یہ مسجد الحرام کا دروازہ ہے۔ مسجدِ حرام میں ابتدائی پہنچ کے وقت اِس دروازے سے داخل ہونا مسنون اور پسندیدہ ہے۔

(۲) حجرِ اسود: یہ جنت سے اتارا ہوا کالا پتھر ہے۔ اپنے نزول کے وقت یہ دودھ کی طرح سفید تھا لیکن لوگوں کے گناہوں نے اسے سیاہ کر دیا۔ اس کے گرد چاندی کا فریم ہے اور یہ کعبہ کے جنوب مشرقی کونے میں کعبہ کی قدِ آدم دیوار میں نصب کیا گیا ہے۔

(۳) حطیم: اِس قطعہِ زمین کو ایک قدِ آدم دیوار محیط ہے اور یہ کعبہ کے بالکل متصل اُس کے شمالی جانب واقع ہے۔ طواف کے دوران حطیم کو شامل کرنا ضروری ہے کیونکہ حطیم بھی کعبہ کا حصّہ ہے۔ زمانہ جاہلیت میں جب قریشِ مکہ نے کعبہ کی از سرِ نو تعمیر شروع کی تو حلال فنڈ کی کمی کی وجہ سے اُنہوں نے اِس حصّہ کی تعمیر روک دی۔

(۴) حرم: مکّہ اور اس کے گرد تھوڑا سا رقبہ سرزمینِ حرم کہلاتا ہے۔ اُس کی حدود نمایاں طور پر نشان زدہ کر دی گئی ہیں۔ حدودِ حرم میں شکار کرنا' درخت کاٹنا اور جانوروں کو چَرانا حرام ہے۔

(۵) استلام: حجرِ اسود کو بوسہ دینا اور اُسے ہاتھوں سے چھونا' یا اُسے صرف چھونا یا رکنِ یمانی کو چھونا استلام کہلاتا ہے۔ اسی طرح لوگوں کے ازدحام کی وجہ سے اگر حجرِ اسود تک رسائی لوگوں کو اذیت دئے بغیر ممکن نہ ہو

تو ہر چکر کے اختتام پر حجرِ اسود کے مقابل ہو کر حجرِ اسود کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو چوم لینا استلام کہلاتا ہے۔

(۶) اضطباع : اِحرام کا بالائی کور دائیں بغل سے نکالتے ہوئے اُسے بائیں کندھے پر ڈالنا۔

(۷) مطاف : مسجدِ حرام میں کعبہ کے گرد طواف کرنے کی جگہ مطاف کہلاتی ہے۔

(۸) مقامِ ابراہیم : بابِ کعبہ کے بالمقابل یہ ایک پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر ابراہیم علیہ السلام نے اپنے فرزند اسمٰعیل علیہ السلام کی ہمراہی میں کعبہ کی تعمیر کی تھی۔ مقامِ ابراہیم مطاف میں شامل ہے۔

(۹) مسجدِ حرام : کعبہ کے اردگرد مسجد کا نام مسجد حرام ہے۔ اس کا ذکر سورۃ البقرۃ' سورۃ التوبہ اور سورۃ الفتح میں آیا ہے۔

(۱۰) ملتزم : حجرِ اسود اور بابِ کعبہ کے درمیان کا حصہ ملتزم کہلاتا ہے۔ ملتزم سے بغل گیر ہو کر اللہ سے اُس کی رحمت کا خواستگار ہونا سنت رسول اللہ ﷺ ہے۔

(۱۱) مروہ : یہ کعبہ کے شمال مشرقی کونے میں ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے۔ سعی اِسی جگہ ختم ہوتی ہے۔

(۱۲) مسعٰی : سعی کرنے کی جگہ مسعیٰ کہلاتی ہے۔ کوہ صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنے کو سعی کہتے ہیں۔

(۱۳) میزابِ رحمت : یہ حطیم میں گرتا ہوا پانی کا پرنالہ ہے۔ اس کے نیچے کھڑے ہو کر اللہ سے التجائیں اور دعائیں کرنی چاہئیں کہ یہاں کی دعا مستجاب ہوتی ہے۔

(۱۴) رکنِ عراقی : عراق کی جانب کعبہ کا شمال مشرقی کونہ رکنِ عراقی کہلاتا ہے۔

(۱۵) رکنِ شامی : ملکِ شام کی طرف کعبہ کا شمال مغربی کونہ رکنِ شامی کہلاتا ہے۔

(۱۶) رکنِ یمانی : ملکِ یمن کی جانب کعبہ کا جنوب مغربی کونہ رکنِ یمانی کہلاتا ہے۔

(۱۷) سعی : صفا اور مروہ پہاڑیوں کے مابین سات چکر ایک خاص انداز میں لگانا سعی کہلاتا ہے۔

(۱۸) شوط : کعبہ کے گرد سات چکروں میں سے ہر ایک کو شوط کہتے ہیں۔ صفا اور مروہ کے درمیان سعی

کے وقت' صفا سے مروہ تک کا ایک چکر ''شوط'' کہلاتا ہے۔اسی طرح مروہ سے صفا کو واپسی کا چکر دوسرا شوط کہلائے گا اور اسی طرح ساتوں چکر۔

(۱۹) صفا: کعبہ کے قریب جنوب کی جانب ایک چھوٹی سی پہاڑی جہاں سے سعی شروع ہوتی ہے۔

(۲۰) تلبیہ : درج ذیل الفاظ کا ادا کرنا تلبیہ کہلاتا ہے:
لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبّيك لَاشَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْك اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَك وَالْمُلْكَ لَاشَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ

(۲۱) طواف : کعبہ کے گرد چکر لگانا طواف کہلاتا ہے۔(ایک طواف سات چکروں پر مشتمل ہوتا ہے)

(۲۲) چاہ زمزم : کعبہ کے قریب مسجد الحرام میں یہ ایک کنواں ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے اپنے پیغمبر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور اُن کی والدہ سلام اللہ علیہا کی خاطر پانی کے چشمہ کی صورت میں ظاہر کیا۔ یہ بغیر کسی اختتام وانقطاع کے صدیوں سے اب تک جاری ہے۔متعدد غذائی موادات کے ساتھ اس کا پانی صحت کے لئے بہت مفید ہے۔

سوال (1): جب اسلام بت پرستی کے خلاف ہے تو مسلمان اپنی نماز میں کعبہ کے آگے کیوں جھکتے ہیں؟ کیا یہ کعبہ کی پرستش نہیں؟

جواب : کعبہ قبلہ ہے یعنی وہ ایک سمت ہے جس کی طرف مسلمان اپنی نمازوں میں رُخ کرتے ہیں۔ اگرچہ مسلمان نماز کے دوران کعبہ کو رُخ کرتے ہیں لیکن وہ اس کی پرستش نہیں کرتے بلکہ وہ تو صرف خدائے واحد کی پرستش کرتے ہیں۔ ہمارے موقف کی تائید میں کچھ مدلل دلائل حسب ذیل ہیں :۔

(۱) اسلام اتحاد و یک جہتی کو پروان چڑھانے پر یقین رکھتا ہے : مثلاً یہ ممکن ہے کہ کچھ مسلمان جنوب کی طرف اور کچھ شمال یا مشرق و مغرب کی طرف رخ کرکے نماز پڑھیں۔ مسلمانوں کو ایک خدائے واحد کی عبادت میں متحد کرنے کے لئے اُنہیں کسی ایک سمت یعنی کعبۃ اللہ کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا گیا۔ اگر کچھ مسلمان کعبہ کے غربی جانب رہتے ہوں تو وہ نماز میں مشرق کی طرف رخ کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر وہ کعبہ کے شرقی جانب رہتے ہوں تو وہ نماز میں مغرب کی طرف رخ کرتے ہیں۔

(۲) کعبہ دنیا کے نقشے کے مرکز میں ہے : دنیا کا نقشہ کھینچنے میں مسلمانوں نے پہل کی ہے۔ انہوں نے نقشہ کھینچنے میں جنوب کو اوپر اور شمال کو نیچے دکھا کر کعبہ کو دنیا کے مرکز میں واقع ثابت کیا ہے۔ بعد میں مغربی نقشہ

نگاروں نے اس کے الٹ یعنی شمال کو اوپر اور جنوب کو نیچے دکھاتے ہوئے نقشہ کشی کی ۔ الحمد للہ! کعبہ پھر بھی دنیا کے نقشے کے مرکز ہی میں رہا۔''

''(۳) کعبہ کے گرد طواف میں ایک خدائے واحد کے ہونے کی طرف اشارہ ہے : جب مسلمان مکۃ مکرمہ کی مسجد الحرام میں جاتے ہیں تو وہ کعبہ کے گرد طواف کرتے ہیں ۔ یہ عمل ایک خدائے واحد پر ایمان اور اس کی پرستش پر دلالت کرتا ہے کیونکہ طواف کے ہر چکر کا ایک ہی مرکز ہے' لہٰذا اللہ سبحانہ' وتعالیٰ صرف اور صرف ایک ہی ہے جو معبودِ برحق ہے اور عبادت کئے جانے کے لائق ہے ۔''

''(۴) عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث مبارکہ : حجر اسود کے بارہ میں صحابیِ رسول حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی طرف ایک حدیث منسوب ہے جنہوں نے حجرِ اسود کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

''اے حجرِ اسود! مجھے معلوم ہے کہ تو ایک پتھر ہے جو نہ کسی کو فائدہ اور نہ نقصان دے سکتا ہے ۔ اگر میں نے اپنے پیغمبر ﷺ کو تجھے چومتے اور بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں کبھی تجھے نہ چھوتا۔'' (صحیح بخاری (جلد دوم: کتاب الحج' حدیث نمبر ۶۷۵)

''(۵) صحابہ کرام نے کعبہ پر کھڑے ہو کر اذانیں دی ہیں : پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دورِ مبارک میں صحابہ کرام نے کعبہ پر کھڑے ہو کر اذانیں دیں ۔ جو لوگ مسلمانوں پر کعبہ کی پرستش کا الزام لگاتے ہیں' اُن سے پوچھا جائے کہ کون سا بت پرست اُس بُت پر کھڑا ہوتا ہے جس کی وہ پرستش کرتا ہے ۔'' ("Answers to Non-Muslims' Common Questions about Islam" ... Dr. Zakir Naik, pp. 42, 43)

(۶) کعبہ کو رخ کرنے کے پس پردہ حکم اور رضائے الٰہی ہے : تمام دلائل میں یہ دلیل بڑی ہی محکم اور مضبوط ہے کہ قادرِ مطلق اللہ نے جو کسی کے آگے جوابدہ نہیں' مسلمانوں کو اپنی نمازوں میں کعبہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم فرمایا ۔ اگر ایک آدمی پتھروں سے تراشے ہوئے بت کی پرستش کرتا ہے تو وہ یقیناً پکا کافر ہے کیونکہ اُس کے اس عمل کے پیچھے رضائے الٰہی شامل نہیں ۔ لیکن اگر کوئی آدمی نماز میں کعبہ کو رخ کرتا ہے (یعنی کعبہ کے آگے سجدہ کرتا ہے) اور کعبہ بھی تو پتھروں کا بنا ہوا ہے' تو وہ مسلمان ہی ہے کیونکہ وہ یہ عمل اپنے رب کے حکم کی تعمیل میں کر رہا ہے ۔ اس طرح اگر کوئی شخص گنگا و جمنا دریاؤں کے پانیوں کو ثواب سمجھ کر پئے تو اُس کا یہ عمل اُسے کافر کر دے گا جبکہ آبِ زمزم کا پینا کارِ ثواب ہے کیونکہ اس کے پیچھے رضائے الٰہی کارفرما ہے جبکہ اوّل الذکر عمل کے پس پردہ رضائے الٰہی نہیں ۔

سوال (2) : مکّہ اور مدینہ کے مقدس شہروں میں غیر مسلموں کو داخلے کی اجازت کیوں نہیں؟

جواب : غیر مسلموں کی ایسی پابندی میں مندرجہ ذیل نکات بطورِ استدلال مسئلہ کی وضاحت میں ہیں:

''(١) تمام باشندوں کو فوجی چھاؤنی کے علاقے میں جانے کی اجازت نہیں ہوا کرتی: فرض کریں میں ہندوستان کا باشندہ ہوں لیکن اس کے باوجود مجھے فوجی چھاؤنی جیسے ممنوعہ علاقوں میں داخلے کی اجازت نہیں ہے۔ ہر ملک کے کچھ علاقے ایسے ہوتے ہیں جہاں اُس ملک کا عام شہری داخل نہیں ہوسکتا۔ صرف اُنہی لوگوں کو جن کا اندراج فوج میں ہے یا اُن لوگوں کو جن کا تعلق ملکی دفاع سے ہے' فوجی چھاؤنی کے علاقوں میں جانے کی اجازت ہوتی ہے۔ اسلام تمام دنیا کے تمام لوگوں کے لئے آفاقی مذہب ہے' جس کے فوجی چھاؤنی کے علاقے مکۃ مکرّمہ اور مدینہ منورہ کے دو مقدس شہر ہیں۔ اُن میں صرف مسلمانوں کے داخلے کی اجازت ہے۔ عام شہری کے لئے اور غیر مسلمین کے لئے بھی اس پابندی پر اعتراض کرنا غیر معقول بات ہوگی۔''

''(٢) مکّہ مکرّمہ اور مدینہ منورہ میں داخلے کا ویزا (سرکاری اجازت نامہ): (الف) جب کبھی کوئی آدمی غیر ملک میں سفر کرنا چاہتا ہے تو اُسے سب سے پہلے ویزا یعنی اُس ملک میں داخلے کے لئے درخواست دینا پڑتی ہے۔ ویزا جاری کرنے میں ہر ملک کے اپنے قواعد وضوابط ہوتے ہیں۔ جب تک اُن کے تقاضے پورے نہ ہوں' وہ ویزا جاری نہیں کرتے۔

''(ب) بالخصوص تیسری دنیا کے لوگوں کو ویزا جاری کرنے میں سب سے زیادہ متشدد ملک امریکہ ہے۔ ویزا حاصل کرنے کے معاملہ میں اُن کی کئی شرائط اور مطالبات پورے کرنے ہوتے ہیں۔''

''(ج) سنگاپور کے مہاجرتی فارم (Immigration Form) پر یہ درج ہوتا ہے کہ ''منشیات کے آدمی کے لئے موت کی سزا ہے۔'' اگر میں سنگاپور جاؤں تو مجھے اُن کے قواعد کی پابندی کرنا ہوگی اور میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ موت کی سزا بہیمانہ سزا ہے لہٰذا وہ مجھے منظور نہیں ہے۔ اگر میں اُن کے قواعد وشرائط کی پابندی کروں' تبھی مجھے اُن کے ملک میں داخلے کی اجازت ملے گی۔''

''(د) مکّہ مکرّمہ اور مدینہ منورہ میں کسی آدمی کے داخلے کے لئے ابتدائی شرط اپنی زبان سے لَآ اِلٰــــہَ اِلَّااللّٰہُ مُحَمَّد'' رَّسُوْلُ اللّٰہِ کا اقرار کرنا ہے۔'' (ڈاکٹر ذاکر نائک' صفحات ۴۴' ۴۵)

''(ڈ) اس ممانعت کا مدلّل ثبوت سورۃ التَّوبہ کی یہ آیت نمبر ۲۸ ہے:

یٰاَ یُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِکُوْنَ نَجَس'' فَلَا یَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا

''اے ایمان والو! مشرکین تو سراپا نجاست ہیں' سو وہ اپنے اِس سال کے بعد (یعنی فتحِ مکہ کے بعد ۹ ھ سے جب حضرت ابوبکرؓ کی زیرِ امارت حج ہوا تھا) مسجدِ حرام کے قریب نہ آنے پائیں۔'' (۹ : ۲۸)

نجاست سے مراد نجاستِ عقائد ہے نہ کہ نجاستِ اعیان واجسام۔ فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ اہلِ کتاب بھی اس حیثیت سے مشرکین ہی کے حکم میں داخل ہیں۔

(۱۱۲) کرما (KARMA)

''بدھ مت اور ہندومت کے مطابق پچھلے جنم کے اعمال کا نام ''کرما'' ہے۔(اوکسفورڈ انگلش اردو ڈکشنری۔۔شان الحق حقی، صفحہ ۸۶۷)

''بدھ مت اور ہندومت میں ''کرما'' کسی آدمی کے ایک جنم میں اُن اعمال و افعال کا مجموعہ ہے جن کی تقدیر کے اچھے بُرے ہونے کا فیصلہ اُس کے اگلے جنم میں ہوتا ہے۔'' (اوکسفورڈ ایڈوانسڈ لرنرز ڈکشنری، صفحہ ۶۴۷)

''عقیدۂ تناسخ (آواگون Reincarnation) اِس عقیدے کا نام ہے کہ کسی آدمی کی موت کے بعد اُس کی روح ایک نئے جسم کو منتقل ہو جاتی ہے۔'' (ایضاً، صفحہ ۹۸۴)

''کرما'' سنسکرت زبان کا لفظ ہے جس کا معنیٰ عمل یا حرکت ہے۔ ہندوستانی مذاہب میں ''کرما'' کو ''قانونِ علت و معلول'' (Law of Cause and Effect) کے طور پر سمجھا جاتا ہے۔ کرما یا عقیدۂ تناسخ کے مطابق، آدمی مستقبل میں اُن اعمال کے نتائج سے دوچار ہوگا جو اُس نے زمانہ ماضی میں کیئے تھے۔ خیر اور اچھائی سے خیر اور اچھائی اور بدی سے بدی ہی ملے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس صورتِ حال میں آدمی آج ہے، وہ اُس کے زمانہ ماضی کا نتیجہ ہے۔ عقیدۂ کرما کے مطابق ''ماضی'' سے مراد وہ زندگی ہے جو آدمی نے موجودہ زندگی سے پہلے گزاری تھی اور ''مستقبل'' سے مراد اس دنیا میں واپسی کی (دوسری) زندگی ہے جو اُس کی موت کے بعد شروع ہوگی۔ بہ الفاظِ دیگر اس عقیدہ کے مطابق لوگ اس دنیا میں مختلف اجسام میں آتے ہیں اور یہ کہ موت اور دوبارہ جنم لینے کا یہ عمل غیر منقطع طور پر جاری و ساری رہتا ہے۔

''تناسخ (آواگون) کے ذریعے ہمیں اپنے اعمال و افعال کا اخلاقی اور روحانی معاوضہ دیا جانا ممکن ہے۔ اگلی زندگی میں خوشی و مسرت کا انحصار اچھے اور راست عمل پر ہے اور ہر مرد و زن اپنے عمل کا خود ذمّہ دار ہے۔ موت سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ دوبارہ جنم لینے کے تسلسلِ عمل سے لوگ اپنی خواہشات کو پا لیتے ہیں اور مسلسل تسکین حاصل کر لیتے ہیں۔ وہ دیوتا برہما میں رہتے ہیں۔ دعویٰ ہے کہ یہ عقیدہ ہند کے باسی کو قوت بخش رجائیت (Optimism) سے نوازتا ہے۔'' ("The History of Religions".. Prof. Dr. Gunay Turner, Prof. Dr. Abdurrahman Kucuk, pp. 91, 92) quoted in "Islam and Karma" by Harun Yahya, p. 21)

مثال کے طور پر وہ شخص جو اِس زندگی میں امیر اور کامیاب ہے، اُسے اپنی سابقہ زندگی میں اچھا ہونے کی وجہ سے دولت سے نوازا جاتا ہے۔ اسی طرح اس عقیدے کی رُو سے اگر کوئی شخص اس زندگی میں غریب و نادار، اپاہج اور ناکام ہے، اُس نے ضرور اپنی سابقہ زندگی میں برے کام کیئے ہوں گے جن کی وہ اب سزا بھگت رہا ہے۔

۲۹۴۱ (کرما یا عقیدہ تناسخ ۔۔۔KARMA)

قرآنِ مجید کا اس توہماتی عقیدے سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ یہ عقیدہ اُن فرضی حکایتوں (Myths)' اور خود اختراعی فلسفہ پر مبنی ہے جو عقل اور معقولیت کے خلاف ہیں اور اسے کسی بھی شہادت کی تائید حاصل نہیں اور یہ کہ اس کی توثیق کسی آسمانی صحیفہ یا کتاب نے نہیں کی۔

اس عقیدہ کے غلط اور غیر حقیقی پہلو اور اُن کا ردّ ذیل میں دیئے جاتے ہیں :

(i) ہوسکتا ہے کہ عقیدۂ تناسخ (کرما) لوگوں میں پُرکشش اخلاقی خصوصیات کو اختیار کرنے میں پُر اثر محرّک ثابت ہو، تاکہ وہ اس دنیا کے اگلے نئے جنم میں ممکنہ حد تک بہتر حالات سے مستفید ہوں۔ تاہم عقیدہ کرما پر یقین اور مختلف مذاہب کی طرف سے پروان چڑھائے ہوئے دوسرے توہماتی نظریات انسانی منطق، انسانی فطرت اور ضمیرِ انسانی کے خلاف ہیں۔ اس طرح ان مذاہب کے قوانین اور اعمال لوگوں کو ممکنہ حد تک اچھی اخلاقی صفات نہیں دے سکتے اور وہ انہیں سکون وطمانیتِ قلبی، اندرونی اعتماد یا خوشی و مسرت مہیا نہیں کر سکتے۔ اُن ممالک میں عام ناگفتہ بہ حالات اور بے انصافی جنہوں نے ان مذاہب کو قومی مذہب کے طور پر اپنایا ہے، اس حقیقت کے ثبوت کے لئے کافی ہیں۔''

''(ii) عقیدۂ کرما اُخروی زندگی کی نفی کرتا ہے اور دنیا میں نئے جنم پر یقین رکھتا ہے جس میں وُہی روح ایک نئے جسم میں داخل ہوتی ہے اور یہ چیز قرآنی تعلیمات سے بالکل متصادم ہے۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل آیت سے ثابت ہے کہ مرنے کے بعد کسی نے بھی اس دنیا میں دوبارہ نہیں آنا :

وَحَرَام'' عَلٰی قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَO (الانبیاء : ۹۵)

''اور جس بستی کو ہم نے ہلاک کرڈالا، ناممکن ہے کہ اُس کے لوگ (مرنے کے بعد) ہماری طرف پلٹ کر آئیں۔'' (۲۱ : ۹۵)

(۳) کرما کے عقیدہ کے مطابق لوگ اپنی پہلی زندگی میں اعلیٰ ترین اور عمدہ ترین اعمال کی بدولت بطور دیوتا کے دوبارہ جنم لے سکتے ہیں۔ یہ بات بھی غیر حقیقی اور خالصتاً مشرکانہ ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی غیر منقسمیت کا انکار اور اُس کے واحد ہونے کو چیلنج ہے۔ قرآنِ حکیم نے انتہائی جامع طور پر سورۃُ الاخلاص میں ایسے غلط نظریات کا ردّ کیا ہے۔

(۴) کرما (تناسخ) کے عقیدہ کی رُو سے موت کے بعد دوبارہ جنم لینے کا سلسلہ غیر منقطع طور پر جاری رہتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کو موت کا ذائقہ لاتعداد حد تک چکھنا ہوگا اور اسی طرح اُس کے دوبارہ جنم لینے کا سلسلہ بھی یونہی رہے گا۔ قرآنِ حکیم نے پھر اس بات کا ردّ کرتے ہوئے کہا کہ ہر آدمی کو موت کا ذائقہ ایک دفعہ چکھنا ہے:

لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى (اَلدُّخان : ۵۶)

''اُس (جنت) میں وہ موت کا ذائقہ نہیں چکھیں گے سوائے (اس) پہلی موت کے (جو گزر چکی ہوگی)۔

۲۹۴۲ (کرما یا عقیدہ تناسخ ۔۔۔KARMA)

(۵) کرما کے عقیدہ پر ایمان رکھنے کے لئے اس بات پر یقین رکھنا ضروری ہے کہ آدمی کو موت سے نہیں ڈرنا چاہئے کیونکہ انسان اپنے دوسرے جنم میں اپنی خواہشات کی تکمیل کو حاصل کر لے گا۔لیکن موت اور دوزخ سے بے خوف ہو جانے کا یہ کوئی صحیح راستہ نہیں ہے۔ایسے خوف سے بچنے کے لئے قرآنِ حکیم نے اللہ تعالیٰ سے بہ خلوص دل لَو لگانے کی تعلیم دی ہے جو قرآنِ حکیم کی تعلیمات اور سنتِ نبوی سے تمسک کرنے سے حاصل ہو گی۔

(۶) اُخروی زندگی کا انکار عقیدہ تناسخ (کرما) کا اہم عقیدہ ہے کیونکہ اس عقیدے کی رُو سے لوگوں کو ہر وقت اچھے یا برے اعمال کے مطابق نیا جنم مختلف ذاتوں میں ملتا رہتا ہے۔ہندوستانی سماج میں ذات پات کا نظام ابھی تک رائج ہے۔لوگ اس دنیا میں جو کچھ کرتے رہیں' وہ اپنی ذات نہیں بدل سکتے۔یہ بات بھی صحیح انصاف اور صحت مند معقولیت کے خلاف ہے' اور قرآنی تعلیمات سے بھی متصادم ہے جس کی رُو سے اللہ کے نزدیک عزت کا معیار عملِ صالح اور تقویٰ ہے (سورۃ الحُجُرات:۱۳)۔اسلام ذات پات پر قطعاً یقین نہیں رکھتا۔

(۷) عقیدہ تناسخ (کرما) کی رُو سے ''اچھے کرما'' کی بدولت ایک آدمی اس دنیا میں آتے وقت ہر دفعہ بلند تر ذات میں جنم لے گا اور بالآخر وہ برہمن اور پادری جیسی اعلیٰ ترین ذات میں جنم لے گا۔عقیدہ یہ ہے کہ اگر کوئی آدمی اپنی زندگی میں برہمن کے طور پر اچھے کام کرتا ہے تو وہ دنیا میں دوبارہ نہیں آئے گا۔اس قسم کے آدمی کے لئے ''زندگی کا پہیہ'' مکمل چکر کاٹ چکا ہے اور اُسے نروانہ (نجات) حاصل ہو گیا ہے۔''نروانہ'' کے حصول کا مطلب یہ ہے کہ آدمی نے تمام دنیاوی خواہشات کو تج دیا ہے اور برہمن کی روح میں ضم ہو گیا ہے اور اُس کے ساتھ جُڑ گیا ہے جسے ''روحِ عالم'' کہا گیا ہے۔ہندوستانی مذاہب میں یہ روح کی انتہائی فرحت و مسرت کی بات ہے۔اس طرح اس غلط عقیدے کی رُو سے اگرچہ ایک آدمی اپنے ہر دفعہ پیدا ہونے کے وقت اچھے کام کرے تب بھی اُس کی اخروی زندگی پر منتج نہیں ہو گی اور وہ واپس ہو کر برہمن کی روح کے ساتھ جُڑ جائے گا۔

بدھ مت کے کچھ ذرائع میں ہمیں اُن کی موت کے متعلق یہ معلومات ملتی ہیں :

''آدمی خواہ جنت میں یا دوزخ کے کسی طبقے میں دوبارہ جنم لے' اِن جگہوں میں دنیا کی طرح وجود کی شکلیں عارضی ہیں اور دائمی نہیں ہیں۔ہندو مت کے مطابق آدمی ان جگہوں پر جتنا عرصہ رہتا ہے' وہ اُس کے اچھے یا برے عمل پر منحصر ہے جو اُس نے زندگی میں کیا ہے۔جنت اور جہنم عارضی وجود کی حالت کے سوا کچھ نہیں جس میں انسان اپنی زندگی میں کیے گئے اچھے یا برے عمل کی سزا یا جزا پاتا ہے۔'' ("The Relation of the Idea of Karma in Indian Religions with the idea of Reincarnation".. Dr. Ali Ihsan Yitik, pp. 130, 131 quoted in Harun Yahya's "Islam & Karma" at page : 30)

اس کے برعکس قرآنِ حکیم اس عقیدے کی نفی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جنت اور جہنم دائمی ہیں اور عارضی نہیں

ہیں اور دونوں کو ہمیشہ ہی کی بقا ہے ۔ جنت میں جانے والے لوگ اُسے کبھی نہیں چھوڑیں گے' اسی طرح جہنم میں جانے والے کچھ لوگ وہاں ہمیشہ رہیں گے ۔ دوزخ کو عارضی ٹھکانہ ماننا توہماتی عقیدہ ہے اور فی الحقیقت اُس کا وجود دائمی ہے جیسا کہ قرآن مجید نے جگہ جگہ خَـالِـدِیْـنَ فِیْهَـا اَبَـدًا (وہ وہاں جنت یا جہنم میں ہمیشہ رہیں گے) کے الفاظ استعمال کئے ہیں ۔'

''(۸) کرما کے عقیدے کا انتہائی غیر منطقی پہلو یہ نظریہ ہے کہ پورا کائناتی نظام خودکار ہے اور اس کے پیچھے کوئی دستِ قدرت کارفرما نہیں ۔ بہ الفاظ دیگر اس میں خالق کے وجود کا انکار ہے جس نے اس دنیا اور جنت اور جہنم کی تخلیق کی اور جو لوگوں کو اُن کے اعمال کی جزا یا سزا دیتا ہے ۔ یہ عقیدہ انتہائی غیر منطقی اور کلی طور پر ناقابلِ تسلیم ہے ۔تخلیقی قوّت کی عدم موجودگی میں جو انصاف کے ساتھ حاکمیت کر رہا ہے' یہ دعویٰ کہ لوگ از خود جنت اور جہنم کو چلے جائیں گے' ہمارے ذہن اور ضمیر کی آواز کے لئے ناقابلِ تسلیم ہے ۔''

علاوہ ازیں اِن عقائد سے قطع نظر کرما کا عقیدہ اس بات کی بالکل وضاحت نہیں کرتا کہ جنت اور جہنم خالق کے وجود کے بغیر کیسے معرضِ وجود میں آگئے ۔ اُن کے دعاوی محض عقائدِ باطلہ ہیں جن کی بنیاد روایات اور توہمات پر ہے ۔''

مختصر یہ کہ کرما (تناسخ) کا عقیدہ کچھ تو اچھی اخلاقی اقدار کا مجموعہ ہے جو قرآنی تعلیمات کے موافق ہیں اور کچھ غلط پہلو بھی ہیں جو نہ تو قرآن سے اور نہ ہی انسانی عقل یا انسانی ضمیر سے ہم آہنگ ہیں ۔

مذہبی تجسس کا حتمی مقصد : انسان میں اللہ کے حلول ہونے کا اسلام مخالف ہے ۔ اسلام عقیدۂ تناسخ کو غیر معقول اور گستاخی پر مبنی قرار دیتا ہے ۔ غیر معقول اس لئے کہ یہ عقیدہ ایک لامتناہی ہستی کو فانی ہستی میں بروئے کار لاتا ہے ۔ اور گستاخ اس لئے کہ وہ اللہ کی اعلیٰ ترین' عظیم ترین ہستی اور اس کی بے مثلیت پر حملہ آور ہے ۔ کرما کا نظریہ اپنے منطقی جواز کی حقیقت کو دو متعلقہ نظریات میں پاتا ہے : یعنی 'پہلے گناہ کا نظریہ' جس میں انسانیت کی تذلیل ہے اور دوسرا نظریہ یہ کہ انسان کی اصل بدی ہے' جو روحانی ارتقاء کے لئے انسان کی ہر کوشش کو خیالی اور واہمے پر مبنی بنا دیتی ہے ۔ یہ دونوں نظریات انسان کی روحانی اور اخلاقی ترقی کے لئے بہت نقصان دہ ہیں ۔ وہ ناامیدی اور شک و ارتیاب کو جنم دیتے ہیں ۔

مندرجہ بالا عقائد کو رد کرتے ہوئے قرآنِ حکیم انسان کی بے گناہ پیدائش کو یوں بیان کرتا ہے :

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ (الرّوم: ۳۰)

''پس آپ اپنا رخ اللہ کی اطاعت کے لئے کامل یکسوئی کے ساتھ قائم رکھیں ۔ اللہ کی (بنائی ہوئی) فطرت (اسلام) ہے جس پر اُس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے (اُسے اختیار کرلو) اللہ کی پیدا کردہ (سرشت) میں تبدیلی نہیں ہوگی ۔'' (۳۰ : ۳۰)

سورۃ الرّوم کی مندرجہ بالا آیت (۳۰) کی تصدیق میں سورۃ الشّمس کی یہ آیات ہیں:

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَاO قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَاO وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَاO (۸۔۱۰)

''پھر اُس نے اُسے اُس کی بدکاری اور پرہیزگاری (کی تمیز) سمجھا دی۔ بے شک وہ فلاح پا گیا جس نے اس (نفس) کو (رذائل سے) پاک کرلیا (اور اس میں نیکی کی نشوونما کی)۔ اور بے شک وہ نامراد ہو گیا جس نے اُسے (گناہوں میں) ملوّث کرلیا (اور نیکی کو دبا دیا) [۹۱ : ۸۔۱۰]

یعنی قلب میں جو نیکی کا رجحان ہے یا بدی کا میلان ہوتا ہے' دونوں کا خالق اللہ ہی ہے۔ گو اوّل الذکر کا القاء بہ واسطہ فرشتہ ہوتا ہے اور ثانی الذکر کا القاء بہ واسطہ شیطان ہوتا ہے۔ اس میں اس مسیحی عقیدہ کی تردید آ گئی کہ انسان فطرۃً گنہگار ہی بنا کر پیدا کیا گیا ہے۔ اس سے اگلی آیات میں بتایا گیا ہے کہ انسان کی طبیعت میں یہ القاء کر دیا گیا کہ نجات وفلاح اُس کے لئے ہے جس نے نفس کو راہِ فجور سے پاک کر کے طریقِ طاعت وتقویٰ اختیار کر لیا اور سزا بھی اُس کے لئے ہے جس نے اپنے کو فجور سے مغلوب ہو جانے دیا۔ دوسرے لفظوں میں نجات وسزا دونوں کی کوشش انسان کے اپنے اختیار کی چیز ہے۔ اس میں ہندو اور بدھ عقیدہ کی تردید ہو گئی کہ ہر عمل انسانی پچھلے جنم کے ''کرم'' کا ناگزیر نتیجہ ہوتا ہے اور اس طرح انسان اس سے جکڑا ہوا ہے۔'' (ماجدی اردو' ص ۱۱۹۷)

''انسان کا اللہ کی طرف عروج'' روحانی سفر یا دینی تجسس کو شامل ہے۔ اس کے حصول وارتقاء کے متعلق ہم قرآن حکیم سے درج ذیل رہنمائی پاتے ہیں۔

روحانی لحاظ سے انتہا کا غلط کار آدمی روحانی جمود میں رہتا ہے جس کے متعلق قرآن فرماتا ہے:

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا (الانعام: ۱۲۲)

''بھلا وہ شخص جو مردہ (یعنی ایمان سے محروم) تھا پھر ہم نے اُسے (ہدایت کی بدولت) زندہ کیا اور ہم نے اُس کے لئے (ایمان ومعرفت کا) نور پیدا فرمایا۔ (اب) وہ اس کے ذریعے (بقیہ) لوگوں میں (بھی روشنی پھیلانے کے لئے) چلتا ہے' اُس شخص کی مانند ہو سکتا ہے جس کا حال یہ ہو کہ (وہ جہالت اور گمراہی کے) اندھیروں میں (اس طرح گھرا) پڑا ہے کہ اُس سے نکل ہی نہیں سکتا۔'' (۶ : ۱۲۲)

''جب اُس کا دل ودماغ اللہ تعالیٰ کے حضور سرِ تسلیم خم کرنے کی دولت بے بہا کو سمجھ جاتا ہے (سورۃ الزُّمَر : ۲۲) اور وہ دین میں تجسس کرنا شروع کرتا ہے تو وہ روحانی طور پر نئے سرے سے زندہ ہو جاتا ہے اور اُسے نئی توانائی بخشی جاتی ہے جیسا کہ سورۃ الانعام کی آیتِ بالا (۱۲۲) میں بیان ہوا اور اللہ تعالیٰ سے اُس کے روحانی قرب میں اضافہ ہو جاتا ہے جیسا کہ سورۃ العَلَق میں ارشادِ باری تعالیٰ ہوا:

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ [اے حبیبِ مکرّم!) آپ سربسجود رہیے اور (ہم سے مزید) قریب ہوتے جایئے]۔ (۹۶:۱۹)

اور جتنا اس قرب میں اضافہ ہوتا ہے' خدا پرست اور خدا پسند زندگی کی ہم آہنگی میں اُتنا ہی اضافہ ہوجاتا ہے اور وہ ہم آہنگی جتنی بڑھتی ہے تو رحمتِ الٰہی اُس پر ایسا نور نچھاور کرتی ہے جس کی روشنی میں وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے (سورۃ الانعام :۱۲۲)۔ پھر وہ اُس روشنی کی مدد سے اپنے روحانی حج کو جاری رکھتا ہے اور اس طرح وہ زیادہ سے زیادہ تقدّس کا حصول کرتا رہتا ہے اور اللہ اور اس کے درمیان مترنم ہم آہنگی ہوجاتی ہے۔ یہاں تک کہ اُس کا مقدّریوں جاگ اٹھتا ہے کہ رب اُسے فرماتا ہے:

يَاأَيَّتُهَا النَّفسُ الْمُطْمَئِنَّةُO ارْجِعِيْ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةًO فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْO وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ O (الفجر : ۲۷۔۳۰)

''اے اطمینان پاجانے والے نفس! تو اپنے رب کی طرف اِس حال میں لوٹ آ کہ تو اُس کی رضا کا طالب بھی ہو اور اُس کی رضا کا مطلوب بھی (گویا اُس کی رضا تیری مطلوب ہو اور تیری رضا اُس کی مطلوب)۔ پس تو میرے (کامل) بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت (قربت و دیدار) میں داخل ہو جا۔'' (۲۷۔۳۰ : ۸۹)

''دینی تجسس میں پیشقدمی کرنے والے ایک طرف تو معرفتِ الٰہی پالیتے ہیں تو دوسری طرف اُنہیں اپنے متعلق خدائے قدّوس کا نائب اور خلیفہ ہونے کا احساس ہوجاتا ہے جس سے وہ اپنی روح کی انتہائی ارفع و اعلیٰ آرزو یعنی قربِ الٰہی کو پالیتے ہیں جو انسان کا بلند ترین ممکنہ کارنامہ ہے۔'' ("The Qur'anic Foundations and Structure of the Muslim Society" Vol. 1, pp. 149, 150
... Dr. Muhammad Fazl-ur-Rahman

<u>کرما اور قرآنی اُخروی زندگی</u>: کرما کے عقیدہ کی رُو سے اگلی دنیا عارضی قیام کی جگہ ہے جبکہ قرآنِ حکیم ہمیں بتاتا ہے کہ جبکہ لوگ اس روئے زمین پر مختصر سے عرصہ کے لئے رہتے ہیں تو وہ اگلی دنیا کے ''حقیقی گھر'' میں ہمیشہ رہیں گے۔ عقیدہ تناسخ (کرما) کے برعکس قرآنِ حکیم مختلف مقامات پر اس دنیا کو عارضی بتاتا ہے۔ مثلاً:

(۱) وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ (الانعام : ۳۲)

''اور دنیوی زندگی (کی عیش و عشرت) کھیل اور تماشے کے سوا کچھ نہیں اور یقیناً آخرت کا گھر ہی اُن لوگوں کے لئے بہتر ہے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں۔'' (۳۲ : ۶)

(۲) وَمَاهٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ (العنکبوت:۶۴)

''یہ زندگی کھیل اور تماشے کے سوا کچھ نہیں اور حقیقت میں آخرت کا گھر ہی (صحیح) زندگی ہے۔'' (۲۹:۶۴)

۲۹۴۶ (کرما یا عقیدہ تناسخ ۔۔۔ KARMA)

چونکہ اُخروی زندگی پر ایمان لانا اسلام کی بنیاد ہے' اس لئے مسلمان کے لئے کسی ایسے نظریے یا عقیدے کے جواز کا تصور تک کرنا محال ہے جو اُخروی زندگی کا انکار کرے۔ ایسے لوگوں کے لئے قرآنِ حکیم کی تنبیہ ملاحظہ ہو:

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ O

''اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا' اُن کے اعمال برباد ہوگئے۔ اُنہیں کیا بدلہ ملے گا مگر وہی جو کچھ وہ کیا کرتے تھے۔'' (۷ : ۱۴۷)

جن لوگوں کو ڈر ہے کہ موت سے وجود ختم ہو جائے گا وہ جہنم میں اپنی بربادی پر واویلا کریں گے : اس کی وجہ کہ بعض لوگ عقیدۂ تناسخ کے غلط نظریہ پر یقین کیوں رکھتے ہیں' یہ ہے کہ اُنہیں اس بات کا خوف ہے کہ موت سے اُن کا وجود ختم ہو جائے گا۔ چونکہ وہ موت کے تصور ہی سے کپکپا جاتے ہیں' اس لئے وہ تناسخ (کرما) جیسے توہماتی عقیدوں کی طرف پناہ لیتے ہیں۔

لیکن قرآنِ مجید کے مطابق موت سے وجود ختم نہیں ہو جاتا بلکہ ہمارے جسموں کو موت اور فنا آتی ہے' اور روح کو ہمیشہ کی بقا ہے کیونکہ وہ غیر فانی ہے۔ روزِ محشر میں ہر جسم کو جزا یا سزا اِس زندگی میں کئے گئے اعمال کے تناسب سے منصفانہ طور پر دی جائے گی۔ اللہ اور اُس کے رسول کا انکار کرنے والوں کی سزا نارِ جہنم کی ابدی سزا ہوگی۔ وہ ہزاروں دفعہ موت اور اپنے وجود کے ختم ہونے کی آرزو کریں گے (سورہ فاطر: ۳۷' سورۃ النبا: ۴۰)۔ قرآنِ حکیم نارِ جہنم میں اُن کی کیفیت کی یوں نقشہ کشی کرتا ہے:

(۱) وَاِذَآ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا O (اَلْفُرقان : ۱۳)

''اور جب وہ اُس میں کسی تنگ جگہ سے زنجیروں کے ساتھ جکڑے ہوئے ڈالے جائیں گے' اُس وقت وہ اپنی ہلاکت کو پکاریں گے۔'' (۲۵ : ۱۳)

(۲) وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ O فَسَوْفَ يَدْعُوْا ثُبُوْرًا O وَّيَصْلٰى سَعِيْرًا O اِنَّهٗ كَانَ فِيْ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا O اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ O (الانشقاق (۸۴) : ۱۰۔۱۴)

''البتہ وہ شخص جس کا نامۂ اعمال اُس کی پیٹھ کے پیچھے سے دیا جائے گا' تو وہ عنقریب موت کو پکارے گا اور وہ دوزخ کی بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوگا۔ بے شک وہ (دنیا میں) اپنے اہلِ خانہ میں خوش و خرم رہتا تھا۔ بے شک اُس نے یہ گمان کر لیا تھا کہ وہ حساب کے لئے (اللہ کے پاس) ہرگز نہ لوٹے گا۔''

سورہ قٓ میں ہمیں روزِ حساب سے غافل اُن لوگوں کے متعلق بتایا گیا ہے جو موت سے ڈرتے ہیں:

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ O وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ O لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ O وَقَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ O اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ O مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيْبٍ O الَّذِيْ جَعَلَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَاَلْقِيٰهُ فِي الْعَذَابِ الشَّدِيْدِ O (قٓ : ۲۰۔۲۶)

''اور صور پھونکا جائے گا' یہی وعید کا دن ہے۔ اور ہر جان (ہمارے حضور اس طرح) آئے گی کہ اُس کا ایک ہانکنے والا (فرشتہ) اور (دوسرا اعمال پر) گواہ ہوگا۔ درحقیقت تو اِس (دن) سے غفلت میں پڑا رہا سو ہم نے تیرا پردہِ (غفلت) ہٹا دیا پس آج تیری نگاہ تیز ہے۔ اور اُس کے ساتھ رہنے والا (فرشتہ) کہے گا: یہ ہے جو کچھ میرے پاس تیار ہے۔ (حکم ہوگا:) پس تم دونوں (ایسے) ہر ناشکر گزار' سرکش کو دوزخ میں ڈال دو' جو نیکی سے روکنے والا ہے' حد سے بڑھ جانے والا ہے' شک کرنے اور ڈالنے والا ہے' جس نے اللہ کے ساتھ دوسرا معبود ٹھہرا رکھا ہے' سو تم اُسے سخت عذاب میں ڈال دو۔'' (۲۰۔۲۶ : ۵۰)

<u>روح غیر فانی ہے</u> : جیسا کہ اوپر بیان ہوا' موت کے بعد ہمارا جسم ہی فنا ہوتا ہے نہ کہ روح کیونکہ یہ اللہ کی طرف سے آئی ہے (سورۃ الحجر: ۲۹ ؛ سورہ صٓ: ۷۲) جو خود غیر فانی ہے۔ روح کی غیر فانی حقیقت کو سورہ یٰسٓ کی آیات ۳۱' ۳۲ اور ۵۳ میں بیان کیا گیا ہے (کہ وہ سب کے سب ہمارے حضور حاضر کئے جائیں گے)۔

مولانا جلال الدین رومی نے اپنی شہرہ آفاق ''مثنوی'' میں اِسی قرآنی نظریے کو یوں بیان کیا ہے :

گر زِ قرآں نقل خواہی اے حَروں   خواں جمیع هُمْ لَدَیْنَا مُحْضَرُوْنَ

مُحْضَرُوْن معدوم نَبُو و نیک بیں   تا بقائے او بجا دانی یقیں

''اے مغرور و متکبر شخص! اگر تجھے روح کے غیر فانی ہونے کا قرآنی ثبوت چاہئے تو اِنْ کُلٌّ ''لَّمَّا جَمِیْعُ لَّدَیْنَا مُحْضَرُوْن پڑھ کے دیکھ لے۔ خوب جان رکھ کہ رب کے حضور پیش ہونے والے فانی نہیں نہیں ہیں تا کہ روح کے غیر فانی ہونے کا یقین دلا دیا جائے۔'' (مثنوی' دفتر چہارم' صفحہ ۵۴)

<u>کرما اور قرآن مجید کا اِس دنیاوی زندگی کے متعلق نظریہ</u> : جیسا کہ اوپر بیان ہوا' کرما کا عقیدہ یہ ہے کہ جو لوگ اپنی زندگی میں اچھے کام کرتے ہیں' وہ انعام سے نوازے جائیں گے اور بد لوگوں کو سزا دی جائے گی۔ اس طرح معلوم یہ ہوتا ہے کہ کرما کا عقیدہ رکھنے والے لوگ اچھے رویّہ کا مظاہرہ کریں گے تا کہ اپنے مرنے کے بعد بدی سے دُور رہنے کی وجہ سے وہ اچھی اور عمدہ زندگی کے مستحق ہو جائیں۔

لیکن اِس کے باوجود کرما کے عقیدہ میں اُن لوگوں کے لئے کوئی زبردست محرک نہیں جو نیک بننے میں سنجیدہ نہیں کیونکہ اُنہیں یقین ہے کہ حیات و ممات کا سلسلہ لامتناہی (ختم نہ ہونے والا) ہے اور یہ کہ ہر دفعہ مرنے کے بعد اُنہیں لازمی طور پر نیا جنم ملے گا اور اس طرح اُنہیں مائل بہ اصلاح ہونے کے غیر مختتم (ختم نہ ہونے والے) مواقع ملتے رہیں گے۔ پس بدی کا ارتکاب کرتے ہوئے وہ یہ خیال کر سکتے ہیں کہ اگر اگلی دفعہ ہماری زندگی بدتر بھی ہوئی تو ہم اُس کے بعد اُس کی تلافی کر سکتے ہیں۔ ذرا غور تو کیجئے کہ غیر مستحکم بنیاد پر رکھا گیا ایسا عقیدہ لوگوں کو بدی سے کیسے دُور رکھ سکتا ہے؟

۲۹۴۸ (کرما یا عقیدہ تناسخ ۔۔۔KARMA)

قرآنی تعلیمات کی رُو سے حیاتِ انسانی کا اصل مقصد اپنے خالق کی عبادت و اطاعت کرنا ہے جو روزی رساں، نشوونما کرنے والا اور اپنی جملہ مخلوقات کا محافظ ہے (سورۃ الرَّعد: ۳۳ ؛ سورۃ الانبیاء: ۴۲)۔ اُس کی عبادت کا حکم کئی مقامات پر آیا ہے مثلاً سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۱ اور سورہ طٰہٰ کی آیت ۱۴ وغیرہ میں۔

حیاتِ انسانی کا ایک اور مقصد اُس دائمی زندگی کی تیاری کے لئے ہماری آزمائش کرنا ہے۔ ہمارا خالق و مالک ہمیں پیش نہادہ واقعات کے ذریعے یہ دیکھنے کے لئے آزماتا ہے کہ کون اُس کی رضا کی خاطر اچھے عمل کرتا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر ایک مرتبہ جب ہم نے موت کا ذائقہ چکھ لیا تو ہمارے لئے اس دنیا میں واپس آنے کا اور اپنے گناہوں کی تلافی کرنے کا کوئی امکان نہیں۔ قرآن مجید اس حقیقت کو یوں بیان کرتا ہے:

(۱) اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ O (العنکبوت : ۲)

’’کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ (صرف) اُن کے (اتنا) کہنے سے کہ ہم ایمان لے آئے ہیں چھوڑ دیئے جائیں گے اور اُن کی آزمائش نہ ہوگی۔‘‘ (۲ : ۲۹)

(۲) اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (الْمُلك : ۲)

’’جس نے موت اور زندگی کو (اس لئے) پیدا فرمایا کہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل کے لحاظ سے بہتر ہے۔‘‘ (۲ : ۶۷)

پس ہماری زندگی میں کوئی وقوع پذیر ہونے والا واقعہ امرِ اتفاقی یا توارد (Coincidence) نہیں ہوا کرتا۔ ہر ایک واقعہ ہماری آزمائش کے لئے اُسی کی تخلیق ہے۔ آدمی کی امارت یا شہرت کا یہ مطلب نہیں کہ اُسے یہ نوازش اُس کے اچھے اعمال کی بدولت عطا کی گئی ہے۔ نہیں اُسے تو خوشحالی اور شہرت کے ذریعے آزمایا جا رہا ہے کہ آیا وہ اُس کی اطاعت کے ذریعے اپنے رب کا شکر گزار بندہ بنتا ہے یا نہیں۔ اسی طرح کسی شخص کی غربت و ناداری اور مشکل زندگی میں ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنی سابقہ زندگی میں کی گئی برائیوں کی اب فصل کاٹ رہا ہے (جیسا کہ کرما کا عقیدہ ہے)۔ نہیں، وہ علیم وخبیر اللہ اُس پر یہ ثابت کر رہا ہے کہ آیا اُسے اپنے ناگفتہ بہ حالات کے مقابل اپنے خالق و مالک پر توکل اور بھروسہ ہے کہ نہیں تاکہ وہ اپنے کردار کی مضبوطی کا مظاہرہ کرے۔

انسان پر کی گئی تمام کی تمام نوازشات اور عطیات صرف اُس ذات کی طرف سے ہیں اور انسان کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ اپنی بعض (خداداد) خصوصیات کی وجہ سے اُن پر اپنا حق جتلائے اور اُنہیں غلط استعمال کرے یا کمزور و ناتواں اور بے سہارا لوگوں پر یہ سمجھتے ہوئے دستِ تظلّم دراز کرے کہ وہ مخلوقاتِ الٰہی میں اللہ کا پسندیدہ اور پیارا ہے۔ قرآن مجید اس کج، گمراہ کن اور غیر انسانی نفسیات کے خلاف یوں وعید سناتا ہے:۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِیْمٌ O (الانفال : ۲۸)

’’اور جان لو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد تو بس آزمائش ہی ہیں اور یہ کہ اللہ ہی کے پاس اجرِ عظیم ہے۔‘‘

۲۹۴۹ (کرمایا عقیدہ تناسخ ---KARMA)

غم و آلام، دکھ اور تکالیف اور ایثار زندگی کے لوازم ہیں اس لئے نہیں کہ وہ بذاتِ خود اچھے ہیں بلکہ اس لئے کہ وہ ہماری اُس آگ کی طرح تطہیر (صفائی) کرتے ہیں جو زرگر کی بھٹی میں (سونے کی) میل کچیل کو دُور کرنے کے لئے جلائی جاتی ہے۔ (عبداللہ یوسف علی، نوٹ:۳۴۲۳)

انسان کو آزمانے کے کئی الٰہی انداز ہیں۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۵۵ میں مختلف طریقوں میں آزمائش کو بیان کیا گیا ہے یعنی دشمن کا خوف پیدا کر کے، بھوک دے کر، کچھ مالوں اور جانوں اور پھلوں میں نقصان دے کر ہم تمہیں آزمائیں گے کہ ہماری رضا پر راضی رہ کر ہمارے بندے بنتے ہو کہ نہیں۔ اسی قسم کا مضمون سورہ آلِ عمران کی آیت ۱۸۶ میں بھی آیا ہے۔

دراصل تمام انسانی زندگی آزمائش اور ابتلاء کے سوا کچھ نہیں کہ انسان برائی سے کیسے بچتا ہے جسے پُرکشش، لبھانے والا، خوشنما اور پُرفریب اور بظاہر شیریں بنا دیا گیا ہے اور یہ کہ وہ ناموافق حالات میں کیسے صراطِ مستقیم اور صداقت پر جما اور ڈٹا رہتا ہے۔ (حق اور صداقت بظاہر پُرکشش نہیں بلکہ کچھ کے نزدیک وہ بے کیف اور اکتاہٹ پیدا کرنے والے ہیں لیکن انجام کار وہ میٹھے اور خوشگوار ہیں)۔ قرآن مجید نے اس حقیقت کی طرف ہماری توجہ دو بار دلائی ہے: ایک تو سورہ ھُود کی آیت ۷ میں، اور دُوسرے سورۃ المُلک کی آیت ۲ میں۔

<u>کرما کا نظریہ تقدیر بمقابل قرآنِ مجید</u>: کرما (تناسخ) کے عقیدہ کی رُو سے انسان کی قسمت اور تقدیر اُس کے اپنے ہاتھوں میں ہے جیسا کہ ("A History of Religions") "Dinler Trihi" میں بیان ہوا۔ اِس نظریہ کی رُو سے وہ ذات جس میں انسان پیدا ہوا اور جس طرح کی زندگی اُس نے گزاری، اس سب کا انحصار اُس کی سابقہ زندگی کے رویّہ پر ہے۔ بہ الفاظِ دیگر اُس کی موجودہ زندگی میں اُس کی جو بھی اچھی یا بُری تقدیر ہے، وہ اُس کی سابقہ زندگی میں کئے گئے اعمال کے تناسب سے ہے۔

اس کے برعکس قرآنِ مجید کا زور اس بات پر ہے کہ ماضی اور مستقبل دونوں زمانوں کے واقعات کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ لہٰذا یہ اللہ ہی ہے جو انسان کے پیدا ہونے سے پہلے اُس کی تقدیر قسمت کا فیصلہ کرتا ہے۔ ہمیں پیش آنے والے تمام واقعات اللہ کی مرضی سے ہوتے ہیں اور ہمارے تجربہ میں آنے سے پیشتر وہ اُن کا فیصلہ کر چکا ہوتا ہے:

مَا اَصَابَ مِنۡ مُّصِیۡبَۃٍ فِی الۡاَرۡضِ وَلَا فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّبۡرَاَهَا (الحدید)

''کوئی بھی مصیبت نہ تو زمین پر پہنچتی ہے اور نہ ہی تمہاری زندگیوں میں مگر وہ ایک کتاب میں (یعنی لوحِ محفوظ میں جو اللہ کے علمِ قدیم کا مرتبہ ہے) اس سے قبل کہ ہم اُن جانوں کو پیدا کریں (موجود) ہوتی ہے۔'' (۵۷ : ۲۲)

معلوم ہوا کہ جتنی بھی مصیبتیں انسان کے لئے مقدر ہیں خواہ وہ داخلی ہوں یا خارجی، سب ازل سے مقدر ہیں۔

۲۹۵۰ (کرما یا عقیدہ تناسخ ---KARMA)

لٰہذا پیش آنے والے مصائب پر ہمارا غم یا واویلا کرنا غیر دانشمندانہ بات ہے۔ سورۃ اَلْحَدِیْد میں ہمیں اِسی بات کی تعلیم دی گئی ہے اور فرمایا گیا ہے:

لِکَیْلاَ تَاْسَوْا عَلٰی مَافَاتَکُمْ وَلاَ تَفْرَحُوْا بِمَا آتَاکُمْ (الحدید: ۲۳)
''تا کہ تم اُس چیز پر غم نہ کرو جو تمہارے ہاتھ سے جاتی رہی اور اُس چیز پر نہ اِتراؤ جو اُس نے تمہیں عطا کی۔'' (۵۷ : ۲۳)

لاَ تَاْسَوْا یعنی رنج وغم حد سے زیادہ نہ کرو جو اطاعتِ الٰہی میں حائل ہو جائے۔ صدمۂ طبعی سے کوئی ممانعت مقصود نہیں۔ اسی طرح طبعی مسرت نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہے۔ اِتراہٹ تو اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب انسان کسی خوبی کو اپنے ذاتی استحقاق کا نتیجہ سمجھتا ہے۔ مفسرین کرام نے فرمایا کہ آیت میں غم کا علاج ہے تقدیر کے یاد کر لینے سے نیز یہ اشارہ ہے کہ اس میں ضرور ہماری ہی مصلحت ہوگی گو ہمیں تفصیل سے علم نہ ہو۔ تو جو لوگ مصائب پر شاکی اور حد سے زیادہ غم واندوہ کرتے ہیں تو ایک طرف تو وہ ذہنی تناؤ کا شکار ہوتے ہیں تو دوسری طرف اُن کے اعمال کا درجہ گراف نیچے کو گر جاتا ہے۔ کاش کہ وہ سمجھیں کہ قدرت کے نظام پر آہ وفغاں کرنے میں کسی کو یارا نہیں!

__''کرما'' اور اخلاقی اقدار/ضابطہ اخلاق__: کرما کے نظریہ کا انتہائی غیر منطقی اور نا قابلِ فہم پہلو یہ ہے کہ یہ علت ومعلول کا قانون ہے۔ اس عقیدہ کے مطابق اخلاقی اقدار کا وجود تو ہے لیکن اُن کا اطلاق کسی پر نہیں ہوتا۔ یہ نظریہ ایک عام آدمی کے لئے بھی نا قابلِ تسلیم ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ اس دنیا کی حکومتوں کے وضع کردہ قوانین کے پیچھے بھی اُن کے نفاذ کے لئے کوئی نہ کوئی مختار کاری (Authority) اور ایجنسی ہوتی ہے جس کے بغیر اُن کا نفاذ نہیں ہوسکتا۔ ''کرما'' کا یہ فضول اور غیر معقول فلسفہ آدمی کو کئی لاینحل مسائل کے گورکھ دھندے میں ڈال دیتا ہے جن میں سے ایک یہ کہ کروڑوں انسانوں کے اچھے اور برے اعمال وافعال کے مابین فرق اور تمیز کون کرے گا اور اُن کے اعمال کے مطابق اُن کی اگلی زندگی کو کون ترتیب دے گا۔ لٰہذا ''کرما'' کا عقیدہ کج فطرت انسانوں کا بنایا ہوا توہماتی عقیدہ ہے اور اُس کا ذکر کسی سچے مذہب میں نہیں ہے کہ خالق نے انسانوں کے لئے اسے منتخب کیا ہو یا قرآن مجید کے ذریعے ہمیں اس کی اطلاع دی گئی ہو جو دونوں جہانوں میں ہماری فلاح و بہبود اور نجات کا واحد ذریعہ ہے۔ سورۃ الحدید کی آیت ۵۷ میں بیان ہوا کہ قادرِ مطلق اللہ قانون کا دینے والا ہے اور وہی جانتا ہے کہ اس کا نفاذ کیسے کیا جائے تا کہ اس کے ذریعے امن وآشتی اور نظم وضبط کو نافذ کیا جا سکے۔

__اللہ تعالیٰ ہی عدل وانصاف کا منبع ہے نہ کہ کرما__: کرما کے عقیدہ کے مطابق ہم اپنے اگلے جنم میں اپنے اعمال کی سزا یا جزا پاتے ہیں۔ یعنی بدکار لوگ اپنے دوسرے جنم میں یا تو درخت یا غلام کے طور پر جنم لیتے ہیں اور راست رَو اور پارسا لوگ اپنی اگلی زندگی میں اعلیٰ مقام پاتے ہیں۔ لیکن یہ اچھے یا برے اعمال کا مکمل اور مبنی بر انصاف سزا وجزا کا عمل نہیں ہے اور نہ ہی یہ بات درست ہے کہ ہم اس دنیا میں کئی بار آئیں گے۔ ہم اس دنیا میں صرف ایک ہی مرتبہ آتے ہیں اور اس کے بعد حیاتِ حقیقی شروع ہوگی جو دائم اور ہمیشہ رہنے والی ہے۔

۲۹۵۱ (کرما یا عقیدہ تناسخ ۔۔۔KARMA)

جو کچھ ہم اپنی اس زندگی میں کرتے ہیں' رب تعالیٰ اس کی مکمل جزا یا سزا ہمیں دے دے گا اور کسی پر ذرّہ برابر ظلم نہیں ہوگا۔ اس حقیقت کو قرآن پاک میں متعدد جگہ بیان کیا گیا ہے مثلاً سورہ آل عمران کی آیت ۲۵ میں' سورۃ النسآء کی آیت ۴۰ میں' سورۃ الانعام کی آیت ۱۶۰ میں' سورہ یوسف کی آیت ۹۰ میں' سورۃ الکہف کی آیت ۴۹ میں' سورۃ الانبیاء کی آیت ۴۷ میں' سورۃ الحج کی آیت ۱۰ میں اور سورہ قٓ کی آیت ۲۹ میں وغیرہ۔

طمانیتِ قلبی اور ذہنی سکون کو کہاں پایا جائے ؟ زندگی کے غموں اور دکھوں سے نجات پانے کے لئے انسان ہمیشہ ذہنی سکون اور طمانیتِ قلبی کی تلاش میں رہا ہے جو حیاتِ انسانی کا اَنمول' قابلِ قدر اور بے مثل سرمایہ ہیں۔ زندگی کے دکھوں سے راہِ فرار پانے کا ایک سبب عقیدۂ کرما میں پناہ لینا ہے۔ بعض اوقات انسان غلط طور پر دھن دولت اور جاہ ومنصب کے پیچھے بھاگتا ہے اور بعض اوقات کسی حسینہ وجمیلہ دوشیزہ کو اپنی حتمی طمانیتِ قلبی اور ذہنی سکون کا ذریعہ سمجھتے ہوئے اپناتا ہے لیکن ان باتوں کو اپنے حتمی مقصد کے حصول میں بے ثمر پاتے ہوئے بالآخر وہ شراب اور دوسری منشیات کو اپنی پناہ گاہ بناتا ہے لیکن پھر بھی سب کچھ بیکار ثابت ہوتا ہے۔ وہ یہ کیوں نہیں سوچتا کہ زندگی کے ممکنہ حد تک متصوّر آرام وآسائش کو مغرب کے کھربوں پتی لوگ بھی اتنی فراخدلی سے نہیں پا سکے جبکہ اُن کے اندر کی دنیا جہنم سے کم نہیں۔ اُن کا جاہ ومنصب اور اقتدار' دولت وآرام' قابلِ رشک مزیّن اور اعلیٰ ترین فرنیچر سے آراستہ گھر' نوجوان' رقص کرتی ہوئی دوشیزگان' اعلیٰ درجے کی منشیات وغیرہ سب کے سب اُنہیں طمانیت قلبی اور ذہنی سکون جیسے انتہائی قابلِ قدر سرمایہ مہیا کرنے میں بے کار ثابت ہوئے ہیں۔

انسان کی ایسی ناگفتہ بہ اور قابلِ رحم حالت کے تحت اللہ تعالیٰ کا لامحدود پیغام غریبوں' بیچاروں اور نادانوں کی دستگیری کے لئے آگے بڑھتا ہے اور یہ مژدہ جانفزا سناتے ہوئے اُنہیں نا امیدی اور محرومی کے دلدل سے باہر نکالتا ہے کہ حقیقی مسرت وشادمانی' حقیقی ذہنی سکون اور اندرونی راحت وآرام اپنے خالق ومالک کے حضور اپنے سراپا کو جھکا دینے' اُس کی فرمانبرداری اور اُس کی مقرر کردہ حدود کے احترام میں ہے۔ متعدّد مقامات پر اس قنوطیت (نا امیدی) کے انسانی پردے کو چاک کر دیا گیا ہے۔ مثلاً فرمایا:

(۱) اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ آمَنُوْا یُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ (البقرۃ: ۲۵۷)

''اللہ ایمان والوں کا کارساز ہے' وہ اُنہیں تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے جاتا ہے۔''

(۲) وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰہِ مَالَا یَرْجُوْنَ (النساء: ۱۰۴)

''تم اللہ سے (اجر وثواب کی) وہ امیدیں رکھتے ہو جو امیدیں وہ نہیں رکھتے۔'' (۴:۱۰۴)

ہمارے تمام معاملات میں مذہب کو کمزوری کا نہیں' قوّت وتوانائی کا منبع ہونا چاہئے۔ اگر ہم محنت کریں اور مصائب جھیلیں اور ایمان سے خالی لوگ بھی یہی کام کریں تو فرق یہی رہ جاتا ہے کہ صاحبِ ایمان شخص اللہ سے پُر امید ہے جبکہ ایمان سے خالی شخص کا کوئی بھی تو سہارا اور مددگار نہیں۔ (اے یوسف علی' نوٹ: ۶۲۰)

(۳) لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا اِنَّہٗ ھُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ O (اَلزُّمَر: ۵۳)

''اللہ کی رحمت سے نا امید نہ ہونا' بے شک اللہ سارے گناہ معاف فرما دے گا۔'' (۳۹ : ۵۳)

(۴) اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ O اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ الْجَنَّۃِ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا جَزَآءً بِمَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ O (الاحقاف: ۱۳، ۱۴)

"بے شک جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے، پھر اُنہوں نے استقامت اختیار کی تو اُن پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ یہی لوگ اہلِ جنت ہیں جو اُس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں، یہ اُن اعمال کی جزا ہے جو وہ کیا کرتے تھے۔" (۱۳، ۱۴ : ۳۹)

اللہ تعالیٰ کے اس وعدہ کے علاوہ کہ ہمیں مسرت وشادمانی اور طمانیتِ قلبی اُس کی اطاعت میں اور اُس تقدیر پر ایمان لانے میں ہے جو اُس نے ہمارے لئے لکھ دی ہے، اُس کا یہ بھی وعدہ ہے کہ وہ صاحبِ ایمان اور اُس پر توکل کرنے والوں اور صالحین کو اِس دنیا میں بھی عمدہ زندگی سے نوازے گا :

(۱) لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا فِیْ ھٰذِہِ الدُّنْیَا حَسَنَۃٌ وَلَدَارُ الْاٰخِرَۃِ خَیْرٌ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِیْنَ O (اَلنَّحل)

"جو لوگ نیکی کرتے رہے، اُن کے لئے اِس دنیا میں (بھی) بھلائی ہے اور آخرت کا گھر تو ضرور ہی بہتر ہے اور پرہیزگاروں کا گھر کیا ہی خوب ہے!" (۳۰ : ۱۶)

(۲) مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْیِیَنَّہٗ حَیٰوۃً طَیِّبَۃً وَلَنَجْزِیَنَّھُمْ اَجْرَھُمْ بِاَحْسَنِ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ O (اَلنَّحل : ۹۷)

"جو کوئی نیک عمل کرے خواہ مرد ہو یا عورت جبکہ وہ مؤمن ہو تو ہم اُسے ضرور پاکیزہ زندگی کے ساتھ زندہ رکھیں گے اور اُنہیں ضرور اُن کا اجر (بھی) اُن اچھے اعمال کے عوض عطا فرمائیں گے جو وہ انجام دیتے تھے۔" (۹۷ : ۱۶)

"دوستی شہد سے زیادہ میٹھی ہوا کرتی ہے" ایک مشہور کہاوت ہے اور فرانسس بیکن نے بے لوث دوستی کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ ایسے ساتھیوں کا حقیقی اُنس اور باہمی شفقت ومحبت اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے اور ایک دوسرے کی موجودگی میں اُنہیں تنہائی محسوس نہیں ہوتی۔ قرآن حکیم دوستی کی ایسی مسرت کا نقشہ یوں کھینچتا ہے :

(۱) وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِھِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ O (اَلْحِجر : ۴۷)

"اور ہم وہ ساری کدورت نکال باہر کریں گے جو (دنیا میں) اُن کے سینوں میں (مغالطہ کے باعث ایک دوسرے سے) تھی، وہ جنت میں بھائی بھائی بن کر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔"

(۲) لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْھَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا وَلَھُمْ رِزْقُھُمْ فِیْھَا بُکْرَۃً وَّعَشِیًّا O (مریم : ۶۲)

"وہ اُس (جنت) میں کوئی بیہودہ بات نہیں سنیں گے مگر (ہر طرف سے) سلام (سنائی دے گا)، اور اُس میں اُن کے لئے اُن کا رزق صبح وشام (میسر) ہوگا۔" (۶۲ : ۱۹)

(۳) اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَئِذٍ بَعْضُھُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ O (اَلزُّخرُف : ۶۷)

"اُس دن سارے دوست واحباب ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے سوائے پرہیزگاروں کے (اُنہی کی دوستی اور ولایت کام آئے گی)۔" (۶۷ : ۴۳)

(۴) لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ O (قٓ: ۳۵)

''اُس (جنت) میں اُن کے لئے وہ تمام نعمتیں (موجود) ہوں گی جن کی وہ خواہش کریں گے اور ہمارے حضور میں ایک نعمت مزید بھی ہے (یا اور بھی بہت کچھ ہے' سو عاشق مست ہو جائیں گے)''

جمہور مفسرین کے نزدیک وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ ''ہمارے حضور میں ایک نعمت مزید بھی ہے'' سے مراد رؤیتِ باری تعالیٰ ہے جس کے مقابل جنت کی تمام نعمتیں' بہتے ہوئے چشمے' مرغزار اور حور و غلمان وغیرہ سب ہیچ ہیں۔ جنت کے خوشنما اور حسین وجمیل نظاروں میں وہ لطف ومستی کہاں جو یار کے دیدار میں ہے!!

اس بارے میں مستشرق گبن لکھتا ہے :

''محمدی جنت کی مسرت وشادمانی مرفہ الحالی' خوش باشی اور جنسی شہوت کی عیش کوشی تک محدود نہ ہوگی اور پیغمبر (علیہ السلام) نے برملا اس بات کا اظہار کیا ہے کہ صالحین اور شہداء تمام سفلی اور کم درجے کی مسرت کو بھول جائیں گے جو رب تعالیٰ کے دیدارِ حسن و جمال سے بہرہ ور ہوں گے۔'' ("Decline and Fall of the Roman Empire".. Gibbon, Vol. V, p 351)

(۵) يَتَنَازَعُوْنَ فِيْهَا كَاْسًا لَّا لَغْوٌ فِيْهَا وَلَا تَاْثِيْمٌ O وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَاَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ O وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ O قَالُوْا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ O فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ O اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ O (اَلطُّور: ۲۳۔۲۸)

''وہاں یہ لوگ جھپٹ جھپٹ کر (شرابِ طہور کے) جام لیں گے' اس (شرابِ جنت) میں نہ کوئی بے ہودہ گوئی ہوگی اور نہ گناہ گاری ہوگی۔ اور نوجوان (خدمت گزار) اُن کے اردگرد گھومتے ہوں گے گویا وہ غلاف میں چھپائے ہوئے موتی ہیں۔ اور وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر باہم پُرسشِ احوال کریں گے۔ وہ کہیں گے: بے شک ہم اس سے پہلے اپنے گھروں میں (عذابِ الٰہی سے) ڈرتے رہتے تھے' پس اللہ نے ہم پر احسان کیا اور ہمیں عذابِ جہنم سے بچا لیا۔ بے شک ہم پہلے سے ہی اُسی کی عبادت کیا کرتے تھے' بے شک وہ احسان فرمانے والا' بڑا رحم فرمانے والا ہے''

ماخذ: ''اسلام اور کرما'' ۔ ہارون یحییٰ' لندن ۲۰۰۲ء

نوٹ: روزمرہ زندگی میں ہمارے جسموں میں تناسخ ہوتا رہتا ہے مثلاً مردہ' گلے سڑے جسم کا مٹی یا جلنے کے بعد راکھ میں تبدیل ہونا' سر کے میل کچیل کا جوں میں بدلنا' مسہری کی خاک کا کھٹمل میں بدلنا' پانی کا دھوئیں میں بدلنا' موسیٰ علیہ السلام کے عصا کا اژدہے میں بدلنا' عیسیٰ علیہ السلام کا مٹی کو پرندے میں بدلنا وغیرہ۔ یہ تمام مثالیں جسموں میں قالب بدلنے کی مثالیں ہیں لیکن روح کا بدل بدل کے مختلف جسموں میں بار بار آنا (یعنی تناسخ) ناممکن ہے جو کافروں کا عقیدہ ہے۔

(۱۱۳) خضر علیہ السلام

سورۂ الکہف میں حضرات خضر اور موسیٰ علیہما السلام کی باہمی ملاقات کے ضمن میں خضر علیہ السلام کے نام یا اُن کی کنیت، لقب یا عرف کا کہیں ذکر نہیں ہوا۔ البتہ اُسی سورہ کی آیت ۶۵ میں اُنہیں عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا (ہمارے بندوں میں سے ایک خاص بندہ) کے الفاظ سے اشارتاً یاد کیا گیا ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی ایک حدیثِ مبارکہ میں اُنہیں ''خضر'' کہا گیا ہے اور اُن کی عمر سینکڑوں سال بتائی گئی ہے۔ آپ موسیٰ علیہ السلام کے ہم عصر تھے۔

تعارف: عبداللہ یوسف علی نے اپنے انگریزی ترجمہ و تفسیر میں خضر علیہ السلام کا تعارف اس طرح کرایا ہے:
''خضر'' کا معنیٰ سرسبز و شاداب ہے۔ اُن کا علم تر و تازہ، سرسبز و شاداب، پھلنے پھولنے والا اور زندگی کے حیات آفریں ذرائع سے ماخوذ ہے کیونکہ وہ رب تعالیٰ کی حضوری سے حاصل ہوا ہے۔ آپ پُر اَسرار شخصیت ہیں جن کی تلاش کی جاتی ہے۔ آپ زندگی کے باطن گہرے رازوں کے امین ہیں جسے عام آدمی نہیں سمجھ سکتے یا سمجھتے ہیں تو غلط طور پر سمجھتے ہیں۔'' (عبداللہ یوسف علی، نوٹ: ۲۴۱۱)

آپ کا نسب نامہ: بلیا بن ملکان بن فالغ بن عابر بن شالخ بن ارفخشد بن سام بن نوح علیہ السلام (روح المعانی، تاریخ طبری جلد اوّل، کامل ابن اثیر جلد اوّل، مروج الذھب لمسعودی جلد ۲، ھدایہ جلد اوّل)

آپ کے والد گرامی فارسی النسل تھے اور فارس کے بادشاہ تھے۔ بادشاہت کو چھوڑ کر اُنہوں نے ترکِ دنیا اور زُہد کی زندگی اختیار کر لی۔ آپ کی والدہ اَلحا جو اپنے وقت کی ممتاز ولیہ تھیں، رومی النسل تھیں۔ خضر علیہ السلام اپنے والدین کی پہلی اولاد تھے اور قُم کے علاقے کے ایک غار میں پیدا ہوئے۔ پیغمبر الیاس علیہ السلام آپ کے سگے بھائی تھے اور آپ سے پانچ سال چھوٹے تھے۔ (تفسیر نعیمی، جلد ۱۵، صفحہ ۷۰۳)

آپ کا زمانہ: سورۂ الکہف میں بیان شدہ حضرات خضر اور موسیٰ علیہما السلام کی باہمی ملاقات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ دونوں حضرات ایک دوسرے کے ہم عصر تھے اور سورہ آلِ عمران کی آیت ۶۵ سے ظاہر ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بہت بعد میں تشریف لائے جس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ حضرات موسیٰ اور خضر علیہما السلام سے صدیوں پہلے کا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کی خضر علیہ السلام سے ملاقات: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعاتِ زندگی میں ایک اہم واقعہ اُس ملاقات کا ہے جو اُن کے اور ایک صاحبِ باطن کے درمیان ہوئی، اور موسیٰ علیہ السلام نے

اُن سے عالمِ تکوینیات کے بعض رموز و اَسرار معلوم کئے۔ اس ملاقات کا ذکر تفصیل کے ساتھ سورۂ الکہف میں کیا گیا ہے اور صحیح بخاری میں اس واقعہ سے متعلق بعض مزید تفصیلات مذکور ہیں۔

حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' اُنہوں نے رسولِ اکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ایک روز حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو خطاب فرما رہے تھے کہ کسی شخص نے دریافت کیا: اِس زمانہ میں سب سے بڑا عالم کون ہے؟ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: مجھے اللہ نے سب سے زیادہ علم عطا فرمایا ہے۔ رب تعالیٰ کو اُن کی یہ بات پسند نہ آئی اور اُن پر عتاب ہوا کہ تمہارا منصب تو یہ تھا کہ اسے علمِ الٰہی کے سپرد کرتے اور کہتے ''واللہ أعلم''۔ پھر وحی نازل ہوئی کہ جہاں دو سمندر ملتے ہیں (مَجْمَعُ الْبَحْرَین) وہاں ہمارا ایک بندہ ہے جو بعض امور میں تم سے بھی زیادہ عالم و دانا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: پروردگار! تیرے اُس بندے تک رسائی کا کیا طریقہ ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مچھلی کو اپنے توشہ دان میں رکھ لو' جس مقام پر وہ مچھلی گم ہو جائے اُسی جگہ وہ شخص ملے گا۔ موسیٰ علیہ السلام نے مچھلی کو توشہ دان میں رکھا اور اپنے خلیفہ یوشع بن نون کو ساتھ لے کر اُس ''مردِ صالح'' کی تلاش کو روانہ ہو گئے۔ چلتے چلتے جب ایک مقام پر پہنچے تو دونوں ایک پتھر پر سر رکھ کر سو گئے۔ مچھلی میں زندگی پیدا ہوئی اور وہ توشہ دان سے نکل کر سمندر میں چلی گئی۔ مچھلی پانی کے جس حصّہ پر بہتی ہوئی گئی اور جہاں تک گئی وہاں پانی برف کی طرح جم کر ایک چھوٹی سی پگڈنڈی کی طرح ہو گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ سمندر میں ایک لکیر یا خط کھچا ہوا ہے۔

یہ واقعہ یوشع بن نون نے دیکھ لیا تھا کیونکہ وہ موسیٰ علیہ السلام سے پہلے بیدار ہو گئے تھے لیکن جب موسیٰ علیہ السلام بیدار ہوئے تو اُن سے ذکر کرنا بھول گئے۔ پھر دونوں نے اپنا سفر شروع کر دیا اور اُس دن اور رات میں آگے ہی بڑھتے گئے۔ جب دوسرا دن ہوا تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اب تھکان زیادہ محسوس ہونے لگی ہے۔ وہ مچھلی لاؤ تاکہ بھوک رفع کریں۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی منزلِ مقصود تک پہنچنے میں کوئی تھکان نہیں ہوئی تھی مگر منزل سے آگے غلطی سے نکل گئے تو اب تھکان بھی محسوس ہونے لگی۔ یوشع نے کہا: آپ کو معلوم رہے کہ جب ہم (صخرہ) پتھر کی چٹان پر تھے تو وہیں مچھلی کا یہ تعجب خیز واقعہ پیش آیا کہ اُس میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ توشہ دان میں سے نکل کر سمندر میں چلی گئی اور اُس کی رفتار پر سمندر میں راستہ بنتا چلا گیا۔ میں آپ سے یہ واقعہ کہنا بالکل بھول گیا تھا' یہ بھی شیطان کا ایک چرکا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ جس مقام کی ہمیں تلاش ہے' وہ وہی مقام تھا۔ یہ کہہ کر دونوں پھر ایک دوسرے سے بات چیت کرتے ہوئے اُسی راہ پر لوٹے اور اُس صخرہ (پتھر کی چٹان) تک جا پہنچے۔ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ اُس جگہ عمدہ لباس پہنے ہوئے ایک شخص بیٹھا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اُسے سلام کیا۔ اُس شخص نے کہا کہ تمہاری اُس سرزمین میں ''سلام'' کہاں؟ (یعنی اس سرزمین میں تو مسلمان نہیں رہتے)۔ یہ خضر تھے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنا تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ میرا نام موسیٰ ہے۔ خضر نے کہا: موسیٰ بنی اسرائیل؟ موسیٰ علیہ السلام نے ''ہاں'' میں جواب دیا اور کہا کہ میں آپ سے وہ علم حاصل کرنے آیا ہوں جو اللہ نے

۲۹۵۶ (خضر علیہ السلام)

آپ کو بخشا ہے۔ جنابِ خضر نے کہا: تم میرے ساتھ رہ کر اُن معاملات پر صبر نہ کرسکو گے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے تکوینی رموز و اَسرار کا وہ علم عطا کیا ہے جو تمہیں نہیں دیا گیا اور اُس نے تمہیں (تشریعی علوم کا) وہ علم عطا کیا ہے جو مجھے عطا نہیں ہوا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا:

سَتَجِدُنِیٓ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ صَابِرًا وَّلَآ اَعْصِیْ لَکَ اَمْرًا ○ (اَلْکَھْف: ۶۹)

''انشاءاللہ آپ مجھے ضرور صابر پائیں گے اور میں آپ کی کسی بات کی خلاف ورزی نہیں کروں گا۔''

خضر علیہ السلام نے کہا: تو پھر شرط یہ ہے کہ جب آپ میرے ساتھ رہیں تو کسی معاملہ کے متعلق بھی جسے آپ کی نگاہیں دیکھ رہی ہوں، مجھ سے کوئی سوال نہ کریں، میں خود آپ کو اُن کی حقیقت بتا دوں گا۔ الفاظ ملاحظہ ہوں:۔

قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِیْ فَلَا تَسْـَٔلْنِیْ عَنْ شَیْءٍ حَتّٰٓی اُحْدِثَ لَکَ مِنْهُ ذِکْرًا○ (اَلْکَھْف: ۷۰)

موسیٰ علیہ السلام نے منظور کرلیا اور تینوں ایک جانب کو روانہ ہو گئے۔ جب سمندر کے کنارے پہنچے تو سامنے سے ایک کشتی نظر آئی جس پر وہ سوار ہو گئے۔ ابھی کشتی چلے ہوئے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ خضر علیہ السلام نے کشتی میں سوراخ کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام کہنے لگے: کشتی والوں نے تو یہ احسان کیا کہ آپ کو اور مجھے مفت سوار کرلیا اور آپ نے اُس کا یہ بدلہ دیا کہ کشتی میں سوراخ کر دیا کہ سب کشتی والے ڈوب جائیں۔ یہ تو بہت نازیبا بات ہوئی! جنابِ خضر نے کہا کہ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ آپ میری باتوں پر صبر نہ کرسکیں گے، آخر وہی ہوا۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے وہ وعدہ بالکل فراموش ہو گیا اس لئے آپ بھول چوک پر میری گرفت نہ کریں۔

کشتی کنارے لگی اور وہ اتر کر سمندر کے کنارے کنارے چل دیئے۔ کچھ بچے ایک میدان میں کھیل رہے تھے۔ حضرت خضر نے آگے بڑھ کر اُن میں سے ایک بچے کو قتل کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام کو پھر یارا نہ رہا اور فرمانے لگے ناحق ایک معصوم جان کو آپ نے مار ڈالا، یہ تو اچھا نہ ہوا! جنابِ خضر نے کہا: میں تو شروع ہی میں کہہ چکا تھا کہ آپ میرے ساتھ رہ کر صبر و ضبط سے کام نہ لے سکیں گے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: خیر! اِس مرتبہ اور نظرانداز کر دیجئے اس کے بعد اگر مجھ سے صبر نہ ہو سکا تو پھر عذر کا کوئی موقع نہیں رہے گا اور آپ مجھ سے علیحدہ ہو جایئے گا۔ غرض وہ پھر روانہ ہو گئے اور چلتے چلتے ایک ایسی بستی میں پہنچے جہاں کے باشندے خوش عیش اور مہمان داری کے ہر طرح قابل تھے۔ مگر دونوں کی مسافرانہ درخواست پر بھی اُنہیں مہمان بنانے سے انکار کر دیا تھا۔ ابھی بستی ہی میں سے گزر رہے تھے کہ خضر علیہ السلام ایک ایسے مکان کی جانب بڑھے جس کی دیوار کچھ جھکی ہوئی تھی اور اُس کے گر جانے کا خطرہ تھا۔ جنابِ خضر نے اُسے ہاتھ کا سہارا دیا اور دیوار کو سیدھا کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے پھر اُنہیں ٹوکا اور فرمانے لگے: ہم اس بستی میں مسافرانہ وارد ہوئے ہیں، مگر اُس کے بسنے والوں نے نہ مہمان داری کی اور نہ رہنے کو جگہ دی۔ ایک آپ ہیں کہ اُس کے ایک باشندے کی دیوار کو بغیر اُجرت درست کر دیا۔ اگر ایسا کرنا ہی تھا تو بھوک پیاس دُور کرنے کے لئے کچھ اجرت ہی طے کر لیتے۔ خضر علیہ السلام نے فرمایا: ھٰذَا فِرَاقُ بَیْنِیْ وَبَیْنِکَ یعنی اب میرے اور تمہاری جدائی کا وقت آ گیا۔ اور پھر اُنہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو اِن تینوں معاملات کے حقائق کو سمجھایا اور بتایا کہ یہ سب باتیں منجاب اللہ تھیں جن پر آپ صبر نہ کر سکے۔

۲۹۵۷ (خضر علیہ السلام)

جب اِن دونوں مقدس ہستیوں کی جدائی ہونے لگی تو خضر علیہ السلام نے اُن واقعات کی جو حقیقت بیان کی' سورۃ الکہف میں اِس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے اِس طرح ظاہر کیا گیا ہے:

أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِينَ يَعْمَلُونَ فِي الْبَحْرِ فَأَرَدْتُّ أَنْ أَعِيبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصْبًاO وَأَمَّا الْغُلَامُ فَكَانَ أَبَوَاهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِينَا أَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا فَأَرَدْنَا أَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّ أَقْرَبَ رُحْمًاO وَ أَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيمَيْنِ فِي الْمَدِينَةِ وَ كَانَ تَحْتَهُ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا فَأَرَادَ رَبُّكَ أَنْ يَّبْلُغَا أَشُدَّهُمَا وَ يَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ وَ مَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي ذٰلِكَ تَأْوِيلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَلَيْهِ صَبْرًاO (الکہف : ۷۹-۸۲)

''وہ جو کشتی تھی تو وہ چند غریب لوگوں کی تھی' وہ دریا میں محنت مزدوری کرتے تھے' پس میں نے ارادہ کیا کہ اُسے عیب دار کردوں اور (اُس کی وجہ یہ تھی) اُن کے آگے ایک (جابر) بادشاہ (کھڑا) تھا جو ہر (بے عیب) کشتی کو زبردستی (مالکوں سے بلا معاوضہ) چھین لیتا تھا۔ اور جو لڑکا تھا تو اُس کے ماں باپ صاحبِ ایمان تھے' پس ہمیں اندیشہ ہوا کہ یہ (اگر زندہ رہا تو کافر بنے گا اور) اُن دونوں کو (بڑا ہوکر) سرکشی اور کفر میں مبتلا کردے گا۔ پس ہم نے ارادہ کیا کہ اُن کا رب اُنہیں (ایسا) بدل عطا فرمائے جو پاکیزگی میں (بھی) اُس (لڑکے) سے بہتر ہو اور شفقت و رحم دلی میں (بھی والدین کے قریب تر ہو)۔ اور وہ جو دیوار تھی تو وہ شہر میں (رہنے والے) دو یتیم بچوں کی تھی اور اُس کے نیچے ان دونوں کے لئے ایک خزانہ (دفن) تھا اور اُن کا باپ صالح (شخص) تھا' سو آپ کے رب نے ارادہ کیا کہ وہ دونوں اپنی جوانی کو پہنچ جائیں اور آپ کے رب کی رحمت سے وہ اپنا خزانہ (خود ہی) نکالیں اور میں نے جو کچھ بھی کیا) وہ از خود نہیں کیا' یہ اُن واقعات کی حقیقت ہے جن پر آپ صبر نہ کرسکے۔'' (۱۸: ۷۹-۸۲)

قرآنِ عزیز نے اِس واقعہ کے شروع میں خضر علیہ السلام کے اُس ''علم'' کے متعلق کہا ہے: وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا (اور ہم نے اپنے پاس سے اُسے علم عطا کیا) اور قصّہ کے آخر میں خضر علیہ السلام کا یہ قول نقل کیا ہے: وَ مَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي (میں نے اس سلسلہِ واقعات کو اپنی جانب سے نہیں کیا) تو اِن دونوں جملوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خضر علیہ السلام کو بعض اشیاء کے حقائق کا وہ علم عطا فرمایا تھا جو تکوینی رموز و اَسرار اور باطنی حقائق سے متعلق ہے اور یہ ایک ایسا مظاہرہ تھا جس سے اللہ تعالیٰ نے اہلِ حق پر یہ واضح کردیا کہ اگر عالمِ ہست و بود کے تمام حقائق سے اسی طرح پردہ اٹھا دیا جائے جس طرح بعض حقائق کو خضر علیہ السلام کے لئے بے نقاب کردیا گیا تھا تو اِس عالم کے تمام احکام ہی بدل جائیں اور عمل کی آزمائشوں کا یہ سارا کارخانہ درہم برہم ہوکر رہ جائے مگر دنیا اعمال کی آزمائش گاہ ہے' اس لئے ''تکوینی حقائق'' پر پردہ پڑا رہنا ضروری ہے تاکہ حق و باطل کی پہچان کے لئے جو ''ترازو'' قدرت نے مقرر کردیا ہے' وہ برابر اپنا کام انجام دیتا رہے۔

سورۃ الکہف کی اِن آیات کے مطالعہ سے یہ بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام چونکہ اولوالعزم پیغمبر اور جلیل المرتبت رسول تھے اور تشریعی احکام کی تبلیغ اُن کا منصب تھا' اس لئے وہ ان تکوینی اَسرار کے مظاہرے کو برداشت نہ کر سکے اور باوجود وعدہِ صبر کے تشریعی منکرات کو دیکھ کر ضبط نہ کر سکے اور خضر علیہ السلام کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مخاطب بناتے رہے اور آخر کار جدائی کی نوبت آ گئی۔

خضر علیہ السلام کا مقام : خضر علیہ السلام کے مقام کے متعلق آراء مختلف ہیں کہ آیا وہ عبدِ صالح (ولی) ہیں یا نبی اور رسول ہیں؟ معروضی اور غیر جانبدارانہ تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے رسول تھے۔

آپ کی نبوّت کے حق میں دلائل: (1) قرآنِ مجید اُن کے بارے میں فرماتا ہے: آتَیْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا (الکہف: ۶۵) ''ہم نے اپنی بارگاہ سے اُنہیں (خصوصی) رحمت عطا کی تھی۔'' سب مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہاں ''رحمت'' سے مراد رسالت ہے کیونکہ قرآن مجید کے کئی مقامات پر رحمت کا معنیٰ رسالت سے کیا گیا ہے مثلاً ذیل کی آیات :

(i) وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْا اَنْ يُّلْقٰى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ (اَلْقَصَص:۸۶)
''اور آپ اس بات کی امید نہ رکھتے تھے کہ آپ پر یہ کتاب اتاری جائے گی مگر (یہ) آپ کے رب کی رحمت سے اتری ہے۔'' (۲۸:۸۶)

یعنی آپ کو قرآن کے بھیجے جانے کی امید نہ تھی لیکن آپ کو ہماری جانب سے رسالت دیئے جانے کی امید تھی۔ لہٰذا آیت میں ''رحمت'' سے مراد رسالت ہے۔

(ii) اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ (اَلزُّخْرُف : ۳۲)
''کیا آپ کے رب کی رحمت (نبوّت) کو یہ لوگ تقسیم کرتے ہیں؟'' (۴۳:۳۲)

اسی طرح سورۃ البقرۃ کی آیت ۶۴ اور سورۃ النساء کی آیت ۸۳ میں ''رحمت'' سے مراد رسالت ہے۔

(2) سورۃ الکہف کی آیت ۶۵ میں خضر علیہ السلام کے متعلق فرمایا گیا: وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا (اور ہم نے اپنے پاس سے اُسے علم عطا کیا)۔ قرآنی لفظ مِنْ لَّدُنَّا میں خضر علیہ السلام کو دیئے گئے علم کو اللہ کی طرف نسبت دی گئی ہے اور اِس بات میں اس بات کا صاف اشارہ ہے کہ اُنہوں نے براہِ راست اللہ سے تعلیم پائی ہے جو اللہ کے نبیوں اور اُس کے رسولوں کا خاصہ ہے۔ معلوم ہوا کہ آپ اللہ کے نبی ہیں۔

۲۹۵۹ (خضر علیہ السلام)

نوٹ: اولیاء اللہ کا علمِ لدنّی براہِ راست نہیں ہوا کرتا بلکہ وہ انبیائے کرام کی وساطت سے بالواسطہ ہوتا ہے۔

(3) موسیٰ علیہ السلام نے خضر علیہ السلام سے درخواست کی تھی کہ میں آپ سے وہ علم حاصل کرنے آیا ہوں جو اللہ نے آپ کو عطا کیا ہے (اَلْکَھف:٦٦)۔ موسیٰ علیہ السلام کی درخواست سے خضر علیہ السلام کی نبوّت ثابت ہوتی ہے کیونکہ پیغمبر پیغمبر ہی کی پیروی کرتا ہے کہ اُس کا ہر قول و فعل لازمی طور پر وحیِ الٰہی کے تابع ہوتا ہے۔

(4) موسیٰ علیہ السلام کی مذکورہ درخواست پر خضر علیہ السلام نے فرمایا تھا: ''تم میرے ساتھ رہ کر اُن معاملات پر صبر نہ کر سکو گے۔'' (اَلْــکَھف:٦٨)۔ اس پر موسیٰ علیہ السلام نے وعدہ کیا کہ'' ''انشاء اللہ آپ مجھے ضرور صابر پائیں گے اور میں آپ کی کسی بات کی خلاف ورزی نہیں کروں گا۔'' (اَلْکَھف : ٦٩)

موسیٰ علیہ السلام کا یہ وعدہ خضر علیہ السلام کی نبوت پر یقین کی بنا پر تھا اور اسی وجہ سے اُن کا یہ ایمان تھا کہ خضر علیہ السلام جو کچھ بھی اُنہیں تعلیم دیں گے' اُس کی بنیاد وحیِ الٰہی ہوگی۔ پیغمبر کی جانب سے ایسا وعدہ غیرِ نبی سے نہیں کیا جا سکتا۔ درحقیقت یہ وعدہ خضر علیہ السلام کی نبوّت کا مظہر تھا۔

(5) خضر علیہ السلام نے اُس کشتی میں سوراخ کر دیا جس میں یہ دونوں حضرات سوار تھے۔ کچھ راہ آگے چلنے پر خضر علیہ السلام نے ایک معصوم بچے کو بلا وجہ مار ڈالا۔ کچھ آگے چلنے پر اُنہوں نے ایک گرتی ہوئی دیوار کو بغیر کسی اجرت کے سیدھا کر دیا۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے اِن تینوں افعال پر (جو بظاہر ناقابلِ فہم تھے) اعتراض کیا تو خضر علیہ السلام نے اِن تینوں کے پسِ پردہ وجوہ کو یہ کہتے ہوئے بے نقاب کیا: وَ مَا فَعَلْتُہٗ عَنْ اَمْرِی ''میں نے یہ کام از خود نہیں کئے۔'' (اَلْکَھف : ٨٢) یعنی اُن کے پیچھے وحیِ الٰہی کارفرما تھی۔ نیز فَاَرَدْنَا میں ''نَا'' صیغہ جمع متکلم کا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خضر علیہ السلام از خود یعنی اپنی مرضی سے یہ کام نہیں کر رہے تھے بلکہ وہ قادرِ مطلق خالق کے حکم و ہدایت پر کئے گئے تھے' جس سے آپ کی نبوّت ثابت ہوتی ہے۔

وحیِ الٰہی انبیاء علیہم السلام کا خاصہ ہے جو صرف اُنہی کو حاصل ہوتی ہے۔ اگر خضر علیہ السلام ولی اللہ ہوتے تو اُنہیں وحی کی بجائے الہام ہوتا اور الہام محض ایک بے فائدہ خیال ہوتا ہے اور اس لئے ناقابلِ یقین ہوتا ہے۔ ایک ولی اللہ کو بھی اپنے الہام کی صداقت کا یقین نہیں ہوتا اور وہ اپنے الہام کو قرآنِ مجید' سنتِ رسول ﷺ اور شریعت کی روشنی میں پرکھتا ہے۔ اگر تو اُس کا الہام شریعت کے مطابق ہو تو وہ اُس پر عمل پیرا ہوتا ہے ورنہ اُسے مسترد کر دیتا ہے۔ خضر علیہ السلام کے ناقابلِ فہم تینوں افعال وحی اور حکمِ الٰہی کے بغیر ہو نہیں سکتے تھے' جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ اللہ کے نبی تھے اور آپ کی نبوّت پر شک کرنا صحیح عقیدہ کے لئے خطرناک بات ہے۔

موسیٰ اور خضر علیہما السلام کے قصہ میں چند اہم نکات : (۱) تفسیر روح المعانی میں ہے کہ جب کوئی بندہ خالصۃً اللہ کے لئے کسی کام میں نکلتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کی تکالیف کو راحت وسکون میں بدل دیتا ہے اور اُسے وہ تکلیف محسوس بھی نہیں ہوتی لیکن جب بندے کا وہ کام اللہ کے لئے نہیں رہتا تو پھر وہ مصائب اپنی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کو مصر سے بحرین جیسے دُور دراز سفر میں وہ تکلیف محسوس نہ ہوئی جو اِس تھوڑے سے سفر میں ہوئی۔

(۲) طلبِ علم کے لئے تکلیف اٹھانا اور تکلیف کی پروانہ کرنا اور تکالیف ومصائب کے باوجود ہمت وکوشش جاری رکھنا سنتِ انبیاء علیہم السلام ہے۔ موسیٰ علیہ السلام اور اُن کے ساتھی کا مصر سے سفر کرنا' بے سروسامانی اور راستے کی تکالیف کا بھی کچھ غم نہ کرنا صرف اللہ کے علم کو حاصل کرنا تھا اور اس میں کوئی دنیاوی مقصد نہ تھا۔

(۳) کائنات میں کوئی بھی شخص انبیائے کرام کے علم کا مقابلہ نہیں کرسکتا خواہ وہ ولی ہو' یا محدث یا مفسر' فلسفی' منطقی اور بڑے سے بڑا سائنسدان کیوں نہ ہو۔ یہ نکتہ وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا (اور ہم نے اپنے پاس سے اُسے علم عطا کیا) سے حاصل ہوا۔

(۴) خضر علیہ السلام رب تعالیٰ کے بہت عظمت والے نبی ہیں اور آپ کی نبوّت کا منکر بے دین ہے۔ یہ نکتہ موسیٰ علیہ السلام کی درخواست هَلْ أَتَّبِعُكَ سے حاصل ہوا یعنی میں آپ کی اتباع کرنا چاہتا ہوں اور اتباع کی تعریف یہ ہے کہ کسی شخص کو بالکل صحیح اور غلطیوں سے پاک سمجھ کر اُس کے نقشِ قدم پر چلنا اور اُس کے پیچھے ایسے چلنا کہ اُس میں اپنی عقل کو بالکل دخل نہ دیا جائے۔ ایسی پاکبازی صرف معصومین میں ہوتی ہے اور انسانوں میں معصوم صرف انبیائے کرام ہی ہوتے ہیں' اسی لئے اتباع بھی انبیائے کرام ہی کی کرائی جاتی ہے۔ تو گویا موسیٰ علیہ السلام نے اتّباع کا لفظ فرما کر خضر علیہ السلام کی نبوّت کا اظہار فرمایا۔

(۵) انسان کو اگر باکمال اور زیادہ علم ومعلومات والا بننا ہے تو اُسے اپنے سے کم درجے اور چھوٹی شخصیت سے کچھ سیکھنے میں شرم وجھجک محسوس نہیں کرنی چاہئے۔ موسیٰ علیہ السلام کئی علوم اور کئی درجوں میں خضر علیہ السلام سے افضل واعلیٰ ہیں جیسا کہ تفسیر صاوی جلد سوم کے صفحہ ۱۸ پر بھی منقول ہے مگر علمِ باطنی سیکھنے کے لئے اُنہوں نے کمالِ ادب واحترام پیش فرمایا۔

(۶) جس سے کچھ سیکھنا ہو' اُس کا ادب واحترام لازم ہے۔ یہ نکتہ سَتَجِدُنِیْ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَاۤ اَعْصِیْ لَكَ اَمْرًا ۝ (الکہف : ۶۹) ''انشاء اللہ آپ مجھے ضرور صابر پائیں گے اور میں آپ کی کسی بات کی خلاف ورزی نہیں کروں گا'' کے مؤدّبانہ اور عاجزانہ کلام سے حاصل ہوا۔ امام اعظم علیہ الرحمۃ نے اپنے ایک تلمی

پڑوسی سے علمِ جفر سیکھا اور اُس کے شیر خوار بچے کا بھی احترام کیا۔ امام شافعی علیہ الرحمۃ نے اپنے ایک دوست سے علمِ جفر سیکھا جو عمر میں آپ سے چھوٹا تھا مگر ہمیشہ اُس کا احترام کیا (تفسیر کبیر، پارہ ۱۵ یہی آیت)۔

(۷) انبیائے کرام کے معجزات اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کے قبضہ اختیار میں دے دیئے جاتے ہیں۔ وہ جس وقت چاہیں، بوقتِ ضرورت دکھادیں۔ خضر علیہ السلام نے کشتی توڑنے کا معجزہ کیا کہ کشتی میں پانی نہ آیا جبکہ موسیٰ علیہ السلام کو ظاہری حالات میں کشتی ٹوٹنے کی نوعیت سے ڈوبنے کا خدشہ تھا۔

(۸) انبیاء علیہم السلام کو دنیا کی کوئی چیز اور کوئی مخلوق نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ موسیٰ علیہ السلام نے لِتُغۡرِقَ یا لِتُغۡرِقَنَا بھی نہیں فرمایا کہ ہم ڈوب جائیں گے یا یہ کشتی ہمیں ڈبو دے گی بلکہ لِتُغۡرِقَ اَهۡلَهَا فرمایا یعنی اہلِ کشتی کو ڈبو دے گی بہ ایں معنیٰ کہ ہم انبیائے کرام معدوم ہونے کے ہر خطرہ سے دُور اور آزاد ہیں۔

(۹) علمائے شریعت کا یہ فرضِ منصبی ہے کہ وہ مشائخِ طریقت کو اُن کی شرعی غلطی پر اُن کا محاسبہ اور گرفت کریں۔ یہ گرفت ادب واحترام کے خلاف نہیں ہے۔ یہ نکتہ سوالاتِ موسوی سے حاصل ہوا۔

(۱۰) ایک نبی اپنی نبوّت کے زمانہ میں بھی دوسرے نبی کی اتباع کر سکتے ہیں، خواہ تابع نبی صاحبِ شریعت یا صاحبِ کتاب ہو یا بغیر شریعت کے ہو۔ پہلی مثال: جیسے موسیٰ علیہ السلام نے چند ساعتیں خضر علیہ السلام کی اتباع کی۔ دوسری مثال: جیسے ہارون علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کی اتباع کی اور بہت سے انبیائے کرام نے سلیمان علیہ السلام کی یا یحییٰ علیہ السلام نے عیسیٰ علیہ السلام کی اتباع کی۔

(۱۱) اگر دو شخص کوئی معاہدہ کریں اور اُن میں سے کوئی اُس کی پابندی نہ کر سکے تو دوسرے کا وعدہ ختم کر دینا وعدہ خلافی نہ ہوگی۔ یہ نکتہ مِنۡ لَّدُنِّیۡ عُذۡرًا سے حاصل ہوا۔

(۱۲) اپنا حق وصول کرنا خواہ کسی شکل اور کسی طریقے سے ہو جائز بلکہ ضروری ہے۔ لیکن طریقت اور تصوّف میں حق چھوڑنا زیادہ افضل ہے۔ یہ فائدہ لَوۡ شِئۡتَ لَتَّخَذۡتَ عَلَیۡهِ اَجۡرًا سے حاصل ہو۔

(۱۳) اپنی ذات پر کی گئی زیادتی اور ظلم کا انتقام نہ لینا بلکہ اُس کا بدلہ اچھائی اور نیکی سے دینا خدا خوف لوگوں کی امتیازی خصوصیت رہی ہے۔ بستی کے لوگوں نے اِن دونوں بزرگوں کی مہمانی کرنے سے انکار کر دیا تھا تو اُنہیں اپنے غصہ کا اظہار کسی طور پر بھی کرنا چاہئے تھا لیکن خضر علیہ السلام نے اُن کی گرتی ہوئی دیوار کو دوبارہ تعمیر کر کے اُن سے مہربانی کا سلوک کیا۔

(۱۴) استاد کو اپنے شاگردوں سے متحمل مزاج اور بُردبار ہونا چاہئے۔ زیرِ نظر واقعہ میں استاد کو یہ سبق دیا

جا رہا ہے کہ شاگرد کی پہلی کسی غلطی پر سرزنش اور مصاحبت سے اُسے دُور نہ کرنا چاہئے۔ یہ نکتہ تین اعتراضوں کے بعد هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ کہنے سے حاصل ہوا۔

(۱۵) درستی اور فائدہ کے لئے کسی کی چیز میں اُس کی اجازت کے بغیر خرابی یا تبدیلی کرنا یا ایسا نقصان کر دینا شرعاً منع نہیں ہے جس خرابی کے ذریعے بڑے نقصان سے بچ جانا ہو۔ یہ نکتہ کشتی توڑنے سے حاصل ہوا کہ چھوٹے تختے کے نقصان کے ذریعے بڑے نقصان یعنی پوری کشتی کے غصب سے بچالیا۔

(۱۶) جو کام ظاہراً اچھا نہ ہو لیکن باطناً اچھا ہو' اُسے بھی رب تعالیٰ کی طرف منسوب نہ کرنا چاہئے یعنی یہ نہ کہنا چاہئے کہ یہ برا کام اللہ نے کیا حالانکہ ہر کام کا فاعلِ حقیقی اللہ ہی ہے کیونکہ اُسی کے حکم وارادے سے بندے کے عمل ہوتے ہیں۔ یہ نکتہ أَرَدْتُّ (میں نے ارادہ کیا) فرمانے سے حاصل ہوا کہ کشتی توڑنا ظاہراً بُرا تھا' اِس لئے اُس کی نسبت رب کی طرف کرنے کی بجائے اپنی طرف کی۔

(۱۷) بڑوں کا تقویٰ' عبادت اور بزرگی اولاد کے کام آتی ہے۔ یہ نکتہ وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا (اُن کا والد نیک آدمی تھا) سے حاصل ہوا۔ اُن کے والد کی پارسائی اور نیکی نے خضر علیہ السلام کو گرتی ہوئی دیوار کو تعمیر کرنے کی تحریک دی۔

(۱۸) سیّدوں کا احترام ہر مسلمان پر فرض ہے کہ جب ایک عام صالح آدمی کی اولاد کا یہ اہتمام فرمایا گیا تو سادات تو امام الانبیاء اور فخر مرسلین کی آل ہیں۔'' (تفسیر نعیمی ۔۔۔ مفتی اقتدار احمد خان' جلد ۱۵'۱۶)

<u>قصّہ مذکورہ میں چند فقہی نکات</u> : صحیح بخاری کے جانے پہچانے شارح حضرت امام نووی علیہ الرحمۃ نے حضرات موسیٰ اور خضر علیہما السلام کے قصہ سے مندرجہ ذیل فقہی نکات اخذ کئے ہیں :۔

(۱) مسافر کا اپنے ساتھ زادِ راہ اور خوراک کا رکھنا جائز ہے اور توکل علی اللہ کے خلاف نہیں ہے۔

(۲) ہر شاگرد پر اپنے استاد کا احترام کرنا اور اُسے تنقید کا نشانہ نہ بنانا فرض ہے۔

(۳) استاد کے احترام کے ساتھ ساتھ شاگرد کے لئے استاد کی ہمراہی بھی ضروری ہے جو استاد کی اجازت کے ساتھ ہونی چاہئے۔ استاد کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے شاگرد سے شفقت و محبت سے پیش آئے اور اُسے علم کی دولت سے نوازے اگر شاگرد اُس کا اہل ہو۔ یہ بات موسیٰ علیہ السلام کی (بہ الفاظ هَلْ أَتَّبِعُكَ) سے ثابت ہے اور خضر علیہ السلام کی طرف سے مشروط اجازت دینے سے ثابت ہے۔

(۴) مسلمان کو ہر موقع پر اور بالخصوص عبادات میں بہت محتاط اور مستعد ہونا چاہئے۔ عبادات میں

عدمِ توجہ رحمتِ الٰہی کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہے اور عبادت گزار کو عبادت کی شیرینی اور لطف سے محروم کر دیتی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی یوشع بن نون کی تھوڑی سی بھول کا نتیجہ بے فائدہ سفر میں ظاہر ہوا اور تھکاوٹ اس کے علاوہ ہوئی جو پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔

(۵) سفر کی نوعیت سے قطع نظر سفر کے دوران اُٹھائی گئی تکالیف اور دشواریوں کا کسی کے آگے ذکر کرنا جائز ہے۔ لیکن مشکلات کا یہ اظہار ازراہِ شکایت نہ ہو۔ موسیٰ علیہ السلام کا ایسا اظہار ازراہِ تعجب تھا نہ کہ ازراہِ گلہ یا شکایت۔ یہ ازراہِ تعجب اس لئے تھا کہ اُنہوں نے مصر سے بحرین تک کے چالیس دن کے طول طویل سفر میں کوئی آرام نہیں کیا تھا اور اُن کا یوں کہنا تھا کہ بڑی عجیب بات ہے کہ ہم اس مختصر سے سفر میں تھک گئے ہیں۔

(۶) مستقبل میں ہونے والے ہر فعل کے لئے انشاء اللہ کہنا ضروری ہے' بالخصوص اُس عمل کے لئے جس کی تکمیل یقینی نہ ہو۔ یہ بات سورۃ الکہف کی آیت ۶۹ (سَتَجِدُنِیٓ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ صَابِرًا) سے ثابت ہے۔

(۷) آدمی کے لئے کسی بھی معاملے میں جلد بازی کرنا جائز نہیں ہے خواہ وہ معاملہ دنیاوی ہو یا مذہبی کیونکہ جلد بازی میں نقصان ہی نقصان ہے۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ کسی کام کو جلدی جلدی کرنا یا وقت سے پہلے کرنا اور بات ہے اور کئی صورتوں میں اس کی ممانعت نہیں جبکہ کسی معاملے میں جلد بازی کرنا اور بات ہے اور ناپسندیدہ اور ممنوع ہے۔ یہ بات قرآنی آیت ۷۰ کے الفاظ فَلَا تَسْئَلْنِیْ عَنْ شَیْءٍ اور ذیل کی حدیث سے ماخوذ ہے:

يَرْحَمُ اللّٰهُ مُوسٰى لَوَدِدْتُ اَنَّهٗ كَانَ صَبَرَ حَتّٰى يَقُصَّ عَلَيْنَا مِنْ اَخْبَارِهِمَا

''رب تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام پر رحم فرمائے' کاش وہ تھوڑا سا صبر کر لیتے تاکہ ہم پر اُن دونوں کی خبروں سے کچھ اور تھوڑا سا قصہ بیان ہو جاتا۔'' (تفسیر نعیمی' ج ۱۵' ص ۷۳۳)

مندرجہ بالا حدیث سے اشارۃ النص کی رُو سے جلد بازی کی ممانعت کا ثبوت ملتا ہے۔

(۸) اگر ایک نابالغ' ذی ہوش آدمی کسی بے گناہ کو قتل کرے تو اُسے قصاص میں قتل کیا جائے گا کیونکہ بِغَیْرِ نَفْس (سورۃ الکہف: ۷۴) کے الفاظ اس بات پر دلالت کر رہے ہیں۔

(۹) اللہ کے رسولوں کو خداداد علمِ غیب حاصل ہوتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے ایک اجنبی مقتول لڑکے کی بے گناہی کو اِسی خداداد علم کی رُو سے یہ کہتے ہوئے جان لیا تھا اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِیَّةً بِغَیْرِ نَفْسٍ (الکہف: ۷۴) یعنی ''کیا آپ نے بے گناہ جان کو بغیر کسی جان (کے بدلہ) کے قتل کر دیا ہے؟''۔

(۱۰) غیر مسلمین کا تیار شدہ کھانا مسلمانوں کے لئے جائز ہے بشرطیکہ کوئی حرام چیز اس میں نہ ملائی گئی ہو۔ یہ بات ان بزرگوں کے الفاظ اِسْتَطْعَمَا اَهْلَهَا (الکہف: ۷۷) یعنی ''اُن دونوں نے اُن سے کھانا

مانگا'' سے ثابت ہے باوجود اس حقیقت کے کہ بستی کے باسی مسلمان نہیں تھے کیونکہ خضر علیہ السلام نہ تو اہلِ ظاہر کے پیغمبر تھے اور نہ ہی اُن کی کوئی اُمت تھی۔ جہاں تک موسیٰ علیہ السلام کا تعلق ہے تو آپ کو تو وہ لوگ جانتے ہی نہ تھے ورنہ وہ اُنہیں اُن کی شان کے مطابق تعظیم و تکریم دیتے۔

(۱۱) ''یتیـــم'' کے لفظ کا اطلاق اُس بچے پر ہوتا ہے جو ابھی بالغ نہ ہوا ہو۔ اُس کے بالغ ہونے پر اُسے ''یتیم'' نہیں کہا جائے گا۔ قرآن کے الفاظ یَبۡلُغَا اَشُدَّ هُمَا (وہ دونوں اپنی جوانی کو پہنچ جائیں) اس نکتے کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

(۱۲) یتیم کے مال اور اثاثہ کو خورد برد کرنا یا اُسے اپنے مفاد کی خاطر استعمال کرنا قطعاً ناجائز اور حرام ہے جیسا کہ سورۃ الکھف کی آیت ۸۲ کی رُو سے یتیموں کے مدفون خزانے کی وراثت سے ثابت ہو رہا ہے۔

<u>خضر علیہ السلام کی درازیِ عمر کی بحث</u> : اگرچہ خضر علیہ السلام کی درازیِ عمر کا اشارہ قرآن مجید میں کہیں بھی نہیں ملتا تاہم جمہور مسلمان آپ کی درازیِ عمر پر متفق ہیں جبکہ کچھ دوسرے لوگ آپ کی درازیِ عمر کو تسلیم نہیں کرتے۔ ابنِ تیمیہ پہلا شخص تھا جس نے آپ کی درازیِ عمر کا انکار کیا اور اپنے دعویٰ کی تائید میں کچھ دلائل بھی پیش کیے جن کا خلاصہ درج ذیل ہے :۔

<u>منکرین حیات خضر کے دلائل اور اُن کے جوابات</u> : (۱) منکرین اپنی تمام دلیلوں کی کمزوری اور بے ساختگی محسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہماری سب سے بڑی اور قوی دلیل خضر علیہ السلام کی لمبی زندگی کے خلاف یہ ہے کہ خضر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر نہیں ہوئے۔

<u>جواب</u> : اس اعتراض کا جواب تفسیر صاوی نے یہ دیا:

وَقَدِ اجۡتَمَعَ بِرَسُوۡلِ اللّٰہِ ﷺ وَاَخَذَ مِنۡهُ فَهُوَ صَحَابِیٌّ'' (جلد سوم' صفحہ ۱۸)

''آپ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے' اُن سے دینِ اسلام حاصل کیا اور آپ نبیِ اکرم ﷺ کے صحابی ہیں۔''

اور تفسیر روح المعانی نے سورۃُ الکَھف کی آیت ۶۵ کے تحت لکھا :

اِنَّ الخِضۡرَ عَلَیۡهِ السَّلاَمُ کَانَ یَاۡتِیۡهِ وَیَتَعَلَّمُهٗ مِنۡهُ وَلٰکِنۡ عَلٰی وَجۡهِ الۡخِفَاءِ

''خضر علیہ السلام نبیِ اکرم ﷺ کی خدمت میں اکثر آیا کرتے تھے اور آپ سے دینِ اسلام سیکھا کرتے تھے لیکن خفیہ طریقے سے (کیونکہ حکمِ الٰہی علانیہ آنے کا نہ تھا)۔''

کَانَ یَاۡتِیۡهِ ماضی استمراری ہے جس سے بار بار آنے کا ثبوت ہے۔ اس کا الزامی جواب یہ ہے کہ

اگر خضر علیہ السلام کا ظاہراً آنا ثابت نہیں تو اُویس قرنی' نجاشی اور الیاس علیہ السلام کا آنا کب ثابت ہے؟ کیا اس بنا پر اویس قرنی اور نجاشی کے وجود کا انکار ہو جائے گا اور الیاس علیہ السلام کی لمبی زندگی پر تو سب کا اتفاق ہے (روح المعانی صفحہ ۳۲۸)۔

(۲) مخالفین کہتے ہیں کہ کسی نے امام بخاری علیہ الرحمۃ سے خضر علیہ السلام کی زندگی کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ وہ زندہ نہیں ہیں اور اس حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے دلیل دی:

اِنَّ عَلٰی رَأسِ مِائَةِ سَنَةٍ لَا یَبْقٰی عَلٰی وَجْهِ الْاَرْضِ مِمَّنْ هُوَ عَلَیْهَا اَحَد"

"نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: جو شخص آج زمین پر موجود ہے وہ سو سال بعد زندہ نہ رہے گا۔"

جواب : حدیثِ مذکورہ میں صرف صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی حیاتِ طیّبات کا ذکر ہے کہ دورِ صحابہ صرف سو سال تک ہے۔ اس سے خضر علیہ السلام کی زندگی کا انکار قطعاً ثابت نہیں ہوتا۔

اس کا الزامی جواب یہ ہے کہ الیاس علیہ السلام کی اور دجّال' یاجوج و ماجوج کی تا قیامت لمبی زندگی کے سب قائل ہیں حالانکہ یہ سب انسان ہیں اور جس دن یہ فرمانِ نبوی ارشاد ہوا' یہ موجود تھے اور کیوں نہ یہ فوت ہوئے۔ پھر اس حدیث سے مخالفین نے کم از کم خضر علیہ السلام کی زندگی کو ابراہیم علیہ السلام سے لے کر نبی اکرم ﷺ تک تقریباً تین ہزار سال لمبی تو تسلیم کر لیا۔ اب صرف اتنا ہی انکار رہا کہ زمانہ نبوی سے لے کر آج تک کی حیات کی نفی ہوئی۔ نیز وہ بچے جو فرمانِ نبوی مذکور کے دن ساری دنیا میں پیدا ہوئے' کیا وہ بھی سو سال کی عمر نہیں پا سکتے؟ امام بخاری علیہ الرحمۃ صرف محدّث ہی ہیں۔ اُن کا فقیہانہ تدبر و تفکر اس لائق نہیں کہ اُسے عمدہ کہا جائے۔ لہٰذا یہ استدلال بہت کمزور اور غلط ہے۔ (تفسیر نعیمی' جلد ۱۵' صفحہ ۷۲۰)

(۳) مخالفین کہتے ہیں کہ روزِ ازل کو تمام انبیائے کرام سے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مدد و نصرت پر عہد لیا گیا جس میں خضر علیہ السلام بھی شامل ہیں۔ تو اگر حضرتِ خضر زندہ ہوتے تو جہادوں میں شامل ہوتے۔

جواب : نصرت اور وعدہ سے مراد جہادوں میں شامل ہونا نہیں بلکہ ایمان لانا اور اپنی اپنی اُمّتوں کو نبی آخر الزماں ﷺ کی شان بتانا ہے۔ نیز تفسیر روح المعانی پارہ نمبر ۱۵ کے صفحہ ۳۲۴ پر ہے کہ خضر علیہ السلام کئی مرتبہ جہاد میں شامل ہوئے اور ظاہراً اس طرح ہوئے کہ ایک مجاہد کا گھوڑا راستے میں مر گیا تو آپ نے بحکمِ الٰہی اُسے زندہ فرما کر جہاد میں بھیجا۔ پھر اُس شخص نے آپ کو جہاد میں دیکھ کر پوچھا کہ آپ کون ہیں تو آپ نے فرمایا کہ میں خضر ہوں۔ (ایضاً' صفحہ ۷۲۱)

اگر مدد کا وعدہ جہادوں میں شامل ہونے سے پورا ہوتا ہے تو پھر دیگر انبیاء علیہم السلام کب شامل ہوئے اور یہ اعتراض تو الیاس علیہ السلام پر بھی پڑ سکتا ہے۔ اگر کہیں کہ اِن تمام انبیاء علیہم السلام کو زندگی میں مدد کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تو پھر اللہ تعالیٰ اُن کی کم زندگی کو جانتا تھا تو اُس نے وعدہ ہی کیوں لیا جو پورا نہ ہو سکے۔

(۴) مخالفین اپنے دعویٰ کی تائید میں یہ آیت بھی پیش کرتے ہیں جس میں رب تعالیٰ فرما رہا ہے :

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ (الانبیاء : ۳۴)

''اور ہم نے آپ سے پہلے کسی انسان کو (دنیا کی ظاہری زندگی میں) بقائے دوام نہیں بخشی۔'' (۲۱:۳۴)

وہ کہتے ہیں کہ اس آیت سے ثابت ہوا کہ خضر علیہ السلام حیات نہیں ہیں۔

جواب: اگر مخالفین کے اس استدلال کو صحیح مان لیا جائے تو ستر کروڑ یاجوج ماجوج اور دجال کو تا قیامت لمبی عمر دیئے جانے کے متعلق کیا رائے ہے اور اس حقیقت کے متعلق کسی کو اختلاف بھی نہیں حالانکہ یہ سب بشر ہی ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی بشر ہی ہیں۔ وہ اگرچہ آسمان پر ہیں لیکن اسی حیاتِ ظاہری سے زندہ ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب دنیا ہی ہمیشہ نہیں تو اس میں ہمیشہ رہنا کیسے ممکن ہے؟ قدرت کے وضع کردہ قانون کے مطابق خضر علیہ السلام، عیسیٰ علیہ السلام، یاجوج و ماجوج اور دجال کو بھی آخر ایک نہ ایک دن موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ لہٰذا ان سب کے لئے خلود کیسے ثابت ہو گیا؟

(۵) مخالفین کی حیاتِ خضر علیہ السلام کے انکار سے متعلق پانچویں دلیل وہ مشہور حدیث ہے جس میں ختمی مرتبت ﷺ نے فرمایا: لَا نَبِيَّ بَعْدِي (میرے بعد کوئی نبی نہیں)۔ چونکہ خضر علیہ السلام بھی ایک نبی ہیں اور اسی لئے حدیثِ مذکورہ کے پیشِ نظر اُنہیں زندہ نہیں سمجھا جا سکتا لہٰذا اُن کی حیات کا عقیدہ رکھنا صحیح نہیں ہے۔

جواب: حضرات عیسیٰ، الیاس اور ادریس علیہم السلام بھی اللہ کے نبی ہیں اور اُن کی طویل العمری پر سب کا اتفاق ہے۔ اس روشن حقیقت کے تحت حدیثِ مذکورہ کا کیا مطلب لیا جائے گا؟

حدیثِ مذکورہ کا صحیح مطلب یہی ہے کہ نہ تو کوئی نیا رسول یا نبی میرے بعد آئے گا اور نہ ہی وحی الٰہی کسی سابقہ نبی یا رسول پر آئے گی چاہے وہ اس روئے زمین پر اپنی ظاہری جسمانی زندگی میں رہ رہے ہوں۔ عیسیٰ علیہ السلام قربِ قیامت میں نبی یا رسول کی حیثیت سے آسمان سے نہیں اتریں گے بلکہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ایک اُمتی کی حیثیت سے تشریف لائیں گے۔

(۶) جنگِ بدر کی رات میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے رب تعالیٰ سے یہ فریاد کی تھی :

اَللّٰهُمَّ اِنْ تُهْلِكْ هٰذِهِ الْعِصَابَةَ لَا تُعْبَدْ فِي الْاَرْضِ

''اے اللہ! اگر تو نے اس جماعت کو ہلاک کر دیا تو روئے زمین پر تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ ہو گا۔''

بدریّین کی یہ جماعت ۳۱۳ صحابہ پر مشتمل تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ خضر اُس وقت زندہ نہ تھے۔ اگر وہ اُس وقت زندہ ہوتے تو خضر علیہ السلام اُن ۳۱۳ میں شامل کیے جاتے اور نبی علیہ السلام یہ الفاظ نہ فرماتے۔

۲۹۶۷ (خضر علیہ السلام)

جواب : حدیثِ مذکورہ کی غلط تاویل کی گئی ہے۔ یہاں عبادت سے مراد محض نماز، روزہ اور اللہ تعالیٰ کے حضور جھکنے یا سجدہ کرنے کا نام نہیں بلکہ اس کا مطلب غلبۂ اسلام اور حاکمیتِ الٰہی کے ذریعے قرآنی نظام اور الٰہی نظم و نسق کو نافذ کرنا ہے۔ حدیثِ مذکورہ کا حیاتِ خضر علیہ السلام سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ عبادت کا نظامِ مذکور طاقتور، اور مستعد افراد کے آہنی ہاتھ کے ذریعے ہی نافذ کیا جا سکتا ہے۔

ایک اور غور طلب نکتہ یہ بھی ہے کہ اگر حدیثِ مذکورہ کو لفظی طور پر لیا جائے تو عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مثال کی کیا تاویل ہوگی جو جنگِ بدر میں موجود نہیں تھے۔ اُنہیں مدینہ منوّرہ میں اُن خواتین، بچوں اور بوڑھوں کی نگرانی کے لئے مامور کیا گیا تھا جو جنگ میں شریک ہونے کے قابل نہ تھے۔ اللہ کے عبادت گزار کئی مسلمان جن بھی تھے۔ یہ سب کے سب اللہ ہی کے عبادت گزار تھے۔

اِن حقائق کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے حدیث کے مضمون ''عبادت'' کا کیا مطلب ہوگا؟ اس لئے ماحصل نتیجہ یہی ہے کہ (۱) حدیث کی تاویل غلط کی گئی ہے اور (۲) حدیث کا خضر علیہ السلام کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے لہٰذا اُن کی طویل العمری ثابت ہوگئی۔

علاوہ ازیں خضر علیہ السلام کی طویل العمری سے متعلق ذیل کی احادیث کا بھی اضافہ کر لیا جائے :

(i) عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ : لَمَّا تُوُفِّيَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَاجْتَمَعَ الصَّحَابَةُ فَدَخَلَ رَجُل ''أَشْهَبُ اللِّحْيَةِ جَسِيْم'' ''صَبِيْح'' فَتَخَطّٰى رِقَابُهُمْ فَبَكٰى فَقَالَ أَبُوْبَكْرٍ وَ عَلِيّ'' رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا : هٰذَا الْخِضْرُ عَلَيْهِ السَّلَامُ (المستدرک للحاکم بحوالہ روح المعانی)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وفات پر آپ کے صحابہ کرام ایک جگہ جمع ہوئے تو ایک چمکدار، گھنی داڑھی والا، پُرکشش، فربہ جسم والا شخص آیا۔ تمام صحابہ کی گردنیں اُن کے احترام میں جھک گئیں۔ نو وارد شخص رو پڑا اور کچھ غم آمیز گفتگو کر کے چلا گیا۔ حضرات ابوبکر صدیق اور علی رضی اللہ عنہما نے انکشاف کیا کہ وہ خضر علیہ السلام تھے۔

(ii) عَنْ عَلِيٍّ كَرَّمَ اللّٰهُ وَجْهَه' قَالَ: يَجْتَمِعُ فِيْ كُلِّ يَوْمِ عَرَفَةَ جِبْرَئِيْلُ وَمِيْكَائِيْلُ وَاِسْرَافِيْلُ وَ الْخِضْرُ (الزهر النضر لابن حجر عسقلانی)

حضرت کرّم اللہ وجہہ، فرماتے ہیں کہ جبریل، میکائیل اور اسرافیل فرشتے اور خضر علیہم السلام ہر سال سرزمینِ عرفات میں جمع ہوتے ہیں۔

(iii) عَنْ عَبْدِالْعَزِيْزِ بْنِ رَوَّادٍ قَالَ: يَجْتَمِعُ الْخِضْرُ وَالْيَاسُ بَيْتَ الْمَقْدِسِ فِيْ شَهْرِ رَمَضَانَ مِنْ أَوَّلِهٖ إِلٰى آخِرِهٖ (تفسیر نعیمی، ج ۱۵، ص ۷۱۵)

عبدالعزیز رَوّاد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرات خضر اور الیاس علیہما السلام ماہِ رمضان المبارک میں بیت المقدس میں برابر طور پر (مسلسل) رہتے ہیں۔

(۱۱۴) خُلع (KHUL'A)

لغوی طور پر خلع کا معنیٰ ہے اُتارنا۔ کہا جاتا ہے: خَلَعَ الرَّجُلُ ثَوْبَہ' خَلعًا (آدمی نے اپنا کپڑا اتار دیا) فقہی اصطلاح میں خلع کا لفظ رشتۂ زوجیت کو ختم کرنے کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔

دینِ اسلام نے جہاں مرد کو طلاق کا حق دیا ہے' وہاں عورت کو خلع کا حق دیا ہے۔

خلع کی حکمت: اسلام خاوند کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ زبردستی اپنی بیوی کو رشتۂ ازدواج میں منسلک رکھے اگرچہ وہ اُس سے نفرت کرتی ہو' یا وہ اُس کے غیرانسانی رویّہ سے تنگ آ گئی ہو اور صلح کی تمام کوششیں ناکام ہو گئی ہوں۔ ایسی صورت میں اسلام رشتۂ ازدواج میں بندھے رہنے کی وجہ سے عورت کو ذہنی تناؤ اور رنج و اَلم میں مبتلا نہیں دیکھنا چاہتا۔ ایسی ناخوشگوار صورت سے نجات پانے اور مسئلہ کے حل کے لئے قرآنِ حکیم نے عورت کو خلع کا حق عطا کیا جس کا اشارہ سورۃ البقرۃ کی اس آیت میں ملتا ہے:

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَاللّٰہِ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِہٖ (البقرۃ: ۲۲۹)
''اگر تمہیں خوف ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدوں کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو اُن پر کوئی حرج نہیں کہ عورت کچھ فدیہ دے کر جان چھڑا لے۔'' (۲ : ۲۲۹)

یعنی خلع کی صورت میں اگر عورت اپنے خاوند کو کچھ دے کر طلاق حاصل کر لے تو خاوند کو بدلہ میں کچھ لینے میں اور عورت کو کچھ دینے میں اور عورت کا طلاق حاصل کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔

جوازِ خلع: سورۃ البقرۃ کی آیتِ مذکورہ ۲۲۹ کے الفاظ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِہٖ (تو عورت مرد کو جو کچھ بدلے دے کر خود کو چھڑا لے تو اس میں اُن دونوں پر کوئی گناہ نہیں) جوازِ خلع پر دلالت کرتے ہیں۔

خلع کا طریقہ یہ ہے کہ ایسی ناخوشگوار صورت کے پیدا ہونے پر عورت حاکمِ وقت کے پاس خلع کا مطالبہ کرے اور حاکم پہلے اُن کی مصالحت کی کوشش کرے گا۔ اگر کامیابی نہ ہو تو خاوند نے عورت کو مہر میں جو کچھ دیا تھا' حاکم اُسے لے کر خاوند کو واپس کر دے اور اُن کے درمیان تفریق کر دے۔ یہ خلع ہے اور اس کا حکم طلاقِ بائن کا ہے۔

فقہائے احناف نے تصریح فرمائی ہے کہ اگر زیادتی خاوند کی طرف سے ہے تو اُسے خلع کرتے وقت بیوی سے کچھ لینا مناسب نہیں اور اگر زیادتی بیوی کی ہے تو جتنا اُس نے بیوی کو دیا تھا' اُتنا اُسے لینا مباح ہے اور اُس سے زیادہ لینا مکروہ ہے۔ مخلوعہ کی عدت بھی تین حیض ہے۔ اس حکم کے نزول کی وجہ محدّثینِ کرام نے یہ لکھی ہے کہ ثابت بن قیس کی بیوی جمیلہ بنتِ عبداللہ نے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر عرض کی: لَا اَنَا وَلَا ثَابِت '' لَا یَجْمَعُ رَأْسِیْ وَرَأْسُہٗ شَیْءٌ'' (میرا سر اور ثابت کا سر ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتا یعنی ہم ایک ساتھ نہیں رہ سکتے)۔ اس نفرت کی سوائے اس

کے کوئی وجہ نہ تھی کہ جمیلہ کو اُن کی شکل پسند نہ تھی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: کیا تم وہ باغ واپس کرنے کے لئے تیار ہو جو ثابت نے تمہیں مہر میں دیا تھا؟ جمیلہ نے کہا: ہاں، وہ بھی اور کچھ اور بھی دینے کو تیار ہوں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے وہ باغ حضرت ثابت کو واپس کر دیا اور اُن میں تفریق کر دی۔ (صحیح بخاری، ج ٦؛ السنن الکبریٰ للبیہقی، ج ٧، ص ٣١٣؛ مشکوٰۃ المصابیح للتبریزی، ج ٣، ص ٢٠٨؛ کتاب السنن الکبریٰ لامام النسائی، ج ٥، ص ٣٦٩) بحوالہ (Ali Asghar Chishti's "Islam and Women" page : 32)

نوٹ: یہ پہلا خلع تھا جو اسلام میں ہوا۔

بلا سبب خلع طلب کرنا : جو عورت اپنے خاوند سے بلا وجہ خلع طلب کرے، اُس کے بارے میں احادیث میں سخت وعید آئی ہے اور ایسی عورت پر جنت کی خوشبو حرام ہے جیسا کہ رسالتمآب ﷺ نے فرمایا:

اَیُّمَا امْرَأَۃٍ سَأَلَتْ زَوْجَھَا فِیْ غَیْرِمَا بَاْسٍ فَحَرَام" عَلَیْھَا رَائِحَۃُ الْجَنَّۃِ (سنن ترمذی، سنن ابن ماجہ، سنن ابی داؤد)

''جو عورت اپنے خاوند سے کسی جائز وجہ کے بغیر خلع طلب کرے تو اُس پر جنت کی خوشبو حرام ہے۔''

خلع بغیر عدالت جائز ہے : اس بارے میں فقہاء کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے۔ قرآن مجید اور سنتِ رسول اللہ ﷺ بھی بغیر عدالت خلع کے جواز کو واجب کرتے ہیں۔ قرآنِ حکیم میں ہے:

(١) فَلَا جُنَاحَ عَلَیْھِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِہٖ (البقرۃ : ٢٢٩)

''اُن دونوں پر کوئی گناہ نہیں اگر عورت کچھ فدیہ دے کر گلو خلاصی کرا لے۔'' اور

(٢) وَلَا تَعْضُلُوْھُنَّ لِتَذْھَبُوْا بِبَعْضِ مَا آتَیْتُمُوْھُنَّ اِلَّا اَنْ یَّاْتِیْنَ بِفَاحِشَۃٍ مُّبَیِّنَۃٍ (النساء:١٩)

''اور اُنہیں اس غرض سے نہ روکے رکھو کہ جو مال تم نے اُنہیں دیا تھا، اُس میں سے کچھ (واپس) لے جاؤ سوائے اس کے کہ وہ کھلی بدکاری کی مرتکب ہوں۔'' (١٩ : ٤)

اگر شوہر خلع دینے سے انکار کرے : اور بیوی خلع لینے پر بضد ہو تو وہ دونوں اپنے اپنے خاندانوں میں سے ایک ایک ثالث مقرر کریں گے۔ یہ دونوں ثالث جو فیصلہ کریں، اُسے فریقین قبول کریں گے۔ چنانچہ ذیل میں درج ارشادِ ربانی میں اسی طرف اشارہ ہے:

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَیْنِھِمَا فَابْعَثُوْا حَکَمًا مِّنْ اَھْلِہٖ وَحَکَمًا مِّنْ اَھْلِھَا (النساء : ٣٥)

''اور اگر تمہیں اُن دونوں کے درمیان مخالفت کا اندیشہ ہو تو تم ایک منصف مرد کے خاندان سے اور ایک منصف عورت کے خاندان سے مقرر کر لو۔'' (٣٥ : ٤)

آیت میں لفظ ''حکم'' (تصفیہ کرانے والا) سے مراد ایسا شخص ہے جو اُن میں تصفیہ کرانے کی صلاحیت رکھتا ہو اور طرفین سے اُن کے کنبہ والوں میں سے دو اشخاص کو طلب کرنے کے لئے اس لئے فرمایا کہ اہلِ خاندان کو بہ

نسبت اجنبی اشخاص کے اُن کے مزاجوں میں زیادہ اثر ہے کیونکہ کنبہ والے ہی اُن کے اندرونی معاملات سے باخبر ہوتے ہیں اور وہی جان سکتے ہیں کہ اُن کی مصالحت کا کون سا طریقہ ہے۔ علاوہ اس کے باہمی مخالفت کے اسباب کا تعلق اُن کے داخلی معاملات سے ہوتا ہے اور میاں بیوی یہ پسند نہ کریں گے کہ اُن باتوں کو غیروں پر افشاء کیا جائے۔ پس کنبہ والوں کو فیصلہ کنندہ مقرر کرنے میں جو حکمت ہے' وہ ظاہر ہے۔ (''کتاب الفقہ'' لعبد الرحمٰن الجزیری' جلد سوم' صفحہ ۲۲۷)

خلع میں رجوع کا حق : چاروں ائمہ کرام اور جمہور علماء کے نزدیک خلع کی صورت میں مرد عدّت کے دوران عورت کی مرضی کے بغیر اُس سے رجوع نہیں کر سکتا کیونکہ عورت نے مال دے کر خود کو آزاد کرا لیا ہے۔ اس امر پر سب علماء کا اتفاق ہے کہ اگر مرد اور عورت دونوں رضامند ہوں تو خلع کے بعد دورانِ عدّت نکاحِ جدید کر سکتے ہیں۔

خلع کی عدّت : حضرت عمر فاروق' حضرت علی' حضرت ابن عمر' سعید بن مسیّب' سلمان بن یسار' سالم' عمر بن عبدالعزیز' زُہری' حسن' شعبی' ابراہیم نخعی' قتادہ' لیث' سفیان ثوری' امام ابو حنیفہ' امام شافعی' امام احمد بن حنبل رضوان اللہ علیہم اجمعین وغیرہ اکثر اہلِ علم کے نزدیک خلع کی عدّت طلاق کی طرح تین حیض ہے۔

خلع طلاق ہے یا فسخ ؟ جمہور فقہاء کے نزدیک خلع ایک طلاق بائن ہے۔ سعید بن مسیّب نے فرمایا کہ رسولِ اکرم ﷺ نے خلع کو ایک طلاق قرار دیا ہے۔

جیسا کہ اوپر حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ اور اُن کی بیوی جمیلہ کے خلع کا واقعہ مذکور ہوا جس میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جمیلہ سے پوچھا تھا: اَتَرُدِّيْنَ عَلَيْهِ حَدِيْقَتَه' (کیا تم ثابت بن قیس کا باغ واپس کرنے کو تیار ہو؟) تو جمیلہ نے کہا: ہاں۔ آپ ﷺ نے ثابت بن قیس سے فرمایا: اَقْبَلِ الْحَدِيْقَةَ وَطَلِّقْهَا تَطْلِيْقَةً (باغ لے لو اور اُسے ایک طلاق دے دو)۔ اس حدیثِ مبارکہ میں رسولِ اکرم ﷺ نے ''طلاق'' کا لفظ استعمال کیا ہے جو اس پر دلالت کرتا ہے کہ خلع طلاق ہے۔

خلع کے اسباب : بعض فقہاء کے نزدیک خلع صرف اِسی صورت میں جائز ہے جب شوہر اور بیوی دونوں کو یہ خوف اور اندیشہ ہو کہ وہ دونوں حدود اللہ کو قائم نہ رکھ سکیں گے۔ آیت اِلَّا اَنْ يَّخَافَا اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللهِ (البقرۃ: ۲۲۹) کا ظاہر اس موقف کی تائید کرتا ہے۔

جمہور فقہاء کہتے ہیں کہ خلع ہر صورت میں جائز ہے' خواہ قیام حدود اللہ کے سلسلہ میں حالتِ خوف پائی جاتی ہو یا نہ پائی جاتی ہو۔ اُن کی دلیل یہ آیت ہے :

فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓئًا مَّرِيْٓئًا O (النسآء : ۴)

''اگر وہ اس (مہر) میں سے کچھ تمہارے لئے اپنی خوشی سے چھوڑ دیں تو اُسے (اپنے لئے) سازگار

اور خوشگوار سمجھ کر کھاؤ۔'' (۴ : ۴)

جب عورت کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ طلاق حاصل کئے بغیر اپنا مہر ہبہ کر سکتی ہے تو بدل دے کر اپنے نفس کی مالکہ بن جانا اُس کے لئے بدرجہ اولیٰ جائز ہے۔

حُدودُ اللہ کی تفسیر میں طاؤس اور قاسم بن محمد علیہما الرحمۃ کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ معاشرت اور رفاقت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اُن دونوں پر فرض کر دی تھی۔

حُدودُ اللہ قائم نہ رکھ سکنے کا خوف دو صورتوں میں ہو سکتا ہے :

(۱) ایک یہ کہ شوہر اور بیوی دونوں میں سے ایک بداخلاق ہو یا دونوں ایسے ہوں کہ حقوقِ نکاح میں سے اُن پر لازم ہونے والے حدود اللہ کو وہ قائم نہ رکھ سکیں گے۔ ان حقوقِ نکاح کا ذکر سورۃ البقرۃ میں یوں کیا گیا ہے:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِىْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (البقرة : ۲۲۸)

''اور ان عورتوں کا حق اُن (مردوں) پر اُسی طرح ہے جیسے دستور کے مطابق (مردوں کا حق) اُن عورتوں پر ہے۔''

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ اُن دونوں میں سے ایک کے لئے دوسرے کے دل میں بغض ہو جس سے باہمی حسنِ معاشرت اور حسنِ سلوک متاثر ہو جائے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کی خلاف ورزی ہو' اُس کے لازم کردہ حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی اور کمی واقع ہو جائے اور ایک بیوی سے ہٹ کر دوسری بیوی کی طرف اظہارِ میلان کرے جس سے اس آیت میں منع کیا گیا ہے:

فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ (النساء : ۱۲۹)

''پس (ایک کی طرف) پورے میلانِ طبع کے ساتھ (یوں) نہ جھک جاؤ کہ دوسری کو (درمیان میں) لٹکتی ہوئی چیز کی طرح چھوڑ دو۔'' (۱۲۹ : ۴)

جب مندرجہ بالا دونوں صورتوں میں کوئی ایک صورت پیش آ جائے اور مرد و عورت کو یہ اندیشہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اُن دونوں کے لئے جو حدود لازم کی ہیں' اُنہیں وہ قائم نہ رکھ سکیں گے تو خلع لینا جائز اور حلال ہوگا۔

<u>خلع سے متعلق چند اصول وضوابط</u> : (۱) اگر بیوی ازدواج کے بندھن سے آزاد ہونا چاہتی ہے تو اُسے خاوند کی طرف سے دئے گئے حقِ مہر کو چھوڑ دینے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

(۲) خلع لینے والی عورت کے عقدِ ثانی کی عدت تین حیض ہیں۔

(۳) خلع دینے کے بعد خاوند کو اُس سے قربت کا کوئی حق نہیں کیونکہ اُس نے خاوند کو کچھ معاوضہ دے کر اُس سے اپنی گلو خلاصی کرالی ہے۔

(۴) ''اگر والد نے اپنی بیٹی کی طرف سے خلع کیا اور ادائیگی مال کا ضامن ہوا تو خلع جائز ہوگا اور مال کی ادائیگی لازمی ہوجائے گی ورنہ نہ ہوگی۔'' (''کتاب الفقہ'' لعبدالرحمٰن الجزیری' ج ۴' ص ۳۳۷)

(۵) اگر خاوند اپنی بیوی پر معاملہ خلع کے لئے تشدد کرے اور اُسے دکھ پہنچائے تاکہ اُس سے فدیہ وصول کرلے تو اس طرح پر کوئی مال اُس سے وصول کرنا خاوند کے لئے حرام ہے خواہ وہ مالِ مہر ہو یا کوئی اور مال ہو۔ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اسی طرف اشارہ کرتا ہے کہ فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا (سورۃ النساء: ۲۰) (یعنی بیوی کو جو کچھ دے چکے ہو' اُس میں سے کچھ واپس نہ لو)۔

(۶) بیوی کو دکھ پہنچانے کا ثبوت ایک شخص کی اپنی چشم دید شہادت سے یا کسی کی سمعی شہادت سے بھی ہوسکتا ہے۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ گواہی دینے والا معتبر شخص ہو بلکہ پڑوسیوں میں سے کسی کا بھی بیان کرنا کافی ہے بشرطیکہ بیوی خاوند کی ایذا دہی کا جو الزام لگا رہی ہے' اُس کے لئے حلف اٹھالے۔ بعض اصحاب کے نزدیک گواہوں سے حلف لینا بہتر ہے۔

(۷) تصفیہ کنندگان کو یہ حق نہیں ہے کہ عورت کو طلاق دیں۔ کیونکہ طلاق کا اختیار خاص خاوند کو حاصل ہے یا پھر اُسے حاصل ہے جسے خاوند نائب بنائے اور خلع کے معاملہ میں مالِ مہر بیوی کا حق ہوتا ہے۔ یعنی اگر خاوند تصفیہ کنندگان کو طلاق کے لئے اپنا نائب بنادے تو اس صورت میں اُنہیں یہ حق حاصل ہوگا۔ (کتاب الفقہ لجزیری)

<u>معاوضہ خلع کی چند شرائط</u> : (۱) معاوضہ ایسی شے کی شکل میں ہونا چاہئے جس کی کوئی قیمت ہو لہٰذا کوئی معمولی سی چیز جس کی کوئی قیمت نہیں ہے' مثلاً گندم کے ایک دانے کو خلع کا معاوضہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔

(۲) وہ مال پاکیزہ اور حلال ہو اور جس کا استعمال میں لانا درست ہو۔ شراب' سؤر' مردار یا خون کو خلع کا معاوضہ نہیں بنایا جاسکتا۔ شریعتِ اسلامیہ کی نگاہوں میں ایسی اشیاء کی کوئی قیمت نہیں ہے اگرچہ اُن میں سے کچھ اشیاء ایسی ہیں جن کی غیر مسلموں کے نزدیک قیمت ہے۔ اس ضمن میں یہ بھی ضروری ہے کہ وہ شے غصب کی ہوئی نہ ہو۔

(۳) معاوضہ کی شے کے لئے یہ شرط نہیں ہے کہ وہ چیز اُس وقت موجود ہو یعنی اگر غیر موجود شے کے عوض خلع کیا تو درست ہے مثلاً جانور کے پیٹ میں جو بچہ ہے' اُس کے عوض خلع کرنا درست ہے۔ پس اگر عورت نے اپنی مملوکہ اونٹنی کے حمل کے عوض خلع کیا اور جب اونٹنی بچہ دے تو وہ خاوند کا ہوگا تو خلع جائز ہے۔ اگر بچہ مردہ پیدا ہوا تو خاوند کا مال ضائع ہوا اور بیوی سے اُس کا مطالبہ نہیں ہوسکتا۔

(۱۱۵) طفل کشی (Killing of Children)

جاہلی عربوں کے کچھ قبائل اپنی لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کے جرم کے عادی تھے۔ ایسے معاشرہ میں جو ہمہ وقت مسلسل طور پر برسرِ پیکار اور شمشیر بکف رہتا تھا' لڑکا اُن کے لئے زورِ بازہ اور غلبے کا ذریعہ تھا جبکہ اُن کے لئے لڑکی کا وجود کمزوری اور ذلت کا باعث تھا۔ اُن کے نزدیک لڑکی کی پیدائش کلنگ کا ٹیکہ سمجھا جاتا تھا اور اُن میں نوزائیدہ بچی کے زندہ درگور کرنے کا عمل عام تھا۔ Robertson Smith لکھتا ہے:

''عرب کے کچھ قبائل بالخصوص بنو تمیم کا بچیوں کو زندہ درگور کرنا ایک جانی پہچانی حقیقت ہے۔'' ("Kinship and Marriage in Early Arabia", p. 153)

اب بھی دوسرے ممالک میں اقتصادی وجوہ کے باعث طفل کشی ایک جانا پہچانا فعل ہے۔ بچوں کی زندگی سے متعلق اس جرم کو قرآنِ حکیم نے گناہِ کبیرہ کہا ہے اور ایسے سنگین جرم پر یوں تہدید سنائی ہے:

وَلَا تَقْتُلُوٓا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْأً كَبِيرًا ○

(بنی اسرائیل : ۳۱)

''اور اپنی اولاد کو ناداری کے اندیشہ سے قتل مت کیا کرو' ہم اُنہیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمہیں بھی' بے شک اُن کا قتل کرنا بہت بڑا جرم ہے۔'' (۱۷ : ۳۱)

یہاں یہ ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ وہ نظریہ بہت ہی غلط قسم کا ہے جو نسل کو گھٹانے اور محدود کرنے کی طرف لے جاتا ہو۔ معاشیات کے صحیح قوانین ہی دوسرے ہیں۔ قتلِ اولاد کی یہ ملعون رسم دختر کشی کے علاوہ ہے۔ افلاس کا ذکر اس لئے فرمایا کہ فلاسفہ مادیین اور مفکرینِ جاہلیت اپنے نظریہ کی عقلی توجیہ عموماً یہی کرتے ہیں۔ چنانچہ آج جاہلیتِ فرنگ کے زیرِ سایہ جو شاندار تحریکِ قتلِ اولاد کی ''منعِ حمل'' کے نام سے جاری ہے' اُس کا محرک بھی یہی خوفِ افلاس ہے۔

سورۃ الانعام میں طفل کشی کے مشغلہ کو تند و تیز لہجہ میں ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے:

قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ قَتَلُوٓا أَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوا وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ○ (الانعام : ۱۴۰)

''واقعی وہ لوگ برباد ہو گئے جنہوں نے اپنی اولاد کو بغیر علم (صحیح) کے (محض) بیوقوفی سے قتل کر ڈالا اور اُن (چیزوں) کو جو اللہ نے اُنہیں (روزی کے طور پر) بخشی تھیں' اللہ پر بہتان باندھتے ہوئے حرام کر ڈالا' بے شک وہ گمراہ ہو گئے اور ہدایت یافتہ نہ ہو سکے۔'' (۶ : ۱۴۰)

یہ اختیار کہ آیا بیچاری لڑکی کو نفرت و برداشت کی چیز سمجھ کر رکھا جائے جس سے وہ کنبے کی ذلت و بدنامی کا سبب بنے یا اُسے زندہ درگور کر کے اُس سے چھٹکارا پایا جائے' درحقیقت ایک ظالمانہ اور ناقابلِ دفاع فعل تھا۔

۲۹۷۔۴ (طفل کشی ۔۔۔Killing of Children)

سورۃ النّحل میں قرآن مجید اس افسوسناک صورتِ حال کی یوں نقشہ کشی کرتا ہے :۔

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُھُمْ بِالْاُنْثٰی ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّھُوَ كَظِيْمٌ O يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ O (اَلنَّحل : ۵۸، ۵۹)

''اور جب اُن میں سے کسی کو لڑکی (کی پیدائش) کی خبر سنائی جاتی ہے تو اُس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ غصّہ سے بھر جاتا ہے۔ وہ اُس بری خبر کی وجہ سے جو اُسے سنائی گئی ہے' لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے' (اب یہ سوچنے لگتا ہے کہ) آیا اُسے ذلت و رسوائی کے ساتھ (زندہ) رکھے یا اُسے مٹی میں دبا دے' خبردار! وہ کتنا ہی بُرا فیصلہ کرتے ہیں!'' (۵۸، ۵۹ : ۱۶)

سورۃ الزُّخرف میں انتہائی تند و تیز تنقیدی انداز میں کہا گیا ہے کہ جس لڑکی سے وہ خود نفرت کرتے ہیں اور اُسے اپنے لئے ذلت و رسوائی سمجھتے ہیں' اُسے اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں!

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُھُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّھُوَ كَظِيْمٌ O (اَلزُّخرف:۱۷)

''جب اُن میں سے کسی کو اُس کی بیٹی کی پیدائش کی خبر دی جاتی ہے جسے اُنہوں نے رحمان کی شبیہ بنا رکھا ہے' تو اُس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے درآنحالیکہ وہ غم و غصّہ سے بھرا ہوتا ہے۔'' (۱۷ :۴۳)

''کوئی شک نہیں کہ دختر کشی کے فعل کا اصل محرک قرآن کی رُو سے غربت و افلاس تھا اور یہ ایک جانی پہچانی بات ہے کہ یہی سبب دوسرے ممالک میں طفل کشی کا محرک بنا ہے۔'' (Hastings' Encyclopaedia of Religion and Ethics, p. 669)

اس دنیا میں زندہ گاڑی ہوئی بچی سے ہمدردی کرتے ہوئے اُس سے روزِ قیامت پوچھا جائے گا کہ کس جرم کی پاداش میں اُسے بے رحمی سے زندہ درگور کر دیا گیا :

وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ہ بِاَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ O (اَلتَّکویر : ۸، ۹)

''اور جب زندہ دفن کی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ کے باعث قتل کی گئی تھی۔'' (۸، ۹ : ۸۱)

یہ نہیں فرمایا گیا کہ اُس کے سنگ دل باپ سے پوچھا جائے گا کہ تو نے اپنی بچی کو کیوں زندہ درگور کیا بلکہ فرمایا کہ اُس بچی سے پوچھا جائے گا کیونکہ یہ باپ جس نے اپنی بے گناہ بچی پر ایسا ظلم کیا ہے' نگاہِ خداوندی میں اِس قابل ہی نہیں کہ اُسے خطاب کیا جائے (روح المعانی) یعنی اس انداز سے اپنے غصّے اور ناراضگی کی انتہا کا اظہار کیا گیا' اُسے مخاطب بنانے کے درجے سے ہی گرا دیا گیا اور اُسے رسوا کرنے میں مبالغہ سے کام لیا گیا۔ نیز ظالم سے اگر اُس کے ظلم کے بارے میں پوچھا جائے تو وہ اس کے لئے کئی حیلے بہانے تراشنے لگتا ہے۔ اس لئے مناسب یہی تھا کہ مظلوم سے پوچھا جائے تاکہ وہ اپنے غم و الم کی داستان بیان کرے۔ تفسیر روح المعانی میں اس وجہ کو یوں بیان کیا گیا ہے:۔

۲۹۷۵ (طفل کشی ---Killing of Children)

اِظْهَارُ كَمَالِ الْغَيْظِ وَالسَّخْطِ لِوَائِدِهَا وَاِسْقَاطُه مِنْ دَرَجَةِ الْخِطَابِ وَالْمُبَالَغَةُ فِيْ تَبْكِيْتِهٖ

''اُس بچی کے زندہ درگور ہونے کے باعث اُسے دفن کرنے والے سے خطاب نہ کرنے میں انتہائی غیظ و غضب کا اظہار ہے اور اُسے مخاطب بنانے کے درجے سے ہی گرا دیا گیا اور اُسے رسوا کرنے میں مبالغہ سے کام لیا گیا۔''

اِس میں ایک اور حکمت بھی ہے۔ وہ یہ کہ دنیا میں کئی مظلوم ہوتے ہیں جنہیں ظلماً قتل کیا جاتا ہے لیکن اُن کا انتقام لینے کے لئے کئی تلواریں بے نیام ہو جاتی ہیں یا کم از کم اُن کی مظلومیت پر رنج و غم کے آنسو تو بہائے جاتے ہیں اور یہ ایسی مظلومہ تھی جس پر ظلم اُس کے ماں باپ نے کیا۔ اُس کی مظلومیت پر کسی نے صدائے احتجاج بھی بلند نہ کی' اُس کی جواں مرگی پر کوئی آنکھ نمناک تک نہ ہوئی بلکہ الٹا اطمینان کا سانس لیا گیا' اُس کے قاتل پر تحسین و آفرین کے پھول نچھاور کئے گئے' اُسے ''غیرتمند'' اور اپنے ''خاندان کی ناموس کے پاسبان'' کا خطاب دیا گیا۔ کیا مظلومیت میں اس کا کوئی ہمسر ہے؟ اگر ایسی معصوم' ستم رسیدہ بچی کی دلجوئی اُس کا پروردگار بھی نہ کرے تو اور کون کرے گا؟

اِس سوال میں قیامت کے برپا کرنے کی حکمت کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ تم خود سوچو کہ اگر قیامت برپا نہ ہو تو کیا اس مظلومہ کی دادرسی کی کوئی اور صورت ہو سکتی ہے۔ اگر اتنا بڑا دلوں کو لرزا دینے والا ظالم محاسبہ سے بچ جائے تو اس سے بُری اندھیر گردی اور کیا ہو سکتی ہے! وہاں اندھیر گردی اور جور و ستم نہیں بلکہ عدل و انصاف ہے۔

سورۃ الانعام کی آیت ۱۵۱ اور سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۳۱ میں قرآنِ حکیم کا کیا گیا وعدہ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ (ہم اُنہیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی) مالتھس اور اُس کے ہمنواؤں کے نظریہ سے متصادم ہے۔ الٰہی وعدہ کی رُو سے انسانی آبادی ذرائع روزگار کے تناسب سے ہے اور قدیم اقتصادی کہاوت مکمل طور پر سچی ثابت ہوئی ہے کہ ''جب آبادی میں ہر اضافے کا مطلب کھانے کے لئے ایک اور جان ہے تو اس کا مطلب ہاتھوں کا ایک اور جوڑا بھی ہے۔''

<u>اسقاطِ حمل</u> : مسلمان فقہاء سب اس بات پر متفق اور ہم آواز ہیں کہ جب جنین (کچا بچہ Foetus) مکمل طور پر بن جائے اور اُس میں روح پڑ جائے تو اُس کا اسقاط کرانا حرام ہے۔ یہ جرم بھی ہے جس کے ارتکاب سے مسلمانوں کو روکا گیا ہے کیونکہ یہ ایک مکمل زندہ انسان کو ضائع کرنے کا سنگین گناہ ہے۔ تاہم ایک استثنائی صورت ہے اور وہ یہ کہ جیسا کہ فقہاء کہتے ہیں کہ بچے کی مکمل تشکیل کے بعد اس بات کا پُر اعتماد طور پر یقین ہو جائے کہ اگر حمل کو ضائع نہ کرایا گیا تو وہ لازمی طور پر ماں کی موت پر منتج ہوگا تو شریعت کے اس عمومی اصول کی رُو سے کہ دو بری باتوں میں سے کم تر برائی کو اختیار کیا جائے' اسقاطِ حمل کرا دیا جائے۔

''ماں جنین (Foetus) کا منبع اور مخرج ہے۔ وہ اپنے کچھ فرائض اور ذمہ داریوں کے ساتھ زندگی

میں مستحکم ہے اور وہ گھر کا ستون بھی ہے۔ تو ایک ایسے جنین کی زندگی کی خاطر اُس کا اپنی زندگی کو قربان کرنا ممکن نہ ہوگا جس نے ابھی کسی شخصیت کا روپ بھی نہیں دھارا اور جس کے ذمہ ابھی کوئی ذمہ داری یا فرض تفویض نہیں ہوا۔'' (الفتاوی للشیخ شلتوت' صفحہ ۱۶۴)

اسقاطِ حمل بمقابل مانعِ حمل ادویات: مانع حمل اور اسقاطِ حمل ایک دوسرے سے بالکل مختلف چیزیں ہیں۔ مسلمان فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ جنین میں روح پڑنے کے بعد اُسے گرانا حرام ہے کیونکہ یہ انسانی زندگی کے قتل سے کم نہیں' لہٰذا ایسے قبیح فعل کا ارتکاب بلا شک وشبہ جرم ہے۔ فقہاء تو یہاں تک کہتے ہیں کہ زندہ جنین کا اسقاط کرانے والے کو دیت (خوں بہا کی رقم) ادا کرنی چاہئے۔ Concise Encyclopaedia of Islam کی مندرجہ ذیل سطور قابلِ توجہ ہیں:

''بہت سے علمائے اسلام کے نزدیک اسلام میں اسقاطِ حمل اُس وقت تک قابلِ تسلیم ہے جب تک جنین مکمل طور پر نہیں بنتا جو حمل کے بعد 120 دن میں بنتا ہے۔ لہٰذا اِن 120 دنوں سے پہلے اسقاط کرانا جائز اور قابلِ تسلیم ہے۔ بعض فقہاء اس مدت میں اور بھی اضافہ کرتے ہیں۔ بہر حال اس مدت کے بعد ہونے والے اسقاط پر کوئی اعتراض نہیں اگر مقصد ماں کی صحت اور تحفظ ہو۔''

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے منعِ حمل اور اسقاطِ حمل کے مابین حدِّ فاصل قائم کی ہے:

''منعِ حمل اسقاطِ حمل کی طرح نہیں ہے۔ اسقاطِ حمل ایک زندہ وجود کے خلاف جرم ہے۔ اب وجود کے بھی کئی مدارج ہیں۔ وجود کا پہلا درجہ بچہ دانی میں مادہ منویہ کا قرار پکڑنا اور اُس کا عورت کی ریزش (Secretions) سے ملنا ہے۔ زندگی کی طرف یہ پہلا قدم ہے اور اس میں مزاحم ہونا یا خلل ڈالنا جرم ہے۔ جب وہ گومڑا (Lump) بن جائے تو اُس کا اسقاط کرانا اور بھی زیادہ جرم ہے۔ جب اُس میں روح پڑ جائے اور اُس کی تخلیق مکمل ہو جائے تو اُس کے اسقاط کا جرم اور بھی سنگین ہو جاتا ہے۔ یہ جرم انتہا کی سنجیدگی تک تب پہنچتا ہے جب اُس جنین کو ماں سے جدا کر دیا جائے۔'' (اِحیاء علوم الدین: کتاب النکاح' صفحہ ۴۷)

اسقاط کے قانونی جواز پر تحقیق: حمل کے چار ماہ گزرنے کے بعد شکمِ مادر کے بچے میں روح پھونکی جاتی ہے۔ پس اِس وقت کے بعد وہ بچہ ایک جاندار مخلوق بن جاتا ہے۔ اس لئے اس وقت اسقاطِ حمل کرانا ایک جاندار جی کو قتل کرنے کی وجہ سے سنگین جرم اور گناہِ کبیرہ ہے۔ حمل کے چار ماہ گزرنے کے بعد بچے میں روح کے پھونکے جانے کا ثبوت ذیل کی حدیثِ مبارکہ سے ثابت ہے:

قَالَ عَبْدُاللهِ ابْنُ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ: حَدَّثَنَا رَسُوْلُ اللهِ ﷺ وَهُوَالصَّادِقُ الْمَصْدُوْقُ قَالَ: إِنَّ أَحَدَكُمْ يُجْمَعُ خَلْقُهٗ فِیْ بَطْنِ أُمِّهٖ أَرْبَعِيْنَ يَوْمًا نُطْفَةً ثُمَّ يَكُوْنُ عَلَقَةً مِّثْلَ ذٰلِكَ ثُمَّ يَكُوْنُ مُضْغَةً مِّثْلَ ذٰلِكَ ثُمَّ يَبْعَثُ اللهُ مَلَكًا وَيُؤْمَرُ بِأَرْبَعِ كَلِمَاتٍ وَيُقَالُ لَهٗ: أُكْتُبْ عَمَلَهٗ وَرِزْقَهٗ وَأَجَلَهٗ وَشَقِیٌّ'' أَوْسَعِيْدٌ'' ثُمَّ يُنْفَخُ فِيْهِ الرُّوْحُ (صحیح بخاری' ج ۱' ص ۴۵۶)

''حضرت عبداللہ ابنِ مسعود رضی اللہ بیان کرتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے بتایا اور آپ سچے اور سچ سے تائید کئے گئے ہیں' آپ نے فرمایا: تم میں سے ہر ایک کی تخلیق اُس کے رِحمِ مادر میں کی جاتی ہے اور وہ وہاں قطفہ کی شکل میں چالیس دن تک رہتا ہے۔ پھر یہ خونِ بستہ کی ایک پھٹکی (علقة) بن جاتا ہے اور وہاں اُسی عرصہ (یعنی چالیس دن) تک رہتا ہے پھر یہی پھٹکی چالیس دنوں تک کے لئے گوشت کا ٹکڑا (مُضغة) بنی رہتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ کو یہ حکم دیتے ہوئے بھیجتا ہے کہ وہ چار باتیں لکھے: اُس کے اعمال (اچھے یا برے ہوں گے)' اُس کا رزق' اُس کی عمر اور آیا وہ بد بخت ہوگا یا نیک بخت۔ پھر اُس میں روح ڈال دی جاتی ہے۔''

یہ حدیثِ مبارکہ صاف طور پر بتاتی ہے کہ استقرارِ حمل سے چار ماہ بعد اِسقاطِ حمل حرام اور گناہِ کبیرہ ہے۔ اگر کوئی معالج یہ سب کچھ جانتے ہوئے اسقاطِ حمل کرتا ہے تو وہ بھی گنہگار ہوگا کیونکہ قرآن مجید کا حکم واضح ہے: وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (المائدة : ۲) یعنی گناہ اور زیادتی کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون نہ کیا کرو۔

اگر چار ماہ گزرنے کے بعد طبی ماہرین اُس کے حمل کو اُس کی زندگی کے لئے یقینی خطرہ سمجھتے ہیں تو اسقاطِ حمل نہ صرف جائز ہوگا بلکہ ناگزیر ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر اسقاط نہ کرایا جائے تو بچے اور حاملہ ماں دونوں کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی اور بچے کا جاندار پیدا ہونا محض ایک خیال اور تصور رہے جبکہ اس کے برعکس اُس کی حاملہ ماں کی زندگی بظاہر یقینی ہے۔ لہٰذا ایسی صورت میں اسقاطِ حمل ضروری ہو جاتا ہے۔ اسقاط کے مسئلے پر مصری عُلماء کی بھی ایسی ہی تحقیق ہے۔ (شرح صحیح مسلم' طبع ۱۲' جلد ۳' ص ۸۹۲ اَز غلام رسول سعیدی) فرید بک سٹال' اردو بازار' لاہور)

(۱۱۶) رشتہ داری اور اسلام (KINSHIP and ISLAM)

سورۃ الفُرقان کی آیت ۵۴ میں اللہ تعالیٰ نے نسب اور مصاہرت (سسرالی رشتہ) دونوں کے ذریعے رشتہ داری کو مستحکم اور مضبوط کرنے کا اشارہ دیا ہے اور فرمایا: فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا (اللہ تعالیٰ نے انسان کو نسب اور سسرال (کی قرابت) والا بنایا۔

پس کنبہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اِلقا شدہ اور اُسی کے حکم سے تشکیل پایا ہوا اِدارہ ہے جیسا کہ سورۃ النساء کی اوّل آیت میں بھی بیان ہوا ہے۔ وہ زمانے پر پھیلے ہوئے آزمائش اور خطا کے عمل سے ہوتا ہوا انسانی تجربے کا تدریجی ارتقاء نہیں ہے۔ یہ ادارہ انسان کی تخلیق کے ساتھ ہی معرضِ وجود میں آ گیا تھا۔ نسلِ انسانی اِسی ادارے کی پیداوار ہے نہ کہ کسی اور کی۔

کنبے کا اوّل اہم جزء والدین ہیں جو کنبے کے نظام میں حیات آفریں اور انتہائی نمایاں مقام رکھتے ہیں

اور جن کے حقوق و فرائض نہایت واضح طور پر قرآن اور سنتِ رسول ﷺ میں بالوضاحت بیان ہوئے ہیں۔ لہٰذا سب سے پہلے اُن کے حقوق و فرائض کی بات کرتے ہیں:۔

(الف) والدین

(1) والدین کے حقوق (اولاد کے فرائض)

عیسائیت، یہودیت، ہندومت اور بدھ مت سمیت دنیا کے تمام مذاہب میں والدین کی خدمت اور اُن کی اطاعت و فرمانبرداری پر زور دیا گیا ہے اور اس اطاعت و فرمانبرداری کو فرض قرار دیا گیا ہے۔ لیکن دوسرے مذاہب کی نسبت جو مابہ الامتیاز چیز اسلام کو متمیز کرتی ہے وہ یہ کہ اسلام نے اپنے ماننے والوں کو نہ صرف والدین کے حقوق کی ادائیگی کی ترغیب دی ہے بلکہ اُس نے اُن کے ساتھ حسنِ سلوک، رحم دلی، مہربانی و تلطف اور خوش اخلاقی سے پیش آنے پر خاصا زور دیا ہے۔ اس مہربانی اور رحم دلی کے ابتدائی الفاظ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ہیں۔ الٰہی ''ثواب'' کی اصطلاح میں مہربانی کا مرتبہ خدمت پر فائق ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اپنے والدین کی خدمت اُس تناسب سے نہیں کرنی چاہئے جو خدمت اُنہوں نے ہماری کی ہے بلکہ ہماری خدمت اتنی زیادہ اور وسیع ہونی چاہئے کہ وہ چشمِ ظاہر بیں کو ''احسان'' نظر آئے (اگرچہ ہمارے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ ہم اُن کی بے لوث اور بے غرض عنایات و نوازشات کا بدل دے سکیں)۔ اُن کے لئے ہمارا کلام مہربانی سے پُر ہونا چاہئے اور اس میں سرد مہری نہیں ہونی چاہئے۔

اسلام میں حقوقِ والدین کی اہمیت: حقوق العباد میں حقوقِ والدین سرِ فہرست ہیں۔ اُن کی افضل و فائق اہمیت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید والدین کے حقوق پر زور حقوق اللہ کے بیان سے بالکل متصل دیتا ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ حقوق اللہ کے بعد حقوقِ والدین کا مقام ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَآئِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا (البقرة: ۸۳)

''اور (یاد کرو) جب ہم نے اولادِ یعقوب سے پختہ وعدہ لیا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنا'' (۸۳ : ۲)

(۲) وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا (النسآء: ۳۶)

''اور اللہ کی عبادت کرو اور اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو۔'' (۳۶ :۴)

(۳) وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِندَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُل لَّهُمَا أُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُل لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا ۝ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُل رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا ۝ (بنی اسرائیل: ۲۳، ۲۴)

''اور آپ کے رب نے حکم فرما دیا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت مت کرو اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا اور اُنہیں مت جھڑکنا، اگر تمہارے سامنے دونوں میں سے کوئی ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں

اُنہیں اُف تک نہ کہنا اور اُنہیں مت جھڑکنا اور اُن دونوں کے ساتھ بڑے ہی ادب سے بات کیا کرنا۔ اور اُن دونوں کے لئے نرم دلی سے عجز و انکساری کے بازو جھکائے رکھنا اور (اللہ کے حضور) عرض کرتے رہنا: اے میرے پالنہار! ان دونوں پر رحم فرما جیسا کہ اُنہوں نے بچپن میں مجھے (رحمت وشفقت سے) پالا تھا۔''
(۲۳، ۲۴: ۱۷)

اگر انسان استطاعت کے باوجود اپنے والدین اور قرابتداروں کی خدمت گزاری میں کوتاہی کرے تو یہ ہرگز قابلِ برداشت نہیں لیکن ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ اولاد افلاس و تنگدستی میں گرفتار ہو اور خود نانِ شبینہ کی محتاج ہو تو اس مجبوری کے عالم میں وہ کس طرح والدین کی خدمت کرے گی؟ ایسے آدمی کو فرمایا کہ محبت بھرے نرم نرم لہجہ میں باتیں کرنے پر تو کوئی لاگت نہیں آتی۔ اگر اور کچھ نہیں کر سکتے تو اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے تو اُن کا دل لبھاتے رہو اور دل میں یہ عزم رکھو کہ جب مولا کریم نے مجھ پر رزق کا دروازہ کشادہ کیا تو میں اپنے والدین کی خدمت بجالانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کروں گا۔ چنانچہ فرمایا:

وَاِمَّا تُعۡرِضَنَّ عَنۡهُمُ ابۡتِغَآءَ رَحۡمَةٍ مِّنۡ رَّبِّكَ تَرۡجُوۡهَا فَقُلۡ لَّهُمۡ قَوۡلًا مَّيۡسُوۡرًا۝ (بنی اسرائیل: ۲۸)
''اور اگر (بوجہ تنگدستی) تجھے اُن سے منہ پھیرنا پڑے اور تم اپنے رب کی رحمت (یعنی خوشحالی) کے متلاشی ہو جس کی تمہیں توقع ہے تو (اس اثنا میں) اُن سے بات کرو تو بڑی نرمی سے کرو۔'' (۲۸: ۱۷)

حقوقِ والدین کی اہمیت کی بابت تاجدارِ انبیا علیہ السلام نے فرمایا:

(۱) رَغِمَ اَنۡفُ ثُمَّ رَغِمَ اَنۡفُ ثُمَّ رَغِمَ اَنۡفُ مَنۡ اَدۡرَكَ اَبَوَيۡهِ عِنۡدَ الۡكِبَرِ اَحَدُهُمَا اَوۡ كِلَيۡهِمَا فَلَمۡ يَدۡخُلِ الۡجَنَّةَ (صحیح مسلم: کتاب البرّ والصّلۃ)
''اُس شخص کی ناک خاک آلود ہو' اُس شخص کی ناک خاک آلود ہو' اُس شخص کی ناک خاک آلود ہو جس نے اپنے والدین کو اُن کے بڑھاپے میں ایک کو یا دونوں کو پایا (اور اُن کی خدمت کر کے) جنت میں داخل نہ ہوا۔

(۲) اَلۡكَبَائِرُ: اَلۡاِشۡرَاكُ بِاللّٰهِ وَعُقُوۡقُ الۡوَالِدَيۡنِ وَقَتۡلُ النَّفۡسِ وَالۡيَمِيۡنُ الۡغَمُوۡسُ (بخاری)
''کبیرہ گناہ یہ ہیں: اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا' والدین کی نافرمانی' کسی کو ناحق قتل کرنا اور جھوٹی قسم کھانا۔'' (صحیح بخاری: کتاب الایمان والنذور' باب: الیمین الغموس)

(۳) جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَاسۡتَاۡذَنَهُ فِي الۡجِهَادِ فَقَالَ: اَحَيٌّ وَالِدَاكَ قَالَ: نَعَمۡ قَالَ: فَفِيۡهِمَا فَجَاهِدۡ (صحیح بخاری: کتاب الجهاد باذن الوالدین' صحیح مسلم: کتاب البرّ والصّلۃ' باب: برّ الوالدین)
''ایک آدمی نبی علیہ السلام کے پاس آیا اور آپ سے جہاد کی اجازت مانگی' آپ نے اس سے پوچھا: کیا تیرے والدین زندہ ہیں؟ اُس نے کہا: جی ہاں۔ آپ نے فرمایا: (جا اُن کی خدمت کر) اُن کی خدمت کرنے میں جہاد ہے۔''

نوٹ: جہاد عام حالات میں فرضِ کفایہ ہے یعنی مسلمانوں کی پوری آبادی میں سے حسبِ ضرورت کچھ لوگ جہاد میں حصہ لیں تو سب کی طرف سے جہاد کا فرض ادا ہو جائے گا۔ اس صورت میں جہاد میں حصہ لینے کے لئے والدین کی اجازت ضروری ہے کیونکہ اُن کی خدمت فرضِ عین ہے۔ فرضِ کفایہ کی ادائیگی کے لئے فرضِ عین

کا چھوڑنا جائز نہیں ہے۔ حدیثِ مذکورہ میں اِسی صورت کا بیان ہے۔ البتہ بعض مخصوص حالات میں جہاد فرضِ عین ہو جاتا ہے تو اُس وقت والدین کی اجازت ضروری نہیں کیونکہ اُس وقت ہر شخص کے لئے جہاد میں حصّہ لینا ناگزیر ہوتا ہے، خصوصاً اُس وقت جب دشمن حد سے بڑھ جائے اور نظریاتی اور ملکی سرحدوں پر حملہ آور ہو۔'' (''ریاض الصالحین'' از ابوزکریا یحیٰی بن شرف النووی الدمشقی، ۶۳۱ - ۶۷۶ ھ - جلد اوّل، صفحات ۲۹۹، ۳۰۰)

اس تمہیدی بیان کے سمجھ لینے کے بعد حقوقِ والدین کو ذیل میں بیان کیا جاتا ہے :

(۱) والدین کی تعظیم و توقیر : اولاد پر اپنے والدین کی مکمل تعظیم و احترام کا اظہار لازم ہے۔ اپنی گفتگو اور زندگی کے ہر انداز میں اولاد کو اپنے والدین سے بڑا مہذّب ہونا چاہیئے۔ اگر کسی معاملہ میں والدین کے ساتھ اختلافِ رائے ہو تو اولاد کو اُن سے نرمی اور لطافت و نفاست سے پیش آنا چاہیئے۔ ابراہیم علیہ السلام کی مثال ہمارے سامنے ہے جب آپ کے چچا آزر نے آپ کو اپنے گھر سے نکال دیا تو ابراہیم علیہ السلام ذرّہ بھر اُس سے گستاخی اور درشت مزاجی سے پیش نہیں آئے۔ یہاں ہم ابراہیم علیہ السلام کی اپنے مغرور و متکبر چچا کے ساتھ جمعیتِ خاطر کا موازنہ پاتے ہیں۔ آپ نے اُسے انتہائی مہذّب، شائستہ انداز میں کہا :

سَلاَمٌ عَلَیْکَ سَاَسْتَغْفِرُ لَکَ رَبِّیْ اِنَّہٗ کَانَ بِیْ حَفِیًّاO (مریم : ۴۷)

''(اچھا) تمہیں سلام! میں اب (بھی) اپنے رب سے تمہارے لئے بخشش مانگوں گا،
بے شک وہ مجھ پر بہت مہربان ہے۔'' (۱۹ : ۴۷)

(۲) والدین کی اطاعت اور فرمانبرداری : قرآن مجید اپنے ماننے والوں سے اطاعتِ والدین کی راہ میں وقت، دولت اور ہر قسم کی قربانی دینے کی توقع رکھتا ہے کیونکہ اُنہی کی اطاعت میں دونوں جہانوں کی نجات و مفاد مضمر ہے۔ قرآن مجید حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اپنے والد کے ساتھ فرمانبرداری کی ان لفظوں میں ستائش کرتا ہے جبکہ ابراہیم علیہ السلام نے اُنہیں بہ حکمِ الٰہی رب کے نام پر قربان کرنا تھا:

یٰاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَO (اَلصّٰفّٰت : ۱۰۲)

''اے ابّا جان! وہ کام (فوراً) کر ڈالئے جس کا آپ کو حکم دیا گیا ہے۔ اگر اللہ نے چاہا تو آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے۔'' (۳۷ : ۱۰۲)

سکھائے کس نے اسماعیل کو یہ آدابِ فرزندی

اطاعتِ والدین کے باب میں ذیل کی حدیث کا حوالہ بھی خالی از فائدہ نہ ہوگا:

''حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک عورت میرے رشتۂ ازدواج میں تھی جس سے مجھے بہت محبت تھی لیکن میرے والد عمر رضی اللہ عنہ اُسے پسند نہیں کرتے تھے۔ اُنہوں نے مجھے اُس عورت کو طلاق دینے کا کہا لیکن میں نے انکار کر دیا۔ جنابِ عمر نے بارگاہِ نبوی میں حاضر ہو کر سارا ماجرا کہہ سنایا تو نبی ﷺ نے مجھے بلا کر فرمایا: اُسے طلاق دے دو۔'' (سنن ابی داؤد، کتاب الاداب، باب: برّ الوالدین؛ جامع ترمذی، ابواب الطلاق)

نوٹ : اگر والدین کا حکم طلاق دینی و اخلاقی بنیادوں پر ہو تو اُس کی اطاعت ضروری ہے جیسا کہ اس حدیث میں ہے ۔ اگر اس کے اسباب کچھ اور ہوں تو پھر والدین کو ادب و احترام سے سمجھایا جائے تا کہ وہ بھی راضی ہو جائیں اور خواہ مخواہ عورت پر بھی ظلم نہ ہو ۔ (ایضاً)

اطاعتِ والدین کے سلسلہ میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ ''جنت کی خوشگوار خوشبو پانچ سو سال کی طے شدہ مسافت سے آئے گی لیکن والدین کے نافرمان لوگ اس سے محروم رہیں گے ۔'' (طبرانی)

(۳) خدمتِ والدین : اولاد کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے والدین کی لگا تار خدمت اور اُن کی نگرانی کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیں بالخصوص جب والدین بوڑھے ہو جائیں ۔ اس خدمت میں والدین کے طعام کا اہتمام' بیماری میں اُن کے علاج کا بہ خلوصِ دل انتظام اور اُن کی جملہ ضروریات کی بہ احسن طریق تکمیل شامل ہیں ۔ ارشادِ ربانی ملاحظہ ہو:

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلْ مَا اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ۔۔۔۔۔ (البقرۃ : ۲۱۵)
''آپ سے پوچھتے ہیں کہ (راہِ خدا میں) کیا خرچ کریں' فرما دیں جس قدر بھی مال خرچ کرو (درست ہے) مگر اس کے حقدار تمہارے ماں باپ ہیں ۔۔۔۔'' (۲ : ۲۱۵)

ایک مرتبہ ایک آدمی نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس یہ شکایت لے کر آیا کہ جو کچھ بھی وہ کماتا ہے' وہ سب اُس کا باپ لے جاتا ہے ۔ نبی اکرم ﷺ نے اُس کے والد کو معاملہ کی وضاحت کے لئے طلب فرمایا تو اُس نے کہا: اے اللہ کے رسول ! ایک وقت تھا جب میرا یہ لڑکا کمزور و ناتواں اور بے یار و مددگار تھا جبکہ میں اُس وقت تندرست و توانا تھا ۔ وہ خالی ہاتھ تھا جبکہ میں خوشحال تھا ۔ میں نے اپنی مملوکات سے اُس کا ہاتھ کبھی نہیں روکا تھا ۔ اب میں ضعیف و کمزور ہو گیا ہوں اور وہ توانا و مضبوط ہو گیا ہے' میں اب خالی ہاتھ ہوں جبکہ وہ خوشحال اور مرفہ الحال ہے ۔ وہ اتنا لالچی اور حریص ہے کہ وہ اپنی روزی اور اثاثہ مجھ سے چھپا کر ایک کونے میں لگا دیتا ہے ۔ اُس بوڑھے باپ کے اس بیان پر نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آنکھیں وفورِ جذبات میں آنسوؤں سے ڈبڈبا آئیں اور آپ نے اُس کے بیٹے سے فرمایا : اَنْتَ وَمَالُكَ لِاَبِيْكَ (تو بھی اور تیرا مال بھی تیرے باپ کا ہے ۔)

آپ نے یہ بھی فرمایا : ''تمہاری اولاد تمہارے لئے عطیۂ الٰہی اور نعمتِ خداوندی ہیں ۔ لہٰذا بغیر کسی تامل اور بغیر کسی جھجک کے اُن کی کمائی کھاؤ ۔''

(۴) والدین کے لئے دعائے مغفرت و بخشش : حقوقِ والدین اُن کے عرصۂ حیات تک ہی محدود نہیں بلکہ اُن کی وسعت اُن کی وفات کے بعد تک کو شامل ہے اور اولاد کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے والدین کے گناہوں اور خطاؤں کی معافی کے لئے اللہ سے دعائے مغفرت کرتے رہا کریں ۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان کو اپنی ہر نماز میں اپنے والدین کے لئے استغفار کرنے کی تعلیم دی گئی ہے (بحوالہ سورہ ابراھیم : ۴۱) ۔

اپنے والدین، مہمانوں اور مومنوں و مومنات کی مغفرت کے لئے تقریباً یہی دعا نوح علیہ السلام نے اپنے رب سے کی تھی جس کا حوالہ سورہ نوح کی آخری آیت (۷۱:۲۸) میں ہے۔

''حضرت ابو اُسید مالک بن ربیعہ الساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جس دوران ہم نبی اکرم ﷺ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ قبیلہ بنو سلمٰی کا ایک آدمی آیا اور کہنے لگا: اے اللہ کے رسول! کیا کوئی نیکی کا ایسا عمل ہے جسے میں اپنے والدین کے لئے اُن کی وفات کے بعد کروں؟ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: ہاں کیوں نہیں۔ یہ کہ اللہ تعالیٰ سے اُن کی مغفرت کی دعا کرتے رہو، اُن کی وفات کے بعد اُن کے وعدوں اور معاہدوں کو پورا کرو، اُن کی رشتہ داریوں سے میل ملاپ کو قائم رکھو اور اُن کے دوستوں کی تعظیم و تکریم کرتے رہو۔'' (سنن ابی داؤد: کتاب الادب، باب: برّ الوالدین)

(۵) والدین کے رشتہ داروں اور دوستوں سے خوش اخلاقی سے پیش آنا: اولاد کا یہ فرض ہے کہ والدین کی وفات کے بعد بھی والدین کے رشتہ داروں اور دوستوں سے خوشگوار اور دوستدارانہ تعلقات قائم رکھیں۔ اس مسئلہ کو اجاگر کرنے کے لئے ذیل کی احادیثِ مبارکہ اہم ہیں:

(i) ابنِ عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: والدین کے ساتھ کی گئی سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ اُن کی وفات کے بعد اُن کی اولاد والدین کے رشتہ داروں، دوستوں اور لواحقین سے خوشگوار تعلقات قائم رکھے۔ (صحیح مسلم)

(ii) نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: خالہ بہ منزلہ ماں کے ہے۔ (سنن ترمذی: ابواب البرّ والصّلۃ)

(۶) متفرق حقوق: مذکورہ بالا فرائض کے علاوہ اولاد کے لئے اِن فرائض کی تکمیل بھی ضروری ہے:

(i) والدین پر اگر کوئی قرضہ تھا، اُسے چکانا اور اُن کی طرف سے کئے گئے وعدوں اور معاہدوں کو پورا کرنا

(ii) والدین کی وصیّت کی تکمیل بشرطیکہ اُس میں کوئی خلافِ شریعت بات نہ ہو کیونکہ:

لَاطَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ

''خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت نہیں ہو سکتی۔''

(iii) محروم القسمت، مفلس و نادار، یتیموں، بیوگان، معذور اور بے بس لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے اگر والدین نے کوئی خیراتی ادارے قائم کئے ہوں، اُنہیں جاری رکھنا اور اُنہیں ترقی دینا بھی اولاد کا فرض ہے۔

(II) والدین کے فرائض (اولاد کے حقوق)

(۱) تحفظ حیات: اسلام کی آمد سے پہلے کچھ قبائلِ عرب اپنی بچیوں کو بھوک اور افلاس کے ڈر سے مار ڈالا کرتے تھے اور بہت سے ممالک میں طفل کشی عام تھی۔ قرآن مجید نے اس سنگین جرم اور گناہِ کبیرہ سے متعلق لوگوں کو سخت وعید سنائی ہے۔ آیات کا حوالہ اس مضمون کے آغاز میں دیا جا چکا ہے۔

۲۹۸۳ (رشتہ داری ۔۔KINSHIP)

جب پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کبیرہ گناہوں کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا :

اَنْ تَجْعَلَ لِلّٰهِ نِدًّا وَّهُوَ خَلَقَكَ وَأَنْ تَقْتُلَ وَلَدَكَ خَشْيَةَ اَنْ يَّطْعَمَ مَعَكَ اَوْتَزْنِيْ بِحَلِيْلَةِ جَارِكَ

''یہ کہ اللہ کے ساتھ تو کسی کو شریک کرے حالانکہ اُس نے تجھے پیدا کیا' اور یہ کہ تو اپنی اولاد کو اس ڈر سے مار ڈالے کہ وہ تیرے ساتھ بیٹھ کر کھائے گا یا یہ کہ تو اپنے پڑوسی کی بیوی سے زنا کرے۔'' (صحیح بخاری: تفسیر سورۃ البقرۃ ؛ صحیح مسلم: کتاب الادب' کتاب التوحید)

پس تعلیماتِ قرآنی نے باور کرایا کہ طفل کشی غیر معقول اور سنگین فعل ہے اور رضائے الٰہی کے خلاف ہے۔ اِن تعلیمات نے یہ بات بھی اچھی طرح ذہن نشین کرائی کہ روزی رساں وہی ہے جس نے اپنی مخلوقات کو پیدا کیا اور یہ کہ ''جبکہ انسانی آبادی میں ہر اضافے کا مطلب کھانے کے لئے ایک اور منہ ہے تو اس کا مطلب ہاتھوں کا جوڑا بھی تو ہے۔'' اس طرح تعلیماتِ قرآنی اور نبی اکرم ﷺ کی اس سنگین جرم کے خلاف تنبیہات اس کا خاتمہ کر دیتی ہیں جیسا کہ رابرٹسن سمتھ نے صحیح لکھا ہے: ''یہ پیغمبر (علیہ السلام) کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ مشرق و مغرب اور عرب کی کئی اقوام میں طفل کشی کا جو رواج بری طرح پھیلا ہوا تھا' اس کا خاتمہ ہو گیا۔'' ("Kinship and Marriage in Early Arabia ... Robertson Smith, p. 97)

(۲) پرورش : اسلام نے بچے کی پرورش اور نگہبانی کی ذمہ داری اُس کے والدین کے کندھوں پر ڈالی ہے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۳۳ میں فرمایا گیا :

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ

''اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو برس تک دودھ پلائیں' یہ (حکم) اُس کے لئے ہے جو دودھ پلانے کی مدت پوری کرنا چاہے۔'' (۲ : ۲۳۳)

بیٹی بیٹے کی نسبت قدرتی طور پر کمزور ہوتی ہے۔ وہ زندگی کی دوڑ دھوپ میں اپنے والد کا ساتھ نہیں دے سکتی' اس لئے اسلام سے قبل کے زمانہ میں وہ ظلم اور تشدد کا شکار تھی۔ اُس کی نگہداشت اور پرورش کے متعلق فرامینِ نبوی نے خاصا زور دیا ہے۔ مثلاً آپ نے فرمایا:

(i) جس شخص کی دو یا تین بیٹیاں یا بہنیں ہوں اور اُس کا اُن سے رویّہ اچھا ہو تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔ (ترمذی)

(ii) جس شخص کی دو بیٹیاں ہوں اور اُس کا اُن سے عمدہ رویّہ ہو یہاں تک وہ سنّ بلوغ کو پہنچ جائیں تو وہ جنت میں میرے اس طرح قریب ہوگا جس طرح یہ دو انگلیاں (اپنی شہادت کی انگلی اور درمیانی انگلی کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے) ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ (ترمذی)

(iii) اگر والدین اپنی بیٹی کی پرورش رحمدلی اور عمدہ رویّہ سے کریں تو اُن کا یہ عمل اُن کے اور دوزخ کی آگ کے درمیان پردہ بن جائے گا۔'' (ترمذی)

(۳) پیار و محبت : اسلام والدین سے بچوں کی نہ صرف نگہداشت اور پرورش کا مطالبہ کرتا ہے بلکہ اس بات کی امید کرتا ہے کہ اُن کے ساتھ مادر پدر کا رویّہ مہربانی و شفقت کا اور مناسب محبت میں شرابور ہو کیونکہ غیر مناسب لاڈ پیار بچے کو بگاڑ دیتا ہے۔ جدید نفسیات سے ظاہر ہوا ہے کہ بچوں کی مناسب پرورش اور تربیت اُن

سے شفقت و محبت کا رویّہ اختیار کرنے ہی میں ہے۔ اس سلسلہ میں نبی آخرالزماں ﷺ کا اُسوہ حسنہ بے مثال ہے جس کی چند جھلکیاں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں :

(i) ایک مرتبہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے نواسے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا بوسہ لے رہے تھے۔ اقرع بن حابس نامی ایک بدّو وہاں موجود تھا۔ اُس نے فخریہ انداز میں کہا کہ اے اللہ کے رسول! میرے دس بچے ہیں لیکن میں اُن میں سے کسی کا بوسہ نہیں لیتا۔ اس پر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''اگر اللہ نے تمہارے دل میں دریائے محبت کو خشک کر دیا ہے تو میں کیا کروں؟'' (صحیح بخاری)

(ii) خطبہ دیتے ہوئے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے نواسے جنابِ حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھا جو ابھی بچے ہی تھے۔ حضرت حسن مسجد کو لڑکھڑاتے ہوئے آ رہے تھے اور وہ کئی مرتبہ گر بھی پڑے۔ یہ دیکھ کر نبی علیہ السلام منبر پر سے اترے اور جنابِ حسن کو اپنی گود میں لے لیا اور باقی خطبہ آپ نے بعد میں مکمل کیا۔

(iii) آپ کی نواسی جنابِ اُمیمہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کندھوں پر اُن کی نماز کے دوران سوار ہو جاتی تھی لیکن آپ ذرّہ بھر خفا نہیں ہوتے تھے۔ سجدے کے لئے جھکتے ہوئے آپ اُنہیں زمین پر نیچے اتار دیتے اور جب آپ قیام کے لئے دوبارہ کھڑے ہوتے تو آپ اُمیمہ کو اٹھا لیتے۔ (صحیح مسلم)

اِس سلسلہ میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی اُمّت کے لئے ایک جامع اصول وضع کیا اور فرمایا:

مَنْ لَّمْ یَرْحَمْ صَغِیْرَنَا وَلَمْ یُوَقِّرْ کَبِیْرَنَا فَلَیْسَ مِنَّا (ترمذی)

''جس نے ہمارے چھوٹے پر رحم نہیں کیا اور ہمارے بڑے کا احترام نہیں کیا' اُس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں۔''

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا: ''بچے باغِ الٰہی کے پھول ہیں۔''

(۴) <u>تعلیم و تربیت</u> : مذکورہ بالا ذمّہ داریوں کے علاوہ اسلام بچوں کی تعلیم اور اُن کی روحانی و اخلاقی تربیت کو مذہبی فریضہ قرار دیتا ہے۔ چنانچہ اس بارے میں قرآن حکیم نے فرمایا:

یٰاَیُّھَاالَّذِیْنَ آمَنُوْا قُوْا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا (اَلتَّحریم : ۶)

''مؤمنو! اپنے آپ کو بھی اور اپنے گھر والوں کو بھی دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔'' (۶ : ۶۶)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آدمی کے لئے خود اچھا ہونا کافی نہیں ہے بلکہ اپنی اولاد کو صراطِ مستقیم پر چلانا بھی اُس کا مذہبی فریضہ ہے تاکہ نوجوان نسل کی اصلاح ہو اور وہ اخلاقی اور مذہبی دونوں طور پر اپنے سماج کے لئے اچھے ثابت ہو سکیں۔

سورہ طٰہٰ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہوا :

وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا (طٰهٰ : ۱۳۲)
''آپ اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم فرمائیں اور اس پر ثابت قدم رہیں۔'' (۱۳۲ : ۲۰)

اس بارے میں نبی علیہ السلام کے فرمودات نہایت واضح اور نمایاں ہیں۔ مثلاً آپ نے فرمایا:

(۱) اَكْرِمُوْا اَوْلَادَكُمْ وَاَحْسِنُوْا آدَابَهُمْ فَاِنَّ اَوْلَادَكُمْ هَدِيَّةٌ'' اِلَيْكُمْ (سنن ابن ماجه)
''اپنے بچوں کا اکرام کیا کرو اور اُن کے آداب و اطوار کو خوبصورت بناؤ کیونکہ تمہارے بچے تمہارے لئے عطیہ الٰہی ہیں۔'' (سنن ابن ماجہ)

(۲) مُرُوْا اَوْلَادَكُمْ بِالصَّلٰوةِ وَهُمْ اَبْنَاءُ سَبْعِ سِنِيْنَ وَاضْرِبُوْهُمْ عَلَيْهَا وَهُمْ اَبْنَاءُ عَشْرٍ وَفَرِّقُوْا بَيْنَهُمْ فِي الْمَضَاجِعِ (سنن ابی داؤد: كتاب الصّلوٰة باب: متٰى يُؤْمَرُ بِالصَّلَاةِ)
''جب تمہارے بچے سات سال کے ہو جائیں تو اُنہیں نماز کا حکم دو اور دس سال کی عمر میں اگر وہ نماز میں سستی کریں تو اُنہیں مارو اور اُن کے بستر علیحدہ کردو۔'' (سنن ابی داؤد: کتاب الصلاۃ)

جہاں یہ حدیثِ مبارکہ باقاعدہ نماز کی اہمیت پر روشنی ڈالتی ہے' وہاں یہ اس بات کی بھی وضاحت کرتی ہے کہ تعلیم و تربیت کے نقطہ نگاہ سے اسلام میں بچے کو (آداب و اطوار سکھانے کی خاطر) مارنا جائز ہے۔ لیکن یہ بات ذہن نشین رہے کہ یہ مار ہلکی ہو اور اذیت ناک نہ ہو کیونکہ اس کا مقصد نماز میں سستی کی وجہ سے بچے میں مذہبی احساسِ زیاں کا پیدا کرنا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ بچوں کو اُن کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ جو چاہے کرتے پھریں۔

فقہائے کرام نے کہا ہے کہ بچوں کو نماز کی مشق کے علاوہ دوسرے احکام شریعت کی بھی مشق کرائی جائے مثلاً رمضان المبارک کے روزے رکھنے کی اُن میں عادت ڈالی جائے اگرچہ اُن کی عمر کے مطابق روزے گاہے گاہے ہوں تاکہ روزے کی اہمیت اُن کے ذہنوں میں مرتسم ہو جائے۔ اور جب وہ بالغ ہو جائیں تو اُنہیں یہ معلوم ہو کہ پنجگانہ نماز کی طرح رمضان کے روزے بھی فرض ہیں جن سے مفر نہیں۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مندرجہ ذیل فرمان اُن لوگوں کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہے جو اپنی اولاد کو اسلامی تعلیم دینے اور اسلامی خطوط پر اُن کی تربیت کرنے سے بے پروا اور غافل ہیں :۔

''قیامت کے دن پہلے مدعیان آدمی کے اپنے گھر والے ہوں گے۔ وہ رب تعالیٰ کے دربارِ عالی میں آدمی کے خلاف یہ التجا کرتے ہوئے نالش کریں گے کہ اے اللہ! ذرا انصاف کیجئے کہ آیا ہم خطا کار ہیں یا ہمارے والدین؟ ہمیں اس بات کی سوجھ بوجھ حاصل نہیں تھی کہ ہمارے والدین ہمیں حرام کھلا رہے ہیں' اُن میں اسلامی خطوط پر ہماری تعلیم و تربیت کرنے کی ذمہ داری لینے میں خامی تھی جس کے نتیجہ میں ہم بدعقل اور لامذہب ہو گئے۔'' (''احیاء علوم الدین'' ۔۔۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ)

(۵) اولاد میں مساوات قائم کرنا : بچوں سے نمٹنے بالخصوص تحفے تحائف دینے کے معاملہ میں اُن میں مساوات قائم کرنا انتہائی اہم نکتہ ہے ورنہ اُن میں نفرت اور حسد کے احساسات اور کوئی بعید نہیں' دشمنی کے پیدا

ہونے کا خطرہ ہے۔اس ضمن میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہمارے لئے ایک سنہرا اصول وضع کیا ہے اور فرمایا:
سَاوُوا بَيْنَ اَوْلاَدِكُمْ فِي الْعَطِيَّةِ فَلَوْ كُنْتُ مُفَضِّلاً أَحَدًا لَفَضَّلْتُ النِّسَاءَ (البیہقی' الطبرانی)
''اپنی اولاد کے درمیان مساوات قائم کرو' اگر میں کسی کو ترجیح دیتا تو میں عورتوں کو ترجیح دیتا۔''

الغرض جن والدین نے اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت اسلامی خطوط پر کی ہو' وہ نہ صرف اپنی اور اپنے بچوں کی زندگیاں سُدھار لیتے ہیں بلکہ روزِ قیامت اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہی سے بھی محفوظ رہیں گے۔

(۶) عقیقہ : بچے کی پیدائش کے ساتویں دن اُس کا سر مونڈنے پر بہ طورِ شکرانہ یہ ضیافت کی جاتی ہے۔عقیقہ ایک مستحب فعل ہے اور فرض نہیں ہے جو آدمی کے ذرائع معاش کے مطابق کیا جاتا ہے۔نبی علیہ السلام نے فرمایا:

اَلْغُلاَمُ مُرْتَہِنٌ ''بِعَقِیْقَتِهٖ تُذْبَحُ عَنْهُ يَوْمَ السَّابِعِ وَيُسَمّٰى وَيُحْلَق
''لڑکا اپنے عقیقہ ☆ سے گروی شدہ ہے کہ اس کی پیدائش کے ساتویں روز جانور ذبح کیا جائے' بچے کا نام رکھا جائے اور اُس کا سر منڈوا دیا جائے۔'' (سنن ابی داوٗد' سنن النسائی' سنن ابن ماجہ' سنن الترمذی)

نومولود بچے کا نام اسلامی ثقافت کا مظہر ہونا چاہئے۔مشرکانہ نام جن سے کفر والحاد کی بو آتی ہو' درست نہیں ہیں #۔نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُن ناموں کو پسند فرمایا ہے جو صفاتِ الٰہی یا اُس کے اسمائے حسنیٰ کے عکاس ہوں۔آپ نے فرمایا کہ اللہ کو سب سے زیادہ پسندیدہ نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں (صحیح بخاری)۔اِسی طرح محمد اور احمد یا کم ازکم اِن دو میں سے کسی ایک کو بطور سابقہ یا لاحقہ بنانا بھی اکثر علماء کے نزدیک پسندیدہ ہے۔

(۷) شادی / نکاح : اولاد کو رشتہ ازدواج میں منسلک کرنا والدین کی ذمہ داری ہے۔اسلام والدین سے توقع رکھتا ہے کہ اس مقدس ذمہ داری کی تکمیل میں تاخیر نہیں ہونی چاہئے۔ایک حدیثِ مبارکہ کی رُو سے تین چیزوں میں تاخیر کرنا جائز نہیں ہے: یعنی نماز میں جب اس کا وقت آجائے' نمازِ جنازہ میں جب میت غسل وکفن کے بعد تدفین کے لئے تیار ہو اور اولاد کی شادی میں جب اُن کے موافق جوڑا مہیا ہو۔

☆ مجدالدین فیروز آبادی نے ''عقیقہ'' کی یوں تعریف کی ہے:
اَلْعَقِيْقَةُ الشَّاةُ الَّتِيْ تُذْبَحُ عِنْدَ حَلْقِ شَعْرِ الْمَوْلُوْدِ (القاموس المحیط جلد ۳' صفحہ ۲۶۶)
''عقیقہ وہ بکری ہے جو (نومولود) بچے کے سر مونڈنے کے وقت (بہ نام خدا) ذبح کی جاتی ہے۔''
نوٹ: سنتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مطابق لڑکے کی پیدائش پر دو بکرے اور لڑکی کی پیدائش پر ایک بکرا بطورِ شکرانہ ذبح کرنا اور غرباء وفقراء کو کھلانا مستحب ہے۔

اسی طرح ''پرویز'' نام رکھنا یا اُسے سابقہ (Prefix) یا لاحقہ (Suffix) کے طور پر اصل نام کے ساتھ ملانا بھی درست نہیں ہے کہ پرویز (شاہِ ایران) نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا گستاخ اور آپ کی رسالت کا منکر تھا جس نے آپ کے نامہ مبارک کو غضبناک ہو کر پھاڑ دیا تھا اور جس کا نتیجہ اُس کی سلطنت کے پارہ پارہ ہونے میں برآمد ہوا۔

شریعتِ اسلامی کا یہ بھی تقاضا ہے کہ شادی کی تقریب کا انعقاد انتہائی سادگی اور کفایت شعاری سے کیا جائے ۔ والدین اپنے عاقلانہ تجربے اور دُور اندیشی کی رُو سے اپنی اولاد کے لئے بہتر جیون ساتھی تلاش کرنے کے پابند ہیں ۔ اُن کی راہ نمائی اُن کے بچوں کے لئے ہمیشہ مفید ہوتی ہے ۔ اسلام نے جہاں اولاد کو رشتہ ازدواج میں منسلک کرنے کی ذمہ داری والدین کے کندھوں پر ڈالی ہے' وہاں اُس نے اولاد کی رضامندی کو بھی ناگزیر امر قرار دیا ہے ۔ اِس سلسلہ میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا جس کے راوی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں :

لَا تُنْکَحُ الْاَیِّمُ حَتّٰی تُسْتَامَرَ وَلَا تُنْکَحُ الْبِکْرُ حَتّٰی تُسْتَاذَنَ قَالُوْا : یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ! وَکَیْفَ اِذْنُھَا؟ قَالَ : اَنْ تَسْکُتَ (بخاری' مسلم' نسائی)

''بیوہ / مطلقہ کا نکاح اُس کی مرضی کے بغیر نہ کیا جائے اور نہ ہی کنواری دوشیزہ کا نکاح اُس کی اجازت کے بغیر کیا جائے ۔ صحابہ کرام نے دریافت کیا : اے اللہ کے رسول ! کنواری کی اجازت کیسے ہوگی؟ فرمایا : اُس کا خاموش رہنا ہی اُس کی طرف سے اجازت ہے ۔''

(۸) متفرق فرائض : درجِ بالا فرائض کے علاوہ والدین اپنے بچوں کے لئے ذیل کے فرض سے عہدہ برآ ہونے کے بھی پابند ہیں : بچے کی پیدائش پر اُس کے دائیں کان میں اذان کہنا اور بائیں کان میں اقامت کہنا ۔ حافظ ابن القیم کے نزدیک اس عمل کا مقصد یہ ہے کہ نومولود بچہ اس دنیا میں آنے پر سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کی آواز سنے ۔

(ب) زوجین

شادی اور کنبے کے اسلامی نظام کو مغربی نظریہ شادی اور کنبہ کے ترازو میں نہ تولا جائے : جناب خورشید احمد کے کتابچہ بہ عنوان ''فیملی لائف اِن اسلام'' کا آخری پیراگراف کچھ اس طرح ہے :

اسلامی نظامِ نکاح اور کنبہ کا مطالعہ زندگی کی اُس منصوبہ بندی کے سیاق و سباق میں کیا جائے جو اسلام قائم کرنا چاہتا ہے ۔ فرد اور کنبہ کا جو تصور اسلام دینا چاہتا ہے' وہ اُس نظریہ سے متصادم ہے جو آج مغرب میں متداول ہے ۔ ہم سمجھتے ہیں کہ مغرب میں کنبے کا بکھرنا اور منتشر ہونا اُس معاشرے میں کنبے کے مقام' اُس کے کردار اور مقصدِ حیات کے متعلق انتشارِ فکر کا نتیجہ ہے ۔ اگر زندگی کے مقاصد اور اقدار کو صحیح نہ کیا جائے تو شادی کے اداروں اور دوسرے اداروں کو بکھرنے سے روکا نہیں جا سکتا ۔ ایک ایسے دور میں جس میں دیوتا کی طرح آزادی کی پرستش کی جاتی ہو' انسان کو انتہائی اہم چیز یعنی آزادی سے محروم رکھا جا رہا ہے' وہ آزادی جس میں اُسے اپنے نصب العین' اقدار' اداروں اور طرزِ زندگی اختیار کرنے کی چھوٹ ہے ۔ ایک انتہائی عظیم کام جو ابھی کرنا باقی ہے' وہ اس اختیار کو بحال اور مستحکم کرنا ہے تاکہ نوعِ انسانی کو اُس کا حق راحت و سکون مل سکے ۔ غیر انسانی اور غیر اخلاقی قوّتوں کو خواہ وہ تاریخ سے متعلق ہوں یا ٹیکنالوجی سے' انسان کے مقدّر کا فیصلہ کرنے کا اختیار نہ ہو ۔ اِس روئے زمین پر انسان خلیفۃ اللہ ہونے کی حیثیت سے اپنا فیصلہ خود کرے ورنہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدانوں میں ہماری کارکردگی کچھ بھی ہو' ہم غلامی کی ایک نئی صورت کی طرف اور دنیا میں اپنے اصل کردار کے جبری ترک کی طرف دھکیلے جا رہے ہیں ۔ اس

کی ہم سب کو اور کم از کم اُن لوگوں کو مزاحمت کرنی چاہئے جن کا اللہ تعالیٰ پر اور کائنات میں ایک اخلاقی نظم ونسق پر ایمان ہے (صفحہ ۳۲)۔

پُرمسرّت ازدواجی زندگی کی بنیاد: سورۃ النسآء کی آیت ۳۴ کے لفظ ''قوّام'' کا ترجمہ کئی طرح کیا گیا ہے۔ کچھ مفسرین کے نزدیک اس کا معنیٰ افسر کا ہے جبکہ کچھ دیگر علماء کے نزدیک اس کا معنیٰ مطلق العنان فرمانروا (Sovereign) کا ہے۔ لیکن یہ دونوں ترجمے صحیح نہیں ہیں۔ خاوند اپنی بیوی کا نہ تو افسر ہے اور نہ ہی مطلق العنان حاکم۔ کنبے کا روزی کمانے والا خاوند اپنے خون پسینے کی تمام کمائی اپنے جیون ساتھی کی گود میں ڈال دیتا ہے اور اُس سے خرچ کا حساب بھی نہیں مانگتا۔ اُس کی رفیقہِ حیات ہی ایسے بااعتماد رویّہ کی مستحق ہے نہ کہ خاوند کی ماں' بہن' بیٹی یا بہو۔ اور خاوند کا اُس پر یہ اعتماد اُس پر کوئی احسان نہیں بلکہ اس میں خالص اسلامی خطوط پر بیوی کی تربیت کرنا ہے (سورۃ التّحریم: ٦) کیونکہ وہ بھی اپنے بچوں کی صحیح خطوط پر پرورش اور نشو ونما کرنے کی برابر کی ذمّہ دار ہے۔ خاوند اپنے اہلِ خانہ کو خوراک مہیا کرنے اور اُن کی جائز اور اصل ضروریات کی تکمیل کرنے کا ذمّہ دار ہے۔ یہ سب تعبیرات لفظِ ''قوّام'' کی تشکیل کرتی ہیں۔

آغازِ کار میں خاوند بالعموم اپنی رفیقہِ حیات کے لئے اجنبی اور نامعلوم ہوتا ہے۔ وہ اُسے اپنے رشتۂ ازدواج میں منسلک کرتا ہے اور اُس پر حقوقِ زوجیت بہ نام خدا حاصل کرتا ہے۔ قرآنی اصطلاح میں اس رشتۂ ازدواج کو مِيثَاقًا غَلِيظًا (سورۃ النساء: ۲۱) یعنی ''پختہ عہد'' کہا گیا ہے۔ اسلام اس ''پختہ عہد'' کو باقی رکھنے اور محض معمولی معمولی باتوں پر اسے تحلیل نہ ہونے کی پوری کوشش کرتا ہے۔

حقوق و فرائض کے معاملے میں ہم اکثر اپنے حقوق کو منوانے کی بات کرتے ہیں اور اپنے فرائض کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ اصولی طور پر بہترین گھر تو وہ ہے جہاں فرائض حقوق سے زمانی سبقت رکھتے ہوں' جہاں فرائض لازمی طور پر پہلے ادا کئے جائیں اور اپنے حقوق کو مؤخر کر دیا جائے۔ بے غرضی اور ایثار و قربانی اس بات میں مضمر ہے کہ اپنے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنتِ مبارکہ کی علامت بننے کے لئے تمام فرائض بہ دل و جان ادا کئے جائیں اور کچھ حقوق کو ترک کر دیا جائے۔ ایسے کردار کی تشکیل کے لئے سورۃ النّساء کی آیت ۱۹ میں ارشاد ہوا:

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّ يَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا

''اور اُن کے ساتھ اچھی بود و باش رکھو' پھر اگر تم اُنہیں ناپسند کرتے ہو تو ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اُس میں بہت سی بھلائی رکھ دے۔'' (۴ : ۱۹)

اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

وَاسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا (اپنی بیویوں کے احساس کرنے والے روادار بنو اور اُن کی اچھی باتوں کو تسلیم کرو)۔

خاوندوں کا اپنی بیویوں کے ساتھ تعلق کے معاملے میں یہ بہترین اسلامی اصول ہے۔ اُن کی خطاؤں اور

چھوٹی چھوٹی کوتاہیوں کو برداشت کرنا چاہئے اور بہرحال اُن کے ساتھ رواداری کا سلوک کرنا چاہئے۔ حیاتیاتی طور پر Nemilow اِس حقیقت کی صداقت پر یوں بات کرتا ہے:

''خواتین کبھی بھی اُن دشواریوں پر قابو نہیں پا سکیں گی جو اُن کی نہاد اور فطرت میں رچی بسی ہوئی ہیں۔ عورت کی فعلیات وعضویات (Physiology) اور حیاتیات (Biology) سے واقف شخص اُس کی دلی کیفیت میں اچانک تبدیلی' اُس کے مزاج میں غیر معقول اشتعال' اُس کے بلا مقصد افعال پر ذرہ بھر بھی خفا نہیں ہوگا۔ اس بات کو سمجھتے ہوئے آدمی بیضہ دانی کے خلیوں کی حاملہ (یعنی عورت) سے گہری ہمدردی کرے گا۔''
("Biological Tragedy of Women", pp. 187-188)

ایک حدیثِ مبارکہ کی رُو سے بہترین بیوی وہ ہے جو اپنے بچوں سے فطری محبت کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے خاوند کو خوش کرتی ہے جب بھی وہ اُسے دیکھتا ہے' اُس کی امانتوں کی حفاظت کرتی ہے جبکہ اُس کی پاکدامنی کی قابلِ قدر خصوصیت اس کے علاوہ ہے۔ حدیثِ مبارکہ کا متن ملاحظہ ہو:

خَیْرُ النِّسَآءِ الَّتِیْ اِذَا نَظَرْتَ اِلَیْھَا سَرَّتْكَ وَاِذَا أَمَرْتَھَا أَطَاعَتْكَ وَاِذَا غِبْتَ عَنْھَا حَفِظَتْكَ فِیْ نَفْسِھَا وَمَالِكَ (الطبرانی)

''بہترین بیوی وہ ہے کہ جب بھی تو اُسے دیکھے' وہ تجھے خوش کرے' جب تو اُسے کوئی حکم دے تو تیری فرمانبرداری کرے' جب تو اُس سے غائب ہو تو وہ اپنی ذات اور تیرے مال کی حفاظت کرے۔''

ایک اور حدیث کے مطابق عورت دو پردوں میں چھپی ہوتی ہے: ایک اُس کا خاوند اور دوسرا اُس کی قبر۔

مرد باپ ہے اور روزی کمانے والا ہوتا ہے جبکہ عورت ماں ہے اور امورِ خانہ داری کی منتظمہ ہوتی ہے۔ عائلی زندگی کی کامیابی و کامرانی کے لئے دونوں کا کردار مساوی طور پر اہم ہے اور تہذیبِ انسانی کی یہی بنیادی اور ابتدائی جڑ ہے۔ قرآن مجید اس تعلق کو سورۃ النّحل میں یوں بیان کرتا ہے:

وَاللّٰہُ جَعَلَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ أَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَکُمْ مِّنْ أَزْوَاجِکُمْ بَنِیْنَ وَحَفَدَۃً وَّرَزَقَکُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ أَفَبِالْبَاطِلِ یُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰہِ ھُمْ یَکْفُرُوْنَ ○ (اَلنَّحل : ۷۲)

''اور اللہ نے تم ہی میں سے تمہارے لئے جوڑے پیدا کئے اور تمہارے جوڑوں (یعنی بیویوں) سے تمہارے لئے بیٹے اور پوتے / نواسے پیدا فرمائے اور تمہیں پاکیزہ رزق عطا فرمایا' تو کیا پھر بھی وہ (حق کو چھوڑ کر) باطل پر ایمان رکھتے ہیں اور اللہ کی نعمت سے وہ ناشکری کرتے ہیں۔'' (۱۶:۷۲)

آیت کے آخری حصے میں نکاح اور اِزدواج کو اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی نسل کو ربّ تعالیٰ کی نعمت کہا گیا ہے جس پر شکر ادا کیا جانا چاہئے۔ اس کے ساتھ ساتھ دوسرے تمام غیر اسلامی نظریات (مثلاً برتھ کنٹرول اور تحدیدِ نسل) کو باطل قرار دے کر اُن کی پیروی کرنے پر بیزاری کا اظہار کیا گیا ہے۔

۲۹۹۰ (رشتہ داری۔۔KINSHIP)

یہ قرآنی آیت اپنے اندر جنسی حیات کا راز رکھتی ہے اور میاں بیوی کے درمیان پیار و محبت اور مساوات کی بنیاد پر عائلی زندگی کی تعمیر کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ ساتھ ہی وہ میاں بیوی کے جوڑے کو یہ بھی یاد دہانی کراتی ہے کہ اُن کا ازدواجی رشتہ نعمتِ الٰہی ہے جس کے لئے اُنہیں ہمیشہ اپنے خالق کا شکرگزار رہنا چاہئے۔ اُس کی شکرگزاری کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ میاں بیوی دونوں میں سے ہر ایک کو اپنے جیون ساتھی سے شائستگی اور حسنِ سلوک سے پیش آنے کی کوشش کرنی چاہئے تاکہ ایک طرف رشتۂ ازدواج کامیابی اور کامرانی سے ہمکنار ہو تو دوسری طرف بیٹے اور پوتے عطا کرنے والے (اللہ) کے راضی کرنے کا بھی سامان ہو جائے۔

سورۃ الـــرّوم کی آیت ۲۱ میں فرمایا گیا کہ اُس اللہ نے تم دونوں (میاں اور بیوی) کے درمیان محبت و شفقت کو پیدا فرمایا ہے تاکہ تم ایک دوسرے سے سکون و راحت اور خوشی و مسرّت پا سکو اور یہ چیز زوجین کے ازدواجی بندھن کو مضبوط کرنے کا ایک اور ثبوت ہے۔ میاں بیوی کے درمیان ایسی حیران کن ہم آہنگی پائی جاتی ہے کہ اُن میں سے ہر ایک دوسرے کے لئے مکمل جزوِ لازم (Counterpart) ہوتا ہے۔ ایک کے جسمانی اور نفسیاتی تقاضے دوسرے کے جسمانی اور نفسیاتی تقاضوں سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہوتے ہیں۔

ایک بنیادی عامل جس نے تہذیبِ انسانی کی تخلیق میں معاونت کی ہے' یہ ہے کہ خالقِ کائنات نے اپنی کامل حکمت کے تحت دونوں جنسوں میں ایک دوسرے کی خواہش' پیاس اور شدید اُمنگ رکھ دی ہے جس کی تسکین اُس وقت تک نہیں ہوتی جب تک وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ مکمل وابستگی نہ رکھیں۔ امن و آشتی کی یہی خواہش اور امنگ اُن دونوں کو اکٹھا گھر بنانے کے لئے محرک بنتی ہے۔

زمین و آسمان' آسمانی مخلوق' پودوں اور حیوانات وغیرہ کے بیان میں قرآن مجید نہایت واضح طور پر کہتا ہے کہ یہ تمام چیزیں انسان کے لئے پیدا کی گئی ہیں لیکن وہ کہیں بھی یہ نہیں کہتا کہ عورت مرد کے لئے پیدا کی گئی ہے' بلکہ وہ یہ کہتا ہے کہ مرد و زن میں سے ہر ایک کو دوسرے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ سُبحانَ اللہ ! شکر ہے اُس ذاتِ کردگار کا جس نے عورت کے مقام کو بہتر بتاتے ہوئے فرمایا:

هُنَّ لِبَاس ''لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاس'' لَّهُنَّ (البقرۃ : ۱۸۷)

''وہ (عورتیں) تمہاری پوشاک ہیں اور تم اُن کی پوشاک ہو۔'' (۲:۱۸۷)

میاں بیوی کو یہاں ایک دوسرے کا ''لباس'' چند وجوہ سے کہا گیا ہے: (۱) وہ ایک دوسرے سے وابستہ اور باہم بغل گیر ہوتے ہیں جس طرح لباس جسم سے چمٹا ہوتا ہے۔ (۲) ایک دوسرے سے حصولِ تسکین کی خاطر اُن کا باہمی تعلق ہوتا ہے۔ (۳) لباس کی طرح وہ ایک دوسرے کے شریکِ حیات ہوتے ہیں۔ (۴) لباس کی طرح وہ گرمی' سردی یعنی کارزارِ حیات کی مشکلات اور مصائب و تکالیف سے ایک دوسرے کو بچاتے ہیں۔ (۵) لباس کی طرح اُن کی ایک دوسرے سے زیب و زینت ہے۔ (۶) زندگی کی دوڑ دھوپ میں وہ لباس کی طرح ایک دوسرے کے لئے ناگزیر اور جزوِ لاینفک ہیں۔ (۷) عورت اپنی تمام تر لطافت و نفاست کے باوجود مرد کے بغیر نامکمل اور

مرد اپنی تمام تر ذہنی و جسمانی صلاحیتوں اور توانائیوں کے باوجود عورت کے بغیر نامکمل ہے۔

ایسے دل پسند کنبہ کی تعمیر میں معاونت کے لئے خاوند کا کردار حق اللہ کے فرض کا احساس ہے جو اُس کے اپنی بیوی سے محبت و تلطف، مستقل مزاجی اور عزت و تکریم کے رویّہ میں ظاہر ہوتا ہے۔ خاوند کا یہ فیاضانہ اور محبت کا رویّہ اُس کی بیوی کا دل جیت لے گا اور اُن کے مابین اچھا اور صحتمند رشتہ قائم کرنے کا موجب بنے گا۔ بیوی کے ساتھ درشت اور کرخت رویّہ کی قرآن مجید پُرزور مذمّت کرتا ہے اور اُن سے مہربانی اور نرمی سے پیش آنے کا حکم دیتا ہے (سورۃ النساء : ۱۹) جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بیان ہوا۔ اگر ہر شخص اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو طاقِ نسیاں کی نذر کرتے ہوئے اپنے قانونی حقوق کے حصول کی کوشش میں لگا رہے تو سماجی زندگی پُرمسرّت اور خوشگوار نہیں ہو سکتی۔

(ا) بیوی کے حقوق (خاوند کے فرائض)

(ا) خوش اخلاقی: عائلی زندگی کی نفاست و لطافت اس بات میں مضمر ہے کہ خاوند اپنی بیوی کے حقوق کو تسلیم کرتے ہوئے اُس سے خوش اخلاقی اور احسن رویّہ سے پیش آئے جیسا کہ سورۃ النساء کی آیت ۱۹ میں حکم ہوا۔ بیوی کی عزت و تکریم اُس کا جائز اور قانونی حق ہے اور عمدگی کے اس اصول کی وسعت چھوٹے بڑے تمام خانگی معاملات کو محیط ہونی چاہئے۔ اس بارے میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مثال ہمارے لئے اور بالخصوص اُن لوگوں کے لئے مشعلِ راہ ہے جو اپنی بیویوں سے ظالمانہ اور بہیمانہ سلوک کرتے ہیں۔ فرمودہ رسول اللہ ﷺ ہے :

(i) خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِاَهْلِهٖ وَاَنَا خَيْرُكُمْ لِاَهْلِيْ (الطبرانی)

''تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لئے اچھا ہے اور میں اپنے اہلِ خانہ کے لئے تم سب سے بہتر ہوں۔''

(ii) خِيَارُكُمْ خِيَارُكُمْ لِنِسَاءِ هِمْ (ترمذی)

''تم میں سے بہتر وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے ساتھ بہتر اور عمدہ ہیں۔''

اس عالمِ رنگ و بُو میں کوئی بھی آدمی مثالی نہیں ہے۔ ہر شخص میں خواہ وہ کتنا ہی پارسا اور نیک کیوں نہ ہو، کچھ نہ کچھ خامیاں ہوتی ہیں اور کوئی بھی خطا سے مبرّا نہیں ہے۔ بیوی بھی اس حقیقت سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اس روشن حقیقت کے تحت ہر ایک کو دوسرے کی کوتاہیوں کو برداشت کرنا ضروری ہے اور برداشت کرنے والے کو خطا کار کی پوزیشن میں رکھ کر دیکھنا چاہئے کہ اگر یہ خطا اُس کی طرف سے ہوتی تو وہ دوسروں سے کیا توقع رکھتا؟ اس باب میں نبی آخرالزماں علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے ہمیں ایک سنہرا اصول عطا کیا ہے کہ فرمایا:

لَا يَفْرَكُ مُؤْمِنٌ مُؤْمِنَةً اِنْ كَرِهَ مِنْهَا خُلُقًا رَضِيَ مِنْهَا آخَرَ (صحیح مسلم: کتاب الرضاع)

''مسلمان خاوند کو اپنی مسلمان بیوی سے نفرت نہیں کرنی چاہئے۔ اگر بیوی کی ایک عادت اُسے ناپسند ہے تو اُس کی کوئی دوسری خصوصیت اُسے ضرور خوش کرے گی۔''

(۲) حقِ مہر : عورت کو اپنے پر حلال کرنے کے لئے خاوند اُسے بوقتِ نکاح جو تحفہ دیتا ہے، وہ ''مہر'' (Nuptial Gift) کہلاتا ہے۔ مہر کا ادا کرنا خواہ وہ کسی شکل میں ہو، بیوی کے مطالبہ پر خاوند کی طرف سے ادا کرنا فرض ہے کیونکہ یہ عورت کے حقِ زوجیت کے عوضانہ کے بدلے میں ہے۔ اس فریضہ کو خوشدلی سے ادا کرنے کی بابت کئی مقامات پر یوں حکم دیتا ہے :

(i) وَمَتِّعُوْهُنَّ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ (البقرة : ۲۳۶)
''اور مطلقہ عورتوں کو متاع میں کپڑے دو، فراخ دست اپنی حیثیت کے مطابق اور تنگ دست اپنی گنجائش کے مطابق دستور اور رواج کے اعتبار سے دے۔'' (۲۳۶ : ۲)

(ii) وَآتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً (النسآء : ۴)
''اور بیویوں کو اُن کے مہر خوشدلی سے ادا کر دیا کرو۔'' (۴ : ۴)

(iii) فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَآتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (النساء : ۲۵)
''ان (کنیزوں) سے اُن کے مالکوں کی اجازت کے ساتھ نکاح کر دو اور اُنہیں اُن کے مہر حسبِ دستور ادا کر دو۔'' (۲۵ : ۴)

بیوی کو اختیار حاصل ہے کہ وہ خاوند کو کل مہر یا اس کا کچھ حصّہ اپنی آزادانہ رضامندی سے بغیر کسی داخلی یا خارجی جبر و اکراہ کے معاف کر دے لیکن خاوند کے لئے یہ بالکل جائز نہیں کہ وہ بیوی کو اشارتاً یا وضاحتاً یا بالواسطہ طور پر یا اُس پر دباؤ ڈال کر مہر کے چھوڑنے یا معاف کرنے کا کہے۔ جیسا کہ سورۃ النساء کی آیت ۴ میں اس کا بیان ہوا جس میں نِحْلَة کا لفظ ''عطیہ'' کا ہم معنیٰ ہے ("Arabic Glossary of the Holy Quran"
---Ibn-e-Qutayba (d. 276 A.H/890 C.E.)

مہر میں تخفیف مستحب ہے اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ پاک ہے :
أَعْظَمُ النِّسَاءِ بَرَكَةً أَيْسَرُهُنَّ مُؤْنَةً (مسند احمد، مسند حاکم و سنن بیہقی)
''وہ عورت سب سے زیادہ بابرکت ہے جس کا حصول آسانی سے ہو۔''

جیسا کہ درج ذیل احادیث سے ثابت ہے، مہر کی ادائیگی کا فرض نمایاں اہمیت کا حامل ہے :
(۱) مہر کے لئے کوئی چیز تلاش کر و خواہ وہ آہنی انگوٹھی ہی کیوں نہ ہو۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)
(۲) جو شخص مہر مقرر کر کے کسی عورت سے نکاح کرتا ہے لیکن اُس کی نیت اُسے ادا کرنے کی نہیں، وہ زنا کار ہے۔

نوٹ : (۱) مہر کا بوقتِ نکاح ادا کر دینا بھی درست ہے اور کل مہر یا اس کے کچھ حصّہ کی ادائیگی میں تاخیر کرنا بھی درست ہے بشرطیکہ دلہن یا اُس کا سرپرست اس پر راضی ہو۔
(۲) جماع کے بعد کل مہر کی ادائیگی فرض ہے تاہم اگر مجامعت سے پہلے طلاق واقع ہو جائے تو مقرر شدہ مہر کا نصف ادا کرنا ہوگا جیسا کہ سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۳۷ میں بیان ہوا۔

(۳) اگر خاوند ''عقد'' کے بعد اور مجامعت سے پہلے فوت ہو جائے تو عورت کو خاوند کی پوری وراثت اور مہر ملے گا اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ کا یہی فیصلہ ہے بشرطیکہ نکاح کے وقت ''مہر'' مقرر ہو چکا ہو اور اگر مہر مقرر نہیں ہوا تھا تو عورت ''مہرِ مثل'' کی مستحق ہو گی اور ''عدّتِ وفات'' بھی گزارے گی (یعنی چار ماہ دس دن یا وضعِ حمل) (''منہاج المسلم'' -- ابوبکر جابر الجزائری' صفحہ ۶۱۸)

(۴) نان ونفقہ : عورت کی جائز ضروریات کا پورا کرنا بھی خاوند کی ذمہ داری ہے جن میں طعام' لباس اور رہائش شامل ہیں ۔ ان کی اسلام نے کوئی حد یا وسعت مقرر نہیں کی بلکہ وہ شوہر کے وسائل اور ذرائع آمدنی پر منحصر ہے جیسا کہ سورۃ البقرۃ میں ارشاد ہوا :

عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُہٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُہٗ (البقرۃ : ۲۳۶)

''وسعت والے پر اُس کی حیثیت کے مطابق (لازم) ہے اور تنگدست پر اُس کی حیثیت کے مطابق ۔'' (۲۳۶ : ۲)

غذا اور خوراک کی فراہمی کے فرض کی بابت قرآن فرماتا ہے :

وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَہٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (البقرۃ : ۲۳۳)

''اور ماؤں کا کھانا اور پہننا دستور کے مطابق بچے کے باپ پر لازم ہے ۔'' (۲:۲۳۳)

ایک صحابی نے نبی اکرم ﷺ سے دریافت کیا: اے اللہ کے رسول! ہماری بیویوں کا ہم پر کیا حق ہے؟ تو آپ نے یہ جواب دیا :

اَنْ تُطْعِمَهَا اِذَا طَعِمْتَ وَتَكْسُوْهَا اِذَا اكْتَسَيْتَ وَلَا تَضْرِبِ الْوَجْهَ وَلَا تُقَبِّحْ وَلَا تَهْجُرْ اِلَّا فِى الْبَيْتِ (ابوداؤد)

''یہ کہ کھانے کے وقت تو اُسے کھلائے' اُسے لباس پہنائے' نہ تو اُس کے چہرے پر مارے اور نہ ہی اُسے برا بھلا کہے اور اگر تو اُس سے جدا ہونا چاہے تو (یہ جدائی) گھر ہی میں ہو ۔''

ایک حدیثِ مبارکہ کی رُو سے آدمی جب اپنی کمائی کو اپنے اہل وعیال پر خرچ کرتا ہے تو اس کا بھی ثواب ملتا ہے اور اللہ کی مہربانی کا وہ بندہ مَورد بن جاتا ہے ۔ نبی آخر الزماں علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا ارشادِ گرامی ہے :

(i) ''ایک دینار تو اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے' ایک دینار تو غلام کو آزاد کرانے میں' ایک دینار تو کسی مسکین پر اور ایک دینار تو اپنے اہل وعیال پر خرچ کرتا ہے لیکن جو دینار تو نے اپنے اہل وعیال پر خرچ کیا' اُس کا اجر وثواب بہت بڑا ہے ۔'' (صحیح مسلم)

(ii) ''رضائے الٰہی کی خاطر تم جو کچھ بھی اپنے اہل وعیال پر خرچ کرتے ہو' یہاں تک کہ وہ لقمہ جو تم اپنی بیوی کے منہ میں ڈالتے ہو' اُس کا بھی تمہیں اجر وثواب ملتا ہے ۔'' (بخاری' مسلم)

(iii) ''آدمی کے گنہگار ہونے کے لئے یہی بات کافی ہے کہ وہ اُن لوگوں کے حقوق ادا نہ کرے جن کی کفالت اُس کے ذمّے ہے ۔'' (ابوداؤد)

(۴) تحمل و بُردباری : ازدواجی زندگی کی کامیابی کا راز دوسرے کی کوتاہیوں اور خطاؤں کو نظر انداز کرنے میں ہے۔ معمولی معمولی باتوں پر غضبناک ہونا جس کی وسعت جدائی اور طلاق تک جا پہنچتی ہے، گھر کو جہنم زار سے کم نہیں بناتا اور جس کا نتیجہ باہمی لڑائی جھگڑوں اور بچوں میں احساسِ کمتری میں نکلتا ہے۔ تنازعات اور اختلافات کو باہمی طور پر اپنی خلوتوں میں چکانا چاہئے جن کا کسی دوسرے کو علم نہ ہو۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

اِسۡتَوۡصَوۡا بِالنِّسَاءِ فَاِنَّ الۡمَرۡأَۃَ خُلِقَتۡ مِنۡ ضِلَعٍ وَاِنَّ اَعۡوَجَ مَافِی الضِّلَعِ اَعۡلَاہُ فَاِنۡ ذَھَبۡتَ تُقِیۡمُہٗ کَسَرۡتَہٗ وَاِنۡ تَرَکۡتَہٗ لَمۡ یَزَلۡ اَعۡوَجَ فَاسۡتَوۡصَوۡا بِالنِّسَاءِ (مُتَّفَق عَلَیۡہِ)

''اپنی بیویوں سے رواداری سے پیش آؤ اور اُن کی اچھی باتوں کی قدر کرو، بے شک عورت مرد کی پسلی سے پیدا ہوئی ہے اور پسلی کا ٹیڑھا ترین حصہ اُس کا بالائی حصہ ہوتا ہے، اگر تم اُسے سیدھا کرنا چاہو تو اُسے توڑ ڈالو گے اور اگر تم اُسے اُس کی حالت میں (ویسا ہی) رہنے دو تو وہ ٹیڑھا ہی رہے گا۔ اس لئے عورت (کی اس کمزوری) کا خیال رکھو۔'' (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

صحیح مسلم میں بیان کردہ حدیث کا مضمون اس طرح ہے :

''عورت بے شک پسلی سے پیدا ہوئی ہے، وہ کسی طرح بھی تمہارے لئے سیدھی نہیں ہوگی، اس لئے اگر اُس سے فائدہ اٹھانا ہے تو اُس کے ٹیڑھے پن کی حالت سے فائدہ اٹھالو۔ اگر تم اُسے سیدھا کرنے لگو گے، تو اُسے توڑ ڈالو گے اور اُس کے توڑنے کا مطلب طلاق اور جدائی ہے۔''

(۵) اخلاقی تربیت : اپنے اہلِ خانہ کی اخلاقی اور دینی تربیت کا انتظام کرنا بھی خاوند کی ذمہ داری ہے جس کا اہم رکن اُس کی بیوی ہے۔ قرآنِ مجید نے ہمیں اللہ سے دعا کرنے کی یہ تعلیم دی ہے :

رَبَّنَا ھَبۡ لَنَا مِنۡ اَزۡوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّۃَ اَعۡیُنٍ وَّاجۡعَلۡنَا لِلۡمُتَّقِیۡنَ اِمَامًا○ (اَلۡفُرۡقَان : ۷۴)

''اے ہمارے پالنہار! ہمیں اپنی بیویوں اور ہماری اولاد کی جانب سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں پرہیزگاروں کا پیشوا بنا دے۔'' (۲۵ : ۷۴)

معلوم ہوا کہ اسلام نے تقویٰ اور پارسائی کا جو بلند معیار مقرر کیا ہے، وہاں تک پہنچنے کے لئے گھریلو مسرّتوں سے دست بردار ہونا صحیح نہیں بلکہ وہ گھر جس میں سلیقہ شعار بیوی اپنی صوری اور معنوی خوبیوں کا نور بکھیر رہی ہو، جہاں خوبصورت اور نیک سیرت بچے پھولوں کی طرح دل لبھا رہے ہوں، اُس گھر کی فضا اس قابل ہے کہ وہاں کے بسنے والے تقویٰ کی رفعتوں تک پہنچنے کے لئے کمرِ ہمت باندھیں۔

دعا کے آخری حصہ وَاجۡعَلۡنَا لِلۡمُتَّقِیۡنَ اِمَامًا سے معلوم ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ ہم اپنی خانگی زندگی کی لذتوں میں ایسے کھو کر رہ جائیں کہ تیری یاد کی بھی ہمیں فرصت نہ ملے یا دولت کی طلب میں ہم ایسے حواس باختہ ہو جائیں کہ حلال و حرام میں تمیز بھی نہ کر سکیں۔ ہو یہ سب کچھ لیکن دل تیری یاد سے سرشار ہو، زبان تیری حمد و ثنا کے گیت گا رہی ہو، پیشانی پر تیری بندگی کا نشان چمک رہا ہو، ہمیں دیکھ کر لوگوں کو تیری یاد آجائے، ہماری باتیں سن کر اُن کے دل

دردِ محبت سے آشنا ہو جائیں' ہمارے پاس بیٹھ کر اُن کی بے چین روحوں کو قرار آ جائے' ہمیں اُن پاک بندوں کا سراپا عطا فرما جن کے متعلق تیرے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: هُمْ قَوْم '' لَا یَشْقٰی جَلِیْسُهُمْ یعنی اولیاء اللہ وہ ازلی سعادت مند ہیں کہ جو بد بخت ایک لحہ اُن کے پاس بیٹھ جائے' وہ بھی بد بخت نہیں رہتا۔'' (ضیاء القرآن)

(۶) خاوند کے ایک سے زیادہ شادی کرنے کے مقابل بیوی کو عدل و انصاف کی شرط کے ساتھ تحفظ دیا گیا ہے۔ اگر خاوند قرآنی قانون کے مطابق اپنی بیویوں کے ساتھ عدل و انصاف نہیں کر سکتا تو اُسے ایک سے زیادہ شادی کرنے کی اجازت نہیں ہے (بحوالہ سورۃ النساء: ۳' ۱۲۹)۔

(۷) خاوند کو اس بات کی اجازت نہیں کہ اُس کی بیوی بہ ظاہر سہاگن اور شوہر دار ہو لیکن فی الحقیقت وہ اپنے کسی حق سے بھی فائدہ نہ اٹھا رہی ہو۔ وہ نہ تو عام شوہر والیوں کی طرح اپنے حقوق سے مستفید ہو رہی ہو اور نہ طلاقنوں کی طرح اپنے کو آزاد اور خود مختار پاتی ہو۔ شریعت نے اس ادھر میں پڑی رہنے والی کی حالت کو بدترین اور ظالمانہ قرار دیا ہے۔ شوہر کو چاہئے کہ اپنے امکان بھر پوری کوشش حسنِ معاشرت کی اور تعلقِ زوجیت کے حق کی کرے لیکن جب دیکھے کہ اس میں کامیابی کی کوئی صورت نہیں تو پھر صاف طور پر قاعدۂ شرعی کے مطابق طلاق دے دے۔ چنانچہ سورۃ النساء کی آیت ۱۲۹ میں فرمایا گیا:

وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوا أَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ

''اور تم ہرگز اس بات کی استطاعت نہیں رکھتے کہ (ایک سے زائد) بیویوں کے درمیان (پورا پورا) عدل کر سکو اگرچہ تم کتنا بھی چاہو' پس (ایک کی طرف) پورے میلانِ طبع کے ساتھ (یوں) نہ جھک جاؤ کہ دوسری کو (درمیان میں) لٹکتی ہوئی چیز کی طرح چھوڑ دو۔'' (۱۲۹ : ۴)

طلاق دینے کی صورت میں خاوند کی طرف سے بیوی کو نقصان پہنچانے کی کوئی صورت نہ ہونے پائے بلکہ اِس حسّاس موقع پر معاملہ کو بڑی شرافت اور عالی ظرفی سے نمٹانے کا حکم دیا گیا ہے (بحوالہ سورۃ البقرۃ: ۲۳۱)۔

(۸) خلع : اس کی تفصیل گزشتہ صفحات ۲۹۶۸ تا ۲۹۷۲ میں دی جا چکی ہے۔

(۹) حلالہ (Superseding Marriage): حلال اور جائز چیزوں میں سے اللہ کے نزدیک مبغوض ترین چیز طلاق ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ طلاق دینے پر ارض و سماء کانپ اٹھتے ہیں۔ طلاق سے شیطان خوش ہوتا ہے اور رحمان ناراض ہوتا ہے۔ (''الجامع الصغیر فی احادیث البشیر النذیر'' لجلال الدین السیوطی' صفحہ ۱۹۷ ؛ ''الاسرار المرفوعہ فی الاخبار الموضوعۃ'' لمُلا علی قاری' صفحہ ۱۲۹)

اب اگر جدائی اور دونوں کے درمیان زن و شو کے تعلق کے ختم ہونے پر دونوں دوبارہ باہم ملنا چاہیں تو خاوند اپنی مطلقہ بیوی کو دوبارہ اپنے حبالۂ عقد میں نہیں لا سکتا جب تک کہ اُس عورت کا نکاح کسی اور خاوند سے نہ ہو

(بحوالہ سورۃ البقرۃ : ۲۳۰)۔ جب تک دوسرا خاوند بغیر کسی جبر و اکراہ کے اپنی صوابدید اور آزادانہ رضا مندی سے طلاق دینے پر راضی نہ ہو تو پہلا خاوند اُس سے نکاح کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ طلاق اور دوبارہ ملاپ کی یہ تشکیل خاوند کو بغیر کسی معقول وجہ کے طلاق دینے سے ممانعت کی بناء پر ہے اور اُس کی غیرت پر تازیانہ لگانے کے سبب سے ہے کہ وہ اپنی بیوی کو کسی دوسرے مرد کو تسکینِ راحتِ جاں کے شرمناک فعل جیسا سامان فراہم کر رہی ہے۔ پس اگر دوسرا خاوند اپنی آزادانہ رضا مندی سے اُسے طلاق دے دے اور عورت کی پہلے خاوند سے محبت بھی لوٹ آتی ہے اور پہلا خاوند بھی اُسے دوبارہ قبول کرنے کے لئے تیار ہو تو اسلام اُنہیں نئی ازدواجی زندگی دوبارہ شروع کرنے کی اجازت دیتا ہے۔

(۱۰) ایلاء☆ کے ذریعے بیوی کی اذیت رسائی کی ممانعت: قبل از اسلام کے عرب میں کچھ خاوندوں کی اپنی بیویوں کے ساتھ جماع نہ کرنے کی عادت تھی اور ایسا کرنے میں بیوی کو دکھ اور آزار دینا مقصود تھا۔ ایسے فعل میں بیوی اُن کے حبالۂ عقد میں رہتے ہوئے حقوقِ ازدواج سے محروم رہتی۔ اس سلسلہ میں احادیثِ نبویہ واضح ہیں کہ اگر خاوند اپنی قسم کو چار ماہ کے اندر توڑ نہیں دیتا تو عورت اُس کی زوجیت سے آزاد ہو جائے گی (صحیح بخاری، جلد ششم، صفحہ ۱۷۰)۔ اگر خاوند اپنی قسم کو توڑ دے تو وہ یا تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانے یا مسلسل دو ماہ کے روزے رکھنے سے کفارہ ادا کرے۔ اگر چار ماہ کی مدّت گزر جائے تو عورت اپنی پسند کے کسی دوسرے مرد سے نکاح کرنے کے لئے آزاد ہو جائے گی۔ لیکن عورت کو کسی غیر یقینی مدّت تک آزار دینا صحیح نہیں۔ تاہم اگر عورت چار ماہ کے بعد اُسی مرد سے دوبارہ نکاح کرنا چاہتی ہو تو اُس پر حلالہ کا اطلاق نہیں ہوگا بلکہ مرد پر کفارہ ادا کرنا لازم ہوگا۔ ("Islam and Women"... Ali Asghar Chishti, p. 34)

(۱۱) عدّت کے بعد بیوہ کو عقدِ ثانی کا حق: سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۳۴ میں فرمایا کہ متوفیان کی بیوگان کی عدّت چار ماہ، دس دن ہے اگر وہ حاملہ نہ ہوں۔ حاملہ بیوہ کی عدّت اُس کا وضعِ حمل ہے یعنی اُس کی عدّت بچے کی پیدائش پر ختم ہوگی جیسا کہ سورۃ الطلاق کی آیت چہارم میں ہے۔

بیوہ کی عدّت کے دوران قرآنِ حکیم کسی مرد کو اُسے نکاح کا پیغام بھجوانے کی اجازت نہیں دیتا۔ تاہم اس خیال سے کہ کہیں وہ اپنے اچھے مستقبل سے مایوس نہ ہو جائے، اُسے محتاط طریقے سے اشارتاً اپنا ارادہ بھیجنا جائز ہے۔

رنڈوے (مرد) کو اپنی بیوی کی وفات کے تین دن بعد عقدِ ثانی کی اجازت ہے۔ مرد کے لئے ایسی رعایت کے پس پردہ منطق یہ ہے کہ عورت کے بغیر گھر کا نظام نہیں چل سکتا۔ اس لئے اسلام نے اُسے سوگ کے تین دن بعد عقدِ ثانی کرنے کی اجازت دی ہے۔ (''کتاب السنن الصغیر''، لیبہقی، ج ۲، ص ۱۲۵ ؛ ''الکتاب المصنف فی الاحادیث والآثار''، لابن ابی شیبہ، صفحات ۱۰۴، ۱۰۵ ؛ ''المصنف''، للسمعانی، ج ۶، ص ۴۷۰ ؛ النسائی، جلد ۳، ص ۳۸۸)

☆ خاوند کا اللہ کی قسم اٹھا کر کہنا کہ میں اپنی عورت کے ساتھ اتنی مدت وطی (جماع) نہیں کروں گا جبکہ وہ مدّت ۴ ماہ سے زائد ہو۔

۲۹۹۷ (رشتہ داری ۔۔ KINSHIP)

ہمارے نبی معظم ﷺ کی مثال مندرجہ بالا حقیقت کا ٹھوس ثبوت ہے۔سیّدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے سال نبوت کے دسویں سال ۱۰ رمضان المبارک میں وفات پائی اور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے اُس سے ایک ماہ بعد یعنی ۱۰ شوال المکرم کو نکاح فرمایا۔ (''سفینۃ الاولیاء'' لدارا شکوہ' صفحات ۱۹۹' ۲۰۰ : ''شریف التواریخ'' لشریف احمد شرافت' جلد اوّل' صفحہ ۲۲۸)

(۱۲) حیض والی عورت سے جماع کرنے کی ممانعت: حیض والی عورتوں کے ساتھ یہود کا رویّہ غیر معقول تھا۔ وہ اُن دنوں میں اُس کے ساتھ ہر قسم کا تعلق یہاں تک کہ ہم نشینی اور کھانا پینا تک ترک کر دیتے تھے۔ حیض کے ایام میں اُس کے ہاتھ کے پکائے ہوئے کھانے کو وہ گندا اور ناپاک سمجھتے تھے۔ اُن کے نزدیک ان مخصوص ایام میں عورت گندگی کا مجسمہ ہوتی ہے۔ اِن معاملات میں ملحدین کا بھی یہود جیسا رویّہ تھا۔ عورت کی ماہواری کے اِن دنوں میں عیسائی لوگ جماع سے گریز نہیں کرتے تھے۔ اس طرح عورت ان تین طبقات کے ہاتھوں ستم رسیدہ تھی۔

اسلام نے اعتدال کا دین ہونے کے ناطے سے اِن متشدّد عادات کا خاتمہ کیا۔ اُس نے عورت کے حیض کے ایام میں اُس سے جماع کرنے کی اس لئے ممانعت کی کہ اِن دنوں میں عورت کمزور اور چڑچڑے مزاج والی ہو جاتی ہے اور اُس میں جنسی خواہش بھی نہیں رہتی۔ تاہم خاوند کو اُن مخصوص ایام میں اُس کی چاہت کی موافقت میں اُس کی ہم نشینی اختیار کرنے' بات چیت کرنے اور اُس کے ساتھ کھانے پینے کی اجازت دی ہے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۲۲ میں اس ممانعت کا ذکر آیا ہے:

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ قُلْ هُوَ أَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيْضِ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ (ألبقرة : ۲۲۲)

''(اے نبی!) لوگ آپ سے حیض کا حکم دریافت کرتے ہیں۔ فرما دیجئے کہ وہ ایک (طرح کی) گندگی ہے پس تم حیض کے دوران عورتوں کو چھوڑے رہو اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں اُن سے قربت نہ کرو۔''

ایامِ حیض میں جماع سے ممانعت کی بابت چند ماہرین کی آراء: ملاحظہ ہو اِسی انسائیکلوپیڈیا کی جلد سوم کا صفحہ ۱۳۹۵۔

(۱۳) ظہار کے مشغلہ کی بیخ کنی: زمانہ قبل از اسلام میں ظہار کا غیر انسانی مشغلہ عام تھا جس کی رُو سے اگر مرد اپنی بیوی کو اپنی ماں کی پشت سے تشبیہ دیتا تو اُسے طلاق کے مساوی سمجھا جاتا اور عورت کے اپنے خاوند کے ساتھ جملہ ازدواجی تعلقات و حقوق ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتے۔ یہ مشغلہ صاف طور پر غیر شریفانہ اور عورت کے حقوق کا ظالمانہ غصب تھا کیونکہ یہ سب کچھ اُس کے قصور کے بغیر ہوتا تھا۔ اسلام نے اس غیر انسانی مشغلہ کی بیخ کنی کی اور سرزنش کی کہ خاوند کو ماں کے ساتھ تشبیہ دینے کے الفاظ کہنا اپنے اوپر کفّارہ کو عائد کرنا ہے۔ تاہم اس سے معاہدۂ نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

(۱۴) خاوند کے فیصلے بیوی پر ٹھونسے نہیں جا سکتے : ایک حدیثِ نبوی کی رُو سے عورت آدم کی پسلی سے پیدا کی گئی ہے' اس لحاظ سے جبلّاتی طور پر وہ کج (ٹیڑھی) ہے۔ لہٰذا خاوند کے لئے اپنے فیصلوں کو اُس پر زبردستی ٹھونسنا اچھی بات نہیں کیونکہ اُس کا ضدی اور خود پسندی کا رویّہ ازدواجی رشتے کو قائم رکھنے میں بہتر نتائج کا موجب نہیں ہوگا۔ عورت کی فطرت سے متعلق حدیثِ نبوی کا حوالہ اِسی جلد کے صفحہ ۲۹۹۴ پر دیا جا چکا ہے۔

(۱۵) اسلام نے عورت کو اپنے خاوند کے انتخاب میں مکمل آزادی عطا کی ہے۔ اُسے اپنی پسند کے خلاف شادی پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلہ میں قرآن حکیم مسلمانوں کو حکم دیتا ہے:

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَّنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ (البقرة : ۲۳۲)

''جب تم عورتوں کو طلاق دے چکو اور پھر وہ اپنی عدّت پوری کر چکیں تو اُنہیں اپنے خاوندوں سے نکاح کرنے سے نہ روکو جبکہ وہ آپس میں شریفانہ طریقے سے رضامند ہو جائیں۔'' (۲ : ۲۳۲)

درجِ ذیل احادیثِ مبارکہ زیرِ نظر موضوع کو مزید تقویت دیتی ہیں جن میں پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا:

(۱) ''لڑکی کو اپنی ذات کے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق اپنے سرپرست کی نسبت زیادہ ہے۔''

(۲) ''کنواری لڑکی کو اُس کے مرضی کے بغیر نکاح میں نہ دو۔''

(۳) ''کسی بیوہ کا نکاح اُس کے مشورہ کے بغیر نہ کرو اور کسی کنواری لڑکی کی شادی اُس کی مرضی کے بغیر نہ کرو اور اُس کی رضامندی اُس کی خاموشی ہے۔''

شادی ہو جانے کے بعد بھی اگر لڑکی اعلان کرے کہ وہ اس شادی پر راضی نہیں تو نکاح فسخ ہو جاتا ہے۔

(۴) نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عہدِ مبارک میں ایک شخص نے اپنی لڑکی کی شادی ایک امیر آدمی سے کر دی لیکن لڑکی اُس مرد کو پسند نہیں کرتی تھی۔ وہ نبی علیہ السلام کی بارگاہ میں آئی اور کہا کہ میرے والد نے میری شادی اپنے ایک امیر بھتیجے سے کر دی ہے تاکہ وہ اس سے مالی منفعت حاصل کر کے اپنی اقتصادی حالت کو بہتر بنا لے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم اُسے پسند نہیں کرتیں تو تم آزاد ہو۔ لڑکی نے جواب دیا کہ میں اپنے والد کے فیصلے کو برقرار رکھتی ہوں لیکن میں یہ سمجھنا چاہتی ہوں کہ آیا والد کو اپنی بیٹیوں کی شادی اُن کی مرضی کے خلاف کرنے کا حق حاصل ہے؟'' (مسند امام احمد' ابن ماجہ)

(۵) اسی طرح بریرہ نامی ایک لونڈی ایک غلام سے بیاہ دی گئی۔ کچھ عرصہ کے بعد بریرہ کو آزادی مل گئی اور اُس نے اُس غلام خاوند کی بیوی رہنے سے انکار کر دیا۔ لیکن وہ اس سے بے حد محبت کرتا تھا۔ وہ اُس کے پیچھے شدید طور پر روتا ہوا گیا۔ اس بات کو دیکھتے ہوئے نبی ﷺ نے بریرہ سے فرمایا: ''بریرہ! اللہ کا خوف کرو اور تمہارے لئے اُس کی محبت اور تمہاری طرف سے مایوس کن صورتِ حال کا کچھ تو خیال کرو! وہ تمہارا خاوند رہا ہے اور اُس سے

تمہارے بچے بھی ہیں۔'' بریرہ نے جواب دیا: ''کیا آپ مجھے اُس کی زوجیت میں رہنے کا حکم فرما رہے ہیں؟'' آپ نے فرمایا: ''نہیں' میں اس کا حکم کیسے دے سکتا ہوں؟ میں تو تم سے سفارش کر رہا ہوں۔'' اس پر بریرہ نے کہا کہ مجھے اُس کی ضرورت نہیں۔'' (صحیح بخاری)

یہ اور اس قسم کے دوسرے واقعات اس بات کا مظہر ہیں کہ اسلامی معاشرے میں حقوقِ نسواں کو بڑا احترام اور قانونی تحفظ حاصل ہے۔

(II) خاوند کے حقوق (بیوی کے فرائض)

جس طرح اسلام نے خاوند پر کچھ ذمہ داریاں عائد کی ہیں' اُسی طرح بیوی پر بھی کچھ فرائض عائد کیے ہیں۔ اسلام کی نظر میں خاوند اور بیوی دونوں کے مساوی حقوق و فرائض ہیں اور اُن میں سے کسی کو دوسرے پر کوئی امتیاز حاصل نہیں جیسا کہ سورۃ البقرۃ میں فرمایا گیا:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِىْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (البقرۃ: ۲۲۸)

''اور دستور کے مطابق عورتوں کے بھی مردوں پر اسی طرح حقوق ہیں جیسے مردوں کے عورتوں پر۔'' (۲:۲۲۸)

بیوی کے فرائض درجِ ذیل ہیں:-

(۱) اطاعت و نیازمندی: خاوند کے آگے بیوی کا مطیع و فرمانبردار رہنا اُس کا فرضِ اوّلیں ہے۔ خاوند کا جائز حکم کا ماننا اُس کا مذہبی فریضہ ہے۔ نیک اور صالح خواتین کی تعریف میں قرآن فرماتا ہے:

فَالصّٰلِحٰتُ قَانِتَات'' (النساء: ۳۴)

''نیک بیویاں (اپنے خاوندوں کی) اطاعت شعار ہوتی ہیں۔'' (۴ : ۳۴)

خاوند کی اطاعت شعار ہونے کے حوالے سے چند احادیثِ نبویہ ذیل میں پیش کی جاتی ہیں:

(i) اِذَا دَعَاالرَّجُلُ زَوْجَتَه' لِحَاجَتِهٖ فَلْتَاْتِهٖ وَاِنْ كَانَتْ عَلَى التَّنُّوْرِ (ترمذی' نسائی)

''جب خاوند اپنی بیوی کو اپنی کسی ضرورت کے لئے بلائے تو اُسے (فوراً) اُس کے پاس آنا چاہئے خواہ وہ تنور پر روٹی تیار کر رہی ہو۔''

(ii) لَوْ كُنْتُ آمِرًا أَحَدًا أَنْ يَّسْجُدَ لِاَحَدٍ لَاَمَرْتُ الْمَرْأَةَ أَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِهَا (ترمذی)

''اگر میں کسی کو حکم دیتا کہ وہ کسی کو سجدہ کرے تو میں بیوی کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔''

(iii) أَيُّمَا امْرَأَةٍ مَاتَتْ وَزَوْجُهَا عَنْهَا رَاضٍ دَخَلَتِ الْجَنَّةَ (ترمذی)

''جو بھی عورت اس حال میں مرے کہ اُس کا خاوند اُس سے راضی ہو' وہ جنت میں داخل ہوگی۔''

(iv) اِذَا دَعَا الرَّجُلُ اِمْرَأَتَه' اِلٰی فِرَاشِهٖ فَلَمْ تَأْتِهٖ فَبَاتَ غَضْبَانَ عَلَيْهَا لَعَنَتْهَا الْمَلَآئِكَةُ حَتّٰى تُصْبِحَ
(صحیح بخاری' صحیح مسلم)
''جب خاوند اپنی بیوی کو اپنی خواب گاہ کی طرف بلائے اور وہ اُس کی طرف نہ آئے' جس وجہ سے خاوند تمام رات غصہ کی حالت میں گزارے تو فرشتے (اُس عورت پر) صبح تک لعنت کرتے رہتے ہیں۔''

اپنے خاوند کی اطاعت و نیاز مندی کے نقشے کا اندازہ ذیل کی حدیث سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے:
لَا يَحِلُّ لِامْرَأَةٍ أَنْ تَصُومَ وَزَوْجُهَا شَاهِدٌ" اِلَّا بِاِذْنِهٖ وَلَا تَأْذَنَ فِيْ بَيْتِهٖ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (مُتَّفَق "عَلَيْهِ)
''بیوی کے لئے (نفل) روزہ رکھنا خاوند کی موجودگی میں اُس کی اجازت کے بغیر جائز نہیں اور نہ ہی اُس کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ خاوند کے گھر میں خاوند کی اجازت کے بغیر کسی کو داخل کرے۔'' (بخاری' مسلم)

(۲) خاوند کی عزت و ناموس اور اُس کے مفادات کا تحفظ : ایک اچھی بیوی خاوند کی موجودگی میں اطاعت شعار اور اُس کی ہم آواز و ہمنوا ہوتی ہے اور اُس کی عدم موجودگی میں بہ حکمِ الٰہی اُس کی عزت و ناموس اور اُس کے اثاثوں کی محافظ ہوتی ہے۔ اس حقیقت کے متعلق قرآن فرماتا ہے :
حٰفِظٰتٌ" لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ' (النساء : ۳۴)
''شوہروں کی عدم موجودگی میں اللہ کی حفاظت کے ساتھ (اپنی عزت کی) حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں۔'' (۴:۳۴)

حجۃ الوداع کے خطبہ☆ میں ختمی مرتبت آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا :
اَيُّهَا النَّاسُ! اِنَّ لَكُمْ عَلٰى نِسَآءِ كُمْ حَقًّا وَلَهُنَّ عَلَيْكُمْ حَقًّا وَلَكُمْ عَلَيْهِنَّ اَلَّا يُوْطِئْنَ فُرُشَكُمْ اَحَدًا تَكْرَهُوْنَه' وَعَلَيْهِنَّ اَلَّا يَأْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ (سیرت ابن ہشام' مظاہرِ حق)
''لوگو! تمہارا تمہاری بیویوں پر حق ہے اور اُن کا تم پر حق ہے' تمہارا اُن پر یہ حق ہے کہ وہ تمہاری خوابگاہ کو کسی سے پامال نہ کرائیں (اور اس کام سے تمہیں نفرت بھی ہے) اور اُن پر تمہارا یہ حق ہے کہ وہ مکمل اخلاقی بلندی کو قائم رکھیں اور ناشائستگی سے گریز کریں۔''

قرآنِ حکیم سورۃ النساء میں ایک اور طبقہ نسواں کا حوالہ دیتا ہے جو اوّل الذکر طبقہ سے کہیں مختلف' بدفطرت اور بدخو ہے :
وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا O (النسآء : ۳۴)
''تمہیں جن عورتوں کی سرکشی کا اندیشہ ہو تو اُنہیں نصیحت کرو اور (اگر نہ سمجھیں تو) اُنہیں خوابگاہوں میں علیحدہ کر دو اور (اگر پھر بھی اصلاح پذیر نہ ہوں تو) اُنہیں (تادیباً ہلکا سا) مارو' پھر اگر وہ تمہاری فرماں بردار ہو جائیں تو اُن پر (ظلم کا) کوئی راستہ تلاش نہ کرو' بے شک اللہ سب سے بلند' سب سے بڑا ہے۔''

☆ حجۃ الوداع کا مکمل خطبہ انسائیکلوپیڈیا کی جلد سوم (اردو) کے صفحات ۱۱۳۸' ۱۱۳۹ پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَھُنَّ اِس جملے کا ترجمہ کرنے سے پیشتر ''نُشوز'' کے معنی خیز اور پُر مغز لفظ کی وضاحت ضروری ہے۔ اس کا لفظی ترجمہ ''بغاوت'' اور ''سرکشی'' ہے۔ لیکن یہ بغاوت ایک شہنشاہیت یا آمریت میں محکوم کی حاکم کے خلاف کے مفہوم میں نہیں بلکہ یہ بیوی کی اپنے خاوند کے کچھ احکام کو نہ ماننے کے مفہوم میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ''نُشوز'' کا لفظ سورۃ النساء کی آیت ۱۲۸ میں خاوند کے لئے بھی استعمال ہوا ہے:

وَاِنِ امْرَاَۃٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِھَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْھِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَھُمَا صُلْحًا

''اور اگر کوئی عورت اپنے شوہر کی جانب سے زیادتی یا بے رغبتی کا خوف رکھتی ہو تو دونوں (میاں بیوی) پر کوئی حرج نہیں کہ وہ آپس میں کسی مناسب بات پر صلح کرلیں۔'' (۴ : ۱۲۸)

اس لئے ''نُشـــوز'' کے لفظ میں خاوند کا بیوی کے بارے میں اندیشہ اور بیوی کا خاوند کے بارے میں اندیشہ دونوں شامل ہیں۔ لہٰذا یہ محکوم کی حاکم کے خلاف بغاوت کے معنیٰ میں نہیں اور سورۃ النساء کی ہر دو آیات ۳۴ اور ۱۲۸ میں ازدواج کے بندھن کو توڑنے کے سیاق میں آیا ہے۔ اگر اِس سیاق و سباق کو مدِّ نظر رکھا جائے تو بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ ''نُشوز'' خاوند یا بیوی کے اُس رویّے کا نام ہے جو دوسرے کے لئے اس قدر پریشان کن ہو کہ اُن کا ایک ساتھ رہنا مشکل ہو جائے۔ اب دوسرے کے لئے یہ پریشان کن رویّہ درجِ ذیل دو طریقوں میں سے کسی ایک طریق میں ہوسکتا ہے :۔

(i) پریشان کرنے والے فریق کی جانب سے کوئی بدنیتی نہ ہو۔ یہ یا تو اُن دونوں کے مزاجوں میں ناموافقت کی وجہ سے ہو یا کسی ایک کی جانب سے دوسرے کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہو کہ وہ دوسرے کے رویّہ میں کوئی پریشان کن پہلو محسوس کرتا ہے۔

(ii) میاں بیوی دونوں میں سے کوئی ایک دانستہ طور پر ایسے طریق سے پیش آتا ہے جو دوسرے فریق کے لئے سنجیدہ طور پر پریشان کن ہو۔ اس صورت میں ایک فریق کی جانب سے دوسرے فریق کے لئے بہ ظاہر بدنیتی ہے۔

تو ''نُشـوز'' کا لفظ اس دوسری قسم کے رویّہ کو شامل ہے کیونکہ دیدہ دانستہ ناشائستہ رویّہ ہی کو جس کی بنیاد بدنیتی پر ہو بغاوت اور سرکشی پر محمول کیا جاسکتا ہے۔

پھر یہ بات بھی ہے کہ ممکن ہے کہ ایک آدمی کے نزدیک ''نُشـــوز'' کا جو معنیٰ ہے وہ دوسرے کے نزدیک نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ میاں بیوی دونوں میں سے ایک فریق کا یہ فیصلہ کہ ایک کا رویّہ دوسرے کے خلاف ''نُشـوز'' کا ہے معروضی اور ذاتی ہے۔ قرآن مجید نے اسی لئے کہا ہے: ''اگر تمہیں نُشـوز کا اندیشہ ہو'' اور یہ نہیں کہا کہ ''اگر تم نُشوز پاؤ۔''

الغرض ''نُشـوز'' کا لفظ میاں بیوی میں سے کسی ایک کے ایسے رویّہ پر دلالت کرتا ہے جو دوسرے فریق کے لئے انتہائی پریشان کن ہو۔

اِن باریکیوں کو سمجھ لینے کے بعد ہم کچھ آگے بڑھتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ آیت میں اُن بیویوں کے لئے کیا تجویز کیا گیا ہے جن کی طرف سے خاوند کو نُشوز کا اندیشہ ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن مجید نے یکے بعد دیگرے تین اقدام تجویز کئے ہیں: (i) وعظ ونصیحت (ii) خوابگاہوں کا اُن سے علیحدہ کرنا (iii) ہلکی مار۔

(i) فَعِظُوهُنَّ (وعظ ونصیحت): سرکش بیوی کی سزا کی یہ پہلی منزل ہے کہ اُسے نرمی و آشتی سے سمجھایا جائے۔ اگر عورت شریف طینت ہے تو یہ کافی ہو جائے گا اور اس میں شوہر کو بھی یہ تعلیم ہے کہ فوراً غصّے میں آکر وہ کوئی سخت کارروائی نہ کر بیٹھے۔ اس اِقدام میں شوہر بیوی کو مختلف قسم کی نصیحتیں کرسکتا ہے۔ وہ اُس کی توجہ کو متلعقہ تعلیماتِ قرآنی ونبوی کی طرف مبذول کرسکتا ہے، وہ اُسے ازدواجی بندھن کے ممکنہ ٹوٹنے کے اُن خطراتِ بد کی یاد دہانی کرا سکتا ہے جس کا اثر اُن دونوں اور اُن کے بچوں سمیت تمام لواحقین پر پڑے گا۔ تاہم ایسی نصیحت اُس صورت میں پُر اثر ہوگی اگر خاوند کم از کم اپنی بیوی کی نسبت زیادہ صاحبِ کردار ہو۔ ورنہ بیوی اُسے یا تو اپنے دل میں یا بانگِ دہل کہہ سکتی ہے: ذرا دیکھو تو سہی' یہ بات کون کہہ رہا ہے! اس لئے خاوند کے قول وفعل میں تضاد نہیں ہونا چاہئے کہ تضاد رب کو پسند نہیں ہے (سورۃ البقرۃ: ۴۴؛ سورۃ الصّف: ۲،۳)۔

(ii) وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ (خواب گاہوں کا علیحدہ کرنا): یعنی اُن سے تعلقاتِ ہمبستری منقطع کرلو اور اُن کے پاس لیٹنا چھوڑ دو۔ یہ سزا کی دوسری منزل ہے۔ خاوند کا بیوی کو نہایت موزوں اور پُر اثر طریقے سے نصیحت کرنے میں اُسے بہت فائدہ مل سکتا ہے لیکن اگر وعظ ونصیحت کارگر نہیں ہوتی تو اُسے اپنی خوابگاہ کو علیحدہ کرنے کے علاوہ دوسرے ایسے اقدامات بھی کرنے چاہئیں جو اُس کے مقصد کے حصول میں مد ثابت ہوں مثلاً اُس سے کلام کرنا چھوڑ دے۔ کلام وخواب کا یہ سلسلہ ٹوٹنا بیوی کی غیرت پر تازیانے کی حیثیت رکھتا ہے جس کے نتیجے میں بیوی اپنے طریقوں کو بدلنے پر تیار ہوسکتی ہے۔

(iii) وَاضْرِبُوهُنَّ (اُنہیں ہلکی مار مارو): یہ تیسرا علاج اُس وقت کے لئے ہے جب دوسرا علاج بھی ناکام ثابت ہو۔ اس پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ یہ مار بالکل ہلکی قسم کی ہو۔ ایسی نہ ہو جس سے چوٹ زیادہ آجائے یا جس سے جیون ساتھی کی توہین لازم آتی ہو بلکہ مفسر صحابی ابن عباس رضی اللہ عنہما سے تو یہ منقول ہے کہ یہ مار مسواک جیسی ہلکی پھلکی چیز سے ہو۔ اتنی اجازت بھی ضرورت پڑنے پر ہے ورنہ سیاقِ عبارت نرمی ہی کی سفارش کر رہا ہے اور اہلِ تحقیق نے تصریح کردی ہے کہ اگر نرم تدبیر کافی ہو تو سخت تر صورت ہرگز جائز نہیں۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ بھی فرمایا کہ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ شوہر اپنی بیوی کو غلام اور لونڈی کی سی مار بھی دے اور پھر اُس سے ہمبستری بھی کرے! (صحیح بخاری، صحیح مسلم بروایت عبداللہ بن زمعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

یاد رہے کہ یہ مار پیٹ عورت پر ظلم نہیں بلکہ اُن کی اصلاح ہے جیسے کبھی اپنے بچوں اور شاگردوں کو مارنا اصلاح کی خاطر ہوتا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: وَاضْرِبُوهُنَّ غَيْرَ مُبَرِّحٍ (ضرورۃً بیویوں کو مارو جس سے اُن کے جسم پر نشان نہ پڑے یعنی سخت اور تکلیف دہ مار نہ مارنی چاہئے)۔ نیز اس مار کا مقصد اذیّت رسانی نہیں بلکہ عورت کو خوابِ غفلت سے جگانا اور اُسے یہ جتلانا ہے کہ وہ غلط راہ پر جارہی ہے۔

ساتھ ہی یہ فرمانِ الٰہی بھی ذہن نشین رہے کہ اگر عورت اپنی سرکشی سے باز آجائے اور اپنے شوہر کی فرمانبردار بن جائے تو پھر شوہر پر بھی لازم ہے کہ وہ اپنے پہلے رویّہ کو یکسر بدل دے اور اُس پر دست درازی سے کلیۃً باز آجائے۔ یہ حکم اُس خدا کا ہے جو سب سے بالا اور سب سے بڑا ہے' اور اُس کے حکم کی سرتابی کے نتائج بڑے ہی المناک ہیں۔ یاد رکھو اگر تم اپنے من مانے رویّہ سے باز نہ آئے تو وہ مقتدر ذاتِ عظیم تم سے نمٹنا خوب جانتی ہے۔لہٰذا اپنی بیوی کے آقا' افسر اور مالک بننے کی کوشش مت کرو۔

<u>آج یورپ میں جو بات بات پر طلاقیں ہو رہی ہیں' اُس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اُن کے ہاں خاوندوں کو بیویوں کی اصلاح کی اجازت نہیں ہے۔</u>

(۳) <u>جذباتِ تشکر و امتنان کا اظہار</u> : بالعموم یہ دیکھا گیا ہے کہ عورتیں اپنے خاوندوں کی ناقدر شناس اور ناشکری ہوتی ہیں اور کسی نہ کسی طریق سے اُن کی شکایت کرتی رہتی ہیں۔اپنے الفاظ اور کلام میں اُنہیں اپنے خاوندوں کا نہ صرف شکرگزار ہونا چاہیۓ بلکہ اطاعت و فرمانبرداری کے ذریعے بھی اُن کا ممنون ہونا چاہیۓ کیونکہ اطاعت بھی شکرگزاری کا ایک طریقہ ہے۔فرمانِ رسولِ عربی ﷺ ہے کہ :

''شبِ معراج میں نے مَردوں سے زیادہ عورتوں کو نارِ جہنم میں جلتے دیکھا۔جب آپ سے اِس کی وجہ معلوم کی گئی تو آپ نے فرمایا: کیونکہ تم عورتیں اپنے خاوندوں کی ناشکرگزار رہتی ہو اور اُن کے حقوق کو تسلیم نہیں کرتیں۔''

اپنی سالی سیّدہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ایک مرتبہ آپ نے فرمایا :
''اُس ذات کی بے قدری اور ناشکری سے بچو جو تمہارا محسن ہے۔تم میں سے کوئی اپنے والدین کے گھر میں خاصا وقت بغیر شادی شدہ رہتی ہے' پھر اللہ تعالیٰ اُسے خاوند (جیسی نعمت) عطا فرماتا ہے' اولاد دیتا ہے' تب بھی وہ شکایت ہی کرتی رہتی ہے۔میں نے تم عورتوں سے کوئی بھلائی نہیں دیکھی۔'' (الادب المفرد)

(۴) <u>اپنے خاوند کے لئے خیرہ کن اظہار</u>: بیوی کا اپنے خاوند کے لئے جنسی انگیخت کا ہر عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ اور لائقِ تحسین ہے۔لہٰذا یہ عمل نہ صرف جائز بلکہ رضائے الٰہی کے حصول کے لئے کافی ہے کہ بیوی ہر وقت صاف ستھری رہے اور ہر طرح اپنے خاوند کا دل موہتی رہے۔خوش کن' ہم آہنگ ازدواجی زندگی کی بنیاد ایک دوسرے کے ساتھ والہانہ شیفتگی اور مغلوب الجذبات (Passionate) محبت ہے (سورۃ الرّوم :۲۱)۔نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ پاک ہے:

خَيْرُ النِّسَآءِ الَّتِىْ إِذَا نَظَرْتَ إِلَيْهَا سَرَّتْكَ (الطبرانی)
''بہترین بیوی وہ ہے کہ جب بھی تو اُسے دیکھے' وہ تجھے خوش کرے۔''
آپ نے یہ بھی فرمایا:

''جب خاوند اپنی بیوی کا ہاتھ از راہِ محبت اپنے ہاتھ میں تھامتا ہے' اللہ بزرگ و برتر عرشِ معلّی پر اپنے بندے کے اس عمل پر خوش ہو رہا ہوتا ہے۔''

(۵) حقِ جماع (Copulation): اسلام میں ازدواجی زندگی کا اصل مقصد پاکیزگی کردار ہے جسے اپنے جیون ساتھی کے ساتھ جماع (ہمبستری) کے ذریعے ہی محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ لہٰذا یہ بیوی کا فرض ہے کہ وہ بوقتِ ضرورت اپنے خاوند کے اس مطالبے کو بہ احسن طریق پورا کرے ورنہ وہ گناہِ کبیرہ کی مرتکب ہونے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے غیظ و غضب کا مورد بھی بنے گی۔ جیسا کہ صفحہ ۲۹۹۹ پر احادیثِ نبویہ کا حوالہ دیا جا چکا ہے۔

(۶) خاوند کی خوشنودی کا حصول: لوگوں سے میل جول کے معاملہ میں بیوی کو اپنے خاوند کے مزاج اور طبیعت کا بخوبی علم ہونا چاہئے تا کہ وہ اُسے اپنے سے ناراض اور غضبناک ہونے کا کوئی موقع نہ دے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

''تین قسم کے لوگوں کی نہ تو نماز اور نہ ہی قربانی قبول کی جاتی ہے۔ اُن میں سے ایک وہ عورت ہے جس کا خاوند اُس سے ناراض ہو۔'' (البیہقی)

خاوند کی جانب سے ظلم و تعدّی یا بیوی کو چھوڑ دینے کے معاملہ سے نکلنے کا طریقہ: اس کا علاج سورۃ النساء کی آیت ۱۲۸ میں یہ بتایا گیا ہے:

وَاِنِ امۡرَاَةٌ خَافَتۡ مِنۡۢ بَعۡلِهَا نُشُوۡزًا اَوۡ اِعۡرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَاۤ اَنۡ يُّصۡلِحَا بَيۡنَهُمَا صُلۡحًا ‌ؕ وَالصُّلۡحُ خَيۡرٌ ‌ؕ وَاُحۡضِرَتِ الۡاَنۡفُسُ الشُّحَّ ‌ؕ وَاِنۡ تُحۡسِنُوۡا وَتَتَّقُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرًا

''اور اگر کوئی عورت اپنے شوہر کی جانب سے زیادتی یا بے رغبتی کا خوف رکھتی ہو تو دونوں (میاں بیوی) پر کوئی حرج نہیں کہ وہ آپس میں کسی مناسب بات پر صلح کر لیں اور صلح (درحقیقت) اچھی چیز ہے اور طبیعتوں میں (تھوڑا بہت) بخل (ضرور) رکھ دیا گیا ہے اور اگر تم احسان کرو اور خدا خوفی اختیار کرو تو بے شک اللہ اُن کاموں سے جو تم کر رہے ہو (اچھی طرح) باخبر ہے۔'' (۴ : ۱۲۸)

''عورت کے اقتصادی مفادات کے تحفظ میں شادی کے مہر میں مختلف اصول مقرر کئے گئے ہیں۔ لیکن شادی کا تقدس کسی بھی اقتصادی مفاد سے عظیم تر ہے۔ تمام حلال چیزوں میں سے طلاق اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔ اس لئے اگر میاں بیوی کے درمیان واقع ہونے والے کسی دراڑ اور رخنے کو کسی اقتصادی تامّل سے پُر کیا جا سکتا ہو تو بیوی' بچوں اور غالباً شوہر کے مستقبل کو داؤ پر لگانے کی بجائے اُس سہولت کو بروئے کار لایا جائے۔ انتہا کے غلط کار انسان کی فطرت میں حبِّ دولت رسی بسی ہوئی ہے اس لئے تجویز یہی ہے کہ انسان ضبطِ نفس کا حامل ہو اور عورت پر کسی اقتصادی قربانی کا بوجھ ڈالے بغیر ہمیں کسی مخلصانہ' دوستانہ تصفیہ پر پہنچنے کے لئے حتی المقدور بھرپور کوشش کرنی چاہئے۔'' (عبداللہ یوسف علی' نوٹ : ۶۳۸)

الغرض شوہر اور بیوی انسانی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ اگر وہ دونوں اپنے اپنے فرائض خوش اسلوبی اور لگن سے ادا کریں تو گاڑی جمالیاتی نظم و تناسب اور سکون و شانتی کے ساتھ رواں دواں رہے گی۔ پُرمسرّت ازدواجی زندگی سے لطف اندوز ہونے کے لئے اُنہیں پہلے اپنے فرائضِ منصبی کی طرف توجہ دینی چاہئے اور اس کے بعد اپنے حقوق کے حصول کی امید رکھنی چاہئے۔

(ج) رشتہ داروں کے حقوق

''انسان مدنی الطبع ہے'' ایک مشہور کہاوت ہے۔ وہ عادتاً اور جبلتاً سماج میں رہنا جانتا ہے اور خلوت و تنہائی سے جلد ہی اکتا جاتا ہے۔ اُس کی اس فطری ضرورت کی تسکین کے لئے اُس کے رحیم و کریم خالق نے اُس کے لئے کنبہ اور رشتہ داری کو پیدا کیا ہے (سورۃ النّحل :۷۲)۔

رشتہ داروں سے ہماری مراد وہ لوگ ہیں جن کی قربت ہمارے والدین سے پھوٹتی ہے۔ مثلاً والدہ کی جانب سے ماموں' ممانی' خالہ' خالو' نانا' نانی اور والد کی جانب سے چچا' چچی' پھوپھی' دادا' دادی ہیں جبکہ والد اور والدہ دونوں کی جانب سے بھائی اور بہنیں ہیں۔ ان سب رشتوں کو اکٹھا کرنے' اُن کے مابین پیار و محبت کا سلسلہ قائم کرنے اور اُن کے حقوق کی کما حقہٗ تکمیل کا نام شریعت کی اصطلاح میں ''صلۂ رِحمی'' ہے۔ اِن رشتوں کے حقوق کو نظر انداز کرنے اور اُنہیں توڑنے کا نام ''قطع رِحمی'' (یعنی رِحم کے رشتوں کو توڑنا) ہے جس کی ممانعت قرآن و احادیث میں جگہ جگہ آئی ہے۔ قرآن مجید میں ان رشتوں کو ''ذوی الارحام'' اور ''ذوی القُربیٰ'' کہا گیا ہے۔

ذوو الارحـــام (رِحم کے رشتوں) کی اہمیت : دیگر مذاہب کے مقابلہ میں اسلام رشتہ داروں کے حقوق پر بہت زیادہ زور دیتا ہے۔ قرآنِ حکیم کے بعض مقامات پر ہمیں اس سلسلہ میں واضح احکام ملتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ شریعتِ اسلامی میں رشتہ داروں سے حسنِ سلوک اور اُن کے ساتھ خوشگوار تعلقات کا ہونا نہ صرف احسان مندی کا عمل ہے بلکہ ہر مسلمان کا لازم اور نا قابلِ فرار فریضہ ہے۔ مثلاً قرآن کا حکم ہے:

(۱) وَاتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیْ تَسَآءَ لُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ (النساء : ۱)

''اور اُس اللہ سے ڈرو جس کے واسطے سے تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور قرابتوں میں بھی تقویٰ اختیار کرو'' (۴ : ۱)

قرآنی لفظ ''الارحـــام'' کا براہِ راست حوالہ اسلام میں ماں اور بیوی کے عظیم مقام و مرتبہ کی طرف ہے۔ غور کیجئے کہ گرامر کے لحاظ سے اس لفظ کو اللہ کے ساتھ جوڑا گیا ہے۔ اس لئے اسلام میں رشتہ داری کو انتہائی اہم سماجی ادارہ سمجھا گیا ہے۔

(۲) وَاعۡبُدُوا اللّٰہَ وَلَا تُشۡرِکُوۡا بِہٖ شَیۡئًا وَّبِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا وَّبِذِی الۡقُرۡبٰی --- (النساء : ۳۶)

''اور اللہ کی عبادت کرو اور اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور والدین' رشتہ داروں سے بھلائی کرو۔''

(۳) وَاُولُوا الۡاَرۡحَامِ بَعۡضُھُمۡ اَوۡلٰی بِبَعۡضٍ فِیۡ کِتٰبِ اللّٰہِ (الانفال : ۷۵)

''اور رشتہ دار اللہ کی کتاب میں (صلہ رحمی اور وراثت کے لحاظ سے) ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں۔'' (۸ : ۷۵)

(۴) وَآتِ ذَا الۡقُرۡبٰی حَقَّہٗ (بنی اسرائیل : ۲۶)

''اور قرابتداروں کو اُن کا حق ادا کرو۔'' (۱۷ : ۲۶)

(۵) قُلۡ لَّا اَسۡئَلُکُمۡ عَلَیۡہِ اَجۡرًا اِلَّا الۡمَوَدَّۃَ فِی الۡقُرۡبٰی (الشُّوریٰ : ۲۳)

''فرما دیجئے میں اِس (تبلیغِ رسالت) پر تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا مگر قرابت داروں کی محبت چاہتا ہوں۔'' (۴۲ : ۲۳)

(۶) فَھَلۡ عَسَیۡتُمۡ اِنۡ تَوَلَّیۡتُمۡ اَنۡ تُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ وَتُقَطِّعُوۡا اَرۡحَامَکُمۡ O (محمد : ۲۲)

''پس (اے منافقو!) تم سے توقع یہی ہے کہ اگر تم (قتال سے گریز کر کے بچ نکلو اور) حکومت حاصل کر لو تو تم زمین میں فساد ہی برپا کرو گے اور اپنے (اُن) قرابتی رشتوں کو توڑ ڈالو گے (جن کے بارے میں اللہ اور اُس کے رسول ﷺ نے جوڑنے اور محبت کا حکم دیا ہے۔)'' (۴۷ : ۲۲)

یعنی اگر بُرائی اور بدی کو بالادستی حاصل ہو جائے تو اُس میں خونی رشتوں کا احترام کہاں؟ اگر برائی کا قلع قمع نہ کیا جائے تو اُس کا تمام عالم میں پھیل جانا یقینی ہے اور ظلم و بربریت کے عام ہونے میں خون کے رشتوں کا احترام نہیں کیا جاتا۔

''رشتہ داروں سے محبت کی وسعت کا معنیٰ مشترک انسانیت سے ہماری محبت ہے کیونکہ تمام لوگ آدم علیہ السلام کی اولاد ہونے کے ناطے سے آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ ہر شخص نوعِ انسانی سے عام محبت کا معنیٰ سمجھ سکتا ہے۔ کیا ہم اس نظریہ کو تمام انسانوں سے محبت تک وسعت نہیں دے سکتے تاکہ رشتہ داری کی محبت اللہ کی محبت سے جُڑ جائے۔'' (عبداللہ یوسف علی' نوٹ : ۴۵۶۰)

<u>رشتہ داروں کے حقوق کی اہمیت ازروئے احادیث</u>: ملاحظہ ہوں اِسی جلد ششم کے صفحات ۲۷۶۳ تا ۲۷۶۷۔

<u>صلہ رحمی کا ثواب</u> : اِسی جلد ششم کے صفحات ۲۷۶۳ تا ۲۷۶۷ سے استفادہ کرنے کے بعد درج ذیل بیان کو بھی شامل کر لیا جائے :۔

آنحضور ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے :

۳۰۰۷ (رشتہ داری ... Kinship)

اَلصَّدَقَۃُ عَلَی الْمِسْکِیْنِ صَدَقَۃ" وَعَلیٰ ذِی الرَّحِمِ صَدَقَۃ" وَ صِلَۃ" (سنن ابن ماجہ' سنن ترمذی)
''مسکین کو خیرات دینا صرف صدقہ ہے لیکن رشتہ دار کو خیرات دینا صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی۔''

''کنز العمال'' میں ہمیں یہ عبارت ملتی ہے :
''رشتہ داروں سے حسنِ سلوک اور احسن رویّہ سے پیش آنا شہروں کے شاد و آباد ہونے اور درازیِ عمر کا سبب بنتا ہے۔ اچھا عمل جو فوری ثوابِ الٰہی کا موجب ہے' صلہ رحمی کہلاتا ہے۔ اگر آدمی کے خاندان کے لوگ تجارت پیشہ ہوں تو اُن کی دولت بابرکت ہوتی ہے۔ کوئی ایسا خاندان نہیں ہوتا جو متحد ہونے کے باوجود محرومی اور افلاس کا شکار ہو۔''

مسلمانوں کے مابین کشیدگی اور عداوت کسی دنیاوی سبب کے باعث نہ ہو۔ اس سلسلہ میں صحیح مسلم کی یہ حدیث ہے جس میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا :
''جنت کے دروازے ہر سوموار اور جمعرات کو کھول دئے جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر اُس شخص کی مغفرت فرماتا ہے جو اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا ہو' سوائے اُس کے جس کی اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ عداوت ہو۔ تین دفعہ یہ حکم دیا جاتا ہے: ان دونوں کو اُن کے حال پر اُس وقت تک کے لئے چھوڑ دو جب تک اُن میں صلح نہیں ہو جاتی۔''

''مظلوم اور دُکھے دل آدمی کے لئے یہی کافی ہے کہ اُس کا بھائی اُس کے پاس اپنے کئے پر معذرت خواہی کرنے آئے' اُسے اُس کی معذرت قبول کر کے اُس سے صلح کر لینی چاہئے اور اُسے یونہی دھتکار نہیں دینا چاہئے۔ نبی علیہ السلام نے یہ کہتے ہوئے تنبیہ فرمائی ہے کہ ایسا کرنے والے کو میں روزِ محشر جنت میں حوضِ کوثر پر نہیں ملوں گا۔'' (طبرانی)

<u>رشتہ داروں کا حقِ وراثت</u> : اسلام نے متوفّٰی کے تمام قرابتداروں کو اُس کے ترکہ میں وراثت کا حق دیا ہے۔ اگر کسی قرابتدار کو حقِ وراثت سے محروم کئے جانے کا منصوبہ ہو تو خطارکاروں کو نارِ جہنم کی وعید سنائی گئی ہے۔ سورۃ النساء میں تمام رشتہ داروں کے حصصِ وراثت بیان ہوئے ہیں اور کسی کوتاہی کی صورت میں یہ تنبیہ کی گئی ہے:
''یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں اور جو کوئی اللہ اور اُس کے رسول کی فرمانبرداری کرے' اُسے وہ جنتوں میں داخل کرے گا۔۔۔۔۔۔ اور جو کوئی اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرے اور اُس کی حدود سے تجاوز کرے' اُسے وہ دوزخ میں داخل کرے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اُس کے لئے ذلت انگیز عذاب ہے۔'' (سورۃ النساء : ۱۳' ۱۴)

نوٹ : قرآن کی نظر میں مستحق اور مظلوم رشتہ دار کی طرف دستِ تعاون دراز کرنا اُس پر کوئی احسان نہیں بلکہ اُس کا اپنے خوشحال اور مرفہ الحال رشتہ داروں پر جائز حق بنتا ہے۔ قرآن حکیم اس حقیقت کو کئی مقامات پر بار بار بیان کرتا ہے کہ اُن کے مال میں محروم القسمت لوگوں کا بھی حق ہے۔

(۱۱۷) کِرَامًا کَاتِبِیْن (Noble Scribes)

انسان کے اعمال وافعال لکھنے والے یہ دو فرشتے ہیں۔ ایک فرشتہ دائیں کندھے پر جو انسان کی نیکیاں لکھنے پر مامور ہے' چاہے وہ نیکی ابھی عملاً نہ ہوئی ہو بلکہ ارادہ تک محدود رہی ہو' اور دوسرا فرشتہ بائیں کندھے پر ہے جو انسان کے بدافعال وکلام لکھتا جاتا ہے۔ ان کا ذکر سورۃ الانفطار (۸۲) میں اور سورہ قٓ (۵۰) میں علی الترتیب اس طرح آیا ہے:

(۱) وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ O كِرَامًا كَاتِبِيْنَ O يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ O (الِانفِطار: ۱۰-۱۲)

''اور بے شک تم پر نگہبان مقرر ہیں۔ معزز لکھنے والے۔ وہ جانتے ہیں جو کچھ تم عمل کرتے ہو۔''

(۲) مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ O (قٓ: ۱۸)

''وہ منہ سے کوئی بات کہنے نہیں پاتا مگر اس کے پاس ایک نگہبان (لکھنے کے لئے) تیار رہتا ہے۔''

''یہ بات بھی مشہور ہے کہ نماز کے اختتام پر دائیں طرف کو سلام دائیں طرف کے فرشتے کو اور بائیں طرف کو سلام بائیں طرف کے فرشتے کو ہوتا ہے۔'' ... ("The Concise Encyclopaedia of Islam" Cyril Glasse, pp. 262, 263 : Singapore 2002.

کِرَامًا کَاتِبِیْن کے اعمال بنی آدم لکھنے کی تفصیل: ربّ ذوالجلال والاکرام نے مختلف فرشتوں کے ذمہ مختلف کام سپرد کئے ہوئے ہیں جیسے عزرائیل علیہ السلام کے ذمہ روح قبض کرنا' میکائیل علیہ السلام کے ذمہ رزق پہنچانا اور اسرافیل علیہ السلام کے ذمہ بروزِ قیامت صور پھونکنا ہے جس سے تمام مخلوق فنا ہو جائے گی۔ اور بعض فرشتوں کے ذمہ یہ ہے کہ وہ زمین میں گھوم پھر کر دیکھیں کہ کہاں اللہ کے بندے اُس کا ذکر کر رہے ہیں' ایسے فرشتوں کو ''ملائکہ سیّاحین'' کہا جاتا ہے اور اسی طرح بعض فرشتوں کو بندوں کے اعمال لکھنے پر مامور کیا ہے جنہیں کِرَامًا کَاتِبِیْن کہا جاتا ہے۔ اِن فرشتوں کو انسانوں کے اعمال لکھنے پر اس لئے مقرر کیا ہے تاکہ اُن کا لکھا ہوا قیامت کے دن انسان پر حُجت ہو جائے۔

اس میں اختلاف ہے کہ کفار کے اعمال کو بھی فرشتے لکھتے ہیں یا نہیں کیونکہ وہ تو صرف بُرے کام کرتے ہیں۔ اس لئے بعض علماء نے کہا کہ اُن کے اعمال کو لکھنے والے فرشتے نہیں ہیں اور بعض نے کہا کہ اُن کے لئے بھی لکھنے والے ہیں کیونکہ قرآن فرماتا ہے:

(۱) وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ فَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِيَهْ O (الحآقّة: ۲۵)

''اور رہا وہ شخص جسے اُس کا صحیفہ اعمال اُس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا تو وہ کہے گا اے کاش! مجھے یہ صحیفہ نہ دیا جاتا۔'' (۶۹ : ۲۵)

(۲) وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ O فَسَوْفَ يَدْعُوْا ثُبُوْرًا O (الانشقاق: ۱۰، ۱۱)

۳۰۰۹ (کِرَامًا کَاتِبِیْن)

''البتہ وہ شخص جس کا نامہ اعمال اُس کی پیٹھ کے پیچھے سے دیا جائے گا تو وہ موت کو پکارے گا۔'' (۸۴:۱۰'۱۱)

رہا یہ سوال کہ جو فرشتہ کافر کی دائیں جانب ہوتا ہے' وہ کیا کرتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ بائیں جانب کے لکھے ہوئے پر گواہ ہوتا ہے۔

''سفیان سے سوال کیا گیا کہ جب بندہ نیک یا بدعمل کرتا ہے' اُس کا فرشتوں کو علم ہونا تو ظاہر ہے لیکن جب نیک یا بدعمل کا وہ ارادہ کرتا ہے تو اُس کا فرشتوں کو کیسے علم ہوتا ہے؟ سفیان نے جواب دیا کہ جب بندہ نیک عمل کا ارادہ کرتا ہے تو اُس سے مشک کی خوشبو آتی ہے اور جب وہ بُرے عمل کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے سخت ناگوار بدبو آتی ہے۔''

''مسلمانوں کا بُرے کام کرنا کفار کے بُرے کام کرنے سے زیادہ سنگین ہے کیونکہ مسلمانوں کو علم ہے کہ اُن کے اعمال کی اطاعت کرنے والے فرشتے مقرر ہیں جو اُن کے اعمال کو لکھتے رہتے ہیں۔ اس کے باوجود جب وہ بُرے کام کریں تو یہ زیادہ قابلِ ملامت ہے کیونکہ کفار کو تو اس پر ایمان نہیں ہے کہ اُن کے تمام اعمال فرشتے لکھ رہے ہیں۔''

<u>کِرَامًا کَاتِبِیْن قضائے حاجت اور جماع کے وقت انسان سے الگ ہوجاتے ہیں</u> : ابنِ عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم لوگ برہنہ ہونے سے بچو کیونکہ تمہارے ساتھ وہ فرشتے رہتے ہیں جو صرف قضائے حاجت کے وقت اور بیوی کے ساتھ عملِ تزویج کے وقت تم سے جدا ہوتے ہیں' سو تم فرشتوں سے حیاء کرو اور اُن کی تکریم کرو۔ (سنن ترمذی' رقم الحدیث: ۲۸۰۰)

''امام بزار حضرت اَنس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ تمہیں برہنہ ہونے سے منع فرماتا ہے' سو تم ان فرشتوں سے حیا کرو جو تمہارے ساتھ رہتے ہیں' وہ کِرَامًا کَاتِبِیْن ہیں جو تین اوقات کے سوا تم سے جدا نہیں ہوتے: قضاء حاجت کے وقت' جنابت کے وقت اور غسل کے وقت۔''

''امام بزار حضرت اَنس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: فرشتے جب ایسا صحیفہ اللہ کے پاس لے کر جائیں جس کے اوّل و آخر میں استغفار ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے درمیان میں لکھی ہوئی چیزوں کو بخش دیتا ہے۔'' (الدُّرُّ المنثور لجلال الدین السیوطی' ج ۸' ص ۴۰۲' ۴۰۳)

امام ابن مردَویہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ دوپہر کے وقت باہر نکلے تو آپ نے جنگل میں ایک شخص کو نہاتے ہوئے دیکھا۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا: اللہ سے ڈرو اور کِرَامًا کَاتِبِیْن کا اِکرام کرو جو دو حالتوں کے سوا ہر وقت تمہارے ساتھ رہتے ہیں۔ جب انسان بیت الخلاء میں ہو یا اپنی بیوی کے ساتھ ہو کیونکہ اللہ نے اُن کا نام ''کـــــرام'' رکھا ہے۔ وہ ایسی حالتوں میں دیوار یا اوٹ کے پیچھے ہوجاتے ہیں اور انسان کی طرف نہیں دیکھتے۔'' (''تبیان القرآن''۔ علامہ غلام رسول سعیدی' ج ۱۲' ص ص ۶۱۱' ۶۱۲)

BIBLIOGRAPHY

	Author	Title
1.	Ashrafullah Husaini, Syed	Handbook on Hajj, Umrah and Ziarah.
2.	Amin, Mohammad, Dr.	Islamisation of Laws in Pakistan.
3.	Anwarullah, Dr.	Islamic Law of Evidence.
4.	Armstrong, Karen	Muhammad—the Biography of the Prophet.
5.	Arnold, T.W.	The Preaching of Islam : London 1896.
6.	Asad, Muhammad, Dr.	The Message of the Qur'an.
7.	Becker, C. H.	Christianity and Islam.
8.	Biddle, John	True Opinion concerning the Holy Trinity
9.	Briffault, Robert	The Making of Humanity: Lahore, 1980.
10.	Browne, Lawrence	The Prospects of Islam.
11.	Bucaille, Maurice	The Bible, the Koran and Science.
12.	Bunsen	Islam or True Christianity.
13.	Chishti, Ali Asghar	Islam and Women.
14.	Davenport, John	Apology for Muhammad & the Koran.
15.	Deniel, Norman	Islam, Europe and the Empire.
16.	Dinler Trihi	A History of Religions.
17.	Dummelow	Commentary on the Holy Bible.
18.	Faruki, A. Kemal	Islamic Jurisprudence.
19.	Fazlur Rahman, Dr.	The Qur'anic Foundations and the Structure of the Muslim Society.
20.	Gandhi, Mahatma	Young India.
21.	Gibbon, Edward	The Decline and Fall of the Roman Empire.
22.	Glubb, John Sir	The Life and Times of Muhammad.
23.	Goats, W. J.	Armed Forces as Power.
24.	Goodspeed, E. J.	The Apostolic Fathers.
25.	Haeckel	Riddle of the Universe.
26.	Harnack	Christianity and History.
27.	Hitti, P. K.	Islam – A Way of Life.
28.	Harun Yahya	Karma and Islam.
29.	Havelock, Ellis	Man and Women.
30.	Havelock, Ellis	Psycology of Sex.
31.	Imran Ahsan Khan Nyazee	Islamic Jurisprudence
32.	Indira	Status of Women in Ancient India.
33.	Lane-poole, Stanley	Glimpses of Muhammad.
34.	Lane-poole, Stanley	Moors in Spain.
35.	Leonard	Islam.

36. Lerouge, Raymond — Vie de Muhammet.
37. Liaqat Ali Khan Nyazee — Islamic Law of Tort.
38. Lindsay, T. — A List of False Reading of the Scripture.
39. Masudul Hasan, Prof. — Reconstruction of Political Thought in Islam.
40. Mazheruddin Siddiqi — The Qur'anic Concept of History.
41. Michener, James, A. — Islam—the Misunderstood Religion.
42. Milton, John — The Christian Doctrine.
43. Moin Qureshi, S.M. — Islam--- the Most Humane Religion.
44. Muir, William, Sir. — Life of Muhammad.
45. Najmee, Abul Hasan Syed — Islamic Legal Theory and the Orientalists.
46. Nemilow — Biological Tragedy of Women.
47. Newman — Phases of Faith.
48. O'Leary De Lacy — Arabic Thought and its Place in History.
49. O'Leary De Lacy — Islam at the Crossroads.
50. Parke, D. B. — The Epic of Unitarianism.
51. Priestly, J. — The History of Jesus Christ.
52. Ragg — The Gospel of Barnabas.
53. Ratnam, Venkata — An Essay on Islam.
54. Renald, A. — Historical and Critical Reflections upon Mohammetinism and Socianism.
55. Robertson, Smith — Kinship and Marriage in Early Arabia.
56. Ross, E. D., Sir — The Persians.
57. Roy, M. N. — Historical Role of Islam.
58. Schacht — Theology and Law in Islam.
59. Schmiedel — Jesus in Modern Criticism.
60. Schuon, Frithjof — Understanding Islam.
61. Scott, S. P. — History of the Modern Empire in Europe.
62. Sidis — Psychology of Suggestion.
63. Stoddard, Lothrop, A. M. — The New World of Islam.
64. Swedenborg — The True Christian Religion.
65. Taqi Usmani, Maulana — Rules of I'tikaf.
66. Tara Chand — Influence of Islam on Indian Culture.
67. Toland, John — The Nazarens.
68. Tritton, A. S. — Islam.
69. Turner, Gunay, Prof. Dr. — The History of Religions.
70. Vaglieri, Laura Veccia — An Interpretation of Islam.
71. Vaglieri, Laura Veccia — What made Islam a World-force?
72. Wallace, A. — Anti-Trinitarian Biographies.
73. Wilbur, E. M. — A History of Unitarianism.
74. Yitik, Ali Ihsan, Dr. — The Relation of the Idea of Karma in Indian Religions.
75. Yusuf, Muhammad Mirza — A-One Comprehensive Knowledge.

76. Zahn, Theodre — Articles of the Apostolic Creed.
77. Zaki Ali, Dr. — Islam in the World.
78. Zakir, Naik, Dr. — Answers to non-Muslims' Common Questions about Islam.

ENCYCLOPAEDIAS

1. Academic American Encyclopedia.
2. Encyclopedia of Islam : E. Von Donzel.
3. Encyclopedia of the Qur'an – Leiden (USA) in six volumes.
4. Concise Encyclopedia of Islam – Cyril Glassee : Singapore 2002.
5. Hastings' Encyclopedia of Religion and Ethics.
6. La Grande Encyclopedia.
7. Encyclpaedia Britannica : USA 1954.
8. New Encyclopedia Britannica.
9. The Oxford Encyclopedia of the Modern Islamic World.
10. Grolier Academic Encyclopedia.
11. Houtsma and Wensink's Encyclopedia of Islam.
12. Micropedia Britannica.
13. Funk and Wagnalls Encyclopedia of New Sciences.
14. McGraw Hill Encyclopedia of Religious Sciences.
15. Encyclopedia of Islamic Spirituality, Lahore, 2000.
16. Urdu Da'ira-tul-Ma'arif, Punjab University, Lahore.

English Translations/Commentaries on the Holy Qur'an

1. Translation and Commentary on the Holy Qur'an : Abdullah Yusuf Ali.
2. Translation and Commentary on the Holy Qur'an : Abdul Majid Daryabadi.
3. Translation of the Holy Quran : Marmaduke Pickthall.

Newspapers/Journals/Monthlies/Weeklies

1. The Daily "Dawn" Karachi of 13th March, 1992.
2. The Hibbart Journal of London, October, 1934.
3. The American Journal of Social Sciences, Summer 1993.
4. "Islamic Literature" of November, 1956.
5. "Light" Lahore of 24th November, 1958.
6. "Light" Lahore of 16th September, 1959.
7. Readers' Digest of May, 1955.

(۸) ماہنامہ ''مؤمن'' لاہور' اپریل ۲۰۰۳ء
(۹) ماہنامہ ''مؤمن'' لاہور' جولائی ۲۰۰۵ء
(۱۰) ماہنامہ ''منہاج القرآن'' لاہور' جنوری ۲۰۰۷ء
(۱۱) ماہنامہ ''منہاج القرآن'' لاہور' جنوری ۲۰۰۸ء
(۱۲) ماہنامہ ''منہاج القرآن'' لاہور' مارچ ۲۰۰۸ء
(۱۳) ہفت روزہ ''تکبیر'' لاہور ۲۶ دسمبر ۱۹۹۶ء
(۱۴) روزنامہ ''مشرق'' میگزین ۱۸ ستمبر ۱۹۹۶ء
(۱۵) ''اخبار بنی'' مولانا اشرف علی تھانوی
(۱۶) ماہنامہ ''اشرف'' کراچی' سیرۃ نمبر ربیع الثانی ۱۴۱۶ھ/۱۹۹۵ء۔
(۱۷) ماہنامہ ''الدعوۃ'' اسلام آباد' جنوری ۱۹۹۶ء
(۱۸) ماہنامہ ''الدعوۃ'' اسلام آباد فروری ۱۹۹۶ء
(۱۹) ماہنامہ ''الدعوۃ'' اسلام آباد' اگست ۱۹۹۶ء
(۲۰) ''نقوش'' لاہور: رسول نمبر
(۲۱) شافعی رسالہ
(۲۲) تصویر کے شرعی احکام (رسالہ) مفتی محمد شفیع۔
(۲۳) تقریر علامہ سیّد احمد سعید کاظمی' خانیوال شہر در موضوع ''مقامِ امامِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ''۔

کتبِ لغت

(۱) المفردات : امام حسین بن محمد راغب اصفہانی (م ۵۰۲ھ) مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز۔ مکہ مکرمہ ۱۴۱۸ء
(۲) لسان العرب : علامہ جمال الدین محمد بن مکرم بن منظور افریقی (م ۷۱۱ھ) مطبوعہ نشر ادب الحوزۃ' قم ایران۔
(۳) القاموس المحیط : مجد الدین محمد بن یعقوب فیروز آبادی (م ۸۱۷ھ) مطبوعہ بیروت۔
(۴) تاج العروس : سیّد محمد مرتضیٰ الزبیدی (م ۱۲۰۵ھ) مطبوعہ المطبعۃ الخیریۃ۔ مصر
(۵) لغات القرآن : ابنِ قتیبہ (م ۲۷۶ھ)
(۶) لغات الحدیث: علامہ وحید الزمان۔
(7) Oxford English-Urdu Dictionary ... Shanul Haq Haqqi
(8) Pallen and Wynne's New Catholic Dictionary
(9) Dictionary of Contemporary Thought ... David Kirby
(10) Dictionary of Politics ... David Robertson.

کتبِ تفاسیر

(۱) جامع البیان : امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری (م ۳۱۱ھ) مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۴۰۹ھ۔
(۲) احکام القرآن : امام ابوبکر بن علی رازی' جصاص (م ۳۷۰ھ) مطبوعہ سہیل اکیڈمی' لاہور ۱۴۰۰ھ۔
(۳) تفسیر کبیر: امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین بن عمر رازی (م ۶۰۶ھ)' مطبوعہ بیروت' ۱۴۱۵ھ۔
(۴) الجامع لاحکام القرآن : علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی (م ۶۶۸ھ) مطبوعہ بیروت ۱۴۱۵ھ۔
(۵) تفسیر القرآن : حافظ عماد الدین اسماعیل بن عمر بن کثیر الشافعی (م ۷۷۴ھ) مطبوعہ بیروت ۱۳۸۵ھ۔
(۶) الدُّرُّ المنثور : حافظ جلال الدین السیوطی (م ۹۱۱ھ) مطبوعہ مکتبہ آیت اللہ العظمیٰ ایران ۱۴۲۱ھ۔
(۷) تفسیر مظہری: قاضی ثناء اللہ پانی پتی (م ۱۲۲۵ھ)' مطبوعہ بلوچستان بک ڈپو' کوئٹہ۔
(۸) فتح القدیر : شیخ محمد بن علی شوکانی (م ۱۲۵۰ھ)' مطبوعہ دار المعرفہ بیروت' دار الوفاء بیروت ۱۴۱۸ھ۔
(۹) روح المعانی : سیّد محمود آلوسی حنفی (م ۱۲۷۰ھ) مطبوعہ دار الفکر' بیروت ۱۴۱۷ھ۔
(۱۰) خزائن العرفان: سیّد محمد نعیم الدین مراد آبادی (م ۱۳۶۷ھ)' مطبوعہ تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور۔

(۱۱) تفسیر ماجدی (اردو): مولانا عبدالماجد دریا آبادی۔ مطبوعہ تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور۔
(۱۲) نور العرفان (تفسیر نعیمی): مفتی احمد یار خان گجراتی (م ۱۳۹۱ھ) و مفتی اقتدار احمد خان گجراتی۔
(۱۳) معارف القرآن: مفتی محمد شفیع (م ۱۳۹۶ھ) مطبوعہ ادارۃ المعارف کراچی، ۱۳۹۷ھ۔
(۱۴) ترجمان القرآن: ابوالکلام آزاد۔
(۱۵) بیان القرآن: محمد علی لاہوری قادیانی۔
(۱۶) ضیاء القرآن: پیر محمد کرم شاہ الازہری، مطبوعہ ضیاء القرآن پبلیکیشنز، لاہور۔
(۱۷) تدبر قرآن: شیخ امین احسن اصلاحی، مطبوعہ فاران فاؤنڈیشن، لاہور۔
(۱۸) تبیان القرآن: علامہ غلام رسول سعیدی۔

کتب علوم قرآن

(۱) البرہان فی علوم القرآن: علامہ بدرالدین محمد بن عبداللہ زرکشی (م ۷۹۴ھ) مطبوعہ بیروت۔
(۲) مناہل القرآن: علامہ محمد عظیم زرقانی، مطبوعہ دار احیاء العربی بیروت۔

کتب حدیث

(۱) مؤطا امام مالک: امام مالک بن انس اصبحی (م ۱۷۹ھ) مطبوعہ دارالفکر بیروت ۱۴۰۹ھ۔
(۲) سنن دارمی: امام ابوعبداللہ بن عبدالرحمن دارمی (م ۲۵۵ھ)، مطبوعہ دارالمعرفۃ بیروت، ۱۴۲۰ھ۔
(۳) صحیح بخاری: امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل (م ۲۵۶ھ)، مطبوعہ دار ارقم بیروت ۱۴۱۲ھ۔
(۴) الادب المفرد: امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل (م ۲۵۶ھ)، مطبوعہ دارالمعرفہ، بیروت ۱۴۱۲ھ۔
(۵) صحیح مسلم: امام ابوالحسین مسلم بن حجاج قشیری (م ۲۶۱ھ)، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ ۱۴۱۷ھ
(۶) سنن ابن ماجہ: امام ابوعبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ (م ۲۷۳ھ)، مطبوعہ دارالجیل بیروت ۱۴۱۸ھ۔
(۷) سنن ابوداؤد: امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث سجستانی (م ۲۷۵ھ)، مطبوعہ بیروت ۱۴۱۴ھ۔
(۸) سنن ترمذی: امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی (م ۲۷۹ھ)، مطبوعہ دارالفکر بیروت ۱۴۱۴ھ۔
(۹) سنن نسائی: امام ابوعبدالرحمن احمد بن شعیب نسائی (م ۳۰۳ھ)، مطبوعہ دارالمعرفہ، بیروت، ۱۴۱۲ھ۔
(۱۰) صحیح ابن حبان: امام ابوحاتم محمد بن حبان البستی (م ۳۵۴ھ)، مطبوعہ بیروت ۱۴۰۷ھ۔
(۱۱) المستدرک: امام ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ حاکم نیشاپوری (م ۴۰۵ھ)، مطبوعہ بیروت، ۱۴۲۰ھ
(۱۲) الترغیب والترہیب: امام زکی الدین عبدالعظیم بن عبدالقوی المنذری (م ۶۵۶ھ) مطبوعہ قاہرہ ۱۴۰۷ھ۔
(۱۳) مشکوۃ: امام ولی الدین تبریزی (م ۷۴۲ھ)، مطبوعہ اصح المطابع، دہلی؛ دار ارقم بیروت۔
(۱۴) مجمع الزوائد: حافظ نورالدین علی بن ابی بکر الہیثمی (م ۸۰۷ھ)، مطبوعہ دارالکتاب العربی بیروت ۱۴۰۴ھ۔
(۱۵) کنز العمال: علامہ علی متقی بن حسام الدین ہندی برہان پوری (م ۹۷۵ھ)، مطبوعہ بیروت۔

کتب شروح حدیث

(۱) اربعین نووی: علامہ یحییٰ بن شرف نووی (م ۶۷۶ھ)۔
(۲) ریاض الصالحین: علامہ یحییٰ بن شرف نووی (م ۶۷۶ھ)۔

(۳) فتح الباری (شرح صحیح بخاری): حافظ شہاب الدین احمد بن علی عسقلانی (م۸۵۲ھ) بیروت۔
(۴) مرقاۃ: علامہ علی بن سلطان محمد القاری (م۱۰۱۴ھ)، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان ۱۳۹۰ھ۔
(۵) مظاہر حق (شرح مشکوٰۃ): مولانا قطب الدین۔
(۶) نُزھۃ القاری: مفتی محمد شریف الحق امجدی (م۱۴۲۱ھ)، مطبوعہ فرید بک سٹال لاہور ۱۴۲۱ھ۔

کتبِ تاریخ، سیرت و فضائل

(۱) السیرۃ النبویہ: امام عبدالملک بن ہشام (م۲۱۳ھ)، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۵ھ۔
(۲) تاریخ الامم والملوک: امام ابوجعفر محمد بن جریر الطبری (م۳۱۰ھ)، مطبوعہ دارالفکر بیروت۔
(۳) المصطفیٰ: امام محمد بن محمد غزالی (م۵۰۵)، مطبوعہ دارالخیر بیروت، ۱۴۱۳ھ۔
(۴) الشفاء: قاضی عیاض بن موسیٰ مالکی (م۵۴۴ھ)، مطبوعہ عبدالتواب اکیڈمی ملتان، دارالفکر بیروت۔
(۵) اَلرّوض الانف: علامہ ابوالقاسم عبدالرحمٰن بن عبداللہ سہیلی (م۵۷۱ھ)، مکتبہ فاروقیہ ملتان۔
(۶) الوفاء: علامہ عبدالرحمٰن بن علی جوزی (م۵۹۷ھ)، مکتبہ نوریہ رضویہ فیصل آباد۔
(۷) الکامل فی التاریخ: علامہ ابوالحسن بن ابی الکرم الشیبانی المعروف بابن الاثیر (م۶۳۰ھ)، بیروت
(۸) اُسد الغابۃ: علامہ ابوالحسن بن ابی الکرم الشیبانی المعروف بابن الاثیر (م۶۳۰ھ)
(۹) سُبُل الھُدیٰ والرشاد: علامہ محمد بن یوسف الشامی (م ۹۴۲ھ)، مطبوعہ بیروت ۱۴۱۴ھ۔
(۱۰) السیرۃ النبوّۃ: علامہ سیّد احمد بن زینی دحلان مکی (م۱۳۰۴ھ)، مطبوعہ دارالفکر بیروت ۱۴۲۱ھ۔
(۱۱) سیرت النبی ﷺ: شبلی نعمانی۔
(۱۲) سیرت النبی ﷺ: سیّد سلیمان ندوی۔
(۱۳) شریف التواریخ: شریف احمد شرافت۔
(۱۴) تاریخ اسلام السیاسی والدّینی والثقافی والاجتماعی: ڈاکٹر حسن ابراہیم۔
(۱۵) سیرت الرحیق المختوم: مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری۔
(۱۶) حیاتِ محمد ﷺ: محمد حسین ہیکل۔
(۱۷) رحمۃ للعالمین: محمد سلیمان منصور پوری۔
(۱۸) خاتم النّبیّین: امام زہرہ، مطبوعہ دارالفکر العربی، قاہرہ ۱۹۸۱ء۔
(۱۹) محسنِ انسانیت: نعیم صدّیقی۔
(۲۰) پیغمبر اعظم و آخر: نصیر احمد ناصر۔
(۲۱) بدر الکبریٰ: ابوخلیل شوقی، طبع مصر ۱۴۱۱ھ۔
(۲۲) اَلرّسول: عالم سعید حوی۔
(۲۳) ضیاء النبی ﷺ: پیر کرم شاہ الازہری۔
(۲۴) تاریخ ادبِ عربی: استاد احمد حسن زیات۔

کتبِ فقہ

(۱) بدائع الصنائع : علامہ ابوبکر بن مسعود کاسانی (م ۵۸۷ھ)، ایچ ایم سعید اینڈ کمپنی کراچی ۱۴۰۰ھ۔
(۲) البحر الرائق : علامہ زین الدین بن نجیم (م ۹۷۰ھ)، مطبوعہ مطبعہ علمیہ مصر ۱۳۱۱ھ۔
(۳) اَلدُّرُّ المختار : علامہ علاء الدین محمد بن علی بن محمد حصکفی (م ۱۰۸۸ھ)، مطبوعہ بیروت۔
(۴) فتاویٰ عالمگیری : ملّا نظام الدین (م ۱۱۶۱ھ)، مطبع کبریٰ امیریہ بولاق مصر، ۱۳۱۰ھ۔
(۵) ردُّ المختار : علامہ سیّد محمد امین ابن عابدین شامی (م ۱۲۵۲ھ)، مطبوعہ بیروت ۱۴۰۷ھ، ۱۴۱۹ھ۔
(۶) کتاب الفقہ : عبدالرحمن الجزیری۔
(۷) اعلاء السنن : شیخ ظفر احمد عثمانی (م ۱۳۹۴ھ)، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۸ھ۔

کتبِ متفرقہ

(۱) رسول اللہ ﷺ کی خارجہ پالیسی : اسد سلیم
(۲) رسولِ اکرم ﷺ کی حکمتِ انقلاب : اسعد گیلانی۔
(۳) رسولِ اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی : ڈاکٹر حمید اللہ۔
(۴) عہد نبوی میں نظامِ حکمرانی : ڈاکٹر حمید اللہ۔
(۵) رسولِ اکرم ﷺ اور رواداری : ڈاکٹر حافظ محمد ثانی۔
(۶) تذکرۃ الانبیاء : حافظ قاضی عبدالرزّاق۔
(۷) قصص القرآن : حفظ الرحمن سیوہاروی۔
(۸) کتاب الخراج : امام ابو یوسف۔
(۹) الاحکام السلطانیہ : الماوردی
(۱۰) یورپ پر اسلام کے احسان : غلام جیلانی برق۔
(۱۱) اسلام اور امنِ عالم : بدر القادری۔
(۱۲) کتابِ زندگی : سلطان بشیر محمود۔
(۱۳) قرآنِ پاک ایک چیلنج، ایک سائنسی معجزہ : میجر (ر) امیر افضل خان۔
(۱۴) فتوح البلدان : علامہ بلاذری۔
(۱۵) الجہاد فی الاسلام : سیّد ابوالاعلیٰ مودودی۔
(۱۶) اسلام اور جدید ذہن کے شبہات : محمد قطب۔
(۱۷) اسلام کا قانونِ صحافت : ڈاکٹر لیاقت علی خان نیازی۔
(۱۸) اسلامی صحافت : سیّد عبید السلام زینی۔
(۱۹) اشراط الساعۃ : یوسف بن عبداللہ بن یوسف الوابل۔
(۲۰) مشرقی یورپ میں مسلمانوں کا عروج و زوال : فیض احمد شہابی (ادارہ معارف اسلامی لاہور)
(۲۱) مغربی تمدّن کی ایک جھلک : سیّد مجتبیٰ موسوی۔

اشاریہ قرآنی (جلد ششم)

[قوسین کے اندر (ـ ـ) کے اعداد صفحہ نمبر کو ظاہر کرتے ہیں۔]

سُورۃ البقرۃ (۲)

آل عمران (۳)

النّسآء (۴)

اَلمائدہ (۵)

الانعام (۶)

❖❖❖❖❖❖❖❖

اشاریہ عمومی (جلد ۶)

اشاریہ احادیث مبارکہ (جلد ششم)

(۵۳) قالَ : اُمُّکَ قالَ:ثُمَّ مَنْ؟ قالَ:اَبُوکَ(۲۷۶۵) (۵۴)فَارْجِعْ اِلٰی وَالِدَیْکَ فَاَحْسِنْ صُحْبَتَهُمَا(۲۷۶۵)

(۵۵)مَنْ اَدْرَکَ اَبَوَیْهِ عِنْدَالْکِبَرِ--- (۲۷۶۶) (۵۶)لَایَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَاطِعٌ" (۲۷۶۷)

(۵۷) اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ عَلَیْکُمْ عُقُوقَ --(۲۷۶۷) (۵۸) مِنَ الْکَبَائِرِ شَتْمُ الرَّجُلِ وَالِدَیْهِ ----(۲۷۶۸)

(۵۹) کَفٰی بِالْمَرْءِ کَذِبًا اَنْ یُّحَدِّثَ (۲۷۹۹) (۶۰) اِنَّ الصِّدْقَ یَهْدِیْ اِلَی الْبِرِّ وَاِنَّ الْبِرَّ-- (۲۷۹۹)

(۶۱) اَلْبَیِّعَانِ بِالْخِیَارِ مَالَمْ یَتَفَرَّقَا-(۲۷۹۹) (۶۲) اِنَّ الصِّدْقَ طَمَانِیْنَةٌ" وَالْکَذِبُ رِیْبَةٌ" (۲۷۹۹)

(۶۳) هَدَایَا الْاُمَرَاءِ غُلُوْلٌ" (۲۸۲۶) (۶۴) شَهَادَةُ النِّسَاءِ جَائِزَةٌ" فِیْمَالَایَسْتَطِیْعُ--(۲۸۳۱)

(۶۵) اَجَازَ النَّبِیُّ ﷺ شَهَادَةَ الْقَابِلَةِ(۲۸۳۱) (۶۶)اِدْرَأُوا الْحُدُوْدَ بِالشُّبُهَاتِ (۲۸۳۵)

(۶۷) اَلْبَیِّنَةُ عَلَی الْمُدَّعِیْ وَالْیَمِیْنُ (۲۸۳۷) (۶۸) مَنْ لَّمْ یَجْمَعِ الصِّیَامَ قَبْلَ الْفَجْرِ فَلَا-- (۲۸۵۷)

(۶۹) لَیْسَ الْکَذَّابُ الَّذِیْ یُصْلِحُ (۲۸۸۲) (۷۰) مَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَیْرًا یُّفَقِّهْهُ فِی الدِّیْنِ (۲۹۱۸)

(۷۱) عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِیْ بَکْرَةَ عَنْ اَبِیْهِ ذَکَرَالنَّبِیَّ ﷺ قَعَدَ عَلٰی بَعِیْرِهٖ وَاَمْسَکَ اِنْسَانٌ بِخِطَامِهٖ اَوْ بِزِمَامِهٖ قَالَ: اَیُّ یَوْمٍ هٰذَا؟ فَسَکَتْنَا حَتّٰی ظَنَنَّا اَنَّهٗ سَیُسَمِّیْهِ سِوٰی اِسْمِهٖ قَالَ: اَلَیْسَ هٰذَا یَوْمُ النَّحْرِ؟ قُلْنَا: بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ: فَاَیُّ شَهْرٍ هٰذَا؟ فَسَکَتْنَا حَتّٰی ظَنَنَّا اَنَّهٗ سَیُسَمِّیْهِ سِوٰی اِسْمِهٖ قَالَ: اَلَیْسَ بِذِی الْحِجَّةِ قُلْنَا: بَلٰی- لِیُبَلِّغَ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ فَاِنَّ الشَّاهِدَعَسٰی اَنْ یُّبَلِّغَ مَنْ هُوَاَوْعٰی لَهٗ مِنْهُ(۲۹۱۷)

(۷۲) لَاتَسْتَقْبِلُوا الْقِبْلَةَ وَلَا تَسْتَدْبِرُوْهَا لِغَائِطٍ اَوْبَوْلٍ (۲۹۳۲)

(۷۳) مَنْ اَدْرَکَ رَمَضَانَ بِمَکَّةَ فَصَامَهٗ وَقَامَ مِنْهُ مَا تَیَسَّرَ لَهٗ کَتَبَ اللّٰهُ لَهٗ مِائَةَ اَلْفِ شَهْرِ رَمَضَانَ(۲۹۳۲)

(۷۴) اَللّٰهُمَّ اِنْ تُهْلِکْ هٰذِهِ الْعِصَابَةَ لَا تُعْبَدْ فِی الْاَرْضِ(۲۹۶۶)

(۷۵) اَنْتَ وَمَالُکَ لِاَبِیْکَ (۲۹۸۱)

(۷۶) لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِیَةِ الْخَالِقِ (۲۹۸۲)

(۷۷) اَکْبَرُالْکَبَائِرِ اَنْ تَجْعَلَ لِلّٰهِ نِدًّا وَهُوَخَلَقَکَ وَاَنْ تَقْتُلَ وَلَدَکَ خَشْیَةَ اَنْ یَّطْعَمَ مَعَکَ اَوْتَزْنِیَ بِحَلِیْلَةِ جَارِکَ (۲۹۸۳)

(۷۸) مَنْ لَّمْ یَرْحَمْ صَغِیْرَنَا وَلَمْ یُوَقِّرْ کَبِیْرَنَا فَلَیْسَ مِنَّا (۲۹۸۴)

(۷۹) اَکْرِمُوْا اَوْلَادَکُمْ وَاَحْسِنُوْا آدَابَهُمْ فَاِنَّ اَوْلَادَکُمْ هَدِیَّةٌ" اِلَیْکُمْ (۲۹۸۵)

(۸۰) مُرُوْا اَوْلَادَکُمْ بِالصَّلٰوةِ وَهُمْ اَبْنَاءُ سَبْعِ سِنِیْنَ وَاضْرِبُوْا عَلَیْهَا وَهُمْ اَبْنَاءُ عَشْرٍ وَفَرِّقُوْا بَیْنَهُمْ فِی الْمَضَاجِعِ (۲۹۸۵)

(۸۱) سَاوُوْا بَیْنَ اَوْلَادِکُمْ فِی الْعَطِیَّةِ فَلَوْکُنْتُ مُفَضِّلًا اَحَدًا لَفَضَّلْتُ النِّسَاءَ (۲۹۸۶)

(۸۲) اَلْغُلَامُ مُرْتَهِنٌ" بِعَقِیْقَتِهٖ تُذْبَحُ عَنْهُ یَوْمَ السَّابِعِ وَیُسَمّٰی وَ یُحْلَقُ (۲۹۸۶)

(۸۳) لَا تُنْکَحُ الْاَیِّمُ حَتّٰی تُسْتَاْمَرَ وَلَا تُنْکَحُ الْبِکْرُ حَتّٰی تُسْتَاْذَنَ قَالُوْا : یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! وَ کَیْفَ

إِذْنُهَا؟ قَالَ: أَنْ تَسْكُتَ (۲۹۸۷)

(۸۴) خَيْرُ النِّسَآءِ الَّتِي إِذَا نَظَرْتَ إِلَيْهَا سَرَّتْكَ وَإِذَا أَمَرْتَهَا أَطَاعَتْكَ وَإِذَا غِبْتَ عَنْهَا حَفِظَتْكَ فِي نَفْسِهَا وَمَالِكَ (۲۹۸۹)

(۸۵) خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِاَهْلِهِ وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِاَهْلِي (۲۹۹۱)

(۸۶) خِيَارُكُمْ خِيَارُكُمْ لِنِسَاءِ هِمْ (۲۹۹۱)

(۸۷) لَايَفْرَكُ مُؤْمِن" مُؤْمِنَةً إِنْ كَرِهَ مِنْهَا خُلْقًا رَضِيَ مِنْهَا آخَرَ (۲۹۹۱)

(۸۸) أَعْظَمُ النِّسَآءِ بَرَكَةً أَيْسَرُ هُنَّ مُؤْنَةً (۲۹۹۲)

(۸۹) أَنْ تُطْعِمَهَا إِذَا طَعِمْتَ وَتَكْسُوهَا إِذَا اكْتَسَيْتَ وَلَا تَضْرِبِ الْوَجْهَ وَلَا تُقَبِّحْ وَلَا تَهْجُرَ إِلَّا فِي الْبَيْتِ (۲۹۹۳)

(۹۰) إِسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ فَإِنَّ الْمَرْأَةَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ وَإِنَّ أَعْوَجَ مَافِي الضِّلَعِ أَعْلَاهُ فَإِنْ ذَهَبْتَ تُقِيْمُهُ كَسَرْتَهُ وَإِنْ تَرَكْتَهُ لَمْ يَزَلْ أَعْوَجَ فَاسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ (۲۹۹۴)

(۹۱) إِذَا دَعَاالرَّجُلُ زَوْجَتَهُ لِحَاجَتِهِ فَلْتَأْتِهِ وَإِنْ كَانَتْ عَلَى التَّنُّوْرِ (۲۹۹۹)

(۹۲) لَوْ كُنْتُ آمِرًا أَحَدًا أَنْ يَسْجُدَ لِاَحَدٍ لَاَمَرْتُ الْمَرْأَةَ أَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِهَا (۲۹۹۹)

(۹۳) أَيُّمَا امْرَأَةٍ مَاتَتْ وَزَوْجُهَا عَنْهَا رَاضٍ دَخَلَتِ الْجَنَّةَ (۲۹۹۹)

(۹۴) إِذَا دَعَا الرَّجُلُ إِمْرَأَتَهُ إِلَى فِرَاشِهِ فَلَمْ تَأْتِهِ فَبَاتَ غَضْبَانَ عَلَيْهَا لَعَنَتْهَاالْمَلَائِكَةُ حَتّٰى تُصْبِحَ (۳۰۰۰)

(۹۵) لَا يَحِلُّ لِامْرَأَةٍ أَنْ تَصُوْمَ وَزَوْجُهَاشَاهِد" إِلَّا بِإِذْنِهِ وَلَا تَأْذَنَ فِي بَيْتِهِ إِلَّا بِإِذْنِهِ (۳۰۰۰)

(۹۶) أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّ لَكُمْ عَلَى نِسَآءِ كُمْ حَقًّا وَلَهُنَّ عَلَيْكُمْ حَقًّا وَلَكُمْ عَلَيْهِنَّ أَلَّايُوْطِيْنَ فُرُشَكُمْ أَحَدًا تَكْرَهُوْنَهُ وَعَلَيْهِنَّ أَلَّا يَأْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ (۳۰۰۰)

(۹۷) اَلصَّدَقَةُ عَلَى الْمِسْكِيْنِ صَدَقَة" وَعَلَى ذِي الرَّحِمِ صَدَقَة" وَّ صِلَة" (۳۰۰۷)

قرآنک انسائیکلوپیڈیا

اُردو ترجمہ

جلد ششم

مؤلف

پروفیسر اشفاق احمد خان